جنوری [illegible]

[illegible]

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

[illegible]

مجلسِ ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت، نسل و رنگ و زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اس کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

......((مرتبہ))......

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت:- ۳۲۰ صفحے   قیمت:- ۵ روپے

جلد ۱۰۹- ماہ ذی القعدہ ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۲ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

افسوس ہے کہ خواجہ غلام السیدین بھی دنیا سے رخصت ہو گئے، انکی موت علمی دنیا کا اندوہناک حادثہ ہے، وہ علی گڑھ کی بہترین پیداوار اور اس کا مثالی نمونہ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان میں علم و فضل، فکر و نظر، تقریر و تحریر، تالیف و تصنیف بہت سے کمالات جمع کر دیے تھے، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انکو بڑی قدرت تھی، تعلیم کے ماہر خصوصی تھے، انکے خیالات میں گہرائی کے ساتھ بڑا اعتدال و توازن تھا، اور وہ مغربی تعلیم اور مشرقی تہذیب کا سنگم تھے، وہ نئے دور کی پیداوار تھے، اور جدید علوم و افکار میں مہارت کے ساتھ راسخ العقیدہ مسلمان بھی تھے، انکے دل میں اپنے مذہب و ملت کا درد تھا، اگرچہ بعض مسائل میں وہ جدید خیالات سے متاثر تھے لیکن اسلام کی ترجمانی کا پورا حق ادا کرتے تھے، انھوں نے قلم و زبان دونوں سے مذہب و ملت کی خدمت انجام دی، انکو ہندوستان اور اس کے باہر بڑے بڑے علمی اعزاز حاصل ہوئے، اور مختلف علمی، تعلیمی، مذہبی اور ادبی موضوعوں پر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تصنیفی یادگاریں چھوڑیں، ان کی تصانیف بڑی فکر انگیز ہیں، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت اور دنیا کی طرح آخرت کی سربلندی سے بھی سرفراز فرمائے، یوں تو آئے دن موتیں ہوتی رہتی ہیں، مگر جب کوئی معاصر اور ہم عمر اٹھتا ہے تو اپنا وقت بھی قریب نظر آتا ہے، ع

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

مذہبی حلقہ کے لیے مولانا احتشام الحسن کاندھلوی کی وفات بھی بڑا حادثہ ہے، وہ اس دور کے صاحب زہد و تقویٰ عالم تھے، شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز اور تبلیغی کاموں میں ان کے دست راست تھے، انھوں نے تبلیغ کو زندگی کا مقصد بنا لیا تھا، ہر وقت اسی کی دھن رہتی تھی، انھوں نے بہت سے تبلیغی رسائل

بھی لکھے، ان کی صحت عرصہ سے خراب تھی، اس کے علاوہ مختلف قسم کی مشکلات میں مبتلا رہے، لیکن کوئی معذوری تبلیغی کام میں حائل نہ ہو سکی، اور مرض الموت تک اس کام کو انجام دیتے رہے، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔

اللہ تعالیٰ نے قوموں کے عروج و زوال، ترقی و تنزل اور کامرانی و ناکامی کے جو قوانین مقرر کر دیے ہیں وہ دنیا کی ساری قوموں کے لیے یکساں ہیں، کسی قوم و ملت کے لیے نہیں بدلتے۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللہِ تَبْدِیْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللہِ تَحْوِیْلًا۔ اور خدا کسی قوم کی حالت میں اس وقت تک بگاڑ نہیں پیدا کرتا جب تک وہ خود اپنے میں بگاڑ نہ پیدا کرے، اِنَّ اللہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ اس میں کوئی استثنیٰ نہیں غزوۂ احد میں مسلمانوں نے غلطی کی، اسکا نتیجہ شکست کی صورت میں ظاہر ہوا، پاکستان کا انقلاب بھی اسی سنت الٰہی کا نتیجہ ہے، خدا نے پاکستانیوں کو جو نعمت دی تھی، وہ اس کے اہل نہ ثابت ہوئے، اسکی بقا و استحکام کیلیے جن تدبیروں کی ضرورت تھی اس سے غفلت برتی، انھوں نے جو گوناگوں غلطیاں کیں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، اس پر پاکستان کی پچیس ۲۵ سالہ تاریخ شاہد ہے، اسکا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علٰحدگی کی صورت میں نکلا جس کا احساس اب خود پاکستانیوں کو بھی ہے،

مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان کے درمیان ڈیڑھ دو ہزار میل کا فاصلہ ہے، ان میں مذہب کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں، پاکستانیوں نے اپنے طرز عمل سے اس رشتہ کو بھی کمزور کر دیا، اس لیے ایک نہ ایک دن دونوں میں علٰحدگی یقینی تھی، افسوس اس کا ہے کہ یہ علٰحدگی خوشگواری کے بجائے انتہائی افسوسناک طریقہ سے ہوئی، فریقین کی ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں، دونوں حصوں پر تباہی آئی اور ان میں ایسی کدورت پیدا ہو گئی جو مدتوں میں دور ہو گی، اب مشرقی بنگال کی علٰحدگی ایک حقیقت بن چکی ہے، اس کو ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے، اس کے خلاف جو قدم بھی اٹھایا جائیگا وہ مزید تباہی کا باعث ہوگا، اس لیے دونوں کو جوش و جذبۂ انتقام کے بجائے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے، مشرقی بنگال میں خواہ کسی قسم کی حکومت قائم ہو بہرحال وہ

مسلمانوں کی اکثریت کا ملک رہے گا، اگر ایک طرف اس کے نکل جانے سے متحدہ پاکستان کو نقصان پہنچا تو دوسری طرف مسلمانوں کی ایک اور آزاد حکومت قائم ہوگئی، اس لیے دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ گذشتہ واقعات کو فراموش کرکے ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کی جائے، اس وقت دونوں کے جذبات مشتعل ہیں، اسلیے صحیح نقطۂ نظر سمجھ میں نہ آئے تو لیکن ایک نہ ایک دن اس نتیجہ پر آنا پڑے گا، سیاست کی دنیا میں دوستی اور دشمنی ناپائیدار ہوتی ہے، آج کے دشمن کل دوست بنجاتے ہیں، انگریز بالکل اجنبی تھے، مشرقی بنگال والوں کو جتنی شکایتیں مغربی پاکستان سے تھیں اس سے زیادہ ہندوستان کو انگریزوں سے تھیں، مگر آزادی کے بعد دونوں کے تعلقات دوستانہ ہوگئے، اس کے مقابلہ میں مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان کے درمیان اتنے رشتے ہیں جو عارضی حالات سے ہمیشہ کے لیے نہیں ٹوٹ سکتے، اس لیے ان دونوں میں دوستانہ تعلقات کیوں نہیں ہو سکتے، یہی معاملہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونا چاہیے، اسی میں سب کی بھلائی ہے،

مشرقی بنگال کی علٰحدگی کے بعد بھی مغربی پاکستان انڈونیشیا اور بنگلہ دیش کے بعد سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور ترقی یافتہ بھی ہے، اس میں ہر طرح کی صلاحیتیں ہیں، اس لیے وہ اب بھی اسلامی ملکوں میں نمایاں مقام حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ گذشتہ واقعات کو فراموش کرکے اپنی پوری توجہ اپنے نقصان کی تلافی اور ملک کی تعمیر و ترقی کی طرف منعطف کردے، اسکے علاوہ اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، برصغیر کی دونوں تقسیموں میں سب سے زیادہ مہاجر تباہ ہوئے، ہندوستان کی تقسیم کے بعد جن لوگوں نے مشرقی بنگال کو وطن بنایا تھا، اب اسکی سرزمین ان کیلیے تنگ ہو رہی ہے، اسکے اسباب جو بھی ہوں، مگر اب بہادری، شرافت اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ انکو بنگلہ دیش کا شہری تسلیم کیا جائے، جمہوری اور سیکولر حکومت کے نقطۂ نظر سے بھی وہ بنگلہ دیش کے شہری ہیں اور یہ اسکی جمہوریت اور سیکولرزم کا پہلا امتحان ہے، اگر اس میں وہ ناکام رہا تو اسکی جمہوریت اور سیکولرزم پر بڑا بدنما دھبہ ہوگا، مسلمانوں پر سب سے زیادہ اثر مہاجرین کے ساتھ بدسلوکی کا پڑا ہے، جو حسن سلوک ہی سے دور ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اسوقت کامیابی کے نشہ میں بنگلہ دیش والے اپنے کو مسلمانوں سے بے نیاز سمجھیں لیکن ہمیشہ کیلیے ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

مقالات

اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۴)

فرنگی تہذیب فرنگی تہذیب کا ظاہر تو بڑا دلکش و دلفریب ہے لیکن باطن اعلیٰ انسانی اقدار سے بالکل خالی ہے، اس کا مقصد صرف مادی عیش و تنعم سے لطف اندوزی ہے، اس کو اقبال نے بڑے دلکش و مؤثر پیرایوں میں بیان کیا ہے، اس کی ظاہری دلفریبی بلکہ ساحری کو اس شاعرانہ انداز میں دکھایا ہے:

یاد ایامے کہ بودم در خمستانِ فرنگ — جام او روشن تر از جامِ جم و اسکندر است
چشمِ مستِ مے فروشش بادہ را پروردگار — بادہ خواراں را نگاہِ ساقیش پیغمبر است

لیکن اس کی باطنی حالت یہ ہے:

جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل — عقل ناپروا متاعِ عشق را غارت گر است
در ہوایش گرمیِ یک آہِ بے تابانہ نیست — رندِ ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

وہ دانائے فرنگ کو پیام دیتے ہیں:

از من اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است

علم و حکمت اگر ش خوئے سگے باز دہد
آدمی زادۂ دانا ز دو دان خوار تر است
(پیام مشرق)

اے باد صبا میری طرف سے دانائے فرنگ کو یہ پیام پہنچا دے کہ جب سے عقل نے بال و پر نکالے ہیں وہ اور بھی گرفتار ہو گئی ہے اس پر تعجب نہیں ہے کہ یورپ میں اعجاز مسیحائی ہے بلکہ تعجب اس پر ہے کہ اس کا بیمار اور بھی زیادہ بیمار ہے، اگر علم و حکمت انسان میں کتوں کی خصلت پیدا کر دے تو اس کا حاصل کرنے والا دانا آدمی زادہ حشرات الارض سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہو جائے گا،

نطشے کی زبانی فرنگی تہذیب کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :-

ایں خرابات فرنگ است و ز تاثیر مئیش
آنچہ مذموم شمارند نماید محمود

نیک و بد را بترازوے دگر سنجیدیم
چشمۂ داشت ترازوے نصاریٰ و یہود

دعویٔ صدق و صفا پردۂ ناموس ریاست
پیر ما گفت مس از سیم بیا بداندود

یہ فرنگ کا خرابات ہے، اس کی شراب کی تاثیر سے بری چیز بھی قابل ستائش نظر آتی ہے، ہم نیک و بد کو ایک دوسرے ترازو سے تولتے ہیں، کیونکہ نصاریٰ اور یہود کے ترازو کے پلے برابر نہیں تھے، صدق و صفا کا دعویٰ ریا کا پردہ ہے، ہمارے پیر کا کہنا ہو کہ گلٹ پر چاندی کا ملمع کرنا چاہئے

عصر حاضر کی مادیت سے دین فریادی ہے، اس کی نام نہاد آزادی میں ہزاروں بند پنہاں ہیں، اس نے اپنی غلط نقش آرائی سے انسانیت کے چہرے کا رنگ و روغن اور اسکی تر و تازگی ختم کر دی،

چہ عصر است ایں کہ دیں فریادی اوست
ہزاراں بند در آزادی اوست

ز روئے آدمیت رنگ و نم برد
غلط نقشے کہ از بہزادی اوست

اس کی نگاہ کافری کی مصور ہے، اور اس کی صناعی کا کمال آذری اور بت گری ہے،

نگاہش نقش بندِ کافریہا　　　کمالِ صنعتِ او آذریہا

ایک نظم میں اس تہذیب کی ظاہری چمک دمک اور باطنی ظلمت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے،

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے　　　حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں　　　گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے　　　سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ حکومت　　　پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم　　　حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت　　　احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ　　　دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

مغربی تہذیب کے عناصر اس لطیف انداز میں بیان کیے ہیں:-

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے　　　نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری
جہاں قمار نہیں، زن تنک لباس نہیں　　　جہاں حرام بتاتے ہیں شغلِ مے خواری
بدن میں گرچہ ہو اک روحِ ناشکیب و عمیق　　　طریقۂ اب و جد سے نہیں ہے بیزاری
نظرورانِ فرنگی کا ہے یہی فتویٰ　　　وہ سرزمیں مدنیت سے ہے ابھی عاری

فرنگی تہذیب قلب و نظر کا فساد اور روح کی پاکیزگی سے خالی ہے، اس لیے اس سے اعلیٰ انسانی صفات پیدا نہیں ہو سکتے۔

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب　　　کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

اس کا ظاہر دلکش و دلفریب ہے لیکن باطن روشنی سے محروم ہے، اور اس کی ظاہری پانی سراب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی،

فکر افرنگ کا اندازہ اسکی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

برا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش

یہ حوریان فرنگی دل و نظر کا حجاب
بہشت مغربیاں جلوہ ہائے پابرکاب

جس تہذیب کی بنیاد ایسے کمزور عناصر ہوں وہ محض تدبر کی فسوں سازی سے مستحکم نہیں ہو سکتی،

نظر کو خیرہ کرتی ہے مگر تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تدبر کی فسوں سازی سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

خبر ملی ہے خدایان بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزر سیل بے پناہ میں ہے

ایسی تہذیب جو خود مر رہی ہو دوسروں کو کیا زندہ کر سکتی ہے۔

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت جو ہے خود لب گور

اسی لیے وہ حیرت انگیز مادی ترقی کے باوجود انسانی فلاح سے قاصر رہی،

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس تہذیب سے بچنے کی مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ یہ تہذیب بالکل بے جان ہو چکی ہے، فرنگی قوموں کا شعلہ اب بجھنے والا ہے، اس کی ظاہری آنکھ تو ضرور صاحب نظر ہے لیکن اس کا دل مردہ ہے، وہ خود اپنی تلوار کے زخم سے بسمل ہو رہی ہیں، وہ دوسروں کو کیا زندہ کر سکتی ہیں! ان کی شراب سے سوز و مستی پیدا نہیں ہو سکتی، ان کا آسمان نئی دنیا بنانے سے قاصر ہے، اب زندگی کا سوز و ساز تمہاری حرارت کا محتاج ہے، اور نئی دنیا پیدا کرنا تمہارا کام ہے،

شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ است　　چشمِ شاں صاحب نظر دل مردہ است
زخمہا خوردند از شمشیر خویش　　بسمل افتادند از شمشیر خویش
سوز و مستی را مجو از تاکِ شاں　　عصرِ دیگر نیست در افلاکِ شاں
زندگی را سوز و ساز از نارِ تست　　عالمِ نو آفریدن کارِ تست

مسلمانوں کو خبردار کرتے ہیں کہ تجدید کے نعرہ کے فریب میں نہ آؤ، اس کا مقصد فرنگی تہذیب کی تقلید ہے، اور تقلید کی غلامی سے خودداری جیسی بیش بہا چیز برباد نہ کرو،

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو　　کر اسکی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک　　ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ دائرۂ تجدید　　مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

ایک نظم میں مصطفیٰ کمال کے تجدیدی کارنامے کی حقیقت بڑی خوبی سے ظاہر کی ہے۔

مصطفیٰ کو از تجدد می سُرود　　گفت نقشِ کہنہ را باید زدود

نو نگردد کعبہ را رخت حیات   گر ز افرنگ آیدش لات و منات

ترک را آہنگ نو در چنگ نیست   تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

سینۂ او را دمِ دیگر نبود   در ضمیرش عالمِ دیگر نبود

لاجرم با عالم موجود ساخت   مثل موم از سوز ایں عالم گداخت

طرفگیہا در نہاد کائنات   نیست از تقلید تقویم حیات

زندہ دل خلاق اعصار و دہور   جانش از تقلید گردد بے حضور

یعنی مصطفیٰ کمال نے تجدید کا نعرہ بلند کیا، اور پرانی ترک قوم پر نیا صیقل کرنا چاہا لیکن اس میں اس لیے وہ ناکام رہے کہ افرنگ کے لات و منات سے کعبہ کا رخت حیات نیا نہیں بن سکتا، یعنی مغربی تہذیب کی تقلید سے مسلمانوں کو زندگی نہیں مل سکتی، ترکوں کے پاس اپنی کوئی چیز نہیں تھی، اور جس کو وہ نئی سمجھتے ہیں وہ صرف افرنگ کا اترا ہوا پرانا لباس ہے، ان کے سینہ میں نیا دم اور ان کے فکر و خیال میں نیا عالم نہیں تھا، اس لیے اس کو موجودہ عالم یعنی جدید تہذیب میں جو کچھ ملا، اسی کو اختیار کر لیا، اور موم کی طرح اس کے قالب میں ڈھل گئے، حالانکہ کائنات کی فطرت میں طرفگی ہے، اور اس میں بہت سی نئی چیزیں ہیں، زندگی تقلید سے نہیں قائم رہتی، زندہ دل قومیں خود زمانہ آفریں ہوتی ہیں، تقلید سے ان کی روح مردہ ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں سے خطاب کرتے ہیں کہ اگر تم میں مسلمانوں کا دل و جگر ہے تو اپنے ضمیر اور قرآن پر نظر ڈالو، اس کی آیات میں سیکڑوں نئے جہاں پوشیدہ اور اس کی ایک ایک آن میں سیکڑوں زمانے مستور ہیں، بندۂ مومن خدا کی آیات میں سے ہے، زمانہ کے مختلف دور اس کے لیے لباس کی حیثیت رکھتے ہیں، جب کوئی زمانہ اور اس کا لباس

...س کے جسم پر پرانا ہو جاتا ہے تو قرآن اس کو نیا جہاں اور نیا لباس عطا کرتا ہے یعنی قرآن مجید ہر زمانہ اور ہر قسم کے حالات کی رہنمائی کے لیے کافی ہے، اس کی رہنمائی میں مسلمانوں کو اپنا جہان آپ پیدا کرنا چاہیے، دوسروں کی تقلید ان کے لیے باعث ننگ ہے،

چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیر خویش و در قرآں نگر

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانِ دیگرش

بعض اعتراضات کا جواب

اقبال پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ آفاقی اور قومی شاعر نہیں بلکہ اسلامی اور فرقہ پرست شاعر تھے، ان کی شاعری قومی و وطنی جذبات سے خالی ہے، اس کی انھوں نے مخالفت کی ہے، انھوں نے صرف مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے، اور ان کو جارحیت کی تعلیم دی ہے، اور وہ مسلمانوں کا غلبہ واقتدار چاہتے تھے، راقم نے اس کے جواب میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا جو جنوری و فروری ۶۰ء کے معارف میں شائع ہوا ہے، اس مقالہ میں بھی ان کی اسلامی شاعری کو پیش کیا گیا ہے، اس سے اس اعتراض کو تقویت حاصل ہوتی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اس پر سرسری نظر ڈال لیجائے،

درحقیقت اس قسم کے اعتراضات وہی لوگ کرتے ہیں جن کی نظر ان کے پورے کلام پر نہیں ہے، وہ صرف ان نظموں کو جو اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ہیں، دیکھ کر فیصلہ کر دیتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے، انکے افکار و تصورات او تعلیمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، انھوں نے سیکڑوں مسائل پر لکھا ہے، ان سب کو پیش نظر رکھنے کے بعد صحیح فیصلہ کیا جاسکتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ قومی شاعر بھی تھے، اسلامی بھی اور آفاقی بھی، انکو اپنے مذہب و ملت سے بھی محبت تھی، قوم و وطن سے بھی اور عالم انسانیت سے بھی، ان سب کے درد سے انکا دل دکھتا تھا اور

ایشیا کی غلامی پر ان کا دل بیقرار رہتا تھا، اپنی شاعری میں انھوں نے ان سب کو مخاطب کیا ہے، اور ان میں روح پھونکنے کی کوشش کی ہے، اس میں کوئی تضاد نہیں ہے، محبت و تعلق کا دائرہ بہت وسیع ہے، ایک ہی وقت میں اپنے بیوی بچوں، اعزہ و اقربا، دوست احباب، اپنی قوم و ملت، اپنے ملک و وطن اور پورے عالم انسانیت سے محبت ہوتی ہے، اور ایک کی محبت دوسرے کی محبت میں حائل نہیں ہوتی، البتہ اسکی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں، اس لیے اپنے مذہب و ملت سے محبت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قوم و وطن کی محبت سے ان کا دل خالی تھا،

ان کے کلام کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لیے اس زمانہ کے حالات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، اٹھارھویں صدی میں قریب قریب پورا ایشیا غلام ہو چکا تھا، اسلامی ملکوں اور مسلمانوں کی حالت خاص طور سے بڑی ابتر تھی، اقبال نے ان سب کی بدحالی پر آنسو بہائے ہیں، اور ان میں زندگی، روح اور آزادی کی تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے مغربی تہذیب و مغربی سیاست کو جس طرح بے نقاب کیا ہے اور قوموں اور ملتوں کے عروج و زوال اور موت و حیات کا جو فلسفہ بیان کیا ہے وہ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ تمام مشرقی قوموں کے لیے یکساں سبق آموز ہے، انھوں نے سارے انسانوں سے محبت کی تعلیم دی ہے،

ایشیا پر ایک مستقل مثنوی لکھی ہے، جس کا نام ہی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ہے، اس میں انھوں نے بڑے جوش و جذبہ سے ایشیا کے شاندار ماضی، اس کے فضائل و کمالات اور عالم انسانیت پر اس کے احسانات کا ذکر کرکے اس میں روح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے،

سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست　　ہم شراب و ہم ایاغ از آسیاست
عشق را ما دلبری آموختیم　　شیوۂ آدم گری آموختیم

ہم ہنر ہم دیں ز خاکِ خاور است　　رشکِ گردوں خاکِ پاکِ خاور است
وانمودیم آنچہ بود اندر حجاب　　آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
ہر صدف را گوہر از نیسانِ ماست　　شوکتِ ہر بحر از طوفانِ ماست
روحِ خود در سوزِ بلبل دیدہ ایم　　خونِ آدم در رگِ گل دیدہ ایم
فکرِ ما جویائے اسرارِ وجود　　زد نخستیں زخمہ بر تارِ وجود
داشتیم اندر میانِ سینہ داغ　　بر سرِ راہے نہادیم ایں چراغ
اے زمینِ دولت و تہذیب و دیں　　آں یدِ بیضا بر آر از آستیں
خیز و از کارِ امم بکشا گرہ　　نشۂ افرنگ را از سر بنہ
نقشے از جمعیتِ خاور فگن
واستانِ خود ز دستِ اہرمن

یعنی دل کا سارا سوز و ساز اور درد و داغ، شراب اور ساغر سب ایشیا ہی سے پیدا ہوئے، عشق کو دلبری کا سلیقہ ہم نے سکھایا، اور آدم گری کا طریقہ ہم نے بتایا، علم و ہنر اور دین و مذہب سب سرزمین مشرق کی دین ہے۔ اس کی خاک پاک رشک گردوں ہے، ہم نے اسرار کائنات کا پردہ چاک کیا ہے، جو روز روشن کی طرح عیاں ہے، ہر سیپ کو موتی ہمارے نیسان سے ملے ہیں، اور ہر سمندر کو شوکت ہمارے طوفان سے حاصل ہوئی یعنی دنیا کو جو کچھ بھی ملا ہے، وہ سب ایشیا سے ملا ہے، بلبل کے سوز میں ہم کو اپنی روح اور بنی آدم کا خون اپنی رگوں میں نظر آتا ہے، ہم پورے عالم انسانیت کو یکساں سمجھتے ہیں، اور ان سب کا درد ہمارے دل میں ہے، ہماری فکر رسا اسرار وجود کی جویا رہی ہے، اور ہم نے وجود کے تار پر پہلا زخمہ لگایا، یعنی اسرار وجود کا پہلے ہم نے

انکشاف کیا، ہمارے سینہ میں داغ کا جو روشن چراغ تھا، اس کو ہم نے سرِ راہ رکھ دیا اور ساری دنیا کو اس کی روشنی سے منور کیا، پھر ایشیا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں، اے دولت و تہذیب اور دین و مذہب کا گہوارہ! اپنا پرانا ید بیضا پھر آستین سے نکال اور اپنے کمالات سے دنیا کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے، اور قوموں کے پیچیدہ مسائل کی گرہ کھول کر فرنگیوں کے سر کا نشہ اتار دے، اپنی جمعیت بنا کر اپنے کو اہرمن کے پنجہ سے آزاد کر لے،

اس سے بڑھ کر ایشیا کی عظمت کا ترانہ اور کیا ہو سکتا ہے، آفتاب کی حرارت در وشنی سے پوری کائنات کو جو فیض پہنچتا ہے اس کو گنانے کے بعد التجا کرتے ہیں

تیرہ خاکم را سراپا نور کن — در تجلیہائے خود مستور کن
تا بر فروز آرم شب افکار شرق — بر فروزم سینۂ احرار شرق
از نوائے پختہ سازم خام را — گردشِ دیگر دہم ایام را
فکر شرق آزاد گردد از فرنگ — از سرودِ من بگیرد آب و رنگ
زندگی از گرمیِ ذکر است و بس — حریت از عفتِ فکر است و بس
پس نخستیں بایدش تطہیر فکر — بعد ازاں آساں شود تعمیر فکر

یعنی میری تیرہ و تار خاک کو بھی سراپا نور اور اپنی تجلیوں میں مستور کر دے تاکہ مشرق کے افکار و خیالات کی شب تار اور مشرق کے احرار کے سینہ کو روشن کر سکوں، اپنی نوا سے خام کو پختہ کر کے زمانہ کا رخ بدل دوں، مشرق کے خیالات فرنگ سے آزاد ہو جائیں اور وہ میرے سرود سے آب و رنگ حاصل کرے، زندگی ذکر کی گرمی اور آزادی خیالات کی پاکیزگی کا نام ہے، اس لیے پہلے خیالات کی تطہیر ضروری ہے، یعنی

اس کو بیرونی خیالات کی آمیزش سو پاک کرنا چاہیے، اس کے بعد نئے خیالات کی تعمیر آسان ہو جاتی ہے،

ایشیا اور ایشیائی اقوام پر ان کی اور نظمیں بھی ہیں "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی پوری مثنوی ہی ایشیا پر ہے، نمونہ کے لیے یہ دو مثالیں کافی ہیں، نہ صرف ایشیا بلکہ پوری انسانیت کا درد اُن کے دل میں تھا، اس کی مثالیں آیندہ آئیں گی،

ان کا دل اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت سے بھی خالی نہ تھا، ہندوستان کی عظمت پر انھوں نے متعدد نظمیں لکھی ہیں، جن کے لفظ لفظ سے اس کی عظمت و محبت ٹپکتی ہے، انکا ابتدائی دور کا وطنی ترانہ بہت مشہور ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے،

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اسکی وہ گلستاں ہمارا

دوسرے ترانے کے دو بند یہ ہیں،

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ان ترانوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی دور کے ہیں، بعد میں ان کے خیالات بدل گئے تھے لیکن ہندوستان کی عظمت و محبت ان کے ہر دور کی نظموں میں نظر آتی ہے، جاوید نامہ میں جو بہت بعد کی تصنیف ہے، اس قسم کی متعدد نظمیں ہیں، ایک نظم میں ہندوستان

کی محبت ان الفاظ میں ظاہر کی ہے،

باز گو از ہند و از ہندوستاں — آنکہ با کاہش نیرزد آسماں
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مُرد — آنکہ اندر دیر او آتش فسرد
آنکہ اے از بہر او خوں کردہ ایم — آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم

از غم ما کن غم او را قیاس
آہ از معشوقانِ عاشق ناشناس

یعنی ہندوستان کا قصہ پھر سناؤ، آسمان جس کی گھاس کی برابری بھی نہیں کرسکتا، جس کی مسجد کے ہنگامے خاموش ہوگئے، اور جس کے بتخانوں کی آگ بجھ گئی ہے، یعنی اُن میں زندگی کی حرارت باقی نہیں رہی، جس کے لیے ہم نے دل خون کیا، اور جس کی یاد کو جان سے پرورش کیا ہے، میرے غم سے اس کے غم کا قیاس کرسکتے ہو معشوقوں سے اپنے عاشقوں کی ناقدری کتنی قابل افسوس ہے، آخری مصرعہ ان لوگوں پر لطیف طنز بھی ہو سکتا ہے جو اقبال کا دل وطن کی محبت سے خالی سمجھتے ہیں،

ایک نظم میں عظیم ہندوستان کی غلامی کا ماتم ان الفاظ میں کیا ہے۔

می ندانی خطۂ ہندوستاں — آں عزیزِ خاطرِ صاحب دلاں
خطۂ ہر ذرہ اش گیتی فروز — درمیانِ خاک و خوں غلطد ہنوز
در گلش تخمِ غلامی را کہ کشت — ایں ہمہ کردارِ آں ارواحِ زشت

ہندوستان کی سرزمین، وہ جو صاحب دل لوگوں کو عزیز ہے، جس کا ہر ذرہ دنیا کو روشن کرتا ہے، اب تک وہ خاک و خون میں تڑپ رہا ہے، اس کی مٹی میں غلامی کا بیج کس نے بویا، یہ سب بری روحوں کی بدکرداریوں کا نتیجہ ہے،

اسی نظم میں یہ ضرب المثل شعر ہے

جعفر از بنگال و صادق از دکن | ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن

انھوں نے آزادی پر جتنی نظمیں کہی ہیں اُن کے مخاطب ہندو مسلمان دونوں ہیں،
ان سب میں ہندوستان کی غلامی کا ماتم کیا ہے، ایک نظم میں کہتے ہیں

اے ہمالہ اے اٹک اے رودِ گنگ | زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب | نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر | خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں | ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب | انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

اے ہمالہ اے اٹک اے گنگا! یہ بے آب و رنگ زندگی کب تک، ہمارے بوڑھے
فراست سے اور نوجوان محبت سے بے بہرہ ہیں، ساری دنیا آزاد ہے۔ اور ہم دوسروں
کے نخچیر ہیں، ہماری اینٹیں دوسروں کی تعمیر کا سرمایہ ہیں، جب سے فرنگی کفر و دین یعنی ہندوستانیوں
کے درمیان ثالث بنے اُس وقت سے کسی میں پانی اور سراب میں تمیز کرنے کی صلاحیت
نہیں رہی،

اس میں ہندو مسلم اختلاف اور اس کے اسباب کی طرف بھی اشارہ ہے،
جاوید نامہ میں عالم بالا میں جو تمثیلی مناظر دکھائے گئے ہیں، اُن میں مادرِ وطن کی
کیسی پاکیزہ تصویر پیش کی ہے،

آسماں شق گشت و حورے پاک زاد | پردہ را از چہرۂ خود برکشاد
در جبینش نورِ نارِ لا یزال | در دو چشمِ او سرورِ لایزال

حلۂ در بر سبک تر از سحاب تار و پودش از رگِ برگِ گلاب

تا چنیں خوبی نصیبش طوق و بند بر لب او نالہائے دردمند

آسمان شق ہوا اور اس سے ایک پاک زاد حور ظاہر ہوئی جس کی پیشانی پر لازوال نور اور اس کی آنکھوں میں لازوال سرور تھا، اس کے جسم پر ابر سے زیادہ لطیف لباس تھا، جس کا تانا بانا گلاب کی پنکھڑی کی رگوں سے بنا تھا، اس حسن و خوبی کے باوجود وہ طوق غلامی میں اسیر ہے، اور اس کے لبوں پر دردناک نالے ہیں،

یہ بڑی طویل نظم ہے، صرف چند اشعار مثالاً نقل کیے گئے، ان کے علاوہ اور نظمیں بھی ہیں مگر سب کو نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے،

انھوں نے ہندوستان کے صلحاء و اخیار کی ثنا و صفت میں بھی نظمیں لکھی ہیں، رام چندر جی کی مدح میں کہتے ہیں،

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند

یہ ہندیوں کی فکرِ فلک رس کا ہے اثر رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں فلک سرشت مشہور جن کے نام سے دنیا میں نام ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی روشن تر از سحر ہے زمانہ میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں مرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ شجاعت میں فرد تھا

گوتم بدھ اور گرو نانک کی عظمت اور ان کے کارناموں کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے،

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی

آہ بد قسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

آہ شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کے اک مردِ کامل[۱] نے جگایا خواب سے

جاوید نامہ میں ایک مکالمہ ہے جس میں کائنات کے مسائل اور حقائق کے متعلق مولانا روم سے ایک عارف ہندی (جوگی) نے سوالات کیے ہیں اور مولانا نے اس کے جوابات دیے ہیں، یہ مکالمہ بہت طویل ہے، اس کے نقل کرنے کی گنجایش نہیں ہے، لیکن عارف ہندی کا درشن کر لیجیے:

زیرِ نخلے عارفِ ہندی نژاد
دیدہ از سرمہ اش روشن سواد

موے بر سر بستہ و عریاں بدن
گردِ او مارے سپید حلقہ زن

آدمی از آب گل بالاترے
عالم از دیر خیالش پیکرے

وقت او را گردشِ ایام نے
کار او با چرخِ نیلی فام نے

ان اشعار میں عارف ہندی کا کتنا بلند تصور ہے، مشہور فلسفی شاعر بھرتری ہری

---

[۱] یعنی گرو نانک

اور سوامی رام تیرتھ پر بھی نظمیں کہی ہیں،

ہندوستان کے مختلف خطوں کی تعریف میں متعدد نظمیں ہیں، اپنے وطن کشمیر اور کشمیریوں کی تعریف میں کہتے ہیں،

ہند را ایں ذوق آزادی کہ داد — صید را سودائے صیادی کہ داد
ایں برہمن زادگانِ زندہ دل — لالۂ احمر ز روئے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش — از نگاہ شاں فرنگ اندر خروش
اصل شاں از خاک دامنگیر ماست
مطلع ایں اختراں کشمیر ماست

اقبال خود بھی کشمیری برہمن تھے، موتی لال اور جواہر لال نے ہندوستان کی آزادی کا علم بلند کیا تھا، اس لیے اس دعوی کی صداقت میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے،

اقبال کو دریائے کاویری جیحون و فرات سے زیادہ عزیز تھا،

رود کاویری یکے نرمک خرام — خستۂ شاید کہ از سیر دوام
در کہستاں عمرہا نالیدۂ — راہ خود را از مژہ کاویدۂ
اے مرا خوشتر ز جیحون و فرات — اے دکن را آب تو آب حیات

اتنی مثالیں قوم و وطن سے محبت کے ثبوت کے لیے کافی ہوں گی، لیکن ان کا نقطۂ نظر بہت وسیع تھا، اس کی نگاہ نسلی اور جغرافی قومیت اور وطنیت کے تنگ دائرے میں محدود نہ تھی، وہ پوری دنیا کو اپنا وطن اور ان کی بسنے والی قوموں کو اپنی قوم سمجھتے تھے، اور عالمگیر انسانی اخوت کے داعی تھے، اس پر انھوں نے مستقل نظمیں بھی کہی ہیں اور مختلف اشعار میں بھی اس کی تعلیم دی ہے،

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے — حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی نوری ہو کہ ناری ہو — لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

اس سے بڑھ کر انسانی اخوت کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے، اس لیے یہ اعتراض سراسر غلط ہے کہ وہ اسلامی اور فرقہ پرست شاعر تھے، اور ان میں آفاقیت نہ تھی، البتہ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے بہت سی نظمیں مسلمانوں کے لیے لکھی ہیں، اور ان میں انھی سے خطاب کیا ہے، لیکن اس سے ان کی آفاقیت اور حب وطن میں فرق نہیں آتا، ان نظموں میں بھی زندگی کے جو اصول اور قوموں کی موت و حیات اور ترقی و تنزل کا جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے وہ ساری قوموں کے لیے یکساں ہے، اس سے ہر قوم سبق حاصل کر سکتی ہے، ایسی نظمیں کم ہیں جو صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہوں اور دوسری قوموں کے لیے ان میں کوئی سبق نہ ہو، تاہم اس قسم کی نظموں سے انکار نہیں، اس مضمون میں بھی ان کو نقل کیا گیا ہے، اس کا سبب ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ گذشتہ صدیوں میں پوری دنیائے اسلام کی حالت نہایت ابتر تھی، اس کی بیشتر حکومتیں مغربی قوموں کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھیں، یا ان کے دام میں اسیر تھیں، ان کی سیاسی طاقت بالکل ختم ہو چکی تھی، سیاسی زوال کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی روح بھی مردہ ہو چکی تھی، اس لیے اگر اقبال نے خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح و تجدید کی طرف زیادہ توجہ کی تو کیا گناہ کیا، ان حالات میں دنیا کا ہر مصلح یہی کرتا ہے، گاندھی جی کا پیام محبت عالمگیر تھا، وہ پورے عالم انسانیت کے دوست تھے، اس کے باوجود اپنی قوم کو خصوصیت کے ساتھ اوپر اٹھانے کی کوشش کی، اور اس میں مذہبی روح بھی پیدا کی، بلکہ جو طبقے زیادہ پسماندہ تھے ان کی طرف زیادہ توجہ کی، اس لیے اپنے مذہب، ملت

کی ہوا خواہی نہ قومیت و وطنیت کے خلاف ہے اور نہ آفاقیت کے۔

جارحیت کی تعلیم کا اعتراض بھی اس پہلو کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں زندگی کی حرارت ختم ہو چکی تھی، ان کے قوائے عملی شل ہو چکے تھے، وہ زندگی کے حقائق سے غافل اپنے حال میں مست و مدہوش تھے، اُن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے اگر اقبال نے ان میں توانائی پیدا کرنے کی کوشش کی تو کوئی جرم نہیں کیا، اس کے بغیر ان کا وجود قائم نہیں رہ سکتا تھا، اس سلسلہ میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اقبال کی جس تعلیم کو جارحیت سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مغربی قوموں کے مقابلہ میں ہے، جنھوں نے مسلمانوں کی حکومتوں کو مٹایا تھا، اور ان کے مذہب و ملت اور تہذیب و ثقافت پر حملہ آور تھیں، اسلیے ان کا اصلی مقابلہ اُن ہی سے تھا، اس کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، اس سے اقبال کا پورا کلام معمور ہے، اوپر جو اشعار نقل کیے گئے ہیں وہ بھی اس پر شاہد ہیں، اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کیجا سکتی کہ انھوں نے مشرقی قوموں کے مقابلہ کے لیے طاقت کی تعلیم دی ہو، اور اب تو یہ مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ تمام مشرقی قوموں کا ہے، اس کے بغیر وہ مغربی قوموں کی جارحیت کا جواب نہیں دے سکتیں اور ان کا وجود قائم نہیں رہ سکتا، گو اب مشرق کا بڑا حصہ سیاسی حیثیت سے آزاد ہو چکا ہے لیکن اقتصادی و معاشی اور تہذیبی حیثیت سے اب بھی مغربی طاقتوں کا غلام ہے، ان کے پنجہ سے رہائی کے لیے حصول طاقت کی تعلیم درحقیقت مظلوم انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے، ظالم و جابر کا مقابلہ پیام محبت اور اخلاقی وعظ و پند سے نہیں ہو سکتا، اس قسم کے الفاظ ظاہر میں کتنے ہی خوشنما ہوں لیکن عملی دنیا کے لیے بیکار ہیں، ورنہ دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ کمزوری اور ناتوانی قوموں کے لیے پیام موت ہے۔

یہ غنی تقدیر کا فتویٰ ہے ازل سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

مگر اسی طرح بے قید قوت کا نشہ بھی دنیا کے امن و آشتی کے لیے خطرناک ہے، جس پر طاقتور قوموں کا عمل شاہد ہے، اس لیے اقبال نے اس کی مخالفت کی ہے۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک
تاریخِ امم کا یہ پیام ازلی ہے صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک

اس لیے وہ طاقت کو اخلاقی ضابطوں کا پابند بنانا چاہتے ہیں، چنانچہ ایک طرف انھوں نے مسلمانوں کو طاقت پیدا کرنے کی تعلیم دی ہے، دوسری طرف اخلاقی درس بھی دیا ہے،

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یعنی طاقت اور شجاعت کے ساتھ عدل و صداقت بھی ضروری ہے، اس وقت وہ دنیا کے لیے خیر بن سکتی ہے،

عالم انسانیت کے لیے اُن کا پیام سراسر امن و آشتی اور اخوت و محبت کا ہے،

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی اُخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے
بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے

درحقیقت جنگ و مقابلہ صلح و سالمت اور محبت و اخوت کے بارہ میں ان کی تعلیم بڑی متوازن اور عین فطرت کے مطابق ہے، اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا،

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

مصاف زندگی میں صورت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

قومیت اور وطنیت کے بارہ میں بھی اُنکے نقطہ نظر میں یہی اعتدال و توازن ہے، قوم و وطن کی محبت کے متعلق انکے جو اشعار اوپر نقل کیئے گئے ہیں ان سے انکے قومی اور وطنی جذبہ کا اندازہ ہو گیا ہو گا لیکن انھوں نے اس قومیت اور وطنیت کی ضرور مخالفت کی ہے جس کا مقصد محض اپنی قوم اور اپنے وطن کی برتری اور سربلندی ہو، جس کا لازمی نتیجہ کمزور قوموں کی پامالی ہے، ایک زمانہ میں اقبال یورپ کی نیشنلزم کے داعی تھے، لیکن پھر عالم انسانیت کیلئے اسکی ہلاکت آفرینی دیکھکر اس کے خلاف ہو گئے۔

یورپ کی نیشنلزم نے قومیت اور وطنیت کو پرستش کی حد تک پہنچا دیا ہے جس کا مقصد صرف اپنی قوم و وطن کی سربلندی اور دوسری قوموں پر اقتدار و تحکم ہے، اس پر مغربی قوموں کی پوری تاریخ شاہد ہے، اسی کی بدولت مشرقی قوموں کو صدیوں تک ان کا غلام رہنا پڑا، اور آج بھی بڑی قوموں میں جو کشمکش برپا ہے وہ اسی وطنی اور قومی فخر و غرور کا نتیجہ ہے جس نے دنیا کا امن و امان خطرے میں ڈال دیا ہے، اس کے نتائج دیکھکر خود مغرب کے مفکرین اس کے خلاف آواز بلند کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، اور وہ عالمگیر انسانی اخوت و محبت کی بنیاد پر ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتے ہیں،

اور اب تو نسلی اور جغرافی قومیت اور وطنیت سمٹ کر پرونشلزم کی شکل اختیار کر لی ہے اور ایک ہی ملک کے مختلف حصے اپنی جداگانہ اور مستقل حیثیت کے مدعی ہو رہے ہیں جس سے کوئی بڑا ملک متحد نہیں رہ سکتا

اقبال نے قومیت اور وطنیت کے اسی محدود تصور کی مخالفت کی ہے،

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اس پر ایشیا اور افریقہ میں مغربی قوموں کی سیاست کی پوری تاریخ گواہ ہے اور اب تو اس قومی اتحاد کے لیے خود ان قوموں میں کشمکش ہو رہی ہے، اس لیے اس بت کو توڑے بغیر انسانی وحدت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا،

اس کی خرابیوں کو دیکھ کر مولانا ابوالکلام جیسے قوم پرور کو یہ کہنا پڑا:

"یہ بات عجیب و غریب ہے کہ قومیت جو استبداد اور ملوکیت کے خلاف ایک محاذ کی حیثیت رکھتی تھی، آج خود اس پر جارحیت کا خول چڑھ چکا ہے، انیسویں صدی میں جو قومیت، حریت اور امن پسندی کا ایک مضبوط قلعہ تھی، آج انسانی ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکا رہی ہے، اس کے اثرات اتنے قوی ہیں کہ ہم عالمی اتحاد پر کامل یقین و اتحاد کے باوجود جب تک قومیت کے قیود سے آزاد اور اس کی سطح سے بلند و بالا نہ ہوں گے انسان کا مستقبل تاریک رہے گا۔"

رابندرناتھ ٹیگور بھی مغرب کی جارحانہ قومیت کے خلاف اور عالمگیر انسانی اخوت کے داعی تھے۔[1]

سیکولر نقطۂ نظر سے اقبال پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ مذہب کے داعی اور اسلام کے مبلغ تھے، یہ بھی کوئی جرم نہیں، ہر صاحب مذہب کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق ہے، اور اقبال کا یہ عقیدہ تھا کہ مادی تہذیب کی خرابیوں کی اصلاح مذہب ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے،

---

[1] انھوں نے ایک مستقل کتاب ہی نیشنلزم پر لکھی ہے جو تین مقالوں پر مشتمل ہے، "مغرب میں قومیت"، "جاپان میں قومیت" اور "ہندوستان میں قومیت"، ان میں ان ملکوں کی قومیت پر تفصیل سے نظر ڈالی ہے، تیسرے مقالہ میں جو امریکہ میں پڑھا گیا تھا، ہندوستان اور امریکہ والوں کو مغرب کی جارحانہ قومیت کے مفہوم سے ہوشیار اور ہندوستان کو اس کے خطرہ سے خبردار کیا تھا، اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔

اور انسانیت کی فلاح اسی پر منحصر ہے اس لیے مذہب کی دعوت انسانی فریضہ اور انسانیت کی خدمت ہے، خود گاندھی جی، ٹیگور، ڈاکٹر بھگوان داس، رادھا کرشنن اور دوسرے ہندو مفکرین کا عقیدہ بھی یہی تھا، اور وہ مذہب، اخلاق اور روحانیت کے بڑے داعی تھے، رادھا کرشنن تو ہندو مذہب کے بڑے شارح و ترجمان سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے ہندو مذہب میں نئی روح پھونکی، جب وہ معارف و حقائق پر گفتگو کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان عارف باللہ بول رہا ہو، اس لیے اگر اقبال نے مذہب یا اسلام کی دعوت دی تو کوئی جرم نہیں کیا،

اسلام کسی قوم و قبیلہ یا ملک و وطن کا مذہب نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مذہب ہے، اسکی دعوت عام ہے، وہ سارے عالم کے لیے رحمت ہے، اس کا خدا تنہا مسلمانوں کا خدا نہیں بلکہ رب العٰلمین ہے، اقبال نے اسی حیثیت سے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اگر اس دعوت میں جبر و اکراہ کی تلقین ہوتی تو البتہ قابلِ اعتراض ہوتا، جس کی کوئی مثال نہیں پیش کیجا سکتی، انھوں نے تو انسانی اخوت و محبت کی تعلیم دی ہے،

یہ بھی واضح کہ مطلق مذہب یا مذہب اسلام کی دعوت سے اقبال کا مقصد مشرقی قوموں خصوصاً مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے مفاسد سے بچانا تھا کسی مذہب کی مخالفت یا اسکا اقتدار مقصود نہ تھا جس پر ان کا پورا کلام شاہد ہے، انھوں نے پورے مشرق کو علم و حکمت، تہذیب و تمدن اور مذہب و اخلاق و روحانیت کا گہوارہ بتایا ہے، اور دنیا پر اسکے احسانات شمار کرائے ہیں، ہندوستان کے ہادیانِ دین اور بانیانِ مذاہب کا عقیدت سے ذکر کیا ہے، ان سے متعلق نظمیں اوپر نقل کیجا چکی ہیں، البتہ ان کا یہ عقیدہ ضرور تھا کہ اس دور میں اسلام ہی دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتا اور اس کی مشکلات کا حل نکال سکتا ہے، اور اسکے دلائل بھی دیے ہیں، یہ بھی قابلِ اعتراض نہیں، ہر مذہب

لو اس کا حق ہے کہ اپنے مذہب کو انسانی فلاح کیلیے دنیا کے سامنے پیش کرے، عیسائیوں نے اس کے باوجود کہ مذہب کو عملی زندگی سے الگ کر دیا ہے، انکے مبلغ ساری دنیا کو انسانیت کی فلاح کیلیے عیسائی مذہب کی دعوت دیتے پھرتے ہیں، بلکہ ہندو تک جنکا مذہب تبلیغی نہیں ہے ویدک کی دعوت دیتے ہیں

مذہب سے الگ اخلاق و روحانیت کا تصور بے معنی ہے، اس کا سب سے بڑا معلم مذہب ہی ہے، اس کے بغیر تنہا اخلاق و روحانیت کی تعلیم کافی نہیں ہے، آج فلسفۂ اخلاق کی کتابوں سے کتب خانے معمور ہیں، لیکن وہ کسی انسانی طبقہ کی اصلاح نہ کر سکیں، اور آج دنیا میں اس کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ سب مذہب ہی کا فیض ہے، جو لوگ مذہب کے نام سے بھڑکتے ہیں، ان سے سوال ہے کہ جب جمہوریت، کمیونزم اور سوشلزم کے مدعیوں کو انسانی فلاح کے نام سے اپنے نظاموں کو پیش کرنے کا حق ہے تو آخر پیروانِ مذاہب کو اس کا حق کیوں نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ مذہب کا غلط استعمال بھی کیا گیا ہے، اور اس کے نام پر اختلافات اور خونریزیاں بھی ہوئی ہیں، لیکن اس کا ذمہ دار مذہب نہیں، بلکہ وہ مدعیانِ مذاہب ہیں جو اپنے مقاصد کے لیے مذہب کا غلط استعمال کرتے ہیں، مذہب تو سراسر امن و آشتی کا پیام ہے، اگر ہر مذہب کے پیرو اپنے مذہب کی صحیح تعلیمات پر عمل کریں تو دنیا کے بہت سے فساد خود بخود مٹ جائیں، پھر مذہب کے نام پر جتنی خونریزیاں دنیا کی پوری تاریخ میں ہوئی ہیں، اس سے کہیں زیادہ موجودہ نظاموں کی ایک ایک جنگ میں ہو جاتی ہیں، ان کی سفاکیاں تو چنگیز و ہلاکو سے بھی بڑھ گئی ہیں، انکے پاس انسانی ہلاکت کے ایسے سامان کہاں تھے کہ چشم زدن میں بڑے بڑے شہروں کو خاک کا ڈھیر بنا دیں، مذہب کے نام پر اگر ایک طرف خونریزیاں ہوئی ہیں تو صحیح مذہب نے انسانیت کو سنوارا بھی ہے، اس کے اخلاقی و روحانی کارناموں سے کون انکار

کر سکتا ہے، اور آج دنیا میں اس کی جو روشنی نظر آتی ہے، وہ مذہب ہی کا طفیل ہے، اس کے مقابلہ میں موجودہ دور کی مادی تہذیب اور اس کے نظاموں نے انسانوں کی راحت و آسائش کے جتنے سامان فراہم کیے ہیں، اس سے کہیں زیادہ اس کی ہلاکت و بربادی کے اسباب مہیا کر دیے ہیں، اس نے انسانیت کو سب سے بڑا نقصان یہ پہنچایا ہے کہ اس کا دامن اخلاق و روحانیت سے بالکل خالی کر دیا، جو اسکا سب سے بڑا جوہر اور اسکی سب سے قیمتی متاع ہے، یہ حقائق اس قدر آشکارا ہیں کہ اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں اس لیے دنیا مادی حیثیت سے جتنی ترقی بھی کر جائے، اس کو مذہب ہی کے دامن پناہ مل سکتی ہے اگر انسانیت کو تباہی سے بچانا ہے تو ایک دن مذہب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

اقبال کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن ان سے انکی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہوسکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل لکھی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے ان کی اردو شاعری، پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، پھر انکی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت)، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔

(مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم) ضخامت ۴۰۰ صفحے، قیمت ہے رر (طبع "منیجر")

سیاست میں اسلام

(۳)

مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دارالمصنفین

مشرقی افریقہ

مشرقی افریقہ کے مسلمان جو کبھی حکمرانی کے درجہ پر فائز تھے، اب ان کو محض غلام طبقہ کہا جاسکتا ہے، لیکن یہ خطہ بہرحال مسلمانوں کا ہے اور ان کو وہیں رہنا ہے، ان کے جانے کی کوئی اور جگہ نہیں ہے، اگرچہ ان کے تعلقات دور دراز مسلم ممالک سے رہے ہیں، اور اب بھی قائم ہیں، یہاں مسلم فرقہ کو دو اہم مسئلوں کا سامنا ہے، ایک یہ کہ تیزی سے ترقی پذیر دنیا میں دوسری قوموں سے ہر محاذ پر مقابلہ کرکے اپنے لیے ایک بلند اور محفوظ پوزیشن بنانا (یہ مسئلہ صرف ان کا ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا ہے) دوسرا مسئلہ ان کی نجی نوعیت کا ہے یعنی موجودہ مشرقی افریقہ میں جو سیاسی سرگرمیوں کی آماجگاہ ہے، اور جہاں تیزی سے ترقی و انقلاب کی طرف قدم بڑھ رہا ہے مسلم عوام کا اپنے لیے نمایاں جگہ حاصل کرنا، یہ مسلم طبقہ افریقہ میں عرب اور اسلامی تہذیب کے پھیلنے سے وجود میں آیا ہے، وہاں اسلامی تہذیب کے پہلو بہ پہلو ایک غیرمذہبی اور ملحدانہ تہذیب بھی ہے، اس طرح یہاں کے مسلمان دو متضاد تہذیبوں (عرب مسلم اور دہریہ تہذیب) کے درمیان عبوری طبقہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں سے ایک تہذیب ان کو ان کے روحانی

اور آبائی مرکز عرب کی طرف کھینچتی ہے، اور دوسری افریقی قومیت میں ضم ہو جانے کی طرف مائل کرتی ہے، کیونکہ صدیوں سے یہ لوگ اسی تہذیب کے پروردہ ہیں، اور صرف گذشتہ صدی میں اسلامی تہذیب وہاں وجود میں آئی ہے،

مشرقی افریقہ کے مسلمان کئی نسلوں پر مشتمل ہیں، عرب نژاد ہیں یا افریقی النسل، یا دونوں سے مخلوط، یہ سب سنی العقیدہ مسلمان ہیں، ان کی زبان سواحلی ہے، یہ لوگ اپنے ملک کا ایک جزو لاینفک بن چکے ہیں، ایشیا کے سنی مسلمان عبادات میں تو ان سے مطابقت رکھتے ہیں لیکن سماجی طور پر ان میں کافی فرق پایا جاتا ہے، یہاں کے سنی مسلمان شیعوں کو مسلمان نہیں مانتے، ان کی جڑیں دوسرے ممالک تک پھیلی ہوئی ہیں، اور لسانی و قومی رشتہ سے وہ اب بھی ایشیا سے منسلک ہیں، ان مسلمانوں کو سواحلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا یہ بھی حقیقت ہے کہ ان مسلمانوں کا روحانی مرکز افریقہ کے باہر ہے، اور ان میں سے اکثر اپنے کو عرب کہتے ہیں، لیکن وہ اپنی معاشرت، زبان، شادی بیاہ، مختلف نظریات اور بیرونی حکمرانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہو کر ملکی معاشرت میں پوری طرح گھل مل گئے ہیں، اس اشتراک نے ان کا رشتہ افریقی ساحل (سواحل) سے مضبوط کر دیا ہے، اور انھوں نے افریقیوں کی ایک کثیر تعداد کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے، اس طرح یہ صحیح معنوں میں اس سرزمین کے فرزند کہے جا سکتے ہیں، ان کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں :-

۱- قدامت پرستی | مشرقی افریقہ کے مسلمان انتہائی روایت پرست ہیں، مثلاً کنزو- لمبا سفید قمیص نما بالائی لباس اور کفیہ (یعنی کشیدہ کاری کی ہوئی ٹوپی) پہنتے ہیں، جو کم تعلیم یافتہ طبقہ کا لباس ہے، مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ اس لباس کو مسجد اور مدرسہ جانے نیز مسلم تقریبات کے مواقع پر استعمال کرتا ہے، عورتیں اب بھی برقعہ کا استعمال کرتی ہیں،

اگرچہ اس سختی سے نہیں جیسے عرب عورتیں، مدرسوں اور مسلم اسکولوں میں نظام تعلیم بھی روایتی ہے، لڑکے زمین پر بیٹھتے ہیں اور پرانے طرز سے درس و تدریس ہوتی ہے، افریقی مسلمان ممباسا کے قدیم شہروں ٹنگانگو، غازی، ممبروئی اور لامو میں خاص طور سے آباد ہیں، ان کی معاشرت خالص اسلامی ہے، اور وہ ہر اس چیز کو ناپسند کرتے ہیں جس میں جدیدیت، مادیت، دہریت یا عیسائیت کا شائبہ بھی ہو،

۲۔ خود حفاظتی اور احتیاطی تدبیریں | یہاں کے مسلمان مشنری اسکولوں کو ہمیشہ سے تبدیلی مذہب کا آلۂ کار شمار کرتے رہے ہیں، اب یہی شبہہ گورنمنٹ اسکولوں پر بھی ہونے لگا ہے، مثلاً ممبروئی کے شہر میں جو مالندی کے شمال میں ساحل پر واقع ہے، مسلم عوام نے اپنے شیوخ کی ہدایت پر اپنے بچوں کو گورنمنٹ پرائمری اسکولوں میں بھیجنے سے انکار کر دیا اور انھیں مکتب میں بھیجنے پر مصر رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ اسکول میں مسلم بچوں کی تعداد پچیس سے زیادہ نہ ہو سکی اور اسکول بند کر دینا پڑا، اس شہر میں عظیم الشان مسجدیں اور مدرسے ہیں، اور مشرقی افریقہ میں اسلامی علوم کا یہ سب سے بڑا مرکز ہے،

اس شہر کے دروازے پر جلی حروف میں قرآن پاک کی یہ آیت تحریر ہے:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ	اور (اے پیغمبر) نہ تو یہودی تم سے کبھی رضامند ہوں گے
وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ	اور نہ نصاریٰ ہی، تاوقتیکہ تم ان ہی کے مذہب کی
قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى	پیروی نہ کرو (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہہ دو کہ اللہ
وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ	کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے، اور (اے پیغمبر) اگر تم
بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ	اس کے بعد کہ تمہارے پاس علم (قرآن) آچکا ہے ان کی
مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ	خواہشوں پر چلے تو پھر تم کو خدا کے غضب سے بچانے والا

شہر ممبروئی جنوبی عربی ساحل کا ایسا جزء معلوم ہوتا ہے جو مشرقی افریقہ میں جوڑ دیا گیا ہو، ان میں سے بہت سے لوگوں کی رشتہ داریاں حبان اور حضر موت میں ہیں، اب یہاں حالات تیزی سے بدل رہے ہیں، دیہی علاقوں کے عوام ساحلی شہروں میں کثیر تعداد میں آ رہے ہیں، ان میں زیادہ تر عیسائی ہیں، اور ممباسا اب نمایاں مسلم اکثریت والا شہر نہیں رہ گیا ہے، اور دیہاتی علاقوں میں بھی اسلام کا اب وہ اثر دکھائی نہیں دیتا جو گذشتہ نسلوں میں تھا، مسلمانوں کا قدیم زرعی نظام بھی اب بدل رہا ہے، گورنمنٹ کی پالیسی یہ ہے کہ قوانین حکومت میں یکسانیت پیدا کیجائے، اس سے قاضیوں کا زور بھی گھٹ گیا ہے، لیکن یہ بات اطمینان بخش ہے کہ یہاں کے مسلمان اپنی تہذیب پر ہر قسم کے حملے سے مدافعت کے لیے تیار رہتے ہیں، ۱۹۶۳ء میں جب صومالیہ کے وزیر اعظم نے ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے ان مظالم کا تذکرہ کیا جو مسلمانوں کو پڑوسی ملکوں میں عیسائیوں کے ہاتھوں سہنے پڑ رہے ہیں تو کینیا کے مسلمانوں نے فوراً ہی جواب دیا کہ ان پر کوئی تشدد نہیں ہو رہا ہے، اور وہ اپنے ملک میں خوش و خرم زندگی گذار رہے ہیں، اور صومالیہ کے وزیر اعظم سے درخواست کی کہ وہ سیاست کو مذہب سے ملوث نہ کریں۔

۳۔ جمود | مشرقی افریقہ کے مسلمان دینی امور میں کسی بھی تبدیلی کے شدید مخالف ہیں، وہ روزمرہ کی زندگی اور مذہبی معاملات میں بھی سخت روایت پسند ہیں، مذہبی شیوخ دینی علوم قدیم طرز سے پڑھاتے ہیں، مسجد میں استاذ شاگردوں کے سامنے زمین پر بیٹھتے ہیں، اور قرآن مجید کی تعلیم میں آیات قرآنی کی شرح سواحلی زبان میں کرتے ہیں، مشرقی افریقہ کے ایک ممتاز شیخ نے جو بڑے وسیع النظر اور جہاں گشت تھے، راقم سطور سے

بتایا کہ مشرقی افریقہ میں مسلم عوام کی دینی رہبری کے لیے کوئی مرکزی رہنما شخصیت نہیں ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے علوم دینیہ میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا ہے، مشرقی افریقہ کی یونیورسٹی کی کونسل برائے مذہبی امور میں صرف ایک مسلم ممبر تھا، وہ بھی دوسروں سے بالکل الگ تھلگ رہتا تھا، اور جس طرح مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک میں زندگی کے موجودہ تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے شریعت کی نئی نئی توضیحات کی جارہی ہیں، اس طرح کا کوئی اصلاحی قدم مشرقی افریقہ میں نہیں اٹھایا گیا، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ "مذہبی اصلاح" کا لفظ ہی انھیں ناپسند ہے، ان کے نزدیک اس اصلاح کا مطلب صرف یہ ہے کہ سیکولر نظریات کو فروغ حاصل ہو، گورنمنٹ اسکولوں میں جو مذہبی تعلیم دی جاتی ہے وہ بھی انھیں پسند نہیں، وہ ایسے مسلم ادارے چاہتے ہیں جن میں سیکولر مضامین کے قابل اساتذہ ہوں،

مشرقی افریقہ میں موجودہ رجحان سیکولر اسکولوں کی طرف ہے جس میں دینی علوم کے ماہرین الگ الگ مذاہب کی تعلیم دیتے ہیں، جو شیوخ یا اساتذہ روایتی خیالات سے انحراف کرنا چاہتے ہیں انھیں یہاں "نوآموز" کہا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی نوآموز اسلام اور عیسائیت کے ٹکراؤ کے مضمر خطرات کو بہتر طریقے پر سمجھتے ہیں، مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے، ان میں تبلیغی جذبہ پاکستانیوں اور احمدیہ فرقہ کے لوگوں نے خاص طور سے پیدا کیا ہے، راقم سطور کو پاکستان کی ایسی تبلیغی جماعتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، یہ گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں مسجدوں کو اپنا مرکز بنا کر تبلیغ کا کام انجام دیتی ہیں، قادیانیوں کی بڑی تعداد وہاں موجود ہے، ان کے سماجی اثرات ان کی تعداد کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں، اگرچہ عام طور سے انکو

کا فر خیال کیا جاتا ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس فرقہ کے وسائل نشر و تبلیغ مشرقی افریقہ کے مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ وہ باطل اور گمراہ مذاہب کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو کر آگے بڑھتے ہیں، دینی طبقہ پریس میں اپنے خیالات کا اظہار صرف شادی، طلاق یا مسلم عورتوں کے لباس سے متعلق مسائل میں کرتا ہے، ان مسائل کے پیدا ہونے پر اخبارات میں مراسلوں کا تانتا لگ جاتا ہے۔

۴۔ لسانی مسئلہ: اگرچہ مشرقی افریقہ کے مسلمانوں کا تعلق مغربی افریقہ کے مسلمانوں کے مقابلہ میں عرب سے قریب تر ہے، لیکن وہ عربی زبان نہیں بولتے، بلکہ سواحلی کا استعمال کرتے ہیں۔ سواحلی زبان میں عربی الفاظ کی بکثرت آمیزش ہو گئی ہے، جو لوگ سواحلی بولتے ہیں، ان کو قرآن پاک کو سواحلی شرح کے بغیر سمجھنا ناممکن ہوتا ہے، اس لیے واعظ اور امام جب مسجد، ریڈیو، یا عوامی جلسوں میں تقریر کرتے ہیں تو کلام پاک کا عربی میں ترجمہ کرتے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ مشرقی افریقہ میں مسلمانوں کے مذہبی درس میں گانے اور شاعری کا سہارا لیا جاتا ہے، ان نظموں کا موضوع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور شہید امام حسینؓ ہوتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے انتہا توصیف و تعریف کی جاتی ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ خداوند قدوس نے یہ سارا عالم اسی ذات بابرکات کی وجہ سے تخلیق کیا ہے، اس قسم کی نظموں کا ماخذ بوصیری[1] کا قصیدہ بردہ ہے، یہ قصائد

---

[1] مترجم: امام ابو عبد اللہ محمد بن سعید البوصیری ساتویں صدی ہجری کے مشاہیر فضلا میں تھے، یکم شوال ۶۰۸ھ کو مصر کے ایک مقام دلاص میں پیدا ہوئے، لیکن زیادہ قیام چونکہ بوصیر میں رہا اس لیے بجائے دلاصی کے بوصیری کی نسبت سے مشہور ہوئے، تیرہ ۱۳ سال کی عمر میں کلام پاک حفظ کیا

عوام میں حد درجہ مقبول ہیں، یہ عربی زبان میں ہوتے ہیں، اس کے باوجود اسکول کا ہر بچہ بآسانی اسے یاد کر لیتا ہے۔ ان نظموں میں اسلام کے ارکان، اس کی تاریخ، اور اخلاقیات سبھی کچھ ہوتا ہے، سواحلی زبان میں ان کے ترجمہ کے ذریعہ عوام کو دینی باتیں نہایت آسانی سے سکھائی جاتی ہیں، میلاد شریف ہر اسلامی مرکز میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کیا جاتا ہے، اس میں کثرت سے لوگ شریک

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴) اور حدیث و کلام وغیرہ علوم متداولہ میں دسترس بہم پہنچائی، ذریعہ معاش خطاطی اور کتابت تھا، مبدء فیض سے شاعری کا ملکہ لے کر آئے تھے، اور قصیدہ گو کی حیثیت سے عربی ادب کے مطلع شہرت پر مہر تاباں بن کر چمکے، تمام ناقدین ادب نے امام بوصیری کی قادر الکلامی کا بالاتفاق اعتراف کیا ہے۔

قصیدہ بردہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ایک طویل قصیدہ ہے، اس کے سبب تصنیف کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ امام بوصیری پر جب فالج کا حملہ ہوا تو انھوں نے شانِ رسالت میں یہ قصیدہ لکھکر اس کے وسیلہ سے اپنی شفا کی دعا کی تھی، چنانچہ خداوند قدوس نے تندرستی عطا فرمائی، یہ قصیدہ دس فصلوں میں منقسم ہے، اشعار کی مجموعی تعداد ۱۶۲ ہے، محققین نے ادبی محاسن (فصاحت، بلاغت، اور اسلوب بیان) کے ساتھ اس کی شفائیہ تاثیر کو تسلیم کیا ہے نکلسن نے لکھا ہے کہ "بردہ اپنے سادہ اور پرشکوہ اسلوب کی بدولت ہمیشہ کیف و سرور کے ساتھ پڑھا جائے گا" عربی ادب کے ماہر مولانا محمد ناظم صاحب ندوی رقمطراز ہیں "قصیدہ بردہ سوز عشق مضامین کی بلندی اور ادبی محاسن کی بدولت عربی نعت گوئی میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے"، اس قصیدہ کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ ساتویں صدی سے اب تک اس کی مختلف نوعیتوں کی ایک سو بیاسی ۱۸۲ شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ "نعیم"

ہوتے ہیں، اور ربیع الاول میں بہت سے لوگ خاص اسی مقصد (شرکت میلاد) کے لیے دور دراز کا سفر کرتے ہیں،

ساحل مسلم تہذیب کا مرکز | اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ مشرقی افریقہ میں مسلمان وہاں کی سماجی زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں، اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلمان اور ان کی تہذیب زیادہ تر سمندر کی ساحلی آبادیوں میں دیکھنے میں آتی ہے، اگر کسی کو ٹنگانکو یا کینیا ساحل کے مالندی شہر جانے کا اتفاق ہو تو اسے وہاں مسجدیں، مکاتب اور مسلم تہذیب کے دوسرے آثار دیکھنے میں آئیں گے، لیکن اندرون ملک ساحل سے سات آٹھ میل دور ممباسہ سے مالندی جانے والی سڑک پر کوئی بھی شخص کفیہ اور کنزو پہنے ہوئے دکھائی نہ دے گا، ان لوگوں کا اصلی وطن بحر ہند ہے، وہ اسی کے مقابل بسے ہوئے ہیں، اسکے دوسرے جانب ان کے آباء و اجداد کا وطن ہے، یہی سبب ہے کہ ان کے ناموں میں ایران و عرب کے پرانے ناموں مثلاً شیرازی، خزرجی اور کندی وغیرہ کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے، لیکن آج کے دور میں جبکہ اتحاد اور مشترکہ قومیت کی آواز ہر طرف بلند ہو رہی ہے، ان ناموں کی وجہ سے ان لوگوں کو شیر و شکر ہونے میں دشواری پیش آتی ہے دیکھنا یہ ہے کہ اس ملک کی نئی حکومتیں کہاں تک ان کو علٰحدگی پسندی کی اجازت دیتی ہیں، یہ رجحان ان کی تاریخ کا ایک جزو ہے، ساحل کی معاشیات پر انہی لوگوں کا تسلط ہے،

عربوں اور افریقیوں میں تفریق | مشرقی افریقہ کے مسلم عوام مخلوط النسل ہیں، حال ہی میں انکے اندر قومیت کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اس سے عربوں اور افریقیوں میں فرق ہو گیا ہے، میرے ایک عرب دوست نے بتلایا کہ یہ تفریق سیاستدانوں کی پیدا کردہ ہے، لیکن میرے خیال میں اس کا اصل سبب نسل کا اختلاط اور سماجی حالات ہیں، ہو سکتا ہے کہ

کسی حد تک سیاست کو بھی دخل ہو، افریقی مسلمان کو شکایت ہے کہ اگر عربوں کی ہدایت کے مطابق انھوں نے اپنے بچوں کو عیسائی مشنری اسکولوں میں نہ بھیجا تو ان کے بچوں کو صرف اپنی مزروعہ زمینوں پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا، مگر خود عرب اپنے بچوں کو اعلیٰ معیار کے عیسائی اسکولوں میں بھیجتے ہیں، اس لیے آزادی کے بعد عربی النسل مسلمان ترقی کے میدان میں افریقی مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے ہیں، یہ جذبہ انقلاب زنجبار کے دوران اپنے عروج پر پہنچ گیا ہے، کیونکہ اس انقلاب میں عمانی اور عبادی عرب اور خود ان کے سلطان اپنا اقتدار و اثر کھو بیٹھے، کینیا میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے، جس کے باعث "افریقی مسلم الیوسی ایشن" نام کی تنظیم وجود میں آگئی ہے، جو دوسرے اقدامات کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغاں کے شبینہ اسکول چلاتی ہے، ایک مسلم تعلیمی فنڈ بھی ہے، جس سے نادار بچوں کی فیس ادا کیجاتی ہے،

اپریل ۶۵ء میں عربوں اور افریقیوں کے درمیان یہ خلیج عید الاضحیٰ کے وقت پر ممباسا میں نہایت وسیع ہوگئی، اس مجمع میں ممباسا کے مسلمان میئر مسانیفو کومبو نے تقریر کرتے ہوئے ان مسلمانوں پر نکتہ چینی کی، جو کینیا کی ترقی میں اپنا کردار پوری طرح ادا نہیں کرتے، انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا بھی ذکر کیا، اور زور دیا کہ طلبہ ملک کے موجودہ حالات و مسائل سے واقفیت پیدا کریں، اور ان دولتمند مسلمانوں پر نکتہ چینی کی جو ہوائی جہاز کے ذریعہ حج کرنے جاتے ہیں، جبکہ کینیا کو خود سرمایہ کی سخت ضرورت ہے، انھوں نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ "جب تک آپ کے ملک کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے، آپ کا مکہ یہیں کینیا میں ہے، میئر کی یہ باتیں نہایت نیک نیتی سے کہی گئی تھیں، اور اس میں کسی سیاسی شرپسندی کو دخل نہیں تھا، لیکن ان کی

تقریر کو عام طور پر بہت ملامت بنایا گیا، اور ان پر اسلام کے ایک اہم ستون کو مسمار کرنے کی کوشش کا الزام لگایا گیا، لیکن میٹر اپنی بات پر مصر ہے، اور جب مخالفین کی شورش حد سے بڑھ گئی تو مسا نیفو کو مبو نے ہتک عزت کا دعوی عدالت میں دائر کر دیا، جس میں وہ کامیاب ہو گئے،

مندرجۂ بالا مثال افریقی مسلمانوں کے خیالات کی ترجمان ہے، یہ لوگ افریقہ کو ہر چیز کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں، ان کو اپنے ہم وطن لیڈروں مثلاً ڈیگو، گرپاان، کمبا اور کیکو یو میں عربی النسل مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ کشش نظر آتی ہے، مشرقی افریقہ کے اسلامی طبقہ میں یہ جذبہ شدید تر ہوتا جا رہا ہے، اس سے یہ اندیشہ ہے کہ اس خطہ میں ایسا اسلام نہ پیدا ہو جائے جو عرب سے لسانی اور ثقافتی تعلقات بالکل منقطع کر لے اور محض نام کا لگاؤ عرب کے ساتھ رہ جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جذبہ محض قبیلہ اور وطن پروری کا شاخسانہ ہو،

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا تعلق ساحلی علاقہ سے ہے، اندرون ملک بھی ایسے علاقے ہیں جہاں انیسویں صدی میں ہاتھی دانت اور غلاموں کی تجارت کے ذریعہ عرب اثرات پہنچے تھے، مثلاً طبورہ یا تنزانیہ میں کیگوما اور بہت سی دوسری جگہوں پر اسلامی اثرات مختلف ذرائع سے نوآبادیاتی دور میں پہنچے تھے، جن سے کینیہ اور یوگنڈا میں اسلام دور دور تک پھیلا اور تمام بڑے بڑے شہروں میں اسلامی فرقوں کو فروغ حاصل ہوا،

اندرون ملک کیلے اور دوسرے پھل دار درختوں کی کاشت کی شکل میں ا مسلمانوں کی جائدادیں ہیں، لیکن وہ خود کاشت نہیں کرتے، جانوروں کا ذبیحہ ا

مرغی پالنا ان کے مخصوص کام ہیں، اس کا انھیں معاوضہ بھی ملتا ہے۔ ساحلی علاقوں سے یوگنڈا اور مغربی کینیا میں عربوں کی آمد و رفت رہتی ہے، اور اب مسلمان ساحلی علاقوں سے بڑھ کر دور دراز کے خطوں میں بھی پھیلنے لگے ہیں، ان کی آبادی برابر بڑھ رہی ہے، اور مشرقی افریقہ اور باہر سے آئی ہوئی تبلیغی جماعتوں کے اثر سے اسلام کو فروغ ہو رہا ہے۔

سیاسی شیرازہ بندی کا وسیلہ مشرقی افریقہ کے مسلمانوں نے ملک کی ترقی میں نمایاں رول ادا کیا ہے، اور وہ نوآبادیاتی نظام اور افریقہ کے عوام کو قریب لانے کا وسیلہ بنے ہیں، وہ تین چار زبانیں بولتے ہیں، سواحلی، انگریزی، عربی اور اپنے قبیلہ کی زبان، اس سے یورپین افسروں کو عرب کے ساحلی حکمرانوں اور افریقیوں سے تعلقات قائم رکھنے میں بڑی مدد ملی ہے، مگر اب جبکہ بیرونی حکمراں (برطانیہ اور فرانس) اپنی نوآبادیوں سے جا چکے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ مشرقی افریقہ کی حکومتیں کس حد تک مسلمانوں کا احسان مانتی ہیں، افریقیوں سے ان مسلمانوں کے تعلقات صدیوں پرانے ہیں، اور خود ان کا تمدن اتنا بلند ہے کہ وہ یورپین طرز فکر کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اقلیتی طرز فکر مشرقی افریقہ میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے ہیں، عرصہ دراز تک تو وہ غیر اسلامی افریقی بر اعظم کے ساحلی علاقوں سے وابستہ رہے ہیں، جہاں انھیں سخت مخالفانہ عناصر کا مقابلہ کرنا پڑا، جب انیسویں صدی میں یورپین یہاں آئے ان مسلمانوں نے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کو ایک طاقتور حلیف پایا، اب ن خطہ میں ان کا کوئی دشمن تو نہیں ہے، لیکن عیسائیت سے اسلام کو شدید خطرہ ہے، حلی علاقوں میں دوسرے ملکوں سے تلاش معاش میں آنے والوں کی وجہ سے مسلمان

اب بھی اقلیت میں ہیں ۔

مشرقی افریقہ کے مسلمان اپنے مذہب کو اسلامی حکومت کے نظریہ سے قطع نظر ایک مقدس چیز شمار کرتے ہیں ، یہ چیز عالم اسلام میں کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی ، اس کا ثبوت ممباسا کے شیخ حیدر الکندی کی حال کی ایک تقریر سے ملتا ہے ، انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو خدا اور رسول کی اطاعت کے بعد ملک کی حکومت کا وفادار رہنا چاہیے خواہ حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی ، ان کے لیے اصل اور لازمی چیز اسلام پر ایمان ہے ، یہ چیز اسلام کو عیسائیت سے مشابہ کر دیتی ہے ، اس لیے ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ ان دو عظیم مذاہب یعنی اسلام اور عیسائیت میں اتحاد کی شکل نکل آئے جن میں ابتک محض مخالفت ہی کا جذبہ رہا ہے ، اس طرح دونوں میں صدیوں کی وسیع خلیج کو پر کرنے کا سہرا مشرقی افریقہ کے سر ہوگا ،

مشرقی افریقہ سیاسی تحریکوں کی آماجگاہ ہے ، یوگنڈا ، کینیا اور تنزانیہ کی حکومتوں نے آزادی کے بعد ہی فیڈریشن بنانے کی تحریک چلائی تھی ، لیکن اب وہ ایک دوسرے سے بہت دور ہو چکے ہیں ، اور زنجبار میں انقلاب بھی ہو چکا ہے ، تنزانیہ کی حکومت ڈکٹیٹرشپ کی راہ پر گامزن ہے ، یوگنڈا میں بھی مخالف گروہوں کے درمیان کسی وقت بھی اقتدار کی جنگ شروع ہو سکتی ہے ان تینوں ملکوں میں کینیا سب سے ترقی یافتہ ہے ، لیکن وہاں بھی دو پارٹیوں کی جمہوریت اب ایک پارٹی میں بدل چکی ہے ، مگر اب پھر دو پارٹیوں کے بننے کے امکانات نظر آرہے ہیں ، لیکن یہ دونوں پارٹیاں ابتدائی "کانو" اور "کاڈو" جماعتوں سے مختلف نظر آتی ہیں ۔

لیکن کیا ان تمام سیاسی انقلابات کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ ہے؟ یقیناً نہیں مشرقی افریقہ کا ایک عام شہری اپنے سیاسی عقائد میں اپنے مذہب، معاشیات اور سیاسی اصولوں سے زیادہ اپنے قبیلہ اور علاقے سے متاثر ہوتا ہے، یہ طرز فکر عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں میں مشترک ہے۔ اس کا ثبوت استعفاء، تقرری اور سیاسی جماعتوں سے وفاداری میں مسلسل تبدیلی سے ملتا ہے، جب سیاست کا نام آتا ہے تو مشرقی افریقہ کا ہر فرد عیسائی یا مسلمان ہونے کے بجائے کسی مخصوص قبیلہ کا ترجمان بننے کو ترجیح دیتا ہے۔

(جیمس ایم رٹے)

مسند ابن حنبل
کی
محققانہ شرح

مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی پندرہ سال سے مسند احمد بن حنبل کی شرح میں مصروف تھے، اس کا پہلا حصہ جو حضرت ابوبکرؓ کی احادیث کی شرح پر مشتمل ہے "نہایۃ التحقیق فی شرح مسند ابی بکر الصدیق" کے نام سے چھپکر شائع ہو گیا ہے، اس کے آغاز میں اصول حدیث پر ایک محققانہ رسالہ بھی ہے،

قیمت مجلد پندرہ ۱۵ روپئے۔ حسب ذیل پتہ سے ملے گی:-

(۱) مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

(۲) منشی شبیر حسن صاحب پوسٹ ماسٹر، موضع رائے دھنہ براہِ کھتولی (میرٹھ)

چند قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح

(استدراک)

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب سابق پروفیسر شعبۂ عربی پنجاب یونیورسٹی

(۳)

آمین۔ آمین کا لفظ اس لحاظ سے نہایت دلچسپ اور اہم کلمہ ہے کہ وہ یہود، نصاریٰ اور اہلِ اسلام تینوں ملتوں کے ہاں عبادت الٰہی میں دعا کے موقع پر استعمال ہوتا ہے،

آمین عبرانی لفظ ہے، جو سب سے پہلے یہودیوں کے مذہبی نوشتوں میں پایا گیا ہے، اور ان کی عبادت گاہوں میں دعا کے موقع پر اب بھی استعمال ہوتا ہے،

آمین کا بنیادی مفہوم دعا، یا قول کو مؤکد کرنا ہے۔ یعنی قائل کہتا ہے کہ "خدا کرے کہ ایسا ہی ہو"۔

انجیل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آمین کا لفظ حضرت عیسیٰؑ نے بھی کئی بار استعمال کیا تھا، اور وہ اسے اپنے اقوال اور مواعظ کو مؤکد کرنے کے لیے کام میں لاتے تھے، کلیسا نے اس دستور کو اب تک جاری رکھا ہے، جب کبھی پادری کوئی دعا مانگتا ہے تو حاضرین اس پر آمین کہتے ہیں،

قاضی خفاجی (مؤلف شفاء العلیل) اور دیگر لغت نویسوں نے آمین کے عربی

یا غیر ہونے پر بحث کی ہے۔ اگر یہ علماء یہود اور نصاریٰ کی مذہبی کتابوں کی طرف رجوع فرماتے جہاں آمین کا لفظ بہت پہلے استعمال ہو چکا ہے تو انھیں اس بحث کی ضرورت پیش نہ آتی۔

اہل اسلام کے ہاں بھی آمین کا لفظ تقریباً ان ہی معنوں میں مستعمل ہے جنھیں یہود و نصاریٰ استعمال کرتے ہیں، اور آمین کا لفظ خاص کر سورۂ فاتحہ کی تلاوت یا قرأت کے بعد آہستہ یا پکار کر کہا جاتا ہے۔

روم۔ الروم ۔ قرآن مجید کی سورۃ الروم میں "الرُّوم" کا جو لفظ آیا ہے، اس سے وہ رومی قوم مراد ہے جس کا نام اس کی سلطنت کے پایۂ تخت روما (Roma) سے مشتق ہے، روما کا شہر اب بھی اٹلی کا دارالحکومت ہے، جسے انگریزی میں Rome لکھتے ہیں۔

رومی قوم کا شمار قدیم زمانے کی مشہور اقوام میں ہوتا ہے، اور ان کی ایک موثق اور مدون تاریخ ہے، ان کی حکومت و سلطنت کی ابتدا اٹلی کے ملک سے ہوئی تھی لیکن رومی سلطنت نے بڑھتے بڑھتے یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے ظہور کے وقت فلسطین اور شام کے ملک رومیوں ہی کے زیر نگیں تھے۔

آگسٹس (۶۳ قبل مسیح تا ۱۴ء) رومی سلطنت کا پہلا حکمران تھا جو ایمپرر (Imperati) کہلایا، آگسٹس (Augustus) اور اس کے جانشینوں نے یکے بعد دیگرے قیصر (Caesar) کا لفظ اختیار کیا، یہاں تک کہ "قیصر" رومی فرمانرواؤں کا خصوصی لقب بن گیا، عرب مورخین نے رومی حکمرانوں کو قیصر ہی کے نام سے یاد کیا ہے، اور اپنے قواعد کے مطابق اس کی جمع قیاصرہ بنالی ہے۔

یہ امر ذہن نشین رہے کہ لاطینی میں حرف C کا تلفظ کاف سے کرتے تھے، اسلیے عربی کا قیصر لاطینی Caesar کے تلفظ کو صحیح طور پر ادا کرتا ہے، ہمارے یہاں انگریزوں کی پیروی میں Caesar کا تلفظ سیزر کرتے ہیں، جو اصل سے بہت دور ہو گیا ہے،

عیسوی دین فلسطین سے نکل کر آس پاس کے ملکوں میں رفتہ رفتہ پھیلتا گیا، یہاں تک کہ اطالیہ میں بھی پہنچ گیا، اور قیصر قسطنطین (Constantine) نے اسے قبول کر لیا، اس نے بزنطیم کو اپنا دارالحکومت بنایا، جو اس کے نام پر قسطنطنیہ کہلایا، ۳۹۵ء میں رومی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، ایک مغربی حصہ جس کا پایہ تخت روما تھا، اور دوسرا مشرقی حصہ جس کو "مشرقی رومی سلطنت" (Eastern Roman Empire) کہتے ہیں اور جس کا مستقر قسطنطنیہ تھا، مورخوں نے اسے "بزنطینی سلطنت" (Byzantine Empire) بھی کہا ہے، ظہور اسلام کے بعد عربوں کو جس رومی سلطنت سے سابقہ پڑا وہ یہی مشرقی رومی سلطنت تھی، جس میں ایشیائے کوچک، شام، فلسطین اور مصر کے ملک داخل تھے،

مشرقی رومی سلطنت اور ایرانی مملکت کے درمیان اکثر جنگ و جدال کا بازار گرم رہتا تھا، کبھی ایک فریق غالب آتا اور کبھی دوسرا، سورۂ روم میں فریقین کی اسی کشمکش کی طرف اشارہ ہے،

جن ملکوں میں رومی سلطنت قائم تھی، عربوں نے انھیں "بلاد الروم" کہا ہے، ایشیائے کوچک کو بلاد الروم میں مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس لیے روم کا لفظ اس پر ایسا چسپاں ہوا کہ وہاں کی ہر ایک چیز رومی کہلانے لگی، مثلاً سلاجقہ کی جو شاخ ایشیائے کوچک پر حکمراں تھی، اسے مورخوں نے "سلاجقۂ روم" کہا ہے، مولانا جلال الدین اس وجہ سے

رومی کہلائے کہ وہ اہل روم کے شہروں میں رہتے تھے، عثمانی خاندان کے سلاطین کو اسلیے "سلطان روم" کہتے تھے کہ وہ قدیم رومی علاقوں کے مالک تھے،

جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے، عربی زبان کے اکثر الفاظ سہ حرفی مادوں مشتق ہیں، یہ قاعدہ اُن اسمار میں بھی جاری ہے جو عربوں کے ہاں مختلف قوموں کے لیے مروج ہیں، مثلاً عرب، عجم، فُرس، تُرک، تتر (تاتاری)، خزر، حبش، زنج (زنگی)، قبط، روس، مجر ([illegible] یعنی ہنگیرین)۔ یہ سب نام ثلاثی ہیں، روم کو بھی اسی فہرست میں شامل کر لیجیے،

سِجِّیل - سجیل کے معنی ہیں کھنگر یعنی مٹی کا ڈھیلا جو منجمد ہو کر پتھر کی طرح سخت ہو جائے۔

سجیل کا لفظ قرآن مجید میں تین مرتبہ استعمال ہوا ہے، سورۂ ہود میں ہے:

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ — اور ہم نے اس (بستی) پر پتھر کے کھنگر برسائے

سورۃ الحجر میں ہے: وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ۔ اور سورۃ الفیل میں ہے

تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ — ابابیل ان پر (یعنی اصحاب فیل پر) پتھر کے کھنگر برسا رہے تھے۔

سورہ الذاریات میں جہاں گذشتہ انبیار کا ذکر ہے وہاں ایک آیت میں ہے:

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِينٍ — یعنی ہم ان پر مٹی کے پتھر یعنی سنگریزے برسائیں گے۔

یہاں حجارہ کے ساتھ طین یعنی مٹی کا جو ذکر آیا ہے، اس سے بھی "حجارۃً من سجیل

کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے، اور ان کے معنی کی وضاحت ہوتی ہے۔

علماء لغت اور اکثر مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اپنے اصل کے لحاظ سے سجیل عجمی کلمہ ہے، اور سنگ گل کا معرب ہے، سنگ کے معنی پتھر اور گل کے معنی مٹی کے ہیں، چنانچہ ابن قتیبہ، جوالیقی، راغب اصفہانی اور قاضی خفاجی اور مفسرین میں سے قاضی بیضاوی اور امام سیوطی کی یہی رائے ہے کہ سجیل ایک فارسی لفظ کا معرب ہے، امام طبری اور قاضی بیضاوی نے اس بارے میں چند اور اقوال بھی نقل کیے ہیں لیکن وہ چنداں درخور اعتناء نہیں۔

مجاہد بھی اس کے قائل تھے کہ سجیل کا لفظ فارسی الاصل ہے، امام سیوطی نے اتقان میں اُن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سجیل بالفارسیة اولها حجارة وآخرها طين۔

قلم - قلم کا لفظ قرآن مجید میں دو مرتبہ بصورت مفرد اور دو مرتبہ بصورت جمع (اقلام) استعمال ہوا ہے،

قلم لکھنے کا وہ آلہ ہے جسے نَے یا نیزہ کو تراش کر تحریر کے کام میں لاتے ہیں، جمع اس کی اقلام آتی ہے، قلم کے چند مشتق کیے گئے ہیں، مثلاً قُلامہ وہ تراشہ ہے جو قلم بنانے میں نکلتا ہے، اور مِقْلَمہ قلمدان کو کہتے ہیں۔

قلم کے اصلی لغوی معنے نَے یا نیزہ کے ہیں، جسے پنجابی میں "کانا" اور انگریزی میں Reed کہتے ہیں، قاموس میں ہے کہ القلمُ الیراعةُ یعنی قلم کے معنے نیزہ کے ہیں، دوسرے معنے بعد میں پیدا ہوئے،

قلم کا لفظ بعض اوقات رسم الخط کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، ابن الندیم نے الفہرست کے ابتدائی باب میں جہاں مختلف قوموں کے خطوط (Scripts) کا ذکر کیا:

وہاں قلم کو لفظ رسم الخط کے ہم استعمال کیا ہے، چنانچہ عبری کے خط کو القلم العبری اور سریانی رسم الخط کو القلم السریانی لکھا ہے،

قلم کا لفظ عربی کے علاوہ دوسری سامی زبانوں مثلاً آرامی، سُریانی اور حبشی میں بھی پایا جاتا ہے، اور فارسی، ترکی، اردو اور پشتو میں بھی اسی معنے میں مستعمل ہے، غالباً عربی ہی سے اخذ کیا گیا ہے،

قلم کا لفظ یونانی اور لاطینی زبانوں میں بھی موجود ہے۔ یونانی میں اُسے Kalamos اور لاطینی میں Calamus کہتے ہیں، یہ واضح رہے کہ یونانی لفظ کے آخر میں جو os ہے وہ حالتِ رفعی (nominative case) کی علامت ہے

قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ لفظ لاطینی میں یونانی کے ذریعہ آیا ہوگا، کیونکہ رومیوں نے اپنے اکثر علوم یونانیوں سے حاصل کیے تھے، یونانی ان سے بلحاظ زمانہ اقدم تھے، اور علمی لحاظ سے اُن پر فوقیت رکھتے تھے،

قلم کا لفظ سنسکرت میں بھی پایا جاتا ہے، اور اس کا املاء رومن حروف میں بصورت Kalamas کر سکتے ہیں، اور اس کے معنے بھی وہی ہیں جو عربی اور دیگر زبانوں میں ہیں، یعنی

(۱) نے یا نیزہ Reed

(۲) لکھنے کا آلہ جو نے سے بنایا جاتا ہے۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلم کا لفظ بہت سی سامی اور آریائی زبانوں کا مشترک لفظ ہے، اتنی کثیر اور اہم علمی زبانوں میں اس لفظ کا پایا جانا قابلِ غور امر ہے، یہ محض توارد یا توافق نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا فیصلہ

ل ہے کہ اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے کس قوم یا ملک کی زبان میں ہوا اور
، قوموں کی زبانوں میں کب اور کیسے پھیلا، مغربی علما، کا قول ہے کہ یہ کی
ٰ نانی ہے لیکن یہ قول مزید تحقیق اور تصدیق کا محتاج ہے۔

یدا و قلم| قلم کے لیے یہ بات کیا کم باعثِ شرف ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلی وحی
تعمال ہوا، جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر غار حرا میں نازل ہوئی تھی،
ارشاد ہوا:۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ	(اے نبی) پڑھو ساتھ نام اس پروردگار
خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ	کے جس نے (تمام کائنات) کو پیدا کیا،
اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي	اور انسان کو خون بستہ سے بنایا، پڑھو اور
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ	جان لے کہ تیرا پروردگار بڑا بزرگ ہے
مَا لَمْ يَعْلَمْ	جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا،
	اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

قمیص ۔ قمیص کے معنے ہیں کرتہ یا پیراہن ۔

قمیص کا لفظ قرآن مجید میں چار مرتبہ آیا ہے، اور صرف حضرت یوسفؑ کے قصہ میں
ہوا ہے، چنانچہ سورۂ یوسف میں ہے کہ

اِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ ۝	اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو،
وَاِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ ۝	اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو،

حدیث نبوی میں بھی ایک دو مرتبہ آیا ہے، مثلاً ایک روایت ہے کہ

اَنَّهُ قَالَ لِعُثْمَانَ اِنَّ اللّٰهَ سَيُقَمِّصُكَ	یعنی رسول خدا (صلعم) نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا کہ

قمیصاً وانك تلا فمن على خلعه ... اللہ تجھ کو عنقریب ایک کرتا یعنی خلافت
فإياك وخلعه ... کا جامہ، پہنائے گا۔ اور لوگ چاہیں گے
کہ تو اسے اتار دے لیکن اسے ہرگز نہ اتارنا۔"

ابو الولید ازرقی کی تالیف "اخبار مکہ" کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ "قمیص الکعبہ" کا لفظ خانہ کعبہ کے غلاف کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

علمائے لغت نے قمیص کو عربی قرار دیا ہے، چنانچہ جوالیقی، سیوطی اور خفاجی نے اسے معرب الفاظ میں شمار نہیں کیا ہے، یعنی یہ لفظ ان کے نزدیک خالص عربی ہے، راغب اصفہانی (مفردات القرآن) اور ابو السعادات ابن الاثیر جزری (صاحب النہایہ) نے بھی اس لفظ کے اشتقاق سے بحث نہیں کی ہے۔

لیکن مغربی محققین کی رائے ہے کہ قمیص کا لفظ لاطینی کلمہ Camisia سے ماخوذ ہے جس کے معنے "سوتی کرتہ" ہیں، اور یہ لاطینی لفظ شام میں ان رومی تاجروں کے ذریعے سے رائج ہوا تھا، جو پانچویں صدی عیسوی میں شام کے مختلف شہروں میں آباد ہوتے تھے، اور اس کے بعد عربوں نے یہ لفظ اہل شام سے اخذ کیا۔

فرانسیسی لفظ شمیز (Chemise) بھی اسی لاطینی کلمہ سے ماخوذ ہے، شمیز وہ ہلکا سا سوتی یا ریشمی جامہ ہے جو خواتین کپڑوں کے نیچے بنیان کے طور پر پہنتی ہیں، اسلیے قمیص اور شمیز کی اصل ایک ہے لیکن یہ لفظ ہمارے ہاں دو مختلف راستوں سے آئے ہیں، اسلیے انکا مفہوم بھی ایک دوسرے سے جدا ہے، ہمارا مطلب ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہے۔

Late Latin : Camisia

French : Chemise	Arabic : قمیص
Urdu : شمیز	Urdu : قمیص

عربوں کا پیراہن یعنی ثوب ٹخنوں تک ہوتا ہے، اس کے برخلاف قدیم مصریوں کا پیراہن صرف گھٹنوں تک ہوتا تھا، اس لیے قرآن حکیم نے اس موقع پر ثوب کی بجائے قمیص کا جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ بلا وجہ نہیں ہے، اس کے استعمال میں مقامی حالات کی رعایت رکھی گئی ہے، اسی طرح سورۂ یوسف میں بھی چند ایسے الفاظ آئے ہیں جن میں مصر کے مخصوص حالات کی رعایت پائی جاتی ہے، اور جن پر انشاء اللہ آیندہ کبھی روشنی ڈالی جائے گی۔

نصاریٰ۔ نصاریٰ سے مراد یسوع ناصری کے پیرو یعنی عیسائی یا مسیحی ہیں، نصاریٰ کا لفظ اس معنے میں قرآن مجید میں چودہ[۱۴] مرتبہ آیا ہے، اور سورۂ آل عمران میں ایک مرتبہ بصیغۂ واحد یعنی نصرانی کی صورت میں بھی استعمال ہوا ہے، حدیث اور فقہ کی کتابوں میں بھی عیسائیوں کے لیے نصاریٰ ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، ہم لفظ ناصری کی تشریح میں بیان کر چکے ہیں کہ چونکہ حضرت عیسیٰؑ کا خاندان مصر سے واپسی کے بعد ناصرہ (Nazareth) کے قریہ میں مقیم ہوا تھا، اور آپ نے تبلیغ کے لیے یہیں سے ظہور فرمایا تھا، اسی لیے وہ اپنے معاصرین میں یسوع ناصری (Jesus of Nazareth) کہلائے، چنانچہ انجیل میں کئی مرتبہ اسی نام سے آپ کا ذکر آیا ہے،

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں ناصرہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ

من الناصرة اشتق اسم النصاریٰ — یعنی نصاریٰ کا نام ناصرہ سے مشتق ہے۔

ہماری رائے میں نصاریٰ کے اشتقاق کے بارے میں یہی قول راجح ہے، راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں بعض لوگوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عیسائیوں

کو نصاریٰ اسلیے کہا گیا ہے کہ انھوں نے نحن انصار اللہ کا نعرہ لگایا تھا جیسا کہ قرآن پاک میں مذکور ہے لیکن راقم الحروف کی رائے میں یہ قول اس وجہ سے ضعیف اور ناقابل قبول ہے کہ نصاریٰ اور انصار اپنی اپنی جگہ جمع کے دو الگ مستقل صیغے ہیں۔ نصاریٰ فعالیٰ کے وزن پر ہے اور انصار افعال کے وزن پر، اس لیے ایک کا دوسرے سے مشتق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،

ہم سطور بالا میں اس بات کی طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ اشتقاق کے لحاظ سے نصاریٰ کا تعلق ناصرہ یا ناصری سے ہے، میرے نزدیک اس لفظ کی ترکیب اس طرح واقع ہوئی ہو کہ ناصرہ اور ناصری دونوں کے حروف اصلیہ تین ہیں یعنی نصر، عربوں نے انہی تین حرف کو لیکر اسکے فعالیٰ کے وزن پر جمع کا صیغہ نصاریٰ بنا لیا،

یَم - یم کا لفظ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں سمندر کے معنی میں سات مرتبہ آیا ہے، اور صرف حضرت موسیٰ اور فرعونِ مصر کے قصہ کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے،

سورۃ القصص میں ہے کہ

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اسے دودھ پلا اور جب تجھے اس کی جان کا خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا۔

پھر آگے چل کر فرمایا

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ

پس ہم نے اس پر (یعنی فرعون پر) اور اسکے لشکروں پر گرفت کی اور انکو سمندر میں پھینک دیا۔

سورۃ الاعراف میں ہے کہ

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ

پس ہم نے ان سے انتقام لیا اور انکو سمندر میں غرق کر دیا۔

یَم کی طرح یَمّ کا لفظ بھی عربی اور قدیم مصری زبان میں مشترک ہے یعنی مصری زبان میں بھی یم کا لفظ سمندر کے معنے میں پایا جاتا ہے، عصر حاضر کے محققین کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی زبان میں مستعار لیا گیا ہے،

قبطی میں بھی جو قدیم مصری زبان کی موجودہ صورت ہے، یم کا لفظ بدستور مستعمل ہے، لیکن اس کی میم مشدد نہیں، غالباً قدیم مصری میں بھی مشدد نہ تھی۔

عرب علماء کا ابتدا ہی سے یہ خیال ہے کہ یم کا لفظ غیر عربی ہے، امام سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں کہ ابن قتیبہ نے یم کو سریانی بتایا ہے، اور الجوالیقی نے بھی اسے سریانی کہا ہے، لیکن شیدلہ کا قول ہے کہ قبطی ہے، اور یہی قول قرینِ صحت ہے،

یہ امر قابل غور ہے کہ یم کا لفظ قرآن پاک میں صرف حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے قصہ میں آیا ہے، اور اس سلسلہ میں کبھی دریائے نیل اور کبھی سمندر کے لیے استعمال ہوا ہے، ورنہ باقی مقامات میں سمندر کے لیے بالعموم بحر کا لفظ آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن حکیم نے مصر کے واقعات کے بیان میں وہاں کے مقامی الفاظ کے استعمال کو ملحوظ رکھا ہے۔

قرآنی اشارے اور علم الارض

از جناب بدیع الزماں صاحب اعظمی

دنیا کے سارے مذاہب اس امر پر متفق ہیں کہ صحیفۂ قدرت خدا کا فعل ہے، اور الہامی کتب خدا کے اقوال کا مجموعہ، جب یہ ایک حقیقت ہے تو ممکن نہیں کہ خدا کے قول اور فعل میں مطابقت نہ ہو۔ قرآن کریم نہ صرف ہمارے لیے نور ہدایت ہے، بلکہ اس نے صحیفۂ قدرت کے رموز اشاروں میں بیان کرکے ہمارے لیے تحقیقات کی راہیں بھی کھول دی ہیں، اس نے کہیں کہیں تاریخ عالم کے کسی واقعہ کی طرف لطیف اشارہ کرکے کسی اہم بات کی تشریح بھی کی ہے۔ مثلاً حضرت سلیمانؑ اور بلقیس (ملکۂ سبا) کا قصہ بیان کرنے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ حضرت سلیمانؑ اسے یقین دلانا چاہتے تھے کہ جن اجرام فلکی کی خوبصورتی اور بے پناہ تابندگی کے آگے وہ سربسجود ہوتی ہے ان کے پیچھے قادر مطلق کا ایک زبردست ہاتھ ہے، جو کام کر رہا ہے۔ چنانچہ جس وقت ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے بلوری محل میں داخل ہوئی تو فرش پر بہتا ہوا پانی دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئی۔ تو حضرت سلیمانؑ نے فرمایا کہ چلی آؤ، یہ پانی نہیں ہے، یہ تو شیشے کا فرش ہے، پانی تو اس کے نیچے بہ رہا ہے۔ تم نے شیشے کو پانی سمجھ لیا، تم کو دھوکا ہوا، ملکہ اس اشارے کی تہ تک پہنچ گئی۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ جس طرح شیشہ پانی نہیں ہے، اسی طرح اس کا معبود چمکتا ہوا سورج نہیں ہے، بلکہ وہ قادر مطلق ہے جو مجسم نور ہے، اور سورج کو نور بخش رہا ہے۔

خدائے جل شانہ نے اپنی کتاب قرآن حکیم میں کائنات اور اسکی مختلف اشیا کے بارے میں جو بھی اشارے کیے ہیں اُن کی صداقت مسلّم ہے، مثلاً پہاڑوں کے متعلق یہ ارشاد کہ

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا
کیا ہم نے زمین کو گہوارہ اور پہاڑوں کو میخ نہیں بنایا۔

یا شق القمر کے متعلق یوں ارشاد فرمایا

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ
قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا)

آیئے ان اشاروں کی صداقت کا جائزہ علم الارض کی روشنی میں لیں۔

ہم جانتے ہیں کہ کرۂ ارض نظام شمسی کے سیارگان میں ایک اہم سیارہ ہے، دنیا کے سائنسداں اور ماہر علم طبقات الارض اس امر پر متفق ہیں کہ نظام شمسی کے ۹ عدد سیاروں کا جنم آج سے تقریباً چھ ارب برس قبل ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک بہت بڑا ستارہ ہمارے سورج کے قریب سے گذرا۔ اس نے اپنی قوت کشش سے سورج سے کچھ مادہ اپنی طرف کھینچ لیا۔ چونکہ وہ ستارہ بہت تیزی سے آگے نکل گیا لہٰذا وہ خارج شدہ مادہ سورج کی کشش سے دور نہ جاسکا اور سورج کا طواف کرنے لگا۔ اسی اثنا میں وہ ۹ حصوں میں منتشر ہوگیا جنھوں نے ۹ عدد سیاروں کی شکل اختیار کرلی۔ خدانخواستہ اگر وہ ستارہ سورج سے ٹکرا گیا ہوتا تو پھر نظام شمسی کی تشکیل ہی نہ ہو پاتی۔ مگر یہ تو قدرت کے سوچے سمجھے پلان کے تحت ہوا۔ جب قدرت چاہے گی کہ اجرام فلکی آپس میں ٹکرا جائیں تو پھر وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر قیامت برپا کردیں گے۔

کرۂ ارض اور سحابیہ (سورج) سے جدا ہونے کے بعد خود دہکتے ہوئے گیس کا ایک گولہ تھا۔ اس عالم میں اس نے اپنی ابتدائی عمر کے کروڑوں برس بسر کیے۔ اسی اثنا میں اس کے

بطن سے ہمارے چاند کا جنم ہوا، مگر اب یہ نظریہ دم توڑتا نظر آرہا ہے، اس واسطے کہ ہمارے بہادر خلا نوردوں کی ٹیم اپنے ہمراہ چاند کی مٹی اور چٹانوں کے جو نمونے لائی ہے، ان کے اجزائے ترکیبی کی جانچ کرنے کے بعد یہ مفروضہ قایم کیا جارہا ہے کہ کرۂ ارض اور چاند دونوں کا جنم ایک ہی سانحہ ہوا ہوگا، اور ان کی عمریں لگ بھگ ساڑھے چار ارب برس ہوں گی، بہرحال اصلیت جو بھی ہو، کہنا یہ ہے کہ سیالی حالت میں رہتے ہوئے اور سورج کا طواف کرتے ہوئے کرۂ ارض کی بیرونی سطح ٹھنڈی ہوکر ٹھوس ہوتی گئی، بالآخر آج سے تقریباً ڈیڑھ ارب برس قبل ایک ہی براعظم کا ظہور ہوا، جسے پَین جیا کہتے ہیں، جب اس براعظم کی بیرونی سطح ٹھنڈی ہوکر ٹھوس ہوتی گئی تو اس میں دراڑیں پڑتی گئیں، جو پھیل کر اور ٹوٹ کر موجودہ براعظموں کے جنم کا سبب بنیں۔ جیسا کہ ذیل کی شکل سے ظاہر ہے۔



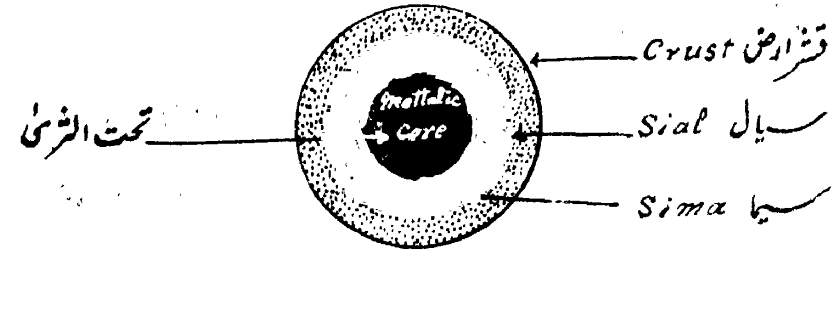
براعظم پین جیا:

براعظم پین جیا زمین کی ناگہانی اندرونی حرکت سے پاش پاش ہوگیا، اس کے منتشر ٹکڑے آج مختلف براعظموں کے نام سے موسوم ہیں، سوال یہ ہے کہ یہ مختلف براعظم جو کسی وقت ایک دوسرے سے ملحق تھے، آج ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر کیسے ہوگئے، اس ضمن میں مشہور سائنسداں اور ماہر علم طبقات الارض مسٹر ویجنر کا نظریۂ براعظمی بہاؤ (Continental Drift) ہمیں مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے، یہ بات قرین قیاس ہے کہ جس طرح کرۂ ارض اپنی بے پناہ

اندرونی حرکت کی بنا پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، اسی طرح کرۂ قمر بھی اپنی ایسی ہی حرکت سے دو ٹکڑوں میں منقسم ہوا ہوگا، ہو سکتا ہے کہ کرۂ قمر کی یہ اندرونی حرکت اسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے انھیں منتشر نہ کر پائی ہو۔ اس لیے وہ دونوں ٹکڑے کچھ دیر الگ رہنے کے بعد جاذبی قوت کشش سے باہم جڑ گئے ہوں، اس کے شواہد بھی ہیں کہ جب چودھویں کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو کر ضیا پاشی کرنے لگا تو لوگوں نے دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہوئے اور پھر آپس میں جڑ گئے، ہندوستان میں بھی اس حادثہ کا مشاہدہ مالابار کے ایک راجہ نے بھی کیا تھا، غرض کہ جزیرۃ العرب سے لیکر بلاد شرقیہ تک بہت سے لوگوں نے قدرت کی یہ لیلا دیکھی تھی،

آج جبکہ ابن آدم کے قدم چاند پر پہنچ چکے ہیں اور پہنچتے رہیں گے، مستقبل قریب میں جب تحقیقاتی ٹولیاں چاند پر جائیں گی اور چاند کا چپہ چپہ چھان ڈالیں گی تو گمان غالب ہے کہ وہ چاند کے دو ٹکڑوں کے جوڑ کی بھی نشاندہی کر کے دنیا والوں کو قرآن کی صداقت پر ایمان لانے کے لیے مجبور کر سکیں گی۔

شق القمر کی بات توضمناً آگئی تھی، اب دیکھنا اور سمجھنا یہ ہے کہ پین جیا کے مختلف وزنی اور ٹھوس ٹکڑوں نے آخر کس طرح اپنی جگہ چھوڑی ہوگی، اس کے جواب میں معاً یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ یقیناً ان کی بنیاد مستحکم نہ ہوگی، ورنہ وہ جنبش نہ کر پائے ہوتے، اسے سمجھنے کے لیے ہمیں کرۂ ارض کی ساخت پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے، کرۂ ارض کی بناوٹ مختلف طبقات پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ ذیل کی شکل سے اندازہ ہوگا:-



اس کا اوپری حصہ قشر ارض کہلاتا ہے، جو انسان اور عام حیوانات کی جولانگاہ ہے، یہ ٹھوس ہے اور مٹی اور ریت کا بنا ہوا ہے، یہ زیادہ تر آبی اور کہیں کہیں آتشی چٹانوں پر مشتمل ہے، اس کی موٹائی نصف میل کے لگ بھگ ہے، اس کے نیچے آتشی چٹانوں کا ایک طبق ہے، اسے سیال (Sial) کہتے ہیں، اس کی دبازت بیس اور تیس میل کے درمیان ہے، اس طبق کے نیچے نیم جامد مادہ کا ایک طبق ہے، جو تارکول کی طرح نیم جامد ہے، اسے سیما (Sima) کہتے ہیں اس کی موٹائی اٹھارہ سو میل ہے، یہ وہی طبق ہے جو آتش فشاں پہاڑوں کو جنم دیتا ہے، اس کے نیچے تقریباً ساڑھے اکیس سو میل موٹا طبق ہے جو مرکز تک پھیلا ہوا ہے، یہ تحت الثریٰ کہلاتا ہے، اس کے متعلق سائنسدانوں کے نظریات میں اختلاف ہے، ایک گروپ کا خیال ہے کہ زمین کے اندر بڑھتے ہوئے درجۂ حرارت کی بنا پر یہ مرکزی طبق گیس کی حالت میں ہوگا، دوسرے گروپ کا یہ کہنا ہو کہ اوپری طبقوں کا اس طبق پر دباؤ اتنا شدید پڑتا ہو کہ اس دباؤ کی زیادتی سے گیس کی شکل میں ہو نہ سیال بلکہ لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ خیال ہے کہ محض ایک ہزار میل کی گہرائی پر چکنی مٹی بھی اوپر کے دباؤ سے لوہے کی طرح سخت ہوگی۔

روئے زمین پر اونچے اونچے پربت بھی ہیں، سطوح مرتفع بھی ہیں اور نشیبی میدان بھی ہیں، برِ اعظم پین جیا کے وجود میں آنے کے بعد اب تک پہاڑوں کی تعمیر کے نو ادوار گذر چکے ہیں، اول چھ ادوار میں بنے ہوئے پہاڑوں کا نشان تک بھی مٹ چکا ہے، البتہ آخری تین ادوار میں بنے ہوئے پہاڑ اس وقت بھی موجود ہیں، ساتویں دور کو کیلی ڈونی دور کہتے ہیں، اس دور کو گذرے ہوئے چالیس پچاس کروڑ برس کا زمانہ گذر چکا ہے، بھارت میں کوہ اراولی کے

سلسلے اس دور کی زندہ یادگار ہیں، آٹھویں دور کو ہرشینی دور کہتے ہیں ۔ وندھیاچل پربت کا ظہور اسی دور میں ہوا، اس پربت کی عمر یں تیس کروڑ برس کے درمیان ہیں، ان ودوادوار کے پہاڑ عوامل شکست وریخت کے ہاتھوں گھس گھسا کر نیچے اور سڈول ہو گئے ہیں، ہمالیہ، آلپس، راکی، انڈیز وغیرہ کے پہاڑی سلسلے آخری دور کی پیداوار ہیں، جسے الپائن دور کہتے ہیں، آج سے سات کروڑ برس قبل ان کا وجود نہ تھا، ہمالیہ کی جگہ تو بحر ٹیدیز موجیں مارتا تھا، بحیرۂ روم تو اسی سمندر کا بچا ہوا ایک حصہ ہے۔ ہمالیہ وغیرہ نوعمر پربت کہلاتے ہیں، ان کی جڑ کرۂ ارض کے اس نیم جامد طبق کے اندر ہیں جسے سیما (Sima) کہتے ہیں، اس لیے ان پر جس قدر عوامل شکست وریخت کا تخریبی اثر پڑتا ہے وہ اسی قدر اور ابھر آتے ہیں، لہٰذا اس بات کے امکانات اب نہیں رہ گئے کہ یہ بھی اپنے سے ماقبل پہاڑوں کی طرح گھس گھسا کر نیچے ہو جائیں، علاوہ بریں انکی دو پیٹیاں ہیں، ایک یوریشیا میں جو مشرق سے مغرب اور دوسری نئی دنیا میں جو شمال سے جنوب کو پھیلی ہوئی ہیں، قدرت نے ان کی ساخت اور تنظیم اس نہج پر کرکے براعظمی بہاؤ کے مزید امکانات بھی ختم کر دیے ہیں،

قشر ارض اور اوپری ٹھوس طبق (Sial) وسطی نیم جامد طبق (Sima) پر اسی طرح تیر رہے ہیں، جس طرح برف کا ایک ٹکڑا پانی میں تیرتا ہے یعنی تیرتے ہوئے برف کے ٹکڑے کا ایک حصہ پانی کے اوپر اور آٹھ حصے پانی کے نیچے رہتے ہیں، چنانچہ ہمارے جملہ براعظم اپنی اپنی گودوں میں فلک بوس پہاڑی سلسلوں، اونچے پلیٹوؤں، اور نشیبی میدانوں کو لیے ہوئے اس نیم جامد طبق پر اسی طرح

رہے ہیں، جس طرح ایک آئس برگ سمندر میں تیرتا ہے، اگر ہمالیہ پربت یا دیگر پربتوں کی اوسط اونچائی چار میل ہے، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کی جڑیں تقریباً ۳۲ میل زمین کے اندر ہوں گی، گویا پہاڑ زمین پر میخوں کی طرح گاڑ دیے گئے ہیں، پھر علم طبقات الارض کی جدید تحقیق کی روشنی میں کون ہے جو قرآن کریم کی اس صداقت سے انکار کر سکتا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهَادًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا

(کیا ہم نے زمین کو گہوارہ اور پہاڑوں کو میخ نہیں بنایا)

ایک قدیم مخطوطہ
نسمۃ السحر کا تعارف

از

جناب ڈاکٹر ایس ۔ بی صمدی

یہ غیر مطبوعہ تصنیف علامہ ضیاء الدین ابو اسحٰق یوسف بن یحییٰ بن الحسین بن المؤید باللہ الحسنی الصنعانی کی ہے ۔ ان کی پیدائش یمن میں شہر صنعا کے ایک شریف النسب خاندان میں ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء میں ہوئی ۔ پیدائش کی تاریخ کا صحیح حوالہ نہیں ملتا ۔ اور نہ تاریخ وفات ہی صحیح طور پر معلوم ہے ۔ اس کا تعین اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کے والد ابو عبد اللہ یحییٰ بن الحسین بن المؤید باللہ ابی الحسین محمد بن منصور باللہ الحسنی کا ذکر خود صاحب تصنیف نے اپنی اس تصنیف کی جلد دوم میں صفحہ ۲۳۸ پر شمارہ ۱۰۲ کے ضمن میں کیا ہے ۔ ان کا انتقال ۱۰۹۰ھ مطابق ۱۶۷۹ء میں ہوا ۔ ان کے حالات زندگی میں لکھا ہے کہ ان کے والد ۱۰۸۷ھ مطابق ۱۶۷۶ء میں حج کے لیے گئے تھے ۔ اس وقت مصنف کی عمر صرف سات سال تھی جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۰۸۰ھ میں ہوئی ۔ اسی طرح ان کی وفات کے سال کا تعین بھی کیا گیا ہے جس وقت انھوں نے اس تصنیف "نسمۃ السحر" کو مکمل کیا اس وقت ان کی عمر تقریباً اکتیس ۳۱ سال کی تھی ۔ تاریخ تصنیف ۱۳؍ رجب المرجب ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ء ہے ۔ سال وفات کا حوالہ ایک اور کتاب بدر الطالع میں بھی ملتا ہے ، جو علامہ شوکانی

کی تصنیف ہے، اس میں ضیاء الدین الصنعانی کی تاریخ وفات ۱۱۲۱ھ مطابق ۱۷۰۹ء دی ہے، اور ان کے حالات بکمال شرح وبسط لکھے ہیں، اس حساب سے مصنف تقریباً اکتالیس سال زندہ رہے۔

مصنف مذہباً زیدی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، جو امامیہ فرقہ کی ایک شاخ ہے، چنانچہ انھوں نے اپنی اس کتاب میں بھی چند کے سوا انہی لوگوں کے حالات، ان کی شاعری اور ادبی نکات کا ذکر کیا ہے، جو امامیہ یا زیدی ہیں،

اس تصنیف کا نام بھی اسی رعایت سے "نسمۃ السحر فی من تشیع وشعر" رکھا ہے، یعنی نسیم سحری جس میں ان لوگوں کے حالات ہیں جو شیعہ بھی تھے اور شاعر بھی، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، اور دنیا میں اس کے صرف تین نسخے پائے جاتے ہیں، پہلا خدابخش اورینٹل لائبریری میں ہے، اس کا نصف اول دوشنبہ کی شب میں ۴ ربیع الآخر ۱۱۹۷ھ مطابق ۱۷۸۳ء میں مکمل ہوا، کاتب کا نام عبدالکریم بن احمد ہے، دوسرا حصہ بھی اسی خط میں ہے، مگر اس کا سنہ تکمیل درج نہیں ہے، خدابخش لائبریری کے مخطوطے کا شمارہ ۱۰/۷۹۶، اور ۱۰/۷۹۷، اور جلد ۱۰/۷، ۲۴۳ اور ۸/۲۴۸ ہے، جلد اول میں ۲۵۲ اوراق اور ہر صفحہ میں ۲۴ سطریں ہیں، کتاب کا سائز ۳½×۶ : ۶½×۸½، دوسری جلد کا سائز بھی یہی ہے، اوراق کی تعداد ۲/۲۰۵ ہے، پہلی جلد میں پچاسی (۸۵) اشخاص کے حالات اور دیگر ادبی وشاعرانہ نکات اور دوسری جلد میں ۱۱۲ اشخاص کے سوانح حیات اور ادبی زندگی کا تذکرہ ہے ان کا تعلق سماج کے مختلف طبقوں سے رہا ہے، اور ان کا زمانہ کئی صدیوں تک پھیلا ہوا ہے، حالات میں کسی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، مثلاً جلد اول میں جن اشخاص کے نام میں پہلے "ابو" آیا ہے، جیسے ابوالعباس یا ابوالحسن وغیرہ، ان کا ذکر شروع میں ہے، مگر

پھر آگے چل کر شمارہ ۱۸۶ پر احمد ہے، اس کے بعد شمارہ ۱۸۷ پر ابو الرقیق کا ذکر اور شمارہ ۱۸۸ پر شمس الدین محمد کا حال ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب کی ترتیب نہ حروف تہجی کے اعتبار سے ہے، اور نہ سنہ پیدائش کے اعتبار سے، جلد دوم میں بھی یہی بے ترتیبی ہے، مردوں کے علاوہ چند خواتین کا بھی ذکر ہے، مثلاً حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت امام حسینؑ کی اہلیہ رباب بنت امرأالقیس بن عدی، زینب بنت محمد بن احمد بن الامام الحسن بن علی بن داؤد الحسینیہ الیمنیہ

گو اس کتاب میں شیعہ اہل علم و کمال کے حالات ہیں لیکن چند ایسے سنیوں کا بھی ذکر ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے آل اطہار سے نسبتہً زیادہ محبت رکھتے تھے، ممتاز ناموں میں چند خلفاء اور حکمرانوں کے نام بھی ہیں، جن میں حسب ذیل خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں

خلیفہ عباسی المامون، سیف الدولہ الحمدانی، ملک الافضل ابن صلاح الدین الایوبی منتصر باللہ العباسی، واثق باللہ العباسی اور فاطمی خلفاء میں المعتز، آمر باحکام اللہ، المنصور العزیز باللہ. ان کا ذکر جلد دوم میں ہے، اصحاب علم و ادب میں ابو الفرج الاصفہانی صاحب کتاب الاغانی، المقامات کے مصنف الحریری، اندلسی شاعر ابن ہانی مشہور ادیب ابوبکر الخوارزمی، شہرۂ آفاق ادیب اور کاتب ابن العمید کے حالات ہیں، مشہور شاعر فرزدق کا حال ہے جس کو آل علی سے محبت کی پاداش میں قید و بند کی مصیبت جھیلنا پڑی، مگر یہ سب تذکرے بے ترتیب ہیں، اس سے قطع نظر یہ نہایت قیمتی اور مفید مخطوطہ ہے، اور تحقیقی کاموں میں اس کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس کی اہمیت کی بنا پر اس کا ایک صحیح نسخہ مرتب کرنے کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (U.G.C) نے راقم کو منتخب کیا ہے، میں نے اس مخطوطہ کے کچھ حصے کا ایک صحیح نسخہ مختلف نسخوں کی مدد سے

تیار کیا ہے، اب وہ اشاعت کے لائق ہوگیا ہے، مگر ہندوستان میں ایسی چیزوں کی قدر کم ہے، یہاں کون ناشر اس کے لیے تیار ہوگا، دوسرے ملکوں مثلاً بیروت یا قاہرہ وغیرہ میں ان کی اشاعت کی زیادہ گنجائش ہے، اس مخطوطہ کے دوسرے جو دو نسخے پائے جاتے ہیں ان میں سے ۱/۲ آصفیہ لائبریری حیدرآباد دکن میں ہے، اس کا حال اس کتب خانہ کی فہرست کے صفحہ ۲/۳۴۴ پر درج ہے، یہ نسخہ بھی دو جلدوں میں ہے، اور فن تراجم کی فہرست میں اس کا شمار ۱۴۳۴/۱۰ اور ۱۴۴ ہے، پہلے نسخہ کی طرح اس کی کتابت بھی سنہ ۱۱۹۵ھ مطابق سنہ ۱۷۸۳ء میں ہوئی ہے، اس کے نصف اول کے اوراق کی تعداد ۲۰۶ ہے اور ہر صفحہ میں ۲۸ سطریں ہیں، اور نصف دوم کے اوراق کی تعداد ۲۰۵ اور سطور فی صفحہ ۲۶ ہیں، اس میں بھی سنہ تالیف سنہ ۱۱۱۱ھ مطابق سنہ ۱۶۹۹ء درج ہے، تیسرا نسخہ برلن میں ہے، اس کا شمارہ ۸۴۲۳ ہے، ان مخطوطات کے آخر میں ایک مقالہ بھی ہے، جو بدیع الزمان الہمدانی متوفی سنہ ۳۹۸ھ مطابق سنہ ۱۰۰۷ء کے اسلوب میں المقامۃ الشاویہ کے طرز پر ہے۔

خلفا میں مامون کے حالات نسبتہً مفصل ہیں، مگر مولانا شبلی نے المامون میں جس قدر حالات لکھے ہیں، اس میں مامون کی شاعری کے علاوہ کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ مامون دوسرے علمی کمالات کے ساتھ خوشگو اور قادر الکلام شاعر بھی تھا، ہم اس کتاب سے اس کے کچھ نمونے نقل کرتے ہیں:۔

بعينيك مشتاقاً فزت بنظرة واغفلتني حتى اساءت بك الظنا

وردّدت طرفاً في محاسن وجهها ومتعت في استمتاع نعمتها أذنا

ارى اثرا منها بعينيك لم يكن لقد سرقت عيناك من وجهها حسنا

میں تیری دونوں آنکھوں کا مشتاق ہوں، میں نظر ڈالنے میں تو کامیاب ہوا مگر تیری غفلت

نے بدگمانی پیدا کردی، پھر میں نے دوبارہ اس کے چہرے کی خوبصورتی کی طرف نظر کی
اور اس کی نعمت کا فائدہ کان کے ذریعہ اٹھایا، تیرے چہرے کی خوبصورتی میں آنکھوں
کا اثر دیکھتا ہوں، تیری آنکھوں نے چہرے کی خوبصورتی کو چرالیا ہے،

امون ایک ایرانی لونڈی مراجل کے بطن سے تھا، اس لیے لوگ اس پر طنز کرتے
تھے، اس نے اس کے جواب میں کہا

لا ینفذ المرء قدراً ان یکون له ام من الروم أو سوداء عجماء
وانما من للاولاد ادعیة مستودعة وللابناء آباء

اگر کسی کی ماں رومی یا سیاہ فام عجمی ہو تو اس سے اس کی قدر کم نہیں ہوتی، کیونکہ
مائیں تو اولاد کیلیے امانتدار ظرف کی حیثیت رکھتی ہیں، درصل بیٹوں کی نسبت تو باپوں سے ہوتی ہے،

وہ شطرنج کا بہت شوقین تھا، مگر اس میں مشاق نہیں تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ میں
دنیا کے امور میں تو ہوشیار رہوں اور ان میں مجھے پوری قدرت حاصل ہے لیکن شطرنج
کے دو بالشت کے چوکھٹے میں میں عاجز رہ جاتا ہوں، اس نے شطرنج کی بساط کی تعریف
میں حسب ذیل اشعار کہے ہیں

أرض مربعة حمراء من أدم ما بین الفین مخصوصین بالکرم
هذی یکر علی هذی وذاك علی هذی یغیر وعین الحزم لم تنم
تذاکوا الحرب فاختار الها مثلا من غیران یأثما فیها بسفك دم
فانظر الی حکمة حالت بمعرکة من عسکرین بلا بوق ولا علم

یہ ایک چوکور سرخ رنگ کے چمڑے کی بساط ہے، اور ان لوگوں کے درمیان جو آپس میں
محبت رکھتے ہیں، الفت کا ایک ذریعہ ہے، یہ اس پر حملہ کرتا ہے اور وہ اس پر حملہ کرتا ہے،

اور کھیل میں ہوشیار آنکھ ذرا بھی نہیں غافل ہوتی، دونوں فریق جنگ کی باتیں کرتے اور بغیر خونریزی کیے اس کی مثال قائم کرتے ہیں، یہ کتنی بڑی حکمت ہے کہ دونوں فریق کے درمیان معرکہ زوروں پر ہے مگر ڈنگل بجتا ہے اور نہ علم بلند ہوتا ہے۔

۲۰۸ھ مطابق ۸۲۳ء میں جب مامون روم پر حملہ کے لیے بغداد سے روانہ ہوا اور جنگ کے لیے زرہ پہنی تو اس کی لونڈی رونے لگی، اس کے آنسو رخساروں پر موتیوں کی طرح بہنے لگے، اور اس نے یہ اشعار پڑھے:

ساد عو دعوۃ المضطر ربا　　یثیب علی الدعا و یستجیب
لعل اللہ ان یکفیک حربا　　و یجمعنا کما تھوی القلوب

میں اپنے رب سے ایک مضطر کی طرح دعا کرتی ہوں جو اس پر اجر بھی دیتا ہے اور اس کو قبول بھی کرتا ہے، اور مجھے امید ہے کہ میرا رب جنگ میں آپ کی مدد کرے گا اور ہم کو پھر ایک دوسرے سے ملائے گا۔

اس کے جواب میں مامون نے یہ اشعار پڑھے،

فیا حسنھا اذ یغسل الدمع کحلھا　　و اذھی تذری الدمع منھا الانامل
عشیۃ قالت فی العتاب قتلتنی　　و قتلی بما قالت ھناک یحلل

یہ حسن کا کیا خوب منظر ہے جب آنسو اس کے سرمہ کو دھو رہے تھے، اور وہ اپنی انگلیوں سے ان کو پونچھ رہی تھی، رات کو اس نے غصہ سے کہا تو نے مجھے قتل کر ڈالا اور اس کے کہنے نے مجھے مار ڈالا اور میرا یہ قتل ہونا (حلال) بھی ہوگیا۔

اور مسرور خواجہ سرا کو حکم دیا کہ جب تک میں واپس نہ آجاؤں اس لونڈی کو عزت و تکریم کے ساتھ رکھنا۔

اگر اخطل کا یہ شعر ہے :۔

قوم اذا حاربوا شدوا مآزرہم دون النساء ولو باتت باطہار

وہ ایک ایسی قوم ہیں کہ جب جنگ کرتے ہیں تو اپنی عورتوں سے دور رہتے ہیں،

نظر میں نہ ہوتا تو میں نہ جاتا،

اس کا میلان شیعیت کی طرف تھا۔ اس نے اپنے مسلک کا اظہار حسب ذیل اشعار میں کیا ہے :۔

اقسم باللہ والا لہ والمرء عما قال مسئول

ان علی بن طالب علی التقی والبر مجبول

وانہ کان الامام الذی لہ علی الامۃ تفضیل

یقول بالحق ویجتازہ ولا تلد امنیہ الا باطیل

کان اذا الحرب براھا الفتی فقصرت عنھا الیھا لیل

یمشی الی القرن وفی کفہ ابیض ماضی الحد مصقول

مشی العفر بین اشبالہ اشبہ المغض العسیل

میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں اور انسان جو کچھ کہتا ہے اس کا جوابدہ ہوتا ہے، کہ تقویٰ اور نیکی علی بن ابی طالب کی فطرت میں داخل تھی، وہ ایسے پیشوا تھے جن کو تمام امت پر فضیلت حاصل تھی، وہ حق گو تھے اور حق کو ابھارنے والے تھے، باطل ان کے قریب نہیں پھٹک سکتا تھا۔ جب جوانمردوں سے جنگ کا سامنا ہوتا اور عقلمندوں کی عقلیں کند ہو جاتیں تو وہ اپنے مدمقابل کی طرف بڑھتے تھے، ان کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تیز دھار کی تلوار ہوتی جس پر خوب صیقل کیا ہوا ہوتا تھا، ان کی چال اس شیر جیسی ہوتی تھی جو اپنے

شیر خوار بچوں کے ساتھ ہو، اور وہ نرم اور خوشبودار جھاڑی کی طرح ہوتے،

بیہقی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ ادب کی اچھائیوں اور برائیوں اور ادب اور نقد کے بارے میں امامون کی صحبت میں بحث کر رہے تھے، وہ ہماری ہمت افزائی کر رہا تھا، اس نے مجھ سے کہا" ہند بنت عقبہ کے اس قول سے اس کی کیا مراد ہے:

نحن بنات طارق نمشی علی النمارق
المسك فی المفارق والدر فی المخانق

ہم طارق کی بیٹیاں ہیں، ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں، بیشک ہمارے بالوں کی مانگوں میں بھرا ہوا اور خوشبو سے ہمارے گلے معطر ہیں۔

طارق سے کیا مراد ہے؟ بیہقی نے لاعلمی ظاہر کی، اس وقت مامون نے بتایا کہ نحن بنات طارق سے مراد یہ ہے کہ وہ ان چمکتے ہوئے تاروں کی بیٹیاں ہیں جو اپنی بلندی کے لیے مشہور ہیں عرب ایسے تاروں کو طارق کہتے تھے۔ طارق کے معنی رات راستہ چلنے والے کے بھی ہیں، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے والطارق وما ادرٰک ما الطارق النجم الثاقب۔ اور قسم ہے طارق کی اور تم کیا جانو طارق کیا چیز ہے وہ نجم ثاقب ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا:۔

اجاعل انت بیقورا مسلعة ذریعة لك بین اللہ والمطر

کیا تو گائے کے ساتھ سلعی باندھنے والا ہے تاکہ اس کو اللہ تعالیٰ اور بارش کے درمیان ذریعہ بنائے۔

اور پوچھا، اس سے شاعر کی کیا مراد ہے؟ میں نے جواب دیا مجھے علم نہیں، تو مامون نے بتایا کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب جب خشک سالی سے دوچار ہوتے تھے تو گائے کے دم میں سلعی اور عشر کی لکڑیاں باندھ دیتے تھے اور اس میں آگ لگا کر گائے کو اونچے مقام پر چڑھا دیتے تھے، اور اس سے اپنے خیال کے مطابق بجلی اور بارش کے متعلق نیک فال نکالتے تھے۔ اس سے شعر و ادب پر مامون کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

کلیات ابن یمین کا مقدمہ

از جناب محمد صفی اللہ صاحب ایم. اے

کلیات ابن یمین کے قلمی نسخے دنیا کے تقریباً تمام مشہور کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، ایک قلمی نسخہ خدا بخش خاں اورنٹیل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ کی فہرست میں ۲۲۳ شمارہ نمبر کے تحت درج ہے۔ ان سب نسخوں کی ابتدا ایک پُر مغز مقدمہ سے ہوتی ہے جس کے بارے میں علمائے ادب و تحقیق کی رائیں مختلف ہیں۔ "فہرست[۱] دو" کے مؤلف بانوات زیلوگرافس کے خیال میں یہ مقدمہ ابن یمین کی اپنی تصنیف ہے، پروفیسر سید حسن صاحب صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی نے بھی اپنے ایک انگریزی مقالہ[۲] میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے، اس کے برخلاف اسپرنگر (Sprenger)، ریو (Rieu) اور خدا بخش خاں لائبریری کے مرتب فہرست کی رائے ہے کہ یہ ابن یمین کا نتیجۂ فکر نہیں بلکہ کسی دوسری نامعلوم شخصیت نے لکھکر شاعر کی جانب منسوب کر دیا ہے، اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اختلاف کو راہ کیسے ملی، اور اصل حقیقت کیا ہے؟ ——— یہ مقدمہ ۷۵۳ھ کی تصنیف ہے، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے:-

"وجری ذالک فی شہر شوال بسنۃ ثلاث وخمسین وسبع مائۃ

---

[۱] "Catalogue du" Compiled by Miss et xylographes

[۲] The Preface to Kulliatiat-i-Ibn-i-Yamin

دولت شاہ اور تقی کاشی جیسے فارسی تذکرہ نگاروں کے قول کے مطابق ابن یمین کی وفات ۷۴۵ھ میں ہوئی، چنانچہ بعض دانشمندوں نے، ان کے بیان پر اعتماد کرکے یہ رائے قائم کرلی کہ اس مقدمہ کو ابن یمین نے بذات خود انشا نہیں کیا، بلکہ اس کے کسی ہمدرد یا شاگرد کے قلم کا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان فارسی تذکرہ نگاروں نے شاعر کی تاریخ وفات کے سلسلے میں پوری تحقیق سے کام نہیں لیا، جس کی بنا پر وہ اس غلطی کے مرتکب ہوئے، دراصل شاعر کی وفات ۷۶۹ھ میں ہوئی، جیسا کہ "مجمل فصیحی"[۱] کے مصنف فصیحی خوافی[۲] نے لکھا ہے اور اسی کتاب کے ایک قطعہ سے جسے خوافی نے شاعر کی تاریخ وفات میں نظم کیا ہے، ظاہر ہوتا ہے۔

وہ قطعہ یہ ہے،

بود از ہجرت ہفتصد با شصت و نہ روز شنبہ ہشتم ماہ جمادی الاخرین
گفت رضوان خور را بر خیز استقبال کن خیمہ بر صحرای جنت می زند ابن یمین

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ابن یمین کی وفات ۷۶۹ھ میں ہوئی، یہ ماننے میں کہ مقدمہ شاعر کی تحریر ہے، تامل نہ ہونا چاہیے، مقدمہ کی یہ عبارت اس کی سب سے بڑی شہادت ہے:-

"اما بعد چنیں گوید محرر ایں مقالات و مقرر ایں کلمات العبد الواثق بالطف الصمدی محمود بن یمین المستوفی الفریومدی"

لیکن حیرت ہوتی ہے کہ خدا بخش خاں لائبریری کے مرتب فہرست نے اس واضح دلیل کے ہوتے ہوئے کیوں اس کی اصلیت سے انکار کیا ہے، شاید وہ اسپرنگر کے بیان سے دھوکا کھا گئے، اور اصل حقیقت کی دریافت تحقیق سے قاصر رہے، یو اور ایتھ نے محض اسی قول

---

[۱] یہ کتاب تین جلدوں میں مشہد ایران سے ۱۳۳۹ و ۱۳۴۱ھ شمسی میں آقای محمود فرخ کی کوشش سے چھپ چکی۔
[۲] ۸۴۵ھ کے بعد وفات ہوئی، اپنی کتاب "مجمل" کو اسی سال مکمل کیا۔

کی تکیہ اور اور نقل پر اکتفا کیا، لیکن معلوم ہوتا ہو کہ ایتھ اسکو نقل کرنے کے باوجود اس سے مطمئن نہ ہو سکے، اور شک و شبہہ میں مبتلا رہے، جیسا کہ ان کے اس بیان سے پتہ چلتا ہو:۔

" اگر[1] ابن یمین اس وقت تک زندہ تھا (یعنی ۷۵۳ھ) تو بہت ممکن ہے کہ یہ مقدمہ اسی نے لکھا ہو۔"

اس اشتباہ کی اصلی وجہ مقدمہ کے آخر کا پیراگراف ہے، جس میں شاعر کی تعریف و توصیف کی گئی ہے، اس لیے وہ ابن یمین کی تحریر ہرگز نہیں ہوسکتی، بلکہ الحاقی ہے، اگر شاعر خود لکھتا تو خود اپنے قلم سے اپنی تعریف نہ کرتا، ایسا کرنا اس کے شایان شان نہیں تھا، معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے کسی دوست یا خیرخواہ نے ۷۵۶ھ میں اس مقدمہ کو نقل کرنے کے بعد اس میں اپنی جانب سے شاعر کی نظم و نثر کی فضیلت کی تحریر بھی شامل کر دی، بعد کے ناقلوں اور کاتبوں نے غلطی سے اس حصہ کو مقدمہ کا جز سمجھ کر ایک ساتھ لکھ دیا، اس پر بعد کے محققین کی بھی نظر نہیں پڑی، اور وہ اس دھوکے کا شکار ہو گئے، حالانکہ اس حصہ کا بغور مطالعہ کرنے سے خود اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ اصل مقدمہ کا حصہ نہیں، بلکہ شاعر کی تحریر سے الگ ہے، وہ حصہ یہ ہے:۔

" تقریب مقالات الصاحب الفاضل، مجمع الفاضل و مرجع الافاضل امیر فخرالدین محمود بن یمین الدین المستوفی الفریومدی، لا زالت ریاض الفضائل مطورۃ برشحات اقلامہ من المنظومات نقراء نظماً و نثراً والمنثورات کمایاتی

---

[1] If Ibn-i-Yamin had been still alive at that time (i.e. 753 A.H) very probably he should have written the introduction himself." — Ethe — "Catalogue of Persian Mss. in the Bodelian library"

"تفصیلا تحریراً فی اواخر ذی القعدہ سنہ ست وخمسین وسبعمائۃ، والحمد للہ اولاً و آخراً والصلوٰۃ علی نبیہ باطناً وظاہراً، وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً۔"

اس اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریر کے وقت یعنی ۷۵۶ھ میں شاعر بقید حیات تھا، ورنہ ناقل "لا زالت ریاض الفضائل ممطورۃ برشحات اقلامہ من المنظومات نقراً نظماً ونثراً" ہرگز نہ لکھتا۔ اس سے دولت شاہ اور تقی کاشی کی دی ہوئی تاریخ وفات کی تردید اور فصیحی خوافی کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

جہانتک مجھے معلوم ہے، ابتک اس مقدمہ پر صرف پروفیسر سید حسن صاحب نے توجہ مبذول کی ہے۔ علی اکبر دہخدا نے ابن یمین کے تقریباً آٹھ ہزار ابیات کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا، جو آجتک شائع نہ ہوسکا۔ "کتب مولفین چاپی فارسی"[1] جلد چہارم میں دہخدا کی تالیفات کا شمار کیا گیا ہے، مگر اس میں اس کلیات یا دیوان ابن یمین کا ذکر نہیں ہے۔ دہخدا نے بھی اپنے "لغت نامہ"[2] میں "ابن یمین" کے ذکر میں اپنی تالیف کی طباعت کے متعلق مکمل خاموشی اختیار کی ہے۔ رشید یاسمی نے اپنی کتاب "احوال ابن یمین"[3] میں دہخدا کی مذکورہ تالیف کا حوالہ دیتے ہوئے، اس سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ رشید یاسمی کو بھی اس مقدمہ کے متعلق شاعر کا خود نوشت ہونے کا کامل یقین ہے۔

ابن یمین نے اس مقدمہ میں نثر نگاری کا دعویٰ کیا ہے کہ اس نے نثری مکتوب اور اپنے دیوان پر ایک رسالہ لکھا ہے، لیکن یہ نثری کارنامے علم وادب کی دنیا میں نایاب ہیں، آجتک اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ البتہ شاعر کے نثری خزانے کا یہی ایک دریتیم نمونہ کے طور پر موجود ہے، وہ بھی کلیات کے مقدمہ کی شکل میں، اس لحاظ سے اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

---

[1] تہران [2] جلد آ ۔۔۔ ابوسعید ص ۲۶۸ [3] یہ کتاب آج سے بیالیس[4] سال پہلے ۱۳۰۳ ش میں ہوئی۔

ادبیات

غزل

جناب کرامت علی کرامت

جلوۂ طور سے اکتا کے پلٹ آئی نظر
ذوقِ عرفاں کو تھا مرغوب فقط حسن بشر

چند نادیدہ حقائق کا تصور لیکر
جھلملاتی رہی کیا جانیے کیوں شمع نظر

آب و رنگ سحر و شام کہ ہے پیش نظر
کون کہہ سکتا ہے اسکو کہ ہے یہ رقص شرر

میرے ایقان سے تابندہ ہو زہرہ کی جبیں
میرے ایمان میں پوشیدہ ہیں انوار سحر

عشق کی اس کو وسیع النظری کہہ لیجے
حسن ہی حسن ہے پھیلا ہوا تا حد نظر

ٹوٹ کر کتنوں کو مجروح یہ کر سکتا ہے
سنگ! تو نے ابھی دیکھا نہیں شیشے کا جگر

خلوتِ حسن کے آداب سے گھبرائی ہوئی
ایک تھی شمع جو جلتی تھی سرِ راہ گذر

غزل

جناب جامی چریا کوٹی

کچھ ایسے بھی ہوئے ہیں راہ رو لے بے خبر پیدا
ستاروں سے بھی آگے کر چکے ہیں رہگذر پیدا

حصولِ دولتِ ایماں ہو بس مشکل زمانے میں ۔۔۔ دگر نہ ہے بہت آسان کرنا سیم و زر پیدا

دعائیں مانگنے والو کبھی تم نے یہ سوچا ہے ۔۔۔ دعاؤں میں تمھاری کیوں نہیں ہوتا اثر پیدا

ہزاروں قافلے صدیوں تلک منزل کو روتے ہیں ۔۔۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے جہاں میں راہبر پیدا

اجالا تو اجالا تیرگی بھی کام آتی ہے ۔۔۔ اگر انسان میں ہو جائے بصیرت کی نظر پیدا

ہیں جتنے بھی قفس میں سب کے سب بال و پر شکستہ ہیں ۔۔۔ مجھی کو یا الٰہی ہوں نہ تنہا بال و پر پیدا

دلوں کی تیرگی مٹ جائے جس کے نور سے جامیؔ
نہیں ہوتی جہاں میں کوئی بھی ایسی نظر پیدا

غزل

جناب پروفیسر افتخار احمد فخرؔ دھولیاوی ایم اے، ایم، جے کالج، جلگاؤں

ہمیشہ کھیلتے آئے ہیں انکی زلف بر ہم سے ۔۔۔ الجھنا سوچ کر اے گردشِ شام و سحر ہم سے

خزاں کا دور ہم سے موسم دیوانہ گر ہم سے ۔۔۔ وہ دیوانے ہیں ہم، آباد ہو وحشت کا گھر ہم سے

وہ شوقِ امتحاں میں کیوں ہیں برہم اسقدر ہم سے ۔۔۔ ملا ہے جب وطن کو وقت پر خونِ جگر ہم سے

جگر میں بیٹھ کر کہتا ہے یہ تیرِ نظر ہم سے ۔۔۔ کہ یہ وہ زخم ہے ہوتا نہیں اچھا جو مرہم سے

رواں ہے ہر رگِ گل میں لہو لے باغباں کس کا؟ ۔۔۔ یہ ثابت ہو چمن پر ہے بہاروں کا اثر ہم سے

ہمیں ہیں جانِ میخانہ ہمیں ہیں شانِ کاشانہ ۔۔۔ جو سچ پوچھو تو ہے ہر رونقِ دیوار و در ہم سے

ہمارے واسطے اک کھیل ہے سیلِ حوادث بھی ۔۔۔ کہ طوفاں ہم سے گھبرائیں تو ٹکرائیں بھنور ہم سے

جنونِ سجدہ ریزی کا یہ اک ادنیٰ کرشمہ ہے ۔۔۔ انھیں کا آستانہ تھا ہوا سجدہ جدھر ہم سے

وہ ہم ہیں کشتۂ تیغِ تغافل فخرؔ الفت میں
کہ کترا کر گذرتا ہے غبارِ رہگذر ہم سے

مطبوعات جدیدہ

نقش غالب ۔ مرتبہ جناب اسلوب احمد انصاری، صدر شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶، کاغذ، کتابت، چھپائی، عمدہ، ضخامت ۱۴۲ صفحے، ناشر غالب اکیڈمی، نئی دہلی، قیمت بارہ روپے۔

غالب پر اب تک معلوم نہیں کتنا لکھا جا چکا ہے، اور نہ جانے کتنا لکھا جائے گا، غزل کی ایک بڑی خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ کیا کہا گیا بلکہ جو کچھ کہا گیا وہ کس طرح کہا گیا ہے، یہی بات اب غالب کی شاعری کی تنقیدوں سے متعلق کہی جا سکتی ہے، غالب کے بارہ میں شاید کوئی نئی بات نہیں کہی جا سکے، البتہ جو بات کہی جائے گی، اس کے کہنے کا انداز اگر نیا نہ ہوگا تو غالب کے پرستاروں کو شاید اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو، جناب اسلوب احمد انصاری صاحب نے اپنی اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس میں بڑا نیا پن ہے، انکی طبیعت میں فطری طور پر بڑی متانت ہے، جو انکی تحریروں میں بھی رچی بسی نظر آتی ہے، قارئین انکی تحریروں کی متانت سے دبتے چلے جاتے ہیں، پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس میں فکر کی ندرت ہے، ذاتی انکشاف کی تازگی ہے، ذہن کی توانائی ہے، اور قلم کی رعنائی بھی، یہ کتاب اُن کے چھ مقالات" کلام غالب کا ایک رخ"، "غالب کا فن"، "غالب اور اقبال"، "غالب کی فارسی غزل"، "ابر گہربار کا ایک پہلو"، اور "خطوط غالب میں نفس کی پرچھائیاں" کا ایک بہت ہی باوقار مجموعہ ہے، جو غالب کے مختلف کمالات کا ایک نگارخانہ بھی بن گیا ہے،

اسی کے ساتھ اس میں بلند تنقید نگاری بھی پائی جاتی ہے، لائق مولف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ غالب کی شاعری میں انسانی شخصیت کی خودنگری، صلابت، شکست و ریخت اور ہزیمت کے باوجود نئی زندگی کی قبا زیب تن کرنے کا حوصلہ ہے، تسخیر کائنات کا جذبہ ہے، ارضی حقیقت کی کنہ تک پہنچنے کی کوشش ہے۔ آفاقی عمل میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی بے پناہ خواہش ہے۔ انکے یہاں انسانی زندگی کی ہنگامہ آرائیاں اور انسانی فطرت کی عجوبہ زائیاں تو بڑی حد تک ملتی ہیں لیکن انکی شاعری کوئی مابعد الطبیعاتی سطح نہیں رکھتی اس اعتبار سے اقبال کو ان پر فوقیت حاصل ہے۔ غالب کی فارسی غزل کے متعلق ان کی رائے ہے کہ فارسی غزل میں انکی انفرادیت اتنی نمایاں نہیں جتنی اردو غزل میں ہے، وہ باوجود کوشش اور اہتمام کے نظیری، حافظ، اور بیدل کے معیار تک نہیں پہنچ پاتے۔ غالب کے خطوط کے متعلق وہ لکھتے ہیں، ان میں انکی خیال، تہ در تہ اور دلکش شخصیت کا عکس ملتا ہے کہیں ان کا معمولی اور روزمرہ کا نقش سامنے آتا ہے، جو زندگی کی لذتوں کا جویا، عواقب پر کڑی نظر رکھنے والا، اور زندگی کی اونچ نیچ سے پوری طرح واقف ہے، کہیں وہ نقش ہے، جسے وہ ایک معیار کے طور پر پیش کرتے اور جس کی طرف وہ للچائی ہوئی نظروں سے مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں، اور کہیں وہ نقش ہے جسے ہم ان کا (Inverted Self) کہہ سکتے ہیں، ممکن ہے کہ ان میں سے بعض باتوں سے کسی کو اختلاف ہو، لیکن لائق مولف نے ان کو کچھ ایسے باوزن طریقے پر پیش کیا ہے کہ قارئین کا ذہن غیر شعوری طور پر مسحور ہو کر رہ جاتا ہے، اس قسم کی بلند پایہ تنقیدوں کو پڑھ کر ذہن میں یہ کشمکش پیدا ہو جاتی ہے کہ غالب کی شاعری واقعی اتنی اونچی اور ارفع تھی یا تنقید نگاروں نے ان کو اونچا اور ارفع بنا دیا ہے، اگر کسی کو موخرالذکر رائے سے اتفاق ہو تو غالب کی شاعری کو اونچا اور ارفع بنانے والوں میں جناب اسلوب احمد انصاری کا نام بھی نمایاں رہے گا۔

مثنوی سوز و گداز (فارسی)۔ مرتبہ ڈاکٹر امیر حسن عابدی، صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، تقطیع ۲۰×۲۶، کاغذ، طباعت ٹائپ عمدہ، ضخامت ۹۵ صفحے، ناشر بنیاد فرہنگ ایران۔

یہ فارسی مثنوی نوعی خبوشانی کی ہے، وہ خبوشان (نزد مشہد مقدس) سے ہندوستان آیا تو اکبر کے ایک درباری امیر یوسف خاں مشہدی سے وابستہ ہوا، پھر عبدالرحیم خانخاناں کے یہاں چلا آیا، وہ اس کو برابر انعام و اکرام سے سرفراز کرتا رہا، ایک ساقی نامہ کے صلہ میں اسکو دس ہزار روپے ایک ہاتھی اور ایک گھوڑا عطا کیا، آخر میں شہزادہ دانیال یعنی اکبر کے بیٹے نے اس کو اپنے پاس بلالیا تھا، مثنوی سوز و گداز کا قصہ یہ ہے کہ لاہور کے دو ہندو عاشق و معشوق ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا رہے، جب ان کی شادی ہونے لگی تو عین بارات کے روز عاشق ایک مکان کے گر جانے سے دب کر ہلاک ہو گیا، معشوقہ کو انتہائی غم ہوا، وہ ستی ہونے کے لیے تیار ہو گئی، اکبر نے اس کو اپنے یہاں بلا کر ہر قسم کی ترغیب دی لیکن وہ اپنے عاشق کے چتا پر جل مرنے سے باز نہ رہی، اسی قصہ کو منظوم کر کے نوعی خبوشانی نے اپنی مثنوی نگاری کا جوہر دکھایا ہے، نوعی خبوشانی کے معاصر مآثر رحیمی کے مولف ملا عبدالباقی نہاوندی تھے، وہ لکھتے ہیں کہ نوعی کے معاصر اساتذہ اس کی شاعری کی شترگربگی پر اعتراض کرتے رہے، اور کہتے کہ اگر اس کے اشعار بہت بلند ہیں تو بہت پست بھی ہیں، لیکن خود مآثر رحیمی کے مولف اس کی شاعری کے بڑے معترف رہے، ان کے خیال میں وہ اپنے زمانہ کا بے نظیر اور بے مثال شاعر تھا، اور مثنوی سوز و گداز خسرو شیریں کی بحر میں بہت ہی خوب کہی ہے اور اس مثنوی کی خوبی کی یہ بھی دلیل ہے کہ یہ ایران سے شائع ہوئی ہے جس سے ظاہر ہے کہ اہل ایران نے اس کو سبک ہندی کی اور دوسری منظومات کی طرح ناقابل اعتبار قرار نہیں دیا۔ لائق مرتب نے اس کے شروع

لب پر مفید مقدمہ لکھا ہے، جس میں بڑی محنت سے مختلف تذکروں میں نوعی کے متعلق جو کچھ ہے
، جمع کر دیا ہے، لیکن تعجب ہے کہ ان کی وسیع نظر آتشکدہ پر نہیں پڑی جس کے مولف
سے براہ راست واقف تھے، اس معاصر ... سلوک ... مستند اور قابل ترجیح
ی جا سکتی ہیں، اس میں نوعی کا ساقی نامہ بھی درج ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ اکبر کی طرف
ن کو وظیفہ اور منصب بھی ملا، ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے اس مثنوی کو شائع کرکے ایک
ب اور مفید کتاب اہل علم تک پہنچا دی ہے، ان کو اندو پرشین لٹریچر سے بڑا شغف ہے،
سلسلہ میں وہ اپنی علمی سرگرمیاں بڑی محنت و کاوش سے جاری رکھے ہوئے ہیں، اب تک
دستان کی فارسی سے زیادہ دلچسپی نہیں لیجاتی تھی لیکن جن ارباب علم نے ہندوستان کے
ن شعر و ادب کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی کوشش کی ہے، ان کی فہرست میں
ڑ امیر حسن عابدی کا نام بھی جلی بلکہ زریں حروف سے لکھنے کے لائق ہے۔ "ص، ع"

مجموعۂ قوانین اسلام ۔ مرتبہ جناب تنزیل الرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ تقطیع کلاں
کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، مجلد، صفحات ۳۶۵، قیمت ۱۵ روپے، ناشر ادارہ تحقیقات
اسلامی، اسلام آباد، پاکستان۔

ادارۂ تحقیقات اسلامی (پاکستان) نے اسلام کے عائلی، دیوانی اور فوجداری قوانین
ن جلدوں میں جدید طرز پر مرتب و مدون کرنے کا جو منصوبہ بنایا ہے، اس کی دو جلدیں
شائع ہو چکی ہیں، ان پر معارف میں مفصل ریویو کیا جا چکا ہے، زیر نظر تیسری جلد مندرجہ
، عائلی قوانین پر مشتمل ہے:۔ (۱) نسب اولاد (۲) حضانت (۳) نفقہ اولاد و آباء
اد (۴) ہبہ (۵) وقف

اس کی نوعیت و خصوصیات بھی وہی ہیں جو پہلی دونوں جلدوں کی ہیں، یعنی

پہلے دفعہ وار قانونی احکام بیان کر کے قرآن، حدیث، آثار صحابہ اور ائمہ و مجتہدین (بشمول اہل تشیع) کے اقوال کی روشنی میں ان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے، اور آخر میں اسلامی ملکوں اور پاکستان کے مروجہ قوانین کا ذکر ہے، ان میں سے جو قوانین اسلام کے خلاف ہیں ان میں ترمیم کی تجویزیں پیش کی گئی ہیں، پہلی جلدوں کی طرح اس میں بھی مصنف کی ترجیحی اور مجتہدانہ رایوں میں اختلاف کی گنجائش ہے، لیکن ان کی تلاش و تحقیق اور رائے کے اعتدال و توازن میں کلام نہیں، دعا ہے کہ اس مفید سلسلہ کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ مصنف کی صحت و عمر میں برکت عطا فرمائے۔

مقالات امینی ۔ مرتبہ مولانا محمد تقی امینی صاحب تقطیع کلاں، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۶۰ قیمت آٹھ روپئے، پتہ یونیورسٹی پبلیکیشنز ظہور وارڈ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

یہ کتاب مولانا محمد تقی امینی ناظم سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مندرجۂ ذیل گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے، (۱) اجتہاد (۲) فقہ کی تدوین جدید (۳) فقہ کی تدوین جدید میں موجودہ حالات کی رعایت (۴) موجودہ مسائل کس طرح حل کیے جائیں (۵) فقہ کے اجتماعی مسائل (۶) خلافت فاروقی میں آراضی کی تنظیم و تقسیم (۷) ریڈیو پر رؤیت ہلال کی خبر (۸) سٹہ بازی اور اسٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت (۹) بیمہ کی حقیقت و شرعی حیثیت (۱۰) جدید دور میں جدید رہنمائی کی ضرورت (۱۱) ایک اور تہذیب جدید کی ضرورت۔ لائق مقالہ نگار نے اسلامی فقہ و اجتہاد پر جو ان کا خاص موضوع ہے، کئی مفید کتابیں لکھی ہیں، اور وقتاً فوقتاً محققانہ مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں، اس مجموعہ کے مقالات معارف اور برہان میں شائع ہو چکے ہیں، فاضل مقالہ نگار نے ان میں موجودہ زمانہ کے ان نئے مسائل

کی جانب جن کا قدیم اسلامی فقہ میں ذکر نہیں ہے، اور موجودہ اصحاب علم ونظر نے بھی ان کی طرف کم اعتنا کیا ہے، ملت کے ارباب حل وعقد کو متوجہ کیا ہے، اور بعض مسائل کو حل کرنے کی بھی کوشش کی ہے، مولانا اس صاحب نظر طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کو زمانہ کے بدلے ہوئے حالات اور شرعی احکام کی نزاکتوں دونوں کا پورا احساس ہے، اس لیے انھوں نے بحیثیت مذہبی حلقوں کو انداز فکر بدلنے اور اجتہاد کا بند دروازہ کھولنے کی دعوت بھی دی ہے، اور نئی جلوہ گاہوں کے مدہوشوں کو ہوش وحواس درست کرنے اور اجتہاد کے نشیب وفراز سے واقف ہونے کا مشورہ بھی دیا ہے، ابتدا کے پانچ مضامین میں اجتہاد و اجماع اور فقہ کی جدید تدوین کی اہمیت وضرورت بیان کرتے ہوئے اس زمانہ میں انفرادی کے بجائے شورائی طرز کے اجتہاد کو مناسب بتایا ہے، اور کتاب کے آخری دو مضامین میں مذہب واخلاق کی قدیم بنیادوں پر نئی عمارت تعمیر کرنے کا مشورہ دیا ہے، جدید مسائل سٹہ اور اسٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت کو ممنوع اور ریڈیو پر رؤیت ہلال کی خبر اور بیمہ کو جائز قرار دیا گیا ہے یہ آخری مضمون بڑا مبسوط ہے، اس میں بیمہ کی حقیقت ونوعیت، آغاز وارتقاء، اس کی مختلف رائج صورتوں اور ان کے جواز وعدم جواز کے بارہ میں جدید مصری علماء کے آراء و دلائل پر مفصل گفتگو کرنے کے بعد ضرورت عامہ کے تحت اس کو جائز بتایا ہے، اور عدم جواز کے وجوہ کا جواب دیا ہے، گو ان اختلافی مسائل میں ان کی بعض رائیں محل نظر ہو سکتی ہیں لیکن یہ سب مضامین گہرے غور وفکر، وسیع علم ومطالعہ اور بڑی تحقیق ومحنت کا نتیجہ ہیں، اور ان مسائل پر بحث ونظر وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے، ان مضامین نے اس کے لیے راہ ہموار کر دی ہے۔

درود اعلیٰ - مرتبہ مولانا حکیم سید محمد مصلح الدین ثاقب کاظمی اعظمی تقطیع خورد

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۷۰ قیمت دو روپئے۔ پتہ لٹریری ایسوسی ایشن یونٹ اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ہمارے شہر کے مشہور طبیب مولانا محمد مصلح الدین ثاقب فاضل دیوبند، اب طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ ہیں، ان کو اردو شعر و سخن کی طرح عربی و فارسی کا اچھا ذوق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے والہانہ عشق و محبت ہے، اس لیے انھوں نے بڑی عقیدت و اخلاص سے درودوں کی یہ سوغات تیار کی ہے، اور اپنے فنی ذوق و استعداد کی بنا پر اس میں صرف غیر منقوط الفاظ استعمال کیے ہیں، اور یہ التزام بھی کیا ہے کہ ہر غیر منقوط لفظ کے درود کا آخری فقرہ اسی پر ختم ہو، اس لفظی صنعت کے باوجود اس میں معنوی کیفیت بھی ہے، اور درود کے اکثر صیغے کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں، شروع میں درود شریف کے فضائل کی بیس حدیثیں مع ترجمہ نقل کی گئی ہیں۔ اس طرح درود شریف کے جو مجموعے تیار کیے گئے ہیں انہیں غالباً یہ اپنی نوعیت کا انوکھا ہے، درود شریف تقرب الی اللہ اور شفاعت نبوی کا وسیلہ ہے، اس لیے یقین ہے کہ مصنف کا یہ نذرانۂ خلوص ان کے درجات میں بلندی کا سامان اور لوگوں میں مقبول ہوگا۔

ایسے تھے گاندھی جی۔ مرتبہ جناب یو آر راؤ صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۵۹، پتہ پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات ونشریات حکومت ہند۔

یہ کتاب گاندھی جی کی سو سالہ جینتی کے موقع پر طلبہ اور معمولی استعداد کے لوگوں کیلئے سہل زبان اور آسان طرز میں لکھی گئی ہے، اس میں انکی بلند شخصیت وسیرت، اونچے آدرشوں اور سبق آموز واقعات زندگی کو موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے، ملک کی آزادی کی طرح گاندھی جی کا مقصد انکی اخلاقی اصلاح اور قوم کی ذہنی و دماغی تربیت بھی تھا، اس حیثیت سے یہ کتاب جونئی نسلوں کو انکے پیام اور تعلیمات سے واقف کرانے کیلئے لکھی گئی ہے، نہایت مفید ہے۔ "ض"

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب و امریکہ، اسلامی رصدخانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت: لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ۔ قیمت: عہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین، قیمت: عہ

صاحب المثنوی،

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری، حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت: عہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے اور جنھوں نے اس کو ترقی دے کر رشک جنان بنا دیا، ان کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی اعظمی ایم اے قیمت: للعہ

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

مصنفات ... ایجی

۱- بزم تیموریہ : تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۴۰ صفحے قیمت ...

۲- بزم مملوکیہ : ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادباء کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے ۳۲۵ صفحے قیمت ...

۳- بزم صوفیہ : عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات کثرت اضافوں کے ساتھ نیا ایڈیشن قیمت

۴- ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے۔ ۵۰۰ صفحے، قیمت : ...

۵- ہندوستان کے عہد ... کی ...

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے ... فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی ... ۵۰۰ صفحے قیمت : ...

۶- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت : ...

۷- ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ضخامت :- ۴۲۰ صفحے، قیمت :- ...

۸- ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت ...

۹- ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت : ...

۱۰- عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۲۰۰ صفحے، قیمت : ...

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۰۲۰ فروری ۱۹۶۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

مجلسِ ادارت

۱۔ جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی،
۲۔ جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی الہ آبادی،
۳۔ شاہ معین الدین احمد ندوی،
۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے،

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب ملت نسل و رنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسکو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہلِ کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات اُن کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

(مرتبہ)

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے قیمت: ۶ہ

جلد ۱۰۹ - ماہ ذوالحجہ ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۲ء - عدد ۲

مضامین

شذرات

بنگلہ دیش آزاد ہو چکا، بہت سی حکومتوں نے اس کو تسلیم کر لیا ہے، جو باقی ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ تسلیم کر لیں گی مگر آزادی اپنے ساتھ بڑی ذمہ داریاں لاتی ہے، جنگی جوش و خروش، نفرت و عداوت اور جذبۂ انتقام کا دور ختم اور معاملات و مسائل پر سنجیدہ غور و فکر اور انکے حل کا تعمیری دور شروع ہو جاتا ہے، مگر ابھی دونوں کے دماغوں سے جنگ کا خمار نہیں اترا ہے، اور ان کے درمیان جو حل طلب مسائل ہیں، انکی طرف کوئی توجہ نہیں، ان میں ایک بڑا مسئلہ بنگلہ دیش کے مہاجرین کا ہے جو بنگالیوں کے جوش انتقام کا شکار ہو رہے ہیں، ان کا قصور یہ ہے کہ وہ بنگالی نہیں ہیں، انکی زبان اردو ہے، اور ان کا کلچر بنگالیوں سے مختلف ہے، ان پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ مغربی پاکستان کے حامی تھے، اور انھوں نے اسکی فوجوں کی مدد کی تھی، ممکن ہے یہ الزام کسی حد تک صحیح ہو، مہاجرین سے نفرت اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کا سلسلہ فوجکشی سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے تحفظ کے لیے فوج کی حمایت کی ہوگی، گو بنگلہ دیش کی حکومت اس کی تردید کرتی اور اس کو بہت ہلکا کر کے دکھاتی ہے لیکن وہاں سے خطوط اور اشخاص کے ذریعہ جو مستند اطلاعیں آرہی ہیں۔ اور غیر ملکی نامہ نگاروں کے بیانات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس وقت ہمارے دیار یوپی کے سیکڑوں گھروں میں ماتم بپا ہے، اگر ہندوستانی فوج مہاجرین کی حفاظت نہ کرتی تو سب کا صفایا ہو جاتا۔ اس سے حالات کی سنگینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، مہاجرین پر جو الزام لگایا جاتا ہے، اگر اسکو تمامتر صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد انکو

اور جمہوری حکومت کے قیام کے بعد مہاجرین وہاں کے شہری بن چکے اور اب ان کو اجنبی سمجھنا اور ان سے انتقام لینے کا کوئی جواز نہیں ہے، ورنہ جمہوریت اور سیکولرزم محض ڈھونگ ہے،

بہادر، شریف اور بلند نظر قومیں کامیابی کے بعد گذشتہ واقعات کو فراموش کر دیتی ہیں اور مخالفین سے بھی انتقام نہیں لیتیں، ہندوستان کی جنگ آزادی میں حکومت کا پورا عملہ انگریزوں کے ساتھ تھا، اس کے عمال نے حریت پسندوں اور ان کے بڑے بڑے لیڈروں پر ہر قسم کی زیادتیاں کی تھیں، ان پر گولیاں تک برسائی تھیں، مگر آزادی ملنے کے بعد ملکی حکومت نے نہ ان سے کوئی انتقام لیا نہ کسی قسم کا نقصان پہنچایا، وہ بدستور اپنے عہدوں پر برقرار رہے، اس سے بڑھکر یہ واقعہ ہے کہ اس نے مسلم لیگی لیڈروں سے بھی جنکو ہندوستان کی تقسیم کا بانی سمجھا جاتا ہے کوئی بدلہ نہیں لیا، اور اسکے نقصان کے علاوہ جو ہندوستان کی تقسیم سے یہاں کے سارے مسلمانوں کو پہنچا تھا لیگیوں کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا، اور نہ ان کو کسی حق سے محروم کیا، ان کو وزارت تک میں لیا، مہاجرین کا جرم ان لیگیوں سے تو زیادہ سنگین نہیں ہے کہ وہ ناقابل عفو ہو، کس قدر شرم اور غیرت کا مقام ہے کہ ایک غیر مسلم اکثریت کی حکومت نے تو لیگی مسلمانوں کے ساتھ انسانیت و شرافت کا یہ نمونہ پیش کیا اور ایک مسلم اکثریت کی حکومت بے کس مہاجرین کے ساتھ بربریت کا ثبوت دے رہی ہے، آخر بیس لاکھ مہاجرین اجڑ کر کہاں جائینگے اور دوبارہ بے خانماں ہونے کے بعد نئی زندگی کس طرح شروع کریں گے، مکمل بربادی کے علاوہ ان کا کوئی انجام نظر نہیں آتا، جس کی ذمہ داری بنگلہ دیش کے سر ہوگی۔

تعجب ہے کہ حکومت ہند، یہاں کے لیڈر اور اخبارات مہاجرین کے مسئلہ کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں، بلکہ اسکی سنگینی کو گھٹانے کی کوشش کر رہے ہیں، ایک طرف تو ہماری حکومت نے ہر طرح کے خطرات برداشت کر کے ایک کروڑ بنگالی پناہ گزینوں کی پذیرائی اور ہر طرح کی امداد و دستگیری کی، اس کے لیے جنگ تک کا خطرہ مول لیا، ان ہندوستانیوں کو جو پشتہا پشت سے سیلون میں آباد تھے، وہاں سے جلا وطن ہونے کے بعد ہندوستان میں بسایا، دوسری طرف وہ مہاجرین کے مسئلہ میں جو چند ہی برس پہلے ہندوستانی

تھے، یا پھر خاموشی ہے، اس تفریق کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، ہم کو یقین ہے کہ مسز اندرا گاندھی کو ان حالات کا پورا علم نہ ہوگا، ورنہ وہ ضرور اس مسئلہ کی طرف توجہ کرتیں، اس وقت بنگلہ دیش حکومت ہند کے زیر اثر ہے، اس لیے اس کی انسان دوستی کا تقاضا ہے کہ وہ مہاجرین کے مسئلہ کو طے کرانے کی پوری کوشش کرے گی، یہ بھی اس کا کارنامہ ہوگا، ورنہ ہندوستانی فوجوں کے ہٹنے کے بعد مہاجرین کا انجام اور بھی برا ہوگا۔

افسوس ہے کہ شیخ ظہور الحسن صاحب سابق ریونیو سکریٹری حکومت اترپردیش نے کراچی میں انتقال کیا، وہ اپنے محکمہ کے ماہر اور اس صوبے کے لائق ترین عہدہ داروں میں تھے، حکومت میں ان کا بڑا وقار تھا، عملاً بڑے مذہبی اور دیندار تھے، مذہبی مطالعہ وسیع تھا، دینی کاموں سے بڑی دلچسپی تھی، ترک وطن سے پہلے دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، کئی سال ہوئے ریٹائرڈ ہو چکے تھے، ان کے لڑکے پاکستان میں بڑے عہدوں پر تھے، لیکن وہ خود ہندوستان ہی میں مقیم رہے، ۱۹۶۵ء کی جنگ سے کچھ پہلے لڑکوں سے ملنے کراچی گئے تھے، اسی دوران میں جنگ چھڑ گئی، اس لیے لڑکوں کے اصرار سے وہاں مستقل قیام اختیار کر لیا، اور وہیں قلبی دورے میں وفات پائی، مسلمان عہدہ داروں میں ایسے لائق اور دیندار کم ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس مرد مومن کی مغفرت فرمائے۔

دوسرا حادثہ پنڈت رام ناتھ کنزرو کی وفات کا ہے، وہ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو صدر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی و انجمن ترقی اردو ہند کے بڑے بھائی، پرانے کشمیری پنڈتوں کی طرح ہماری پرانی مشترک تہذیب کا نمونہ اور اردو زبان کے بڑے شیدائی تھے، جامعہ اردو علی گڑھ کے امیر بھی تھے، ان کی وفات سے اردو کا ایک بڑا حامی و مددگار اٹھ گیا، اور قدیم تہذیب و شرافت کی ایک یادگار مٹ گئی، اب اس دور انقلاب میں ایسے نمونے نہ پیدا ہوں گے۔

مقالات

میرزا محمد امین میر جملہ المتخلص بہ روح الامین

از جناب ڈاکٹر نور السعید اختر ایم اے، پی ایچ ڈی بمبئی

دیارِ دکن کی سرسبز و شاداب وادی ادبی، ثقافتی اور معاشی اعتبار سے بڑی مستحکم رہی ہے، بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد یہ مملکت پانچ خود مختار ریاستوں میں بٹ گئی، قطب الملک نے گولکنڈہ کو اپنا پایۂ تخت بناکر اپنی سلطنت کے ہر شعبے کو فروغ دینا شروع کیا، اس کے جانشینوں نے بھی ادب و فن کی ترویج و ترقی کو اپنا شعار بنایا، محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) فنی و ادبی گلستانوں میں نئی روشیں نکالی گئیں، محمد قلی قطب شاہ کی قدر دانی اور ادب نوازی کی شہرت سنکر ایرانی فنکاروں نے بھی دکن کا رخ کیا، ان میں ایسی نامور شخصیتیں بھی تھیں جن کی ایرانی دربار تک رسائی نہ ہوسکی تھی، اس لیے جب محمد قلی قطب شاہ نے ان کی عزت افزائی کی تو شاہانِ ایران بھی دنگ رہ گئے، میرزا محمد امین بھی اُن خوش نصیبوں میں سے ہیں، ایسے تجربہ کار اور کامیاب منتظم کی شاہانِ ایران نے پرسش نہیں کی، اس گوہر بہا کو پہلے محمد قلی قطب شاہ نے پرکھا اور پھر جہانگیر و شاہ جہاں نے آب و تاب بخشی،

حالاتِ زندگی میرزا محمد امین وطناً شہرستانی تھا،[1] بعض نے سیستانی اور اصفہانی[2] بھی بتایا ہے،

[1] تاریخ گولکنڈہ، عبدالمجید صدیقی، ص ۲۹۲ [2] مآثر الامراء، شاہنواز خاں، ص ۲۱۲ (جلد سوم)

اس کے آبا و اجداد شہرستان کے مشہور سید گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، شاہی درباروں میں ان کی بڑی عزت و عظمت تھی، میرزا کے بڑے بھائی میرزا جلال الدین حسین صلائی[1] شاہ عباس صفوی کے عہد میں قاضی القضاۃ کے جلیل القدر عہدے پر فائز تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کے دوسرے بھائی میرزا تقی کے لڑکے میرزا رضی[2] اس عہدے پر سرفراز ہوئے، میرزا کے بچپن کے حالات کا سراغ نہیں ملتا، البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے چچا وغیرہ سے کسب علم کیا ہوگا، میرزا نے جلد ہی علوم متداولہ حاصل کر لیے تھے، اور انھیں اکاؤنٹسی (Accountancy) معاشیات (Revenue) اور سول ایڈمنسٹریشن (Civil Administration) پر عبور حاصل ہو گیا تھا، علی بن طیفور کے اس بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے،

"در فن استیفا و لیاقت بمرتبۂ مہارت کہ ہیچ کس از ابنائے روزگار بادے خیال مساوات بر لوح ضمیر نمی توانست نگاشت۔"[3]

ان اوصاف کے باوجود اس گوہر گرانمایہ کی اپنے وطن میں کوئی قدر و منزلت نہ ہوئی اور وہ آلام روزگار برداشت کرتا رہا، جب اسے کوئی امید نظر نہ آئی تو اس نے مادر وطن کو بحال تباہ[4] خیرباد کہا اور قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان جنت نشان کی طرف نکل پڑا، ان واقعات سے قیاس ہوتا ہے کہ ایرانی دربار سے میرزا کی کوئی چشمک ضرور تھی، ورنہ میرزا جیسا ماہر زمانہ جس کے اعزا و اقارب اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، کیوں وطن چھوڑنے پر مجبور ہوتا، اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا کہ وہ پہلے کس راستے ہندوستان میں داخل ہوا، اگر خیبر کی راہ سے آیا تو مغل شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر کے دربار میں براہ راست کیوں حاضر نہیں ہوا؟ اور

---

[1] مآثرالامراء، شاہنواز خاں ص ۲۰۷ (جلد سوم)، [2] ایضاً [3] حدائق السلاطین، علی ابن طیفور، مخطوطہ ص ۱۲۲ ورق ۱۰۵
[4] منتخب اللباب: خافی خاں ص ۲۵

کوشش سے شاہانِ گولکنڈہ کی سرکار میں لے گئی۔ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد مومن، مرتضائے ممالک اسلام، پیشوائے سلطنتِ قطب شاہیہ کی تحریک سے میرزا نے دربارِ گولکنڈہ کی راہ لی تھی۔

تاریخیں اس امر پر متفق ہیں کہ میرزا ۱۰۱۱ھ کے قریب گولکنڈہ آیا، اس وقت اسکی خوش قسمتی سے میر جملہ کی اسامی خالی تھی، ملک امین الملک الف خاں کے انتقال کے بعد سے یہ عہدہ خالی پڑا تھا اور سوری راؤ منصرا نہ طور پر میر جملہ کے فرائض انجام دے رہا تھا، محمد قلی قطب شاہ سوری راؤ کے انتظام اور نظم و نسق سے زیادہ خوش نہیں تھا، اکثر امراء اور اہلِ دربار بھی اس کے شاکی تھے، محمد قلی قطب شاہ کے ملک الشعراء وجہی نے سوری راؤ کے نظم و نسق کی مذمت ان اشعار میں کی ہے ؎

خونِ من صرفِ گردنِ راؤ است　　زیرِ جرم است استخواں ہائے

وعدہ می دہد مرا ہر روز　　کہ بہ آں وعدہ نے سرست نہ پاؤ

سال می رفت و ہنوز می گوید　　خوب ہے کیا ہتا ہے دیکھے جاؤ[2]

محمد قلی قطب شاہ کو اعلیٰ درجے کے منتظم، دیانت دار اور مدبر جملۃ الملک کی ضرورت تھی، چنانچہ ۱۰۱۱ھ مطابق ۱۶۰۲ء میں پیشوائے مملکت میر محمد مومن کی سفارش پر میرزا کو جملۃ الملک اور وزیر و مختار کل بنا دیا اور ایک اعلیٰ درجے کا قلمدان جو قیمتی جواہرات سے مرصع تھا، میرزا کو عطا کیا، میرزا کی قابلیت اور انتظام مملکت میں اس کے جوہر دیکھکر محمد قلی قطب شاہ نے ۲ لاکھ ہون سالانہ (یعنی زمانہ حال کے تقریباً ۱۰ لاکھ روپے) تنخواہ مقرر کی،

[1] تاریخ گولکنڈہ: عبدالمجید صدیقی، ص ۲۹۲

[2] کلیات فارسی۔ ملا اسد اللہ وجہی (قلمی) سالار جنگ لائبریری، نمبر ۱۵

اس کے علاوہ مختلف موقعوں پر شاہی عطیات سے نوازتا رہا، حدائق السلاطین کا بیان ہے:

"بانواع تشریفات شاہانہ واسپان بازین زر و فیلان کوہ پیکر معزز و ممتاز گردید"[1]

تقرر کے بعد ہی میرزا نے اپنی کارکردگی کے جوہر دکھانے شروع کیے، اس سلسلے میں انھوں نے اپنے پیش رو سوری راؤ برہمن کے حساب و کتاب کی تحقیقات کی اور ایک بڑی رقم اس کے ذمے واجب الادا نکلی، اس واقعہ نے سب کے کان کھڑے کر دیے اور سلطنت کے گوشے گوشے میں ان کی ہوشیاری کا چرچا پھیل گیا، اور سلطنت کے کارندے نہایت جانفشانی اور دیانتداری سے فرائض سلطنت انجام دینے لگے،

میرزا کو بادشاہ وقت کے مزاج میں کافی دخل تھا، وہ بلا کھٹکے بادشاہ کی خوابگاہ میں پہنچ جاتا تھا، اور اسے گہری نیند سے جگانے میں بھی گریز نہیں کرتا تھا[2]، اس سلسلے میں شاہنواز خاں رقمطراز ہیں:

"میرزا محمد امین از مددگاری بخت و توفیق اقبال در مزاج محمد قلی (قطب شاہ) چناں جا گرفت که او بخطاب میرجملگی بر نواخته، ہمگی حل و عقد امور بکار آگہی میر را گذاشت[3]"

اس کی مثالیں شاہان گولکنڈہ کے یہاں کم ملتی ہیں کہ انھوں نے اپنے کسی امیر کی دعوت قبول کی ہو، یہ فخر میرزا محمد امین کو حاصل رہا ہے کہ اس نے محمد قلی قطب شاہ جیسے پرشکوہ بادشاہ کو اپنے یہاں مدعو کیا، اور اس کی ایسی شاندار دعوت کی کہ جس کی مثال دکن کی تاریخ میں نہیں ملتی، میرجملگی کے عہدہ پر میرزا کا تقرر ۱۰۰۱ھ میں ہوا تھا اور ۱۰۰۲ھ میں اس نے بادشاہ کی دعوت کی تھی، اس دعوت کے تزک و احتشام کا حال

---

[1] حدائق السلاطین، علی ابن طیفور بسطامی ص ۸۱، [2] سلطان محمد قلی قطب شاہ، زور محی الدین قادری ص ۲۴۳ تا ۲۵۵ [3] مآثر الامراء، شاہنواز خاں (حصہ سوم) ص ۳۱۴

ڈاکٹر محی الدین قادری نے ان الفاظ میں دکھایا ہے :-

"اس موقع پر اس نے محل کو سات رنگوں کے دیبا سے سجایا تھا اور جملہ راستے عنبر و گلاب و مشک سے خوشبودار بنائے تھے۔ بادشاہ صبح کے وقت جب اس محل میں داخل ہوا تو میرزا محمد امین نے زربفت، اطلس مخمل اور مشجر کو پا انداز کر کے اپنی ڈیوڑھی کو رشک گلستان بنا دیا، بادشاہ کی آمد سے قبل ہی حیدرآباد کے تمام امرا، اعیان دولت، سلاحدار اور قدیم الخدمت ملازمین وزیر اعظم کے محل میں جمع ہو کر اپنی اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے، بڑے بڑے انشا پرداز اور شاعروں نے اس مجلس میں بادشاہ کی مدح میں قصیدے اور مضامین نثر پڑھ کر سنائے جن میں وزیر کو اس اعزاز و افتخار پر مبارکباد دی گئی تھی۔ اس کے بعد ماہرین رقص و سرود نے اپنے اپنے کمال فن کے اظہار سے مجلس کو مسرور کیا، پھر میرزا محمد امین نے بادشاہ کی آمد پر قسم قسم کی نادر و بیش بہا اشیا بادشاہ کی خدمت میں پیش کیں، مثلاً

(۱) تیس ۳۰ عربی النسل گھوڑے جن میں ہر ایک کی زین و لگام مرصع تھی،

(۲) بیس ہاتھی،

(۳) ایک سونے کا کمربند جس میں چودہ ۱۴ جواہر جڑے ہوئے تھے، اور جس کا چوکھٹا سونے کا تھا اور اس میں بھی جواہر لگے ہوئے تھے۔

(۴) قرآن مجید اور دوسری کتابوں کی چودہ خوشخط و مطلا و مذہب جلدیں،

(۵) دو سو عجیب و غریب سنکری غوری (؟)

(۶) دو سو باریک اور نفیس کشمیری شال

(۷) زربفت مخمل کمخواب مشجر اور اطلس کے چودہ چودہ تھان،

۸۔ خوشنما قالینوں کی تیس جوڑیاں،

۹۔ تیس عدد بند گرانی خوش رنگ و خوش قماش کافی طویل و عریض،

۱۰۔ چند سونے کی کشتیاں جن میں قسم قسم کے جواہر اور شمامہائے عنبر تھے۔

۱۱۔ ان کے علاوہ اور بہت سے بری اور بحری تحفے۔

اس قیمتی نذرانے کے بعد دسترخوان پر اتنے قسم کے کھانے، مشروبات اور میوے چنے گئے تھے کہ ایک مورخ کے بقول " بتخیلہ نگنجد و بشمار نیاید"۔ کھانے پینے سے فراغت کے بعد محمد امین نے جملہ ندیموں، قصہ خوانوں، شاعروں اور اہل نغمہ کو جو اس مجلس میں موجود تھے، تشریفات فاخرہ سے سرفراز کیا اور پچاس ہزار ہون نقد عطا کیے، بادشاہ کی خدمت میں جو نذر پیش کی تھی، تاریخوں میں اس کی قیمت ایکسو پچاس ہزار ہون کے لگ بھگ بتائی گئی ہے۔[۵]

جب بادشاہ دعوت سے لوٹنے لگا تو اس نے محمد امین کی عزت افزائی کے لیے اپنے کندھوں پر پڑی ہوئی زمردیں چادر نکال کر محمد امین کو عنایت کی، یہ اس زمانہ میں سب سے بڑا اعزاز تھا، اس کے علاوہ

(۱) زرنگار خلعت فاخرہ

(۲) پانچ ہاتھی،

(۳) پانچ عربی گھوڑے، جن کی زین اور لگام مرصع تھی، اور واپسی میں محمد امین کے نذر کردہ گھوڑوں میں سے ایک پر سوار ہو کر شاہی محل کو لوٹا۔

میرزا اگرچہ بڑا مدبر اور عالی خاندان تھا لیکن مزاج میں تندی و تیزی زیادہ تھی،

۵؎ سلطان محمد قلی قطب شاہ، زور، محی الدین قادری، ص ۳۵۰

معاملات میں نہایت متعصب واقع ہوا تھا، مآثر الامراء لکھتا ہے کہ

"میر اگرچہ در سیاست و شرافت نسب مرتبۂ بلند داشت اما از اخلاق مرضیہ و اطوار بہیہ نصیبہ نداشت، بسیار سبک مزاج و تند خو بود و مذہب امامیہ سخت متعصب .... روزے در حضور اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) تقریب مذہب درمیان آمد، میر بتندی حرف زد، پادشاہ فرمود کہ میر واقعی اصفہانی است کہ مردم آنجا بدرشتی و تندی اشتہار دارند۔"[1]

اس کی دوسری خامی یہ تھی کہ وہ رزم سے زیادہ بزم کا دلدادہ تھا، سنہ ۱۰۱۹ء میں وہ آخری بار وہ محمد قلی قطب شاہ کے حکم سے باغی پرتاب شاہ کی گوشمالی کے لیے گیا تھا، اس وقت بھی اس نے جس احتیاط سے کام لیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میدان کارزار کا سپاہی نہیں تھا، ایسے کاموں میں سستی سے کام لیتا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح جنگ ٹل جائے، قطب شاہ کو جملۃ الملک کی یہ عشرت پسندی اور امن دوستی پسند نہ تھی، چنانچہ اس نے ایک بار اس کو باغیوں کی بیخ کنی کی تاکید کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"خسرو زمان رکن سلطنت البہیہ و اعتماد الدولۃ العلیہ میرزا محمد امین میر جملہ فرمود کہ رفع آں مفسد اہم مہمات است و اہمال در تنبیہ آں مفسد موجب فساد۔"[2]

سنہ ۱۰۲۰ء میں میرزا کے قدردان بادشاہ کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا، اس کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی، اس لیے سلطنت کے وارث کا مسئلہ پیش آیا، اور مومن اور مرحوم بادشاہ کی وصیت کے مطابق محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا جانشین قرار پایا، تاریخوں میں اس سانحہ میں دوسرے امراء اور وزراء کے طرز عمل کا ذکر ملتا ہے، لیکن

---

[1] مآثر الامراء، شاہنواز خاں، ص ۱۶۳ [2] تاریخ قطب شاہی، ص ۳۰۷

مرزا کا کوئی ذکر نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آقا کے انتقال کے بعد اسے ہونے کا جواز ہی نہیں رہ گیا تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ محمد قطب شاہ سے خوش نہ ہو، اور اس سے کوئی رنجش ہو، گلزار آصفی [۲] کا مولف لکھتا ہے کہ محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد ہی میرزا نے اس کی خدمت میں رخصت کی عرضی پیش کی، محمد قطب شاہ اس سے خوش نہ تھا، اس لیے اس نے فوراً درخواست منظور کر لی، اور میرزا کو اپنے پورے مال و متاع کے ساتھ حیدرآباد سے چلے جانے کی اجازت دیدی، اور اس کی خدمات کا لحاظ کر کے اپنی طرف سے میرزا کو سفر کے اخراجات کے لیے دس ہزار ہون بھی عطا کیے، اگر محمد قطب شاہ کو میرزا سے کسی قسم کی خلش نہ ہوتی تو وہ ایسے قابل اور تجربہ کار شخص کو چلے جانے کی اجازت نہ دیتا، اس سلسلہ میں برہان مآثر کا بیان ہے کہ

"فتورے در مزاج استقلال خود مشاہدہ نمود و از روئے حزم و عاقبت اندیشی استعفائے خدمت کردہ استدعائے رخصت مراجعت بوطن مالوف نمود، واز فرط ہمت بلند نظر بمال و منال او نگردد"

۱۰۲۰ھ اور ۱۰۲۱ھ کے درمیان میرزا دربار بیجاپور میں بار یاب ہوا لیکن سلطان عادل شاہ نے دور اندیشی اور مصلحت کے پیش نظر میرزا کی ہمت افزائی نہیں کی کیونکہ وہ پڑوسی حکومت کا معزول شدہ امیر تھا، اس لیے اس کا تقرر حکومت کے مفاد کے خلاف تھا، اس واقعہ کو مآثر الامراء کے مصنف نے دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے:

"میرزا گولکنڈہ بہ بیجاپور پیوست، با عادل شاہ نیز صحبت او درنگرفت"[۱]

اب میرزا کے پاس اپنے وطن کی واپسی کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا، اس لیے اپنے بیوی

---

[۱] مآثر الامراء، شاہنواز خاں، ص ۴۱۵،

اثاثے کے ساتھ ایران چلا گیا اور ۲۲ ویں سال جلوس ۱۰۳۶ھ میں شاہ عباس صفوی کے دربار میں اپنے بھتیجے میرزا رضی (رفیع) کے توسط سے حاضر ہوا۔ میرزا شاہ عباس سے کسی اعلیٰ عہدے کا خواہشمند تھا۔ چنانچہ اس نے بادشاہ کی خدمت میں تقریباً ایک لاکھ کی قیمتی نذر[1] پیش کی، لیکن شاہ عباس کو معلوم تھا کہ میرزا کی ملکیت میں کئی جواہر ہیں، وہ انھیں حاصل کرنے کی فکر میں تھا[2]، اس لیے میرزا کو کسی عہدے پر مقرر کرنے میں توقف سے کام لیا۔

میرزا کی قیافہ شناس طبیعت نے اس کو بھانپ لیا اور بقول کلیم اصفہانی ؎

در خاک وطن تخم مرادی نشود سبز
بیہودہ کلیم این ہمہ سرگرم سفر نیست[3]

اس لیے اس نے دوبارہ ہندوستان لوٹنے کا فیصلہ کیا، اور اپنے ارادے سے شہنشاہ جہانگیر کو مطلع کیا۔ جہانگیر کو میرزا کی خوبیوں کا علم پہلے سے تھا، اُس نے اپنے قلم سے میرزا کے نام فرمان لکھکر اس کو بلایا، چنانچہ جمعہ ۲ ربیع الاول ۱۰۲۷ھ کو میرزا دربار جہانگیری میں حاضر ہوا، جہانگیر تزک میں میرزا کے متعلق لکھتا ہے:-

"اسی دن میر جملہ عراق سے یہاں پہنچکر آستان بوسی سے مشرف ہوا، یہ اصفہان کے سادات خاندان سے تعلق رکھتا ہے، اب اس کا بھتیجا میر رضی میرے بھائی شاہ عباس کی خدمت میں صدارت کے عہدے پر فائز ہے، اور شاہ نے اپنی دختر کی نسبت اس سے کی ہوئی ہے، یہ شخص عرصہ چودہ سال ہوا کہ عراق سے ہندوستان آکر محمد قلی قطب الملک کی خدمت میں پہنچ گیا تھا، اس کا اصلی نام محمد امین ہے، اور میر جملہ کا خطاب اسے

---

[1] مآثر الامراء، شاہنواز خان ص ۵۳۰ تا ۵۳۱، منتخب اللباب، خافی خان ص ۱۳۰ (حصہ دوم)

[2] مآثر الامراء، شاہنواز خان ص ۵۳۱ [3] ابوطالب کلیم اصفہانی، شریف النساء بیگم انصاری

قطب الملک نے دیا تھا، یہ دس سال تک قطب الملک کی خدمت میں رہا اور میر
سامان کے عہدے تک ترقی کی، قطب الملک کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا ریاست
والی مقرر ہوا تو اس نے میر جملہ سے خاطر خواہ سلوک نہیں کیا، اس لیے وہ دل برداشتہ
ہو کر واپس عراق چلا گیا، شاہ عباس نے میر جملہ سے اس کی قرابت داری کا لحاظ
کرتے ہوئے نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا، اس نے اپنے نادر تحائف شاہ کی خدمت میں
پیش کیے، اور تین چار سال تک عراق ہی میں مقیم رہا، اس کے متعلق اطلاع ملتی رہی
کہ وہ ہندوستان آنے کی خواہش رکھتا ہے، اسے میں نے فرمان بھیج کر اسے اپنے دربار
میں طلب کر لیا، اس نے دربار میں حاضر ہو کر آستاں بوسی کی سعادت حاصل کی،
اور بارہ[۱۲] گھوڑے، نو[۹] کشتیاں اعلیٰ اور نادر سامان سے بھری ہوئی اور دو[۲] انگوٹھیاں
میری خدمت میں پیش کیں، جس عقیدت اور خلوص دلی سے وہ میری خدمت میں
حاضر ہوا تھا، میں نے اس پر نوازشات کرتے ہوئے بیس[۲۰] ہزار درب بطور اخراجات
اور خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کیا[۱]۔"

میرزا نے جہانگیر کی خدمت میں بھی ایک گرانقدر نذر پیش کی جس کی قیمت کم از کم
پچاس[۵۰] ہزار روپے تھی، اس میں حسب ذیل چیزیں تھیں،

گھوڑے ۱۲ عدد، زربفت کے تھان ۹ عدد، یاقوت کی انگشتریاں ۲ عدد۔ اسکا
تذکرہ تزک، اقبال نامہ اور منتخب اللباب میں ہے،

جہانگیر نے میرزا کو دو ہزاری، دو پانصدی، و دو بست، سوار کا منصب عطا اور عرض مکرر
کے عہدے پر فائز کیا، پھر ارادت خاں کے منصب میں تبدیلی کے بعد میرزا کو میر ساماں بنایا[۲]

---

۱ تزک جہانگیری: نورالدین محمد جہانگیر [ترجمہ مولوی احمد علی] ص ۲۹۰ ۲ مآثر الامراء: شاہنواز خاں ص ۴۱۵

جہانگیر کے انتقال کے بعد شاہجہان نے بھی میرزا کی ہر طرح سے عزت افزائی کی، شاہنواز خاں لکھتا ہے:-

"چوں نوبت سلطنت به اعلیٰ حضرت رسید، مدتے بوسیلہ در ایں بندگی بمیر سابق اختصاص داشت و در سال ہشتم از تغیر اسلام خاں بجائے و دلائی میر بخشی گیری برآمد باضافہ ہزاری پانصد سوار بمنصب پنجہزاری دو ہزار سوار چہرۂ کامیابی برافراخت[1]"

میرزا خوش نصیب امیر تھا، اسے گولکنڈہ اور مغل بادشاہوں کی خدمت کا موقع ملا، اس نے دونوں جگہ اپنی قابلیت اور صلاحیتوں کا ثبوت دیا، اور "امین الملک اور آصف دوراں[2]" کے لقب سے یاد کیا گیا، اس نے نہ صرف حکومت کے انتظامی فرائض انجام دیے بلکہ بیرونی طاقتوں کے مقابلے میں قطب شاہی فوجوں کی کامیاب رہنمائی کی[3]، اسے نوادرات جمع کرنے، خوشنما باغات وغیرہ بنانے کا بڑا شوق تھا، حیدرآباد کے دوران قیام میں ندی کے کنارے ایک عالیشان باغ بنوایا تھا، اس باغ کی ہر روش سے تزک احتشام کی شبنم ٹپکتی تھی، اس کے چلے جانے کے بعد یہ باغ شاہی تفریحگاہ اور شاہی مہمان خانے کے کام آتا تھا، یہ امین باغ کے نام سے ابتک موجود ہے، اور زنانہ اسپتال بنا دیا گیا ہے[4]۔

ملا نظام الدین احمد اس باغ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"باغ میرزا محمد امین میر جملہ ماضی کہ قطعہ ایست از بہشت بریں[5]"

"باغ میرزا محمد امین میر جملہ ماضی بہترین مقامات و منازل دارالسلطنت است[6]"

میرزا نہایت فراخ دل اور فیاض تھا، اس نے قحط کے زمانے میں لنگر خانے کھلوائے،

---

[1] مآثر الامراء، شاہنواز خاں ص ۱۵۷ [2] تاریخ گولکنڈہ، عبدالمجید صدیقی ص ۲۹۲ [3] ایضاً ص ۱۱۰-۱۱۱
[4] حدیقۃ السلاطین: ملا نظام الدین احمد ص ۴۳، [5] سلطان محمد قلی قطب شاہ: زور محی الدین قادری ص ۲۰۰
[6] حدیقۃ السلاطین: ملا نظام الدین احمد ص ۶۲ [7] ایضاً ص ۱۳۳

آثرالامرا میں ہے:-

"گویند کہ در سال چہارم کہ اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) بخطۂ برہانپور اقامت داشت، بنا بر امساک باراں گرانی و غلا بجائے انجامید کہ جانے بنانے میدادند کسی نمی خرید و شریف و ضعیف می فروختند نمی ارزید، متصدیان مہمات پادشاہی و حسب الحکم والا آش پزخانہا (لنگرہا) در ہر بلدہ ترتیب دادند در آں ہنگام میر جملہ نامے بسخاوت برآورد و شب و روز در ایران پر لنگر طعام جاری داشت و نقد و اجناس نیز بمردم خیرات کرد اگرچہ آں وقت ہم مردم ایران می گفتند کہ کرم میر جملہ نیست اما ایں طعن و سرزنش صریح ناشی از سوئے باطن است۔ والا ایں امر بتکلف ہم مورد تحسین و محل جزا است۔"[۵]

۱۰۴۴ھ مطابق ۱۶۳۴ء میں میرزا پر فالج کا دورہ پڑا، اور اسی مرض میں جہان فانی کو خیرباد کہا۔ اور اکبرآباد (آگرہ) میں سپرد خاک کیا گیا۔[۲]

شعرا کی سرپرستی

میرزا نے ہندوستان میں چھتیس[۳] سال کا زمانہ گزارا، حیدرآباد کے دوران قیام میں متعدد ادبا، اور شعرا کا ساتھ رہا، پیشوائے مملکت میر محمد مومن ایک جید عالم اور کامل صوفی تھے، انھوں نے قطب شاہی دربار کی زینت کے لیے بہت سے علما فضلا، اور لائق وزرا جمع کر لیے تھے، ان میں قاضی سمنانی، میرک معین الدین سبزواری وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ میرزا بھی اسی زمرے میں ہیں، اس کو شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق تھا، وہ خود بھی خوشگو شاعر و ادیب اور شعرا و ادبا کا بڑا قدردان تھا، اس نے جس شاعر کی سرپرستی کی اسے ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا گیا۔ ان میں سب سے پہلے قطب شاہی دربار کا یکتا ملا وجہی قابل ذکر ہے۔ اس کو نثر اور نظم دونوں پر قدرت تھی، اس نے

---

[۵] ماثرالامرا: شاہنواز خاں ص ۷،۱۴ (حصہ سوم) [۲] محمد قلی قطب شاہ، شیروانی ہ ۔ک۔ (انگریزی) ص ۵۰-۵۹

شعر گوئی میں میرزا کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، اور اپنی شاعری میں بارہا اُن کے کمالات کا اعتراف کیا ہے:

سخن را سد رتبی رسانیده ام | که روح الامین خواند استاد من[1]

عالے رای کم شاگرد داند اعجاز طبع | وہ ہست استادم گرد و علا ہیں پیشہ را[2]

جب میرزا دربار جہانگیری میں حاضر ہوا تو اس کی قدر دانی کا شہرہ سنکر صحیفۂ غزل کا آخری ورق[3] ملک الشعراء مرزا ابوطالب کلیم میرزا سے وابستہ ہوا۔ ۱۰۳۲ھ اور ۱۰۳۶ھ کے درمیانی عرصے میں کلیم نے میرزا کے سوا کسی سے توسل اختیار نہیں کیا، اور میرزا کی مدح میں پر زور قصائد لکھے، ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

در تہنیت عید و مدح میر جملہ روح الامین

قدسیاں کردند مشق نام آں فرخنده فال | شکل نون بر لوح گردون بنگر اینک از ہلال
پادشاہ کشور دانشوره روح الامیں | آنکہ از ضبطش مزاج دہر داده اعتدال
از حروف حلقه دارش حلقه در گوش افگند | گر بخواہم بیتی از دیوان تو بر اہل حال
جند اوراق دیوان تو بہر جلدش در خستن | پوست را از تن بدندان میکشد بریوں غزال
لفظ بر معنی دلالت میکند وزبس ظہور | در ہمہ اشعار تو معنی بود بر لفظ دال
نقطہ بر فوق حروفش ہمچو اختر بر سپہر | تحت الفاظش نقطہ چوں در ته دریائے لال
خلعت الفاظ بر قد معنی دوختہ | راست ہمچوں جامۂ کلک تو بر بالائے نال
گر ز کلک سحر سازش فقط گیرد بہ الف | پشت او از بار معنی خم شود مانند دال
بسکہ مربوط اند معنیہا بہم چوں سلسلہ | جزو ہا یا بند بے شیرازہ با ہم اتصال

[1] کلیات فارسی: ملا اسد اللہ وجہی (قلمی) سالار جنگ لائبریری نمبر ۱۱۵ [2] ایضاً [3] شعر العجم، مولانا شبلی نعمانی ص ۱۸۵ (حصہ سوم)

ازکمال جا بود کز ذہن النیام — ریشہا در خامہ ات معنی فرو چیدہ تو نال

در ضمیرم ہست معنیہا ولی بس می کنم — کز پریشانی گفتم نگرفت صاحب ملال

ہاں کلیم از حال خود حرفی نگوئی زینہار — تا دعا باشد کسی ہرگز نگوید شرح حال

کلیم نے غزلوں میں بھی روح الامین کی تعریف وتوصیف کی ہے:[1]

ہرکہ بہ روح امیں شعر خواندت کلیم — گر ہمہ روح امین است سخنداں نشود

دولت گوش زد روح امیں گشت کلیم — پس بود گر سر تحسین طپیدن واری[2]

اس سے یہ قیاس اغلب ہے کہ کلیم کو ملک الشعرائی کا خطاب دلانے میں میرزا کو بڑا دخل تھا،

تصانیف | میرزا کی چند تصانیف ہمارے علم میں آگئی ہیں، فارسی دیوان کے علاوہ خمسہ نظامی کی طرز پر ان کی پانچ مثنویاں بھی ہیں، "دکھنی کے چند تحقیقی مضامین" میں مولوی نصیرالدین ہاشمی رقمطراز ہیں کہ "روح الامین کی بیشتر مثنویاں شائع ہو چکی ہیں، مگر راقم کی نظر سے روح الامین کی کوئی شائع شدہ مثنوی نہیں گذری، البتہ مختلف کتب خانوں میں روح الامین کی مثنویوں کے مخطوطے ملتے ہیں، انگلستان اور پیرس کے کتب خانوں میں بھی ان کے چند نسخے محفوظ ہیں، ڈاکٹر رضیہ اکبر (عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) نے روح الامین کی ایک نادر مثنوی کا نسخہ جس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں نہیں ہے، اپنے ایران کے سفر میں غالباً "ملیک" لائبریری میں دیکھا تھا

آیندہ سطور میں میرزا کی تصانیف کا مختصراً تعارف اور تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) گلستانِ ناز :- میرزا نے اپنے فارسی مجموعۂ کلام کا نام گلستانِ ناز رکھا، اس کے

---

[1] ابوطالب کلیم اصفہانی: شریف النسا بیگم انصاری ص ۲۰۴

[2] ایضاً ۳۳۹ ،

ابتدائی صفحات میں دیباچہ لکھا ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ میرزا کا یہ کلام عہد جوانی کی یادگار ہے۔ اس میں ڈھائی ہزار اشعار ہیں۔

یہ دیوان کم و بیش دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے چار مخطوطے راقم کے علم میں ہیں: ایک نسخہ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں ہے، فارسی مخطوطات کی فہرست میں اس کا نمبر ۳۲ ہے، یہ نسخہ ناقص الاول ہے، سنہ کتابت، کاتب اور مقام کتابت کا کوئی ذکر نہیں ہے،

اس دیوان کے کچھ منتخب اشعار یہ ہیں:-

اے روشن از فروغ تو شمع زبان ما — ذکر قدرت تو چه حیرت بیان ما
ما را زبان کجاست که وصف ادا کنیم — وصف ترا زبان تو گفت از زبان ما
چو قول ما فلک همه تن گوش گشته است — گردیده اند لوح و قلم هم زبان ما
آن بیت لیک صاف تر از آب زندگی — روح الامین نظیر ندارد بیان ما

چه سود بود که روح الامین ز سودا کرد — بکالای دولت تو بفروخت دین و دنیا را

تنها نه همین روح الامین بدر تو گشته — صد فوج ملک منتظر و چشم [illegible]

ای ناخدا از سعی طوفان زیاده شد — آورده اند ساحل مقصود رخت ما
ما بادشاه مملکت درد و بخششیم — گردون شده ست حسرتی تاج و تخت ما

روح الامین غم دو جهان از تو وارستی — ازین سبب به بزم عالم نمی رسد

هزار قافلهٔ بوی خوش نسیم آرد — چه سود دل آشنا نمی آرد
بساحلی که دل آنجاست کشتی یار را — خدا رساند اگر نا خدا نمی آرد

بیا بیا که تو لی آرزو دل ما را — بیا بیا که تو هر [illegible]
برگ و زندگیم احتیاج است بتو — بچشم ز [illegible]

دل پر آتش و چشم پر آب و سینہ چاک — بگفت عشق بروح الامین مدد گاری

از کثرت اغیار شدی کار تو دشوار — اے روح امین عشق چو مشہور نبود کا

گفتم صاحب نظر از چشم یاد دی کے — بے نیاز م کرد و از خورشید مہ روی کے

گفتم خود جب کہ بی برگ کا ہی از غم عشق — تا برد باد صبا آساں مرا سوئے کے

حال ہند و شیخ بعین جا کہ دو زان گنج لب — زیں سبب روح امیں کرد و تدہ ہند و کے

(۲) شیریں خسرو :۔ میرزا نے نظامی گنجوی کے خمسہ پر اساتذہ کے تتبع میں پانچ مثنویاں لکھی ہیں، ان میں سب سے پہلے "شیریں خسرو" لکھی اور اسے محمد قلی قطب شاہ کے نام سے منسوب کیا۔ اس مثنوی کے ۱۳۱ صفحات ہیں، ابتدا میں چند صفحوں کا ایک دیباچہ بھی ہے،

اے بشہ بدست قدرت کروی کمر منت نہادہ تا جش الخ

مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :۔

الٰہی ہمچو صبحم سینہ بکشائی — ز چاک سینہ ام خورشید بنمائی

[شیریں خسرو]

(۳) مطلع الانظار :۔ اس مثنوی کے دو مخطوطے نمبر ۹۸۵ اور ۱۰۴۳ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں ہیں، ان میں سے ایک کرم خوردہ ہے، اس میں آٹھ اوراق کا ایک نثری دیباچہ بھی ہے جس میں مصنف لکھتے ہیں :

مشرق ذیابتہ ابجد خورشید حمد خدائے بیزوال رشک خاور ساختم، ندائی داد کہ اللہ کبیر عالم تعلیمون، بگوش ہوش رسیدہ الخ

یہ مثنوی [illegible] میں تصنیف ہوئی، جب مصنف ایران میں شاہ عباس کے دربار میں صلے کی تمنا میں وہاں گئے ہوئے تھے۔ شاہان گولکنڈہ کی گذشتہ قدردانی کے اعتراف میں یہ مثنوی محمد قلی قطب شاہ کے نام سے منسوب کی ہے، اس کے صفحات کی تعداد ۱۰۷ ہے، اس کے چند اشعار یہ ہیں

تیغ گهی سخن آمد نخست　　　بیهوده بالی است نشه پیت

بیهوده سازد چو بجایش سخن　　　بسر شد افتاده به ابا ز جهان

هرچه درین خانه شد از بیغشی　　　گر چه چرخ است ز ذات خداست

صانعِ این گنبدِ فیروزه رنگ　　　لعل برآرنده ز پهلوی سنگ

هرچه پدید آورد از بار و برگ　　　ره سپرانند ز گردون بسر

روح یقین بخشِ دلِ مقبلان　　　خورده و دیدهٔ صاحبدلان

باغِ دل آباد کن از نخلِ نور　　　غنچهٔ جان پرورد از آب سرور

[از صفحه ۵۳]　مقاله دوم در بیان کیفیت طبع آدمی و چگونگی حال او

ایکه ترا آدم خاکیست نام　　　از چه شده شعلهٔ تو وقتِ خام

خاک تو گر دیده چو آتش ز چه　　　همچو هوا در رگ و سرکش ز چه

طبعِ تو در اصل بود سرد و خشک　　　از چه شده گرمیش افزون ز مشک

طبع ترا سرد خدا آفرید　　　تا که شوی گنج گهر را کلید

جوش زدی تا همه از سر شدی　　　مشک صفت دشمنِ گوهر شدی

خرمن شکش بگهر بار نیست　　　هر گهرت لیک بباید گریست

خاکِ ترا همدم جان کرده اند　　　آدمیت نام ازان کرده اند

همدم جان بارکش گل چرا　　　صاحبدل بیخبر از دل چرا

[اختتامیه اشعار صفحه ۱۰۹]

روح آمین است شد ابریم گشت　　　گشت ولش ... بهشت

نو نو شنواز بیا ترا بگفت　　　طبع افکار بیک چه گفت

بود گذشتہ ز ربیع نخست — بست و ششم روز وہ ساعت درست

یک ہزار و نہ ز فصل بہ شاد — فوزدہ اختر شدہ بر ہر مراد [ت ۱۰۲۶ھ]

شکر خدا از ین شکرستان من — گشت پر از قند سراسر دکن

شاہ جہانگیر کہ خود عکس اوست — بیشترش دارد از ماہ دوست

کردہ ام این نامہ بنامش تمام — بادمہش بندہ و مہرش غلام

روح آمین بہرہ ور از خوان او — سرخوش از بادۂ احسان او

باد خدا یار دہ عدل و داد — خاطر ناظم کن از عشق شاد

عفو کنش جرم کہ شرمندہ است

مردہ بتن لیک بدل زندہ است

(۴) لیلیٰ مجنوں :۔ یہ مثنوی بھی محمد قلی قطب شاہ کے نام سے معنون کی گئی ہے، دوسری مثنویوں کی طرح اس میں بھی چند صفحات کا دیباچہ ہے۔ اس میں ۱۹۰ صفحات ہیں، مثنوی کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے ؎

اے حسن طراز عشق پرداز

انجام نمائے کار از آغاز

اس مثنوی میں میرزا نے نظامی گنجوی کی بڑی تعریف کی ہے، اور کئی شعرا پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

(۵) آسمانِ مُعظم یا فلک البروج :۔ نظامی کی ہفت پیکر کے پس منظر اور اسی نہج پر لکھی گئی ہے، اس میں ۴۸ صفحات ہیں، اس کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے :

اے روان آفرین دل آرائے — مے خرد از تجلیش راہنمائے

[illegible] تمام [illegible]

[illegible] زیب [illegible]

شد چون این کار با سر بلند تمام   کہ بخشد آسمان [illegible] تمام

(۶) سکندر نامہ :- راقم کا خیال ہے کہ اس مثنوی کا نام "سکندر نامہ" کی مناسبت سے "قطب نامہ" ہونا چاہیے۔ افسوس ہے کہ اس کی کوئی نقل یا مخطوطہ ہندوستان کے کسی کتب خانے میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر رضیہ اکبر (پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد) نے اس کا ایک نسخہ ایران کے سفر میں کسی کتب خانے میں دیکھا ہے۔

طاہر نصر آبادی حدیقۃ العالم میں لکھتا ہے کہ روح الامین کے اشعار کی تعداد بیس ہزار تھی، دست برد زمانہ کے ہاتھوں ان کا بیشتر کلام تلف ہو گیا، میرزا چونکہ نظامی سے بہت متاثر تھے، اس لیے انھوں نے بعض دوسرے شعرا کی طرح نظامی ہی کا تتبع پسند کیا، اس کے کلام میں شعری و ادبی محاسن بہت کم نظر آتے ہیں، ان کا دیوان حسن و عشق کے فرسودہ خیالات سے بھرا ہوا ہے، اس میں کوئی فلسفیانہ یا پرکشش تخیل نہیں ہے، یہی حال مثنویوں کا ہے، البتہ کہیں کہیں ندرت ادا اور جدت تخیل کی جھلک نظر آتی ہے، جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے، میرزا کا طرز قدیم رنگ سخن میں ڈوبا ہوا ہے، روزمرہ، محاورے، تلمیحات و تشبیہات میں بھی کوئی ندرت نہیں ہے۔ البتہ یہ چیز قابل تعریف ہے کہ گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کی مشق سخن بھی جاری رہی، اس کی بیشتر مثنویاں محمد قلی قطب شاہ کے نام سے منسوب ہیں، اگر ان کا دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ان میں محمد قلی قطب شاہ کے حالات سے متعلق بہت سے نئے معلومات فراہم ہو سکتے ہیں، میرزا کے ہمعصروں میں ظہوری، ملک قمی، آتشی، عرفی، ابو طالب کلیم، حاجی محمد خان قدسی [illegible]

اور میر کمال الدین سبزواری تھے ایسے بلند پایہ شعرا کے سامنے میرزا کا چراغ جلنا محال تھا۔ مگر داستانوں پتا ہے کہ میرزا کو سخن فہمی اور سخن سنجی میں پورا ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے وجہی اور نظامی جیسے شعراء کی سرپرستی کر کے انھیں شہرت و سربلندی عطا کی۔ پروفیسر ٹی۔ این۔ دیوارے نے میرزا کی ادبی صلاحیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"He was a prominent literary artist of that period' was distinguished for his celebrated imitations of Nizamis Masnavi"۱

میرزا کے متعلق ایچ۔ کے۔ شیروانی صاحب نے اپنی رائے کا اظہار یوں فرمایا ہے:۔

In spite of his obvious preoccupations as a statesman and a soldier Mirza Mohammad Amin found time to compose some fine poetry. He was so confident of his own capacity that he, in a way, challanged such a masterly work as the Khamsah Nizami ych... while the collection of his other poems both Gazals and quatrains called Gulistan-e-Naz, is a valuminous book of considerable merit."۲

---

۱ Literary history of Persian Literature: T. N. Devare.

Mohd Quli Qutub shah: H. K. Sherwani. P. 59. ۲

حوالہ جات

مصنف یا مولف	نام کتاب	صفحہ نمبر
۱ ؟	تاریخ قطب شاہی	ص ۲۶۴
۲۔ خواجہ غلام حسین خاں	[illegible]	" ۳۰
۳۔ خافی خاں	منتخب اللباب	حصہ اول ص ۲۹۶، حصہ دوم صفحہ ۱۳۵
۴۔ ڈیوڈ ، ای، این	اے شارٹ ہسٹری آف پرشین لٹریچر	ص ۱۷۶
۵۔ زور، ڈاکٹر محی الدین	سلطان محمد قلی قطب شاہ	ص ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۶، ۳۲۷ " ۳۴۲ تا ۳۵۵، ۳۸۴
۶۔ زور "	اردو شہ پارے	
۷۔ زور "	حیات میر محمد مومن	ص ۴۰، ۴۱، ۵۰ تا ۵۸، ۶۶، ۷۰
۸۔ شبلی نعمانی	شعر العجم حصہ سوم	" ۱۸۵
۹۔ شیروانی، ایچ، کے	محمد قلی قطب شاہ [انگریزی]	" ۵۸، ۵۹
۱۰۔ شاہنواز خاں	مآثر الامراء حصہ سوم	" ۴۱۳ تا ۴۱۸
۱۱۔ شریف النساء بیگم انصاری	ابو طالب کلیم اصفہانی	" ۴۲، ۴۳، ۲۴۹
۱۲۔ طاہر نصر آبادی	حدیقۃ العالم	" ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۵۴، ۲۵۵
۱۳۔ علی ابن طیفور بسطامی	حدائق السلاطین	مخطوطہ ص ۱۸۲ تا ۱۸۷
۱۴۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری	تذکرۂ شعرائے دکن	حصہ دوم ص ۹۴۷
۱۵۔ عبدالمجید صدیقی	تاریخ گولکنڈہ	ص ۱۱۰، ۱۱۱، ۲۵۹، ۲۹۲
۱۶۔ محمد صالح کنبو	اعمال صالح	" ۹۶۷
۱۷۔ معتمد خاں	اقبال نامۂ جہانگیری	" ۱۰۸
۱۸۔ ملا نظام الدین احمد	حدیقۃ السلاطین	" ۱۶، ۹۲، ۹۴، ۱۳۳، ۱۸۴
۱۹۔ نور الدین محمد جہانگیر	تزک جہانگیری (ترجمہ مولوی احمد علی)	" ۲۹۲، ۳۰۲، ۳۰۸، ۴۲۱
۲۰۔ دجی اسد اللہ	کلیات فارسی (قلمی)	سالار جنگ لائبریری حیدرآباد نمبر ۵۱۱

"سراجاً منیراً"

(علمی و عقلی نقطۂ نظر سے)

از

جناب محمد شہاب الدین صاحب ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور

نیّرِ فلکی قرآن کریم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری دنیا کے لیے خالق عالم نے دو روشن چراغ مہیا کیے ہیں، ایک مادی اور دوسرا روحانی، یعنی ایک آفتاب عالم جو ہماری مادی کائنات کو روشن کرتا ہے اور دوسرا آفتاب رسالت جو ہماری روحانی دنیا کو منور کرتا ہے، ایک سے ہماری دنیوی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور دوسرے سے روحانیت کی آبیاری اور اس کا نشو و نما ہوتا ہے، اول سے حیوانی زندگی برقرار رہتی ہے، ثانی سے اخلاقی زندگی کی تعمیر و تکمیل ہوتی ہے، انسانیت کی بقا کے لیے یہ دونوں ہی ضروری و لازمی ہیں، ان دونوں میں سے کسی ایک کا عدم ہمارے پورے عالم ارض کو تباہ کر دے گا، غالباً اسی بنا پر قرآن حکیم میں ان دونوں کو "سراج" (چراغ) سے تشبیہ دی گئی ہے، سورج کے بارے میں ارشاد ہے:

تَبَارَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ	بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے آسمان میں
بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرَاجًا وَّ	بہت سے بروج (کہکشائیں) بنا دیے
قَمَرًا مُّنِیْرًا (فرقان - ۶۱)	اور ان میں (چمکنے کے لیے) ایک چراغ (سورج)
	اور ایک روشنی دینے والا چاند بنا دیا۔

اس آیت کریمہ میں چراغ سے مراد سورج ہے جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر وضاحت کی گئی ہے،

وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (نوح ۱۶) اور سورج کو اس نے چراغ بنایا۔

ایک اور موقع پر اس کی وضاحت بھی فرما دی کہ یہ چراغ بہت زیادہ تابناک اور بھڑکدار ہے:

وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (نبا ۱۳) اور ہم نے ایک بھڑکدار چراغ بنا دیا ہے،

اسی طرح آفتاب رسالت یعنی پیمبر آخر زماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سراج سے تشبیہ دی گئی ہے،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ — اے نبی ہم نے آپ کو (تمام لوگوں کے لیے)
شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا — نگراں، مبشر اور متنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے
وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ — نیز اللہ کی طرف سے اسی کے حکم سے بلانے والا
وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (احزاب: ۴۵-۴۶) — اور روشن چراغ بنا دیا ہے،

قرآن مجید میں لفظ "سراج" کا تذکرہ ان ہی چار مقامات میں آیا ہے، اور بجز آفتاب عالم اور آفتاب رسالت کے کسی اور شے کو سراج سے تشبیہ نہیں دی گئی ہے۔ اس لیے سوال یہ ہے کہ خصوصیت کے ساتھ ان ہی دو کو سراج سے کیوں موسوم کیا گیا، اور اس میں کیا حکمت ہے؟ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، ایک سے اگر ہماری حیوانی زندگی برقرار رہتی ہے تو دوسرے سے روح کی غذا فراہم ہوتی ہے۔ اس مضمون میں ان ہی دو آفتابوں کی کارکردگیوں کا جائزہ لینا اور انسانی زندگی پر ان کے اثرات دکھانا مقصود ہے۔ اس لیے پہلے سورج کی ضرورت و اہمیت کا سائنسی نقطۂ نظر سے ایک

مختصر سا جائزہ لیا جائے، پھر نبوت و رسالت کی ضرورت و اہمیت پر ایک نظر ڈالی جائے،

آفتاب کی روشنی آفتاب کو سراج (چراغ) اس بنا پر کہا گیا ہے کہ اس کی حرارت اور روشنی ذاتی ہوتی ہے، چاند کی طرح مستعار نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں چاند کو کسی ایک مقام پر بھی سراج نہیں کہا گیا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سورج کو ایک دوسرے موقع پر بصراحت "ضیاء" اور چاند کو "نور" قرار دیا گیا ہے،

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً — وہی ہے جس نے آفتاب کو (انتہائی) روشن

وَّالْقَمَرَ نُوْرًا (یونس: ۵) — بنایا اور چاند کو نور بخشا۔

لفظ "ضیاء" قواعد کی رو سے مصدر ہے جو فاعل کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور مبالغہ کا صیغہ بھی،[1] انتہائی نور کو ضوء اور ضیاء کہتے ہیں۔[2] اور نور وہ بے کیف چمک ہے جو خود ظاہر ہو اور کسی دوسری چیز کو ظاہر کر دیتی ہو،[3] نور کا اطلاق نور بصیرت پر بھی ہوتا ہے، اور نور بصارت پر بھی،[4] بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ضیاء کسی چیز کی مستقل روشنی کو کہتے ہیں، اور نور مستعار روشنی کو، اس لیے اس موقع پر سورج اور چاند کی روشنی کیلیے الگ الگ الفاظ لانے کا مقصد یہ ہے کہ دونوں کی کمیت و کیفیت یکساں نہیں ہے،

سورج کا ٹمپریچر سائنسدانوں کا اندازہ ہے کہ سورج کی سطح کا درجۂ حرارت چھ ہزار ڈگری ہے، اور اس کے مرکز کا درجۂ حرارت ڈیڑھ ت.. کروڑ ڈگری ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ کروڑوں میل کی مسافت سے زمین کو گرم اور منور رکھتا ہے، اندازہ لگایا گیا ہے کہ استوائی خطہ کی ایک ایکڑ زمین پر ایک دن میں جتنی حرارت پہنچتی ہے، اس کی مقدار

---

[1] روح المعانی بحوالہ لغات القرآن [2] تفسیر بیضاوی بحوالہ لغات القرآن

[3] تفسیر کبیر بحوالہ لغات القرآن [4] مفردات القرآن بحوالہ لغات القرآن

اتنی ہے جتنی چار ارب ٹن کوئلہ جلاکر حاصل کی جاتی ہے۔

قرآن حکیم میں سورج کو نہ صرف سراج کہا گیا ہے بلکہ اسکے ساتھ "وہاج" (بہت زیادہ بھڑکیلا) بھی قرار دیا گیا ہے، جس سے غالباً اسی بے انتہا حرارت وتپش کی طرف اشارہ مقصود ہے، اس طرح جدید انکشافات قرآنی انکشاف ہی کی تشریح وتفسیر نظر آتے ہیں، ذرا سوچیے تو سہی چودہ سو سال پہلے کے ناخواندہ اور غیر ترقی یافتہ معاشرہ کو سمجھانے کے لیے اس سے بہتر کون سے الفاظ استعمال کیے جا سکتے تھے، جن سے موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی ان کا مفہوم بدلنے نہ پائے!

سورج کی کارفرمائی اب آپ اس عالم رنگ وبو میں جاری وساری ہر قسم کے حیاتیاتی ہنگاموں کا جائزہ لیجیے، تو آپ کو "زندگی" کی ہر ہر "حرکت" میں خواہ وہ حیوانی زندگی سے متعلق ہو یا نباتاتی زندگی سے، آفتاب اور اسی کی حرارت وضیاء فشانی ہی کارفرما نظر آئے گی، اگر سورج نہ ہوتا تو ہمارا کرۂ ارض ہمیشہ تاریک رہتا، اور دنیا کے تمام سائنسدان مل کر بھی کسی ایک خطۂ ارض کو بھی اس قدر روشن نہیں کر سکتے جس قدر سورج روشن ومنور کرتا ہے،

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِضِيَاءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ (قصص ۷۱)	ان سے کہو کہ اللہ اگر تمہارے لیے قیامت تک ہمیشہ رات ہی رات کر دے تو کیا تم بتا سکتے ہو کہ اللہ کے سوا ایسا بھی کوئی دوسرا الٰہ موجود ہے جو تمہارے لیے روشنی لاسکے، کیا تم سنتے نہیں!

اور مسلسل تاریکی کے باعث نہ تو پیڑ پودے ہی نشو و نما پا سکتے ہیں اور نہ حیوانات ہی اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔

یہ آفتاب ہی ہے جو بنی نوع انسان کو ایک پیسہ خرچ کیے بغیر ہمیشہ بالکل مفت

روشنی و حرارت فراہم کر رہا ہے، اگر شمسی توانائی کے اخراج کی مقدار ظاہر کرنے والا کوئی میٹر لگا دیا جاتا جس طرح ہمارے گھروں میں اور کارخانوں میں بجلی کا صرف معلوم کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے، تو شاید نوع انسانی کو ہر سال اور ہر مہینہ نہیں بلکہ ایک دن کی توانائی کا بل (Bill) ادا کرنے کے لیے ہمارے سارے خزانے خالی ہو جاتے،

سورج کا نظم و ضبط | کمال یہ ہے کہ سورج اپنی روشنی و حرارت کا اخراج اور شعلہ فشانی انتہا درجہ منظم و منضبط طریقے سے کر رہا ہے جس میں کبھی کمی بیشی نہیں ہوتی، اور اس کو کسی قسم کی "مرمت" کی ضرورت نہیں پیش آتی، آپ اپنے روزمرہ کے معمولات اور سورج کے نظام الاوقات کا جائزہ لیکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ آپ کے مقررہ اوقات میں کچھ نہ کچھ تقدیم و تاخیر یا کوئی نقص و خرابی واقع ہو ہی جاتی ہے، مگر سورج کی رفتار اور اس کے طلوع و غروب کے نظام میں ایک منٹ بلکہ ایک سکنڈ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی، اگر آپ کو سورج کا سال بھر کا نظام الاوقات معلوم ہو تو سال بھر کے کسی بھی موسم میں اور کسی بھی دن محض اس کے طلوع و غروب سے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی درست کر سکتے ہیں،

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى (رعد: ۲)

اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو کام میں لگایا، ہر ایک ایک مقررہ وقت کے مطابق دوڑ رہا ہے

پانی کی کارفرمائی | روشنی اور حرارت کے بعد پانی کے مسئلہ کو لیجئے، اس موقع پر یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ حیوانی زندگی کے لیے پانی کی کتنی اہمیت ہے، پانی قدرت کا اتنا زبردست عطیہ ہے کہ اس کے بغیر نہ تو ہماری پیاس بجھ سکتی اور نہ غذا ہی حاصل ہو سکتی ہے، کیونکہ ہر قسم کے نباتات محض پانی ہی کی بدولت سیراب ہوتے اور نشوونما پاتے ہیں،

جن سے ہمیں غلہ، پھل، میوے، ساگ پات، ترکاریاں، مسالے، حتیٰ کہ جلانے کی لکڑی، عمارتی لکڑی، فرنیچر، دوائیں، سوتی کپڑے، ربڑ کا سامان، رسیاں، چٹائیاں، ٹاٹ، بورے، دھاگہ، کاغذ، کتابیں اور مختلف قسم کا سامان سب کچھ حاصل ہوتا ہے، گویا حیوانی زندگی کا دارومدار تمامتر نباتات پر منحصر ہے، اور نباتات پانی ہی کی بدولت نشو و نما پاتے اور زندہ رہتے ہیں، اسی طرح نہانے دھونے، کھانا پکانے، وضو کرنے اور سردی گرمی سے بچاؤ اور مکانات کی تعمیر کے لیے بھی پانی ایک لازمی چیز اور بنیادی عنصر ہے، جس کے بغیر زندگی کے ہنگامے ایک دن کے لیے بھی جاری نہیں رہ سکتے،

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ	پس انسان اپنی غذا کو غور سے دیکھے
أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا. ثُمَّ	(کہ وہ کس طرح مہیا ہو جاتی ہے) حقیقت
شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا	یہ ہے کہ ہم نے اوپر سے ڈھیروں پانی برسایا،
فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا. وَعِنَبًا	پھر زمین کو پھاڑ ڈالا، پھر ہم نے اس میں
وَقَضْبًا. وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا	(ہر قسم کے) غلے، انگور، ترکاریاں، زیتون،
وَحَدَائِقَ غُلْبًا وَفَاكِهَةً	کھجور، خوب گھنے باغات، طرح طرح کے میوے
وَأَبًّا. مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ	اور شاداب گھاس پیدا کر دی، تمہارے لیے
(عبس : ۲۴ - ۳۲)	بھی اور تمہارے مویشی کے لیے بھی ۔

سورج ایک بہشتی

غرض یہ تمام وسائل زندگی اور حیاتیاتی کرشمے پانی ہی کی بدولت ظہور پذیر ہوتے ہیں، اور پانی سورج کی بدولت حاصل ہوتا ہے، خلاقِ عالم نے پانی کی فراہمی کیلیے ایک عجیب و غریب اور حیرتناک نظام مقرر کیا ہے، جس کی بدولت حیوانات و نباتات کی زندگی برقرار رہتی ہے، کیا آپ جانتے ہیں کہ کنوؤں اور نالابوں اور ندی نالوں

میں پانی کہاں سے آتا ہے؟ آپ کہیں گے کہ بارش سے حاصل ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ خود بارش کا پانی کہاں سے آتا ہے؟ آپ فوراً بول اٹھیں گے کہ بادلوں سے، آپ نے کبھی سوچا ہے کہ یہ کالے کالے بادل کہاں سے اور کیوں کر وجود میں آجاتے ہیں؟ آپ کا جواب ہوگا کہ یہ بادل سائنٹیفک نقطۂ نظر سے دراصل پانی سے لدے ہوئے "مشکیزے" ہیں جن کا منبع سمندر ہے۔

آپ ایک برتن میں تھوڑا سا پانی چولہے پر گرم کیجئے، یا دھوپ میں رکھ دیجئے، تھوڑی دیر میں آپ دیکھیں گے کہ برتن خالی اور پانی غائب ہوگیا ہے، سوال یہ ہے کہ یہ پانی گیا کہاں؟ تو واقعہ یہ ہے کہ پانی گرمی کی وجہ سے بخارات یا بھاپ بن کر اوپر اٹھ کر بالائی فضاؤں میں پہنچ جاتا ہے، قدرت کے اس قانون کے مطابق سورج کی حرارت اور شعلہ فشانیوں کی وجہ سے ہر منٹ کھربوں ٹن پانی سمندروں سے بخارات کی شکل میں اوپر اٹھتا رہتا ہے، اور ایک خاص بلندی پر پہنچ کر بادلوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے، یہ بادل فضاؤں میں معلق ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر ملک ملک کی سیر کرتے اور اذنِ الٰہی سے مختلف خطہ ہائے ارض کو جل تھل کر دیتے ہیں۔

یہ ربِ کائنات کی حکمت تخلیق کا ایک نرالا اور لاجواب نمونہ ہے کہ اس نے مخلوقات کی زندگی و پرورش کی خاطر پانی کی فراہمی کے لیے سورج کو نوکر رکھا، جو نہ صرف ہمیں روشنی اور حرارت فراہم کرتا رہتا ہے، بلکہ ہمارے لیے سمندروں سے پانی بھی ٹرانسپورٹ کرتا رہتا ہے، اس لحاظ سے وہ ہمارے لیے ایک بہت بڑا "بھشتی" بھی ہے۔

قرآنی انکشاف | حسب ذیل آیت کریمہ میں ربوبیت کے اس سرِ نہاں پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ بارش کا پانی دراصل سمندروں ہی سے آتا ہے:۔

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ
(واقعہ: ۶۸ - ۷۰)

[illegible] پیتے ہو کیا اس کو بادل سے تم نے اتارا ہے یا ہم اتارتے ہیں، اگر ہم چاہتے تو اس کو کڑوا کر دیتے، پھر تم شکریہ کیوں نہیں ادا کرتے۔

اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ بارش کا پانی درحقیقت سمندروں ہی سے آتا ہے، کیونکہ لفظ "اجاج" کے معنی کڑوے یا کھاری کے ہیں، جو سمندری پانی کھارا ہی ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر رب العلمین مذکورہ بالا عجیب و غریب اور حکیمانہ طریقے پر سمندری پانی کی نمکینی زائل نہ کر دیتا تو پھر صفحۂ گیتی پر کوئی بھی حیوان یا نبات زندہ نہ رہ سکتا، سب کے سب نمک بن جاتے اور پوری زمین نمک سے بھر جاتی، کیونکہ کرۂ ارض کا تقریباً ستر فیصد حصہ سمندروں ہی پر مشتمل ہے، صرف تیس فی صد حصہ خشکی، دنیا کے سمندروں میں اس قدر نمک پایا جاتا ہے کہ اگر اس کو نکال کر تمام براعظموں میں پھیلا دیا جائے تو ہر جگہ اور ہر مقام پر پانچ سو فٹ موٹی نمکین تہ بن جائے گی، اور پورے کرۂ ارض پر ایک دبیز قسم کی نمک کی چادر چڑھ جائے گی، اور تمام چیزیں اور سارے حیوانات و نباتات نمک بن کر رہ جائیں گے، اس لیے حکیم مطلق کا یہ کتنا بڑا احسان اور اس کی رحمانیت کا کتنا بڑا مظہر ہے کہ اس قسم کی ہلاکت آفرینیوں سے ہم کو محفوظ رکھا اور مخلوق پروری کی خاطر سمندروں سے حیرت انگیز طریقے سے نہایت درجہ شیریں اور حیات آفریں پانی بھی مہیا کر دیا، جس سے تمام حیوانات و نباتات سیراب ہوتے اور باغ و بہار کے مزے لوٹتے ہیں، جس سے انسانوں کیلئے شکر گذاری ضروری ہے۔

"علم وتفکر دین" کا یہی مقصد ہے۔

سورج ایک باورچی روشنی، حرارت اور پانی کے بعد اہمیت کے لحاظ سے غذا کا نمبر آتا ہے، سائنسی تحقیقات سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ سارے نباتات صرف دن کے وقت سورج کی روشنی ہی میں "غذا" تیار کرتے ہیں، سائنٹفک نقطۂ نظر سے سارے درخت کی پتیوں میں نہایت درجہ ننھے ننھے ہرے رنگ (کلوروفل) کے خوردبینی ذرات ہوتے ہیں، جن کو سائنسی اصطلاح میں کلوروپلاسٹ (Cheoro Peaot) کہا جاتا ہے، ان ہی ذرات کی بدولت پتیاں ہری دکھائی دیتی ہیں، یہی وہ حیرت انگیز ذرات ہیں، جو سورج کی کرنوں کے تعامل سے پانی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو آمیز کر کے شکر اور نشاستہ (Carbohydrato) میں تبدیل کر دیتے ہیں، جو نہ صرف پودوں کی بلکہ تمام حیوانات کی بھی بنیادی غذا ہے، ہمارے جسم میں گرمی و حرارت اسی سے پیدا ہوتی ہے

یہاں پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ غلوں، پھلوں، دالوں اور مختلف قسم کے میوہ جات کا اکثر حصہ کاربوہائیڈریٹ ہی پر مشتمل ہوتا ہے، جو صرف سورج کی روشنی ہی میں پیدا ہو اور پروان چڑھتا ہے، سورج کے اس تعامل کو سائنس کی اصطلاح میں "شعاعی ترکیب" یا Photosynthesas کہتے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ	اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو کام میں
كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى يُدَبِّرُ	لگایا (جو تمہارے لیے مختلف قسم کی خدمتیں
الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ	انجام دیتے ہیں) ان میں سے ہر ایک ایک
بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ:	بالکل مقررہ وقت کے مطابق دوڑ رہا ہے
	وہ اللہ تمہارے تکوینی و تشریعی تمام) معاملات

کی تدبیر کر رہا ہے اور اپنے نشانات و
دلائل ربوبیت کھول کھول کر بیان
کر رہا ہے، تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات
کا یقین کر سکو۔ (رعد: ۲)

اسباب اور مسبب الاسباب | اس آیت کریمہ میں یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح کر دی گئی کہ اس کارخانۂ عالم میں اگرچہ علت و معلول کا سلسلہ جاری کیا گیا ہے اور مظاہر فطرت میں مختلف خواص و طبائع رکھے گئے ہیں، مگر یہ مستقل بالذات نہیں ہیں، بلکہ ان سب کی باگ اور زمام کار مدبر کائنات کے دست قدرت میں ہے، جیسا کہ تنبیہا فرما دیا "یُدَبِّرُ الْاَمْرَ" یعنی تمام معاملات کی تدبیر اصل میں وہی کر رہا ہے، اس لحاظ سے یہ ظاہری اسباب و علل بے جان پتلیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، جن کے پس پردہ ایک منظم ہستی کی کارفرمائی جلوہ گر ہے، اس لیے نوعِ انسانی کو ان ظاہری اسباب و علل میں الجھ کر شرک اور مظاہر پرستی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، یہ کارخانۂ فطرت ایک منظم پیمانے پر عبرت و بصیرت حاصل کرنے اور فکر و نظر میں جلا پیدا کرنے کی غرض سے تخلیق کیا گیا ہے، جن کے ذریعہ ایک شاہدِ حقیقی کا سراغ لگایا جا سکے جس کے جلووں سے صفحۂ کائنات کے تمام اوراق روشن و منور ہیں۔

آفتاب ہر فن مولا | یہ چند بڑے بڑے فوائد ہیں، جو ہم کو اس نیرِ آسمانی سے حاصل ہوتے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ہیں، مثلاً سورج ہی کی بدولت ہمیں بہت سی بیماریوں سے نجات ملتی ہے، اگر سورج نہ ہوتا تو بیماریاں پھیلانے والے جراثیم کا وجود دوچند ہوتا، جو کرۂ ارض کو تباہ کر کے رکھ دیتے، کیونکہ ان جراثیم کی شرح پیدائش نہایت وجہ

سورج کی گرمی اور روشنی بیشتر ان جراثیم کو نابود کر دیتی ہے اور ان کو بہت بڑی حد تک کم اور محدود کر دیتی ہے، اسی طرح آفتاب کی تمازت سے مختلف قسم کی نمی اور رطوبت بھی ختم ہو جاتی ہے جو بیماریاں پھیلانے کا باعث بنتی ہیں۔ غرض آفتاب اور اسکے نظام میں بے انتہا حکمتیں اور مصلحتیں مضمر ہیں، جنکے مطالعے سے نقاشِ فطرت کی بے مثال صناعی ظاہر ہوتی ہے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔

(۲) آفتابِ رسالت

صفت نبوی | یہ آفتاب عالم اور چراغ فلک کی حقیقت و ماہیت اور اسکی کارکردگیوں کا ایک مختصر سا جائزہ ہے۔ اب آفتابِ رسالتؐ اور اس کی ماہیت و کارکردگی کا بھی ایک جائزہ لے لیجئے، اس سے معلوم ہوگا کہ جس طرح چراغ فلک سے ہماری مادی زندگی کی ساری ضروریات پوری ہوتی ہیں اسی طرح چراغ رسالت سے ہماری روحانی زندگی کی حاجتیں بھی پوری اور اس کے نقش و نگار آراستہ ہوتے جاتے ہیں،

ظاہر ہے کہ جس خدا نے بنی نوع انسان کی مادی زندگی کی بقا کے لیے اس قسم کا اہتمام کیا ہو اور بغیر کسی رکاوٹ کے ان کی تمام ضروریات پوری کرتا چلا جا رہا ہو وہ انسان کے روحانی سدھار اور اس کے اخلاق و کردار کی تعمیر و تہذیب سے غافل کیسے رہ سکتا ہے،

أَفَنَضْرِبُ عَنكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا أَن كُنتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِينَ (زخرف)

کیا ہم تمہاری سبق آموزی سے اس لیے رک جائیں گے کہ تم حد سے گزرنے والے ہو؟

حسب ذیل دو آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند صفات بیان کی گئی ہیں، جن سے مقصد رسالت پر روشنی پڑتی ہے،

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ	اے نبی ہم نے آپ کو (تمام لوگوں کیلیے)
شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا	شاہد، مبشر اور متنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا،
وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ	نیز اس نے آپ کو اللہ کی طرف بلانے والا ۔
سِرَاجًا مُّنِيْرًا (احزاب ۴۵-۴۶)	اسی کے حکم سے ۔ اور روشن چراغ بنا دیا ہے

اس آیت کریمہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پانچ صفات سے متصف کیا گیا ہے، (۱) شاہد (۲) مبشر (۳) نذیر (۴) داعی الی اللہ (۵) اور سراجا منیرا یعنی روشن چراغ ۔ اور پیمبر آخر زماں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، قرآن مجید کے کسی دوسرے مقام پر اتنی جامع انداز میں مذکور نہیں ہیں، ان صفاتِ نبوی سے منکرین حدیث کا یہ خیال باطل ہو جاتا ہے کہ رسول کی حیثیت محض قاصد یا نامہ بر کی ہوتی ہے، اور ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک داعی بھی ہوتا ہے، اور متنبہ کرنے والا بھی، شاہد بھی ہوتا ہے اور نگران کار بھی، جس کا اسوۂ حسنہ (نمونۂ زندگی) سب کے لیے واجب العمل اور جس کی اطاعت واجب التعمیل ہوتی ہے، اسی لیے اس کو "سراجا منیرا" کہا گیا ہے ۔ رسول کے منصب پر حسب ذیل آیہ پوری روشنی ڈالتی ہے ۔

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ	وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ	کی قوم سے ایک پیغمبر مبعوث کیا، جو ان کو
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	خدا کے احکام پڑھ کر سناتا ہے، ان کو پاک
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	وصاف کرتا ہے، اور ان کو کتاب و حکمت
(جمعہ : ۲)	کی تعلیم دیتا ہے ۔

اس آیت کریمہ میں رسول کے چار فرائض شمار کرائے ہیں: (۱) تلاوت آیات ،

(۲) تزکیۂ نفوس (۳) تعلیم کتاب اور (۴) تعلیم حکمت، اگر غور کیا جائے تو یہ چاروں امور، اوپر گنائی گئی پانچ صفات ہی کے دائرہ میں گھومتے نظر آئیں گے، صرف اسلوب اور تعبیر کا فرق ہے، اس حیثیت سے یہ دونوں مقامات ایک دوسرے کی تشریح و تفسیر کر رہے ہیں،

منصب رسالت | اگر منصب رسالت صرف نامہ بری تک محدود ہوتا تو اس کے لیے "تلاوتِ آیات" کافی تھی، تزکیۂ نفوس اور کتاب و حکمت کی تعلیم کی ضرورت نہیں تھی، لیکن ایک فکری و روحانی انقلاب برپا کرنے اور اخلاق و روحانیت کی تربیت اور نشو و نما کے لیے لوگوں کی ٹریننگ بھی ضروری ہے، محض وعظوں اور لیکچروں سے دنیا کی کایا پلٹ کبھی نہیں ہو سکتی، اسی لیے "تزکیۂ نفوس" اہداف رسالت کا ایک اہم ترین ہدف و نشانہ قرار دیا گیا ہے، یعنی رسول کا اصل منصب یہ ہے کہ وہ اپنے پیروؤں کی صحیح تربیت کے ذریعہ ان کے دلوں سے دنیاوی آلودگیوں کو نکال کر پاک و صاف کرکے ان کو انسان کی طرح رہنا سکھائے، ان کی سیرت کو سنوارے، انھیں نظامِ عدل کا پابند بنائے اور ایک ایسی جماعت تیار کردے جو دوسروں کی اصلاح و تربیت کا فرض انجام دے سکے،

لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ	تاکہ تم نوعِ انسانی پر شاہد بن سکو
وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ	اور رسول تم پر شاہد رہے
شَهِيدًا (بقرہ: ۱۴۳)	

یہاں شہادت کا لفظ بہت وسیع مفہوم میں ہے، جس میں یہ مفہوم بھی داخل ہو سکتا ہے، چنانچہ سورۂ احزاب میں رسول کو "شاہد" (نگراں) قرار دیا گیا ہے، جو رسالت کا ایک نمایاں ترین وصف ہے، اور اسی بنا پر اس کو "روشن چراغ" بھی کہا گیا ہے، یعنی

جس کی روشنی سے پوری روحانی کائنات منور ہو جائے (نور بن جائے) اور انسانیت کی تمام اخلاقی بیماریاں دور ہو جائیں جس طرح آفتاب سے انسان کی تمام مادی ضروریات پوری اور بہت سی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ مقصد عظیم محض "نامہ بری" سے حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لیے تربیت و نگرانی بھی ضروری تھی،

تزکیۂ نفوس کا صحیح مفہوم ہے ایک مقررہ "ٹریننگ کورس" یعنی "تلاوت کتاب" یا کتابی نظریات و تعلیمات کو عملاً برت کر سکھانا اور پوری زندگی کو ربانی منشاء و مقصد کے مطابق اسلامی سانچے میں ڈھالنا جس کی بنیاد فکر آخرت پر ہو، حقیقت یہ ہے کہ جب تک نفوس کا تزکیہ نہ ہوگا، نہ ان کی صحیح روحانی تربیت ہو سکے گی، نہ انسانی دل و دماغ خدا پرستانہ جذبات سے معمور ہو سکیں گے، نہ عمل صالح پیدا ہو سکے گا، نہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں انسانی اعمال کی تطہیر ممکن ہو سکے گی، جس معاشرہ میں تقویٰ، للہیت اور اخلاص کا فقدان ہوگا وہ کبھی نہیں سنور سکتا، اس میں تہذیب و شائستگی کے برگ و بار نہیں آ سکتے، برائیوں اور خود غرضیوں کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، انسانیت کی سطح بلند نہیں ہو سکتی، نفسانی خواہشات اور برائیوں کا استیصال نہیں ہو سکتا، اور ملکوتی صفات پیدا نہیں ہو سکتیں، غرض تزکیۂ نفوس کے بغیر ایک صالح، پاکیزہ اور متوازن معاشرہ کی تشکیل ممکن نہیں، کوئی انسان کسی استاد اور رہبر کی مدد کے بغیر محض کتابیں پڑھ کر ایک ماہر ڈاکٹر، جراح اور انجینیر وغیرہ نہیں بن سکتا، "تعلیم کتاب" سے دراصل صرف فکری و نظریاتی تبدیلی ہوتی ہے، زندگی میں انقلاب تزکیۂ نفوس سے پیدا ہوتا ہے، ایک سے فکر و نظر کی اصلاح ہوتی ہے اور دوسرے سے عمل و کردار کی تعمیر ہوتی ہے، پہلی چیز دل و دماغ کی صفائی کرتی ہے، دوسری چیز

معاشرہ کی تطہیر کرتی ہے، غرض تزکیۂ نفوس ہی سے تقویٰ و طہارت اور اخلاص و للٰہیت کے برگ و بار پیدا ہوتے ہیں، جن سے انسانیت کی تعمیر نو ہوتی ہے،

اسلامی تصوف اسلام میں تصوف کی اصل غرض و غایت دراصل نفوس کا تزکیہ (صیقل کرنا) اور انسانی انا کو دور کر کے دل کو خوف و خشیت الٰہی سے معمور کرنا ہے، تاکہ انسان اپنے ہر عمل میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھے اور جس چیز کو وہ "تعلیم کتاب" سے حاصل کر چکا ہے، اس کو مستحضر رکھے اور اپنی زندگی کو اس میں ڈھالنے کی کوشش کرے، حدیث میں ہے:

ان تعبد اللہ کانک تراہ	تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم
فان لم تکن تراہ فانہ یراک	اس کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اس کو نہ دیکھ سکو
	تو (کم از کم اتنا تو ضرور تصور کرو کہ) وہ تم کو
(مسلم شریف)	ضرور دیکھ رہا ہے۔

یہاں عبادت سے مراد محض نماز روزہ ہی نہیں بلکہ عبدیت کے تمام مظاہر مراد ہیں، یعنی ہر کام اور ہر فعل خواہ وہ نماز روزہ سے متعلق ہو یا معاشرتی زندگی سے، انفرادی معاملات سے تعلق رکھتا ہو یا اجتماعی امور سے، قومی زندگی سے متعلق ہو یا بین الاقوامی روابط سے، ہر حال میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر اس کی مرضی و منشا کے مطابق ہونا چاہیے، ظاہر ہے کہ یہ عظیم الشان مقصد بغیر عملی تربیت کے محض وعظوں اور لکچروں سے حاصل نہیں ہو سکتا، اور یہ اعلیٰ اوصاف و صفات بغیر تربیتی کورس کے محض کتابوں کے رٹ لینے سے پیدا نہیں ہو سکتے، بقول علامہ اقبال ؎

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار	شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل	دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(باقی)

سیاست میں اسلام

(۴)

مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دارالمصنفین

الجزائر

آزاد الجزائر میں اسلام کا کردار نہایت اہم اور بحث طلب موضوع ہے، کیونکہ الجزائری باشندہ کے لیے اپنی انفرادی اور قومی شخصیت کو اجاگر کرنے کا ایک اہم ذریعہ اس وقت مذہب ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ الجزائر ابھی حال ہی میں ایک یورپین اور عیسائی طاقت سے شدید جد وجہد کے بعد آزاد ہوا ہے، اور اس بیرونی طاقت نے وہاں کی ثقافت پر ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک نہایت گہرا اثر ڈالا اور اس کے متمول طبقہ کو کافی حد تک اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے، اس لیے وہاں مذہب کے دو محاذ ہیں، ایک ثقافتی اور دوسرا سیاسی، دوسرے الفاظ میں انھیں اعتدال پسند اور اسلام نواز گروہ بھی کہہ سکتے ہیں،

پہلے طبقہ کا نظریہ ہے کہ الجزائری انقلاب جو ابھی اپنی سماجی منزل تک محدود ہے اس کا رخ ایک سیکولر قوم پرست اور سوشلسٹ نظام کی طرف ہونا چاہیے، الجزائر کو ایک ایسی خود کفیل ریاست بننا ہے جو دنیا کی ترقی پذیر اقوام کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہو سکے، اس لیے وہاں کے مارکس نواز اور ترقی پسند اپنے نظریات کی روشنی میں مرحوم جمال عبدالناصر

کی بہ نسبت صدر ٹیٹو اور کیسٹرو سے زیادہ قریب ہیں" ؛ بالخطوص یہ وہ لوگ الجزائر کے اسلامی کردار کا بھی دم بھرتے ہیں، اس پر ممنونیت کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ عہد غلامی میں قومی انفرادیت کو قائم رکھنے اور سیاسی انقلاب کی جد و جہد کو آگے بڑھانے میں اس کردار نے بہت نمایاں حصہ لیا ہے، لیکن اب جبکہ آزادی کی صبح روشن ہو چکی ہے، وہ مذہب کو دوسرے نمبر پر اہمیت دیتے ہیں،

اسلام پسند طبقہ کا نقطۂ نظریہ ہے کہ تعمیری انقلاب کا رخ اسلام کی مسخ شدہ روایات اور طویل مدت تک کچلی ہوئی روح کو از سر نو زندہ کرنے کی طرف ہونا چاہیے، تاکہ اس کو دہریت کے اثرات سے محفوظ رکھا جا سکے، لیکن یہ دونوں متضاد نظریے محض تصوراتی ہیں، بیشتر الجزائری یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ ان دونوں میں فی الواقع کس کے حامی ہیں، ان لوگوں کی تعداد بہت مختصر ہے جو ان نظریات میں سے کسی ایک کے واضح طور پر حامی ہیں،

جدیدیت اور اسلام پرستی کی یہ کشمکش آزادی کی جد و جہد کے دوران اس صدی کی تیسری دہائی میں ظاہر ہوئی، مثالی الحاج (Mess. al-Hadj) پہلے لیڈر تھے جنھوں نے الجزائر کی مکمل آزادی کا نعرہ لگایا، ان کی نظر میں مستقبل کے ایسے الجزائر پر تھیں جو ایک مسلم اور سوشلسٹ ریاست ہوگی، اسی دور ان میں فرحت عباس جو فرانس کے ساتھ مساوات کی بنیاد پر مکمل انضمام کے حامی تھے، چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے مذہب کو اپنی شخصیت کا محض ایک جزو بنا کر رکھیں، وہ فرانس کی باغی "علماء" نام کی ایک جماعت کے ممبر تھے، جسے شیخ بن بدیس نے ۱۹۳۱ء میں قائم کیا تھا، اس جماعت کا مقصد فرانس سے انضمام کو رد کرنا، اور عوام میں پھیلی ہوئی مذہبی برائیوں کو دور کرنا تھا

اس لیے مجلس علماء کے اراکین نے عربی و اسلامی علوم کو وسعت دی، انقلاب کی تحریک اگرچہ ان لوگوں نے شروع نہیں کی تھی، لیکن جلد ہی یہ لوگ آزادی کے طرفدار بن گئے،

فوجی انقلاب کے بیشتر قائدین جدت پسند تھے، لیکن وہ اس کو بھی پوری طرح محسوس کرتے تھے کہ مذہب کی جڑیں عوام خاص کر ناخواندہ طبقہ کے دلوں میں نہایت گہری جمی ہوئی ہیں، اور انھی عوام کو بغاوت کے لیے تیار بھی کرنا تھا، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ قومی محاذ آزادی شراب کے استعمال کو غداری قرار دیتا تھا، اور نقاب کو بھی، جو الجزائر کی ثقافت کا ایک حصہ تھا، فرانس سے انضمام کے خلاف ایک اہم قدم شمار کرتا تھا، پھر بھی بیشتر مجاہدین آزادی نے مذہب کو اپنا مقصود نہیں بنایا بلکہ اسے سماجی تعمیر نو اور قومی آزادی کی راہ میں ایک وسیلہ اور منزل شمار کرتے تھے، اور ۱۹۵۴ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیان اسلامیت اور جدیدیت دونوں کے علمبردار قومی آزادی کو ترجیح دیتے رہے،

آزادی کے ساتھ ہی مذکورۂ بالا دونوں طبقوں کی کشمکش بالکل سامنے آگئی یہ صحیح ہے کہ بعض امور میں بن بدیس کے ورثہ اور ترقی پسند دونوں متفق الرائے ہو جاتے تھے، لیکن اس وقت بھی ان کے دلائل اور انداز فکر میں کافی اختلاف ہوتا تھا، اسلام نواز طبقہ جن مذہبی رواجوں کو بدعت اور مذہب کی راہ میں رکاوٹ شمار کرتا تھا، ان کو جدیدیت پسند طبقہ بھی معاشرہ کی تعمیر نو میں سنگ راہ تصور کرتا تھا، مگر جدوجہد آزادی میں علماء کے نمایاں کردار کی وجہ سے ان کی عزت ضرور تھی لیکن ان لوگوں کو ملک کی سیاسی زندگی سے دور رکھا جاتا تھا، اور دور غلامی کی طرح

اب بھی حکومت مذہب پر حاوی رہی، مثلاً اوقاف پر اس کا مکمل اقتدار تھا، اور آج تک وہاں قانونی طور پر تسلیم شدہ کوئی مسلم تنظیم نہیں ہے۔

سابق صدر بن بیلا اور ان کے ہمنوا مذہب اور عوام کے گہرے رشتے سے پوری طرح واقف تھے، اس لیے انھوں نے اسلام کو ثانوی درجہ میں رکھنے سے احتراز کیا، اور ہمسایہ ملک تیونس کے صدر بورقیبہ نے اسلام کو جس طرح جدید بنانے کی کوشش کی تھی، بن بیلا نے اس سے بھی پرہیز کیا، شراب مسلمانوں کے لیے غیر قانونی قرار دیدی گئی، روزے کی پابندی سختی سے ہونے لگی، ۱۹۶۲ء میں قومی محاذ آزادی کے نوجوان ممبروں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ عوام کو حتی المقدور روزے رکھنے کا پابند بنائیں، بن بیلا، بشیر بومازہ حتی کہ کمیونسٹ رجحان والے محمد حربی بھی اسلام کو الجزائری سوشلزم اور ثقافت کا ایک اہم جزو شمار کرتے تھے، اپریل ۱۹۶۴ء میں جب قومی محاذ آزادی کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی تو مسلمانوں نے بن بیلا کو مجبور کیا کہ وہ کمیونسٹ اخبار "الجزیرہ پبلکن" (Alger Republicain) کی اشاعت پر قانونی پابندی عائد کریں، اسی کانفرنس میں ایک عائلی قانون منظور کیا گیا جس کے مطابق عورتوں کی تعلیم و تربیت ضروری قرار دی گئی، الجزائر کے اہم اخبار "افریقی انقلاب" کے اڈیٹر حربی کو ہٹا کر ان کی جگہ عمر واوزیگین کو مقرر کیا گیا، جو کبھی کمیونسٹ رہ چکے تھے، مگر اب وہ اسلام اور عربی رجحانات کے دشمنوں پر کھلم کھلا حملہ کرتے اور ان لوگوں کی مذمت کرتے تھے جو غیر ملکی نظریات کے ذریعہ الجزائری انفرادیت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ جب بن بیلا نے اصلاحی اقدامات شروع کیے تو اسلام پرستوں نے زمین کو قومی ملکیت میں لیے جانے کی شدید مخالفت کی، ان مخالفین میں بن بادیس کے وارث الابراہیمی پیش پیش تھے، وہ "انجمن مصلحین علما" کے صدر تھے، اس لیے

بیرونی باشندوں کی متروکہ زمینوں کو قومی ملکیت میں لیکر انھیں کسانوں کے اجتماعی نظام کے تحت کر دیا گیا، گو یہ زمین الجزائر کا سب سے زرخیز حصہ تھی، لیکن اس کا رقبہ اس زمین کے مقابلہ میں کچھ نہ تھا، جو اب بھی مسلم کسانوں کی ملکیت میں تھی، اس زمین کو آج تک قومی ملکیت میں لینے کی ہمت حکومت کو نہ ہوسکی،

گورنمنٹ کو اس اقدام سے باز رکھنے کا سبب یہ نظریہ تھا کہ سوشلزم اور اسلام کبھی ہم آہنگ نہیں ہو سکتے، اور مذہب اسلام کے اصول و روایات اور نجی ملکیت کے درمیان گہرا رشتہ ہے، جدت پسند طبقہ اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ ابتدائی دور میں اسلام خود ایک سوشلسٹ نظام تھا، جو امیروں کو غریبوں کے استحصال سے روکتا تھا، اسلام اور سوشلزم کی ہم آہنگی یا تضاد اور اسلام و سرمایہ داری کے درمیان لزوم ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ہر مسلم ملک میں بحث جاری ہے،

جون ۱۹۶۵ء میں بن بیلا کا زوال اگرچہ سیاسی وجوہ سے ہوا، خصوصاً اس وجہ سے کہ جس طرح وہ الجزائر کی ہر تنظیم پر حاوی تھے، اسی طرح فوج پر بھی حاوی ہونا چاہتے تھے، لیکن الجزائر کے عوام کو بن بیلا کے زوال کا قطعی صدمہ نہیں ہوا، اس کا خاص سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عوام کو یہ باور کرانے میں ناکام رہے تھے کہ اسلام کے ساتھ ان کی وفاداری محض زبانی یا سیاسی نہیں ہے، انکے نکتہ چینوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ بن بیلا "لینن امن انعام" ملنے کے بعد حد درجہ مغرور ہو گئے تھے، اور انھوں نے مراکش سے سرحدی "تنازعہ" کے موقع پر چینی طرز کی نیلی وردی رائج کر کے لوگوں کو اور زیادہ ...

کے لڑکے کو گرفتار کر کے اس کو اذیت پہنچائی گئی تھی ،

مئی ۱۹۶۵ء میں جب ابراہیمی کا انتقال ہوا تو بن بیلا نے اس کے جنازہ میں بھی شرکت نہیں کی . حالانکہ الجزائر کی موجودہ تاریخ میں اس کا جنازہ اسکی مقبولیت اور وسیع اثرات کا سب سے بڑا نمونہ تھا ، بن بیلا کے مخالفین یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں وہ محمد حربی جیسے مارکسی مشیروں کے بہت زیادہ زیر اثر آگئے تھے ،

ملک بنابی نے اپنی سوانح عمری میں بن بیلا پر بعض ایسے الزامات لگائے ہیں جس سے ان کی اور ان کے ہمنواؤں کے اسلام کو نظر انداز کرنے کی ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے ، وہ بن بیلا کو ان لوگوں میں شمار کرتے ہیں جو بیرونی اصطلاحات اپنانے کی کوشش کرتے ہیں ، چنانچہ ان کی اصطلاحات کچھ فرانسیسی اور کچھ روسی نوعیت کی ہیں ، یہ لوگ الجزائر اور اس کے عوام کی روح سے قطعی واقف نہیں ، وہ ایسے بیرونی کیڑے ہیں جو قومی خصوصیات کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں ، ملک بنابی عرصۂ دراز تک اسلام میں از سر نو زندگی پیدا کرنے کی کوشش میں رہے ، اور اس وقت وہ الجزائر یونیورسٹی میں علوم اعلیٰ کے ڈائرکٹر ہیں ،

بن بیلا پر سب سے بھی زیادہ شدید حملے محمدی سعیدی نے کیے ہیں ، وہ الجزائر کے نائب صدر کے عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں ، اور اب نئے حکمرانوں سے اپنی وفاداری وابستہ کر لی ہے ، رسالہ " افریقی انقلاب " جولائی ۱۹۶۵ء میں لکھتے ہیں :-

"...... مسلمان ہونا تو درکنار ، بن بیلا الجزائر میں اسلام سے بالکل ہی مختلف نظریات رائج کرنے کے لیے کوشاں تھے ، یہی سبب ہے کہ مذہب پرست طبقہ آج

بن بیلا جیسے عوام دشمن اور اسلام دشمن کے لیے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا۔"

اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ۱۹ جون ۱۹۶۵ء کے انقلاب میں بن بیلا کا آفتاب اقبال غروب ہونے کے بعد مارکس نواز مثلاً محمد حربی، حسین زہوئی، بشیر حاجی علی وغیرہ خاص طور پر نشانہ بنائے گئے۔ الجزائر کے موجودہ صدر کرنل بومداین کی مخالفت کا بڑا سبب جدیدیت پسندوں کی نگاہوں میں یہ ہے کہ وہ بومدین میں ایک خاص قسم کی مذہبیت، آمریت اور بورژوائیت کی آمیزش ہے۔ جامع ازہر کے فارغ التحصیل ہیں، اور اس لحاظ سے تمام الجزائری لیڈروں میں ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ ملک کے دوسرے تمام قائدین فرانسیسی تعلیم یافتہ ہیں۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ بن بیلا کے زوال میں دیگر عوامل کے ساتھ ایک بڑا سبب اُن کی غیر اسلامی روش تھی، مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ انکے بعد کے اربابِ حکومت الجزائری سماج میں اسلام کی روح پھونکنے پر مستعد ہیں، خود بومداین کو بھی کٹر اسلام پرست سمجھنا صحیح نہیں ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ جن اہل قلم کی تحریروں اور خیالات کو پسند کرتے ہیں ان میں "فرانس فینن" کا نام بھی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو انقلابی افریقہ میں نیگرو تحریک سے وابستہ ہے۔ اور جس نے اپنی تحریروں سے الجزائر کی جدوجہد حریت میں نمایاں رول ادا کیا، ہے، ایک زمانہ میں وہ قومی محاذ آزادی کے آرگن " المجاہد" کا اڈیٹر بھی رہ چکا ہے، غرض فینن نظریاتی طور پر بالکل سیکولر ہے۔

کرنل بومدائن نہ تو یونیورسٹی کے طلبہ کے مخالف ہیں اور نہ فرانس میں الجزائری

مزدوروں کی تنظیم سے انھیں کوئی مخاصمت ہے۔ اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہو کہ ڈالجزائری انقلاب کے ان بنیادی اصولوں سے منحرف ہیں، جو ۶۲ء اور ۶۴ء میں تریپولی میں وجود میں آئے تھے، یہ اصول تعلیم میں اسلام کی مداخلت اور ملک کے اصل مسائل کو پس پشت ڈالنے کی مذمت کرتے ہیں، ۷۶ء کے قانون میں اگرچہ اس کو تسلیم کیا گیا ہے کہ "الجزائر ایک اسلامی عرب حکومت ہے"، لیکن اسی مسودہ میں یہ بھی ہے کہ الجزائر کی عرب اسلامی حیثیت اسے کسی خاص طرز زندگی کا پابند نہیں بناتی ہے، اور الجزائری انقلاب اسلام کو اس کی صحیح اور ترقی یافتہ شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرے گا، ان دونوں تجویزوں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ الجزائری کلچر کو قومی، متحرک اور سائنٹفک ہونا چاہیے، بنابی اور اوزگین جیسے دانشوروں کا کہنا ہے کہ تجدید کردہ اسلام اور آفاقی انسانی قدروں میں کوئی تضاد نہیں ہے، اور توفیق احمد المدنی جو ایک مشہور مصلح ہیں، کہتے ہیں کہ اسلام خود سوشلسٹ ہے، کیونکہ اصول مساوات پر مبنی ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں میں اسلام نواز اور جدیدیت پسند طبقوں میں مفاہمت کی شکل پیدا ہو جائے، موجودہ وزیر تعلیم احمد طالب (جو ابراہیمی کے فرزند اور فرانسیسی تعلیم یافتہ ہیں) ایسی مفاہمت کے ہمنواؤں کے بہت سرگرم رکن ہیں،

مذکورۂ بالا تجزیوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر الجزائری معاشرہ کو کسی ایک مخصوص اصول کا (خواہ وہ جدیدیت پسندی کا ہو یا مارکسیت کا یا مکمل طور پر اسلامی) پابند کیا گیا تو سماجی انتشار پیدا ہوگا، اور ملک کا مستقبل خطرہ میں پڑ جائے گا، اس سے انکار نہیں کہ مذکورہ دونوں طبقوں کے درمیان مصالحت و مفاہمت وقت کی ایک

اہم ضرورت ہے لیکن فی الحال اس سے بھی شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ ان دونوں ہی نظریات کو اعتدال کے ساتھ پنپنے دیا جائے۔ کیونکہ الجزائر میں ہمیشہ روایت پسندی اور جدیدیت کے درمیان کشمکش جاری رہے گی، اور جب بھی کسی ایک کی طرف زیادہ جھکنے کا رجحان پیدا ہوگا تو دوسری سمت مخالفت میں شدت پیدا ہوگی

(نوشتہ:۔ ڈاکٹر ڈیوڈ سی گارڈن۔ پروفیسر تاریخ یورپ امریکن یونیورسٹی، بیروت)

اضافہ از مترجم :۔

فاضل مقالہ نگار نے مذکورہ بالا سطور میں الجزائر کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں سرسری اشارات پر اکتفا کیا ہے، اور ان تفصیلات کے ذکر سے بالکل سکوت اختیار کیا ہے جو نہ صرف الجزائر بلکہ عالمی تاریخ کا ایک زریں باب ہیں، فرانس کے چنگل سے رہائی کے لیے کامل سات سال تک جانفروشی اور دس لاکھ فرزندوں کا خون دیکر حصول آزادی کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے، اس لیے ذیل میں الجزائر اور اس کی تحریک حریت کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے،

الجزائر جسے انگریزی میں الجیریا اور الجیرز بھی کہا جاتا ہے شمالی افریقہ کا ایک بھاری مسلم اکثریت کا خطہ ہے، اس کے مشرق میں لیبیا و تیونس، مغرب میں مراکش، جنوب میں مالی و نائجر اور شمال میں بحر روم واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۲۳ لاکھ ۸۱ ہزار سات سو اکتالیس مربع کیلو میٹر ہے، یہاں مسلمان نوّے فیصدی ہیں، رقبہ کی وسعت کے مقابلہ میں آبادی کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ اس علاقے کا بیشتر جنوبی حصہ صحرا پر مشتمل ہے جو بالکل غیر آباد ہے،

الجزائر چونکہ فرانس کے جنوبی ساحل کے عین بالمقابل واقع ہے، اس لیے وہ ہمیشہ

سے اس کی حویلیں۔ . . . ٹھکانوں کا پھندا ، انیسویں صدی کے اوائل تک اس پر ترکی قابض رہا۔ ۱۸۳۰ء میں فرانسیسی مسلح فواج نے دوسری مغربی طاقتوں سے سازباز کرکے الجزائر پر حملہ کر دیا۔ عثمانی فوجوں نے حتی الوسع مقابلہ کیا، مگر آخر میں جدید ترین آلات حرب سے شکست کھا کر پسپا ہو گئیں، اور الجزائر پر فرانس کا تسلط ہو گیا، بظاہر فرانس نے الجزائر پر حملہ کا یہ جواز پیش کیا ہے:۔

> الجزائر بحری قزاقوں کی کمین گاہ بنا ہوا ہے، جن سے نکل کر وہ بحیرہ روم سے گذرنے والے جہازوں کی لوٹ مار کرتے ہیں، ہم نے پہلے ترکی حکومت سے انکے خلاف شکایت کی لیکن اس نے اپنی بے بسی اور عجز کا اظہار کیا، لہذا اس علاقہ میں مستقل قیام امن کی خاطر ہمارے لیے ان بحری قزاقوں کی سرکوبی بہت ضروری ہے۔"

ممکن ہے اس دلیل میں کسی حد تک صداقت کا عنصر بھی موجود ہو، جیسا کہ بعض مورخین کا خیال ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہ کرنا چاہیے کہ صرف بحری قزاقوں کی بیخ کنی ہی الجزائر پر حملہ کا اصلی سبب نہیں ہو سکتی، بلکہ فرانس کے بہت سے مفاد اس ملک سے وابستہ تھے، جن کی فکر میں وہ عرصہ دراز سے تھا، اور آخر میں اس کو اس پر حملہ کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔

ترکی کی شکست کے بعد اگرچہ الجزائر پر فرانس کے پنجے مضبوطی سے جم گئے، تاہم اس ملک کے عوام کے سینوں میں آزادی کی آگ برابر شعلہ زن رہی۔ اس سلسلہ میں امیر عبد القادر کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، جس نے ۱۸۳۲ء میں فرانسیسی تسلط کے خلاف حیرت انگیز استقلال اور مدبرانہ رہنمائی کے ساتھ قابض حکمرانوں کا

مقابلہ کیا، اس جدو جہد آزادی میں عبدالقادر کو فرانس کی حربی طاقت کے سامنے پے در پے شکستیں اٹھانی پڑیں لیکن اس کی ہمت میں فرق نہ آیا اور وہ برابر مقابلہ کرتا رہا بالآخر ۱۸۴۷ء میں گرفتار کر کے فرانس میں نظر بند کر دیا گیا، اس کے بعد یہ المیہ بھی لائق ذکر ہے کہ فرانسیسی حکمرانوں نے نظر بندی میں الجزائر کی تحریک آزادی کے اس ہیرو کی "تطہیر ذہنی" کچھ اس عیاری سے کی کہ پھر ۱۸۵۳ء میں رہائی کے بعد وہ اپنے عوام کا نہ ہو سکا اور عالم خمولیت میں جان جاں آفریں کے سپرد کر دی،

عبدالقادر کے بعد الجزائر میں پھر کوئی اتنا بڑا مدبر اور ہر دلعزیز قائد نہ ابھر سکا، لیکن جدو جہد آزادی کا کارواں اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتا رہا، ۱۸۵۷ء میں عین اس زمانہ میں جب ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف آزادی کا علم بلند ہوا، الجزائر میں بھی حریت پسندوں اور غاصبوں کے درمیان بڑی خوفناک جنگیں ہو رہی تھیں، فرانس نے تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے جس وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا، اس کی داستان تاریخ میں محفوظ ہے لیکن اس کے باوجود ابنائے وطن کے دلوں میں جذبۂ حریت کی چنگاریاں سرد نہ ہو سکیں،

بالآخر بیسویں صدی کے نصف ثانی میں حریت پسندوں کی قربانیاں رنگ لائیں اور شمالی افریقہ میں آزادی کی نسیم چلنا شروع ہوئی، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۵۱ء میں لیبیا اٹلی کے پنجۂ تسلط سے آزاد ہوا، اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں سرفروشان مراکش کی جدوجہد آزادی کامیابی سے ہمکنار ہوئی، پھر ۱۹۵۶ء میں ٹیونس نے فرانس کے چنگل سے رہائی حاصل کی اور سب سے آخر ۱۹۶۲ء میں الجزائر نے بھی طوق غلامی اتار پھینکا، (مراکش کے بارے میں راقم الحروف کا ایک تفصیلی مقالہ معارف بابت اکتوبر ۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکا ہے)

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ الجزائر کی آزادی میں احمد بن بیلا نے بہت نمایاں کردار ادا کیا تھا لیکن جس طرح ہر انقلابی کچھ عرصہ کے بعد ڈکٹیٹر کا روپ اختیار کر لیتا ہے، اسی طرح بن بیلا نے بھی آمریت کا لباس پہن لیا اور جس اسلام کا علم بلند کرکے یہ روز سعید دیکھنا نصیب ہوا تھا، رفتہ رفتہ بن بیلا نے اس کو طاق نسیان کے حوالہ کر دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس بلند نصب العین کی خاطر عوام نے اپنے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی، وہ بن بیلا کو اس سے انحراف کی اجازت کسی قیمت پر نہ دے سکتے تھے، چنانچہ بن بیلا جن کی شہرت و مقبولیت اوج کمال کو پہنچ گئی تھی، قعر دار میں گر گئے، ان کے جانشین کرنل حوری بومداین نے اس راز کو پوری طرح سمجھ لیا ہے اس لیے الجزائر کا اسلام نواز طبقہ بھی ان کی توصیف میں رطب اللسان ہے، اور جدت پسند گروہ میں بھی وہ اپنی لچکدار پالیسیوں کے باعث مقبول ہیں، اسلام اور اسلامیت کی ترقی میں اس وقت الجزائر افریقہ کے تمام ممالک میں ایک روشنی کے منارہ کی حیثیت رکھتا ہے، گذشتہ عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی ذلت آمیز شکست کے بعد جہاں مراکش کے شاہ حسن ثانی نے ایمان افروز صدا بلند کی تھی، وہیں کرنل بومداین نے بھی کہا تھا کہ

"گو مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک نے جنگ بندی قبول کر لی ہے لیکن الجزائر اس تجویز کو قبول نہیں کر سکتا، اور وہ اس وقت تک حالت جنگ میں رہیگا جب تک کہ سرزمین قدس اسرائیل کے ناپاک قبضہ سے خالی نہیں ہو جاتی۔"

ڈاکٹر ڈیوڈ کے مذکورہ بالا مقالہ سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ بومداین محض ظاہری طور پر اپنی اسلام پرستی کا ثبوت دیتے ہیں، لیکن صدر موصوف کے اوپر کے بیان سے اس کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

افکارِ اقبال
پیام مشرق کے آئینے میں

از جناب حافظ محمد طاہر علی صاحب ایم اے، لکچرار شعبۂ عربی و فارسی و اسلامیات
وشوا بھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن

ڈاکٹر اقبال ایک مردِ حق شناس، واقفِ اسرارِ حیات، دانائے رموزِ کائنات اور انسانی عظمت کے پرجوش مبلغ تھے، مغربی اور مشرقی فلسفوں کے تقابلی مطالعہ نے ان کے اندر فکری بلندی اور وسیع النظری پیدا کی، اور مغرب کے تصوراتی و مادی نظریاتی فلسفے کا کھوکھلا پن اور مشرق کی اخلاقی و روحانی عظمت و برتری بھی ان پر واضح کردی، دوسری طرف ان کا دل عشقِ رسول سے سرشار تھا، مغربی فلسفیوں نے جو نظریاتی بت تراشے تھے، اقبال نے جنونِ عشق میں ان پر تیشہ زنی شروع کردی اور سازِ عشق پردہ دلگداز و پرسوز ترانہ چھیڑا کہ دنیائے فکر و نظر میں انقلابِ عظیم برپا ہوگیا،

نعرہ زد عشق کہ خونین جگری پیدا شد حسن لرزید کہ صاحب نظری پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور خودگری خودشکنی خودنگری پیدا شد[۱]

اقبال کے افکار نے نہ صرف مشرق بلکہ مغرب کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا اور پروفیسر نکلسن نے "اسرارِ خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کرکے اقبال کے فلسفۂ خودی سے مغرب کو

---

[۱] تسخیر فطرت

روشناس کرایا لیکن اسرار خودی میں اقبال فلسفی زیادہ اور شاعر کم نظر آتے ہیں، اس کے مقابلہ میں پیام مشرق میں ان کی فلسفیانہ اور شاعرانہ دونوں حیثیتیں متوازن نظر آتی ہیں اور رباعیات، قطعات، غزلوں اور نظموں پر اقبال کو جو دسترس حاصل ہے پیام مشرق اسکا نمونہ ہے، اسی طرح وسعت تخیل، تنوع مضامین، سلاست و روانی اور موسیقیت کے اعتبار سے بھی پیام مشرق، اسرار خودی اور رموز بیخودی سے زیادہ دلکش اور پُر اثر ہے، بعض نظمیں مثلاً سرود انجم، نوای وقت، نغمۂ ساربان حجاز، بہار وغیرہ اپنی ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے قاآنی کے کلام سے مشابہ ہیں، اور ان نظموں کی موسیقیت پڑھنے والے پر وجد و کیف کا عالم طاری کر دیتی ہے،

ان ادبی شعری محاسن کے باوجود پیام مشرق میں فکر شاعری پر مقدم ہے، اس میں "مے باقی" کے عنوان سے جو غزلیں ہیں وہ حدیث زنان نہیں، حدیث زیست ہیں اور ان میں اقبال زلف معشوق نہیں بلکہ گیسوئے حیات سنوارتے نظر آتے ہیں، جو شخص ان میں رومانیت کی چاشنی اور زلف ولب و رخسار کا حسن تلاش کرتا ہے، اس کو خود بھی مایوسی ہوتی ہے، اور اقبال بھی اس سے شاکی ہوتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں:۔

آشنای من ز من بیگانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت

من شکوہ خسروی او را دہم
تاج کسری زیر پای او نہم

او حدیث دلبری خواہد ز من
رنگ و آب شاعری خواہد ز من

کم نظر بیتابی جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید

برگ گل رنگین ز مضمون من است
مصرع من قطرۂ خون من است[۱]

---

[۱] پیشکش بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں

اقبال نے پیامِ مشرق جرمنی کے مشہور فلسفی شاعر گوئٹے[1] کے دیوان کے جواب میں لکھا ہے، چنانچہ کہتے ہیں :-

پیرِ مغرب شاعرِ المانوی　　آں قتیلِ شیوہ ہای پہلوی
بست نقشِ شاہدانِ شوخ و شنگ　　داد مشرق را سلامی از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغامِ شرق　　ماہ تابی ریختم بر شامِ شرق[2]

لیکن اقبال اور گوئٹے میں جو فرق ہے اس کا احساس اقبال کو بھی ہے، گوئٹے مشرق کے وجد آفریں ترنم اور پرسوز تغزل پہ سر تو ضرور دھنتا ہے لیکن اس کے اخلاقیات و روحانیات سے کوئی تاثر قبول نہیں کرتا، اس نے مغرب میں آنکھ کھولی اور مغربی فضا میں تربیت پائی، اس لیے اس میں شوخی، تیزی اور طراری ہے، اور اسکے نغمے سے سارا چمن گونج اٹھا۔ لیکن اقبال مشرق کا پروردہ ہے۔ اس میں وہ بیباکی نہیں ہے، مگر اس کا کلام عجمی روحانیات سے لبریز اور پیرانِ مشرق کے نالوں سے پرسوز ہے، اگرچہ دونوں "دانائے ضمیرِ کائنات" اور "گوہرِ آئینہ تابدار" ہیں، لیکن ایک صدف سے باہر اپنی آب و تاب سے نگاہوں کو خیرہ کر رہا ہے، اور دوسرا آغوشِ صدف میں پنہاں ہے، گوئٹے کے ساتھ اپنا موازنہ کرتے ہوئے اقبال نے اس فرق کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے :-

---

[1] گوئٹے جرمن کا مشہور شاعر، ناول نگار، ڈرامہ نگار، سائنسداں اور فلسفی تھا، وہ ۱۷۴۹ء میں فرانکفرٹ میں پیدا ہوا، صغر سنی ہی میں اس نے متعدد نظمیں کہیں، وہ فلسفہ، سائنس، علم نجوم، مذہبیات اور تصوف سے دلچسپی رکھتا تھا اور فلسفہ میں کانٹ، شیلر اور اسپنوزا سے متاثر تھا، اس نے حافظ، عطار، سعدی اور فردوسی سے بھی استفادہ کیا، جس نے اسکے اشہبِ تخیل کیلیے مہمیز کا کام کیا اور اسکے تخیل کی بلند پروازی نے "مغربی دیوان" کی شکل اختیار کرلی جسکے ذریعہ گوئٹے نے جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی، اسی دیوان کے جواب میں پیامِ مشرق لکھا گیا، گوئٹے نے ۱۸۳۲ء میں ویمر میں وفات پائی، [2] مشکوٰۃ بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں،

شعلۂ من از دم پیرانِ شرق | او ز افرنگی جوانان مثلِ برق
من دمیدم از زمین مردہ ای | او چمن زادی چمن پروردہ ای
من بصحرا چون جرس گرم خروش | او چو بلبل در چمن فردوس گوش
ہر دو پیغام حیات اندر ممات | ہر دو دانای ضمیر کائنات
او برہنہ من ہنوز اندر نیام | ہر دو خنجر صبح خند آئینہ فام
زادۂ دریای ناپیدا کنار | ہر دو گوہر ارجمند تابدار
تا گریبانِ صدف را بردرید | او ز شوخی در تہ قلزم تپید
در ضمیر بحر نایابم ہنوز[1] | من باغوشِ صدف تابم ہنوز

اقبال نے پیام مشرق کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ لالۂ طور، افکار، مئے باقی اور نقش فرنگ۔ ان میں کورانہ تقلید، فلسفہ حکمت، عقل، حقیقت زندگی، جد وجہد، سیاست، جمہوریت، خودی اور عظمت انسان کے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ اور مغربی فلاسفہ اور شعراء پر اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں تبصرے بھی کیے ہیں، ذیل میں پیام مشرق کی روشنی میں ان عنوانات سے متعلق افکار اقبال کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

کورانہ تقلید | اقبال کورانہ تقلید کے قائل نہیں، تقلید کو گناہ عظیم سمجھتے ہیں، اور اپنی راہ خود نکالنے کا درس دیتے ہیں۔ اس کو وہ اس موثر مثال سے سمجھاتے ہیں کہ اگر تقلید اچھی چیز ہوتی تو پیغمبر اپنے آباد اجداد کی تقلید کرتے۔

زبند پاستاں آزاد رفتے | چہ خوش بودے اگر مرد نکو پے
پیمبر ہم رہ اجداد رفتے[2] | اگر تقلید بودے شیوۂ خوب

---

[1] پیش کش بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں [2] خردہ

دوسری جگہ کہتے ہیں:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش / براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کارِ نادر آید / گناہی ہم اگر باشد ثواب است[1]

مغرب کے بعض فلسفیانہ نظریات کے قائل ہوتے ہوئے بھی تقلید کی مخالفت کی بنا پر ان نظریات سے بالکلیہ متفق نہیں، بلکہ اس کی مخالفت کرتے ہیں، البتہ یہ مخالفت غیر مشروط نہیں ہے، کیونکہ اقبال خود فلسفی تھے، اور ان کا سارا کلام فلسفیانہ خیالات سے معمور ہے،

فلسفہ | اقبال تنہا فلسفہ کو علم و یقین کا ذریعہ نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک فلسفہ ایک کارِ بے پایاں ہے جس کی تحصیل کے لیے صرف دبستان میں زانوے تلمذ تہ کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ سوز دروں کی بھی ضرورت ہے:

حکمت و فلسفہ کاری ست کہ پایانش نیست / سیلیٔ عشق و محبت بہ دبستانش نیست[2]

مغرب محض دماغ کی فسوں گری کے ذریعہ حقیقتِ عالم کو پانے کی کوشش کرتا ہے، اس لیئے دانای فرنگ کو خطاب کرکے کہتے ہیں:

دانش اندوختۂ دل زکف انداختۂ / آہ زاں نقد گرانمایہ کہ در باختۂ[3]

اقبال کا خیال ہے کہ محض فلسفہ کے ذریعہ کچھ حاصل نہیں ہوتا:

دشت و کہسار نوردید و غزالی نگرفت / طوف گلشن زد و یک گل بگریبانش نیست[4]

اس لیے عشق کی زبان سے علم کو پیغام دیتے ہیں:

بیا یک ذرہ از دردِ دلم گیر / تہ گردوں بہشت جاوداں ساز[5]

---

[1] لالۂ طور [2] پیام [3] ایضاً [4] ایضاً [5] محاورۂ علم و عشق

اقبال فلسفہ سے زیادہ فلسفی پر تنقید کرتے ہیں، ان کے نزدیک فلسفی گم کردہ منزل ہوتے ہیں، وہ بحرِ حقیقت میں غواصی ضرور کرتے اور لولوئے لالہ کی تلاش میں رہتے ہیں، لیکن گرداب میں پھنس کر اسی کو منزل سمجھ بیٹھتے ہیں، اور تہ تک نہیں پہنچ پاتے، اسلیے گوہرِ مراد اُن کے ہاتھ نہیں آتا،

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم   دستِ رومی پردۂ محمل گرفت
این فروتر رفت تا گوہر رسید   آں بگردابی چوں خس منزل گرفت [1]

اقبال کہتے ہیں کہ فلسفی دماغ کے دریچوں کو تو کھول سکتا ہے لیکن دل میں سوز و گداز نہیں پیدا کر سکتا، اور اس کو وہ حرارت نہیں بخشتا جس سے زندگی عبارت ہے، اس لیے وہ فلسفیوں سے دور رہنا کی تلقین کرتے ہیں،

زیر دستِ فلسفیاں در آ بحریم سوز و گداز من   زیر فسوں گری خرد بہ تپیدن دل زندہ [2]

حکمت | حکمتِ فرنگ کو اقبال سامانِ موت کہتے ہیں، اپنی نظم "حکمتِ فرنگ" میں ایک ابلہ کی زبان سے "بحضور یزدانِ پاک" یہ شکایت کرتے ہیں کہ تیرا فرشتۂ اجل آج بھی روح قبض کرنے کے وہی فرسودہ طریقے استعمال کرتا ہے، حالانکہ حکمتِ فرنگ نے موت کے نئے نئے سامان اور طریقے ایجاد کر دیئے ہیں،

کشندگو و اندیشہ پہ کارِ مرگ   ہمہ حکمتِ او پرستارِ مرگ [3]

اس لیے بے دریغ جان لینے کے طریقے سیکھنے کے لیے اپنے فرشتہ کو فرنگستان بھیج،

فرست ایں کہن ابلہ را در فرنگ   کہ گیرد فن کشتن بے درنگ [4]

لیکن اقبال حکمت کے مطلق مخالف نہیں، اس کو وہ "خیر کثیر"[5] کہتے ہیں:

---

[1] حکمت و شعر۔ [2] مے باقی۔ [3] حکمتِ فرنگ [4] ایضاً [5] قرآن، سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۹ (من یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً)

گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر[1]

بلکہ اس کو وجدان کا تابع کرنا چاہتے ہیں،

عقل

اقبال کے نزدیک محض عقل باعث تخریب جہاں ہے، اور جویائے حق کو جنون و حیرت کی وادی میں بھٹکاتی ہے، کیونکہ وہ ادراک وجدانی کی قائل نہیں، بلکہ عقلی ادراک کا تجزیہ کرنے کے لیے پرپیچ راہوں سے گذرتی ہے، اس لیے خود جادۂ مستقیم سے بھٹک جاتی ہے، اور کسی مسئلہ کی عقدہ کشائی کے بجائے اس کو اور تہ و لیدہ بنا دیتی ہے :

چہ کنم کہ عقل بہانہ جو گرہے بروی گرہ زند نظری کہ گردش چشم تو شکند طلسم مجاز[2]

اس لیے وہ جستجوئے حقیقت میں محض عقل کی رہبری پر بھروسہ نہیں کرتے، انکا خیال ہے کہ عقل ہمیشہ شک و شبہ میں مبتلا رہتی ہے، اس کے برعکس عشق یقین کی سرحد پر پہنچا دیتا ہے، اقبال عقل کو کہیں "بہانہ جو" اور کہیں "فسوں پیشہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں، عقل کی مذمت میں اقبال اور برگساں[3] دونوں متفق ہیں، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ برگساں عقل کو قطعی طور پر قابل مذمت قرار دیتا ہے، اور اقبال عقل کو تمامتر قابل مذمت نہیں قرار دیتے[4]، ان کے نزدیک یہی عقل جو اپنے جلوۂ بیباک سے سارے جہاں میں آگ لگاتی ہے، اگر عشق سے آئین جہاں تابی سیکھ لے تو دوسری ہی چیز بنجائے گی۔

عقلے کہ جہاں سوز دیک جلوۂ بیباکش از عشق بیاموزد آئین جہاں تابی[5]

---

[1] پیشکش بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں [2] مے باقی [3] ہنری برگساں فرانس کا مشہور فلسفی اور اقبال کا ہمعصر تھا، وہ ۱۸۵۹ء میں پیرس میں پیدا ہوا ۱۹۰۰ء میں فرانس کے ایک کالج میں فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا اور ۱۹۲۱ء تک اس عہدہ پر فائز رہا، ۱۹۲۷ء میں اس کو ادب پر نوبل پرائز ملا، اس نے زمان و مکان، جبر و اختیار، عقل و وجدان، حقیقت زندگی اور اخلاقیات و مذہب پر متعدد تصانیف چھوڑی ہیں، اقبال نے برگساں پر کئی اشعار لکھے ہیں، برگساں نے ۱۹۴۱ء میں وفات پائی [4] Iqbal, his art and Thought از ایس، اے وحید، ص ۱۰۱ [5] عشق

عشق عقل کو اس مقام پر لیجائے گا کہ جہاں خود بیں سے جہاں بیں بنجائیگی اور بال بلبل سے بازوئے شاہین میں تبدیل ہو جائے گا، اپنے ظن و تخمین کی وادی میں گم نہیں ہوگی، بلکہ دونوں عالم پر محیط ہو جائے گی،

عقل خود بین دگر و عقل جہاں بیں دگر است
بال بلبل دگر و بازوی شاہیں دگر است

دگر است آنسوئے نُہ پردہ کشادن نظرے
این سوی پردہ گمان و ظن و تخمین دگر است

ای خوش آن عقل کہ پہنای دو عالم باادست
نور افرشتہ و سوز دل آدم با اوست[1]

حقیقت زندگی | حقیقت زندگی کے متعلق اقبال برگسان سے متفق ہیں، اقبال زندگی اور کل موجودات کو حقیقی تصور کرتے ہیں۔ ان کا ذاتی وجود اور اپنی انفرادیت تسلیم کرتے ہیں، برگسان زندگی کو بہتے ہوئے دھارے سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس کے تسلسل کا قایل ہے۔ برگسان کا خیال ہے کہ زندگی ایک دھارے کی طرح مسلسل رواں ہے اور اس مستقبل غیر متعین ہے[2]، یہ مادہ سے مل کر نئی نئی شکلیں اختیار کرتی ہے۔

ابن العربی[3] بھی اس کے قائل ہیں اور فصوص الحکم کے "فص شعیبی" میں اس کی تشریح کی ہے، جامی[4] اپنی تصنیف "لوائح جامی" کے لائحہ بست و ششم میں ابن العربی کے حوالے سے لکھتے ہیں: "عالم

---

[1] پیام[2] Iqbal - his art and Thought by S. A. Vahid R 100 [3] شیخ محی الدین ابن العربی ۵۶۰ھ / ۱۱۶۵ء میں بمقام مرسیہ پیدا ہوئے اصل نام محمد اور والد کا نام علی بن محمد عربی ہے۔ عالم متبحر اور عارف کامل تھے، وحدت الوجود کو ایک جامع نظریہ کی حیثیت سے پیش کیا اور اس سے متعلق بکثرت کتابیں لکھیں، جامی نفحات کا خیال ہے کہ انکی تصنیفات پانچ سو سے زیادہ ہیں، شعرانی نے چار سو شمار کیا ہے، جدید تحقیق سے انکی دو سو تصنیفات کا پتہ چلتا ہے، انکی تصنیفات میں "فتوحات المکیہ" اور "فصوص الحکم" بہت مشہور ہیں، ابن العربی نے ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء میں دمشق میں وفات پائی اقبال ابن العربی کے نظریہ وحدت الوجود سے اتفاق نہیں کرتے

[4] نور الدین عبد الرحمن بن نظام الدین احمد بن محمد الدشتی نویں صدی ہجری کے عظیم المرتبت شاعر، جید عالم اور باکمال صوفی تھے علامہ عبد الرحمن جامی کے نام سے مشہور ہوئے ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء میں خراسان کے ایک قصبہ جام میں پیدا ہوئے اور ۸۹۸ھ / ۱۴۹۲ء میں بمقام ہرات وفات پائی۔ تصوف میں نقشبندیہ سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن نظریاتی اعتبار سے ابن العربی کے ہمنوا اور انکے مسلک پر کاربند تھے۔ انکی تصنیفات میں نفحات الانس، سلسلۃ الذہب، سبحۃ الابرار، لوائح وغیرہ مشہور ہیں۔

عبارت است از اعراض مجتمعہ در عین واحد کہ حقیقت ہستی حق است و آں متبدل و متجدد می گردد مع الانفاس والآنات۔ در ہر آنے عالم بعدم می رود و مثل آں بوجود می آید۔" اس کے بعد جامی نے اس ضمن میں، اشاعرہ اور سوفسطائیہ کے نظریات کی وضاحت کی ہے، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زندگی جو تجلی حق ہے ہر آن ایک نئی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس خیال کو جامی نے متعدد رباعیوں میں پیش کیا ہے، دو رباعیاں ذیل میں درج کیجاتی ہیں،

بحریست نہ کاہندہ نہ افزائندہ　　امواج برو روندہ و آئندہ
عالم چو عبارت از ہمیں امواج است　　نبود دو زماں بلکہ دو آں پائندہ[۱]

ہستی کہ دو آن نیست عیاں در شانے　　در شانِ دگر جلوہ کند ہر آنے
ایں نکتہ بجو ز کل یوم فی شان　　گر بایدت از کلام حق برہانے[۲]

اقبال بھی یہی کہتے ہیں:

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود　　ایں مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود[۳]

دادم نقشہائے تازہ ریزد　　بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است　　بخاکِ تو شرار زندگی نیست[۴]

زندگی کی اس "حقیقت تبدل" سے اقبال بالکلیہ متفق ہیں، انھوں نے کائنات کا بغور مشاہدہ کیا اور اجزائے کائنات کی نمو دس پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ کائنات کی ہر شے بڑھنا، ابھرنا، نشو و نما حاصل کرنا اور اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتی ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

چہ لذت یارب اندر ہست و بود است　　دل ہر ذرہ در جوشِ نمود است

---

[۱] لوائح جامی، لائحہ بست و ششم [۲] ایضاً [۳] پیام [۴] لالۂ طور

شگافد شاخ را چوں غنچۂ گل تبسم ریزہ از ذوقِ وجود است[1]

برگساں زندگی کی "حقیقت تبدل" (Reality of change) کے ساتھ اسکی صلاحیت تخلیق کا بھی قائل ہے، جسے وہ Elan vital سے تعبیر کرتا ہے، لیکن اقبال اس کی تخلیقی صلاحیت سے متفق نظر نہیں آتے[2]، البتہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس دھارے کے ساتھ رواں دواں رہنا ہی زندگی ہے، اور اس سے جدائی موت ہے؛ چنانچہ کہتے ہیں:

تا بر تو آشکار شود رازِ زندگی خود را جدا ز شعلہ مثالِ شرر مکن[3]

برگساں کے اس خیال سے بھی اقبال متفق ہیں کہ حقیقت زندگی محض عقل کے ذریعہ نہیں پہچانی جا سکتی، ہماری عقل زندگی کے صرف ان مظاہر کا ادراک کرتی ہے، جو زمان و مکان میں مقید ہیں، کائنات کی بازیافت اور حقیقت زندگی کے ادراک کے لیے عقل (Intellect) کے ساتھ وجدان (Intuition) بھی ضروری ہے[4]

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است[5]

جد و جہد | اقبال کے نزدیک زندگی کا مقصد جد و جہد اور فعالیت ہے، چنانچہ کہتے ہیں:

مگو از مدعائے زندگانی ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست
من از ذوقِ سفر آنگونہ مستم کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست[6]

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است[7]

---

[1] لالۂ طور [2] Iqbal - His art and Thought by S. A Vahid. P.100 [3] پیام برگساں [4] Iqbal - His art and Thought. by S. A Vahid P.100 [5] پیام برگساں [6] لالۂ طور [7] ایضاً

موج کی زبان سے اسی سوال کا جواب دیا ہے:

موج زخود رفتہ تیز خرامید و گفت ہستم اگر می روم گر نروم نیستم[1]

اقبال کہتے ہیں کہ زندگی اسی وقت سرخرو اور کامیاب ہوتی ہے جب خطرات سے مقابل ہو:

خطر تاب و تواں را امتحان است عیار ممکنات جسم و جان است[2]

اسی جذبۂ فعالیت اور پیغام جہد و عمل کی بنا پر اقبال نٹشے[3] کے مداح ہیں، اقبال کا "مردِ مومن" اور نٹشے کا "فوق البشر" (Super Man) دونوں عزم و یقین اور جہد و عمل کا نمونہ ہیں، اسی لیے اقبال نٹشے کے متعلق کہتے ہیں:

از سستی عناصر انساں دلش تپید فکر حکیم پیکرِ محکم تر آفرید[4]

نٹشے اور اقبال میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ نٹشے مسیحیت کے اس تصور کا کہ انسان پیدائشی طور پر گنہگار ہے، اور اپنے گناہوں کیلیے اسے خدا سے معافی مانگنی چاہیے، قطعی مخالف ہے، وہ انسان کو خود اپنی تقدیر کا خالق مانتا ہے، اور اسے اپنی قوت ارادی کو کام میں لانے کیلئے بالکلیہ آزاد چھوڑ دیتا ہے کسی کے سامنے جوابدہ تصور نہیں کرتا، اس طرح وہ خدا کا قطعی انکار کرتا ہے، اقبال بھی انسان کو اپنی تقدیر کا خالق مانتے ہیں، اسے رزم و بزم میں متحرک اور فعال دیکھنا چاہتے ہیں، اور اسے اپنی فطری قوتوں کو بروئے کار لانے کی تلقین کرتے ہیں لیکن نٹشے کی طرح اس کو بالکل آزاد نہیں چھوڑتے بلکہ حدود شریعت کے اندر رکھتے ہیں، نٹشے خدا کا منکر اور اقبال خدا پرست ہیں، اسلیے وہ نٹشے کے مداح ہونے کے باوجود اس مجذوب فرنگی کو مقام کبریا سمجھانا چاہتے ہیں، نٹشے نے مسیحی فلسفۂ اخلاق پر اپنے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے جو حملے کیے اس سے دنیائے فرنگ میں ایک تہلکہ مچ گیا، اقبال نے پیام مشرق میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:

افگند در فرنگ صد آشوب تازۂ دیوانۂ بکارگہ شیشہ گر رسید[5]

---

[1] زندگی و عمل [2] اگر خواہی حیات اندر خطر زی [3] جرمن کا مشہور فلسفی اور شاعر تھا، ۱۸۴۴ء میں پرشیا میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۰ء میں اس کا انتقال ہوا۔ [4] نٹشے [5] ص ۱۴۵

سیاست | پیام مشرق میں اقبال نے مغربی سیاست پر بھی جا بجا حملے کیے ہیں، مغربی سیاست پر اظہار خیال کرتے وقت اقبال کا لہجہ سخت ہو جاتا ہے وہ فلسفی اور سیاست داں کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فلسفی را با سیاست داں بیک میزاں مسنج　　　چشم آں خورشید کورے، دیدۂ ایں بے نمے
آں تراشد قول حق را حجت نا استوار　　　ایں تراشد قول باطل را دلیل محکمے[1]

دوسری جگہ کہتے ہیں :-

برفتد تا روش رزم دریں بزم کہن　　　دردمندان جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند　　　بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند[2]

اقبال اس مغربی جمہوریت کے بھی قائل نہیں جس میں صرف عددی اکثریت پر حق و باطل کے فیصلے کا انحصار ہو، ان کا عقیدہ ہے کہ ایک حق بیں و دور اندیش کی رائے سیکڑوں کوتاہ اندیشوں پر مقدم ہے، اور موجودہ جمہوریت کا نظریہ اسکے برعکس ہے، اس لیے اقبال جمہوریت پر طنز کرتے ہیں :

متاع معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی　　　ز موراں شوخیٔ طبع سلیمانی نمی آید
گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو　　　کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید[3]

خودی اور عظمت انسان | اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کو بھی پیام مشرق میں رباعیات و قطعات کے علاوہ مختلف نظموں مثلاً "غلامی"، "قطرۂ آب"، "کرمک شب تاب"، "پند باز با بچۂ خویش"، "ہلال عید" وغیرہ میں پیش کیا ہے، اسی طرح عظمت انسان کا تصور بھی محاورہ ما بین خدا و انسان"، "افکار انجم"، "تسخیر فطرت" وغیرہ میں ملتا ہے۔

غرض پیام مشرق اقبال کے نظریات اور حکیمانہ افکار کا ایسا حسین گلدستہ ہے، جسے اقبال نے گلشن مشرق کے گلہائے رنگا رنگ سے سجا کر مغرب کے سامنے پیش کیا، مغرب نے بھی سے سر آنکھوں پر جگہ دی اور مستشرقین نے اس کا ترجمہ کرکے اقبال کی ژرف بینی، بالغ نظری، وسعت تخیل اور حیات و کائنات کے گوناگوں مسائل سے متعلق ان کے حکیمانہ افکار و نظریات سے مغرب کو روشناس کرایا۔

---

[1] فلسفہ و سیاست [2] جمعیت الاقوام [3] جمہوریت۔

فتحپور کے بعض مخطوطات اور نوادر

از

جناب الطاف حسین خاں شروانی، اسلامیہ کالج اٹاوہ

ضلع فتحپور (یو۔پی) اور اس کے مضافات کی آبادیاں اور قصبات قدیم ایام سے علماء و فضلاء، ادباء، شعراء اور متصوفین و فقراء کا مشہور مرکز رہا ہے، اس اعتبار سے یہاں آثار علمی کا پایا جانا حیرت ناک نہیں، یہاں کے بیشتر علمی ذخائر خاصی تعداد میں انگریزوں کے دورِ حکومت میں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں منتقل ہو چکے ہیں[1] لیکن اس کے باوجود اگر تفحص کیا جائے تو گرانقدر ذخیرہ آج بھی فراہم کیا جا سکتا ہے،

فتح پور یو۔پی کا ایک پرانا قصبہ ہے، یہاں علماء و صوفیہ کے گھروں میں قیمتی مخطوطے بھی تھے، اور نایاب کتابات بھی۔ مشائخ کے ملفوظات بھی تھے، اور تذکرے و دواوین بھی لیکن افسوس ہے کہ آج ان کا کوئی پرسان حال نہیں، پرانے خاندان کی یادگاریں بدحالی کا شکار، اور اپنے بزرگوں کے اندوختوں کی قدر و قیمت سے بے خبر ہیں، اس لئے بہا ہر کوڑیوں کے مول ضائع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں، اس سلسلہ میں ایک واقعہ ملاحظہ ہو:-

---

[1] تاریخ ہنسوہ (ضلع فتحپور ہنسوہ) انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے۔

۱۹۵۵ء میں میرے والد صاحب (محمود حسن خاں شروانی وکیل مرحوم) کے ایک دوست محمود منزل تشریف لائے اور فرمایا کہ ایک بنیے کی دوکان میں کوئی شخص فارسی کا ایک مخطوطہ فروخت کر گیا ہے، بنیا کہتا ہے کہ اگر یہ کوئی قیمتی کتاب ہو تو وہ خرید کے دام واپس کر دے گا، والد صاحب مشرقی علوم کے دلدادہ تھے، فوراً قیمت (ایک روپیہ) بھیج کر مخطوطہ منگوا لیا، دیکھا گیا تو مہابھارت کا فارسی ترجمہ تھا، جو محمد شاہ بادشاہ کے عہد ۱۷۴۶ء کا مکتوبہ تھا، فتحپور کے کسی ہندو رئیس نے اپنے لیے ایک مسلمان کاتب سے لکھوایا تھا،

جون ۱۹۵۹ء میں میرا تقرر مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے ایک پروجکٹ میں ہو گیا، اور میں اس مخطوطہ کو علی گڈھ ساتھ لے آیا، وہاں میں نے مختلف لائبریریوں کی فہرستِ مخطوطات کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی کہ یہ نسخہ مہابھارت کے سب نسخوں میں زیادہ قدیم ہے، اس کے جو دوسرے نسخے ملتے ہیں وہ اگر ۱۷۴۶ء سے پہلے کے مکتوبہ ہیں تو کم ابواب (پربھ) پر مشتمل ہیں اور جو مکمل ہیں، وہ ۱۷۴۶ء سے بہت بعد کے ہیں، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

مولانا آزاد لائبریری، شعبۂ مخطوطات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۔ مہابھارت: از فن اول تا یازدہم۔ از فیضی، مکتوبہ ۱۸۴۷ء، درگا پرشاد صفحات ۲۳۹

۲۔ مکتوبہ ۱۷۲۷ء، پرنت رائے، صفحات ۲۴۵

۳۔ خلاصہ ترجمہ مہابھارت اول و دوم۔ ملا طاہر بن عماد الدین، سال تصنیف عہد اکبری۔ جزء اول: ۱۸ پربھ کا خلاصہ صفحات ۲۲۸۔ جزء دوم: ناقص، مکتوبہ ۱۷۰۲ء،

۴۔ از اول تا چہارم پریبہ۔ ابوالفضل، مکتوبہ ۱۰۵۲ھ، صفحات ۳۹۱

۵۔ از نقیب خاں، مکتوبہ ۱۰۶۱ھ (کاتب عبدالرحمٰن خاں) ناقص۔

خدا بخش خاں لائبریری، بانکی پور، XVI vol

۱۔ ۹ ابواب (تاریخ درج نہیں، غالباً انیسویں صدی کا، قیاس مرتب فہرست) صفحات ۴۲۳

۲۔ ۱۸ ابواب (تاریخ درج نہیں، غالباً انیسویں صدی کا، قیاس مرتب فہرست)

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ:

۱۸ ابواب، مکتوبہ ۱۵۸۱ء، صفحات ۶۷۰

انڈیا آفس لائبریری لندن:۔

۱۸ ابواب از ابوالفضل، مکتوبہ ۱۶۰۱ء، صفحات ۵۱۴

برٹش میوزیم، لندن:۔

۱۔ ترجمہ مع دیباچہ ابوالفضل، مکتوبہ ۱۷۷۵ء

۲۔ تقریباً ۱۸ ویں صدی عیسوی کے اختتام کا مکتوبہ (قیاس مرتب فہرست)

ان نسخوں کے مقابلہ میں فتحپور کا نسخہ ہر لحاظ سے قیمتی اور قابل توجہ ہے،

تقطیع کلاں، خوشخط، شروع میں خوبصورت طلائی گلکاری، کاغذ بیز، شنجرفی، کاتب محمد وارث بن محمد اعظم، مکتوبہ ۱۰۴۶ء، نوسو ستر صفحات پر مشتمل ہے، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ نے اس نسخہ کو خرید لیا ہے، اور اب یہ یونیورسٹی کلکشن نمبر ۱۵۹ فارسیہ اخبار میں درج ہے،

بعض دوسرے مخطوطات جو فتحپور میں موجود ہیں یا علی گڑھ منتقل کر دیے گئے ہیں،

(۲) مفتاح الجنان۔ مؤلفہ محمد وجیہ الدین مرید خواجہ نصیرالدین قدس سرہ

برادر زادہ مولانا ضیاء الدین صاحب تفسیر المغنی مکتوبہ ۱۲۳۸ھ، کاتب شیخ علاؤ الدین آگرہ، خط پاکیزہ، کہیں کہیں کرم خوردہ، تقطیع متوسط، صفحات ۵۳۶

یہ کتاب ایک طرح کی کشکول ہے جس میں مختلف انبیاء علیہم السلام، خلفاء وسلاطین؛ علماء وصوفیہ ومشائخ کے سبق آموز حالات اور قصص وحکایات درج ہیں، اس کی تالیف میں بزرگوں کے ملفوظات سے زیادہ مدد لی گئی ہے، اس سے مفید تاریخی معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب نہایت اہم ہے،

خلیفہ چلپی نے کشف الظنون میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے، اس کے دو نسخے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (شعبہ مخطوطات حبیب گنج کلکشن) اور ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے، [illegible] نسخہ کو لاکر اب تک چار نسخے دستیاب ہو چکے ہیں، ان چاروں کی مدد سے ایک معیاری اڈیشن تیار کیا جا سکتا ہے، (یہ نسخہ علی گڑھ منتقل ہو چکا ہے)

۳۔ نافع السالکین۔ ملفوظات حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ (المتوفی ۱۲۶۹ھ) دو حصوں میں ہے، اور ہمارے خاندان کی پرانی یادگار ہے، میڈھ دخال کاتب ساکن فتحپور نے لالہ راج بہادر رئیس فتحپور کی فرمایش پر ۱۲۸۰ھ میں لکھا ہے تقطیع کلاں، خط نستعلیق ہے، کہیں کہیں شکست بھی ہے، مصنف امام الدین مرید خواجہ تونسویؒ نے یہ ملفوظات ۱۲۵۱ھ میں سپرد قلم کیے ہیں، یہ مخطوطہ بھی اب مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ منتقل ہو گیا ہے،

(۴) مراۃ الکاملین۔ مصنفہ عباد اللہ خواجہ عنایت اللہ ساکن کالپی، اسکی تصنیف وکتابت ۱۳۰۵ھ میں ہوئی ہے، یہ نسخہ مصنف کے قلم کا ہے، کتاب اردو میں ہے، اس کا دوسرا نسخہ غالباً کہیں نہیں پایا جاتا، کالپی کے صوفیۂ کرام کے حالات

اور ان کے متعلق مفید معلومات پر مشتمل ہے۔[1]

(۵) رسالہ دلائل النبض۔ مصنفہ حکیم یوسف بن محمد ہروی، طبیب خاص بابر بادشاہ، شیخ فرید لکھتے ہیں،

"Enc. of Islam میں لکھا ہے کہ یوسفی، ہمایوں کا منشی شاید وہی حکیم یوسف بن محمد ہروی ہے جو بابر کا طبیب خاص بھی رہا ہے، دلائل النبض بھی اسی کی تصنیف ہے۔[2]"

سال تصنیف ۹۴۲ھ ہے،

اس میں ایک اور رسالہ بھی شامل ہے، جس کا نام "رسالہ مختصر البیان فی ضروریات بحران" ہے، غالباً یہ بھی حکیم یوسف بن محمد ہروی کی تصنیف ہے، دلائل النبض کے آخر میں حسب ذیل اشعار درج ہیں ؎

احکام بول را چو زدہ فکر یوسفی	بہر تو جمع کردہ جمیع پدا دراں
تاریخ سال تاکہ شود روشنت بدا	قارورہ گیر ساز صد و سی فزایراں

(۶) انشائے طغرا۔ از ملا طغرا مشہدی، مکتوبہ شیخ آبرو بخش ساکن مجاہد پور برائے مولوی فیض خاں اکبر آبادی ۱۲۶۳ھ، سرخ تحریر میں چند ابواب قائم کیے ہیں۔

ان مخطوطات کے علاوہ اورنگ زیب کے عہد کے بیع نامے، تبادلے نامے، بخشش کے فرامین اور دوسری قیمتی یادگاریں بھی ہیں جو ۱۰۹۴ھ مطابق ۱۶۸۲ء سے ۱۸۵۶ء تک سے متعلق ہیں، اس قسم کے بائیس ۲۲ نوادر ہمارے یہاں محفوظ ہیں، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے متعلق دو نوادر قابل توجہ ہیں،

---

[1] علی گڑھ میں اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں، اسکے علاوہ دنیا کے دوسرے کتب خانوں میں بھی دستیاب نہیں ہوگا۔
[2] معارف، جولائی ۱۹۴۲ء، مقالہ "دو کتابیں"۔

(۱) فتحپور کے ان اشخاص کی فہرست ہے، جن کو اس جنگ آزادی میں ان کے حسن خدمات کے صلہ میں انعام ملے تھے۔ اس میں ان کے نام، تعداد، انعام کی قسم، وجہ انعام تفصیل سے درج ہے،

(۲) اس میں انگریزوں کے اس مال کی تفصیل درج ہے جو غدر میں لوٹ لیا گیا تھا، پھر بعد میں دستیاب ہوا، مرتبہ امداد علی کوتوال فتحپور، آخر میں محمد زماں خاں شروانی کے دستخط بحیثیت نائب کوتوال شہر درج ہے۔

ہنسوہ، کوڑہ جہان آباد، کڑہ سادات اور ایرایاں وغیرہ میں بہت سے فارسی مخطوطات غیر مرتب حالت میں محفوظ ہیں، جن کا انشاء اللہ آیندہ ذکر کیا جائے گا۔

اسلامی علوم وفنون

ہندوستان میں

ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون پر اور جگہوں کے مقابلہ میں کم کام نہیں ہوا ہے، ان تمام علوم پر ہندوستانی علماء اور مصنفین کی بہترین کتابیں موجود ہیں، جن سے تمام دنیا متمتع ہو رہی ہے، لیکن ان کی کوئی جامع فہرست اب تک مرتب نہیں ہوئی تھی، اسی کمی کو دور کرنے کیلئے حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم نے الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند کے نام سے عربی میں ایک کتاب مرتب کی تھی، جس کو شام کے مشہور علمی ادارے المجمع العلمی العربی دمشق نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، یہ اسی عربی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں ہندوستانی علماء و مصنفین کی تصانیف کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل علمی و تعلیمی و ذہنی و فکری تاریخ بھی قلم بند ہو گئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی دور کے محققین کیلیے ایک بہترین ماخذ بن گئی ہے۔ ضخامت ۴۴۸ صفحے قیمت ۱۰ روپے

منیجر

دو قدیم شاہی فرامین اور بعض تاریخی آثار

از مولانا سید عبد الرؤف صاحب اورنگ آبادی

صوبہ بہار میں بہت سے شاہی فرامین محفوظ ہیں، ان میں سے دو یہاں نقل کیے جاتے ہیں، ان میں ایک اختیار خاں سالار فوج کے نام ہے، دوسرا مولانا محب اللہ صاحب خطیب جامع مسجد[1] قصبہ سرس اور مولانا محمد معصوم صاحب امام جامع مسجد کے نام، اختیار خاں ان غزنوی یا غوری مجاہدین کی نسل سے تھے، جنھوں نے قصبہ سرس میں سکونت اختیار کر لی تھی، شاہ عالم کے فرمان میں ان کے نام کے ساتھ سالار فوج کے لقب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد تک یہ عہدہ یا لقب اس خاندان میں باقی تھا، مولانا محب اللہ صاحب اور مولانا محمد معصوم صاحب بھی سرس کے قدیم باشندے تھے، ان کی اولاد اس قصبہ میں ابتک آباد ہے، ان میں مولانا محمد غلام مصطفےٰ صاحب، مولانا عبد الحیٰ صاحب فرنگی محلی کے شاگرد اور اس دور کے نامور عالم تھے، جامع سرس جس میں ان کا عربی کا مدرسہ تھا، جو اب مکتب کی شکل میں ہے،

[1] یہ جامع مسجد سرس میں دریائے چن چن کے کنارے بڑی بلندی پر واقع اور عالمگیری عہد کی تعمیر کردہ اور مسجد شمس الدین کے نام سے مشہور ہے، کتبہ کی نقل حسب ذیل ہے:- بعہد خلافت جہاں خدیو سلطان الاعظم شہنشاہ ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی، درعمل نواب کامگار خاں مسجد جامع شمس الدین محمد بتوفیق تمام حسب دلخواہ در ۱۱۰۱ھ الف سبعین احد انتظام یافت، ضعف من عباد اللہ سید افضل بخاری ہمسو اتمام شد

فرمان شاہ عالم بنام اختیار خان سالار فوج	مہر زدہ شاہ عالم بادشاہ غازی بہ دستخط نواب عالی جاہ ممتاز الدولہ نصیر الملک بہادر امیر محمد قاسم خان

سنہ ۱۱۷۳ھ رفعت و عوالی پناہ عزیز القدر مرتضیٰ قلی خان مورد مراحم باسند اختیار خان سالار فوج را دہ بسوہ اراضی لاخراج در بستی و ہفت بگیہ دہ بسوہ اراضی لاخراج عبور چن چن واقع پرگنات ساتی دیوان بہ قصبہ سرس بانعام بہادری مرحمت فرمودہ شد بنا برآں مرقوم می گردد کہ نام بردہ را حسب الضمن اراضیات لاخراج بدہند دریں باب تاکید اکید دانند زیادہ چہ نگاشتہ آید تاریخ ہفدہم شہر شعبان المعظم سنہ ۱ جلوس معلی قلمی شد

برپست فرمان مقرر شرح ضمن بموجب فرمان عالیشان جناب مرقوم تاریخ ہفدہم شعبان سنہ ۱ جلوس معلی بست بگیہ اراضی لاخراج بانعام دادہ شد و پروانہ مرحمت گردید دستخط چہارم رمضان المبارک نقل بدفتر دیوان عالی شد۔ ملاحظہ شد۔

فرمان بنام مولانا محب اللہ خطیب جامع مسجد سرس	مہر زدہ شاہ عالم بادشاہ غازی بدستخط نواب عالیجاہ ممتاز الدولہ نصیر الملک بہادر میر محمد قاسم خان

سنہ ۱۱۷۳ھ رفعت و عوالی پناہ عزیز القدر مرتضیٰ قلی خان والا مراحم باشند مولانا محمد معصوم امام جامع مسجد سرس ظاہر نمودند کہ شش بگیہ دہ بسوہ آراضی لاخراج اندر بستی جانب مشرق از چن چن تا مزار حضرت زندہ شہباز صاحب قدس سرہ العزیز جانب جنوب از مسجد شاہی تا مسجد خام کہ دراں مکانات

سکونتی رعایا و مزار مورثان ما واقع اند و یک بیگھہ آراضی لاخراج
واقع بردہ میرخان جملہ دوازدہ بیگھہ آراضیات لاخراج و چہار دو آنہ
یومیہ بصلہ امامت مولانا محب اللہ صاحب خطیب جامع مسجد سرس
بمد معاش و دو بیگھہ دہ بسوہ آراضی لاخراج جہت فتیلہ سوزی
و جاروب کشی جامع مسجد شاہی مقرر یافتہ آمدہ و سندش سوختہ شد بنابریں
مرقوم می گردد کہ دوازدہ بیگھہ دہ بسوہ آراضیات لاخراج مسطور
را در قصبہ سرس بمد معاش امام مسجد موصوف و دو بیگھہ دہ بسوہ
آراضی لاخراج شاملی زار از جہت فتیلہ سوزی بتولیت امام مسجد
شاہی موصوف بموجب سند سرکار بدستور سابق بحال دارند یومیہ
مذکور را نیز از تحصیل مال بمد معاش می دادہ باشند کہ یکے زنہ کسے بوجہ
من الوجوہ مزاحم نہ باشند و سند مجدد نہ طلبند کہ صرف اوقات نمودہ
در دعاگوئی اشتغال و مواعظ نمودہ باشند دریں باب تاکید دانند
زیادہ چہ نگاشتہ آید، پانزدہم شہر جمادی الثانی سنہ ... جلوس معلی
قلمی شد۔

ادبیات

نظم

از جناب ڈاکٹر ولی الحق انصاری

ہو گیا درد لا دوا ہم نے جو کی دوا طلب
تیرے کرم سے کیا ملا ہم نے کیا تھا کیا طلب

جتنی ملی مرادِ دل اُس سے بڑھی سوا طلب
مجھ کو کہیں مٹا نہ دے یہ دلِ مدعا طلب

نحس ہے تیرا پاٹ شل، سعد ہو دست با عمل
سایۂ بوم سے نہ ڈر، کر نہ پرِ ہما طلب

تیغ ستم سے زخم دل مانگ رہے ہیں پھر نمک
طالب جورِ یار ہو پھر یہ دلِ جفا طلب

پیش جہاں بڑھائے ہاتھ ہم نے خلوص کیلئے
جو نہ کبھی وہ دے سکے ہم نے وہی کیا طلب

اس کی جو شان کیا بیاں جس کا مقام عرش ہو
اس کا نہ پوچھ مرتبہ جس کو کرے خدا طلب

میرے دل و دماغ میں کیسے نبھے گی دیکھئے
سر میرا بے نیازِ دہر دل میرا آشنا طلب

ہنستے تم اڑا دی شوخیٔ طبعِ بندگاں
تجھ سے تجھی کو اے خدا کرتے ہیں بڑا طلب

راہِ وفا میں دوستو ہم کو اجل کا خوف کیا
ہم نے کیا ہے موت کو آپ ہی بارہا طلب

بہر حصول کام دل مشقِ شوق چاہیئے
چاہے جو تو وہی ملے پہلے مگر بڑھا طلب

آج تو سوئے میکدہ اٹھتے ہیں شیخ کے قدم
آج تو دستِ دختِ رز کرتے ہیں پارسا طلب

پیش خدا جھکے جو سر دستِ دعا اٹھے اگر
مانگ نگاہ صدق بیں کر دلِ بے ریا طلب

کتنا ہی غم ہو دل خراش در ہمہ حال شاد باش
درد میں کر شفا تلاش کر نہ کبھی دوا طلب

تیرے اسیر وہ نہیں جنکو اجل کا خوف ہو
تیرے شہید وہ نہیں جنکا ہو خوں بہا طلب

عالم شوق میں ولی بھول گئے ہم انکو بھی
اس کا بھی ہوش اب نہیں کسنے ہیں کیا طلب

غزل

از جناب بدرالزماں صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ

میرے نصیب کا فسانہ ہو تو کیا کہئے
جو حسن اپنا ہی دیوانہ ہو تو کیا کہیے

بہت ہے اک نگہِ پُر کرم جو مل جائے
دل حریص کا پیمانہ ہو تو کیا کہیئے

وہ سن تو لیتے مرا حال دل بجبر سہی
طویل درد کا افسانہ ہو تو کیا کہئے

یہ مانا عالم تدبیر ہے رہین خرد
پابند حسن کا کاشانہ ہو تو کیا کہئے

رموز عشق کے پردے اٹھے ہوئے ہیں ولے
یہیں کہیں دل دیوانہ ہو تو کیا کہئے

خرد کی بات کوئی کیا کہے جنوں سے مگر
جو خود جنون ہی فرزانہ ہو تو کیا کہئے

میں کچھ سمجھ نہ سکا رمز لن ترانی کو
وہ بول اٹھے کہ یہ دیوانہ ہو تو کیا کہئے

وہ آئے بزم میں شمعیں تو جھلملا اٹھیں
نگاہ سوز یہ تیغانہ ہو تو کیا کہئے

وہ آئے حسن کا محشر لیے رقیب کے ساتھ
میں کیا کہوں؟ یہ صنم خانہ ہو تو کیا کہئے

نگاہ ناز کی فتنہ طرازیاں معلوم
یہ دل اسی کا جو پروانہ ہو تو کیا کہئے

بساط الٹ دی زمانہ نے قصۂ دل کی
بہار حسن کا افسانہ ہو تو کیا کہئے

مطبوعات جدیدہ

ترجمان القرآن جلد سوم و چہارم: از مولانا ابو الکلام آزاد، متوسط تقطیع کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، صفحات بالترتیب ۱۰۰۰ و ۱۵۴۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت فی جلد عـ۲۲؎ ، پتہ: ساہتیہ اکاڈمی، رابندرا بھون، نئی دہلی۔

ساہتیہ اکاڈمی نے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی تمام تصنیفات کے نئے اڈیشن خاص اہتمام سے شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، ترجمان القرآن کی اشاعت بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس کی پہلی دو جلدوں کا ذکر ان صفحات میں ہو چکا ہے، تیسری اور چوتھی جلدیں بھی اسی اہتمام اور انداز سے شائع کی گئی ہیں، اور علی الترتیب سورۂ اعراف تا یوسف اور سورۂ رعد تا نور کے وضاحتی ترجمہ اور تفسیری اشارات پر مشتمل ہیں، سابق اڈیشنوں میں سورۂ نور کا ترجمہ و تفسیر شامل نہیں تھی، بعد میں اس کا مسودہ مولانا کے کاغذات میں دستیاب ہو گیا، اس لیے اس اڈیشن کی چوتھی جلد میں سورۂ نور کا ترجمہ و تفسیر بھی شائع کی گئی، پہلی دونوں جلدوں کی طرح ان جلدوں کے آخر میں بھی حواشی اور اشارے درج ہیں، حواشی میں پہلے اڈیشنوں کے فرق و اختلاف کی تصریح، حوالوں کی تخریج اور بعض اغلاط وغیرہ کی تصحیح کی گئی ہے، لیکن مصنف و مصحح کے حواشی ایک ہی ساتھ درج کیے گئے ہیں، حالانکہ امتیاز کیلئے ان کو علٰحدہ علٰحدہ درج کرنا مناسب ہوتا، کسی جلد میں مرتب و مصحح کے نام کی تصریح

نہیں کی گئی ہے، بعض حواشی کے آخر میں "م" سے معلوم نہیں کوئی عام مصحح مراد ہے یا جناب مالک رام صاحب، جن کو غبار خاطر اور تذکرہ کے تحشیہ کی سعادت حاصل ہے، چوتھی جلد میں سورہ کہف کی تفسیر کے ضمن میں اصحاب کہف اور ذوالقرنین کی بحث مولانا کی ذہانت اور تحقیق کا شاہکار اور اردو کیا پورے تفسیری ذخیرہ میں بالکل نئی چیز ہے، اسی طرح تیسری جلد میں سورۂ توبہ اور سورہ یوسف کے بعض نکات بھی خاص طور پر قابل توجہ ہیں، مولانا کے آرا و تحقیقات سے اتفاق ضروری نہیں ہے، لیکن انکا ترجمہ و تفسیر اپنی نوعیت میں بے نظیر ہے، کاش انکے پرزور قلم سے پورے قرآن مجید کی تفسیر و ترجمہ کا کام ہو گیا ہوتا، تو تفسیر و اسلامیات کے ذخیرہ میں بڑا عظیم الشان اضافہ ہوتا، مگر اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو کون جان سکتا ہے۔

ہماری تہذیبی میراث : مرتبہ جناب سفارش حسین صاحب رضوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۸۰ قیمت عام اڈیشن سے ۶ لائبریری اڈیشن مع، پتہ: نیشنل پرنٹرز 278/ 97 جامعہ نگر دہلی ۲۵۔

اس کتاب میں ہندوستان کی گذشتہ اور موجودہ مختصر تاریخ، سیاسی و تمدنی واقعات اور سماجی و معاشرتی حالات کا تذکرہ کرکے ہندوستانی تہذیبوں کی کہانی بیان کی گئی ہے، جو آریوں سے پہلے سندھ وادی تہذیب سے شروع ہوکر موجودہ دور پر ختم ہوتی ہے، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یہاں رہنے اور باہر سے آنے والی متعدد قوموں اور نسلوں نے اپنی مختلف خصوصیات اور گوناگوں مذہبی و لسانی اختلافات کے باوجود وحدت و یکجہتی اور رواداری و سماجی برابری کو قائم رکھا، مغلوں کے دور تہذیبوں کے میل سے ایک نئے تہذیبی رنگ (ہندوستانی) کو جنم دینے کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے، ملک کی یکجہتی اور تہذیب کو پروان چڑھانے

والوں کے ساتھ ان مفاد پسند عناصر کا بھی ذکر ہے، جن کی سازشوں نے ملک کو کمزور اور اس کی تہذیبی خصوصیت کو ختم کرکے دوسروں کو اس پر حملہ آور اور قابض ہونے کا موقع دیا، آزاد ہندوستان میں بڑھتی ہوئی فسطائیت کا بھی جرأت سے ذکر کیا گیا ہے، مصنف کا یہ خیال گو صحیح ہے کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی حکومتیں اسلامی نہیں تھیں، لیکن اس حیثیت سے انکی ستائش اسلامی حکومت پر سیکولر حکومت کی برتری اور اکبر کی لا مذہبی ریاست کی مدح اور اورنگ زیب کے بعض کاموں کی مذمت کرنا قوم پروری میں غلو کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ انھوں نے خود ہندو مورخین کے بیانات سے خالص اسلامی حکومت (ابوبکرؓ و عمرؓ کے طرز کی) کی تعریف نقل کی ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "بہت سے مسلمان پیغمبر کی سنت کو دوسرا بھروسے کا سوت مانتے ہیں"۔ بہت سے مسلمان نہیں بلکہ تقریباً سارے مسلمان قرآن مجید کے بعد حدیث نبوی کو اسلامی قوانین کا ماخذ مانتے ہیں، اس کے نہ ماننے والوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ پوری امت کے مقابلہ میں ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے، ان خفیف فروگذاشتوں سے قطع نظر مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مفید اور قابل مطالعہ ہے،

انتخاب مضامین شبلی، ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گذشتہ لکھنؤ، امراؤ جان ادا، فسانہ مبتلا، انتخاب ولی } مرتبہ ۱ و ۲ جناب رشید حسن خانصاحب ۳ ڈاکٹر محمد حسن و ۴ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی و ۵ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات بالترتیب ۲۰۸، ۴۰۰، ۴۴۰، ۲۷۲ و ۲۴۴ و ۱۲۸، قیمت بالترتیب مجلد لائبریری اڈیشن ۳ للعہ پیپر، و ۵۰ پ و لائبریری اڈیشن عــہ

لے؍ لائبریری اڈیشن مجلد ۵؍ لائبریری اڈیشن ۲؍ پیپر بیک لائبریری اڈیشن ۳؍

پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

حکومت جموں و کشمیر کی مالی مدد سے مکتبہ جامعہ قدیم معیاری اور کمیاب کتابوں کے نئے اڈیشن شائع کر رہا ہے، اس سلسلہ کی کچھ کتابوں کا معارف میں پہلے تعارف کرایا جا چکا ہے، زیر نظر کتابیں ان کے بعد موصول ہوئی ہیں، ان میں پہلی کتاب مولانا شبلی مرحوم کے پچیس ۲۵ ادبی، تنقیدی، تحقیقی، علمی، تعلیمی اور مذہبی مضامین پر مشتمل اور مقالات شبلی کی ان آٹھ جلدوں کا انتخاب ہے جو دار المصنفین نے شائع کی ہیں، فاضل مرتب نے ان مضامین کو آٹھ جلدوں کا عطر مجموعہ کہا ہے، لیکن درحقیقت مولانا کے اور مضامین اہم اور قابل انتخاب تھے، تاہم اس مجموعہ میں کتب خانۂ اسکندریہ، الجزیہ، حقوق الذمیین اور مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم وغیرہ جیسے شاہکار مضامین شامل ہیں، صفحات ۵۸ و ۵۹ کی ترتیب الٹ گئی ہے۔

دوسری کتاب مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی کی بہترین اور ممتاز کتابوں میں ہے، اس کو پہلے انھوں نے اپنے رسالہ دلگداز میں بالاقساط تحریر کیا تھا، بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا، یہ کتاب شاہان اودھ کی تاریخ، اس عہد کے لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت، اس کی لطافت و نفاست، زندگی کے تکلفات کا مرقع، مختلف طبقوں کے حالات و خصوصیات اور مختلف النوع معلومات کا خزانہ ہے، جس سے اس عہد کی پوری تصویر نظر آجاتی ہے، مولانا شرر کا بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس تصویر کو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا، مگر اس حیثیت سے مرقع عبرت ہو کر اب یہ باتیں افسانہ معلوم ہوتی ہیں،

تیسری کتاب امراؤ جان ادا اردو کے بہترین ناولوں اور ادبیات کی کلاسیکل کتابوں میں ہے، زبان وبیان کی لطافت ودلکشی اور کردار وپلاٹ کی خوبی ودلآویزی میں بھی بے نظیر ہے،

چوتھی کتاب فسانۂ مبتلا المعروف بہ محصنات اردو کے مشہور صاحب طرز ادیب اور پہلے ناول نگار مولانا نذیر احمد دہلوی کی ہے، جو ان کے ناولوں کی خصوصیات اور مخصوص طرز نگارش کی رعنائی ودلکشی کی حامل ہے، آخری کتاب اردو شاعری کے باوا آدم ولی گجراتی کی غزلیات اور بعض دوسرے اصناف کلام کا انتخاب ہے لائق مرتبین کے قلم سے ہر کتاب کے شروع میں ایک جامع اور پرمغز تعارف بھی شامل ہے، اس میں کتاب کے خصوصیات اور مصنف کے کمالات کا بڑے سنجیدہ اور معتدل انداز میں ذکر ہے، خصوصاً پہلی دونوں کتابوں کا تعارف جو رشید حسن خاں صاحب کے متوازن اور مدلل ودل قلم سے ہے ان کی دیدہ وری، ادبی شائستگی تحریر اور رائے کے اعتدال وتوازن کا نمونہ ہے۔ آخری تین کتابوں کے آخر میں فرہنگ بھی ہے، اگر لائق مرتبین نے حواشی بھی تحریر کر دیے ہوتے تو کتابوں کی قدر وقیمت دوچند ہو جاتی، اردو زبان وادب کے طلبہ کے لیے ان کلاسیکی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے، مکتبہ جامعہ ان کی اشاعت پر مبارکباد کا مستحق ہے۔

فضائل درود ابراہیمی - مرتبہ مولانا محمد ارشد اعظمی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۳۲ قیمت ۵۰ پیسے، پتہ مکتبہ اسلامی ادب، فاطمان، وارانسی

اس کتابچہ میں درود شریف کی اہمیت وفضیلت کا ذکر اور درود ابراہیمی کے متعلق بعض شکوک کا جواب دیا گیا ہے، آخر میں مختلف ماثورہ درود کے الفاظ وتمات درج کیے گئے ہیں، درود شریف شفاعت کا وسیلہ ہے، اس لیے اس رسالہ کا مطالعہ ہم خرما وہم ثواب ہوگا۔ "ض"

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے۔ قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب و امریکہ، اسلامی رصدخانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت: لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں۔ (زیر طبع)

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی کے [illegible] ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ، قیمت: غلہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے مشہور ارباب صحاح تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل، مرتبہ ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین۔ قیمت: [illegible]

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت: غلہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

بہت نفیس کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے اور جنھوں نے اس کی [illegible] کی بہت ہی مستند و مفصل [illegible] و تمدنی تاریخ، مترجمہ [illegible] عباسی [illegible] قیمت [illegible]

منیجر دارالمصنفین اعظم گڑھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)   مارچ ۱۹۷۲ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مجلس ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب ملت نسل و رنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

......((مرتبہ))......

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے　　قیمت: ۔ؕ

جلد ۱۰۹ ۔ ماہ محرم الحرام ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۲ء۔ عدد ۳

مضامین

شذرات

اسلامی کانفرنس نے بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان صلح کرانے کے لیے جو قدم بڑھایا ہے وہ بہت ضروری تھا، یہ کام اسی کے کرنے کا تھا، بنگلہ دیش آزاد ہو چکا، اب دونوں میں سیاسی وحدت کا تو کوئی سوال نہیں، مگر اس کے علاوہ بھی اُن میں صلح و صفائی کی بڑی ضرورت ہے، دونوں کے درمیان بہت سے مختلف فیہ مسائل ہیں جن کے حل کے بغیر دونوں میں کسی قسم کے تعلقات نہیں ہو سکتے، بنگلہ دیش کو پاکستان سے جو شکایتیں بھی ہوں، مگر اب اس نے بھی صلح کا ہاتھ بڑھایا ہے اس لیے بنگلہ دیش والوں کو جذبات سے کام لینے کے بجائے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے، مذہبی رشتہ سے قطع نظر جس کی اب کوئی قیمت نہیں رہ گئی ہے، دونوں ایشیائی اور پڑوسی ملک ہیں، اُن کے بہت سے مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اس لیے وہ ہمیشہ کے لیے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔

بنگلہ دیش کی حکومت خواہ کتنی ہی سیکولر ہو اور وہاں کے برسر اقتدار لوگوں کے جو خیالات بھی ہوں لیکن بنگالی قوم بہرحال مسلمان اور بنگلہ دیش مسلمان ملک ہے، اور اس کو دنیائے اسلام سے تعلقات رکھنا ہیں، اس سلسلہ میں یہ بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ مختلف تاریخی جغرافی اور تمدنی عوامل کی بنا پر مغربی پاکستان کا خطہ بنگلہ دیش کے مقابلہ میں ہمیشہ سے اسلامی ملکوں سے زیادہ قریب رہا ہے اور اسکی آواز ان میں زیادہ موثر رہی ہے، اب بنگلہ دیش کو ان میں نہ صرف اپنی جگہ بنانا ہے بلکہ مغربی پاکستان کا توڑ بھی کرنا ہے اسلئے اسکو اسلامی کانفرنس کی تجویز کا خیر مقدم کرنا چاہیے، یہ چیز سیکولرزم کے خلاف نہیں

وہ چار کے سوا قریب قریب سارے اسلامی ملک سیکولر اور جمہوری ہیں، مگر وہ سب اسلامی اتحاد کے حامی اور اسکی تنظیموں میں شریک ہیں، ٹرکی بھی جو سیکولرزم کا امام ہے، ان کا رکن ہے اس لیے بنگلہ دیش کا قدم بھی کسی سے پیچھے نہ رہنا چاہیے، ورنہ وہ اسلامی دنیا سے کٹ کر رہ جائے گا،

مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ کچھ دنوں سے سرد پڑ گیا تھا، حکومت کے ذمہ داروں نے بارہا اسکا یقین دلایا کہ مسلمانوں کی مرضی کے بغیر اس میں تبدیلی نہ کیجائیگی، مگر اب کچھ نام نہاد مسلمانوں نے اسکا مطالبہ شروع کر دیا ہے، اس مسئلہ کو سمجھنے میں بنیادی غلطی یہ کیجاتی ہو کہ اس کو مذہبی نہیں بلکہ سماجی مسئلہ سمجھا جاتا ہے، حالانکہ مسلمانوں کا پرسنل لا کلام مجید اور احادیث نبوی پر مبنی ہے، جو مسلمان اس کا مطالبہ کرتے ہیں ان میں سے کچھ تو حسن نیت سے مگر مذہب سے ناواقفیت کی بنا پر کرتے ہیں، اور کچھ وہ لوگ ہیں جنکو مذہب سے کوئی علاقہ نہیں، وہ کلام مجید کے صریح احکام کو بھی قابل ترمیم سمجھتے ہیں، اور علانیہ اسکا اظہار کرتے ہیں، ایسے لوگ مسلمان کہلانے کے کب مستحق ہیں، اور ان کو مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کا کیا حق ہے، محض مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے اور مسلمانوں جیسا نام رکھ لینے سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک کلام مجید کے احکام پر پورا ایمان نہ ہو۔

پرسنل لا کے منصوص اور صریح احکام میں تو کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن مصلحت اور ضرورت کے لحاظ سے بعض پہلوؤں میں ترمیم و اصلاح کی گنجایش ہے، مگر مصلحت و ضرورت کا معیار محض زمانہ کا رجحان اور دوسروں کی تقلید نہیں، بلکہ واقعی ضرورت ہے، جس کے بغیر مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہو، اس صورت میں بھی اس کا اختیار ماہرین شریعت کو ہے، ہر کس وناکس کو نہیں کہ وہ شریعت کے دائرے کے اندر اس کے اصولوں کی روشنی میں اس کا حل نکالیں، اگر زمانہ

کے رجحان و مذاق کو معیار مان لیا جائے تو وہ ہر زمانہ میں بدلتا رہتا ہے، اس لیے ہر دور کے مذاق کے مطابق شریعت کے قوانین میں تبدیلی کرنا پڑے گی، اور وہ بازیچۂ اطفال بن جائے گی،

یہ مسرت کا مقام ہے کہ دار العلوم دیو بند نے اس مسئلہ کی طرف توجہ کی ہے، اور مولانا محمد طیب صاحب نے اس پر غور کرنے کیلئے علماء کا ایک اجتماع طلب کیا ہے، اس قسم کے مسائل پر غور اور انکے متعلق فیصلہ کا سب سے زیادہ حق دار العلوم دیو بند ہی کو ہے، امید ہے کہ مولانا محمد طیب صاحب کی رہنمائی میں یہ ضروری کام صحیح طریقہ سے انجام پائیگا، ہر مسئلہ کے بعض فقہی مسائل ہیں اگر کسی خاص کتب فقہ کی پابندی نہ کیجائے تو بہت سی مشکلات کا حل نکل سکتا ہے، اور ہر دور کے فقہاء نے ضرورت کے وقت اس سے فائدہ اٹھایا ہے، اس لیے اس زمانہ میں بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ناظرین کو یہ معلوم کرکے افسوس ہوگا کہ دفتر دار المصنفین کے منصرم یحییٰ صاحب اعظمی نے چند دنوں کی علالت کے بعد ۲۲ فروری کو انتقال کیا، وہ عمر بھر دار المصنفین سے وابستہ رہے اور مرکر اس سے جدا ہوئے، مرحوم بڑے متدین اور دفتری کاموں میں تجربہ کار تھے، ہزاروں روپئے کا کاروبار اُن کے ہاتھ میں تھا اور کبھی ایک حبہ کا فرق نہیں نکلتا تھا، ایسے قابل اعتماد آدمی مشکل سے ملیں گے، طبیعت میں حد سے زیادہ نظافت و نفاست تھی، بڑی صاف ستھری زندگی بسر کرتے تھے، ان کا دفتری کام بھی بڑا صاف ستھرا تھا، خشک دفتری کاموں کے ساتھ خوشگو شاعر بھی تھے، اُن کے کلام کے دو مجموعے "نوائے حیات" اور "نوائے عصر" شائع ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مقالات

تہذیب کی تشکیل جدید

جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(سلسلہ کیلئے ملاحظہ ہو معارف مئی ۱۹۶۹ء)

اس مفید مضمون کے کئی نمبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکے ہیں، مولانا کی مشغولیت کی وجہ سے درمیان میں عرصہ تک اس کا سلسلہ رک گیا تھا، اب انھوں نے پھر اس کو شروع کیا ہے، مضمون کی افادیت کے پیش نظر اس کو شائع کیا جاتا ہے۔　"م"

دوسری قسم (جن صفات کا زیادہ تعلق دوسرے انسانوں کی فلاح و بہبود سے ہے) کی تفصیل یہ ہے:-

عدل و عدالت اللہ کی صفت "عدل و عدالت" کائنات کے ہر گوشہ میں نمایاں اور اسی پر کائنات کا پورا نظام قائم ہے، صفات امتیازی میں یہ صفت زندگی کی روح رواں اور قیام و بقا کی بنیاد ہے، اس کے بغیر نہ شخصی کردار میں توازن پیدا ہوتا اور نہ جماعتی کردار قیام و بقا کی ضمانت پیش کرتا ہے،

لغت میں عدل کے معنی کسی چیز کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا،

العدل هو التقسيط على سواء[1]　　عدل کے معنی برابر تقسیم کرنا

---

[1] راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن

قرآن حکیم میں اس کے لیے لفظ میزان آیا ہے

قرآن حکیم میں اس کی حقیقت کو لفظ میزان (ترازو) سے سمجھایا گیا ہے کہ اگر کسی ایک طرف پلہ جھک جائے تو پورا نظام درہم برہم ہو جائے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَان (رحمٰن ۔ رکوع ۱)
اللہ نے آسمان کو بلند کیا اور (قانون عدالت کا) میزان رکھا۔

دوسری جگہ ہے

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید ۔ رکوع ۳)
ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ وہ لوگوں میں انصاف قائم کریں۔

امام غزالی، افلاطون اور دیگر فلسفیوں کے نزدیک عدل کی تعریف

امام غزالیؒ نے عدل کی یہ تعریف کی ہے:۔

هو ضبط الشهوة والغضب تحت اشارة العقل والشرع (احیاء العلوم ج ۳ ص ۰۴۰)
قوت شہوت و غضب کو اس حد تک ضبط کرنا کہ وہ عقل و شرع کے مطابق کام کرنے لگیں۔

شاہ ولی اللہؒ نے یہ تعریف کی ہے:۔

هی ملكة فی النفس تصدر عنها الافعال التی يقام بها نظام المدينة والحی بسهولة (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ)
عدالت ایک ملکہ ہے جس سے وہ افعال صادر ہوتے ہیں جن سے بآسانی شہر اور گاؤں کا انتظام ہوتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک عدالت کا جوہر "روحانی و داخلی" ہے، یعنی اندرونی زندگی اتنی منظم ہو کہ ہر شخص اپنا کام کرے اور دوسرے کے کام میں دخل نہ دے۔ اسی طرح "جان ڈیوی جیمس"

اور روجرس وغیرہ کے نزدیک عدالت اخلاق کا حاصل اور فضائل اصلیہ کی سرتاج ہے، اگر یہ نہ ہو تو دوسرے فضائل اپنی غرض و غایت کھو بیٹھیں گے۔[۱]

مغربی تہذیب میں عدل کی بنیاد | مغربی تہذیب میں عدل و عدالت کی بنیاد قوم پرستی و وطن پرستی ہے، جس کو قومی ترقی و سربلندی کے لیے قومی پیمانہ پر اپنایا جاتا ہے۔

تشکیل جدید میں عدل کی بنیاد | تشکیل جدید میں اس کی بنیاد خدا پرستی و روحانی پاکیزگی پر ہے جو عالمگیر افادیت و عمومی رحمت کے اس نظریے کے تحت وجود میں آتا ہے۔

الخلق کلھم عیال اللّٰہ[۲] تمام مخلوق اللہ کی عیال ہیں۔

دوسری جگہ ہے:

الناس کلھم اخوۃ (الحدیث) تمام لوگ بھائی بھائی ہیں۔

عدل کا معیار | اس لحاظ سے عدل و عدالت کا معیار نہایت بلند ہے، جس کی نظر میں قریب و بعید، دوست و دشمن، اپنے اور غیر میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ	اے ایمان والو! عدل کے ساتھ انصاف
بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰی	پر قائم رہنے والے اور خدا لگتی گواہی دینے والے
اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ	ہو جاؤ اگرچہ یہ گواہی اپنے نفس یا ماں باپ
اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ	اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو،
اَوْلٰی بِھِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی	اگر ان میں کوئی مالدار یا محتاج ہے (تو تمہیں
اَنْ تَعْدِلُوْا (نساء، رکوع ۲۰)	اس کی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے)
	اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے تم انصاف چھوڑ کر خواہش کی پیروی میں نہ آؤ اور اگر تم زبان ...

---

[۱] روجرس۔ تاریخ اخلاقیات ص ۳۳ و جان ڈیوی و جیمس ٹفٹس: اخلاقیات حصہ ۲ باب ۱۹ ص ۳۴۲[۲] مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق الفصل الثالث

دوسری جگہ ارشاد ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا	اے ایمان والو مضبوطی کے ساتھ انصاف
قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ	پر قائم رہنے والے اور خدا لگتی گواہی دینے
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ	والے بنو اور کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات
أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ	پر نہ آمادہ کردے کہ اس کے ساتھ بے انصافی
أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ	کرو ہر حال میں انصاف کرو یہی تقویٰ سے
(مائدہ ۔ رکوع ۲)	لگتی بات ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔

قبیلہ مخزومیہ کی ایک مالدار عورت نے چوری کی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کی سفارش پہنچائی گئی تو آپ نے فرمایا:

إنما اهلك الذين قبلكم انهم	تم سے پہلے لوگ اس بنا پر ہلاک کیے گئے کہ
كانوا اذا سرق فيهم الشريف	اگر ان میں کوئی اونچے درجہ کا شخص چوری
تركوه واذا سرق فيهم الضعيف	کرتا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا اور اگر کمزور
اقاموا عليه الحدود، وايم الله	شخص چوری کرتا تو اس پر حد جاری کی جاتی۔
لو ان فاطمة بنت محمد سرقت	خدا کی قسم اگر فاطمہ میری بیٹی بھی چوری کرتی
لقطعت يدها [1]	تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

عدل و عدالت کی دو قسمیں ہیں:-

(۱) شخصی اور (۲) جماعتی

شخصی عدل | شخصی عدل یہ ہے کہ حقوق و فرائض کی ادائیگی میں ہم آہنگی برقرار رہے، قرآن حکیم کے مختلف مقامات میں اس کا ذکر ہے۔

---

[1] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ باب الشفاعۃ فی الحدود

یتیموں کے بارے میں ہے :۔

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (النساء ۱۹) — اور یتیموں کے حق میں انصاف ملحوظ رکھو۔

عورتوں کے بارے میں ہے :۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (نساء ۔ ۱۵) — اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی عورت سے شادی کرو۔

شہادت و فیصلہ اور باہمی تصفیہ کے بارے میں ہے :۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (الانعام ۔ ۱۹) — جب بات کہو تو انصاف کے ساتھ کہو اگرچہ (فریق) رشتہ دار ہی ہو۔

دوسری جگہ ہے :۔

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا (حجرات ۔ ۱) — دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرو اور انصاف کرو

خرید و فروخت اور دیگر معاملات کے بارے میں ہے :

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (الانعام ۔ ۹) — انصاف کے ساتھ ناپ اور تول کرو

دوسری جگہ ہے :۔

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ (بقرہ ۔ ۳۹) — چاہئے کہ معاملات میں باہمی قرارداد کو کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے۔

ایک اور جگہ ہے :۔

فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ (بقرہ ۔ ۳۹) — اس کا ولی (مختار کار) انصاف کے ساتھ لکھائے

جامعی عدل جامعی عدل یہ ہے کہ اس کے نظم و قوانین میں ہر شے اور ہر شخص کی رعایت کی گئی ہو یعنی ہر شے اپنے محل اور اپنی حدود کے اندر رہے، اور ہر شخص کو اس کی استعداد کے مطابق یکساں مواقع حاصل ہوں۔

یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ فکری وعملی قوتوں میں توازن برقرار رہے، اور عدل قائم کرنے میں ہر شخص اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اپنی ڈیوٹی انجام دے۔

قرآن حکیم میں ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا	اللہ تمھیں یہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں انکے
الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا	اہل کو پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان
حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ	فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ
تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (نساء - ۸)	فیصلہ کرو۔

اس آیت میں اصل خطاب حاکموں سے ہے اور امانت میں ہر قسم کی ذمہ داریاں، عہدے اور مناصب وغیرہ شامل ہیں۔

ان هذا الخطاب لولاة الامر	یہ خطاب حاکموں سے ہے کہ وہ رعایا
ان يقوموا برعاية الرعاية	کی حفاظت کریں، ان کو دین و شریعت
وحملهم على موجب الدين	کے مطالبات کا پابند بنائیں، امانت کی
والشريعة وعد وامن ذلك	ادائیگی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ عہدے
تولية المناصب مستحقيها [1]	اور مناصب انکے مستحقین کو دیے جائیں۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں:-

---

[1] شفیع دیوبندی: مقالہ دستور قرآنی۔

وھو کان سبب نزول الاٰیۃ [1] — حاکم ہی اس آیت کے نزول کا سبب تھی۔

قرآن میں ہے

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ اَللّٰہُ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ (شوریٰ - ۲)

آپ کہہ دیجئے کہ میں اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اتاری اور مجھے حکم دیا گیا ہو کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں،

ایک اور جگہ ہے

وَاِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (المائدہ - ۶)

اگر آپ فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجئے، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

عدل و عدالت کی ضد ظلم ہے عدل و عدالت کی ضد ظلم ہے، خواہ شخصی زندگی میں پایا جائے یا جماعتی زندگی میں، اس کا خاصہ ہلاکت و بربادی ہے۔

لغت میں ظلم کے معنی ہیں:

وضع الشئ فی غیر موضعہ المختص بہ [2] — کسی شے کو اس کی غیر جگہ میں رکھنا۔

قرآن حکیم میں ظلم کے مفہوم کی وسعت قرآن حکیم میں اس کا استعمال کئی معنوں میں آیا ہے (کفر، شرک، معصیت، حق تلفی اور ایک دوسرے پر زیادتی وغیرہ) اور ان سب میں لغوی معنی کا لحاظ ہے، کفر کے بارے میں ہے:

فمن اظلم ممن کذب علی اللّٰہ — اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے

---

[1] ابن تیمیہ، الجوامع فی السیاست الالٰہیۃ ص۲۵

وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ (زمر۔ رکوع ۴)

اللہ پر جھوٹ بولا اور سچی بات کو جھٹلایا جب اس کے پاس آئی، کیا کافروں کا ٹھکانا دوزخ نہیں ہے۔

دوسری جگہ ہے

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (الاعراف۔ ۴)

اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے،

شرک کے بارے میں ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے

معصیت کے بارے میں ہے:۔

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ (فاطر۔ ۴)

پھر ان میں کوئی (گناہ کرکے) اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔

اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (بقرہ۔ ۲۹)

جبکہ انھوں نے (گناہ کرکے) اپنے اوپر ظلم کیا،

مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ

جو ایسا کرے گا بیشک وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا۔

حق تلفی و زیادتی کے بارے میں ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ (الاعراف۔ ۴)

آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے حرام کیا بےحیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ہوئی اور گناہ و ناحق زیادتی کو حرام کیا

دوسری جگہ ہے:

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ	الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ناحق ظلم
النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ	کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی
بِغَيْرِ الْحَقِّ (شوریٰ - ۴)	پھیلاتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سی آیتوں میں ظلم کی برائی اور ظالم و مظلوم کے احکام بیان ہوئے ہیں۔

احادیث میں ظلم کی برائی | ذیل میں چند حدیثیں ذکر کیجاتی ہیں، جن سے تشکیل جدید میں ظلم کی برائی ظاہر ہوتی ہے، رسول اللہؐ نے فرمایا کہ

الظلم ظلمات یوم القیمۃ[1]	ظلم قیامت کے دن ظلمات بنجائے گا

ایک مرتبہ مقام حجر (ثمود یعنی قوم صالح کی تباہ شدہ بستی) سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گذرے تو فرمایا

لا تدخلوا مساکن الذین	جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے جب انکے
ظلموا انفسهم الا ان تکونوا	گھروں میں داخل ہو تو روتے ہوئے داخل
باکین ان یصیبکم ما اصابهم؟	ہو کر مبادا وہی عذاب تمھیں پہنچے جو انکو
ثم قنع راسه و اسرع	پہنچ چکا ہے، پھر رسول اللہؐ نے اپنا سر
السیر حتی اجتاز الوادی[2]	جھکایا اور تیزی کے ساتھ وادی سے گذر گئے،

ایک موقع پر فرمایا

"تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی تو مدد کیجا سکتی ہے مگر ظالم کی مدد کس طرح کیجائے، تو آپ نے فرمایا کہ

---

[1] بخاری و مسلم و مشکوۃ باب الظلم [2] ایضاً

اس کو ظلم سے روکا جائے۔" (مسلم باب نصر الاخ ظالماً او مظلوماً)

ایک موقع پر آپ نے حاضرین سے سوال کیا کہ مفلس کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس روپیہ پیسہ اور مال و دولت کچھ نہ ہو، اس کے جواب میں رسول اللہ صلعم نے ظلم کی مختلف شکلوں کو ذکر کر کے فرمایا

ان المفلس من امتی من یاتی یوم	میری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت
القیمۃ بصلوٰۃ وصیام وزکوٰۃ	کے دن ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کے
ویاتی قد شتم ھذا وقذف	پاس نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ سب نیکیاں
ھذا واکل مال ھذا وسفک	ہوں گی لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوگی،
دم ھذا وضرب ھذا فیعطی	کسی کو تہمت لگائی ہوگی کسی کا مال کھایا
ھذا من حسناتہ وھذا من حسناتہ	ہوگا کسی کی خونریزی کی ہوگی کسی کو مارا
فان فنیت حسناتہ قبل ان یقضی	ہوگا، ان سب کو اسکی نیکیاں دیدی
ما علیہ اخذ من خطایاھم	جائیں گی، اگر ان کے حقوق کی ادائیگی سے
فطرحت علیہ ثم طرح فی النار	پہلے نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو ان لوگوں
(مسلم و مشکوٰۃ باب الظلم)	کی برائیاں اس پر ڈالدی جائیں گی، پھر
	اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائیگا۔

رحم | اللہ کی صفتوں میں سب سے بڑی صفت "رحم" ہے، قرآن حکیم میں ہے:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (اعراف-۱۹) میری رحمت ہر چیز کو وسیع ہے

رَبَّنَا وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَحْمَۃً وَعِلْمًا (مومن-۱) اے ہمارے پروردگار آپ کا علم اور آپ کی رحمت ہر چیز کو وسیع ہے۔

اَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ (مومنون-۷) — آپ رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتوں میں بھی "رحم" کو سب سے بڑی صفت قرار دیا گیا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء-۷) — نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام جہان کے لوگوں پر رحمت بنا کر۔

دوسری جگہ ہے:-

بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (توبہ - ۱۶) — آپ ایمان والوں پر نہایت شفقت اور رحم کرنے والے ہیں

صحابۂ کرام کی صفت میں مذکور ہے:-

رُحَمَاءُ بَیْنَهُمْ (فتح - ۴) — وہ آپس میں رحم دل ہیں

انسانیت کے لیے رحم کے بغیر چارہ نہیں ہے

انسانیت کے نشو ونما کے لیے "رحم" کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لا تنزع الرحمة الا من شقی[1] — رحمت (رحم) بدبخت ہی سے زائل ہوتی ہے۔

تشکیل جدید میں رحم کی اہمیت و تاکید سے متعلق چند روایتیں یہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

الرحم شجنة من الرحمٰن[2] — رحم رحمٰن سے لپٹی ہوئی شاخ ہے۔

من لا یرحم لا یرحم[3] — جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء[4] — تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والے تم پر رحم کریں گے۔

---

[1] ترمذی، مشکوٰۃ باب الشفقة والرحمة علی الخلق الفصل الثانی [2] بخاری کتاب الادب باب من وصل وصله الله

[3] ایضاً باب رحمة الناس والبهائم [4] بخاری ابواب البر والصلة

لیس منا من لم یرحم صغیرنا — وہ شخص ہم میں سے نہیں ہو جس نے ہمارے چھوٹوں
ولم یوقر کبیرنا[۱] — پر رحم نہ کیا اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کی۔

رحم کی تعلیم انسان تک محدود نہیں بلکہ اس میں بے زبان جانور بھی شامل ہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا

فی کل ذات کبد رطبۃ اجر[۲] — ہر جانور کے ساتھ رحم کرنے میں اجر ہے

ایک اور جگہ فرمایا

"اگر کوئی شخص ذبح کیے ہوئے جانور پر رحم کریگا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس پر رحم کریگا"[۳]

بے رحمی پر نکیر | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے رحمی، سنگ دلی، اور قساوت قلبی پر مختلف انداز سے نکیر فرمائی ہے، مثلاً ایک بدو نے آپ سے کہا کہ آپ لوگ بچوں کو پیار کرتے اور ان کا بوسہ لیتے ہیں، ہم لوگ بوسہ نہیں لیتے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ نے تمھارے دل سے رحم نکال لیا تو میں کیا کر سکتا ہوں[۴]

اسی طرح جانوروں کے لڑانے کے جو بے رحمانہ طریقے پہلے رائج تھے اور اب بھی رائج ہیں، اس سے آپ نے منع فرمایا۔[۵]

رحم اور عدل کی صفتیں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ نیک و بد، ظالم و مظلوم، باغی و وفادار، متقی و فاجر کے درمیان عدل کیا جائے، بلکہ ان کے ساتھ یکساں سلوک رحم کے منافی ہے۔

---

۱ ترمذی و مشکوٰۃ، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق الفصل الثانی ۲ بخاری و مسلم ۳ بخاری الادب المفرد باب رحمۃ البہائم ۴ بخاری کتاب الادب باب رحمۃ المولود ۵ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم

احسان | احسان۔ دوسرے کے ساتھ ایسا سلوک کرنا کہ جس سے اس کا دل خوش ہو اور اسکو راحت ملے،

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی صفت "محسن" بار بار ذکر کی گئی ہے، نیز اس کے احسانات کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا اور بندوں کو اس کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ اس آیت میں حکم ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ　　اللہ انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے

(نحل۔ رکوع ۱۳)

عدل کے ذریعہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق ملتا اور "احسان" کے ذریعہ لوگوں کی تکلیف و آرام اور رنج و راحت کا خیال رکھا جاتا ہے، یعنی بات صرف عدل پر نہیں ختم ہوتی، بلکہ راحت و آرام پہنچانے کے لیے احسان و سلوک کا بھی حکم ہے

احسان کی مختلف شکلیں | قرآن حکیم نے احسان کی مختلف شکلیں بیان کی ہیں، مثلاً مالی امداد کرنا

اَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ　　احسان کر (قارون کو حکم ہے) جیسا کہ اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا۔

(قصص ـ ۸)

مصیبت سے نجات دلانا

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ (یوسف ـ ۱۱)　　اللہ نے مجھ پر احسان کیا (یوسفؑ کا قول) کہ اس نے مجھکو قید خانہ سے نکالا۔

قصور معاف کر دینا وغیرہ

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (آل عمران۔۱۴)　　اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں "احسان" کے لیے اور الفاظ بھی مستعمل ہیں، مثلاً "فضل"، "نعمت"، "معروف" اور "بر" وغیرہ، ان سب کے مجموعی مواقع استعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ احسان کسی خاص شکل میں

محدود نہیں، بلکہ اس کا دائرہ نیکی کی تمام راہوں کو وسیع ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"اللہ نے ہر شے کے ساتھ احسان کرنا فرض کیا ہے، حتیٰ کہ اگر کسی کو جان سے مارنے کی نوبت آئے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو، کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو خوبی کے ساتھ ذبح کرو، چھری کو تیز کر لو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔" (مسلم کتاب الصید والذبائح)

صرف احسان کے بدلہ میں احسان کا حکم نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی بدسلوکی سے پیش آئے تو اس کے ساتھ بھی احسان کی تاکید ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (رحمٰن-۳) احسان کا بدلہ احسان ہی ہے

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں کسی شخص کے پاس سے گذرتا ہوں تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا، اگر وہ میرے پاس سے گذرے تو کیا میں بھی اس کی مہمانی نہ کروں؟ آپ نے فرمایا نہیں، تم اس کی مہمانی کرو۔ (ترمذی باب ماجاء فی الاحسان والعفو)

عفو و درگذر عفو و درگذر بھی اللہ تعالیٰ کی نہایت اہم اور بڑی صفت ہے، اگر یہ نہ ہو تو گناہوں سے بھری دنیا تباہ و برباد ہو جائے، اللہ کے نام غافر، غفور اور غفار بار بار آتے ہیں، اور عفو و معافی کا بھی ذکر متعدد جگہوں پر آیا ہے، مومن بندوں کی صفت میں ہے:

وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ (شوریٰ-۱۴)	جب وہ غصہ ہوتے ہیں تو معاف کرتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے:-

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ	اور چاہیے کہ وہ لوگوں کو معاف کر دیں اور
أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ	درگذر سے کام لیں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ
غَفُورٌ رَحِيمٌ (نور-۳)	تمہیں معاف کرے، اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے

کلام مجید میں ان موقعوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے، جہاں عفو و درگذر کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، مثلاً

عفو و درگذر کے اہم مواقع مذہب کے معاملہ میں لوگوں کے احساسات نہایت نازک ہوتے ہیں، اس میں اختلاف و اشتعال انگیزی کی صورت میں عفو و درگذر کا حکم ہے

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ	معاف کرو اور درگذر کرو یہاں تک کہ
اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (بقرہ۔ رکوع ۱۳)	اللہ اپنا حکم صادر فرمائے۔

جب انسان کی عزت و آبرو پر حملہ ہوتا ہے تو وہ بے قابو ہو جاتا ہے، اس حالت میں بھی عفو و درگذر کا حکم ہے

ولا یأتل اولوا الفضل مِنْكُمْ	تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب حیثیت
والسعة ان یؤتوا اولی القربٰی وَالْمَسٰكِيْنَ	ہیں وہ قرابت داروں، محتاجوں اور اللہ
وَالمهاجرین فی سَبِیْلِ اللّٰهِ	کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (امداد)
ولیعفوا ولیصفحوا	نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں بلکہ چاہیے کہ
(نور۔ ۳)	ان کے قصور بخشدیں اور درگذر کریں۔

حضرت مسطحؓ حضرت ابوبکرؓ کے رشتہ دار تھے، وہ ان کی کفالت کرتے تھے لیکن جب انھوں نے واقعۂ افک میں حصہ لیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی مالی امداد بند کر دی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ میں اپنے خادم کا قصور کتنی مرتبہ معاف کروں؟ آپ کچھ دیر خاموش رہے، اس نے پھر سوال کیا، آپ نے فرمایا ہر روز ستر دفعہ معاف کیا کرو۔ (ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی ادب الخادم)

اس حدیث میں تعداد مقصود نہیں، بلکہ عرب کے محاورہ کے مطابق کثرت بیان کرنا مقصود ہے

عفو و درگزر کی تعلیم میں خودداری کی شان برقرار رہتی ہے

موجودہ انجیل میں عفو و درگذر کی تعلیم جس انداز سے دی گئی ہے، اس سے طبیعت میں ذلت اور پستی پیدا ہوتی ہے، لیکن تشکیل جدید میں جس انداز میں اس کی تعلیم ہے، اس سے نہ خودداری کو ٹھیس پہنچتی اور نہ نظم و انتظام میں خلل واقع ہوتا ہے، چنانچہ ظلم و زیادتی کی صورت میں بدلہ لینے کی بھی اجازت ہے لیکن عفو و درگذر اللہ کی نگاہ میں زیادہ پسندیدہ ہے،

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا	اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، لیکن
فمن عفا واصلح فاجره على الله	جو شخص معاف کردے اور صلح کرلے تو اسکا
انه لا يحب الظلمين	ثواب اللہ کے ذمہ ہے، بیشک وہ ظلم
(شوریٰ ـ ۴)	کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

بدلہ کا حق حاصل ہونے کے بعد عفو و درگذر سے کام لینا بڑی ہمت کا کام اور بلند اخلاق کی اعلیٰ مثال ہے۔

ایثار و قربانی

یعنی اپنی ذاتی ضرورت پر دوسروں کی ضرورتوں کو ترجیح دینا، صمدیت (بے نیازی) اللہ کی صفت ہے، یہ اس کا عکس ہے، اس وصف سے انسانیت کے جوہر نمودار ہوتے اور انسان اعلیٰ مدارج طے کرتا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا	تم کمال نیکی نہیں حاصل نہیں کرسکتے یہاں تک کہ
مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران ـ ۱۰)	اپنی پسندیدہ چیزیں خرچ کرو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ وصف بہت نمایاں تھا، جس کی بکثرت مثالیں محفوظ ہیں۔

انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف | صحابۂ کرام میں انصار کا سب سے بڑا وصف یہی تھا جس کی بدولت اسلام کو بڑی تقویت حاصل ہوئی اور مدینہ پہنچنے کے بعد اس کا دائرہ روز بروز وسیع ہونے لگا، انصار کے اس وصف کا تذکرہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں ہے :-

وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ	اور ان کے واسطے جنھوں نے ان (مہاجرین
مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ	کی آمد) سے پہلے اس دار (مدینہ) اور ایمان
اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ	میں جگہ پکڑ لی یہ لوگ ان سے محبت کرتے ہیں
حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى	جو وطن چھوڑ کر ان کے پاس آئے اور اپنے
اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ	دل میں تنگی نہیں محسوس کرتے اس سے جو
وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ	ان کو دیا جائے اور اپنے اوپر ان کو
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ	مقدم رکھتے ہیں اگرچہ فاقہ کی نوبت آجائے،
	اور جو اپنی طبیعت کے لالچ سے بچا لیے گئے
(حشر، رکوع ۱)	وہی مراد پانے والے ہیں،

ایک مرتبہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، کاشانۂ نبوت میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا، آپ نے فرمایا جو شخص آج کی رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے گا، یہ سنکر ایک انصاری اس کو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ اس نے جواب دیا صرف بچوں کا کھانا ہے، انصاری نے کہا کہ بچوں کو بہلا کر سلا دو اور مہمان کو کھانا دے کر چراغ بجھا دو، تاکہ اسکو یہ پتہ نہ چل سکے کہ ہم لوگ کھانا نہیں کھا رہے ہیں، چنانچہ بیوی نے ایسا ہی کیا، انصاری صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ تمھارے اس

حسن سلوک سے اللہ بہت خوش ہوا ۔ (مسلم کتاب الاشربہ باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ)

بحرین جب فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلاکر فرمایا کہ میں اس کو انصاریوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں ، ان لوگوں نے عرض کیا کہ جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اتنا ہی نہ ملے ہمیں یہ لینا منظور نہیں ، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ منظور نہیں تو صبر کرو ، میرے بعد تمھیں پر تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لیں گے اور تمھیں نہ پوچھیں گے۔[۲] (بخاری جلد ۱ باب مناقب الانصار)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان صفات سے کس قسم کے محاسن کی نمود ہوتی ہے ،

صفات تعمیری پیداشدہ صفات	تعمیری صفات سے درج ذیل قسم کے صفات نمودار ہوتے ہیں مثلاً
غلبہ واقتدار	اس سے برتری ، اقتدار و بالادستی کا احساس پیدا ہوتا ہے جس کی تسکین کیلیے

انسان جدوجہد پر مجبور رہوتا ہے ، یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی صفات الملک العزیز اور القاہر کا عکس ہیں جن کا پرتو قرآن حکیم میں ہے ،

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي	کہئے اے اللہ ، ملک کے مالک آپ جسکو
الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ	چاہیں ملک بخشدیں اور جس سے چاہیں ملک
مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ	لے لیں ، جسے چاہیں عزت دیں اور جسے
وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ	چاہیں ذلیل کردیں ، آپ ہی کے ہاتھ میں
الْخَيْرُ (آل عمران - ۳)	ہر طرح کی بھلائی کا سررشتہ ہے ۔

دوسری جگہ ہے ،

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ	وہی اپنے بندوں پر زور اور غلبہ رکھنے والا ہے
وهو الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ (انعام - ۲)	اور وہی حکمت والا اور آگاہ ہے ،

رعب و دبدبہ | اس سے خود رائی و خود نمائی کا احساس ابھرتا ہے جس کو بروئے کار لانے کے لیے انسان طرح طرح کی تدبیریں کرتا ہے، یہ جذبات اللہ تعالیٰ کی صفت الکبیر المتعال اور المتکبر وغیرہ کا عکس ہیں، قرآن حکیم میں ہے:

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اور اللہ ہی کے لیے بڑائی ہے آسمانوں میں اور
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (الجاثیہ - ۴)	زمین میں اور وہی زبردست حکمت والا ہے

دوسری جگہ ہے:-

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ	آج کس کا راج ہے اللہ کا ہے جو اکیلا
الْقَهَّارِ (المومن - ۲)	اور غلبہ والا ہے۔

جلال و جبروت | اس سے شخصیت پر ہیبت بنتی ہے، اور دوسروں کی دست اندازی سے حفاظت رہتی ہے، یہ جلال و جبروت اللہ تعالیٰ کی صفات الجبار اور ذوالجلال کا عکس ہے، قرآن کریم میں ہے

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ	آپ کے رب کا نام بڑی برکت والا ہے
وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن - ۳)	عظمت اور بڑائی والا ہے

دوسری جگہ ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ	جو کوئی زمین پر ہے وہ فنا ہونے والا
رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ	ہے، اور آپ کے رب کی ذات باقی
(الرحمٰن - ۲)	رہے گی جو عظمت و بڑائی والی ہے۔

محنت کوشی و محنت گیری | اس سے انسان میں محنت و مشقت کا جذبہ ابھرتا اور وہ عزم و ہمت کے کام پر آمادہ ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے اوصاف القوی المتین اور ذی الطول کا عکس ہے۔

قرآن حکیم میں ہے :۔

ذی الطول (المومن رکوع ۱) — اللہ قدرت والا ہے

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (بروج-۱) — بیشک آپ کے رب کی پکڑ سخت ہے ،

ترقی کا جذبہ | اس سے انسان کسی ایک حالت پر قانع نہیں رہتا بلکہ دن بدن آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے ، جو اللہ تعالیٰ کی صفات القابض والباسط وغیرہ کا عکس ہے ، قرآن حکیم میں ہے :

رَفِيْعُ الدَّرَجَاتِ ذُوالْعَرْشِ (المومن-۲) — اللہ اونچے درجوں والا عرش کا مالک ہے ،

دوسری جگہ ہے

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَانٍ (الرحمٰن-۲) — ہر روز وہ ایک نئے کام میں ہے

تسخیر کائنات | اس سے انسان کائناتی تصرفات کے قابل بنتا ہے ، وہ اشیاء کے خواص واثرات کی تحقیق کرتا اور مختلف قسم کی معلومات کے ذریعہ ان پر قابو حاصل کرتا ہے ، یہ اللہ تعالیٰ کی صفت تسخیر کا عکس ہے ، قرآن حکیم میں تسخیر اشیاء سے متعلق بہت سی آیتیں ہیں ، مثلاً

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ — اللہ ہی ہے جس نے دریا کو تمہارے لیے مسخر کردیا

لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً — تاکہ تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ اور اس سے

تَلْبَسُوْنَهَا (النحل - ۲) — زیور نکال کر پہنو

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ (ابراہیم ۵) — اور تمہارے لیے سورج اور چاند کو مسخر کیا ،

وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرَاتٌ بِاَمْرِهٖ (النحل ۲) — اور ستارے مسخر ہیں اس کے حکم سے

سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ — اللہ کی ذات پاک ہے جس نے جانوروں کو

مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ (الرعد - ۱) — ہمارے لیے مسخر کیا اور ہم اس پر قابو پانے والے نہ تھے ،

نفع و نقصان کی چیزوں پر قابو | اس سے انسان نفع پہنچانے والی اور نقصان دینے والی چیزوں پر قابو

حاصل کرکے اپنی بالا دستی تسلیم کراتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے اوصاف النافع، المانع اور الضار کا عکس ہے، قرآن حکیم میں ہے:

إِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا	اگر اللہ کوئی تکلیف (یا نقصان) پہنچائے تو
كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ	اس کے سوا اور کوئی ہٹانے والا نہیں اور
بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ	اگر بھلائی (یا فائدہ) پہنچانا چاہے تو اس کے
(یونس۔ رکوع ۲)	فضل کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔

دوسری جگہ ہے

إِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا	اگر اللہ کوئی نقصان پہنچائے تو اسکے سوا
كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يَمْسَسْكَ	اور کوئی ہٹانے والا نہیں، اور اگر بھلائی
بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (انعام - ۲)	پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

انتقام سزا | اس سے مدافعت و مقابلہ کی طاقت اور بدلہ لینے کی ہمت و سزا دینے کی جرأت پیدا ہوتی ہے، جس سے برائیوں کا استیصال ہوتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی صفات المنتقم اور المعذب کا عکس ہے، قرآن حکیم میں ہے:

وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ (النور ۵)	اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے
إِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ (رعد ۱)	بیشک آپ کا رب سخت سزا دینے والا ہے
فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا	جس شخص نے ذرہ برابر بھلائی کی وہ اس کو
يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ	دیکھے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر برائی کی
شَرًّا يَرَهُ (زلزال ۱۰)	وہ اس کو دیکھے گا۔

غرض صفات جلالی کے عکس سے ایسی تعمیری صفات نمودار ہوتی ہیں جن کے ذریعہ نظم و ضبط

کی صلاحیت ابھرتی اور خلافت و نیابت کی شان نمایاں ہوتی ہے،

تشکیل جدید میں جمالی و جلالی دونوں صفات کی نمو ضروری ہے، اگر ان میں کسی ایک کو بھی نظر انداز کیا جائے گا تو زندگی یک رخی بنجائے گی، اور انسان اپنا مقام حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

صفات تکمیلی کے عکس سے پیدا شدہ خوبیاں صفات تکمیلی سے درج ذیل قسم کی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں:۔

پرورش کی صلاحیت عربی زبان میں ربوبیت کے معنی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق نشو ونما دینا اور پرورش کرنا ہیں، مفردات میں ہے:۔

هوانشاء الشئ حالاً فحالاً الی حد التمام	کسی چیز کو مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشو ونما دیتے رہنا
(مفردات القرآن)	کہ وہ اپنی حد کمال تک پہنچ جائے۔

اس صفت سے پرورش کرنے اور نشو ونما دینے کا جذبہ ابھرتا ہے اور انسان محبت و شفقت کے ساتھ حالت و ضرورت کے مطابق اشخاص و اشیاء کی نگہداشت کرتا ہے،

قرآن حکیم میں ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	تمام تعریفیں اللہ کے لیے سزاوار ہیں
(الفاتحہ۔ ۱)	جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

دوسری جگہ ہے:

قال فمن ربکما یٰموسیٰ قال ربنا الذی اعطیٰ کل شئ خلقہ ثم ھدیٰ	فرعون نے کہا کہ موسیٰ تم دونوں کا پروردگار کون ہے جواب دیا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اسکی صورت عطا کی پھر راستہ بتایا
(طٰہٰ۔ رکوع ۲)	

رزق، موت، حیات وغیرہ کے ذکر کے بعد ہے:

فَذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمُ الْحَق (یونس۔ ۴)	یہ سب کرنے والا اللہ ہے جو تمہارا حقیقی پروردگار ہے

(باقی)

سرکے بالوں کی شرعی حیثیت

ازجناب مولانا حبیب ریحان صاحب ندوی

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو "دین قیم" اور امت محمدیہ کو "امت وسط" سے تعبیر کیا ہے اور دین کے سارے معاملات میں یُسر اور آسانی کا لحاظ رکھا ہے، اور بنیادی اور اصولی عقائد واعمال کو چھوڑ کر فروعی معاملات میں اتنی وسعت وسہولت دی گئی ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ذوق کے لوگوں کے لیے ان پر عمل میں کوئی دشواری نہیں ہے۔

عقائد، عبادات، معاملات اور معاشرت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جس کو اسلام نے تشنہ چھوڑا ہو، ان سب کے متعلق کلام مجید اور احادیث نبویؐ میں احکام وہدایات موجود ہیں، ان میں بعض فرض وواجب ہیں، بعض رسول اکرمؐ کے دائمی عمل سے ثابت ہیں، ان کی پیروی سنت ہے، جن کی صریح ممانعت ہے، وہ حرام ہیں، جن اعمال کے بارہ میں حضورؐ نے سکوت اختیار فرمایا، ان کا کرنا جائز ہے، وہ امور جن کا تعلق بنیادی عقائد وعبادات وغیرہ سے نہیں ہے، اس کو شریعت نے مسلمانوں کی فراست تجربہ، عقل وعلم اور عرف پر چھوڑ دیا ہے۔

حرمت کیلئے قطعی الدلالۃ نص کی ضرورت ہے

شریعت میں کسی چیز کو حرام کرنے کے لیے کسی ایسی قطعی الدلالۃ نص کی ضرورت ہے، جو قرآن یا سنت سے ثابت ہو، اور جس میں کسی قسم کی تاویل کی گنجایش نہ ہو، اس مضمون میں تطویل کے خوف سے ہم نے صرف

چار پانچ مراجع سامنے رکھے ہیں، ورنہ اس موضوع پر بے شمار مراجع ہیں، اس مقالہ میں حسب ذیل موضوعات پر گفتگو کی جائے گی،

۱۔ "قزع" کی ممانعت

۲۔ نئے طرز کے موجودہ بال "قزع" میں داخل نہیں،

۳۔ بال رکھنا افضل، اقرب الی الصواب اور سنت ہے۔

۴۔ مانگ نکالنا سنت ہے، لیکن نہ نکالنا بھی جائز ہے،

۵۔ بالوں میں کنگھی کرنا اور تیل ڈالنا مستحب ہے۔

۶۔ بال منڈانے کو مکروہ یا ناجائز کہنے والوں کے دلائل۔

۷۔ بال رکھنا افضل ہے لیکن منڈانا بھی جائز ہے۔

قزع کی ممانعت | بالوں کا معاملہ درحقیقت انسانی ذوق وزینت سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کو سنتِ جمالی کہا جا سکتا ہے، یہ دین کا کوئی ایسا بنیادی عقیدہ یا اصولی مسئلہ نہیں کہ اس پر ترک سلام وکلام اور توبہ وکفارہ کی ضرورت ہو، اسلام میں توبہ گناہ پر ہوتی ہے، اور صرف خدا کے روبرو ہوتی ہے، اور کفارہ غریبوں کا حق ہے، اور صرف بھول چوک یا گناہ کی ان صورتوں میں واجب ہے جن کی صراحت شریعت میں موجود ہے، عام حالات میں سر منڈانے کا کفارہ شارع نے قرآن وسنت کی کسی نص میں مقرر نہیں فرمایا، بلکہ اس کی آزادی ہے کہ مسلمان جس طرح کے بال مناسب سمجھیں رکھیں، صرف ایک طرز کے بال رکھنے کی ممانعت ہے، اور وہ ہے "قزع" صحیح مسلم میں ہے:۔

عن نافع عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ ﷺ نافع نے ابن عمرؓ سے یہ روایت کیا ہے کہ

صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن القزع	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قزع
قلت لنافع وما القزع قال	سے منع فرمایا، راوی کا بیان ہے کہ میں نے
یحلق بعض راس الصبی	نافع سے پوچھا قزع کیا ہے، انھوں نے
ویترک بعضاً[1]	کہا کہ بچہ کا کچھ سر مونڈا جائے اور کچھ چھوڑ

(دیا جائے)

نافع کی اس شرح کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:۔

احلق کلہ او دعہ کلہ[2]	یا سب کو مونڈو یا سب کو چھوڑ دو

امام نوویؒ اس سلسلہ میں کہتے ہیں کہ قزع کا مطلب سر کے کسی حصہ کو مونڈنا ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ سر کو متفرق جگہوں سے مونڈنا ہے، مگر صحیح پہلی بات ہے[3]، اس کے بعد نووی رقم طراز ہیں:۔

واجمع العلماء علی کراھۃ	علماء کا اجماع ہے کہ قزع مکروہ ہے،
القزع اذا کان فی مواضع	اگر وہ متفرق جگہوں سے ہو لیکن علاج
متفرقۃ الا ان یکون لمداواۃ	وغیرہ کے لیے اجازت ہے، اور یہ کراہت
ونحوھا وھی کراھۃ تنزیہ[4]	تنزیہی ہے،

امام نووی نے قزع کو کراہت تنزیہی سے تعبیر کیا ہے، اور باب بھی "باب کراہۃ القزع" قائم کیا ہے، محدثین و فقہاء کی اصطلاحوں میں بہت باریک معنی سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے کسی چیز کی حرمت، کراہت، جواز یا استحباب وغیرہ کا پتہ چل سکتا ہے، مثلاً دوسرے باب کا عنوان ہے "باب النھی عن الجلوس فی الطرقات"۔ تیسرے باب کا عنوان ہے "تحریم فعل الواصلۃ والمستوصلۃ والواشمۃ والمستوشمۃ"۔ ایک باب کا عنوان ہے

---

[1] صحیح مسلم بشرح النووی، المطبعۃ المصریۃ ۱۴، ص ۱۰۱ [2]، [3]، [4] ایضاً

"باب استحباب مس التعالی فی الیمنیٰ اور لاد الخلع من الیسریٰ" یا "باب اباحۃ اکل الثوم" یا "باب جواز ارداف المرأۃ الاجنبیۃ اذا اعیت فی الطریق"

اس لیے بالوں کی صرف ایک شکل مکروہ ہے، اور وہ قزع ہے، کیونکہ بال سنت جمال ہے، اور قزع میں یعنی کہیں بالوں کا گچھا ہو، کہیں سے چندیا صاف ہو، یا سر منڈا ہوا ہو صرف بیچ میں بال ہوں، ان سب صورتوں میں بالوں کا جمال ختم ہو جاتا ہے، اور ایک بدنما ہیئت پیدا ہو جاتی ہے، اسلیے اسکی ممانعت ہے۔

نئے طرز کے بال قزع میں داخل نہیں موجودہ دور کے عام بالوں کو بعض لوگ قزع میں داخل کرتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے، یہ بال کسی صورت میں بھی قزع میں نہیں آتے، جن کی شرح نافع نے کی ہے، کیونکہ وہ اس طرح نہیں کاٹے جاتے کہ سر کا کچھ حصہ بالکل صاف ہو جائے اور کچھ میں بال ہوں، اور نہ ان بالوں میں آتے ہیں جن کی کراہت پر امام نووی نے اجماع لکھا ہے، یعنی جگہ جگہ سے کہیں بال کٹے ہوں اور کہیں موجود ہوں، پھر حدیث میں لفظ حلق خاص دلالت رکھتا ہے، نیز امام نووی کی اس وضاحت سے کہ علاج کیلئے قزع کیا جا سکتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیچ سے بالوں کو استرے سے اس طرح کاٹا جائے کہ سر کی جلد دکھائی دینے لگے، موجودہ بالوں میں حلق نہیں ہوتا، نئے طرز کے بال قینچی سے تراش کر برابر کیے جاتے ہیں، اور یہ تراش خراش گردن کی سمت ہوتی ہے، اسلیے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہو کہ وہ مسنون اور پٹے دار بالوں کی طرح سب جگہ سے برابر نہیں ہوتے اور یہ صحیح ہو لیکن کراہت یا عدم جواز جن بالوں کے لیے ہو ان میں وہ کسی طرح شامل نہیں ہوتے، مونڈنے اور تراشنے میں بڑا فرق ہے، امام احمد کی ایک روایت میں جہاں انھوں نے سر مونڈنا مکروہ اور ناجائز لکھا ہے، یہ تصریح کر دی ہے کہ جو بال استرے سے مونڈے جائیں وہ مکروہ ہیں، قینچی سے نہیں،

قال احمد انما کرھوا الحلق بالموسی — امام احمد نے کہا حلق استرے سے مکروہ سمجھتے تھے،

واما المقاریض فلیس بہ باس لان — قینچی سے کوئی ہرج نہیں، کیونکہ کراہت کے

ادلۃ الکراھۃ تختص بالحلق[1] — دلائل حلق کے ساتھ مخصوص ہیں،

اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ حلق کا لفظ استرے سے مونڈنے کیلئے خاص ہے،

غرض کسی چیز کی حرمت یا عدم جواز کے لیے جس محکم دلیل کی ضرورت ہے وہ ان بالوں کے لیے نہیں پائی جاتی۔

رہی مسئلہ کی دوسری شق کہ یہ بال کم سے کم فیشن ایبل یا ماڈرن طرز کے ہوتے ہیں، تو یہ ضروری نہیں کہ ہر فیشن ایبل چیز شریعت کے خلاف ہو کسی چیز کی حرمت و کراہت کے لیے نصوص اور شرعی دلائل کے بجائے یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ یہ چیز فیشن ایبل طرز کی ہے،

تشبہ بالقوم کے دائرے میں بھی یہ بال نہیں آتے، کیونکہ تشبہ سے مراد وہ دینی شعائر ہیں جو دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے بپتسمہ لینا، یا گرجا میں جا کر مسح کرانا وغیرہ، جب تک کسی چیز کی حرمت یا کراہت کے قطعی نصوص نہ ہوں صرف اس لیے ان کو حرام یا مکروہ نہیں کہا جا سکتا کہ دوسرے لوگ وہ کام کرتے ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری قوموں کی بعض چیزیں استعمال کی ہیں، جنکا تعلق لباس یا اسلحۂ جنگ وغیرہ سے تھا، اس کی تفصیل شمائل اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے اور جو چیزیں حرام تھیں ان کو کبھی استعمال نہیں فرمایا، اور ان کی ممانعت فرمائی، خواہ وہ عربوں کی ہوں یا دوسروں کی،

---

[1] المغنی لابی محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ، مطبعۃ الامام قاہرہ، ج اول ص ۹۷

اس بحث کا یہ مقصد فیشن ایبل بالوں کی ترغیب دینا یا اس کو پسند کرنا نہیں، بلکہ صرف یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں حرمت وحلت یا جائز و ناجائز کے جو شرعی حدود ہیں یا ان کیلئے جن صریح دلائل کی ضرورت ہے، ان کو سامنے رکھنا ضروری ہے،

فتویٰ صرف جائز و ناجائز پر دیا جائے گا، البتہ تقویٰ اور اتباع سنت کا تقاضہ یہ ہے کہ جیسے بال حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھے ویسے رکھے جائیں، بال منڈوانے کے سلسلے میں بھی یہی فتویٰ دیا جائے گا کہ وہ جائز ہیں، حالانکہ بال منڈانے کے خلاف بہت سے دلائل ہیں، اور نئے طرز کے بالوں کے خلاف کوئی دلیل نہیں، پھر ہر شخص اپنی دینی تربیت اور ذوق سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ افضل اور مسنون طریقہ کیا ہے، جائز کیا ہے، اور مکروہ کیا ہے؟ اور اسے کیا کرنا چاہیے؟

بال رکھنا افضل ہے جو شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع اور آپ کے اسوہ پر چلنا چاہتا ہے، اس کو بال ایسے رکھنے چاہئیں جو آپ سے ثابت ہیں، قرآن پاک میں بال رکھنے کے سلسلے میں کوئی نص موجود نہیں، البتہ حج میں بال منڈانے یا کتروانے کے سلسلے میں چند آیات ہیں، جن پر آگے چل کر حلق کے سلسلے میں گفتگو کی جائے گی۔ ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حج وعمرہ کے علاوہ بال رکھنا تقاضائے فطرت ہے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کی احادیث کو پیش نظر رکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ حج وعمرہ کے علاوہ آپ نے کبھی بال نہیں منڈوائے، اور نہ کتروائے، شمائل ترمذی کے شارح امام شیخ ابراہیم الباجوری نے شرح المصابیح کے حوالہ سے ابن عربی کا یہ قول نقل کیا ہے،

لم يحلق النبی راسه فی سنی	حضورؐ نے ہجرت کے سالوں میں کبھی بال
الهجرة الا فی عام الحديبية	نہیں منڈائے صرف حدیبیہ والے سال

وعمرۃ القضاء وحجۃ الوداع	اور عمرۃ القضاء میں اور حجۃ الوداع میں
ولم یقصر الامرۃ واحدۃ	اور عمر میں صرف ایک مرتبہ قصر کرائے
فی الصحیحین [1]	جیسا کہ صحیحین میں ہے،

اب موئے مبارک کی ایک جھلک احادیث میں دیکھئے۔ آپ کے بال نہ تو زیادہ گھونگھریالے تھے، نہ بالکل سیدھے، سپاٹ [2]۔ حضرت انس بنؓ مالک کے بیان کے مطابق نصف کانوں تک تھے [3]، حضرت براء بنؓ عازب حضور کے جمال مبارک کے بارہ میں فرماتے ہیں، ایسا شخص میں نے دیکھا ہی نہیں، کان کی لو سے لیکر مونڈھے تک آپ کے بال تھے [4]، یعنی کبھی کان کی لو تک رہتے تھے، کبھی بڑھکر شانہ تک آجاتے تھے،

ان احادیث سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ آپ نے حج اور عمرہ کے علاوہ کبھی بال نہیں منڈوائے، بلکہ ہمیشہ رکھے، جب وہ گھٹتے تھے تو نصف کانوں تک رہتے تھے، اور جب بڑھتے تھے تو مونڈھوں تک پہنچ جاتے تھے، اس لیے بالوں کا اقرب الی السنۃ اور افضل ترین طریقہ وہی ہے جس طریقے پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بال رکھے، ابن قدامہ لکھتے ہیں :-

ویستحب ان یکون شعر الانسان	مستحب یہی ہے کہ انسان کے بال حضور انور
علی صفۃ شعر النبی صلی اللہ	صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کی طرح ہوں جب
علیہ وسلم اذا طال فالی منکبیہ	بڑھیں تو مونڈھے تک آجائیں اور گھٹیں تو
وان قصر فالی شحمۃ اذنیہ [5]	کان کی لو وں تک رہیں۔

---

[1] الشمائل المحمدیہ للترمذی حاشیۃ الباجوری، مطبعۃ السعادہ، مصر ص ۳۸ [2] المغنی ج ۱ ص ۹۵

[3-4] المغنی ج ۱ ص ۹۵ [5] ایضاً،

اس لیے ضرورت سے زیادہ چھوٹے بال بھی مسنون طریقے سے اس طرح خارج ہوجائیں گے جس طرح بہت زیادہ بڑے بال لیکن جائز دونوں ہیں،

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عمل کے پیش نظر ابن قدامہ نے یہ فیصلہ کیا ہے،

واتخاذ الشعر افضل من ازالته[۱]	بالوں کا رکھنا ز، کٹھنے سے افضل ہے،

کسی نے ابوعبداللہ سے پوچھا کہ بال رکھنا کیسا ہے، انھوں نے جواب دیا:

سنة حسنة لو امكننا اتخذناه[۲]	اچھی سنت ہو اگر ممکن ہوتا تو ہم بھی اس پر عمل کرتے،

امام قرطبی لکھتے ہیں:-

وقد اجمع العلماء على حبس الشعر واباحة الحلق[۳]	علماء کا اس پر اجماع ہے کہ بالوں کا رکھنا افضل ہے اور حلق جائز ہے

ابن عربی کا قول ہے:-

والشعر فى الراس زينة وتركه سنة[۴]	بال سر کی زینت ہیں اور ان کا رکھنا سنت ہے،

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ بال رکھنا افضل اور مسنون ہے، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بالوں کے لیے علماء محدثین نے سنت، افضلیت اور مستحب کے الفاظ استعمال کیے ہیں، فرض و واجب کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے، کیونکہ وہ (۳) حقیقت سے واقف تھے کہ کسی چیز کے فرض یا واجب ہونے کے لیے قطعی احکام و دلائل کی ضرورت ہوتی ہے،

فرق افضل ہے اور سدل جائز ہے | ان حدیثوں سے بھی بال رکھنے کی تائید ہوتی ہے جن سے

[۱و۲] المغنی ج ۱ ص ۹۵ [۳] الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۲ ص ۳۸۳ [۴] شمائل ترمذی الیاجوری ص [۳]

ظاہر ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مانگ نکالا کرتے تھے، کیونکہ بالوں کے بغیر مانگ نکالنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، عبد اللہ بن عتبہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يسدل شعره وكان المشركون يفرقون رؤسهم وكان اهل الكتب يسدلون رؤسهم وكان يحب موافقة اهل الكتب فيما لم يؤمر فيه بشیٔ ثم فرق رسول الله راسه[1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بالوں کو سیدھا چھوڑ دیتے تھے اور مشرکین مانگ نکالتے تھے، اور اہل کتاب مانگ نہ نکالتے تھے، اور حضور ان چیزوں میں اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے جن میں آپ کو کوئی حکم نہیں دیا جاتا تھا، پھر آخر میں مانگ نکالنے لگے۔

امام قرطبیؒ نے اس حدیث کو نسائی کے حوالہ سے نقل کیا ہے[2]، امام مسلم نے الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ نقل کیا ہے[3]؛

امام قرطبی نے قاضی عیاض کے حوالے سے اور امام نووی نے شرحِ مسلم میں سدل کے معنی یہ بیان کیے ہیں :-

سدل الشعر ارساله والمراد هنا عند العلماء ارساله على الجبين[4]	سدل کے معنی ہیں بالوں کو چھوڑ دینا لیکن یہاں علماء کے نزدیک مراد ہے پیشانی پر چھوڑ دینا۔

---

[1] شمائل حاشیۃ الباجوری ص ۱۴ [2] تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۱۰۵ [3] مسلم شرح نووی ج ۱۶ ص ۹۰

[4] قرطبی ۲/۱۰۵ مسلم ۱۶/۹۰

اہل کتاب کی موافقت : حدیث کا یہ ٹکڑا کہ جس چیز میں آپ کے پاس وحی کا حکم نہیں ہوتا تھا، صاف بتا رہا ہے کہ بالوں کا معاملہ انسانی ذوق و جمال کا معاملہ ہے، البتہ یہ ٹکڑا کہ آپ اس میں اہل کتاب کی موافقت کرتے تھے، قابل غور ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ جائز چیز میں اگر کسی قوم کی موافقت کی جائے تو وہ تشبہ بالقوم میں داخل نہیں ہوتی، اس لیے آپ نے اہل کتاب کے طرز پر پہلے سدل کیا، پھر جب دیکھا کہ بالوں کی صفائی، نظافت اور جمال کے لیے مانگ نکالنا بہتر ہے تو مانگ نکالنے لگے، یہ کہنا کہ اللہ کے حکم سے یہ تبدیلی ہوئی، صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ اگر حکم سے ایسا ہی ہوتا تو آپ سدل کی ممانعت فرما دیتے، مگر ایسا نہیں کیا، چنانچہ بعض صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی سدل ثابت ہے، اس لیے اصل مسئلہ جائز و ناجائز اور صحیح و سقیم کا ہے، یہ نہیں ہے کہ کوئی دوسری قوم کیا کرتی ہے۔

حدیث بالا سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا آخری عمل مانگ نکالنا ہے، اس لیے تبع سنت کے لیے یہی افضل اور اقرب الی الاتباع ہے، قرطبی لکھتے ہیں:-

والفرق فی الشعر سنة [1]	بالوں میں مانگ نکالنا سنت ہے

امام مالک کا قول ہے:

فرق الرجل احب الی [2]	آدمی کا مانگ نکالنا مجھے پسند ہے

ابن قدامہ لکھتے ہیں:

ویستحب فرق الشعر لان النبی صلعم فرق شعرہ وذکرہ من الفطرة [3]	مانگ نکالنا مستحب ہے کیونکہ نبی صلعم نے مانگ نکالی اور اسے فطرت کی چیزوں میں سے بتایا۔

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۱۰۵ [2] مسلم شرح نووی ج ۲ / ۹۰ [3] المغنی ج ۱ / ۹۵

لیکن آپ نے سدل کی ممانعت نہیں فرمائی اور بعض صحابۂ کرام سے ثابت ہے کہ انھوں نے اس کے بعد بھی سدل کیا، اگر یہ جائز نہ ہوتا تو حضورؐ اس کی ممانعت فرما دیتے، اور صحابۂ کرامؓ اس کے خلاف عمل کرتے۔ شیخ ابراہیم الباجوری لکھتے ہیں:

الحدیث یدل علی جواز الامرین	حدیث دونوں چیزوں کے جواز پر
والامر فیہ وسیع لکن الفرق افضل	دلالت کرتی ہے، اور اس معاملہ میں
لکون النبی صلی اللہ علیہ وسلم	وسعت ہے، لیکن مانگ افضل ہے کیونکہ
رجع الیہ آخرا ولیس بواجب	نبی صلعم نے آخر میں مانگ نکالی، لیکن واجب
فقد نقل ان من الصحابہ	نہیں ہے کیونکہ بعض صحابہ سے منقول ہے
من سدل بعد ولو کان الفرق	کہ انھوں نے سدل کیا، اگر مانگ نکالنا
واجبا لما سدلوا [1]	واجب ہوتا تو صحابہ کبھی سدل نہ کرتے،

مگر مانگ کے افضل ہونے اور سدل کے جائز ہونے کے باوجود حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کا یہ عمل قرطبی نے نقل کیا ہے:

کان اذا انصرف من الجمعۃ	وہ جب جمعہ سے واپس ہوتے تو مسجد کے
اقام علی باب المسجد حرسا	دروازے پر نگراں مقرر کرتے جو ہر
یجزون ناصیۃ کل من لم	اس شخص کی پیشانی کے بال کاٹتے جو
یفرق شعرہ [2]	مانگ نہ نکالتا ہو۔

اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کی تاویل یہ کی جا سکتی ہے کہ آپ کو اتباع سنت کا اس درجہ اہتمام تھا کہ آپ نے حضورؐ کے آخری عمل کو نافذ کرنا ضروری سمجھا، یا یہ سبب ہو کہ

---

[1] شمائل ص ۱۲۱ [2] تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶

کچھ لوگوں نے بالوں کی صفائی ستھرائی چھوڑ رکھی ہو یا بال پریشان رکھتے ہوں، یا کوئی ایسا سبب ہو جس کی بنا پر آپ نے یہ تادیبی کارروائی کی ہو، اس لیے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کا یہ عمل کسی وقتی ضرورت یا مصلحت کی بنا پر تو صحیح ہو سکتا ہے لیکن سدل کے جواز کے دلائل کی موجودگی میں حجت نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کا عدم جواز شریعت سے ثابت نہیں، بعض صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سدل کرتے تھے، اور شریعت نے جس چیز میں آسانی رکھی ہو اس میں تنگی بلا وجہ صحیح نہیں ہے،

بالوں میں کنگھی کرنا اور تیل ڈالنا مستحب ہے	بال رکھنا سنت ہے، اور ان میں مانگ نکالنا افضل ہے، لیکن اگر بالوں میں تیل نہ ڈالا جائے، کنگھی نہ کی جائے،

ان کی صفائی کا خیال نہ رکھا جائے تو ان میں گندگی یا جوئیں پیدا ہو سکتی ہیں، اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

من کان لہ شعر فلیکرمہ[1] — جس کے بال ہوں اسے ان کا اکرام کرنا چاہیے،

اور عملاً بھی اس کی تعلیم دی، چنانچہ اعتکاف کی حالت میں بھی آپ بالوں کی صفائی کا خیال رکھتے تھے، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اعتکف یدنی راسہ وارجلہ[2]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف فرماتے تھے تو اپنا سر مبارک قریب کر دیتے تھے اور میں کنگھی کرتی تھی،

بالوں میں کنگھی اور ان کی صفائی کرنا مستحب ہے،

ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی

---

[1] ابوداؤد بحوالہ المغنی ج اول ص ۵۵ و [2] مسلم ج ۳ ص ۲۰۹

کان یترجل غبا[1] کنگھی کرتے تھے۔

"غبا" کے اصل معنی ہیں کسی کام کو ایک دن بیچ کر کے کرنا، پھر کسی کام کو کبھی کرنے اور کبھی چھوڑ دینے کے معنی میں بولا جانے لگا، یعنی آپ کبھی کنگھی کرتے تھے اور کبھی نہیں کرتے تھے۔

بالوں میں تیل بھی ڈالتے تھے، حضرت انس ابنؓ مالک کا بیان ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکثر دھن راسہ[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر میں کثرت سے تیل ڈالتے تھے،

کنگھی کرنے، تیل ڈالنے اور بالوں کی زینت و نظافت کی حدیثوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص بھی بال رکھے اسے ان کی دیکھ بھال اور نظافت کا خیال رکھنا چاہیے، لیکن اس میں خود نمائی اور مبالغہ نہ ہونا چاہیے کہ آدمی سارے کاموں کو چھوڑ کر بس بالوں کے سنوارنے میں لگا رہے، شارح شمائل ترمذی لکھتے ہیں کہ

ویوخذ من ھذا ندب تسریح شعر الراس[3] اس سے بالوں میں کنگھی کرنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔

غرض بال رکھنا، ان میں مانگ نکالنا، کنگھی کرنا، تیل ڈالنا یہ سب حضورؐ کا عمل ہے، اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ سر منڈانے کے مقابلے میں بالوں کو رکھنا اقرب الی السنت ہے،

حلق کو ناجائز کہنے والوں کے دلائل: حلق کے سلسلے میں جمہور کا مسلک جواز کا ہے، یعنی بال منڈائے جا سکتے ہیں، جمہور کے مسلک کی تائید میں دلائل بعد میں بیان کیے جائیں گے

---

[1] شمائل ص ۴۴ [2] ایضاً ص ۴۴ [3] ایضاً ص ۴۴

پہلے حلق کو مکروہ، ناجائز اور بدعت کہنے والوں کے دلائل بیان کیے جاتے ہیں،

حلق کا لفظ قرآن مجید میں حج یا عمرہ کے موقع پر آیا ہے، جو حج اور عمرہ کے ساتھ خاص ہے، حضورؐ کی دائمی سنت یہی ہے کہ آپ نے حج وعمرہ کے علاوہ بال نہیں منڈائے اور حدیث میں ارشاد ہے: لا توضع النواصی الا فی حج او عمرۃ[1]

امام احمد بن حنبل کی ایک روایت میں حلق راس کو مکروہ بتایا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضورؐ نے خوارج کے متعلق ارشاد فرمایا تھا کہ سیماھم التحلیق فجعله علامة لهم[2] ان کی پہچان یہ ہے کہ ان کے سر منڈے ہوئے ہونگے، یعنی یہ خوارج کی علامت ہے،

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے امام احمد نے یہ روایت نقل کی ہے

لیس منا من حلق[3] — وہ ہماری جماعت سے نہیں ہو جو سر منڈائے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صبیغ سے فرمایا تھا

لو وجدتك محلوقا لضربت — اگر میں تم کو سر مونڈا ہوا پاتا تو تمھاری

الذی بین عینیك بالسیف[4] — آنکھوں کے بیچ جو چیز ہے اسے تلوار سے مارتا

اسی لیے امام احمد نے اسلاف کے متعلق لکھا ہے کہ

وکانوا یکرھون ذالك[5] — وہ اسے مکروہ سمجھتے تھے،

اور ابن عربی نے حلق راس کو بدعت قرار دیا ہے،

والشعر فی الراس زینة وترکه — بال سر کے لیے زینت ہیں، انکو چھوڑنا سنت

سنة وحلقه بدعة[6] — ہے اور مونڈانا بدعت ہے،

ص۳۸

[1] رواہ الدارقطنی فی الافراد، المغنی ۱/۹۵ [2] ایضاً ۱/۹۵ [3] رواہ احمد، المغنی ۱/۹۶ [4] المغنی ۱/۹۵ [5] ایضاً [6] شمائل

امام احمد کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ استرے سے حلق مکروہ ہے، اور یہ ساری گفتگو اسی کے متعلق ہے، قینچی سے کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ کراہیت کے دلائل حلق کے ساتھ مخصوص ہیں، قال احمد انما کرھوا الحلق بالموسی، واما المقراض فلا بأس به لان ادلة الکراهة تخص الحلق[1]

بال رکھنا افضل ہے لیکن مونڈنا بھی جائز ہے	جمہور علماء کے نزدیک بال منڈانا جائز ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کسی چیز کو حرام یا مکروہ اور ناجائز

کہنے کے لیے کسی قطعی الدلالہ نص یا حکم کی ضرورت ہوتی ہے، جو ایسی واضح اور صریح ہو کہ اس میں کسی قسم کی تاویل ممکن نہ ہو،

یہ صحیح ہے کہ قرآن پاک میں حلق کا تذکرہ دو بار آیا ہے، سورہ بقرہ میں ہے

وَلَا تَحْلِقُوا رُؤُسَكُمْ حَتّٰى تَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ — اپنے سر نہ مونڈو یہاں تک کہ قربانی کا جانور اپنی جگہ پر پہنچ جائے،

سورہ فتح میں ہے:۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُؤُسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ — اللہ نے رسول کا خواب سچ کر دکھایا، حق کے ساتھ تم داخل ہوگے مسجد حرام میں انشاء اللہ امن کے ساتھ سر مونڈے ہوئے اور کترے ہوئے

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج میں بالوں کا حلق یا قصر ضروری ہے،

---

[1] المغنی ج ۱ ص ۹۰

اور اس کے علاوہ بال رکھے جا سکتے ہیں، خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج میں حلق کیا تھا، اور حضرت معاویہؓ نے عمرہ میں مروہ پر آپ کے بال قصر کیے تھے،[1]

یہ صحیح ہے کہ حلق کا تذکرہ ہر حالت میں حج یا عمرہ کے احکام کے ساتھ وابستہ ہے، اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ حج اور عمرہ میں حلق یا قصر ضروری ہے، لیکن یہ ثابت کرنا کہ حلق ناجائز یا مکروہ ہے، کسی طرح صحیح نہیں، اس کے لیے ایسی آیت کی ضرورت ہے جس میں حج اور عمرہ کے علاوہ حلق اور قصر کی صریح ممانعت ہوتی، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی عمل بھی اس کی تائید میں تو پیش کیا جا سکتا ہے کہ بال رکھنا مسنون ہے، اس لیے بال منڈانے کی حرمت یا کراہت کے لیے بھی ایسی ہی عملی مثال کی ضرورت ہے،

جس روایت میں حلق خوارج کی علامت بتائی گئی ہے، اگر وہ صحیح ہو تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حلق ناجائز ہے، کیونکہ اگر کوئی خارجی بال رکھ لے یا داڑھی رکھ لے تو اس سے دونوں کا سنت ہونا ختم نہیں ہو سکتا، حلق کی ممانعت میں سب سے زیادہ قوی دلیل یہ حدیث ہو سکتی ہے کہ "جو حلق کرے وہ ہم میں سے نہیں"۔ لیکن یہ مسلّم ہے کہ حدیث کے یہ الفاظ خاص موقع کے لیے ہیں، یعنی کسی کی موت پر واویلا مچانا، اس کے غم میں بالوں کا منڈانا، اور دوسرے غیر شرعی طریقوں کو اختیار کرنا، بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں یہ حدیث زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ وعید صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو غم و الم اور موت کے وقت اس قسم کے کام کرتے ہیں، اس لیے اس حدیث سے استدلال صحیح نہیں ہے، اس کے بعد کوئی

[1] تفسیر قرطبی جلد ۱۶ ص ۲۹۱

دلیل باقی نہیں رہ جاتی، تطویل کے خوف سے صرف صحیح مسلم سے چند روایتیں پیش کیجاتی ہیں، حضرت ابو موسیٰ اشعری سخت درد اور تکلیف میں مبتلا تھے، ان کا سر ان کی بیوی کے زانو پر تھا، ان کی حالت دیکھکر ان کے گھر کی کسی عورت نے زور سے چیخنا شروع کیا، حضرت ابو موسیٰؓ اس وقت درد و کرب کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے، مگر جوں ہی افاقہ ہوا فرمایا:۔

انا بریٔ مما بریٔ منہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بریٔ من الصالقۃ والحالقۃ والشاقۃ[1]	میں اس سے بری ہوں جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برأت کی ہے، بیشک رسول اللہؐ نے برأت ظاہر کی ہے چیخنے والی بال کاٹنے والی اور کپڑے پھاڑنے والی سے

صالقہ وہ عورت جو مصیبت کے وقت بلند آواز سے چیخے، حالقہ جو بال کٹائے، شاقہ وہ جو کپڑے پھاڑے، اس حدیث میں مؤنث کا صیغہ استعمال ہوا ہے، کیونکہ عام طور پر عورتیں ہی ماتم و نوحہ میں بال نوچتی ہیں، دوسری روایت میں مذکر کے صیغہ کے ساتھ بھی آیا ہے، حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے،

الم تعلمی وکان یحدث ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال انا بریٔ ممن حلق وسلق وخرق[2]	کیا تم کو معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بری ہوں اس سے جس نے سر مونڈا، بلند آواز سے چیخا اور کپڑے پھاڑے،

امام مسلم نے عیاض الاشعری کے حوالے سے برأت کے بجائے "لیس منا من حلق

---

[1] مسلم شرح نووی ج ۲ ص ۱۱۰ [2] ایضاً ص ۱۱۱

وسلق وخرق[۱] روایت کیا ہے،

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حلق کی وعید خاص ماتم اور موت وغم کے موقع کے لیے ہے، عام حالات میں بال منڈانے سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں، ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ اس سے مراد مصیبت میں بال منڈوانا ہے،[۲]

اس تفصیل کی روشنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے جو آپ نے صبیغ سے فرمایا کہ اگر تم سر منڈائے ہوتے تو میں تمھیں تلوار سے مارتا، ممکن ہے کہ آپ نے کسی ایسے ہی موقع پر یہ تنبیہ کی ہو، یا کسی خاص موقع پر خاص حالت کی بنا پر ایسا فرمایا ہو، اس پر عام حکم لگا کر اس کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا،

اس سے مثلہ مراد لینا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ مثلہ تو حج یا عمرہ کسی میں بھی جائز نہیں ہے، احادیث میں اس کی صریح ممانعت ہے،

عن ابی حنیفة عن علقمة عن ابن بریدة عن ابیه ان رسول الله صلے الله علیه وسلم نهی عن المثلة[۳]

ابو حنیفہ علقمہ سے وہ ابن بریدہ سے وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ سے منع فرمایا ہے،

مثلہ کے معنی ہیں کسی عضو کو کاٹ ڈالنا، سر کے بال مونڈنا اس میں داخل نہیں ہو سکتا، بدعت اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی حرمت پر کوئی قطعی دلیل موجود نہیں ہے، جائز چیز کے کرنے میں بدعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، امام قرطبی نے حضرت علیؓ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ حلق کرتے تھے،

وکان علی بن ابی طالب رضی الله عنه یحلق رأسه[۴]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اپنا سر مونڈتے تھے۔

۱؎ مسلم ج ۲ ص ۱۱۱ ۲؎ المغنی ج اول ص ۹۶ ۳؎ مسند الامام ابو حنیفہ، مطبعۃ الاصیل حلب ص ۱۵۴ ۴؎ تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۳۸۳

اگر سر مونڈنا بدعت ہوتا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے منع فرما دیتے اور خود حضرت علیؓ یہ کام نہ کرتے۔ حضرت علیؓ کا یہ عمل حلق کے جائز ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے، لیکن حضور انور صلعم اور صحابہ کرامؓ کے دائمی عمل یعنی بال رکھنے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کسی مجبوری یا ضرورت کی وجہ سے سر منڈاتے ہوں گے، جو بہر حال جائز ہے۔

حضرت جعفرؓ کے بچوں والی حدیث مثلہ کے جواب میں تو پیش کیجا سکتی ہے لیکن حلق راس کے جواز میں پیش نہیں کیجا سکتی، کیونکہ یہ عمل مجبوری کی وجہ سے تھا، ان کی ماں اس وقت جب غم والم میں مبتلا تھیں، اس میں بچوں کے بال کی نگہداشت نہیں کر سکتی تھیں، اور مجبوری کی حالت میں خصوص کو عموم سے بدلا جا سکتا ہے، جیسے کسی مجبوری کی وجہ سے قربانی کے جانور کو ذبح کرنے سے پہلے بھی حلق کی اجازت ہے، بہرحال حلق کے جواز کے لیے اس واقعہ سے سند کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔

حلق جائز ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ قرآن وسنت میں کہیں اس کو مکروہ یا ناجائز نہیں کہا گیا، اور تمام چیزوں کی اصل اباحت اور جواز ہے، جب تک شارع ان کو حرام یا ناجائز نہ قرار دے۔ دوسرے یہ کہ قزع والی صورت میں ارشاد ہے کہ "احلق کله اودعه کله[۵]" یعنی یا تو پورا سر مونڈ دو یا پورا چھوڑ دو۔ قزع نہ کرو، یہ حدیث پاک خود جواز حلق کی موید ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ارشاد ہے:

من كان له شعر فليكرمه — جس کے بال ہوں وہ ان کا اکرام کرے

۵؎ صحیح مسلم شرح نووی ج ۱۴ ص ۱۰۱

اس سے پوری طرح واضح ہے کہ اگر بالوں کی دیکھ بھال نہ کر سکتا ہو تو منڈا دے، لیکن بال رکھکر انکی دیکھ بھال کرنا اولیٰ و افضل ہے،

اس لیے حضرت ابو عبد اللہ نے فرمایا کہ "بال رکھنا سنت حسنہ ہے، اگر ممکن ہوتا تو ہم بھی کرتے"[1] یعنی کسی مجبوری کی بنا پر بالوں کی دیکھ بھال کی زحمت سے بچنے کے لیے بال نہیں رکھے اور سہولت اور جواز کی راہ اختیار کی،

اسی کے پیش نظر اس پر اجماع ہے کہ بال رکھنا جائز ہے، خود امام احمدؒ سے اس باب میں روایات مختلف ہیں، ابن قدامہ لکھتے ہیں:

واختلفت الروایة عن احمد فی حلق الراس[2]	امام احمدؒ سے حلق راس کے سلسلے میں مختلف روایتیں ہیں،

یعنی بال رکھنے اور منڈوانے دونوں کی روایتیں ہیں، اور منڈانے کے جواز پر علماء کا اجماع ہے،

وقد اجمع العلماء علی اباحة الحلق وکفی بھذا حجة[3]	علماء کا اجماع ہے کہ حلق مباح ہے اور یہ حجت کے لیے کافی ہے

قرطبی نے بھی ابن عبد البر کا قول نقل کیا ہے،

وقد اجمع العلماء علی حبس الشعر وعلی اباحة الحلق وکفی بھذا حجة	علماء کا اجماع ہے کہ بالوں کا رکھنا (افضل) ہے اور حلق جائز ہے، یہ حجت کے لیے کافی ہے.

امام قرطبی فیصلہ کن انداز میں فرماتے ہیں:

[2] المغنی ج ۱ ص ۹۵ [3] ایضاً ص ۹۵ [4] ایضاً [5] تفسیر قرطبی جلد ۲ ص ۳۸۳

لااختلاف ان حلق الراس	اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حج میں
فی الحج نسك مندوب الیه	سر منڈانا مناسک حج میں ہے اور مندوب
وفی غیر الحج جائز[1]	ہے، اور حج کے علاوہ جائز ہے۔

حاصل بحث اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ بال سنت جمالی ہے، قزع کے علاوہ ہر طرح کے بال رکھے جا سکتے ہیں، انسان اپنے ذوق و زینت کے پیش نظر جیسے چاہے بال رکھ سکتا ہے، شارع نے اس باب میں کوئی پابندی نہیں لگائی ہے، اور کسی خاص قسم کے بال رکھنے کا حکم نہیں دیا ہے۔

(۲) قزع کے علاوہ موت یا غم و الم کے رسوم میں بال منڈانا منع ہے، مجبوری کی حالت اس سے مستثنیٰ ہے۔

(۳) افضل اور مسنون بال رکھنا ہے،

(۴) بالوں میں مانگ نکالنا سنت ہے،

(۵) سدل جائز ہے،

(۶) تیل ڈالنا اور کنگھی کرنا مندوب و مستحب ہے،

(۷) بال منڈانا بھی جائز ہے، جب ان کی دیکھ بھال نہ ہو سکے،

(۸) یہ ساری تفصیل مردوں کے بالوں کے متعلق ہے،

(۹) اس بحث کا تعلق عورتوں کے بالوں سے نہیں،

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۳۸۳

سراجاً منیرا

(علمی و عقلی نقطۂ نظر سے)

از جناب محمد شہاب الدین صاحب بی، وی. ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور

(۲)

نماز کا صحیح مقام دنیا کی اصلاح اور معاشرہ کی اخلاقی و روحانی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے نہ صرف تربیتی کورس ضروری ہے بلکہ ایک مثالی کردار اور آئیڈیل نمونے کی بھی ضرورت ہے، تاکہ لوگ اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرسکیں پیغمبر آخر زماںؐ کو یہی مثالی و مرکزی کردار بنا کر پوری "امت دعوت"[ل] اور "امت اجابت"[۲] کے سامنے پیش کیا گیا، یہ مثالی کردار آج ہمارے سامنے "سنت نبوی" کی شکل میں موجود و محفوظ ہے، جس کو "اسوۂ رسول" بھی کہتے ہیں،

اس تربیتی کورس کی بہترین شکل اسلامی نماز ہے، جس کے ذریعہ بندہ ہر دن پانچ مرتبہ بارگاہ احدیت میں حاضر ہوکر اپنی عبدیت کا اعتراف کارزار حیات میں ذات باری کو فراموش نہ کرنے، ہمیشہ و ہر حال میں اس کو حاضر و ناظر جاننے اور اسکے احکام سے سرتابی نہ کرنے کا اقرار و اعتراف کرتا ہے،

ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے "کاروبار حیات" کے دوران میں روزانہ کم از کم

ل اس سے مراد قیامت تک کے تمام لوگ اور پوری نوع انسانی ہے ۲ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو آپ کی رسالت پر ایمان لے آئے۔

پانچ پانچ مرتبہ اپنے مالک و آقا اور رب کریم کے حضور میں حاضری دے رہا ہو، جس کے متعلق خود اس کا یہ عقیدہ ہو کہ وہ تمام کھلے اور چھپے کا جاننے والا اور دلوں تک کے اسرار سے واقف ہے، وہ اس کے احکام و مرضیات سے سرتابی کیسے کر سکتا ہے؟

نماز دراصل جذبۂ عبودیت کے اظہار کے علاوہ احتساب اعمال کا بھی ذریعہ ہے، جس کی بدولت نہ صرف نفس کی تہذیب ہوتی ہے بشرطیکہ نماز کو نماز سمجھ کر اس کے پورے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کیا جائے، جس کو قرآن حکیم کی اصطلاح میں "اقامت صلوٰۃ" کہا گیا ہے،

جب بندوں کا یہ حال ہو جائے گا تو معاشرہ کی کایا پلٹ جائے گی، نہ کوئی کسی پر ظلم و زیادتی کرے گا اور نہ کسی کا حق مارے گا، نہ کوئی برائی سرزد ہوگی، نہ بداخلاقی و بدکاری کی جانب قدم اٹھ سکیں گے، اسی لیے کہا گیا ہے

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (عنکبوت: ۴۵)
نماز یقیناً برائیوں اور بدکاریوں سے روکتی ہے۔

تصوف کیا ہے | اس لحاظ سے نماز "تزکیۂ نفوس" اور تہذیب اخلاق کا بڑا ذریعہ ہے مگر اس تزکیہ کی تکمیل تصوف کے ذریعہ ہوتی ہے، جس سے تقویٰ و طہارت اور خوف و خشیت الٰہی کا اعلیٰ درجہ حاصل ہوتا ہے۔

مگر تصوف شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں، بلکہ اس سے حقیقتاً شریعت ہی کی تکمیل مقصود ہے، وہ شریعت کی ضد نہیں بلکہ اس کا خادم اور متمم ہے، تصوف نام ہے "تزکیۂ نفوس" کا، اور جو چیز شریعت کے خلاف اور اس کی ضد ہو، وہ

تصوف ہی نہیں بلکہ ضلالت و گمراہی ہے،

تصوف کا منشائے مقصود سوز جگر کو جلا دینا اور "عشقِ الٰہی" کی آگ کو بھڑکانا ہے جو سارے محاسن اخلاق کا سرچشمہ ہے،

سنت رسول | اب رہا مثالی کردار اور آئیڈیل نمونہ تو وہ "اسوۂ رسول" اور "سنت نبوی" کی شکل میں موجود و محفوظ ہے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال و افعال یا عملی طریقے مراد ہیں جو آپ نے "تزکیۂ نفوس" اور "تعلیم کتاب" کی تشریح و توجیہ کے لیے اختیار کیے۔ اسی کا دوسرا نام "حکمت" ہے۔ "ویعلمہم الکتٰب و الحکمۃ[1]" کا مفہوم یہی ہے۔

غرض رسول کی حیثیت محض ڈاکیہ اور پیامبر کی نہیں ہوتی بلکہ وہ انسانوں کی تعلیم و تربیت اور اس کی اخلاقی و روحانی اصلاح کے لیے مبعوث کیا جاتا ہے، وہ جس طرح عقائد کی اصلاح کرتا ہے، اسی طرح مراسم عبودیت بھی سکھاتا ہے۔ آئین کے تنفیذ چکاتا ہے، باہمی مناقشات و نزاعی امور کے درمیان فیصلے کرتا ہے، وہ صرف احکام خداوندی بندوں تک نہیں پہنچاتا بلکہ ان کے نشیب و فراز بھی سمجھاتا ہے، آیاتِ الٰہی کی تلاوت کے ساتھ ان کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ ان کے معانی و مطالب اور ان کے غموض و اسرار سے بھی آگاہ کرتا ہے اور اپنے عمل سے ان تمام امور کی مزید وضاحت کرتا اور

---

[1] پوری آیت شروع میں گزر چکی ہے، جو یہ ہے:-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ: ۲)

وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی کی قوم سے ایک پیغمبر مبعوث کیا، جو انکو خدا کے احکام پڑھکر سناتا ہے، ان کو پاک صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب حکمت کی تعلیم دیتا ہے،

زبانی منشاء و مقصد کو سمجھاتا ہے، تاکہ کسی معاملہ میں کسی قسم کا شبہہ یا اشتباہ باقی نہ رہ جائے اور لوگ اس کے مطابق اپنی زندگیوں ڈھال لیں، ایسا وعظ و پند جس پر خود عمل نہ ہو اسلام کی نظر میں انتہائی مبغوض اور ناپسندیدہ ہے، ارشاد باری ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ	اے ایمان والو: تم ایسی بات کیوں
تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ	کہتے ہو جو خود کرتے نہیں ہو؟ اللہ
كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن	کے نزدیک یہ بڑی قبیح حرکت ہے کہ
تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (صف ۲-۳)	تم وہ بات کہو جو خود کرو نہیں۔

یہ فطری اور منطقی حقیقت ہے کہ لوگ اس شخص کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جو حسن گفتار کا غازی اور کردار سے تہی دامن ہو اور جس کے اقوال و افعال میں تضاد ہو۔ عملی لحاظ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن کریم کی عملی تفسیر ہے، یعنی جو جو احکام و اوامر قرآن میں ہیں، آپ نے خود اس کا عملی نمونہ پیش کیا، اس بنا پر دنیا میں آپ نے ایسا کامیاب اور ہمہ گیر انقلاب برپا کر دیا جس کی مثال پیش کرنے سے پوری انسانی تاریخ قاصر ہے، کیا ایسا لاثانی اور حیرت انگیز انقلاب بغیر عمل و کردار کے محض زبانی باتوں اور خشک لکچروں کے ذریعہ برپا ہو سکتا تھا؟ خود کلام مجید اس کردار پر شاہد ہے،

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (قلم-۴)	بلاشبہ آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں،

یہی وہ بلند و اعلیٰ کردار ہے، جس کے اتباع کا قرآن مجید نے حکم دیا ہے

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ	کہہ دو کہ اے مسلمانو اگر تم کو اللہ سے
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَ	محبت کا دعویٰ ہو تو میری اتباع
يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ	کرو، اس کے عوض اللہ بھی تم سے

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ — محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا، اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحم دل ہے۔

(آل عمران: ۳۱)

اور یہی کردار آپ کا اسوہ یا سنت رسول بھی کہلاتا ہے یہ اسوہ یا سنت کوئی وقتی چیز نہیں بلکہ دائمی وابدی ہے جو رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے روشنی کا منارہ اور انسانیت کا معیار رہے گا، آپ کی بعثت کا مقصد ہی اخلاق وکردار کی تکمیل تھی،

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق — میں تو اخلاق کریمانہ کی تکمیل ہی کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

۳۔ چراغ فلک اور چراغ رسالت

دو روشن چراغ | غرض اللہ تعالیٰ نے جس طرح عالم انسانیت کی مادی ضروریات کی تکمیل کے لیے فطرت کا ایک ضابطہ اور آفتاب عالم تاب کو اس ضابطہ کا پابند بنایا، اسی طرح انسان کی اخلاقی وروحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے شریعت کا بھی ایک نظام بنایا اور ایک قانون نافذ کیا، اور اس کے نفاذ کے لیے پیغمبروں کو مبعوث کیا تاکہ فطرت اور شریعت کے نظاموں میں توافق وہم آہنگی برقرار اور ترازو کے دونوں پلڑے سیدھے رہیں،

جس طرح آفتاب کی پوری زندگی تکوینی (Natural) ضوابط کی پابند ہے جس سے وہ سرمو تجاوز نہیں کرتا، اسی طرح انبیائے کرام کی زندگی بھی تشریعی ضوابط یا احکام خداوندی کی پابند ہوتی ہے، جس سے وہ ارادۃً کبھی تنکے

کے برابر بھی عدول نہیں کرتے، اس طرح اگر سورج کی کرنوں سے پورا خاکدانِ عالم روشن ہوتا ہے تو انبیائے کرام کی حیات آفریں شعاعوں سے دنیائے انسانیت کے قلوب و اذہان منور ہوتے ہیں، اور ان کا زنگ دور ہو جاتا ہے،

اس لحاظ سے انبیائے کرامؑ کی پاکیزہ سیرت اور ان کا مثالی کردار پوری نوعِ انسانی کے لیے روشنی کا عظیم و لافانی منارہ ہے،

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید۔ ۲۵)	ہم نے اپنے رسولوں کو یقیناً کھلے کھلے دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتارتے ہیں تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں۔
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب۔ ۳)	تمھارے لیے اللہ کے رسول میں (ان کی سیرت میں) ایک بہترین نمونۂ عمل موجود ہے۔

دونوں میں مشابہت | اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح آفتاب اپنے تابع سیاروں کو روشن و منور کرتا ہے، اور پوری دنیا کے لیے سامانِ حیات فراہم کرتا ہے، اسی طرح آفتابِ رسالت روحانی کائنات میں جان ڈالتا ہے،

۲۔ جس طرح نیر فلکی ایک نظام کا پابند ہے، جس میں کبھی ردو بدل نہیں ہوتا، اسی طرح رسول کی پوری زندگی خدائی قوانین و ضوابط کی پابند ہوتی ہے، اسی بنا پر انبیائے کرامؑ کی سیرتوں کو "میزان" سے تعبیر کیا گیا ہے،

۳۔ آفتاب کی روشنی اور حرارت اگرچہ خلاقِ فطرت ہی کی بخشی ہوئی ہے

مگر ذاتی ہوتی ہے، اسی طرح رسول اگرچہ منجانب اللہ مبعوث ہوتا ہے مگر اسکی حیثیت مستقل ہوتی ہے، اور وہ ملکۂ نبوت سے عالم انسانی کے سدھار کیلیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے، جس کو سنت کہا جاتا ہے، بعض سنتیں ایسی ہیں جنکا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔

(۴) جس طرح سورج کی روشنی درخشاں اور تابناک ہے، اسی طرح آفتاب رسالت کی ضیا باریاں بھی نہایت درجہ روشن اور منور ہیں،

(۵) جس طرح ہماری مادی کائنات آفتاب کی ضرورت مند ہے، اسی طرح روحانی زندگی نیر رسالت کی محتاج ہے،

(۶) جس طرح آفتاب اپنی تپش اور گرمی سے کرۂ ارض کی گندگیوں کو دور، جراثیم کو ہلاک اور مختلف بیماریوں کا استیصال کرتا ہے، اسی طرح شمس رسالت بھی اپنی نورانی شعاعوں سے روح کی گندگیوں اور اس کی آلائشوں کو دور کرتا ہے، اور انسانی اخلاق کو جلا بخشتا اور گیسوئے انسانیت سنوارتا ہے۔

(۷) جس طرح آفتاب اپنی روشنی اور توانائی کے خزانے مفت لٹاتا ہے اسی طرح آفتاب رسالت بھی مفت ضیا باری کرتا ہے، اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا،

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ

(انعام: ۹۰)

کہدو کہ میں اس (دعوت و ہدایت) پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا، یہ تو سارے جہان کے لیے ایک درس ہے (انعام: ۹۰)

(۸) سورج کے بغیر زندگی کا کاروبار قائم نہیں رہ سکتا، اسی کی بدولت ساری انسانی وحیوانی ضروریات پوری ہوتی ہیں، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اسی طرح انبیائے کرامؑ کی مقدس اور روشن سیرتوں کے بغیر نہ دنیا سے اخلاقی برائیاں دور ہوسکتی ہیں اور نہ قوموں کے فسادات مٹ سکتے ہیں، نہ بین الاقوامی مشکلات کا حل نکل سکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آفتاب رسالت کے بغیر پورا عالم تپتی ہوئی بھٹی اور گرم تنور بن جائے گا جس میں سارے انسان جھلس جھلس کر ختم ہو جائیں گے، جس پر موجودہ دور کی ہلاکت آفرینیاں شاہد ہیں، جس سے پورا عالم انسانیت خطرہ میں پڑ گیا ہے، اور آج دنیا میں اخلاق و روحانیت کا کہیں وجود ہے تو ان ہی پاک سیرتوں کے طفیل ہے۔ اس لیے اگر امید کی کوئی کرن نظر آتی ہے تو اسی اخلاق و کردار کے احیا میں جس کا جدید تہذیب نے خاتمہ کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دو "روشن چراغوں" میں سے کسی ایک کا فقدان بھی زندگی کو جہنم زار بنا دیتا ہے، اس لیے انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ جس شفیق و مہربان ہستی نے انسان کی تمام ضروریات کا اس قدر اہتمام فرمایا ہے، اس کی عائد کردہ شرعی و اخلاقی پابندیوں کو تسلیم اور اپنے آپ کو اس عظیم ہستی کے سپرد کر دیا جائے۔

رسالت ایک مستقل رحمت ہے | جس طرح آفتاب حرارت اور روشنی کا ایک مستقل منبع ہے۔ گرچہ وہ خدائی حکم اور ارادہ کا تابع ہے، اسی طرح رسول بھی حکم الٰہی کے ماتحت ہدایت و نور کا مستقل منبع ہے، اور اس کی حیثیت بہت سے معاملات

میں شارع کی بھی ہے، چنانچہ کتاب اللہ کے بعد اسی کی طرح رسول کے احکام وہدایات یعنی حدیث وسنت واجب العمل ہیں، وہ جو کچھ کہتا ہے خدا ہی کی طرف سے کہتا ہے، وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔

اس کے علاوہ "سراجاً منیرا" کی تشبیہ کے بعض اور اسباب بھی ہیں،

آپ ایک مکمل دین وشریعت یعنی گذشتہ مذاہب میں جو چیزیں تشنہ رہ گئی تھیں یا جنکی اس زمانہ میں ضرورت نہ تھی، اسلام نے ان کو مکمل شکل میں پیش کیا چنانچہ وہ انسانی زندگی کا مکمل ضابطۂ حیات ہے، جس سے اس کا کوئی پہلو بھی باہر نہیں ہے، یہ جامعیت اسلام کے علاوہ کسی مذہب میں نہیں ہے۔

۲۔ قرآن مجید ایک کھلی ہوئی واضح کتاب ہے، جس میں کوئی غموض وپیچیدگی نہیں اس کے متن کی شرح اور اجمال کی تفصیل یا خود قرآن کی آیات سے ہوجاتی ہے یا سنت رسول سے،

۳۔ جس طرح آفتاب غروب ہوجانے کے بعد بھی اس کی روشنی چاند کے ذریعہ منعکس ہوکر کائنات کو روشن کرتی رہتی ہے، اسی طرح رسول کے بعد آپ کے صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمۂ اسلام کے ذریعہ اخلاق وروحانیت کی کائنات منور ہوتی رہتی ہے، اور ہمیشہ ہوتی رہے گی،

سیاست میں اسلام

(۵)

مترجمہ حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دارالمصنفین

تیونس

۱۹۵۶ء میں پروفیسر ہشام شرابی نے پیشینگوئی کی تھی کہ مغربی نظریات اور اسلامی روایات کے تضاد کو حل کرنے میں تیونس تمام عرب ممالک پر سبقت لے جائے گا، اس پیشینگوئی کا باعث وہ قانونی اصلاحات تھیں جنھیں بورقیبہ نے آزادی کے چند ہی مہینوں بعد ۱۹۵۶ء میں نافذ کیا تھا، یہ اصلاحات تعدد ازدواج پر پابندی اور شادی کی عمر بڑھا کر لڑکیوں کے لیے پندرہ اور لڑکوں کے لیے اٹھارہ برس کرنے سے متعلق تھیں، (۱۹۶۴ء میں یہ عمریں اور بڑھا کر علی الترتیب ۱۷ اور ۲۰ کر دی گئیں) طلاق کے قانون کو سخت تر بنا دیا گیا، اس نئی حکومت کے ابتدائی دور میں کچھ اور بھی اہم تبدیلیاں کی گئیں، مثلاً بیرونی ممالک میں رہنے والے باشندوں کی جائدادیں بحق حکومت ضبط کر لی گئیں، اور تمام مسلم اور یہودی مذہبی عدالتوں کا خاتمہ کر دیا گیا، ان اقدامات میں حکومت نے شریعت کا احترام بہرحال ملحوظ رکھا، اس سے

روح اسلام کے خلاف جانے کا کوئی عندیہ ظاہر نہ ہوتا تھا، اسی لیے ۱۹۵۶ء میں یہ امید قائم ہوئی تھی کہ تیونیسیائی قائدین اسلام کی مکمل تجدید و پیروی کا بیڑا اٹھائینگے اور زمانہ کے حالات کے ساتھ اسلام کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے،

۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۱ء کی تعلیمی اصلاحات نے ان توقعات کو اور قوی کردیا، زیتونہ مسجد سے ملحق یونیورسٹی جو بڑی عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی، دینی تعلیم کیلئے تیونس کی جدید یونیورسٹی کا اہم حصہ سمجھی جانے لگی، اس کے نصاب میں اسلامی تعلیمات کے علاوہ دوسرے مذاہب کا تقابلی مطالعہ، تاریخ، جغرافیہ، جدید زبانیں، عمرانیات، معاشیات کے مضامین بھی شامل تھے، یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو سرکاری اسکولوں میں دینی امور کی تدریس کے لیے مقرر کیا جاتا تھا، محکمۂ تعلیمات نے ایک حکم جاری کیا کہ دینی تعلیم کے درجات میں ایسا۔ روحانی ماحول ہونا چاہیے جو طلبہ کو مذہب کی اہمیت و کردار سے صحیح طور پر واقف کرا سکے، اور اساتذہ کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ حفظ کے طلبہ کلام مجید کے مفہوم کو پوری طرح سمجھکر حفظ کریں، ان کے اساتذہ کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ طلبہ میں قرآن کی محبت وچاشنی پیدا کریں اور مذہبی رسوم میں غیر ضروری نمائش کے خطرات سے واقف ہوں، انھیں بتانا چاہیے کہ عبادت ہی وہ ذریعہ ہے جس سے کسی شخص کی انفرادیت سماج میں مکمل ہوتی ہے، مذہبی معاملات میں بحث ومناظرہ سے دور رہنا چاہئیے، تمام بنی نوع انسان کے لیے اخوت و رواداری کا جذبہ فروغ دینا چاہیے،

حالیہ چند برسوں میں زبردست سماجی اور معاشی انقلابات نے تیونس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، اس دوران میں کچھ مزید مذہبی تبدیلیاں نافذ کی گئیں

صدر بورقیبہ روایتی لباس خصوصاً برقعہ سے سخت بیزار تھے، انھوں نے یہ بھی کہا کہ رمضان کا احترام تو کرنا چاہیئے لیکن اسے کسی پر اس طرح مسلط نہ کرنا چاہیئے جس سے دوسرے فرائض کی انجام دہی متاثر ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ روزہ نہ رکھنے کا بہانہ ڈھونڈھتے تھے، انھیں اب آزادی حاصل ہوگئی، بورقیبہ نے یہ بھی کہا کہ جس میں قربانی کرنے کی استطاعت نہ ہو اس کے لیے عیدالضحیٰ کے موقعہ پر قربانی ضروری نہیں، بقرعید میں جو اسراف اور نمایش ہوتی تھی ملکی اخبارات نے اس پر بھی شدید نکتہ چینی کی، تیونس کے محدود زرمبادلہ کو بچانے کیلیے بورقیبہ نے عازمین حج کو مشورہ دیا کہ وہ کسی مقامی بزرگ بالخصوص قیروان میں صحابہ کے مزارات کی زیارت کر لیا کریں، شروع شروع میں بزرگوں کی یادگاریں ہونے والی تقریبات کو حکومت معاندانہ نظر سے دیکھتی رہی، مگر بعد میں رواداری برتنا شروع کر دی، سرکاری طور پر صوفیانہ نظریات کی حوصلہ شکنی لیکن بیرونی سیاحوں کی دلچسپی کے لیے رقص و سرود کی تقریبات کی ہمت افزائی کیجاتی ہے، اور اسکے جواز میں یہ دلیل پیش کیجاتی ہے کہ قوم کا فنون لطیفہ کا سرمایہ ضائع نہ ہونے پائے، ۱۹۶۵ء میں حکومت نے سرکاری کاموں میں مذہبی تاریخوں کا استعمال منسوخ کر دیا اور رفتہ رفتہ قوم کی مذہبی زندگی ارباب حکومت اور سیاسی پارٹیوں کے کنٹرول میں آتی گئی،

اب دینی تعلیم کے لیے پرائمری اور ثانوی درجات تک تیونسی مصنفین نے نئی درسی کتابیں تیار کی ہیں، امام کا منصب ۱۹۵۶ء ہی میں ختم کر دیا گیا تھا، اب وہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے سکریٹری کے ماتحت مخصوص قانونی حیثیت رکھتے ہیں

اور اب انھیں امام کے بجائے واعظ کہا جاتا ہے۔ ان کے فرائض میں عبادتوں کا اہتمام اور مسجدوں کا انتظام ہے، قومی بہبود کے موضوعات پر تقریریں کرنا اور قومی تعلیم و ثقافتی امور کے سکریٹریوں کی دیکھ بھال بھی ان کے فرائض میں ہے۔ حال ہی میں بہت سی نئی مسجدیں تعمیر کی گئی ہیں، صدر بورقیبہ کا خیال ہے کہ ان مسجدوں کو اجتماعی مرکز کی حیثیت سے استعمال کیا جائے اور قومی بہبود سے متعلق سارے کاموں میں لوگ مسجد میں جمع ہوا کریں۔

موجودہ برسر اقتدار پارٹی اپنے اصولوں کو دستوری سوشلزم کا نام دیتی ہے، مگر اسی کے ساتھ اخلاقی قدروں کی حمایت کی بھی دعویدار ہے۔ ان اصولوں کے علمبرداروں نے ایک خاص نظریہ کو جنم دیا ہے، جسے وہ اسلام کے نام پر نافذ کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ اسلام کو اس کا صحیح مقام حاصل ہو سکے گا، ہر اعتدال پسند اور ذی شعور انسان کی زندگی میں سب سے ضروری چیز اس کے ضمیر کا اخلاقی احساس ہے، اس احساس ہی کے ذریعہ وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں بمقام جہدیہ ایک مذہبی تقریب میں صدر بورقیبہ نے اپنے عقیدہ کی تشریح ان الفاظ میں کی تھی:۔

> "میں تمام عمر اس کا قائل رہا ہوں کہ روحانیت کو مادہ پرستی پر فوقیت ہونی چاہیے، میرا یہ عقیدہ ہے کہ حق یقیناً فتحیاب ہوتا ہے، اور انسان اپنی روح کی گہرائیوں سے موجودہ کو آیندہ (آخرت) کے لیے قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اور شر کے مقابلہ میں ہمیشہ خیر میں اپنے کو جذب کرنا چاہتا ہے وہ روحانی قدروں کو اپنا رہنما بناتا ہے، کیونکہ یہی چیز دنیا میں اس کی عزت

اور آخرت میں نجات کا وسیلہ بنتی ہے۔"

ہم نے پروفیسر شمرابی کی جس پیشین گوئی کا اوپر حوالہ دیا ہے، اس کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تیونس نے ۱۹۵۵ء میں اسلام اور مغربی تجدد کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کا جو دعویٰ کیا تھا، اسے کسی حد تک پورا بھی کیا ہے، اس سوال کا جواب یقینی طور پر نفی میں ہے، جیسا کہ درج ذیل اسباب سے ظاہر ہے،

۱۔ ترکی کی طرح تیونس بھی کسی نہ کسی طور پر دنیائے عرب سے اپنے رشتے منقطع کر چکا ہے، اور مذہب سے اب اس کا کوئی خاص تعلق باقی نہیں ہے، عرب دنیا کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے اسلامی خیالات کا تیونس میں داخلہ بہت ہی محدود ہے، اور اگرچہ تعلیم میں عربی طرز کو اعتدال پسندی کے ساتھ اپنایا جا رہا ہے، لیکن تیونیسی عوام اپنی ذہنی جلا کے لیے یورپ ہی کی طرف دیکھتے ہیں، بورقیبہ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ ان کے ملک کا مستقبل یورپ سے وابستہ ہے،

۲۔ موجودہ دور میں تیونس میں کوئی عظیم دینی مفکر پیدا نہیں ہوا، جو اسلام کو ایسے رنگ میں پیش کرتا جس سے غربت کے خلاف جدوجہد کو جاری رکھا جا سکتا، اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی عقائد کو بھی تقویت پہنچتی۔

۳۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ "دستورین سوشلسٹ پارٹی" نے مذہب کو اپنے کنٹرول میں لے لیا ہے، اور اس سے اس کا مقصد دینی فروغ نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ سے عوام کو موجودہ حکومت کے نظریات سے ہم آہنگ کرنا ہے، اصلی اسلام اگرچہ غیر تغیر پسند ہے، لیکن آج بھی قومی شیرازہ بندی کا اصل ذریعہ یہی ہے

اس لیے حکمراں جماعت کے ارکان متفکر ہیں کہ کس طرح مذہب کی اصل روح کو برقرار رکھکر اس کو خطرات سے بچایا جائے، اور دور جدید میں اسے کس حد تک ترقی یافتہ بنایا جائے کہ وہ قوم کی ترقی میں مدد ومعاون ثابت ہو سکے، اس لیے ان لیڈروں کی نظر اسلام کو ایک منفی قوت کے طور پر استعمال کرنے پر ہے، وہ اس نئے اسلام کی کوئی واضح تشریح بھی نہیں کرتے، جس سے لوگوں میں تجدد کا جذبہ فروغ پا سکے، یہاں ہمیں مغربی مفکر آرنالڈ ہسٹنگر کی دوربینی کا قائل ہونا پڑتا ہے، وہ کہتا ہے:-

"مذہب کا صحیح استعمال ایک ایسی طاقت ہے جو آگے بڑھنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، کوئی بھی مذہب منفی قوت نہیں ہو سکتا اگر وہ بحیثیت ایک مذہب کے اپنی طاقت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔"

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تیونیسی عوام کے موجودہ مذہبی رجحانات کا یہ تجزیہ محض عارضی اور وقتی ہے، ہو سکتا ہے کہ آج کا دور جس میں مختلف عناصر کارفرما ہیں اور سماجی ڈھانچہ کو سدھارنے کے لیے لوگ آگے بڑھ رہے ہیں، اسی دور میں سے انجام کار مسلمانوں کے عقیدہ کی ایک نئی تشریح یا ایک نیا رخ جنم لے لے۔

تیونس نئے افکار کی سرزمین ضرور ہے، لیکن یہ افکار کسی ذہنی عمل کا نتیجہ نہیں ہیں تیونس کی موجودہ تاریخ عاقبت اندیش اور بامقصد تغیرات کی حامل ہے۔ حال ہی میں ایک نوجوان تیونیسی عالم نے یہ اعلان کیا ہے کہ عالم اسلام کی ایک نئی حکومت قائم کیجائے، جس کے ہاتھ میں صرف دینی اور روحانی طاقت ہو، اس اعلان کو اخبارات اور ٹیلی ویژن پر جس قدر شوق سے پڑھا اور سنا گیا اس سے عوام کے رجحانات کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسی عالم نے یہ بھی کہا کہ اسلام کے انداز فکر و عمل پر

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایسی مہر لگ گئی تھی کہ ان کی مزید تشریح نہیں کی جاسکی، لہٰذا ان کو ناقابلِ تغیر سمجھنا چاہیئے۔ اور اسلام کے قدیم اصولوں کو موجودہ تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بنانے کی ضرورت ہے،

تیونس اسلام میں تبدیلیاں لانے کی حامی ایک عظیم شخصیت کا وطن بھی ہے، یہ شخص پروفیسر محمد طلبی ہے، انھوں نے سنہ ۱۹۷۰ء میں بمقام پیرس تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ عالمِ اسلام کے مذہبی تغیرات سے ہمیں بہت زیادہ پُر امید نہیں ہونا چاہیے، ان کے خیال کے مطابق اسلام میں بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی بہت گنجایش ہے، لیکن اگر کوئی موثر اصلاح کرنا چاہے تو اسلام کے متبعین کو شدت کے ساتھ اس کی تقلید کرنا چاہیے، تقریر کے خاتمہ پر انھوں نے مزید کہا کہ وہ مذہب جو ہمارے اندر روحانی خلفشار نہ پیدا کرسکے یا ہم کو نئے اقدار کا متلاشی نہ بنا سکے' نئے معیارات کی طرف مائل نہ کرسکے، جو ہمیں نقطۂ عروج تک نہ پہنچا سکے کسی طرح بھی مذہب کہے جانے کے قابل نہیں،

(پادری آر بارسٹن اسپیٹ، تیونس)

اسلام کا سیاسی نظام

اس میں کتاب وسنت کی روشنی میں اسلامی سیاسی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے، اٹھارہ ابواب ہیں جن میں نظریۂ خلافت مجلس تشریعی، طریقۂ قانون سازی حقوق رعایا بیت المال، احتساب، حرب ودفاع، خارجی معاملات وغیرہ، قریب قریب اسلامی دستور کے تمام اصولی اور اساسی پہلوؤں آگئے ہیں، آخری باب سیاست کے غیر اسلامی نظریات سے متعلق ہے جس میں موجودہ سیاسی نظریات پر مختصر مگر جامع بحث کی گئی ہے، ضخامت ... صفحے، قیمت چھ روپے۔

منیجر

مقالہ نما

مضامینِ "الندوہ"

از سلمان شمسی ندوی

عرصہ سے خیال تھا کہ معارف کے مضامین کا مقالہ نما مرتب کرایا جائے، اگر ابھی یہ کام شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک نوجوان ندوی فاضل سلمان شمسی نے الندوہ کے مضامین کا مقالہ نما مرتب کر دیا، الندوہ اپنے دور کا ممتاز علمی رسالہ تھا، اس میں اس عہد کے نامور اہل علم کے مضامین شائع ہوتے تھے، اور اس میں علمی مضامین کا بڑا ذخیرہ ہے، اب الندوہ کی یاد بھی فراموش ہو چکی ہے، اس لیے اہل علم کے استفادہ کے لیے اس کا مقالہ نما شائع کر دینا مناسب معلوم ہوا، میں نے عزیز موصوف سے خواہش کی ہے وہ معارف کا مقالہ نما بھی مرتب کر دیں، امید ہے کہ وہ اس کو قبول کریں گے۔ "م"

جوں جوں تحقیق کا کام وسیع ہوتا جا رہا ہے، اس سے متعلق وسائل و معلومات کے طریقۂ کار کو بھی وسعت دی جا رہی ہے، موجودہ علمی اور ادبی طریقۂ کار میں مقالہ نما (Bibliography) کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور اسی اہمیت کے پیش نظر انگریزی رسالوں نے بڑے اہتمام سے اس طریقہ کو اختیار کیا، اور قدیم و جدید رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کے مقالہ نما شائع کیے۔

اردو میں سب سے پہلے اس مفید کام کی ابتدا "نوائے ادب" بمبئی نے کی جسے

بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس کی تقلید ہند و پاک کے بہت سے رسالوں نے کی،

خیال ہوا کہ "الندوہ" جو اپنے وقت کا وقیع علمی رسالہ تھا، اس کے مضامین کا مقالہ نما تیار کیا جائے، جو ہمارے محققین کے لیے یقیناً مفید ثابت ہوگا، اسی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کام کو شروع کیا گیا جو ہدیۂ ناظرین ہے،

الندوہ پر کئی دور گذرے اور اس کی سرپرستی بھی کئی شخصیتوں نے کی، سب سے پہلے ۱۹۰۴ء میں علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی سرپرستی میں شائع ہونا شروع ہوا جس کا سلسلہ ۱۹۱۰ء تک جاری رہا، پھر کچھ وقفہ تک بند رہنے کے بعد ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک اکرام اللہ خاں ندوی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا اور دو سال کے بعد بعض حالات کی وجہ سے دوبارہ بند ہوگیا، تیسری بار فروری ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء تک مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور مولانا عبد السلام قدوائی کی ادارت میں شائع ہوا،

افسوس ہے کہ اس کی فائلیں پوری طرح محفوظ نہ رہ سکیں، چنانچہ اس مقالہ نما کی تیاری میں بھی بعض پرچے نہیں مل سکے، یہ مقالہ نما کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ فائلوں سے تیار کیا گیا ہے، محققین کی آسانی کے لیے مضامین کو پہلے موضوعات کے لحاظ سے تقسیم کر دیا گیا ہے، تاکہ مضمون نگار کو اپنے موضوع سے متعلق مواد مل سکے، ترتیب مضمون نگار کے نام سے حروف تہجی کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے،

مقالہ نما مندرجۂ ذیل موضوعات پر منقسم ہے،

۱۔ علمی مباحث ۲۔ تحریکیں اور درسگاہیں ۳۔ عربی مدارس کے مسائلِ تعلیم

۴۔ تنقید و تبصرہ ۵۔ سماجیات ۵۔ شخصیات ۶۔ ادبیات

۷۔ دینی مباحث ۸۔ تاریخی مباحث ۹۔ اخلاقیات ۱۰۔ علوم قدیمہ ۱۱۔ متفرقات۔

علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہما کے اکثر مضامین جو الندوہ میں شائع ہوئے تھے، کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، اس "مقالہ نما" میں ان سے بھی استفادہ کرنے میں مدد ملے گی۔

مقالہ نما تیار کرتے وقت کوشش کی گئی ہے کہ مضمون کے کسی ایسے حصہ کا اقتباس لیا جائے جس سے مرکزی خیال کا پتہ لگ سکے۔ دوسرے یہ کہ اس خیال کو خود مضمون نگار کے الفاظ میں پیش کیا جائے لیکن جہاں ایسا ممکن نہیں ہو سکا ہے، وہاں مرتب نے اپنے الفاظ کو استعمال کیا ہے، بعض مضامین کے بارہ میں صرف اس کے عنوانات سے اندازہ ہو سکتا ہے، اس لیے صرف عنوان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ مقالہ نما کتب خانہ ندوۃ العلماء کے محفوظ فائلوں پر مشتمل ہے اس لیے مجلدات کا حوالہ نمبر بھی دیدیا گیا ہے، تاکہ محققین کو استفادہ کرنے میں آسانی ہو سکے،

خدا کرے یہ سعی قابلِ قبول ہو۔ "مرتب"

علمی مباحث

(۱) اکرام اللہ خاں (ص ۳۰ - ۳۲ اپریل ۱۹۱۶ء حوالہ ۲۸۶)

"اہل یونان کے معبود اور ان کے مذہبی اوہام"

اہل یونان نے قوت تخئیل کی بلند پروازی سے ہر معبود کے لیے خاص خاص صورتیں فرض کر لی تھیں، ان کے لیے حسن وجمال بھی تسلیم کیا جاتا تھا، اور یہ خیال تھا کہ وہ نہایت خوبصورت اور انسانی حسن وجمال کا مظہر ہوتے ہیں، ان کے معبود مرد بھی ہوتے تھے اور عورتیں بھی، آخر الذکر کو نسوانی حسن وجمال کا بہترین نمونہ فرض کیا جاتا تھا،

(۲) ص ۲۷ - ۳۲ - جنوری ۱۹۱۵ء، حوالہ ۲۸۵

" ایام جاہلیت میں کس سنہ کا رواج تھا"

اس کی تحقیق کی گئی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں میں کوئی سنہ رائج تھا یا نہیں، اور تھا تو کونسا سنہ تھا، آخر میں جاہلیت کے جداول بھی دیے گئے ہیں،

(۳) ص ۱ - ۱۱ - اگست ۱۹۱۵ء، حوالہ ۲۸۵

" سکہ کا رواج اور اس کی تدریجی تاریخ، مختلف ملکوں کے سکوں پر محققانہ مقالہ،

سکہ کے متعلق تاریخی تحقیقات کے لیے سب سے پہلے چین کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ چین عہد گذشتہ میں تمدن و شائستگی کا سرچشمہ اور معارف و صنائع کا مرکز رہ چکا ہے، اور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تاریخ عالم میں نہایت ممتاز درجہ رکھتا ہے، چین میں ایسے سکوں کا پتہ چلا ہے جن میں سنہ مسیحی سے دو ہزار دو سو پچاس پہلے کی ضرب موجود ہے،

(۴) ص ۲ - ۸ - جولائی ۱۹۱۶ء - حوالہ ۲۸۶

فن تحریر اور تصنیف کی تدریجی ترقی کا محققانہ جائزہ -

یہ عجیب بات ہے کہ فن کتابت نے ہماری تاریخ اور قومی روایات کو محفوظ رکھکر ہمارے ہاتھوں تک پہنچایا ہے، لیکن خود کتابت کی تاریخ آجتک نہیں معلوم ہو سکی، اور یہ قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کتابت نے سب سے پہلے کس قوم اور کس سنہ میں رواج پایا، کیونکہ اکثر قومیں اس فضیلت کو اپنی طرف منسوب کرتی ہیں،

(۵) ص ۱۷ - ۲۶ - ستمبر ۱۹۱۲ء - حوالہ ۲۸۴/۱

" فن تصویر اور مسلمان"، اس میں تصویر کی تاریخ، قدیم قوموں میں اس کے رواج

اور مسلمانوں میں اس کی ترقی پر بحث کی گئی ہے، اسلام میں تصویر کشی حرام ہے، اس لیے مسلمانوں نے اگرچہ مستقل فن تصویر کی طرف توجہ نہیں کی تاہم آثار قدیمہ کے مطالعہ اور تفحص و تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس فن سے بیگانہ نہ تھے، .... چنانچہ انھوں نے اپنے عروج و ترقی کے زمانہ میں بغداد، قرطبہ، طلیطلہ، غرناطہ اور اشبیلیہ میں حیوانات کی مورتیں اور سواروں کے اسٹیچو جابجا نصب کیے تھے .... اگرچہ قدیم زمانہ کی نادر طبی تحقیقات موجود نہیں ہیں، لیکن گمان غالب ہے کہ مسلمانوں نے جب یونانی و فارسی طبی کتابوں کا ترجمہ کیا تو بعض اعضائے انسانی کی تصویریں بھی دیں،

انصاری، محمد اقبال وارث ندوی :-

(۱) "افلاطون کا نظریۂ تعلیم" (ذی الحجہ ۱۳۶۰ھ، محرم ۱۳۶۱ھ، ربیع الاول ۱۳۶۱ھ) حوالہ $\frac{۲۸۰}{۲}$

الوزر محمد صاحب ندوی :-

(۱) "کتب خانہ ندوۃ العلماء کے مخطوطات" (ص ۲۸ - ۳۱ - اپریل ۱۹۴۲ء حوالہ $\frac{۲۸۰}{۱}$)

کتب خانہ ندوۃ العلماء کے چند اہم مخطوطات کا تعارف و تذکرہ۔

اویس محمد ندوی صاحب (مولانا) : (ص ۷-۱۵، جون ۱۹۴۰ء، حوالہ ۲۸۶)

(۱) "منطق استقرائی اور مسلمان"

اس وقت جبکہ یورپ اپنے لیے ایک خاص نظام استدلال کی تلاش میں ہر طرف تشنہ لب دوڑ رہا تھا، ٹھیک اسی وقت مسلمانوں کے یہاں علم و فضل کے دریا لہریں لے رہے تھے، ہر چیز عقل و فہم کی روشنی میں دیکھی جا رہی تھی، ہر بات دلیل کی ترازو میں تولی جاتی تھی، اور اصول و قانون میں قیاس کے ماتحت استقراء کا مکمل نظام تیار ہو چکا تھا جس کا خود محققین یورپ کو ..... اعتراف ہے۔

پی نیر ا:-

"جدید علم فلک کا ایک صفحہ" } (ص ۱۶ - ۳۰، مئی ۱۹۱۵ء

آفتاب اور سیارات - عمل اور رد عمل } حوالہ ۳۸۵)

زمین مع اپنے گرد چکر کرنے والے آفتاب کے تمام کائنات کا مرکز ہے، یہ مقبول خیال عام صرف علمائے طبیعیات و فلکیات کی مسلسل کوششوں سے مغلوب ہوا ہے، مگر اس سلسلہ میں جو یادگار مباحث ہوئے ہیں، اس وقت ہم اس پر تبصرہ نہیں کریں گے، بلکہ صرف ان کے نتائج قلمبند کریں گے۔"

زینبی سید علی (مولانا) (جولائی تا دسمبر ۱۹۱۴ء - حوالہ نمبر ۲۸۴/۱)

ا۔ "فن بلاغت":-

فن بلاغت کی مکمل تاریخ، اس کی تدریجی ترقی، عربیت میں اس کا مقام، اس کے مشہور اہل کمال، ان کی مشہور تصنیفات اور فن بلاغت سے متعلق مباحث کا تذکرہ۔

سلیمان ندوی سید (علامہ): (شمارہ مارچ ۱۹۰۹ء تا ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ، حوالہ ۲۷۹/۹)

ا۔ "اسلامی رصد خانے"۔ مسلمانوں کے قائم کردہ رصد خانوں کی تاریخ۔

اسلامی رصد خانوں کی تاریخ سخت تاریکی میں ہے، "دائرۃ المعارف" کو چھوڑ کر خود انہوں (ابن خلدون) کو بھی ان کی واقفیت نہیں، اس لیے ان پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے، "سب سے قدیم رصد خانہ جس کا تاریخ میں ذکر ہے، متون کا رصد خانہ ہے، جو ۴۳۲ برس قبل حضرت مسیح قائم کیا گیا تھا، اسی رصد خانہ میں سب سے پہلے مدار شمسی کی تعیین کی گئی، اور اس آلہ کا استعمال ہوا جس کو قائمۃ "ہیلومیٹر" کہتے ہیں، اس کے بعد تیموخارس، ستالاوس، ابرخس نے رصد خانے قائم کیے، لیکن مسلمانوں سے پہلے سب سے مشہور

اسکندریہ کا وہ رصدخانہ ہے جس کا مہتمم بطلیموس تھا،

(۲) "اوس وخزرج" (ص ۲-۷۔ شمارہ اگست ۱۹۱۶ء۔ حوالہ ۲۸۷)

اوس وخزرج عرب کے دو مشہور قبیلوں کے نام ہیں، جو اسلام کے پہلے سے مدینہ میں سکونت پذیر تھے، اسلام آیا تو وہ اس کے پرزور دوست وبازو بن گئے، انصار ان کا لقب تھا، عام طور سے ان کو بھی قحطانی الاصل اور کہلان کا ایک خاندان قرار دیا گیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ رائے بھی صحت سے تہی مایہ ہے، زبان، مذہب اور اخلاق قومی کے علاوہ روایات سے بھی ان کے اسمٰعیلی ہونے پر مستحکم دلائل ہیں،

(۳) "شیراز ہند پورب" شمارہ فروری، مارچ، اپریل مئی ۱۹۲۱ء۔ حوالہ ۲۸۰/۲)
"مشرقی ہند کی علمی تاریخ کا جائزہ"۔ "حیات شبلی کے بعض حصے"

(۴) "طبقات الارض اور مسلمان" (ص ۱۷-۲۳ شمارہ اکتوبر ۱۹۰۸ء، حوالہ ۲۶۹/۴)
طبقات الارض (جیالوجی) وہ علم ہے جس میں زمین کی تاریخ۔ پیدائش، ترکیب، شکل خواص، طبقات اور پہاڑوں کی پیدائش سے بحث کی جاتی ہے، اس مضمون میں طبقات الارض کے ایک خاص مسئلہ یعنی زمین اور پہاڑ کی پیدائش پر بحث ہے جس سے یہ معلوم ہوگا کہ مسلمان طبقات الارض کے مبادی سے واقف تھے، اور اس عام خیال کی تردید ہوگی کہ مسلمان طبقات الارض سے واقف نہ تھے،

(۵) "عربیت اور ہندوستان" یعنی ہندوستان میں عربیت کی تاریخ۔

(شمارہ ذیقعدہ وذی الحجہ ۱۳۲۲ھ حوالہ ۲۶۹/۱)

ہندوستان کی چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے علما، ومشائخ کے تذکرے پڑھنے اور ان کی اجازات وسندات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ فن ادب سے بھی

الال تھے، حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا قدس سرہ العزیز نے، اپنے زمانہ طالب علمی میں تمام مقامات حریری از بر کر لیے تھے، حضرت بدرالدین اسحاق خلیفہ و داماد حضرت فرید الدین گنج شکر قدس سرہما نے ایک کتاب علم الصرف میں "تصریف بدری" نامی لکھی تھی، اس کے آخر میں بطور خاتمہ نثر و نظم میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی زبان پر پورا قابو رکھتے تھے۔

(۶) "علم ہیئت اور مسلمان": (شمارہ اپریل ۱۹۱۰ء و اگست ۱۹۱۰ء۔ حوالہ ۳۴۹/۲)

دنیا کے تمام علوم و فنون کا وجود مدبرین عالم کی دماغ سوزیوں کا نتیجہ ہے، صرف علم ہیئت اپنے وجود میں ایشیا کے صحرا نشین چرواہوں کا ممنون احسان ہے، جو ایشیا کے کھلے میدانوں میں اپنی پرمصیبت راتیں اختر شماری میں بسر کرتے اور بے شغلی سے گھبرا کر صفحۂ افلاک کا مطالعہ شروع کر دیتے تھے، اس غور و مطالعہ سے ان کو ستاروں کی ہر سطر میں یہ عبارت آنے لگی کہ اس دائرۂ افلاک کا ہر نقطہ کوکب ایک مستحکم قانون کی سطح پر ساکن ہے یا حرکت کرتا ہے، کواکب کا سکون و حرکت ہماری زراعت پر خاص اثر کرتی ہے، ان ستاروں کا تغیر و تبدل کسی خاص اصول پر ہے،

(۷) مدین: (شمارہ مارچ ۱۹۱۵ء، ص ۳ - ۲۰، حوالہ ۲۸۵)

نسل ابراہیمی کا سرخیل مدین تھا جس نے اپنے بھائی اسماعیل کے قریب مدین نامی آبادی قائم کی، یہ مدین شمالی مغربی عرب میں جزیرہ سینا کے متصل طولاً خلیج عقبہ "عیلانہ" کے سواحل پر از دہانہ خلیج تا حد ساحل بحر احمر و ارض ثمود و حجاز جہاں ثمود و جرہم و عرب اسماعیل آباد تھے، واقع تھا۔

(۸) "مستشرقین یورپ"، قدیم مستشرقین کا تعارف اور ان کی علمی خدمات کا جائزہ، (شمارہ جولائی تا نومبر ۱۹۱۱ء۔ حوالہ ۲۷۹/۸)

مستشرقین یورپ نے اسلام اور عربیت پر جو بے انتہا احسانات کیے ہیں، ان کے شکریہ کا بارگراں چند مختصر مضامین سے نہیں ہو سکتا، ذیل کے چند مسلسل نمبروں میں ان کے احسانات کے اعتراف میں ان کے کارناموں کا مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ اس مضمون کا ماخذ "الآداب العربیۃ فی القرن التاسع عشر" ہے

شبلی نعمانی علامہ :-

(۱) بھاشا زبان اور مسلمان: ص ۱-۱۲، شمارہ اکتوبر ۱۹۰۶ء، حوالہ ۲۷۹/۳

اس مضمون میں دکھایا گیا ہے کہ ترجمہ اور اشاعت کے علاوہ مسلمانوں نے خود بھاشا زبان میں کیا کیا تصنیفات کیں، اور بھاشا کی شاعری میں کس درجہ کا کمال پیدا کیا، عام طور پر مشہور ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے بھاکا زبان میں شعرو شاعری کی وہ حضرت امیر خسرو ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ کا پتہ آگے تک چلتا ہے۔

(۲) عربی زبان، یعنی سامانی زبانوں کی خصوصیات اور عربی، سریانی اور عبرانی کی قدامت پر مختصر بحث: (شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ، حوالہ ۲۷۹/۱ ص ۲۴-۲۷)

دنیا میں یوں تو سیکڑوں ہزاروں زبانیں مروج اور مستعمل ہیں لیکن سب کی اصل الاصول صرف تین زبانیں ہیں، ایک سامی جو سام بن نوح کی طرف منسوب ہے، اس زبان سے جو زبانیں پیدا ہوئیں وہ عربی، عبرانی، سریانی، کلدانی، نبطی وغیرہ ہیں،

(۳) "علوم جدیدہ" - قدیم و جدید کو سامنے رکھکر علم کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے۔

(شمارہ جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ، ص ۳۸-۴۲ - حوالہ ۲۷۹/۱)

علوم جدیدہ کے مسائل بعض ایسے ہیں جو پہلے بھی موجود تھے، لیکن آج انکی تشریح جس طرح کیجاتی ہے اگلوں نے نہیں کی تھی، اس سلسلہ کی ابتدا اسی قسم کے ایک مسئلہ سے کیجاتی ہے، کیونکہ اس سے

قدیم وجدید کے موازنہ کا موقع بخوبی مل سکتا ہے۔"

(۴) عمر خیام کا جبر و مقابلہ۔ (ستمبر ۱۹۰۹ء، ص ۵-۷، حوالہ ۲۷۹/۶)

عمر خیام کو ہم جس حیثیت سے جانتے اور پہچانتے ہیں وہ یہ تھی کہ وہ شاعر ہے، رباعی گو ہے، اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ آجکل کے مذاق کے موافق آزاد خیال ہے، تاریخوں اور تذکروں میں اسکی ریاضی دانی کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن ہمارے خیال میں وہ اس قسم کی بات تھی کہ علامہ ابن ہمام شارح ہدایہ موسیقی بھی جانتے تھے، لیکن یورپ کی بدولت آج ہم کو عمر خیام کی وہ کتاب ہاتھ آئی جس سے ریاضی داں اعظم ہونے کا ثبوت ملتا ہے،

(۵) فن بلاغت، اس کے موجد مسلمان تھے۔ (رمضان ۱۳۲۲ھ ص ۲۷-۳۰- حوالہ ۲۷۹/۱)

مسلمانوں نے جو علوم و فنون خود ایجاد کیے اور جن میں وہ کسی کے مرہون منت نہیں ہیں، انہیں ایک یہ فن بھی ہے، عام خیال یہ ہے، اور خود ہم کو ایک مدت تک یہ گمان رہا کہ یہ فن بھی مسلمانوں نے یونانیوں سے لیا، لیکن اب اس خیال کی غلطی علانیہ ثابت ہوگئی۔

(۶) مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی۔ (رمضان ۱۳۳۳ھ۔ ص ۱-۱۴، حوالہ ۲۷۹/۲)

مسلمانوں نے ہندوؤں کے علوم و فنون کو جس ذوق و شوق سے سیکھا اور ان میں جو مہارت حاصل کی اس کو ہم نے اپنی کتاب تراجم میں تفصیل سے لکھا ہے،....... ابو معشر فلکی نے ہندوستان میں رہ کر جس طرح سنسکرت کے علوم و فنون حاصل کیے، ابوریحان بیرونی نے سولہ برس کی مدت میں سنسکرت میں کمال پیدا کیا اور ہندوں کے علوم و فنون پر مبسوط کتاب لکھی ....

یہ واقعات ہمارے ہندو دوستوں کے کانوں تک نہیں پہنچے لیکن مسلمانوں کی علمی انجمن کے پارینہ افسانے ہیں، اور اس لئے ہم ان کو دوہرانا نہیں چاہتے۔

(باقی)

باب التقریظ والانتقاد

تفسیر ماجدی حصہ دوم

از جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۷۷ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۱۷، غیر مجلد ۱۵، پتہ: (۱) صدق جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنؤ (۲) دار المصنفین، اعظم گڈھ (۳) کوثر ایجنسی، چھتہ بازار، حیدرآباد، دکن۔

تفسیر ماجدی کے پہلے حصہ پر معارف میں ریویو ہوا تھا، اس کا دوسرا حصہ بھی جو سورۂ نساء سے لیکر سورہ توبہ تک کی تفسیر پر مشتمل ہے، عرصہ ہوا شائع ہوگیا تھا، مگر ہماری نظر سے نہیں گزرا تھا، اب اس کا دوسرا اڈیشن ریویو کیلئے آیا ہے، اس کے پہلے حصہ کے ریویو میں ہم نے اس کی خصوصیات کا ذکر کیا تھا، اس حصہ میں بھی وہی خصوصیات ہیں، ان کو سمجھنے کے لیے چند باتوں کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے،

ہر زمانہ کا ذوق اور اس کے خیالات و رجحانات، اس زمانہ کے علوم و اکتشافات اور علمی و عقلی معیار کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، اس لیے ہر دور کے مفسرین نے اپنی اپنی تفسیروں میں ان کا لحاظ رکھا ہے، اور ان کی روشنی میں تفسیریں لکھی ہیں، اس لیے وہ اپنے اپنے زمانہ کے ذہن و دماغ کی تشفی کے لیے بالکل کافی ہیں، اب زمانہ کا قدم بہت

آگے بڑھ گیا ہے، ہر چیز علمی و عقلی معیار سے جانچی جاتی ہے، اس لیے ایسی تفسیر کی ضرورت تھی جو اس دور کے معیار پر پوری اتر سکے اور موجودہ ذہن و دماغ کی تشفی کر سکے، چنانچہ اس زمانہ میں بعض ایسی تفسیریں لکھی گئی ہیں، ان میں مولانا ابوالکلام کے ترجمان القرآن کا مقدمہ بہت اہم ہے، گو اس میں کلام مجید کی پوری روح اور اس کی تعلیمات کا جوہر آ گیا ہے، لیکن وہ صرف سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے، باقی حصہ صرف تشریحی ترجمہ ہے، اس میں بھی کہیں کہیں مفید بحثیں آ گئی ہیں، اسی نہج پر پورے کلام مجید کی تفسیر کی ضرورت تھی، اس ضرورت کو تفسیر ماجدی نے پورا کیا ہے،

کلام مجید اصلاً رشد و ہدایت کا صحیفہ ہے، اس کا مقصد انسانوں کی ہدایت و رہنمائی اور ان کا اخلاقی و روحانی تزکیہ ہے، اس لیے اس کا مقصود بالذات ان سے متعلق تعلیمات اور احکام و ہدایات ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اس کی قدرت و ربوبیت کے ثبوت کے لیے کائنات کی خلقت، اس کی حکمتوں، اس کے فوائد، اس کے بے نظیر نظام اور انسانوں کی عبرت و بصیرت کے لیے گذشتہ انبیاء و رسل اور قدیم اقوام و ملل کے سبق آموز واقعات کا بکثرت ذکر ہے، اور ان پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، طبیعیات، حیاتیات، نباتات بہت سے علوم کی بنیادیں ملتی ہیں، مگر ان کا مقصد عبرت و بصیرت ہے، اس لیے کلام مجید کا انداز بیان علمی و فنی کے بجائے سبق آموزی کا ہے، اور صرف اسی حد تک جس حد تک اس مقصد کے لیے ضروری ہے، چنانچہ اس نے ان کا ذکر اپنے عہد کے رائج اور متعارف خیالات کے مطابق کیا ہے، مگر یہ اس کا اعجاز ہے کہ اس نے ان کی تعبیر ایسے الفاظ میں کی ہے کہ ہر زمانہ کے لوگ اپنی عقلی سطح اور اپنے دور کے علوم و اکتشافات کی روشنی میں اس کی تعبیر کر سکتے ہیں اور

اس میں اور کلام مجید کے بیانات میں کوئی تعارض و تضاد نہیں پیدا ہوتا،

تفسیر ماجدی میں ان تمام پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے، قرآنی تعلیمات کی تفسیر احادیث اخبار اور اکابر مفسرین کی تفسیروں کی روشنی میں کی گئی ہے، اور ان میں تفسیر کے مختلف پہلوؤں کے متعلق جس قدر ضروری معلومات ہیں سب کو اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے، جا بجا اسلامی احکام کا دوسرے مذاہب کے احکام سے موازنہ کر کے اسلامی احکام و تعلیمات کی برتری دکھائی گئی ہے،

گذشتہ انبیاء و رسل اور قدیم اقوام و ملل کے واقعات میں اسلامی ماخذوں کے علاوہ خود انکی مذہبی اور تاریخی کتابوں اور جدید تاریخی و اثری تحقیقات سے بھی مدد لیگئی ہے، اور ان سے کلام مجید کے بیانات کی تصدیق اور اسکے خلاف ان اقوام و مذاہب میں جو روایات ہیں انکی پوری تردید کی گئی ہے، اس سلسلے میں کلام مجید پر مستشرقین کے اعتراضات کا جواب بھی آگیا ہے، اس تفسیر کی سب سے بڑی خصوصیت اور اس کا امتیازی وصف یہی ہے جس کی مثال اردو کیا عربی کی تفسیروں میں بھی نہیں ملتی،

کائنات کی تخلیق اور اس کے نظام کی آیات کی تفسیر اس طرح کیگئی ہے کہ عوام و خواص دونوں کی عقل و فہم کے لیے یکساں قابل قبول ہے، اور اس میں اور جدید علوم و اکتشافات میں کوئی تعارض نہیں ہوتا، اس تفسیر میں اردو کی بعض عقلی تفسیروں کی طرح دور از کار تاویلوں سے کام نہیں لیا گیا ہے اسکی کوئی تفسیر بھی اسلام کی روح اور عقیدۂ سلف کے خلاف نہیں ہے، اس لحاظ سے یہ تفسیر علم و تحقیق، عقل اور روایت و درایت کے سارے پہلوؤں کی جامع اور ان سب کے معیار پر اترتی ہے، انداز بیان کی خوبی اور دلنشینی کے لیے مولانا کا نام پوری ضمانت ہے،

"م"

مطبوعات جدیدہ

فروغ اردو مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر:۔ مرتبین جناب عبدالقوی دریابادی، سید احتشام حسین، محمد حسین شمس علوی، سید امیر حسن نورانی، سعادت علی صدیقی صاحبان۔ بڑی تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۲۴، قیمت نو روپئے۔

پتہ ادارۂ فروغ اردو، ۳۷۔ امین آباد پارک لکھنؤ ۱

مولانا عبدالماجد دریابادی کے علمی، مذہبی و ادبی خدمات اور قلمی گلکاریوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے، خصوصاً ادب و انشا اور طنزیات کے مسلمہ امام ہیں، اور اردو و انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، یہ خاص نمبر مولانا کے گوناگوں خدمات اور کمالات کا مرقع ہے، اس میں ان کے حالات و سوانح اور علمی و دینی، ادبی و تنقیدی اور صحافتی و تصنیفی کارناموں کے متعلق کئی درجن مضامین ہیں، ملا واحدی، ظفر حسین خاں مرحوم، غلام رسول مہر مرحوم، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، پروفیسر سید احتشام حسین، حضرت آوارہ اور غلام احمد فرقت کاکوروی وغیرہ ممتاز اصحاب علم و قلم نے مولانا کی شخصیت و کمالات کے مختلف جلوے دکھائے ہیں، ماہنامہ آجکل کی فرمایش پر مولانا نے اپنے خود نوشت حالات لکھے تھے، یہ دلچسپ مضمون بھی اس نمبر کی زینت ہے، نظموں کا حصہ بھی ہے لیکن بھاری بھرکم نثری مضامین کے سامنے ہلکا ہے، مولانا اور ان کے ہمعصر اکابر کے چند یادگار فوٹو بھی ہیں، جو مولانا کے موجودہ ذوق و طبیعت پر

یقیناً گراں گذرے ہوں گے، مضامین ایک سطح کے نہیں ہیں، اور نہ مولانا کی بوقلموں شخصیت اور گوناگوں کمالات کا ایک نمبر میں احاطہ ہی کیا جاسکتا ہے، تاہم اکثر مضامین معلومات افزا ہیں اور ان سے مولانا کی سوانحعمری کی ترتیب میں آئندہ بڑی مدد ملے گی، اس عہد کے اکثر فضلاؤ اہل قلم سے مولانا کے تعلقات رہے ہیں اور وہ خود مختلف علمی، ادبی اور مذہبی تحریکوں اور اداروں سے وابستہ رہے ہیں، اس لیے اس نمبر سے ان کے متعلق بھی یک گونہ معلومات حاصل ہوتے ہیں مولانا کے متوسلین اور علمی و ادبی حلقوں میں ادارۂ فروغ اردو کی یہ پیشکش پذیرائی کے لائق ہے

عالم عربی کا المیہ :- از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۸، قیمت تین روپے ۵۰ پیسے، پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ۔

مسلمانوں کے قبلۂ اول اور فلسطین کی ارض مقدس پر یہود کا قبضہ اور عربوں کی شکست دنیائے اسلام اور اسلامی تاریخ کا بڑا سانحہ ہے جس سے پوری دنیائے اسلام بے چین ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو عربوں سے زیادہ لگاؤ رہا ہے، انھوں نے اکثر عرب ممالک کی سیاحت کی ہے، اور ان کے حالات و مسائل اور اداروں و تحریکوں سے پوری طرح واقف ہیں، اس لیے اس المیہ پر ان کا کرب و اضطراب بھی غیر معمولی ہے، یہ کتاب اسی کرب و بے چینی کا نتیجہ اور جذبات غم کی تصویر ہے، اس میں مندرجہ ذیل سات مضامین ہیں، (۱) عالم عربی کا المیہ اور اس کے حقیقی اسباب (۲) فتح و غلبہ کے الٰہی نظام (۳) سود و زیاں کی میزان (۴) عالم عربی کا اصل خطرہ اسرائیل سے نہیں اس ضمیر سے ہے جس نے اپنا کام چھوڑ دیا (۵) المیہ فلسطین سے تین سبق (۶) صدر ناصر کی مخالفت کیوں؟ (۷) اسلام کے حلقہ بگوش عربوں کو قرآن کی نوید فتح۔

ان مضامین میں فاضل مصنف کی دلسوزی و دردمندی، ملی و قومی حمیت اور اسلا

مسلمانوں کی سربلندی کے جذبات نے بڑی تاثیر پیدا کردی ہے، اس لیے یہ نالۂ و شیون کے بجائے مسلمانوں کی نشاۃ نو کا پیغام ہیں، ان میں قرآن مجید کی روشنی میں عربوں کی ہزیمت کے اسباب و عوامل کا تجزیہ اور ان کی خامیوں اور ان کے بعض حکمرانوں کے طرزِ عمل پر بڑی شدت سے نقد و احتساب کیا گیا ہے، ابتدا کے پانچ مضامین میں المیہ کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے، اور آخری مضمون میں یہود کی کامیابی کو عارضی بتاتے ہوئے عربوں کو فتح کا مژدہ سنایا گیا ہے، اور اس کے شرائط بتائے گئے ہیں، چھٹے مضمون کے سوا سب عربی میں تھے، مولانا کے عزیزوں اور شاگردوں نے ان کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے اس آئینہ میں پاکستان کی موجودہ شکست کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے، اور یہ ہر مسلمان کے لیے سبق آموز ہے۔

گاندھی جی اور انکے خیالات:۔ مرتبہ جناب عبداللطیف اعظمی صاحب، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۵۲، مجلد مع گردپوش، قیمت پانچ روپئے

پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

گاندھی جی کی صد سالہ جینتی کے موقع پر رسالہ جامعہ نے ایک خاص نمبر شائع کیا تھا، جناب عبد اللطیف اعظمی نے اس میں کچھ رد و بدل اور ترمیم و اضافہ کر کے یہ کتاب مرتب کی ہے، جو دس مضامین اور گاندھی جی کی چند تقریروں، تحریروں اور ایک اردو خط پر مشتمل ہے، گو یہ مضامین مختصر ہیں لیکن ونوبا بھاوے، پیارے لال، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، پروفیسر ہمایوں کبیر مرحوم، پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر سید عابد حسین وغیرہ کے قلم کے ہیں، جن کو گاندھی جی سے قربت و خصوصیت رہی ہے، پروفیسر ہمایوں کبیر کا مضمون (گاندھی جی اور انقلاب ہند) بہت مفید ہے، اس سے گاندھی جی کی سیاسی بصیرت اور انقلاب کی تعلیم و تربیت

پر روشنی پڑتی ہے، گاندھی جی کی تحریریں اور تقریریں ہندو مسلم اتحاد، عدم تشدد اور ہندوستان کی قومی زبان اور معاشی و اخلاقی ترقی کے متعلق خیالات پر مشتمل ہیں، لائق مرتب نے ان کی کتاب "تلاش حق" کی تلخیص کی ہے، اور ان کی پیدائش ۱۸۶۹ء سے ۱۹۱۵ء تک کے اور جناب کرشن کرپلانی نے اس کے بعد ۱۹۱۶ء سے وفات ۱۹۴۸ء تک کے واقعات و حالات لکھے ہیں، اس سے گاندھی جی کی شخصیت اور ان کے خط و خال کے علاوہ گذشتہ سو سالہ قومی جد و جہد کی سرگذشت اور جنگ آزادی کے مختلف مراحل کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، فاضل مرتب نے ان منتشر مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرکے ایک مفید قومی کام انجام دیا ہے۔

"ض"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت :-	ماہانہ
نام پرنٹر :-	عطاء اللہ
قومیت :-	ہندوستانی
پتہ :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر :-	" "
قومیت :-	ہندوستانی
پتہ :	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر :-	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت :-	ہندوستانی
پتہ :-	دار المصنفین اعظم گڈھ

نام و پتہ مالک رسالہ

میں عطاء اللہ تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔　عطاء اللہ

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب اور امریکہ، اسلامی رصد خانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت: لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں۔ (زیر طبع)

مقالات عبد السلام

مولانا عبد السلام ندوی کے ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ۔ قیمت: عہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین۔ قیمت: ...

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت: عہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے اور جنھوں نے اس کو رشک جنان بنا دیا، ان کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی اعظمی ایم اے، قیمت: ...

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) اپریل ۱۹۷۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام
کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و ق
لحاظ سے بلا تفریق مذہب ملت نسل ورنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے
کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے
اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانو
میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق
سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات
علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا

......(مرتبہ)......

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے   قیمت: ۔/۳

جلد ۱۰۹ ۔ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۲ء ۔ عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات

Bolt Jamil Ahmad

شذرات

دارالمصنفین کو ابتدا سے ریاست حیدرآباد اور بھوپال کی امداد و سرپرستی حاصل رہی، اسکا قیام ہی ان دونوں ریاستوں کی امداد سے عمل میں آیا تھا جو انکے قیام تک برابر جاری رہی، اس کے بعد ختم ہوگئی تھی۔ نواب مفخم جاہ بہادر کی علم نوازی سے پھر اس دیرینہ تعلق کی تجدید ہوگئی، ممدوح نے از راہ قدردانی دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کی صدارت قبول فرمائی ہے جس کے لیے کارکنان ادارہ صمیم قلب سے نواب صاحب ممدوح کے شکر گذار ہیں۔

شیخ الحدیث مولانا سید فخر الدین احمد صاحب کی وفات دینی و علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے، مرحوم ہندوستان کے نامور عالم دین دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر تھے، انکی پوری زندگی دینی علوم کی خدمت میں گذری، تقریباً نصف صدی تک مدرسہ مسجد شاہی مراد آباد اور دارالعلوم دیوبند میں انکا فیض جاری رہا جس سے سیکڑوں تشنگان علم سیراب ہوئے، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے بعد دارالعلوم کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے، درس و تدریس کے ساتھ ملک و ملت کے بھی مجاہد تھے، خلافت اور ہندوستان کی آزادی کے تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا اور قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، تدین و تقویٰ میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔

دوسرا حادثہ شیخ محمد اسماعیل صاحب صدر مسلم لیگ کی وفات کا ہے، وہ ملک و ملت کے پرانے خدمتگذار تھے، ایک زمانہ میں کانگریسی تھے، پھر مسلم لیگ میں شامل ہوگئے تھے، جنوبی ہند کی سیاست میں انکو نمایاں مقام حاصل تھا، یہ انہی کی شخصیت تھی کہ ملک کی تقسیم کے بعد جب ہندوستان میں لیگ کی کوئی گنجائش نہیں

رہ گئی تھی، جنوبی ہند میں اس کو دوبارہ زندہ کیا، پھر ملک کے مختلف حصوں میں اسکو پھیلا دیا، مگر اسکو فرقہ پروری سے اتنا دور رکھا، اور ملکی حالات سے اتنا ہم آہنگ کر دیا کہ اسکے مخالفین کو بھی گرفت کا موقع نہ مل سکا اور کانگریسی حکومتوں تک کو اس سے مصالحت کرنا پڑی، اب ملت کے ایسے بڑے غمگسار مشکل سے پیدا ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

جدہ کی اسلامی کانفرنس اس حیثیت سے کامیاب رہی کہ اس میں تیس اسلامی ملکوں کے نمایندے شریک ہوئے اور مسلمانوں کے اہم ملی مسائل پر غور اور اسکے متعلق مفید تجویزیں منظور کیں، یہ شکر کا مقام ہے کہ ایک مدت کے تجربہ کے بعد اب اسلامی ملکوں کو اسلامی وحدت کا احساس پیدا ہوا جو نہ صرف مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی ان کے لیے ضروری ہے، اس وقت تقریباً ۲۰، ۲۲ آزاد اسلامی ملک ہیں جو اقوام متحدہ کے ممبر ہیں، اگر متحد ہو جائیں تو بین الاقوامی معاملات میں انکی آواز موثر بن سکتی ہے اور یہ کام عرب ہی انجام دے سکتے ہیں، خصوصاً سعودی عربیہ کو جو دینی مرکزیت حاصل ہے، وہ کسی ملک کو نہیں ہے، ان کے پاس دولت بھی ہے، جو اس قسم کی تنظیموں کے قیام کے لیے ضروری ہے، اس وقت بھی ان کے مصارف کا بڑا حصہ وہی برداشت کرتے ہیں،

لیکن اسلامی اتحاد کے لیے سب سے پہلے خود عربوں میں اتحاد ضروری ہے، اس اتحاد کی صدا سب سے پہلے عرب ہی سے اٹھی تھی، اسی نے انکو متحد کیا تھا، "واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً" لیکن آج وہی اختلاف کا سب سے بڑا شکار ہیں، یہ صحیح ہے کہ انکے مسائل جدا جدا ہیں، اس لیے ان میں اتحاد آسان نہیں ہے لیکن ان ذاتی مسائل کے علاوہ مشترک مذہبی ملی اور اقتصادی مسائل میں تو اشتراک و تعاون ہو سکتا ہے، جو سب کے لیے یکساں مفید ہے، اس راہ میں دشواریاں بھی ہیں، مگر جس حد تک بھی اتحاد ہو جائے ان کے لیے مفید ہی ہوگا اور یہ اسلامی سکریٹریٹ کا بڑا کارنامہ ہوگا،

اللہ تعالیٰ نے عربوں کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے، عرب ملک ہر طرح کی خام دولت سے مالا مال ہیں، مشرق وسطیٰ کا پورا علاقہ "سیال سونے" کا مخزن ہے، جس کی ساری دنیا کو احتیاج ہے، انکی جغرافی پوزیشن یہ ہے کہ پاکستان سے اسلامی ملکوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ ایشیا و افریقہ ہوتا ہوا یورپ کی سرحد تک چلا جاتا ہے، درمیان میں اسرائیل کی چھوٹی سی پٹی کے علاوہ کوئی غیر مسلم ملک نہیں ہے، اگر ان میں اتحاد اور اپنے وسائل سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو وہ ایشیا کے پاسباں بن سکتے ہیں، افسوس یہی ہے کہ نہ ان میں اتحاد ہے اور نہ اپنی دولت سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہے، دولت کا بڑا حصہ تعیشات میں صرف ہوتا ہے، اور وہ معمولی معمولی ضروریات زندگی کے لیے دوسروں کے محتاج ہیں، اب انھوں نے صنعت و حرفت کی طرف توجہ کی ہے، اسلامی اتحاد سے اس میں بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے،

اسلامی ملکوں کو سب سے زیادہ نقصان خود ان کے اختلاف نے پہنچایا ہے، مختلف ملکوں کے درمیان اتحاد کا کیا ذکر ایک ملک کے باشندوں میں بھی اتحاد نہیں، جس پر ان کے آئے دن کے انقلاب شاہد ہیں، پاکستان کا انقلاب اس کی تازہ مثال ہے، مگر پاکستان نے اس سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کیا، جس اقتدار پسندی اور صوبائی اور لسانی عصبیت نے بنگلہ دیش کو الگ کیا تھا، اب وہی مغربی پاکستان میں بھی ابھر گئی ہے، بنگلہ دیش میں تو صرف بنگالی اور غیر بنگالی کا سوال تھا، پاکستان میں تو پختون، پنجابی، سندھی اور بلوچی چار چار عصبیتوں کا سامنا ہے، اگر یہی صورت حال رہی تو پاکستان کی بھی خیر نہیں، خدا ہی اس کو راہ راست پر لائے،

مقالات

عہد اکبری کے فارسی ادب و زبان پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبد الرحمن

عہد اکبری (۱۵۵۶ء ۔ ۱۶۰۵ء) کو فارسی زبان و ادب کے فروغ کا ایک زریں دور کہا جا سکتا ہے، اس زمانہ میں اس زبان کی جو سرپرستی ہوئی، وہ اپنی مثال آپ ہے، شاہی دربار اور پھر اس کے امرا نے اس زبان کے فضلا، علما، اور شعراء کو جس طرح اپنی فیاضیوں سے سیراب کیا، اس کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ اس زبان کے بولنے والوں کا کوئی ایسا علاقہ اور کوئی ایسا شہر باقی نہیں رہا تھا، جہاں سے فضلاء اور شعراء ہندوستان آکر یہاں کی زرپاشیوں سے متمتع نہیں ہوئے، ان کے شاندار اجتماع کی وجہ سے ہندوستان زبان حال سے کہہ رہا تھا،

نیست در ایران زمیں سامان تحصیل کمال تانیامد سوئے ہندوستاں حنا رنگیں نہ شد

لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ جو ایرانی الاصل شعراء ہندوستان آئے وہ اپنے ایرانی پندار اور غرور میں ہندی الاصل شعراء کو اپنا مد مقابل نہیں سمجھتے رہے، مگر جب یہی ایرانی الاصل شعراء ہندوستان میں رہ بس گئے، تو آج ایران میں ان کو سبک ہندی کا حامل سمجھکر نظرانداز کرنے کی کوشش کیجاتی ہے، عرفی شیرازی اور نظیری نیشاپوری حتی کہ صائب بھی

سبک ہندی کے نمائندے سمجھے جانے لگے ہیں، حالانکہ وہ اگر ایران میں رہ کر وہی سب کچھ کہتے جو انھوں نے ہندوستان میں کہا ہے تو وہ ایرانی سبک کے مایہ ناز شعرا سمجھے جاتے۔ اس بحث سے قطع نظر یہاں پر دکھانا یہ مقصود ہے کہ فارسی زبان میں ہندوستان کے اس دور میں بڑی رنگا رنگی پیدا ہوئی،

اس عہد میں مہابھارت، رامائن، اتھرون، بھگوت گیتا، تاجک جیسے سنسکرت کے کلاسیکل ادب کے فارسی میں منتقل ہو جانے سے اس زبان کی دولت میں ایک بڑے علمی سرمایہ کا اضافہ ہوا، افسوس ہے کہ مہابھارت اور رامائن کے فارسی ترجمے ابتک مخطوطات کی شکل میں مختلف کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں، ان کو ایڈٹ اور طبع کرکے اہل علم تک پہنچانے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ان ترجموں میں اس زمانہ کے اہل قلم نے اپنا قلمی جوہر کس طرح دکھایا ہے، ان ترجموں سے یہ بھی فائدہ ہوا کہ ہندوؤں کی مذہبی اور علمی وراثت محض ان ہی کے لیے ایک سربمہر خزانہ نہیں رہی بلکہ غیر ہندوؤں خصوصاً مسلمانوں کو بھی ان سے واقفیت ہوگئی اور یہ دلچسپی اتنی بڑھی کہ آیندہ بھی سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے برابر جاری رہے،

اس دور میں تاریخ نویسی کا معیار بھی بہت بلند ہوا، اکبر نامہ تو تاریخ و ادب دونوں کا شاہکار ہے، اس پر اکبر کی چاپلوسی اور مداحی کا اعتراض ہوتا رہتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے بہتر تاریخ ہندوستان میں نہیں لکھی گئی، آئین اکبری تو برطانوی حکومت کے نظم و نسق میں بھی مشعل راہ بنی رہی، تاریخ الفی، طبقات اکبری، منتخب التواریخ، تاریخ ہمایوں و اکبر، تاریخ کشمیر وغیرہ میں منتخب التواریخ کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس کا اندازِ بیان کچھ ایسا اچھوتا ہے کہ اس کے مصنف پر تعصب کا جا ہے جتنا بھی الزام رکھا جائے، اس کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہے، دوسری نثری تصانیف میں انجیل،

معجم البلدان، کلیلہ دمنہ، جامع رشیدی، تاریخ الحکما، بحر الاسمار وغیرہ کے فارسی ترجموں سے فارسی لٹریچر میں مفید اضافہ ہوا لیکن وہ ادبی حیثیت سے زیادہ مقبول نہ ہو سکیں، البتہ تزک بابری کے فارسی ترجمہ کو شوق سے پڑھا گیا، اس دور میں ادبی حیثیت سے سہ نثر ظہوری کو بڑی مقبولیت ہوئی گو وہ اکبر کی سرپرستی میں نہیں لکھی گئی، اس کی انشاء پردازی آج کل کے ذوق پر تو گراں گزرتی ہے لیکن اس میں جو صنائع و بدائع کا جوہر اور انشاء پردازانہ فن دکھایا گیا ہے، اس سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا،

جہاں تک نثر نگاری کا تعلق ہے، اس دور میں مسجع، مقفی اور مکلف عبارت آرائی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی، اکبرنامہ اور سہ نثر ظہوری اس کی اعلیٰ مثالیں ہیں، تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے میں شرف الدین یزدی نے ظفر نامہ میں نثر نگاری کا جو نمونہ پیش کیا تھا، اس کو ابو الفضل نے انتہائے کمال تک پہنچا دیا، اس کے زور قلم کی تو تقلید صحیح معنوں میں نہیں ہو سکی لیکن اس کی اصل کی نقل اتارنے کی ضرور کوشش کی گئی، آگے چل کر شاہجہان نامہ اور عالمگیر نامہ اسی کے طرز انشاء کی آواز بازگشت ہیں، اس قسم کی انشاء پردازی کا تاریخ ادب فارسی میں ایک مقام ضرور ہے لیکن مجموعی حیثیت سے ہندوستان میں اس سے زبان کو نقصان پہنچا، یہ بادشاہوں، امیروں اور ان کے درباروں ہی تک محدود ہو کر رہ گئی، ہندوستان کے عوام تک نہیں پہنچ سکی، اسی لیے رفتہ رفتہ یہاں سے جاتی رہی، نظام الدین احمد بخشی نے طبقات اکبری میں جو صاف، سلیس اور آسان زبان اختیار کی تھی، وہی چل نکلتی تو ہندوستان سے یہ جانے نہ پاتی، ملا عبد القادر بدایونی نے اکبرنامہ اور طبقات اکبری دونوں کے درمیان میں ایک طرز بیان اختیار کیا تھا، جو نہ بہت مشکل اور نہ بہت آسان تھی، یہ علمی بھی تھی اور بامحاورہ

بھی، اس میں بعض محاورے اور روزمرے بہت ہی جاندار اور آج کل کے لحاظ سے دلچسپ ملتے ہیں،

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، غزالی، عرفی، نظیری، فیضی، شکیبی اور ثنائی نے اس کا معیار بلند رکھا، اس دور میں مثنویاں، رباعیاں، قصیدے اور غزلیں بکثرت لکھی گئیں مگر غزلوں اور قصیدوں کے مقابلہ میں مثنویاں اور رباعیاں دبی نظر آتی ہیں، پھر بھی مثنویاں کافی لکھی گئیں، جن میں کچھ یہ ہیں، نقش بدیع، مشہد انوار، آئینۂ خیال، قدرت آثار، رشحات الحیات، اسرار المکتوم، واردات، مواہب، مرأۃ الکائنات (از غزالی مشہدی) گل افشاں از کاہی، کوہ اجمیر از قاسم ارسلان، محمود و ایاز انیسی شاملو، صورت معنی از بیردی، دہ نامہ، حسن و یوسف از تدرولی ابھری، سکندر نامہ از ثنائی، مثنوی خسرو بیگ، مثنوی دلفریب از سید شاہی، سوز و گداز از نوعی خبوشانی، خمسہ کے طرز پر عرفی نے مخزن اسرار کے جواب میں ایک مثنوی قلمبند کی، موجی نے یوسف زلیخا اور لیلیٰ مجنوں کے انداز میں دو مثنویاں لکھیں، منظری سمرقندی نے تو ایک شاہنامہ لکھنے کی کوشش کی، فیضی نے بھی خمسہ کے طرز پر مرکز ادوار، سلیمان بلقیس، ہفت کشور، اکبرنامہ اور نل دمن لکھنے کی کوشش کی، نل دمن کو تو مکمل کر سکا، لیکن کوئی مثنوی مکمل نہ ہوسکی، لیکن اس کی نل دمن کو جو شہرت دوام حاصل ہوئی، وہ کسی اور شاعر کی کسی مثنوی کو نہ ہوسکی، اس دور میں عشقیہ مثنویوں کی زبان صاف اور سلیس ہے، جیسا کہ حسب ذیل اقتباسات سے معلوم ہوگا، ان سے زبان کے علاوہ مثنویوں میں اس عہد کے طرز بیان کا بھی اندازہ ہو جائے گا،

مثنوی نل دمن میں فیضی نے نل کے فراق میں دمن کی جو بیقراری دکھائی ہو، اسکی مرقع آرائی

اس طرح کی ہے:۔

طوفان بلاکشائی عشق ست	سیلاب خرد دریای عشق ست
چون جوش زند بموج غوغا	نی شہر شناسد و نہ صحرا
گردشت کند بچشم باباغ	گہ باغ ازو بجان نہد داغ
آمد چو دمن بخانہ خویش	پیچیدہ بحزن ترانہ خویش
جا داد پدر بقصر باغش	تا تازہ شود زگل دماغش
وان خود ہمہ علت جنون شد	آشفتگیش زحد برون شد
از سینہ خروش فاش برداشت	فریاد جگر خراش برداشت
گفت ای فلک این چہ کج خرامست	بازم چو صبح تیرہ شامست
صحرا بہ زین چمن کہ دارم	غربت بہ زین وطن کہ دارم
چون فاختہ بودم از زمانہ	مرغِ قفس نگار خانہ
بکشادہ بہ کام عیش بالی	تا پختہ نہ آرزو خیالی
در کنج قفس کم آشیان بود	تنہائی من بلای جان بود
بس نالہ زدم بہ بخت ناساز	تا داد مرا بدوست پرواز
ناگاہ جدا ازہم نفس کرد	بازم بگرفت در قفس کرد
شاہی بہ حجاب سایۂ خویش	بہ شگافت سخن بدایۂ خویش
کای مہر سرشت پاک گوہر	در پردہ درشتم بجای مادر
بس تربیتم بہ کار بردی	تا رنگ زصد بہار بردی
کردی بکنار مہر تدبیر	سیرابم زان دو چشمۂ شیر

خود را مپسند بر کرانہ | مہری بنما ہی مادرانہ
ہستم ہماں نفی کرداتی | لب تشنہ شیر مہربانی
مگذار ہر یک دست بستم | بنگر کہ غزال شیر مستم
از مہر نظر بگیر بازم | کز پرورش تو بے نیازم
خواہی کہ دریں غم جگر تاب | باشم ز بہار عمر شاداب
بشتاب و ز بار من خبر گیر | وز ابر بہار من خبر گیر
زو و است باد تند خیزد | برگ دہر ہستیم بر بیزد

مثنوی دل فریب کا قصہ یہ ہے کہ شاہی لشکر کے ایک سپاہی موسیٰ کو ایک لڑکی موہنی سے عشق ہو گیا، لشکر چھوڑ کر وہ اپنی محبوبہ کے پاس رہنے لگا، دو سال تک دونوں کی ملاقات نہ ہو سکی، ایک رات موسیٰ کسی طرح موہنی کے گھر پہنچ گیا، دونوں گرم جوشی سے ملے، مگر دونوں پاکباز اور باعفت رہے، موسیٰ کے بھائی سید شاہی نے اس واقعہ کو اس مثنوی میں قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دونوں کی نظروں کے سامنے آب حیات رکھا تھا، لیکن پینے کی مجال نہ تھی، دونوں کے دل پیاس سے بے قرار تھے، لیکن لبوں پر شرم نے مہر لگا رکھی تھی، ایسا ہی عشق پاک ہوتا ہے،

ہرچند ہوائے دل زدی جوش | مے کرد حیا ندا کہ خاموش
در پیش نظر ز لال حیواں | یکدم و مجال خوردن آں
ولہا ز کمال تشنگی گرم | لبہا شدہ مہر بستہ از شرم
یک خانہ خلوت دو مشتاق | ولہا شدہ جفت ماندہ تن طاق

ماندند دو خستہ دل افزونہ | در بازی طاق وجفت تا روزہ
این ست بہ نزد ما محبت | کز دل ببرد خیال شہوت
چوں دل ز ہوائے نفس میرد | کے عشق دراں قرار گیرد
نبود بہ جہاں بہ سرو پائے | جز در دل پاک عشق را جائے
عشق است انیس جان پاکاں | عشق است رفیق دردناکاں
القصہ بصد لطافت و ناز | بکشادہ ہزار دفتر راز
دیدند قریب چو سحر را | کردند وداع یک دگر را

موسیٰ اپنے عشق میں ناکام رہتا ہے، موہنی کے والدین اس سے شادی کرنے کے لیے کسی حال میں تیار نہیں ہوتے، وہ جان دیدیتا ہے، موہنی کسی طرح اس کی قبر پہ آتی ہے، اور موسیٰ کا نام لے کر اس کی قبر پر گرجاتی ہے، اور اپنے کو اپنے عاشق صادق کے حوالے کر دیتی ہے،

با خوبی او چو عشق شد جمع | پروانہ صفت بسوخت آں شمع
کرد از سر شوق وجذبہ فریاد | موسی بزباں گرفت و جاں داد
در یک نفس آں دو سرو عشق | گشتند شہید خنجر عشق
تا آنکہ میان باغ رضواں | باشند بہم ز خلق پنہاں
آں ہردو مصاحبان جانی | رفتند از من جہان فانی
از درد و غم و فراق رستند | پنہاں ز ہمہ بہم نشستند
اے سیدی ایں چہ نالہ داری | دل را بہ ... حوالہ داری
ایں واقعہ را بکن فراموش | در صبر بکوش و باش خاموش

نوعی خبوشانی کی مثنوی سوز و گداز کا قصہ یہ ہے کہ لاہور کے دو ہندو عاشق و معشوق ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا رہے، اور جب ان کی شادی ہونے لگی تو عین بارات کے روز عاشق ایک مکان کے گر جانے سے ہلاک ہو گیا، معشوقہ کو انتہائی غم ہوا، اور وہ ستی ہونے کے لیے تیار ہو گئی، اکبر نے اس کو اپنے یہاں بلا کر ہر قسم کی ترغیب دی، لیکن وہ اپنے عاشق کے چتا پر جل مرنے سے باز نہ رہی، جس طرح وہ ستی ہوئی اس کا آخری نقشہ نوعی نے اس طرح کھینچا ہے :-

کشد آتش ز شوقش در بغل تنگ	چو مخموری کہ در ساغر زند چنگ
ملاحت پیکرش در ہم نوردید	چو مستی در کباب شور پیچید
تن صافیش چوں شد شعلہ آلود	تن او شعلہ گشت و شعلہ شد دود
رخش از تاب آتش تازہ گلشن	بر وہر شاخ سنبل نخل ایمن
ہزار رطل سوز آتش در رگ و پوست	ولے مغز دلش آغشتہ دوست
وجودش چو خم مے جوش در جوش	دہانش چوں لب پیمانہ خاموش
در آتش چوں سمندر غوطہ ور شد	ہمہ ذرات او آتش شرر شد
ز استیلائے آتش سر نہ پیچید	ازیں پہلو بہ آں پہلو نگردید
سراسر سوخت ذرات وجودش	کہ از دل بر زباں نگذشت دودش
بیاں در نعت عشق و ذکر آں گل	زبانش طوطی و دل بود بلبل
ہر گاہ سوختن از ہر کنارہ	رواں شد تیر باران نظارہ
دوبارا فراشت از آغوش سوزش	سر خود چوں حباب از دود آتش
چو خورشید قیامت آتشیں روی	ہزاراں شعلہ زد لیدہ در موی

دہر سو گرد خنداں لب نگاہی | نگاہی گرم تر از برق آہی

دو بار از قہر آتش سر بر آورد | حیا بنشس غو طرائی ہم بر سر آورد

دگر ہم گشت رگہا بر تنش خشک | شد او خاکستر و خاکسترش خشک

کف خاکستر آں پیکر نور | مصفا تر نمود از مغز کافور

مجرد شد چو روح از تن پرستی | بہ آتش پاک شد از جرم ہستی

ز جرم آب و گل شد صاف بے عشق | بیا بود از حریر تو رشس آتش

ز ہر آلایشی خود را بری کرد | لباس عمرش آتش گاذری کرد

مبرا زیں حیات رائیگاں شد | پذیرای حیات جاوداں شد

بہ یک جاں دادن از صد درد دل رست | بری شد از خود و با دوست پیوست

اسی زمانہ میں خنجر بیگ نے تین سو اشعار کی مثنوی کہی جس میں اکبر کو ایسی نصیحتیں کی ہیں جو سیاست نامہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اس کی زبان بڑی صاف سلیس اور رواں ہے، اس کے کچھ نمونے یہ ہیں:-

پادشاہ ولی شعاری تو | در جہاں از برائے کاری تو

عدل و انصاف و جود و علم و سخا | لطف و احسان و خلق و مہر و وفا

ہمہ داری ز لطف یزدانی | چہ کنم قدر خود نمی دانی

تو نخندہ بہ فیل دست زناں | مردم انگشت فکر در دنداں

تو بجز طوم فیل پنجہ کشا | آستیں ما فشاندہ از دنیا

تو مقابل بہ شیر درندہ | مردم از وہم ہر طرف کندہ

تو بہ جنگ پلنگ بازی کن | رو کناں ما پہ پنجہ و ناخن

اس دور میں رباعیاں بھی بہت کہی گئیں۔ ملا بدایونی نے تو لکھا ہے کہ فکری پایہ بات تو اپنے کو اپنے زمانہ کا خیام کہتا تھا، لیکن یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے، خیام کا رنگ نہ اسکی اور نہ اس دور کے کسی اور شاعر کی رباعیوں میں پایا جاتا ہے، لیکن اس دور کی تمام رباعیوں پر نظر ڈالی جائے تو بعض رباعیاں بہت ہی پرکیف اور سبق آموز نظر آئینگی، مثلاً

فیضی:

مستان الٰہی کہ دم خوش زدہ اند | بے جام و سبو شراب بے غش زدہ اند
آرایش علم و فضل از یشان مطلب | کیں طائفہ در کتاب آتش زدہ اند
فیضی بکشا گوش دل و دیدۂ ہوش | از کار جہان دور کن این دیدہ و گوش
نیرنگ زمانہ بگرد ... بربند | افسانۂ دہر بشنو و چشم بپوش

عرفی:

اے از بد و نیک آمدہ در جوش و خروش | گہ شکر طرازی و گہے شکوہ فروش
مختار مشو تا نشدی بیہدہ کوش | کاورد و یاد باشس بار سر و دوش

عبدالرحیم خانخاناں:

تا عشق خیال یار در خانہ ماست | طاؤس امل کینہ پروانہ ماست
ان روز کہ آشنا شدم با غم او | ہر کہ غیر اوست بیگانۂ ماست
اے دوست چہ کسی بدرد ہم خانہ بری | در معرکہ از معرکہ بیگانہ بری
در آتش ما کہ عشق مردان خداست | مردانہ درآ و شیر مردانہ بری

نامی:

عشقت نہ در متاع ہر خریدار بود | او را دو جہان بہاشے یک تار بود

گل نیست کہ در کوچہ و بازار بود | یا مشک کہ در دکان عطار بود
ز آلایش روزگار اندر گلۂ | عیب دگران مکن تو ہم زان گلۂ
بر ہنر از آلودگی دامن خویش | نامی دو سہ زنے کہ درین مرحلۂ

محب علی سندی:

در دہر کہ عیب و ہنرش می دانم | وز ہر چہ در اوست کمترش می دانم
بالای نفشانم و صفیری نکشم | بر خود ز نفس تنگ ترش می دانم

فکری:

دار فکری سری کہ سامانش نیست | در دلیست بدل نہاں کہ درمانش نیست
عمریست کہ پاکردۂ ز سرحد رہ عشق | سر کردہ رہے کہ ہیچ پایانش نیست
فردا کہ نماند از جہاں جز خبری | ظاہر شود از بہار محشر اثری
چوں سبزہ سر از خاک بر آرند بتاں | ما نیز بہ عاشقی بر آریم سری

اس دور میں ایسی رباعیاں بھی ملیں گی جن میں رواداری اور وسیع المشربی کا اظہار کیا گیا ہے، یہ دور اسی کا دور بھی رہا۔

غزالی:

در کعبہ اگر دل سوئے غیر است ترا | طاعت ہمہ فسق و کعبہ دیر است ترا
ور دل بحق است و ساکن میکدۂ | مے نوش کہ عاقبت بخیر است ترا

عرفی:

فقیہان دفترے را می پرستند | حرم جویان درے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد | کہ یاراں دیگرے را می پرستند

توسنی ؛

بے عشق تو در جگر لب نار است | بے درد تو در سرم سراسر خار است
بت خانہ و کعبہ ہر دو نزدم کفر است | ما را بہ یگانگی ایزد کار است

طفلی

زہے نگاہ تو غارت گر مسلمانی | امید وعدۂ تو مایۂ پشیمانی
ز سجدۂ صنم اے برہمن مشو نومید | کہ ہست آئینہ تحت داغ پیشانی

غزل گوئی کا معیار نظیری اور فیضی نے بہت اونچا رکھا، ایک ایرانی دانشور نے توجہ دلائی ہے کہ نظیری نے سعدی اور حافظ کی تقلید میں بہت سی غزلیں کہی ہیں، مثلاً

سعدی ؛

شب فراق کہ داند کہ تا سحر چند ست | مگر کسے کہ بزندانِ عشق در بند ست

نظیری

بحرف اہل غرض قرب و بعد ما بند ست | دل شکستۂ ما را ہزار پیوند ست

سعدی :

ایہا الناس جہاں جای تن آسانی نیست | مرد دانا بہ جہاں داشتن ارزانی نیست

نظیری :

دل کہ جمع ست غم از بے سر و سامانی نیست | فکر جمعیت اگر نیست پریشانی نیست

سعدی :

درخت غنچہ بر آورد و بلبلاں مستند | جہاں جواں شد و یاراں بہ عیش بنشستند

نظیری :

بہ ہوش سیر چمن کن کہ شاہداں مستند   قرابہ بر سر ابر بہار بشکستند

سعدی :

گفتمش سیر ببینم مگر از دل برود   آں چناں جای گرفتہ است کہ مشکل برود

نظیری :

کس چو من نیست کہ پیش نظر از دل برود   غائب از دیدہ نگردد و مقابل برود

سعدی :

اے زلفِ تو ہر خمی کمندی   چشمت بکرشمہ چشم بندی

نظیری :

اے عقدہ کشای ہر کمندی   بردار زپای شوق بندی

حافظ کی غزلوں کے قافیوں اور بحروں میں تو نظیری کی بہت سی غزلیں ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں :

حافظ :۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را   بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

نظیری :

برائے خشتِ خم خواہیم گو آں پیر ترسا را   کزیں بازیچۂ طفلاں خرد مشت گل ما را

حافظ

صوفی بیا کہ آئینہ صافی ست جام را   تا بنگری صفای مے لعل فام را

نظیری :

در خور اگر نیم مے لعل فام را   اے کاش تر کنند بہ بوی مشام را

حافظ :-

اگرچہ عرض ہنر پیش یار بے ادبی ست
زباں خموش ولیکن دہاں پر از عربیت

نظیری :-

جزائے حسن عمل در شریعت عربیت
بعرف عفو نکردن گناہ بے ادبیست

حافظ :-

سبب مپرس کہ چرخ از شعلہ پرور شد
کہ کام بخشی اورا بہانہ بے سببت

نظیری :

قبول بے ہنراں ز التفات معشوق ست
عنایت ازلی را نشان بے سببت

حافظ :-

جمال دختر زر نور چشم ماست مگر
کہ در نقاب زجاجی و پردۂ غیبست

نظیری :-

زمن مشاطۂ بستاں صداق می طلبد
ہنوز دختر زر در سراچۂ غیبت

حافظ

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمۂ حسن
بسوخت دیدہ زحسرت کہ ایں چہ بوالعجبیت

نظیری :-

خلاف رسم دریں عہد خرق عادت داں
کہ کارہائے چنیں از شما بوالعجبیت

حافظ :-

دریں چمن گل بے خار کس نچید آئے
چراغ مصطفوی با شرار بولہبیت

نظیری :

شب سیاہ صباح سفید می آرد چراغ مطلب از دود مان ہر بیت

حافظ :

کنون کہ بر کف گل جام بادۂ صاف ست بہ صد ہزار زبان بلبلش در اوصاف ست

نظیری :

بہ شرح حالت من نامہ ہا در اطراف ست ہزار قافلہ ام زیر بار اوصاف ست

حافظ :-

زاہد ظاہر پرست از حال ما آگاہ نیست در حق ما ہر چہ گوید جائے ہیچ اکراہ نیست

نظیری :

واند اخلاص مرا و زحال من آگاہ نیست در رو بسش رہ بر دم بر آستانش راہ نیست

حافظ :-

مطرب عشق عجب ساز و نوای دارد نقش ہر نغمہ کہ زد راہ بجای دارد

نظیری :-

بر سر شاخ کہ در باغ ہوای دارد ہر گلی رنگے و ہر مرغ نوای دارد

حافظ :-

در ازل پرتو حسنت و تجلی دم زد عشق پیدا شد و آتش بہمہ عالم زد

نظیری :-

شادی عشق تو ہنگامہ غم برہم زد شور عشقت نمکی بر جگر آدم زد

یہ صحیح ہے کہ یہ غزلیں سعدی اور حافظ کی تقلید میں لکھی گئی ہیں، لیکن یہ نظیری کا وصف ہے کہ اس نے باکمال اساتذہ کے رنگ میں اپنی غزلیں کہہ کر اپنا رنگ دکھلایا ہے چنانچہ

مذکورہ بالا دانشوروں کو بھی یہ کہنا پڑا ہے کہ

"در غزل سرای علی الخصوص از ہر بابت نسبت بغزلیات آسانی خواجہ نوعی

شکرف می نمود۔"

باکمال اساتذہ کی تقلید تکمیل فن کی خاطر کیجاتی تھی، ہر شاعر کی یہ جرأت اور ہمت نہیں ہو سکتی ہے کہ مسلم الثبوت اساتذہ کے رنگ میں وہ غزلیں کہے، باکمال شاعر ہی باکمال اساتذہ کی تقلید کر سکتا ہے، چنانچہ غزل ہو یا قصیدہ باکمال شعراء کے یہاں انکے پیشرو اساتذہ کے رنگ میں اس قسم کی تقلید کے بہت سے نمونے ملیں گے۔ نظیری اور فیضی دونوں کے یہاں گذشتہ اساتذہ کے رنگ کے علاوہ ان کے یہاں عشقیہ، فلسفیانہ اور رندانہ قسم کے مضامین بھی ملیں گے، پھر ان میں جوش بیان بھی ہے۔ مضامین کی طرفگی بھی، استعارات کی جدت بھی، تشبیہات کی لطافت بھی، شوخی بھی، ندرت بھی، نئی نئی ترکیبیں بھی، مضمون آفرینی بھی، روزمرے اور محاورے بھی، جس سے اس دور کے تغزل میں بڑی تابناکی پیدا ہوئی۔ یہ دونوں تو اساتذۂ فن تھے، اس لیے ان میں یہ ساری خوبیاں آسانی سے مل جائیں گی، لیکن اس دور کے اور شعراء کے کلام میں بھی بہت کچھ خوبیاں ملیں گی، مجموعی طور سے اس دور کی غزلیں صاف، سلیس اور دلنشین انداز میں لکھی جاتی رہیں، مثلاً

مقیمی سبزواری:

عاشقانیم و سر کوئے بلا ماوائے ماست — عالمے پرفتنہ و آشوب از غوغائے ماست

ہر کجا اندوہ و محنت پیش آنجا ساکنیم — ہر کجا آشوب و غم بسیار آنجا جائے ماست

با چنیں بد حالی کامروز داریم از غمش — مرگ می خواہد آنکو در غم فردائے ماست

در بیابان غمش سرگشتہ ایم و سایہ است — آں سیہ بختی کہ در روز جنیں ہمپائے ماست

ماتیم از بازگفتی نیست پروائے کسم
آری آری کی باین خوبی ترا پروائے ماست

نویدی تربتی :

خدنگت را کہ عمرے جاں در دل داشتم دارم
نہال آرزوئے کز تو حاصل داشتم دارم

ہماں قیدی کہ در اول من مسکیں سرگرداں
ازاں لیلی وشی مسکیں شمائل داشتم دارم

اگر از گریہ شد تاریک چشم من خیالت را
بداں صورت کہ در آئینۂ دل داشتم دارم

بگیرائے آشنا دانستم کز آبدیدہ عمرے شد
بوادی جنوں پائے کہ در گل داشتم دارم

نویدی مرغ دل را کز خدنگ غمزہ اش عمرے
بخاک و خوں چو مرغ نیم بسمل داشتم دارم

جوشش بیان کے نمونے یہ ہیں :

الفتی یزدی

مشت خاشاکیم و داریم آتشی ہمراہ خویش
دور نبود گر بسوزیم از شرارہ آہ خویش

بقائی

بجائے اشک از چشم دل افگار می بارد
ہمہ خون جگر زین ابر آتش بار می بارد

حزنی

خرقہ بر آتش نہم تا بوئے ایماں بشنوی
از کہن دلقی کز و یکتار بے زنار نیست

شیری

بر آن دلی کہ تو ئی یاد دیگری کردن
درون کعبہ پرستیدن ست عزی را

ہم از جہان گرد و پیش یار گرفت
کہ راہ نیست دراں تنگنا تمنی را

روان گو تیز تر می آں کہ از درد فراق
مصر فریاد زلیخا بر تنا بد بیش ازیں

تشبیہات و استعارات کی اچھی مثالیں ان اشعار میں ملتی ہیں :

سلطان:-

دلبری دارم کہ رویش چو گل و مو سنبل است — سنبل پر چین او افتادہ بر برگ گل است

عزیز اللہ -

سبزۂ خط رستہ ز لعلش بسی با آب و تاب — زانکہ دائم می خورد از چشمۂ خورشید آب

محوی -

اے رخ زیبای تو رشک سمن — قامت رعنائی تو سرو چمن
پستۂ خندان تو تنگ شکر — رشتۂ دندان تو در عدن
کاکل مشکین تو دارم بلا — نرگس فتان تو عین فتن
آہوئے چشمان تو مردم شکار — غمزۂ خوں ریز تو ناوک فگن
کار دو د ز لعنت ہمہ جادوگری — شیوۂ چشمت ہمہ خوں ریختن
می کشد از مشک خط جان فزائی — سبزۂ نوخیز تو بر یاسمن
جانب محوی نگر از روی لطف — اے بت سنگین دل سیمیں بدن

فیضی نے بھی اس زمین میں اپنے ابتدائی دور میں کہا تھا

اے قد نیکوئی تو سرو روان — وے خم ابروئے تو شکل کمان
حلقۂ گیسوئے تو دام جنوں — طرۂ ہندوئے تو کام جہاں
ہم لب جادوے تو آب حیات — ہم خط دلجوئی تو خضر زمان
آمدہ آہوئے تو عین بلا — کشتۂ آہوئے تو شیر ژیاں
بستۂ گیسوئے تو فیضی زار — خستۂ ہندوئے تو خلق جہاں

جدت تخیل:-

سلطان:-

با یک چو موئیست میانے کہ تو داری گویا سرآں موست دہانے کہ تو داری

نامعلوم:-

گفتم کہ گمانیست دہانے کہ تو داری گفتا کہ یقین است گمانے کہ تو داری

قادری:-

سرچشمۂ خضر است دہانے کہ تو داری ماہی است دراں چشمۂ لطفے کہ تو داری

غربتی:-

دہان یار من دوش رمزے گفت پنہانی کہ من سرچشمۂ آبِ حیاتم ہیچ می دانی

صرفی:-

بر رخ افگند چاشت گر آں مہ نقاب را پیش از زوال شام رسید آفتاب را

نامعلوم:-

نارے ز زلف خم بہ خم یارم آرزوست یعنی کہ دردمندم و اظہار آرزوست

عناری:-

اظہار در پیش سگ یارم آرزوست یعنی کہ دردمندم و اظہار آرزوست

توسنی:-

شیخ مستغنی بدین و برہمن مغرور کفر مست حسن دوست را با کفر و ایماں کار نیست

انیسی:-

آتش کدہ است دل ز خیال تو ور برو داغ تو ہندوئے کہ نگہبان آتش است

عشق کی خستگی اور برشتگی کی حسبِ ذیل مثالوں سے لطف لیا جا سکتا ہے:-

دوائی:۔

ہیچ دیوانی نشد پیدا کہ تعمیرے نداشت   درد بے درمان عشق است اینکہ تدبیرے نداشت
درشب زلف سیاہش خواب مرگم دربود   بوالعجب خوابے پریشانی کہ تعبیرے نداشت
وہ چہ عاشق کش نگاہی بود وآں منزل کجاست   کاندرو پیدا نشد یک سینہ کہ تیرے نداشت

روز ہجراں کہ دم سوختن است   کار جاں شعلہ برافروختن است
درشبِ ہجر کہ جاں باید باخت   کار دل درد و غم اندوختن است
اے جدائی چہ بلائے کہ مدام   دوزخ از بیم تو درسوختن است
زاں دو جادو طلب عشوہ وناز   مست را عربدہ آموختن است
اے دوائی طلب وصل بتاں   شعلہ و پنبہ بہم دوختن است

شکیبی اصفہانی:۔

ہنوز نالۂ شب ہائے من اثر دارد   کماں شکستہ و من تیر کارگر دارد
دلم بہ ہجر درآویخت رحمتی اے بخت   کہ دست عربدہ با کوہ درکمر دارد
توکل بدامن یاراں نشاں کہ خستۂ ہجر   بنوک ہر مژہ صد پارۂ جگر دارد

صبوری ہمدانی:۔

سپردم جان من بے صبر و دل از داغ ہجرانش   چہ در دست ایں کہ غیر از جاں سپردن نیست درمانش
چو سوز آشکارم بیش از اظہار نمی گردد   جہاں آگاہ سازم از جدا اعتنائے پنہانش
چو در شبگوں لباس آں مہ بسیر شب بروں آید   فروغ صبح ظاہر گردد از چاک گریبانش

رندانہ مضامین کا یہ رنگ رہا:

قدسی:۔

صومعۂ طاعتم گوشۂ میخانہ شد / صیحۂ درویشم نعرۂ مستانہ شد
خرقۂ زہد و صلاح درگرو بادہ رفت / غلغل تسبیح و ذکر قلقل پیمانہ شد
قدسی بے خانماں سوئے حرم می شتافت / زد صنمے راہ او جانب بتخانہ شد

یوسف :-

خوش وقت آنکہ جائے میخانہ ساختہ / دریائے خم بہ ساغر و پیمانہ ساختہ
آں کس کہ دادہ شیوۂ مستی بچشم یار / ستم از اں دو نرگس مستانہ ساختہ

نشائی :-

محتسب دوش خم شکست و آب آتش ناک ریخت / خاک من برباد داد و خون من بر خاک ریخت

ودائی ہروی :-

نہ از شراب بہ بزم تو ہر زماں روم از خود / پیالہ لعل تو بوسہ زد و شک آں روم از خود

طالعی یزدی :-

ساقیا چند تواں خورد غم عالم را / بادہ پیش آر کہ بیروں کنم از دل غم را

اس دور کے باکمال شعرا اپنی قصیدہ نگاری میں اس صنف کے گذشتہ اساتذہ کی تقلید کرکے اپنے شاعرانہ فن کی مہارت کا اظہار کرتے رہے، مثلاً

انوری :-

اے قاعدۂ تازہ ز دست تو کرم را / اے مرتبۂ نو ز بنان تو قلم را

عرفی :-

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را / ہمت نخورد نشتر لا و نعم را

نظیری :-

چوں نالہ نہم بر سر افلاک قدم را / از ضعف بروں آورم احسان و کرم را

شکیبی

از صفحۂ امتیاز ستردیم رقم را حرفی ننوشتیم و شکستیم قلم را

خاقانی

صبح خیزاں بیں قیامت درجہاں انگیختہ نعرہا شاں نفخ صور از ہر دہاں انگیختہ

عرفی

اے متاع درد در بازار جاں انگیختہ گوہر ہر سود در جیب زیاں انداختہ

خاقانی

آں مصر مملکت کہ شنیدی خراب شد واں نیل مکرمت کہ بدیدی سراب شد

نظیری

اں بخت فتنہ جو کہ تو دیدی بخواب شد واں دل کہ بود سخت تر از خارہ آب شد

خاقانی

سلسلۂ ابر گشت زلف زرہ شان او قرصۂ خورشید شد گوئی گریبان او

نظیری

ادبجز امش چو سیل ما ہمہ ویران او ہرچہ زما شد خراب رفت بجولان او

ہندوستان کے یہ شعراء اپنی صلاحیت، لیاقت اور ذہانت کا سارا زور صرف کر کے اپنے کو انوری، خاقانی، اور اسمٰعیل اصفہانی کی صف میں لا کر کھڑا کرنا چاہتے، عرفی تو اپنی قصیدہ نگاری کا طالب تو ابو الفرج رونی اور انوری کی روح سے ہوا ہے، اور بقول مولانا شبلی کہ کلام جس کی ابتدا، نظامی نے کی تھی، عرفی نے اس کو کمال تک پہنچایا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ قصیدہ گویوں کا بادشاہ مانا جاتا ہے، لیکن پختگی کے سوا مضمون آفرینی، اور زور کلام

یں عرفی سے اُس کو کچھ نسبت نہیں، (شعرالعجم جلد پنجم ص ۱۱) ہندوستان کے تذکرہ نگار ز
قصیدہ نگاروں میں شکیبی کے قصائد کی صفائی کو رشک قطرات سحاب اور اس کی پا
کو غیرت گوہر سیراب بتاتے ہیں، ثنائی کو طلاقت بیان اور غدویت رسان میں عراق ا
خراسان میں بے نظیر کہا ہے، اور ظہوری کو بہارستان الفاظ ورمعانی کے ریاض او
ونکتہ دانی کے گلزار کو سرسبز اور سیراب کرنے والا کہا ہے، ایران والے اس قسم کے
عقیدت سے اتفاق نہ کریں لیکن یہ شاعری ہندوستان کی قیمتی ادبی وراثت ہیں ؤ
تو ہندوستانیوں کو اس پر فخر ہے،

ان شعراء پر وہی اعتراضات کئے جا سکتے ہیں، جو اور قصیدہ نگاروں پر ہوتے آ
یعنی یہ کہ اس میں جھوٹ، مبالغہ، صریح خوشامد، ادعائے بے معنی تعلی بے جا، شکوہ بے
اور اسی قسم کی اور باتیں ہوتی ہیں، جو صدق وراستی کی منافی ہیں، یہ بڑی حد تک
اکبری دور کے قصیدہ نگار بھی ان باتوں سے بری نہ تھے، نعتیہ قصیدوں سے مذہبی ؤ
یں تو کچھ گرمی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اور تمام قصیدوں میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی۔
قومی اخلاق و سیرت کے بنانے میں معاون ہوئی ہو، مولانا شبلی رقمطراز ہیں کہ اکبرا
خانخاناں...... کے سیکڑوں معرکے تاریخی یادگار ہیں، جن کے بیان سے مردہ دلوں
جنبش پیدا ہو سکتی ہے، عرفی نظیری، اور فیضی وغیرہ نے ان لوگوں کی مدح میں سیکڑوں پرزور
لکھے لیکن ان معرکوں کا کہیں نام تک نہ آیا، (شعرالعجم جلد پنجم ص ۴۳) اس لحاظ سے بہت
ایسے قصائد ہیں جن سے تاریخی افادیت حاصل کی جا سکتی ہے اگر یہی زور بیان اخلاق و کردا
سنوارنے کی خاطر صرف کیا جاتا تو یہ صنف کیسی مفید ثابت ہوتی،

مگر اس قسم کے اعتراضات کے جوابات قصیدہ نگاری کی مدافعت میں دیئے جاچکے

یہ کہ مبالغہ آمیز مداحی کسی خوشامد یا تملق کی دلیل نہ تھی، اس زمانہ میں عام طور سے شعرا اپنے جوشِ طبیعت کی جولانیاں قصائد میں دکھانے کے سلسلہ میں آسمان و زمین کے قلابے ملایا کرتے تھے، ان سے مراد ممدوح کی چاپلوسی نہیں ہوتی تھی، مادح اور ممدوح دونوں سمجھتے تھے کہ مدح میں جو خیالات ادا کیے گئے ہیں، ان کا تعلق حقیقت سے نہیں، فن شاعری سے ہے، شاعر محض اپنا زورِ طبع اور کمالِ فن دکھانا چاہتا ہے، پھر قصائد میں جو جولانیِ طبع، زورِ بیان، خیال آرائی، مضمون آفرینی، قوتِ ایجاد، ترکیبوں کی دلآویزی، بندش کی چستی اور استعارات و تشبیہات کی دلفریبی وغیرہ دکھائی گئی، ان سے فنِ شاعری کو گوناگوں فوائد پہنچے ہیں، روشن پہلو اکبری دور کے قصائد میں بھی دیکھے جاتے ہیں، وہ شہسوارِ سخن بنکر سنگلاخ زمینوں میں بھی دوڑتے نظر آتے ہیں، زمین کی سنگلاخی یا قافیوں کی دشواری ان کے لیے سدِّ راہ نہیں ہوتی، انکی طبیعت کی تیزی، مضامین کی تخم ریزی، پتھریلی زمین کو بھی گلزار بناتی رہی۔

اس زمانہ میں منظوم معما گوئی کا بھی رواج رہا حتی کہ فیضی نے بھی اس میں طبع آزمائی کی (بدایونی جلد سوم ص ۲۹۹) گو بعد میں اس کو چھوڑ دیا، قاسم کاہی بھی کبھی کبھی معما کہا کرتا تھا، بسم اللہ پر اسکا معما ہے:-

نیست از ہستیش کسے آگر   ابدا کان لانہا نہایتہ لہٗ

اسی طرح اسم نبی پر اس نے معما کہا:

تا رہ شرع راشتافتہ ام   از محمد نبی شگافتہ ام

جعفر ہروی نے میرزا عزیز کوکہ کے نام پر پوری ایک غزل معما لکھی تھی (بدایونی جلد سوم ص ۲۱۵) میر حیدر رفیعی کاشی کے نام کا تو جزو معمائی بھی تھا، فنِ معما اور تاریخ گوئی میں اسکا کوئی جواب نہیں تھا، ان دونوں چیزوں کے علاوہ وہ کسی اور فن کو اہمیت نہیں دیتا تھا، ایک روز فیضی نے اس سے کہا کہ ہندوستان میں معما متروک ہو گیا ہے، اور اب یہ عیب سمجھا جاتا ہے،

اس نے جواب دیا کہ میں نے ولایت میں برسوں اس فن کے لیے تکلیف اٹھائی ہے، اب جبکہ اس فن میں بوڑھا ہو گیا ہوں کس طرح چھوڑ سکتا ہوں (بدایونی جلد سوم ص ۲۲۳)، شیری بھی علم عروض کے ساتھ معما گوئی میں بے نظیر تھا (ایضاً ص ۲۴۰)، فہمی سمرقندی کی معما گوئی بھی مشہور رہی (ایضاً ص ۲۹۴)، میر محسن رضوی مشہدی نے اسم رُخ پر یہ معما کہا ہے (ایضاً ص ۳۲۴)

اے زلف کجت رہزن جانہا زعتاب ... وی درد تو مرہم نزد لہا ی خراب
عکس زلب تو گشتہ در آب عیاں ... یا برگ گلے فتادہ در جام شراب

اس زمانہ کے ایک امیر حسین شاہ کے نام پر اس نے یہ معما کہا:

آں مہ کہ بدیدہ جانگاہش نیکوست ... منظور نظر رخی چو جاہش نیکوست
محسن سر خود نہادہ بر پایش ... چو مہر صفت عارض ماہش نیکوست

محوی نے اسم قاسم کا یہ معما کہا تھا (ایضاً ص ۳۲۲)

شوخی کہ بود خاک درش منزل من ... جز جور و جفا نیست ازو حاصل من
از گوشۂ ایام چوں رخش رانیم ... چشمش فگند تیر جفا بر دل من

تاریخ گوئی کا بھی عام رواج تھا، رفیعی معمائی نے ایک رباعی کہی تھی جس سے ۲۰ تاریخیں نکلتی تھیں، (بدایونی جلد سوم ص ۲۴۴-۲۲۳)، خواجہ حسین مروی نے شہزادہ سلیم کی ولادت کے موقع پر ایک طویل قصیدہ کہا جس کے پہلے مصرع سے اکبر کی تاریخ جلوس اور دوسرے سے سلیم کی تاریخ ولادت نکلتی تھی، قصیدہ کا مطلع یہ تھا:-

للہ الحمد از پے جاہ و جلال شہریار ... گوہر مجد از محیط عدل آمد برکنار

بات بات پر قطعۂ تاریخ کہا جاتا، ولادت، شادی بیاہ، وفات، فتح، سفر، کسی کتاب کی تالیف کے موقع پر پھڑکتی ہوئی تاریخ کہہ کر ادبی دنیا میں برابر داد طلب کی جاتی رہی،

اور بعض تاریخ تو ایسی ہوتی کہ زبان زد عوام وخواص ہو جاتی، اور بعض تکلیف دہ بھی ہوتیں مثلاً فیضی ۱۰۰۴ھ میں مرا تو اس کی وفات پر کچھ شعرا نے یہ تاریخیں کہیں۔

(بدایونی جلد سوم ص ۳۰۰-۳۰۱)

فیضی بے دین چو مرد سال فاتش | گفت سگے از جہاں رفتہ بحال قبیح

سال تاریخ فیضی مردار | شد مقرر بجا ر مذہب نار

فیضی بخش دشمن نبوی | رفت و باخویش داغ لعنت برد

سگکی بود و دوزخی زاں شد | سال فوتش چہ سگ پرستی مرد

چو بنا چار رفت شد ناچار | سال تاریخ خالد فی النار

بزم تیموریہ جلد اول

بزم تیموریہ کے پہلے اڈیشن میں مغل سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر اور تمام تیموری شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور انکے دربار کے امرا، شعرا، اور فضلا کے مختصر تذکرہ کے ساتھ انکے علمی کمالات کی تفصیل بیان کی گئی تھی جس کو ارباب ذوق تحقیق نے بیحد پسند کیا، اور اس کے حوالے اپنے مقالات اور تصنیفات میں دیے، اب اسی کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ تمام مغل سلاطین اور ان کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں مغل سلاطین میں سے پہلے کے تین شہنشاہوں یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے عہد کے امرا و شعرا، و ارباب فضل و کمال کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور دوسری جلد میں بقیہ مغل سلاطین اور انکے دربار کے علمار، فضلاء و شعرا کا تذکرہ ہوگا۔

اسمیں اس قدر اضافے ہوئے ہیں کہ بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے پہلے سے کہیں جامع اور مکمل۔

(زیر طبع) مینیجر

تہذیب کی تشکیل جدید

از جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

سنبھالنے کی طاقت | قیوم وہ ہے جو نہ صرف اپنی ذات سے قائم ہے بلکہ دوسروں کے بھی قیام کا سبب بنے، لغت میں ہے

القیوم القائم الحافظ بکل شئ والمعطی لہ ما بہ قوامہ[۱]	قیوم وہ ہے جو خود قائم ہو، ہر شے کی حفاظت کرتا ہو اور جس شی کا قیام ہو وہ اس کو دیتا ہو،

دوسری جگہ ہے:۔

وھو مع ذٰلک یقوم بہ کل موجود حتی لا یتصور وجود شئ ولا دوام وجود الا بہ[۲]	خود کے مستقل قیام کے ساتھ اس کے ذریعہ ہر موجود کا قیام ہو کہ کسی شی کا وجود اور وجود کا دوام اسکے بغیر تصور نہ کیا جا سکے،

اس کے عکس سے زندگی میں استقلال اور غیر اللہ سے بے نیازی پیدا ہوتی ہے اور انسانی ہمدردی کے ساتھ دوسروں کے قیام میں مدد کرنا اور ان کو سنبھالنا ہے، قرآن حکیم میں ہے،

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ	اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے،

---

[۱] راغب اصفہانی مفردات القرآن [۲] زبیدی تاج العروس

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ — قیوم ہے، نہ اس کو اونگھ ہوا ور نہ نیند ہے ۱
(بقرہ : ۳۴)

دوسری جگہ ہے

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ — اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے
نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ — قیوم ہے، اسی نے آپ پر سچائی کے ساتھ
(آل عمران : ۱) — قرآن حکیم اتارا،

حقائق اشیاء کی معرفت | اس سے چیزوں کی حقیقت اور ان کے خواص و اثرات کی دریافت ہوتی ہے، جس کے ذریعہ انسان نئے نئے انکشافات اور ترقی کے مدارج طے کرتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی صفت عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (وہ غیبوں کا جاننے والا ہے) کا عکس ہے، آدمؑ کے بارے میں ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا — اور اللہ نے آدم کو کل "الاسماء" سکھائے۔
(بقرہ : ۳۱)

قرینہ سے الاسماء کا الف لام عہد کا معلوم ہوتا ہے، مراد کچھ خاص اسماء ہیں جن کا کل مراد ہے،[۱] الاسماء کی یہ تفسیر کی گئی ہے:-

الهمه معرفة ذوات الاشياء — اللہ نے آدم کو اشیاء کی ذات، خواص اور
وخواصها واسمائها واصول — نام نیز علم کے اصول صنعتوں کے قوانین
العلوم وقوانين الصناعات — اور آلات کی کیفیت الہام کی،
وكيفية آلاتها[۲]

تفسیر کبیر میں ہے

علمه صفات الاشياء ونعوتها — خدا نے آدم کو اشیاء کی صفت اور ان کے
وخواصها[۳] — خواص سکھائے۔

۱؎ امین احسن، تدبر قرآن ۲؎ قاضی عبداللہ بیضاوی

کشاف میں ہے:-

علم آدم مسمیات الاشیاء کشاف اللہ نے آدم کو چیزوں کے مسمی سکھائے

پھر جب آدم نے نام بتادیے اور فرشتے نہ بتاسکے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (البقرہ-۴) — کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب جانتا ہوں

ایجاد و اختراع | اس کے ذریعہ انسان ریسرچ اور تحقیق سے نئے نئے ایجادات کرتا اور موجودہ ترقیات کو آگے بڑھاتا ہے جس سے اللہ کی قدرت و عظمت ظاہر ہوتی اور اس کی مخلوقات کو فائدہ پہنچتا ہے، یہ صفتِ ابداع کا عکس ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:-

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (البقرہ-۱۴) — وہ آسمانوں اور زمین کا ایجاد کرنے والا ہے جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

دوسری جگہ ہے:

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ (انعام-۱۳) — وہ آسمانوں و زمین کا موجد ہے، اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے،

صناعی و کاریگری | اس سے انسان صنعت و کاریگری کی طرف مائل ہوتا اور مختلف قسم کی صنعتوں کے ذریعہ چیزوں کو استحکام بخشتا ہے۔ یہ پورا کارخانہ اللہ تعالیٰ کی صنعت صناعی کی بدولت قائم ہے، جس کا عکس انسان پر پڑتا ہے، اور حسب استعداد وہ اس کو جذب کرتا ہے،

قرآن حکیم میں ہے

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ (نمل - ۷) اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر شی کو مضبوط کیا

اسرار و حکم کی معرفت | اس سے انسان کو حکمتوں اور علتوں کا علم ہوتا ہے، جس کے ذریعہ حالات و واقعات کا صحیح تجزیہ کرنے میں سہولت اور شخصی و جماعتی زندگی کی معرفت حاصل ہوتی اور ہر شی کو مناسب محل میں رکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی صفت العلیم الحکیم اور علیم بذات الصدور (دلوں کی بات کو جاننے والا) کا ذکر بار بار ہے،

دوسری جگہ ہے :-

یُؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا (بقرہ - ۳۷)	اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت کی دولت مل گئی تو سمجھو کہ بڑی دولت مل گئی۔

ائمۂ لغت و مفسرین نے حکمت کے یہ معنی بیان کیے ہیں :

الحکمة اصابة الحق بالعلم والعقل[1]	علم اور عقل کے ذریعہ سچی اور صحیح بات کو پہنچنا حکمت ہے۔

لسان العرب میں ہے :-

الحکمة عبارة عن معرفة افضل الاشیاء بافضل العلوم[2]	افضل اور بہترین چیزوں کو بہترین علوم کے ذریعہ جاننا حکمت ہے،

مفسرین کی تصریحات یہ ہیں :-

(۱) معرفة الاشیاء بحقائقها	حقائق اشیا کی معرفت
(۲) الفصل بین الحق والباطل	حق و باطل کے درمیان فیصلہ کی قوت

---

[1] راغب اصفہانی، مفردات القرآن [2] علی بن محمد، تفسیر خازن ص ۲۰۸ و قاضی ثناء اللہ، تفسیر مظہری ص ۱۴۸

(۳) الاصابۃ فی القول والعمل[۱] قول وعمل میں درستی کو پہنچنا

(۴) وہ معارف واحکام جن سے نفوس انسانی کمال کو پہنچیں مایکمل نفوسہم من المعارف

کام۔ ان کے علاوہ اور بھی ہیں مثلاً: (۵) انوار قلوب کی معرفت اور اسرار نبوت سے

نفیت (۶) نفس اور شیطان کی دقیقہ رسی سے آگاہی (۷) شیطانی اور انسانی تقاضوں

امتیاز کی قوت (۸) عقل کی رہنمائی اور قلب کی بصیرت (۹) برائیوں کی صحیح نشاندہی

اس کے علاج کی صحیح تدبیر (۱۰) مخلوق کے احوال کا علم (۱۱) خاص قسم کی فراست (قیافہ

شناسی) وغیرہ،

ابن مسکویہ نے حکمت کے تحت یہ چیزیں بیان کی ہیں:

ذکاوت وذہانت، سرعت فہم، قوت فہم، ذہن کی صفائی، عقل کی رسائی، اور

سیکھنے کی سہولت وغیرہ،[۲]

ان چیزوں کے ذکر کے بعد کہتے ہیں:

وبھذہ الاشیاء یکون حسن الاستعداد للحکمۃ[۳]	ان ہی چیزوں کے ذریعہ حکمت کی حسن استعداد پیدا ہوتی ہے،

گیریت | (۷) ہمہ گیریت، اس سے ذہن وفکر میں وسعت پیدا ہوتی اور چیزوں کو سمجھنے اور

زندگاقتدار کو وسیع کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ یہ صفت "محیط" کا عکس ہے، اور قرآن حکیم میں

بار ذکر کی گئی ہے،

وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ (البقرہ: ۳۴)	اللہ جتنا چاہے اس کے علاوہ اور کسی چیز کا اس کے علم سے لوگ احاطہ نہیں کر سکتے،

بو محمد از رسالہ ابن ابی النصر، عرائس البیان فی حقائق القرآن ص ۱۶ [۲] ابن مسکویہ، تہذیب الاخلاق ص ۸

یکتائیت

(۸) یکتائیت ۔ اس سے زندگی میں وہ خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں، جن سے دوسرے کے مقابلہ میں یکتائی پیدا ہوتی ہے، یہ ان صفات کا عکس ہے جن سے اللہ کا بے مثل ہونا ظاہر ہے، قرآن حکیم میں ہے،

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (شوریٰ - ۲) اللہ کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

مذکورہ تفصیلات سے ظاہر ہے کہ تشکیل جدید میں سیرت انسانی کا پیمانہ کیا ہے، اور اس سے کس قسم کی سیرت تعمیر ہوتی ہے؟

مغربی تہذیب میں خاندانی نظام درہم برہم ہو چکا ہو جس سے ہر شخص اپنے کو اجنبی و تنہا محسوس کرتا ہے

شخصی و انفرادی زندگی کی تعمیر اجتماعی زندگی میں عائلی تنظیم ہوتی ہے، جس کی ابتدا خاندانی نظام سے ہوتا ہے، مغربی تہذیب میں یہ نظام درہم برہم ہو چکا ہے، جس سے باہمی خلوص و محبت اور ہمدردی کے جذبات سرد پڑ گئے ہیں، اور ہر شخص اپنے کو تنہا اور اجنبی محسوس کرنے لگا ہے،[۱] ٹی او ہل، زلالوف ۶۵

تشکیل جدید میں خاندانی نسبت سے باہمی خلوص و محبت کی تاکید ہے

تشکیل جدید میں خاندانی نظام اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے، اور اس کے قیام کے لیے باہمی خلوص و محبت اور ہمدردی کی خاص تاکید ہے، قرآن حکیم کی متعدد آیتوں میں مختلف انداز سے اس کا ذکر کیا گیا ہے،

وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ (نساء - ۱)　　اور تم اللہ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو، اور قرابت سے بھی ڈرو،

الارحام کی تفسیر اور اس کا محل استعمال

'الارحام' رحم کی جمع ہے، جس کے اصلی معنی عورت کے رحم کے اور مجازی معنی رشتہ داری و قرابت کے ہیں،

الرحم رحم المرءۃ ومنہ استعیر　　رحم کے معنی عورت کے رحم کے ہیں، خاندان

الرحم للقرابۃ لکونہم خارجین من رحم　　کے لوگ چونکہ ایک رحم سے نکلتے ہیں اس بنا پر

واحارۃ[۱] — قرابت کے معنی میں اسکو مستعار لیا گیا ہے

من المجاز الرحم القرابة وبینهما — رحم کے مجازی معنی قرابت کے ہیں، عرب میں جب

رحم ای قرابة قریبة[۲] — کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان "رحم" ہے تو اس سے مراد قرابت قریبہ ہوتی ہے

"رحم" میں محرم وغیر محرم دونوں قسم کے قریبی رشتہ دار داخل ہیں،

الرحم اسم بکافة الاقارب — "رحم" تمام قرابتداروں کا نام ہے، اس میں

من غیر فرق بین المحرم وغیرہ[۳] — محرم وغیر محرم کی تفریق نہیں ہے

اس آیت میں لفظ "اللہ" پر الارحام کے عطف سے صلہ رحمی کی تاکید اور قطع رحمی کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، ابوبکر جصاص کہتے ہیں۔

فیه تعظیم لحق الرحم وتاکید للنهی عن قطعها[۴] — اس میں رحم کے حق کی تاکید اور اسکے قطع کی ممانعت ہے،

ابن حیان کہتے ہیں:-

وفی عطف الارحام علی اسم — اللہ کے نام پر "الارحام" کے عطف سے ثابت ہوتا

اللہ دلالة علی عظم ذنب قطع الرحم[۵] — ہے کہ قطع رحمی بڑا گناہ ہے،

سرتی آیتوں سے خاندانی بت کی اہمیت — خاندان کی نسبت سے ہمدردی و بھلائی کا تعلق زندگی تک محدود نہیں ہے، بلکہ مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے، ورثہ میں مال و دولت کی

یم کا حکم اسی بنا پر ہے،

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی — اور ان میں کے قرابتدار ایک دوسرے کی (میراث)

بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ۔ الانفال ۷۵ — کے زیادہ حقدار ہیں،

یہ خاندانی نسبت اتنی قوی ہے کہ اختلاف مذہب سے بھی رشتہ نہیں ٹوٹتا، اور ان سے

---

[۱] راغب اصفہانی مفردات القرآن [۲] زبیدی، تاج العروس [۳] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن [۴] جصاص رازی، احکام القرآن [۵] ابن حیان، البحر المحیط

محبت کا مطالبہ قائم رہتا ہے، رسول اللہؐ نے اپنے رشتہ داروں سے فرمایا تھا،

قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی (شوریٰ - ۳)

میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں چاہتا ہوں، سوائے اس کے کہ قرابت میں دوستی ومحبت کا خیال کرو،

اس رشتہ کو جو لوگ توڑتے ہیں، قرآن حکیم نے انکو فاسق اور گمراہی کا مستحق ٹھہرایا ہے،

وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ (بقرہ : ۳)

اور اس کے ذریعہ اللہ فاسق ہی کو گمراہ کرتا ہے جو اللہ سے عہد باندھکر توڑتے ہیں اور جس رشتہ کے جوڑنے کا حکم دیا اس کو قطع کرتے ہیں، اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔

رسول اللہ صلعم نے مختلف تعبیرات کے ذریعہ اسکی اہمیت بیان کی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پیرایوں میں اس نسبت کی فضیلت اور اس کو برقرار رکھنے کی اہمیت بیان کی ہے، مثلاً

قال اللہ تبارک وتعالیٰ انا اللہ وانا الرحمٰن خلقت الرحم وشققت لها من اسمی فمن وصلها وصلته ومن قطعها بتته [1]

اللہ نے فرمایا میں اللہ ہوں، میں رحمٰن ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا اور اپنے نام سے اس کو نکالا، جو شخص اسکو جوڑیگا میں اسکو جوڑونگا جو اسکو توڑیگا میں بھی اسکو توڑدونگا،

دوسری جگہ ہے:-

الرحم شجنة من الرحمٰن فقال

"رحم" رحمٰن سے لپٹی ہوئی شاخ ہے، اللہ

۱؎ ابوداؤد ومشکوٰۃ باب البر والصلہ

اللہ من وصلک وصلتہ و من قطعک قطعتہ[1]

نے فرمایا جس نے تجھکو جوڑا میں اس کو جوڑوں گا، جس نے تجھکو قطع کیا میں اسکو قطع کروں گا ،

تیسری جگہ ہے :-

خلق اللہ الخلق فلما فرغ منہ قامت الرحم فاخذت بحقوی الرحمن فقال مہ قالت ھذا مقام العائذ بک من القطیعۃ قال الا ترضین ان اصل من وصلک واقطع من قطعک قالت بلی یا رب[2]

اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا، جب اس سے فارغ ہوا تو رحم کھڑی ہوئی اور اس نے رحمٰن کی کمر پکڑی، رحمٰن نے کہا ٹھہر جا، اس نے کہا یہ اسکی جگہ ہے جو تجھ سے پناہ مانگتا ہے، رحمٰن نے کہا کیا تو اس سے راضی نہیں ہے کہ میں اس کو ملاؤں جو تجھے ملائے اور اس کو جدا کروں جو تجھکو جدا کرے، اس نے جواب دیا کہ میں راضی ہوں ،

ایک اور جگہ ہے :

الرحم معلقۃ بالعرش تقول من وصلنی وصلہ اللہ ومن قطعنی قطعہ اللہ[3]

"رحم" عرش سے معلق ہے، وہ کہتا ہے کہ جو شخص مجھے ملائیگا اللہ اسکو ملائیگا اور جو مجھے قطع کریگا اللہ اس کو قطع کریگا ،

مغربی تہذیب میں اولاد اور ماں باپ پرورش نگہداشت کی ذمہ داری نہیں لیتے ہیں

مغربی تہذیب میں ماں باپ اور اولاد ایک دوسرے پر بوجھ بن گئے ہیں ، اور ان کے درمیان حقوق و فرائض

---

۱ بخاری و مسلم کتاب البر والصلۃ ۲ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ ،

کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے، بچوں کی پرورش و نگہداشت kindergarten میں ہوتی ہے اور بوڑھے ماں باپ کی نگہداشت ان گھروں میں ہوتی ہے جو خاص ان کے لیے علیحدہ بنائے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے نہ وہ فطری جذبات پرورش پا سکتے ہیں جو خونی رشتہ کے لیے ناگزیر ہیں، اور نہ وہ جذبات بر روئے کار آ سکتے ہیں جو باہمی خلوص و محبت کے لیے درکار ہیں۔[1]

تشکیل جدید میں فطری جذبات کے پیش نظر حقوق و فرائض کی تفصیل ہے،

تشکیل جدید میں انسان کے فطری جذبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں کے درمیان تعلق کو زیادہ سے زیادہ قوت پہنچائی گئی اور مختلف انداز سے ان کے حقوق و فرائض کی تفصیل بیان کر کے ان کی اہمیت ظاہر کی گئی ہے، قرآن حکیم کی بہت سی آیتوں میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید ہے، اور اکثر جگہ یہ تاکید توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہے، جس سے غالباً یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان کے پیدائش کی علت فاعلی (اللہ کی ذات) اور علت مادی (والدین کی ذات) دونوں کے حقوق کا یکساں خیال رکھنا ضروری ہے، صرف تقدم و تاخر کا فرق ہے، اس سے متعلق چند آیتیں یہ ہیں۔

وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا

اور آپ کے رب نے یہ حکم دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو، اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف (تک) بھی نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو، اور ان سے ادب کے ساتھ

---

[1] مصلح الدین۔ سماجیات حصہ اول ص ۲۲۴

جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ	نرم بات کہو اور ان کے آگے اطاعت کا
وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا	بازو محبت سے جھکائے رہو اور یہ دعا
رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا	کرو کہ اے میرے پروردگار ان پر رحم
	فرما جس طرح انھوں نے بچپن میں میری
(نساء : ۵)	پرورش کی

دوسری آیت میں ہے :-

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا	اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے
بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا	ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین
(نساء : ۵)	کے ساتھ احسان کرو ۔

تیسری آیت میں ہے :

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم	آؤ، میں تمھیں سنا دوں جو تمھارے رب نے
ان لا تشرکوا به شیئا وَّ	حرام کیا ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی کو شریک
بالْوالِدَيْنِ اِحْسَانًا (انعام: ۱۸)	نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کرو

بچوں کی پرورش میں چونکہ ماں کو زیادہ مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے، اس لیے احسان و سلوک میں اس کو زیادہ اہمیت دی گئی ۔

قرآن حکیم میں ہے :

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ	ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے
حملته امه وهنا علی وهن	بارہ میں حکم دیا ہے، اسکی ماں نے اس کو
وفصاله فی عامین ان اشکرلی	تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دو سال

ولوالدیک الی المصیر — میں دودھ چھڑایا یہ کہ میرا اور والدین کا شکر کرو، میرا اور والدین کا حق مانو، میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے،

(لقمان : ۱)

دوسری جگہ ہے :

ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا حملتہ امہ لدھا ووضعتہ لدھا (احقاف:۲) — ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ احسان کا حکم دیا، ان نے اس کو مشقت کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور مشقت کے ساتھ اسکو جنا،

والدین کے ساتھ حسن سلوک سے متعلق چند حدیثیں یہ ہیں :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا :

ما حق الوالدین علی ولدھا — اولاد پر والدین کا کیا حق ہے، آپ نے فرمایا

قال ھما جنتک ونارک — وہ دونوں تیری جنت ہیں یا دوزخ ہیں،

(ابن ماجہ وشکوٰۃ باب البر والصلہ)

دوسری حدیث میں ہے :

رضی الرب فی رضی الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد — اللہ کی رضامندی باپ (والدین) کی رضامندی پر موقوف ہے، اور اللہ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی پر موقوف ہے،

(ترمذی وشکوٰۃ باب البر والصلہ)

تیسری حدیث میں ہے :

رغم انفہ رغم انفہ رغم انفہ قیل من یا رسول اللہ قال من ادرک والدیہ عند الکبر احدھما — اسکی ناک خاک آلود ہو، اسکی ناک خاک آلود ہو، اسکی ناک خاک آلود ہو (یہ ذلت وخواری کے لیے محاورہ ہے) عرض کیا گیا کس کی یا رسول اللہ

او کلاھما ثم لم یدخل الجنۃ — فرمایا کہ جس شخص نے اپنے ماں باپ کو یا دونوں

(مسلم و مشکوٰۃ باب البر والصلۃ) — میں ایک کو پایا اور جنت میں نہ داخل ہوا،

قرآن حکیم کی طرح احادیث میں بھی ماں کو مقدم رکھنے کا حکم ہے، ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے حسن سلوک کا کون زیادہ حقدار ہے، آپ نے فرمایا تیری ماں، اس نے کہا پھر کون، فرمایا تیری ماں، اس نے کہا پھر کون، فرمایا تیری ماں، اس نے کہا پھر کون فرمایا تیرا باپ، (بخاری و مسلم کتاب البر والصلۃ)

ایک شخص نے ماں باپ کے مرنے کے بعد انکے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، آپ نے فرمایا کہ ان کے لیے مغفرت کی دعا کرنا، ان کے عہد و پیمان کو پورا کرنا، انکی نسبت سے لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا اور ان کے دوستوں کی عزت کرنا،

اختلاف مذہب کے باوجود والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے، حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ نے جب اپنی مشرکہ ماں کے بارے میں سوال کیا، تو آپ نے انکے ساتھ صلہ رحمی کی تاکید کی، (بخاری و مسلم)

ماں باپ پر اولاد کے حقوق میں سب سے مقدم پرورش ہے — تشکیل جدید میں جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں اسی طرح اولاد کے حقوق ماں باپ پر ہیں، ان میں سب سے مقدم پرورش ہے،

قرآن حکیم نے پیدائش سے پہلے ماں باپ کی خواہش اور دعا کا ذکر اس طرح کیا ہے،

لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحاً لَنَكُونَنَّ — اے اللہ اگر آپ ہمیں صالح بچہ دیں

مِنَ الشَّاكِرِينَ (اعراف: ۲۳) — تو ہم تیرا شکر کریں گے،

لفظ "صالح" سے خاص قسم کے اعمال و افعال مراد لیے جاتے ہیں، لیکن موقع کے لحاظ سے اسکا مفہوم بدلتا رہتا ہے[1]، اس موقع پر "صالح" کا مفہوم مفسرین نے یہ بیان کیا ہے،

---

[1] عروج و زوال کا الٰہی نظام (امینی)

ولدا سویا قد صلح بدنه[1]	تندرست بچہ جس کا جسم درست ہو
سویا مستوی الاعضاء[2]	تندرست جس کے جوڑ بند درست ہوں،
سویا تام الخلق یصلح للقیام	مکمل تندرست جس میں فائدہ بخش انسانی
بالاعمال البشریة النافعة[3]	کام انجام دینے کی صلاحیت ہو،

پرورش اس انداز کی ہو کہ جس چیز کی بچہ کو ضرورت ہے وہ اس کو مل سکے	پرورش اس طرح ہونی چاہئے کہ مناسب طریقہ پر بچہ کی نشو ونما ہو سکے اور اس عمر میں جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسکو

مل سکے، چنانچہ دودھ پلانے کا ذکر قرآن حکیم میں اس طرح ہے

وَالْوَالِدَاتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَ	اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال
هُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ	دودھ پلائیں، یہ ان کے لیے ہے جو دودھ
اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ (بقرہ: ۳۰)	پلانے کی مدت پوری کرنا چاہیں۔

دودھ پلانے کے رشتہ کا اس قدر احترام ہے کہ اگر ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت دودھ پلائے تو اس سے اور اس کی اولاد سے نسبی رشتہ جیسی حرمت ثابت ہو جاتی ہے،

وامهاتکم التی ارضعنکم	اور وہ مائیں حرام ہیں جنھوں نے تمھیں
واخواتکم من الرضاعة	دودھ پلایا، اور تمھاری دودھ شریک
(نساء - ۴)	بہنیں بھی حرام ہیں،

باپ کے ذمہ دودھ پلانے والی کی کفالت ہے، خواہ ماں ہو یا دوسری عورت ہو،

وعلی المولود له رزقهن و	اور لڑکے والے (باپ) پر دودھ پلانے والی
کسوتهن بالمعروف (البقرہ - ۳۰)	ماؤں کا دستور کے مطابق کھانا کپڑا ہے

بچوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیار و محبت کا ذکر متعدد حدیثوں میں ہے، ایک مرتبہ

---

[1] قاضی عبداللہ بیضاوی [2] شیخ سلیمان، الجمل الجمل حاشیہ جلالین [3] عبدہ مصری المنار ج ۹

ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

اتقبلون الصبیان فما نقبلھم	کیا آپ لوگ بچوں کا بوسہ لیتے ہیں، ہم نے
فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	تو کبھی نہیں لیا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ
او املک لک ان نزع اللہ	علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ نے تمہارے دل سے رحمت
من قلبک الرحمۃ (بخاری ومسلم مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق)	نکال دی ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں،

دوسری روایت میں اعرابی کا نام اقرع بن حابس ہے، جس نے رسول اللہ صلعم کو حسنؓ کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھکر کہا تھا کہ میرے دس بچے ہیں، میں ان کا کبھی بوسہ نہیں لیتا، اس پر آپ نے فرمایا:

من لم یرحم لا یرحم (بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد)	جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا،

ایک اور حدیث میں ہے

لیس منا من لم یرحم صغیرنا	جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی
ولم یوقر کبیرنا (ترمذی مشکوٰۃ باب الشفقۃ)	عزت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے،

پیار و محبت کے اظہار میں مساوات کا خیال رکھنا ضروری ہے، یعنی چھوٹے اور بڑے کے درمیان لین دین میں امتیاز نہ برتنا چاہیے، کہ ایک کو عطیہ دے اور دوسرے کو بلا وجہ محروم کردے جس سے اسکی حق تلفی ہوتی ہو، چنانچہ نعمان کے والد نے ایک مرتبہ ان کو عطیہ دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ

اکل ولدک نحلت مثلہ	کیا تم نے سب لڑکوں کو ایسا ہی عطیہ
قال لا قال فارجعہ	دیا ہے، انھوں نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا
(بخاری ومسلم مشکوٰۃ باب العطایا)	کہ اس کو واپس لے لو،

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

ایسرک ان یکونوا الیک	کیا تم پسند کرتے ہو کہ تمھارے سب بیٹے تمھارے
فی البر سواء قال بلیٰ قال	ساتھ حسن سلوک میں برابر ہوں، انھوں نے
فلا اذاً	کہا "ہاں" آپ نے فرمایا پھر ایسا کرو (یعنی ان میں
(بخاری و مسلم و مشکوٰۃ باب العطایا)	عدم مساوات نہ برتو)

ایک دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں:

اتقوا اللہ واعدلوا بین اولادکم	اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان
(ایضاً)	برابری قائم رکھو۔

لڑکیوں کی پرورش کی طرف خصوصی توجہ کا حکم | عربوں میں لڑکیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی، اس لیے رسول اللہ صلعم نے ان کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی، ایک موقع پر فرمایا

من کانت لہ انثی فلم یادھا	جس کے لڑکی ہو اس نے اس کو زندہ رہنے
ولم یھنھا ولم یوثر ولدہ	دیا، اسکی بے توقیری نہ کی اور اس پر لڑکے کو
علیھا ادخلہ اللہ الجنۃ [1]	ترجیح نہ دی تو اللہ اسکو جنت میں داخل کریگا،

دوسری روایت میں ہے:

من ابتلی من ھذہ البنات	جس شخص کی لڑکیاں ہوں اور اس نے
بشئ فاحسن الیھن کن لہ	ان کے ساتھ حسن سلوک کیا تو ان کیلئے
ستراً من النار [2]	دوزخ کی آگ سے حجاب بنجائیں گی۔

ایک اور روایت میں ہے:

---

[1] ابوداؤد و مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق [2] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ باب ایضاً

من عال جاریتین حتی تبلغا	جس شخص نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک
جاء یوم القیمۃ انا وھو ھکذا	کہ وہ بالغ ہوگئیں تو وہ شخص اور میں قیامت
وضم اصابعہ	کے دن ایک ساتھ ہوں گے جیسے انگلیاں
(مسلم و مشکوۃ)	ایک ساتھ ہوتی ہیں،

مناسب پرورش کی خاطر پیدائش کے درمیان وقفہ یا وقت ضرورت ضبط ولادت کی اجازت

بچوں کی مناسب پرورش میں اگر غربت و افلاس حائل ہو تو مختلف تدبیروں کے ذریعہ پیدائش کے درمیان وقفہ اور اگر ضرورت ہو تو ضبط ولادت کی بھی اجازت ہے،

موجودہ ترقی یافتہ زمانہ میں ضبط ولادت کی جو صورتیں رائج ہیں، وہ نزول قرآن کے زمانہ میں نہ تھیں، اس بنا پر قرآن و سنت میں ان کا صریح حکم تلاش کرنا اور نہ ملنے کو بنیاد بناکر اس کے عدم جواز کا فیصلہ کرنا کسی طرح قرین انصاف نہیں ہے، اس مسئلہ میں بنیادی حیثیت سے جو بات دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ "اسلام کے اصول" Fundamental principles) اور کلی پالیسی کے خلاف نہ ہو، اگر خلاف ہے تو بلا رو رعایت عدم جواز کا فیصلہ کردینا چاہیے، اور اگر نہیں ہے تو پھر جواز و عدم جواز کے کسی ایک پہلو پر اصرار قطعاً غیر مناسب ہے، حالات کے لحاظ سے دونوں پہلوؤں کی گنجایش ہونی چاہیے جس طرح حالات کے تحت کبھی کثرت ولادت کی حوصلہ افزائی ناگزیر ہے، اسی طرح حالات کے ماتحت ضبط ولادت کی بھی واقعی ضرورت ہوتی ہے، غالباً اسی لیے قرآن و سنت میں اس کے متعلق کوئی قطعی حکم نہیں دیا گیا ہے،

حالات کے لحاظ سے ضبط ولادت اسلام کے اصول اور کلی پالیسی کے خلاف نہیں ہے

اس سلسلہ میں چند چیزیں پیش کیجاتی ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ حالات کے لحاظ سے ضبط ولادت

اسلام کے اصول اور کلی پالیسی کے خلاف نہیں ہے،

وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ	اور جو شخص تم میں سے اسکی مقدرت نہ رکھتا
يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ	ہو کہ وہ مومنہ عفیفہ عورتوں سے نکاح
مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِنْ فَتَيٰتِكُمُ	کرے تو مومنہ لونڈیوں سے نکاح کرلے

المؤمنات (نساء - ۴)

دوسری جگہ ہے

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ	جو لوگ نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے
نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ	ان کو چاہیے کہ عفت کی زندگی اختیار کریں
(النور : ۴)	یہانتک کہ اللہ انکو اپنے فضل سے الدار کرے

آیتوں سے ثبوت ان آیتوں میں جب غربت و افلاس کو شادی کے باب میں موثر رکاوٹ تسلیم کیا گیا ہے تو وقت ضرورت کثرت اولاد کے باب میں بھی یہ رکاوٹ قابل تسلیم ہونی چاہیے،

(۲) نزول قرآن کے زمانہ میں ضبط ولادت عزل (مادۂ تولید اندر نہ جانے دینا) کی صورت میں رائج تھا، لیکن قرآن حکیم نے اسکو منع نہیں کیا، حضرت جابرؓ نے اس سکوت کو اجازت پر محمول کیا ہے

کنا نعزل والقرآن ینزل	ہم عزل کرتے تھے اور قرآن نازل
(مسلم ج ۱ باب حکم العزل)	ہوتا تھا۔

سفیانؒ کہتے ہیں:

لوکان شیئًا ینھی عنه لنھانا عنه	عزل اگر ممانعت کے لائق ہوتا تو قرآن
القرآن (ایضًا)	اس سے منع کر دیتا۔

(۳) آیت: نساء کم حرث لکم فأتوا حرثکم انی شئتم (بقرہ ۲۸) — تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں، اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ۔

کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ اور ابو حنیفہؒ سے یہ منقول ہے:

کیف شئت ان شئت عزلا او غیر عزل (جصاص رازی، احکام القرآن ج ۱ ص ۴۱۲) — جس طرح چاہو عزل کے ساتھ یا بغیر عزل کے۔

(۴) ذالک ادنی ان لا تعولوا (النساء) کی تفسیر میں زید بن اسلم، جابر بن زید (جلیل القدر تابعین) اور امام شافعی سے منقول ہے

ان لا یکثر عیالکم (لسان العرب ج ۱۳ عول، روح المعانی جز رابع ص ۱۹۱ للسید محمود آلوسی والکشاف ص ۲۲۶ ج ۱ زمخشری) — ایک عورت یا صرف باندی پر اکتفا اس بات سے زیادہ قریب ہو کہ تمہارے عیال زیادہ نہ ہوں۔

سفیان بن عیینہ سے الا تعولوا کی یہ تفسیر منقول ہے۔

ان لا تفتقروا (روح المعانی جزء رابع ص ۱۹۱) — اس بات سے زیادہ قریب ہے کہ تم محتاج نہ ہو۔

(۵) قلت وکثرت اولاد کے بارے میں روایتیں مختلف ہیں۔ بعض سے کثرت اولاد کی حوصلہ افزائی ہوتی اور بعض سے قلت کی پسندیدگی کی ہوتی ہے

(۶) اسی طرح عزل کے باب میں روایتیں مختلف ہیں، بعض سے اجازت ثابت ہوتی، اور بعض سے مخالفت کا ثبوت ملتا ہے، ان سب روایتوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں حالات کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر وسعت تھی ورنہ کسی ایک جانب قطعی فیصلہ کر دینے میں آپ کو کوئی دشواری نہ تھی،

(۷) حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مصر کے فاتح اور حکمراں حضرت عمروؓ بن العاص نے اس قسم

کے حالات کے لحاظ سے قوم کے سامنے یہ خطبہ دیا تھا جس کو حکومت کی وقتی پالیسی کہا جا سکتا ہے،

یا معشر الناس ایاکم وخلال	اے لوگو چار خصلتوں سے بچو، کیونکہ یہ
اربعة فانها تدعوا الی النصب	آرام کے بعد تکلیف، فراخی کے بعد تنگی
بعد الراحة والی الضیق	اور عزت کے بعد ذلت کا باعث ہوتی
بعد السعة والی المذلة بعد	ہوتی ہیں، (۱) کثرت عیال سے بچو
العزة ایاکم وکثرة العیال	(۲) حال پتی (گھٹیا معیار زندگی) سے بچو
واخفاض الحال وتضییع	(۳) مال ضائع کرنے (۴) اور بے ضرورت
المال والقیل بعد القال	و بے مقصد باتوں میں وقت ضائع کرنے
ومن غیر ذکرك ولا نوال[1]	سے بچو

اس خطبہ کو تفصیل کے ساتھ ابن عبدالحکیم نے مصر کی تاریخ میں نقل کیا ہے،[2]

(۸) امام غزالی اور شاہ عبدالعزیز نے بھی قلت مال کی وجہ سے عزل کی اجازت دی ہے،[3]

ضبط ولادت میں گنجائش نکلنے کے بعد یہ بحث زیادہ وقیع نہیں رہتی کہ اس کے لیے مرد کوئی تدبیر اختیار کرے یا عورت، لیکن یہ گنجائش محدود اور بدرجۂ مجبوری ہے، اگر بلا کسی قید کے اس کی عام اجازت دیدی جائے تو اس کے نتائج نہایت خطرناک شکل میں ظاہر ہونگے جیسا کہ مغربی تہذیب اور اس کے مقلد سماج میں ظاہر ہو رہے ہیں،

---

[1] یوسف ابن تغری بردی النجوم الزاہرۃ فی اخبار مصر والقاہرہ ج ۱ ص ۲۷، [2] ابن عبدالحکیم: فتوح مصر و اخبارہا، ج ۱ ص ۱۳۹، [3] غزالی: احیاء العلوم ج ۲ آداب النکاح ص ۴۲ د

مولانا وصی احمد محدث سورتی پیلی بھیتی

از مولانا شاہ محمود احمد قادری استاذ مدرسہ احسن المدارس قدیم کانپور

حضرت مولانا شاہ وصی احمد محدث سورتی پیلی بھیتی علیہ الرحمہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی المتوفی ۱۳۱۳ھ کے مرید و خلیفہ اور استاذ المحدثین حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری المتوفی ۱۲۹۷ھ کے نامور اور ممتاز و محبوب و مشہور شاگرد تھے، مولانا وصی احمد محدث کا شمار حدیث کے نامور اساتذہ میں تھا، ذیل میں اُن کے حالات لکھے جاتے ہیں،

ولادت و خاندان | مولانا وصی احمد محدث، اکبر شاہ ثانی کے عہد زوال ۱۸۳۶ء میں بمقام سورت پیدا ہوئے، سنہ ولادت مولانا غلام مہر علی نے ۱۸۴۱ء لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے[۱]، ان کا نسبی تعلق محمد بن حنفیہ بن امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہے، اسی نسبت سے وہ اپنے دستخطوں میں حنفی تحریر کرتے تھے، ان کے بزرگ مولانا قاسم ابن شیخ طاہر مدینہ طیبہ کے ساکن تھے، انھوں نے سولہویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں بعہد شاہجہاں اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان کا سفر کیا، اور سورت کی بندرگاہ کے راستہ سے راندیر پہنچے، ورود ہند کے بعد مولانا قاسم کے ہمراہی اور اہل خاندان دو حصوں میں بٹ گئے، کچھ لوگوں نے شاہی فوج میں ملازمت کر لی اور عنایت خاں ابن

---

[۱] الیواقیت المہریہ بشرح الثورۃ الہندیہ: مولفہ مولانا غلام مہر علی ص ۸۷

قاسم خاں گورنر بنگال کی سرپرستی میں کلکتہ کے قرب وجوار میں پرتگیزوں سے معرکہ آرا ہوئے اور ان کو شکست دی، ان لوگوں نے عنایت خاں کی اجازت سے مسجد تعمیر کر کے اسی خطہ میں بود و باش اختیار کر لی، ان کی کوشش اور توجہ سے ان مسلمانوں کو جنھیں انگریز مشنری نے عیسائی بنا لیا تھا، پھر اسلام کی دولت نصیب ہوئی،

مولانا شیخ قاسم نے راندیر کی سکونت پسند کی اور یہاں علم دین کی خدمت و اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے ذریعۂ معاش کے لیے متقدمین ائمہ و محدثین کی طرح تجارت کا پیشہ کیا، راندیر میں ان کی کپڑوں کی بہت بڑی دوکان تھی، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزی فوجوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی، مولانا قاسم نے لمبی عمر پائی، ۱۸۸۵ء میں انکی وفات ہوئی،

جنگ آزادی ہند اور محدث سورتی کا سفر عراق و حجاز

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں محدث سورتی اکیس ۲۱ برس کے تھے، اور ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا طیب ابن شیخ قاسم سے حاصل کر چکے تھے۔ انگریزوں سے نفرت ان کو ورثہ میں ملی تھی، جذبۂ جہاد سے سرشار تھے، اس لیے ہنگامہ شروع ہونے کے بعد انگریزی فوجوں نے سب سے زیادہ ظلم و ستم کا نشانہ ان ہی لوگوں کو بنایا جو مذہب کے دلدادہ تھے۔ محدث سورتی کے خاندان کے متعدد افراد گولیوں کا نشانہ بنے، ان کے دادا مولانا شیخ قاسم کی قائم کردہ کپڑوں کی دوکان جلا کر خاکستر کر دی گئی، اور ان کے مکانات پر فوج نے قبضہ کر لیا، محدث سورتی اور ان کے والدین اور چھوٹے بھائی مولانا عبد اللطیف کئی دن روپوش رہنے کے بعد چھپتے چھپاتے دخانی جہاز کے ذریعہ بغداد پہنچے، تین سال سے زیادہ یہاں مقیم رہنے کے بعد حجاز کا سفر کیا، اور حج کے شرف سے مشرف ہوئے، پھر کچھ دنوں تک مدینہ منورہ میں قیام کیا، اس عرصہ میں ہندوستانی سیاست میں سکون پیدا ہو چکا تھا، دار و گیر کا سلسلہ

ختم ہو گیا تھا۔ اور باغیوں کے عام معافی کا اعلان بھی ہو چکا تھا، اس لیے محدث سورتی نے والد، والدہ اور بھائی کے ساتھ پھر ہندوستان کا رخ کیا، مولانا طیب نے راندیر میں پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں انتقال کیا، اور راندیر پہنچنے کے بعد والدہ ماجدہ نے بھی ۱۸۶۰ء میں داغ مفارقت دیا، ان کا نام بی بی حلیمہ تھا، اور وہ مولانا خیر الدین محدث سورتی کی نواسی تھیں،

مولانا خیر الدین دورِ آخر کے ان علماء میں تھے، جو رسوخ فی العلم، زہد و تقویٰ اور عبادت و اطاعت میں ائمہ و مشائخ کی یادگار سمجھے جاتے تھے، انھوں نے مولانا محمد بن عبد الرزاق سورتی سے حصول تعلیم کے بعد حج و زیارت کے لیے حجاز کا سفر کیا، اور مدینہ طیبہ میں ایک عرصہ تک مقیم رہ کر علامہ حیات سندھی علیہ الرحمہ سے حدیث کا درس لیا، وہاں سے واپس ہو کر وطن میں درس حدیث میں مشغول ہو گئے، اور پورے پچاس برس تک ان کی خانقاہ درس حدیث کا مرکز رہی، اور دور دراز ملکوں کے طالبین حدیث نے آکر ان سے سند حدیث حاصل کی، مشہور عالم، لغوی، مفسر، محدث، صوفی اور معقولی علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی المتوفی ۱۲۰۵ھ حجاز جاتے ہوئے ان کے مدرسہ میں ٹھہرے تھے، اور ان سے فیض حاصل کیا تھا، مولانا خیر الدین نے ۱۰ رجب المرجب ۱۲۰۶ھ میں وفات پائی، اور سورت میں مدفون ہوئے، ان کی تصانیف میں شواهد التجرید تصوف کی عمدہ کتاب ہے،[1]

محدث سورتی کا طلب علم کے لیے سفر | والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد مولانا وصی احمد محدث سورتی نے راندیر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا، اور جو جائداد تباہی سے بچ گئی تھی اسے فروخت کر کے اپنے چھوٹے بھائی مولانا عبد اللطیف کو ساتھ لیکر تحصیل علم کے لیے مدرسہ حسین بخش میں پہنچے، پھر کچھ ہی دنوں کے بعد مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی المتوفی ۱۳۳۴ھ کی خدمت

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ہفتم از مولانا حکیم عبد الحئی ص ۱۱۶

میں علی گڑھ کی جامع مسجد کے مدرسہ میں داخل ہو گئے، اور مفتی صاحب کی توجہ خاص سے ۱۲۸۶ھ میں علوم عقلیہ اور فقہ و تفسیر کی تکمیل کر لی۔[1] علی گڑھ میں انھوں نے مولانا محمد علی کانپوری مونگیری المتوفی ۱۳۵۲ھ سے بھی درس لیا،[2] دورۂ حدیث کی تکمیل کے لیے مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی اور اپنے پیرو مرشد حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی المتوفی ۱۳۱۳ھ کے مشورہ وہدایت سے مشہور محدث مولانا احمد علی سہارنپوری کے حلقۂ درس میں جاکر شامل ہوئے،

حضرت مولانا سید پیر مہر علی شاہ گولڑوی المتوفی ۱۳۵۶ھ اور حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ محدث الوری بانی دار العلوم حزب الاحناف لاہور المتوفی ۱۳۵۴ھ مولانا وصی احمد محدث سورتی کے رفیق درس تھے، مولانا غلام مہر علی گولڑوی الیواقیت المہریہ بشرح الثورۃ الہندیہ میں مولانا سید دیدار علی کے ترجمہ میں لکھتے ہیں

ثم رحل سنة الهجرية اثنتين	پھر اس کے بعد انھوں نے ۱۲۹۲ھ میں
وتسعين بعد الالف والمائتين	علم حدیث کی تحصیل کے لیے سہارنپور کا
لاخذ علم الحديث الى بلدة	سفر کیا اور استاذ الکل اور شہرۂ آفاق
سهارنپور فاخذ الحديث عن	محدث مولانا احمد علی سہارنپوری محشی
استاذ الكل الشيخ الشهير في	بخاری سے حدیث کا درس لیا اور تمام
المشرق والمغرب المحدث علی احمد	علوم سے فراغت حاصل کی اور ۱۲۹۳ھ
السهارنپوری محشی البخاری	میں محدث ممدوح سے سند حاصل کی،
الشريف فرغ عن جميع العلوم	ان کے رفقاے حدیث میں عارف کبیر

---

[1] الیواقیت المہریہ ص ۸۰ [2] نزہۃ الخواطر جلد ہشتم از حکیم عبد الحئی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ ص ۵۱۶ و المعتمد المستند از مولانا احمد رضا بریلوی ص ۲۳۳

وشرفنا بالسند المبارك
عن المحدث الممدوح سنة
ثلثين وتسعين بعد الالف
والمائتين من الهجرية وكان
من شركائه في اسباق كتب
الحديث العارف الكبير
والامام الجليل الغوث الامجد
مرشدنا الاعظم قبلتنا
ومولانا السيد مهر على
الشاه الگولڑوی رحمه الله تعالى
والمحدث الشهير الامام
الاستاذ والعلام المحدث
وصی احمد السورتی ثم
البيلى بهيتى محشى شرح معانى
الآثار

اور امام جلیل غوث امجد ہمارے
قبلہ و آقا سید مہر علی شاہ گولڑوی
(اللہ کی ان پر رحمت ہو) اور محدث شہیر
استاذ امام محدث علام وصی احمد
سورتی پیلی بھیتی محشی شرح معانی
الآثار تھے۔

حضرت مولانا سید پیر مہر علی شاہ گولڑوی قدس سرہٗ کے ذکر میں رقمطراز ہیں:

ثم انتقل منها (علی گڑھ) سنة
الهجرية اثنتين وتسعين

پھر علی گڑھ سے ۱۲۹۲ھ میں سہارنپور
منتقل ہو گئے اور محدث شہیر علامہ محمد

---

۱ الیواقیت المہریہ ص ۱۱۸

بعد الالف والمائتین الی بلدۃ	حدیث میں علما ہند کے استاذ شیخ
سہارنپور وقرأ کتب الحدیث	کبیر احمد علی سہارنپوری سے کتب
علی المحدث الشہیر والعلامۃ	حدیث پڑھیں، اور ۱۲۹۳ھ مطابق
الحبر مولانا استاذ علماء الہند	۱۸۷۵ء میں تمام علوم سے فراغت
فی الحدیث الشیخ الکبیر المحدث	حاصل کر لی۔
احمد علی السہارنپوری	
وفرغ عن جمیع العلوم سنۃ	
الہجریہ ثلث وتسعین بعد	
الالف والمأتین مطابقۃ	
لسنۃ المیلادیۃ خمس سبعین	
بعد الالف وثمان مائیۃ[1]	

مولانا غلام مہر علی نے ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۵ء تحریر کیا ہے جو صحیح نہیں ہے، ۱۸۷۵ء کے بجائے ۱۸۷۶ء ہونا چاہیے،

مولانا غلام مہر علی نے مولانا پیر مہر علی شاہ اور مولانا سید دیدار علی شاہ کا ورود سہارنپور ۱۲۹۲ھ اور تکمیل دورۂ حدیث ۱۲۹۳ھ میں لکھا ہے، اور مولانا وصی احمد محدث سورتی کو ان کے رفقاء میں شمار کیا ہے، لیکن محدث سورتی کے نواسے مولانا قاری حکیم احمد کی تحریری روایت ان دونوں روایتوں سے مختلف ہے، مگر ان کی تحریری روایت بھی تاریخی شواہد کی روشنی میں غلط ثابت ہوئی ہے، وہ لکھتے ہیں:

---

[1] الیواقیت المہریہ ص ۱۴۱

"آپ (محدث سورتی) کے سہارنپور جانے کے بعد ہی سہارنپور میں مظاہر علوم کی بنیاد پڑی اور دیوبند میں چھتہ کی چھوٹی سی مسجد میں ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو ایک دینی درسگاہ کا قیام عمل میں آیا۔"

مدرسہ دیوبند ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق مئی ۱۸۶۶ء کو چھتہ کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے قائم ہوا، اور اسی سنہ میں مدرسہ مظاہر علوم کا قاضی محلہ سہارنپور میں قیام عمل میں آیا، اس وقت مولانا وصی احمد محدث سورتی علی گڑھ میں استاذ العلماء مفتی لطف اللہ علی گڑھ کی درسگاہ میں تحصیل علم میں مصروف تھے۔ مدرسہ دیوبند ۱۲۹۰ھ میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے جامع مسجد میں منتقل کر دیا گیا، جب یہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہوئی تو مولانا محمد قاسم نانوتوی المتوفی ۱۲۹۷ھ نے مدرسہ کے لیے آبادی سے باہر ایک کشادہ اور وسیع عمارت کی تجویز پیش کی، چنانچہ زمین کی خریداری کے بعد ۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کو جمعہ کے دن موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا،[1]

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جس کا نام پہلے مدرسہ اسلامیہ تھا، رجب ۱۲۸۳ھ میں قاضی محلہ میں قائم ہوا، حافظ فضل حق المتوفی ۱۳۰۲ھ نے اپنا ذاتی مکان توڑ واکر ایک عمارت تیار کرائی اور مدرسہ کو قاضی محلہ سے اس نئی عمارت میں لے آئے اور .... اپنے دوست اور مدرسہ کے صدر مدرس و شیخ الحدیث مولانا محمد مظہر نانوتوی المتوفی ۱۳۰۲ھ کے نام پر مدرسہ کا تاریخی نام "مظاہر العلوم" رکھا،[2]

محدث سورتی کو مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی بارگاہ علم و فضل میں خصوصی تقرب حاصل تھا، ان پر وہ بڑی شفقت فرماتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانہ میں مولانا احمد علی

---

[1] تاریخ دیوبند از مولانا محبوب رضوی ص ۸۲ [2] تذکرۃ الخلیل مؤلفہ مولانا عاشق علی میرٹھی ص ۱۳۵ و ۳۶

شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی سے حدیث پڑھ رہے تھے۔ اُس زمانہ میں محدث سورتی کے پیر و مرشد حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی المتوفی ۱۳۱۳ھ دہلی میں موجود تھے، وہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ کے تلمیذ خاص تھے، اسلیے شاہ اسحاق صاحب محدث اور حضرت گنج مراد آبادی ایک دوسرے کو حدیث سنایا کرتے تھے،[1] ان تعلقات اور حضرت گنج مراد آبادی کے تقدس کے پیش نظر مولانا احمد علی ہمیشہ گنج مراد آباد حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور اپنے تلامذہ کو حضرت گنج مراد آبادی سے مرید ہونے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ مولانا وصی احمد محدث سورتی علی گڑھ سے تکمیل کے بعد گنج مراد آباد چلے گئے تھے، اور وہیں سے سہارنپور پہنچے تھے وہ اپنے شیخ مولانا احمد علی کی خدمت و طاعت کو اپنے لیے فخر و سعادت تصور کرتے تھے۔

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اپنے علمی کمال کی بنا پر خانوادۂ ولی اللّٰہی کے رکن خصوصی تصور کیے جاتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں مولانا پیر مہر علی شاہ گولڑوی المتوفی ۱۳۵۶ھ مولانا سید دیدار علی شاہ محدث الوری لاہوری المتوفی ۱۳۵۴ھ، مولانا محمد قاسم نانوتوی المتوفی ۱۲۹۷ھ، مولانا شبلی نعمانی المتوفی ۱۳۳۲ھ، مولانا محمد احسن نانوتوی المتوفی ۱۳۱۲ھ، مولانا رشید احمد گنگوہی المتوفی ۱۳۲۳ھ جیسے مشاہیر علماء تھے۔ مولانا احمد علی کے فرزند مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا خلیل الرحمٰن نے بھی علمی دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی۔

مولانا گنج مراد آبادی کی خدمت میں مولانا وصی احمد محدث سورتی نے سہارنپور جانے سے پہلے استاذ العلماء مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی کی ہدایت سے گنج مراد آباد جاکر مولانا شاہ فضل رحمٰن

---

[1] افضال رحمانی مرتبہ شاہ افضال رحمانی گنج مراد آبادی سجادہ نشین خانقاہ گنج مراد آبادی ص ۲۵

گنج مراد آبادی قدس سرہٗ سے بیعت کا شرف حاصل کرلیا تھا، پھر کچھ دنوں کے بعد سلوک و معرفت کی تربیت کے لیے عرصہ تک مرشد کی خدمت میں رہے، اس کی تکمیل کے بعد ان کو سلسلۂ قادریہ کی اجازت وخلافت مرحمت فرمائی اور علوم حدیث کے نشر کا حکم دیا، مولانا میر غلام علی لکھتے ہیں:-

واقام فی حضرته زمانا فشرّفت	ایک زمانے تک ان کی خدمت میں حاضر
عن حضرته النفس سیئة فضلا	رہے، اور ان کے نفس قدسیہ کی برکت سے
وعرفانا فاجازه الشیخ فی السلسلة	فضل وعرفان سے مشرف ہوئے اور شیخ
القادریة واشارہ الی نشر الحدیث	نے ان کو سلسلۂ عالیہ قادریہ کی اجازت
وخدمة الدین [1]	عطا کی اور علوم دینی کے نشر اور خدمت دین

مولانا ابوالحسن علی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے "تذکرہ مولانا شاہ فضل رحمٰن" کے طبع اول میں خلفاء کے ذیل میں محدث سورتی کا بھی نام درج کیا تھا، مگر موجودہ اشاعت میں نہ جانے کیوں ان کا نام نکال دیا گیا، [2]

مدرسۂ فیض عام کانپور میں درس حدیث گنج مراد آباد سے رخصت ہوکر محدث سورتی کانپور آئے اور ایک عرصہ تک یہاں مقیم رہے، مولانا حکیم عبدالحی صاحب لکھتے ہیں: ثم رجع الی کانپور واقام بھا زمانا۔ [3]

اس میں اتنا تسامح ہے کہ گنج مراد آباد سے آمد کے بجائے سہارنپور سے لکھدی ہے، مولانا احمد حسن کانپوری سے پہلے سے روابط تھے، اس لیے ان ہی کے یہاں قیام ہوا، مولانا کانپوری نے حضرت گنج مراد آبادی کی تحریک پر اپنی چھوٹی سالی سے پہلی بھیت میں محدث

---

[1] الیواقیت المہریہ ص ۸۵ [2] پہلی اشاعت میں خلفاء و مریدین کے نام درج کیے گئے [3] نزہۃ الخواطر جلد ہشتم

سورتی کا عقد کرا دیا، اور مدرسۂ فیض عام میں محدث مقرر کیا،

پیلی بھیت کا قیام پیلی بھیت میں ازدواجی رشتہ ہو جانے کی وجہ سے وہاں محدث سورتی کی آمد و رفت رہا کرتی، وہاں کے عوام و خواص کی بڑی اکثریت حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے حلقۂ ارادت سے وابستہ تھی، حکیم خلیل الرحمٰن خاں خصوصی تعلق رکھتے تھے انکو حضرت گنج مرادآبادی کے یہاں ایک نوع کا تقرب حاصل تھا حکیم صاحب کی استدعا پر حضرت گنج مرادآبادی نے محدث سورتی کو پیلی بھیت جاکر درس حدیث جاری کرنے کا حکم دیا، انکے پیلی بھیت پہنچنے پر حکیم خلیل الرحمٰن نے حافظ الملک حافظ رحمت خاں[1] المقتول ۱۱۸۸ھ کی تعمیر کردہ جامع مسجد (سنہ تعمیر ۱۱۸۳ھ) میں حافظ الملک کی یادگار میں مدرسۂ حافظیہ کے نام ۱۲۹۵ھ کے آخر میں ایک مدرسہ قائم کیا، کچھ عرصہ کے بعد مولانا وصی احمد نے ایک وسیع قطعۂ آراضی خرید کر کے ۱۳۱۰ھ میں پنجاب، بدایوں اور فرنگی محل لکھنؤ کے علما کی موجودگی میں مولانا احمد رضا فاضل بریلوی (المتوفی ۱۳۴۰ھ کے ہاتھوں سے عمارت کا سنگ بنیاد رکھوایا اور تین گھنٹے تک حدیث کے موضوع پر تقریر فرمائی،[2] اس مدرسہ کا نام مدرسۃ الحدیث رکھا گیا، مولانا غلام مہر علی نے مدرسۃ الحدیث کا سال تاسیس ۱۸۶۹ء لکھا ہے،[3] اگر ان کا بیان صحیح مان لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ محدث سورتی ۱۸۶۸ء / ۱۲۸۶ھ یا اس سے پہلے پیلی بھیت پہنچ چکے تھے، حالانکہ اسی سنہ میں وہ علی گڑھ میں اکتساب علم میں مصروف تھے، اس کے علاوہ ان کے قیام پیلی بھیت کی مدت مشہور روایت کے مطابق چالیس برس کے بجائے چونسٹھ برس ماننا پڑیگی جو صریحاً غلط ہے،

---

[1] تعمیر مسجد کے واقعہ اور احوال حافظ الملک کیلئے حافظ رحمت خاں مرتبہ سید الطاف علی بریلوی دیکھی جائے [2] حیات اعلیٰ حضرت حصہ سوم (قلمی) مرتبہ مولانا ظفر الدین قادری رضوی بہاری مملوکہ پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ص ۰،

[3] الیواقیت المہریہ ص ۸۰،

مجلس ندوۃ العلماء میں شمولیت اور علیحدگی

مولانا وصی احمد محدث سورتی کو علوم دین کی اشاعت سے گہرا تعلق خاطر تھا، وہ چاہتے تھے کہ حدیث رسول کی جس شمع کو اسلاف کرام نے روشن کیا ہے، اس کی روشنی کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے، اس لیے علم دین کے نام سے جو تحریک بھی سامنے آتی تھی، محدث سورتی اس میں پیش پیش رہتے تھے، چنانچہ شعبان ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں جب مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی میں اصلاح نصاب کی تجویز پاس ہوئی تو مولانا محمد علی کانپوری مونگیری نے باتفاق رائے مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کو اس میں شرکت کی دعوت دی اور دعا کی درخواست کی جس کو آپ نے قبول فرمایا، اور آپ کے حکم کے مطابق محدث سورتی نے پورے جوش وخروش سے اس میں حصہ لیا، اور مجلس ندوۃ العلماء کو فروغ دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، مگر ندوۃ العلماء سے ان کی یہ وابستگی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی، اس کے پہلے اجلاس منعقدہ کانپور ۱۳۱۱ھ کی دوسری نشست میں مولوی غلام حسین کنتوری مجتہد کی تقریر کا بہت بڑا اثر ہوا، تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی المتوفی ۱۳۱۹ھ، مولانا سید عبدالصمد[1] سہسوانی اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی بڑے جوش وخروش سے شریک ہوئے تھے، بلکہ فاضل بریلوی ایک مقالہ بھی لکھ کر لائے تھے جس میں مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی اور مولانا احمد حسن کانپوری قدس سرہما کی بیحد تعریف و توصیف کی تھی،[2] مجتہد کنتوری کی

---

[1] مولانا سید عبدالصمد سہسوان ضلع بدایوں کے باشندے تھے، ۱۴ شعبان ۱۲۶۹ھ موافق ۱۸۵۳ء نزجمعہ کو پیدا ہوئے، مولانا نور احمد بدایونی، مولانا فضل رسول بدایونی، مولانا عبدالقادر بدایونی سے تکمیل علوم کی، ۱۴ برس کی عمر میں فراغت کی سند پائی، ۱۲۸۳ھ میں مدینہ طیبہ میں چھ ماہ حاضر رہ کر سید مبارک مدنی کو بخاری زبانی سنائی، مولانا حافظ محمد اسلم خیرآبادی المتوفی ۱۲۶۶ھ کے مرید وخلیفہ تھے، مشاہیر علماء ومشائخ میں ان کا بڑا مرتبہ تھا، ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ کو سہسوان میں ان کا انتقال ہوا، تذکرہ علماء اہل سنت ص ۱۲۹، ۱۳۰ ونزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۲۵۶ ملخوذ مصابیح القلوب (سوانح مولانا عبدالصمد) [2] علمائے سلف مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی وسیرۃ مولانا محمد علی مونگیریؒ مرتبہ محمد الحسنی ص ۱۳۱

تقریر سے سخت برہم ہوئے،[1]

یہ نقطۂ آغاز تھا جس نے آگے چل کر اختلاف کی زبردست خلیج پیدا کردی، محدث سورتی بھی ان علماء کے ساتھ مجلس ندوۃ العلماء سے علیحدہ اور اس کی مخالفت میں علمائے بدایوں بریلی سہسوان کے ساتھ شریک ہوگئے، اور قاضی عبدالوحید رئیس اعظم آباد پٹنہ المتوفی ۱۳۲۶ھ نے جب ندوہ کے مقابلہ میں پٹنہ میں علمائے اہل سنت کی مجلس تشکیل کی اور اس کے زیر اہتمام مدرسہ حنفیہ قائم کیا تو قاضی صاحب کی دعوت پر محدث سورتی ایک سال سے زیادہ ۱۳۲۰-۱۳۲۱ھ اس میں مصروف رہے، خیرآبادی سلسلہ کے مشہور معقولی عالم مولانا سید عبدالعزیز انبیٹھوی سہارنپوری المتوفی ۱۳۴۳ھ کا فیض درس ان ہی دنوں اس مدرسہ میں جاری تھا،[2]

محدث سورتی کی مجلس ندوۃ العلماء سے علیحدگی کو مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے بہت سراہا اور لکھا کہ انھوں نے اپنے اساتذہ کے مقابلہ میں حق کی حمایت کی، لکھتے ہیں:

الفاضل الکامل، جبل	فاضل کامل، استقامت کے پہاڑ، بزرگی
الاستقامۃ، کنز الکرامۃ	کا خزانہ، ہمارے دوست اور ہمارے
صدیقنا وحبیبنا مولانا المولوی	حبیب مولانا مولوی محمد وصی احمد محدث
محمد وصی احمد الحنفی المحدث	سورتی وطناً اور پیلی بھیتی نزیلاً، دین کے
السورتی وطناً نزیل پیلی بھیت	مددگار، اور مبتدعین کی طاقتوں کو کھانے
حفظہ اللہ تعالیٰ ناصر الدین	والے اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے
ودامغا للمبتدعین وثبتہ	اور حق پر ان کو بہترین ثبات عطا فرمائے،
علی الحق احسن تثبیت فانہ	وہ (اللہ تعالیٰ انھیں سلامت رکھے)
سلمہ اللہ تعالیٰ کان تلمیذ	مولانا محمد علی کانپوری ناظم اور انکے استاذ

[1] سیرۃ مولانا محمد علی مونگیری ص ۱۲۹ [2] ان کے احوال کے لیے تذکرہ علماء اہل سنت دیکھی جائے۔

الکانپوری المذکور نالم الندوة
وتلمیذ شیخه وصدرها
ولکن لم یستخفه الذین لا یوقنون
وما استطاعوا ان تزل قدمه
بعد ثبوتها وقد کان معاشه
حفظه الله تعالیٰ من بیت ندوی
عتا وطغیٰ واعتدی وبغی
فقطع ادرارہ قاصدا
اضرارہ ولکن الفاضل حبیبنا
سلّمه الله تعالیٰ لم یکن یؤثر
الدنیا علی الدین فمن یومئذ
سمیته الاسد الاسد الاشد
الارشد وهو اهل لهذا

(مولانا لطف اللہ) صدر ندوہ کے شاگرد
تھے لیکن یقین کی دولت سے محروم افراد
پر ثابت قدم ہونے کے بعد ان کے پائے استقلال
کو متزلزل نہ کر سکے، حالانکہ محدث سورتی
کو معاش کی سہولتیں ندویوں کی طرف سے
حاصل تھیں جسے ان لوگوں نے بند کر دیا،
لیکن میرے حبیب فاضل (اللہ تعالیٰ انکو
سلامت رکھے) نے دنیاوی منافع کو
دین و آخرت کے منافع پر مؤخر نہ ہونے دیا،
اسی وقت میں نے ان کا نام الاسد الاسد
الارشد الارشد رکھدیا اور یہ اس کے
اہل ہیں بلکہ اس سے زیادہ بہتر ہیں،

او لا حسن من هذا (المستند المعتمد بناء نجاة الابد تالیف مولانا احمد رضا بریلوی ص ۲۳۳)

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

میرے استاذ، فن حدیث کے امام (محدث سورتی) کو بیعت حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہٗ سے تھی، مگر حضرت کی زبان پر پیر و مرشد کا ذکر میرے سامنے کبھی نہیں آیا اور اعلیٰ حضرت کا بکثرت تذکرہ محویت کے ساتھ فرماتے تھے، میں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ آپ کے پیر و مرشد کا تذکرہ نہیں سنتا اور اعلیٰ حضرت کا آپ خطبہ پڑھتے رہتے ہیں۔

فرمایا کہ جب میں نے پیرومرشد سے بیعت کی تھی یا یوں سمجھئے مسلمان تھا کہ میرا سارا خاندان مسلمان سمجھا جاتا تھا، مگر جب میں اعلیٰ حضرت سے ملنے لگا تو مجھکو ایمان کی حلاوت مل گئی۔ اب میرا ایمان رسمی نہیں بلکہ بعونہٖ تعالیٰ حقیقی ہے، جس نے حقیقی ایمان بخشا اسکی یاد سے اپنے دل کو تسکین دیتا رہتا ہوں۔

میں نے عرض کیا، کیا وہ علم الحدیث میں آپ کے برابر ہیں، فرمایا، ہرگز نہیں، پھر فرمایا شاہزادہ صاحب! آپ کچھ سمجھے کہ ہرگز نہیں کا کیا مطلب ہے؟ سنیئے کہ اعلیٰ حضرت امیرالمومنین فی الحدیث ہیں، اگر میں سالہا سال ان سے اس فن میں تلمذ کروں تو بھی ان کا پاسنگ نہ ٹھہروں[1]"

مولانا وصی احمد محدث سورتی ایک استفتا کی تصدیق کرتے ہوئے، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کو ان خطابات سے یاد کرتے ہیں،

موجودہ صدی کے مجدد، شریعت مصطفوی کے مجدد، بحر زاخر، حبر فاخر، محقق علامہ، مدقق فہامہ، شیخ العلماء، وشیخون الفضلاء، عالم نبیل، فاضل جلیل، صاحب حجۃ قاہرہ، مالک رقبۂ حکمت فاخرہ، سند اصحاب منقول فحول، ومستند ارباب معقول، فقیہہ وجیہہ، محدث نبیہہ، آیۃ من آیات اللہ البینات، جبل ابن جبل اللہ الشامخات، عالم سنت امام اہل سنت سیدنا حضرت مولانا احمد رضا[2] (باقی)

---

[1] خطبۂ صدارت یوم اعلیٰ حضرت منعقدہ شوال ۱۳۸۱ھ بمقام ناگپور مشمولہ مقالات یوم رضا، مرتبہ قاضی عبد النبی کوکب وحکیم محمد موسیٰ امرتسری ص ۴۳ و مجدد اسلام مرتبہ مولانا نسیم بستوی و ماہنامہ مدنی تجلیات، ناگپور، امام احمد رضا نمبر
[2] ماہنامہ مخزن تحقیق ملقب بہ تحفۂ حنفیہ پٹنہ، مجریہ شعبان ۱۳۱۸ھ مرتبہ مولانا قاضی عبد الوحید عظیم آبادی، ص ۱۲

مقالہ نما

"مضامین الندوہ"

از سلمان شمسی ندوی

(۲)

طبا طبائی، حیدر علی (مولانا)

تقسیم اقوام حسب رائے فلاسفۂ فرنگ اپریل ۱۹۱۱ء ص ۲۷-۲۸ حوالہ ۲۷۹/۸

طبا طبائی حیدر علی (مولانا) نومبر ۱۹۰۸ء ص ۳۱-۳۲ حوالہ ۲۷۹/۵

متشابہات

یمین میں اختلاف مذہب کا ایک سبب یہ ہے کہ کلام الٰہی میں متشابہات بھی ہوا کرتے ہیں، اور متشابہات کو کوئی فرقہ محکمات میں شمار کرتا ہے اور کوئی قابلِ تاویل سمجھتا ہے، پھر تاویل کرنے والوں میں اختلاف واقع ہوا کرتا ہے،

"متشابہات پر مختصر بحث"

عارف ندوی:

سلاطین ہند کی فیاضی اور علم و ہنر کی قدر دانی، جنوری ۱۹۱۶ء

ص ۳-۱۹ حوالہ ۲۸۶/۱۱

موضوع بالا پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے،

عبدالسلام ندوی: نومبر ۱۹۰۶ء

ایران کا قدیم خط ص ۸-۲۶ حوالہ ۲۷۹

"اب تک اس زبان کے اصول و فروع کے متعلق معلومات کا جس قدر ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، اس موقع پر ہم ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ یہ زبان چونکہ نہایت قدیم زبان ہے، اس لیے اس پر تین دور گذرے ہیں، اور ہر دور کے اختلاف کے ساتھ حروف کے نام اور رسم الخط میں بھی تغیر پیدا ہو گیا ہے۔"

عبدالسلام ندوی: فرقہ شعوبیہ۔ مارچ ۱۹۱۱ء ص ۲۵-۳۲ حوالہ ۲۷۹/۸

فرقہ مذکورہ کے عقائد و خیالات اور دعوت و تبلیغ پر بحث کی گئی ہے۔

عبدالسلام ندوی:

فیالوجی اور مسلمان ستمبر ۱۹۰۹ء، ص ۳۰ - ۳۳ حوالہ ۲۷۹/۹

"مسلمانوں کو غیر قوموں کے علوم و فنون سے ہمیشہ جو بے تعصبی رہی، اس کے لحاظ سے ہم جدید تعلیم یافتہ گروہ کی اس قدر دانی کی داد دیتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہم کو یہ گوارا نہیں ہے کہ مسلمانوں کی علمی تاریخ کا ایک حرف بھی مٹ جائے، اس بنا پر ہم اس فن کی مختصر تاریخ لکھتے ہیں، جس سے معلوم ہو گا کہ اس فن کا سنگ بنیاد درحقیقت مسلمانوں نے رکھا تھا۔"

عبدالعلی صاحب مرحوم (ڈاکٹر)

روشنی کی رفتار جون ۱۹۱۲ء ص ۱۵-۲۴ حوالہ ۲۷۹/۹

جدید و قدیم نظریات کی روشنی میں موضوع سے متعلق دقیق علمی نکات بیان کیے گئے ہیں۔

عبداللہ پھلواروی ندوی (مولوی) نومبر ۱۹۴۱ء

عربی زبان کے طریق تعلیم پر ایک ماہر فن کی رائے۔ ص ۲۵ - ۲۹ حوالہ ۲۸۰/۲

عربی زبان کے ایک ماہر فن شیخ تقی الدین ہلالی کے ایک طویل مضمون کا ترجمہ تلخیص کے ساتھ، جس میں اجنبی ملکوں میں عربی زبان کی تدریسی مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے۔

اور ساتھ ہی طریق تعلیم پر بحث کی گئی ہے۔

عبد الواحد ندوی:

قانون   اگست دستمبر ۱۹۰۹ء   حوالہ ۲۷۹/۹

دائرۃ المعارف کے ایک باب کا ترجمہ جس میں قانون، انواع قانون اور دنیا کے بڑے بڑے قوانین سے بحث کی گئی ہے۔

عمادی، عبد اللہ

(۱) روس میں ایک اسلامی سلطنت۔   جمادی الآخر ۱۳۲۳ھ

ص ۱۸ - ۲۴   حوالہ ۲۷۹/۴

ایشیا اور یورپ میں ہمیشہ سے ایک بین الاقوامی جنگ قائم ہے........ ایک قدیم اسلامی سلطنت کا تعارف کرایا گیا ہے۔

(۲) صدر اول کی کتابیں   مئی ۱۹۰۵ء ص ۲۳-۲۰   حوالہ ۲۷۹/۲

عام خیال ہے کہ ہجرت کی پہلی صدی میں کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی اور اسلامی تعلیمات کا وہ مجموعہ جس کو حدیث اور اخلاق کہتے ہیں، قریباً سو برس تک غیر مرتب رہا، سب سے پہلے تصنیفات کی ابتدا ابن جریج سے ہوئی،

اس مضمون میں مذکورہ بالا خیال کی تردید کی گئی ہے، اور تاریخ سے صدر اول کی تصنیفات کا ثبوت پیش کیا گیا ہے،

(۳) عرب قدیم   جون ۱۹۰۵ء   ص ۶ - ۱۰   حوالہ ۲۷۹/۶

تحقیق کو جس قدر وسعت ہوئی، یہی ثابت ہوا کہ قدیم اشوریوں اور بابلیوں کا اصل وطن عرب تھا، اس سلسلہ میں عرب قدیم پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اور قدیم اقوام

و مقامات کا تعارف کرایا گیا ہے،

(۴) قدیم عربی سلطنتیں   جون ۱۹۰۵ء، ص ۱۰۔ ۲۳، حوالہ ۲۷۹/۸

اہل عرب کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں تمدن اور حکومت کی ابتدا عرب سے ہوئی، عربی حکومت کا ابتدائی مرکز اسلام کے قبل یمن تھا، اور سلاطین یمن نے دنیا کے مختلف ممالک فتح کیے اور متعدد قوموں کو باجگزار بنایا،

(۵) موبدان مجوس ہندوستان میں۔   ستمبر ۱۹۰۵ء، ص ۲۔ ۱۶ حوالہ ۲۷۹/۲

اس مضمون میں ان پارسیوں کے مذہبی پیشواؤں (جن کو موبد کہتے ہیں) کا مختصر حال ہے، جو ہندوستان میں سکونت رکھتے تھے، اور جن کی تصنیفات و تالیفات اہل علم میں پھیلی ہوئی ہیں، اور یہ حالات اسلامی تصنیفات سے لیے گئے ہیں، اس لیے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کے لٹریچر اور تاریخ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے،

قمر الدین صاحب

علم صلہ اور اس کی ضرورت   اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۷۔ ۱۸، حوالہ ۲۷۹/۹

صحیح انشاء کا جن اجزاء پر انحصار ہے، وہ محض صرف و نحو بلاغت کی معمولی واقفیت سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ ان میں پوری مہارت کی ضرورت ہے، اور اس کے لیے باقاعدہ انشاء، اور علم صلہ کی تعلیم ضروری ہے،

ماہر ندوی

ابنائے یعقوب   اپریل ۱۹۱۶ء

ص ۲۔ ۱۴ حوالہ ۲۸۶

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد پر تاریخی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔

مترجم نومبر ۱۹۰۸ء

طبقات ارض ص ۲۳ - ۲۹ حوالہ ۲۷۵

مدتوں کے کون و فساد کے عمل سے ایک طرف سے زمین یا پہاڑ کٹکر دوسری طرف جزیرہ یا پہاڑ پیدا ہوجاتا ہے یا کسی خاص زمین کے ٹکڑے پر دوسری زمین کی ایک نئی تہ چڑھ جاتی ہے، ان ہی تہوں کو زمین کے طبقات یا طبقات الارض کہتے ہیں،

معین الدین ندوی جولائی ۱۹۱۵ء

فظائع البشر ص ۱۲ - ۲۲ حوالہ ۲۸۵

محققین علم الآثار قدیم انگلستان کو بھی مردم خواروں کی ایک نوآبادی بتاتے ہیں، کیونکہ وہاں آدمی کی ہڈیوں پر انسان کے دانت کے علامات پائے گئے ہیں، انگلستان میں خاص خاص عبادت کے اوقات میں انسانی قربانی کا رواج زمانہ قدیم سے جاری تھا،

تحریکیں اور درسگاہیں

اکرام اللہ خاں جولائی ۱۹۱۵ء

(۱) ندوۃ العلماء سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ ص ۲۹ - ۳۵ حوالہ ۲۸۵

بعض اعتراضات کا جواب

(۲) ندوۃ العلماء کا نصب العین فروری ۱۹۱۵ء ص ۴ - ۸ حوالہ ۲۸۵

ہندوستان میں سب سے پہلے ندوۃ العلماء نے مذہبی تعلیم کے نظام پر غور کیا اور مسلسل غور و فکر کے اس نتیجہ پر پہنچا کہ مخصوص مذہبی تعلیم کے لیے ایک جامعہ اسلامیہ (مذہبی یونیورسٹی) کی ضرورت ہے، جس میں وسیع پیمانہ پر اعلیٰ ساز و سامان کے ساتھ مذہبی تعلیم کا انتظام ہو

حامد علی ندوی مارچ ۱۹۴۰ء مئی جون جولائی اگست

انجمن طلباء قدیم ندوہ ص ۲۲ - ۲۷ حوالہ ۲۸۶

تعارف

سلیمان ندوی، سید مئی ۱۹۱۵ء

(۱) ندوۃ العلماء کا نصب العین (تقریر) ص ۲-۱۵ حوالہ ۲۸۵

ہندوستان جب انقلاب کی کشاکش میں تھا، چند روشن ضمیر بزرگوں نے موقع کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھا وہ اٹھے اور آواز دی، آواز ایسی شیریں اور دلپسند تھی کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کے جواب میں لبیک کی صدائیں آئیں۔ ندوہ کی مجلس مرتب ہوئی، علماے ہند جنکا مشغلہ صرف نزاع وکشاکش باہمی تھا، خواب سے چونکے، محبت اور ہمدردی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور بالآخر قوم کے تمام امراض کا علاج دارالعلوم قرار پایا۔

(۲) دارالفنون طہران ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ حوالہ ۲۷۹/۴

(تعارف)

(۳) مصر کے مدارس اگست ۱۹۱۱ء ص ۳۰-۳۲ حوالہ ۲۷۹/۴

مصر تعلیمی حیثیت سے روز بروز ترقی کرتا جارہا ہے، جدید اصلاحیں عمل میں آرہی ہیں، مذہبی مدارس میں بھی انقلاب ہورہا ہے اور جدید طرز پر مذہبی مدارس کی بنیاد پڑ رہی ہے۔

(۴) دارالعلوم بیروت فروری ۱۹۱۲ء ص ۲۳-۲۸ حوالہ ۲۷۹/۹

(تعارف)

(۵) جامع ازہر جولائی ۱۹۰۶ء ص ۵-۲۲ حوالہ ۲۷۹/۳

"اسلامی مدارس کے نام صفحۂ ہستی سے محو ہوچکے ہیں، جامع ازہر ہی اسی پہلی شان و شوکت کے ساتھ اپنے علم دوست بانیوں کا نام زندہ کر رہا ہے، ہم ذیل کے مضمون میں اسی مدرسہ کا مرقع ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

(۶) ندوۃ العلماء کی تاریخ کا پہلا صفحہ   فروری ۱۹۴۰ء

ص ۱۰ - ۱۶   حوالہ ۲۸۰/۲

تحریک ندوۃ العلماء کی ابتدا اور اس سلسلہ کے اجلاس کا تذکرہ۔

شبلی نعمانی، علامہ

(۱) ندوہ کیا کر رہا ہے؟   ستمبر و نومبر ۱۹۰۶ء   حوالہ ۲۷۹/۳

"ماضی اور حال کا جائزہ نیز کارکردگی اور نقائص کا تجزیہ"

(۲) ندوہ کی نئی زندگی   اگست ۱۹۰۰ء

ص ۱ - ۳   حوالہ ۲۷۹/۵

تحریک ندوۃ العلماء کی ترقی اور تنزل کے اسباب پر نظر ڈالی گئی ہے۔

(۳) مشرقی کانفرنس   اگست ۱۹۱۱ء

(ندوہ سے متعلق)   ص ۱ - ۶   حوالہ ۲۷۹/۸

مشرقی علوم کی تدریج و ترقی اور ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد سے بحث کی گئی ہے،

(۴) ریاست حیدر آباد کی مشرقی یونیورسٹی   مارچ ۱۹۰۹ء

(تعارف)   ص ۷ - ۱۷   حوالہ ۲۷۹/۶

(۵) ندوہ اور نصاب تعلیم   جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ

ص ۷ - ۱۰   حوالہ ۲۷۹

"ندوہ کے قائم ہونے کی سب سے بڑی ضرورت جو ظاہر کی گئی اور واقعی تھی بھی وہ نصاب تعلیم کی اصلاح تھی"

(۶) ندوہ کے مقاصد پر پہلی تقریر   محرم ۱۳۵۹ھ   حوالہ ۲۸۰/۱

عائشہ ندوی فروری ۱۹۱۶ء

شام کی ایک پُراسرار جماعت ص ۱ - ۲۲ حوالہ ۲۸۶

شام کے تاریخی، اور جغرافیائی حالات اور وہاں کی ایک قدیم سفاک جماعت کا حال

عمران محمد خاں ندوی حافظ مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۴۰ء

(۱) جامعۂ ازہر حوالہ ۲۸۶

جامعہ ازہر کا تفصیلی جائزہ

ندوۃ العلماء مارچ ۱۹۱۵ء حوالہ ۲۸۵

رپورٹ اجلاس چہاردہم منجانب ادارہ

ندوۃ العلماء مارچ ۱۹۱۶ء حوالہ ۲۸۶

رپورٹ اجلاس پانزدہم ۱۹۱۶ء منجانب ادارہ

عربی مدارس اور انکے مسائل

ابوالحسن علی ندوی جولائی ۱۹۴۰ء

عربی مدارس ص ۴ - ۱۱ حوالہ ۲۸۶

مدارس کے کچھ فرائض اندرونی ہیں کچھ بیرونی، اندرونی سے مراد وہ کام ہیں جو مدارس عربیہ کے اصحاب اور معلمین کو مدرسہ کے اندر انجام دینے چاہئیں، بیرونی سے مراد وہ خدمات ہیں، جن کا تعلق مدارس کی چہار دیواری سے باہر ہے

ابو النظر حکیم امروہوی مارچ ۱۹۴۲ء

اسلام کے لال قلعے ص ۹ - ۱۸ حوالہ ۲۸۰

عربی مدارس کی اصلاح و تنظیم اور اس کی اہمیت پر بحث،

انوار اللہ خاں بہادر شعبان ۱۳۲۶ھ

نصاب تعلیم ص ۸ - ۱۸ حوالہ ۲۶۹/۱

اسلامی نصاب تعلیم کی عہد بہ عہد تبدیلی و ترمیم کا جائزہ لیا گیا ہے،

رشید رضا مصری (علامہ) اپریل ۱۹۱۲ء

عربی افتتاحی تقریر۔ اجلاس ندوۃ العلماء حوالہ ۲۶۹/۹

رشید رضا مصری کی تقریر کا ترجمہ جو انھوں نے ندوۃ العلماء کے اجلاس سنہ ۱۹۱۲ء میں کی تھی، اس میں عربی تعلیم گاہوں کے مسائل پر بحث کی گئی ہے،

سلیمان ندوی سید مارچ ۱۹۴۲ء

(۱) غیر مذہبی عربی تعلیم حوالہ ۲۸۰/۱

ہندوستان میں انقلاب حکومت کے بعد سے جو مذہبی فتنے پیدا ہوئے وہ اسی غیر مذہبی عربی تعلیم کا نتیجہ ہے، سرسید مولوی چراغ علی اور ان کے رفقاء کی تحریک، قادیان کا ہنگامہ، اہل قرآن کا فتنہ، مشرقی صاحب کی تحقیق ان سب کا سرچشمہ عربی تعلیم یا عربی زبان کی واقفیت ہے جس میں مذہبی تعلیم و تربیت کا عنصر شامل نہ تھا،

(۲) عربی مدارس کا نیا نظام مئی ۱۹۴۲ء حوالہ ۲۸۰/۳

عربی مدارس کی اصلاح و تنظیم اور ندوۃ العلماء کی تحریک کے تعارف اور ملک میں اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے،

شبلی نعمانی، علامہ شوال ۱۳۲۳ھ

فن نحو کی مروجہ کتابیں ص ۱ - ۵ حوالہ ۱۷۹/۱

اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ابن حاجب نے کافیہ میں مسائل نحو کو جس طریقہ سے مدون کیا وہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے بعد جس قدر کتابیں اس فن میں لکھی گئیں گویا اس کی عکسی تصویریں تھیں، ایک مدت کی ممارست اور انس کی وجہ سے اب یہ خیال ہی نہیں آتا کہ اس طریقہ میں کوئی نقص ہوگا، لیکن آؤ تقلید کے دائرہ سے نکل کر دیکھیں کہ کیا ایسا ہی ہے۔

شروانی حبیب الرحمٰن خاں جون ۱۹۴۲ء

عربی کا نیا نظام ص ۳۵ - ۴۳ حوالہ ۲۸۰/۳

خطبہ، اجلاس ندوۃ العلماء۔ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق نظام تعلیم میں ترمیم و تبدیلی پر زور دیا گیا ہے۔

عبدالحئی حسنی حکیم، (مولانا)

ہندوستان نصاب درس

ہندوستان میں قدیم نصاب تعلیم کا جائزہ لیا گیا جو دراصل مصنف کی عربی کتاب الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

یعنی خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح و حالات اور تعلیمات و ملفوظات، سلسلۂ چشتیہ کے متوسلین و منتسبین کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ،

مولفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے، ہدیہ محض عہ

مکتبہ دار المصنفین اعظم گڈھ سے طلب فرمائیے۔

ادبیات

غزل

از جناب ڈاکٹر ولی الحق انصاری

حجاب ناز سے نکل کے انجمن میں آ گئی
ردائے رنگ اوڑھ کر کلی چمن میں آ گئی

عروسِ زندگی ہوس کے مکر و فن میں آ گئی
یہ سادہ لوح پھر فریب اہرمن میں آ گئی

تری نگاہ شوخ میں حیا کا رنگ الاماں
لطافتوں کی روح کھنچ کے بانکپن میں آ گئی

فسردگی دل نہ مٹ سکی نشاط دہر سے
خزاں رہی چمن میں گو بہار بن میں آ گئی

کہاں سے یہ نفاق کی سموم تند و جانگسل
نحوستیں لیے ہوئے مرے وطن میں آ گئی

حیات جاوداں کے بھی لباس ہیں نئے نئے
کبھی قبا و تاج میں کبھی کفن میں آ گئی

ہر ایک سمت ہے کشش ہر ایک سمت اہرمن
حسینۂ حیات کیوں ہوس کے بن میں آ گئی

ہوس کی چشم بے بصر کی روشنی کے واسطے
لطافت بدن سمٹ کے پیرہن میں آ گئی

عروج سفلگاں ہوا شریف مٹ کے رہ گئے
بہار بن میں آئی کیا خزاں چمن میں آ گئی

بہار آئی مہوشوں کے رنگ روپ میں کبھی
کبھی لباس نکہت گل و سمن میں آ گئی

بنا ہوا ہے داغہائے غم سے لالہ زار دل
خزاں کے ساتھ ہی بہار بھی چمن میں آ گئی

لگی ہے کیسی آگ اس کے دل میں جس کے فیض سے
حرارت حیات تو ولی کے فن میں آ گئی

غزل

از جناب اسلم سندیلوی

تیری قدرت نے عطا کر کے شکستہ دل مجھے
کر دیا ہے جلوہ گاہِ ناز کے قابل مجھے

میری آشفتہ سری نے کر دیا کامل مجھے
مژدہ، اے جوشِ جنوں کونین ہیں حاصل مجھے

ناامیدی نے کیا ایسا شکستہ دل مجھے
سامنے ہے اور نظر آتی نہیں منزل مجھے

دہر کی رنگینیوں پر کر دیا مائل مجھے
خواہشاتِ دل نے کب رکھا کسی قابل مجھے

میری جہدِ مستقل کو کیوں ہو حاصل کی تلاش
کس لیے درکار ہوں خار و خسِ ساحل مجھے

قطرہ قطرہ ہے مری نظروں میں بحرِ بیکراں
ذرے ذرے میں نظر آتی ہے اک محفل مجھے

چاکِ شب سے پھر نمودِ صبح کے آثار ہیں
پھر نظر آتا ہے اٹھتا پردۂ محمل مجھے

ناخنِ تدبیر بھی دینا تھا قسامِ ازل
جب مقدر کا دیا تھا عقدۂ مشکل مجھے

دل نے جب دیکھا روکشی کی وعدۂ میثاق سے
اس کی ہر دھڑکن نظر آنے لگی قاتل مجھے

کر دیا برباد تو نے اے دلِ خانہ خراب
عشق نے بخشا ہے اک تاریک مستقبل مجھے

ہر نفس کھلتا ہے مجھ پر یہ فریبِ ہست و بود
ہر قدم ملتی ہے اسلم اک نئی منزل مجھے

مطبوعات جدیدہ

مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی (دفتر اول حصہ اول)

ترجمہ مولوی قاضی عالم الدین صاحب مرحوم، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۲۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت مجلد ۱۲ روپے ۵۰ پیسے، پتہ: (۱) اللجنۃ العلمیہ چھپل گوڑہ حیدرآباد ۲۴۔ (۲) مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد ۱۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات جو تین دفتروں پر ... اور تصوف کی اہم اور مقبول ترین کتابوں میں ہیں، ان کا اردو ترجمہ پہلی دفعہ سنہ ۱۹۱۳ء ... الدین تاجر کتب کشمیری بازار لاہور نے شائع کیا تھا، اس کے بعد کئی اڈیشن دوسری ... وں سے چھپے، مگر اب یہ ترجمہ کمیاب تھا، اس لیے حیدرآباد کی اللجنۃ العلمیہ نے اس کا ... اڈیشن شائع کرنے کا پروگرام بنایا، یہ اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے جو دفتر اول کے ابتدائی ... حصہ اور دو سو مکتوبات پر مشتمل ہے، شروع میں پہلے اڈیشن سے ماخوذ مجدد صاحب ... کمالات و فضائل کے علاوہ ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی ہے، اس میں مکتوبات کی ... خصوصیات اور بعض اہم مکتوب الیہم کے متعلق مختصر معلومات دیدیے گئے ہیں، یہ مکتوبات ... ید خالص اور دین و شریعت کے اہم حقائق و معارف کا خزانہ، اس دور کے سیاسی ... نی حالات اور اکبری دور کے فتنوں کے خلاف مجدد صاحب کے اصلاحی و تجدیدی ... رناموں کا مرقع ہیں، مگر بڑے دقیق مباحث پر مشتمل ہیں، اس لیے عام لوگوں کی فہم

سے بالاتر ہیں، اس سے استفادہ کے لیے تصوف کے مسائل اور اکبری و جہانگیری عہد کے وقائع سے واقفیت ضروری ہے، البتہ العلیہ کی یہ علمی و دینی خدمت قابلِ تحسین ہے،

تلمیحات و اشاراتِ اقبال - مرتبہ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۴۴ مجلد مع گرد پوش قیمت ۱۲ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم اور ان کی شاعری پر بہت لکھا گیا ہے، لیکن ابھی تک اس پہلو کی جانب کسی نے توجہ نہیں کی تھی، اس لیے لائق مرتب نے اس پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا تھا، اس میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے کلام میں قرآن، حدیث، فلسفہ، تاریخ و سیاست، مشرق و مغرب کے حکما و شعرا اور مقدس شخصیتوں انبیاء، صحابہ اور اولیاء وغیرہ کی جانب جو تلمیحات و اشارات ہیں ان کو جمع کرکے ان کی ضروری تشریح کی ہے اور اشخاص کے متعلق مختصر نوٹ اور آیتوں اور حدیثوں کے حوالے دیے ہیں، بعض روایتوں کی فنی حیثیت پر بھی گفتگو کی ہے، ایک باب میں اقبال کی بعض نظموں کے ماخذ بیان کیے ہیں، شروع میں ان کی شخصیت اور ماحول کا اور آخر میں ان کے اسلامی پیغام و دعوت کا مختصر و جامع جائزہ لیا گیا ہے، یہ مقالہ جو پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں بڑی کد و کاوش سے لکھا گیا ہے، خاصے کی چیز اور اقبالیات میں اچھا اضافہ ہے، مگر کتابت و املا کی غلطیاں تکلیف دہ اور قیمت زیادہ ہے،

عہدِ نبوی کا نظامِ تعلیم - مرتبہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۵۰، قیمت عہ پتہ الہدیٰ بک ایجنسی جگمہ روڈ، ترپ بازار، حیدرآباد ۲

مشہور فاضل و نامور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے ۱۹۳۹ء میں رسالہ اسلامک کلچر حیدر آباد کے لیے یہ مقالہ انگریزی زبان میں لکھا تھا، پھر اس کو اردو میں منتقل کرکے انھوں نے معارف میں شائع کرایا اور اس کے کئی اڈیشن اصلاح و اضافے کے بعد شائع ہوتے رہے، ایک اڈیشن فرانسیسی زبان میں بھی نکلا ہے، اور اب اس کا نواں جامع تر اڈیشن شائع کیا گیا ہے، اس پر معارف میں پہلے تبصرہ ہو چکا ہے، اس میں اسلام سے پہلے کے جاہلی اور اس کے بعد کے عہد نبویؐ کے نظام تعلیم کا مفصل خاکہ ہے، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہوگا۔

اردو میں وہابی ادب۔ مرتبہ جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۲۵ قیمت ۶ر پتہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لائق صدر خواجہ احمد صاحب فاروقی نے اگست ۱۹۶۷ء میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس منعقدہ ٹشی گن (امریکہ) میں یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی تھی، زیر نظر مقالہ اسی اجلاس میں پڑھے جانے والے انگریزی مقالے کا اردو ترجمہ ہے، اس میں انھوں نے انیسویں صدی کے اوائل کی مجاہدین کی تحریک کے خط و خال اسکی ہمعصر تحریروں کے آئینہ میں دکھائی ہے، اسکا رخ حنفیہ ولی اللّٰہی تحریک ہے جسکو بدنام کرنے کیلیے وہابی تحریک کے نام سے موسوم کر دیا گیا اور اب یہ نام اسقدر رائج ہو چکا ہو کہ اسکو ترک کر دینے سے اشتباہ ہو جاتا ہے، اس میں پہلے ان عوامل و حالات کو بیان کیا گیا ہو جو اس تحریک کے ظہور کا باعث ہوئے تھے، مثلاً شرک و بدعت کے وہ رسوم و اعمال، باطل افکار و عقائد اور ہندوانہ تہذیب و معاشرت کے اثرات جو اس زمانہ کے مسلمانوں میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے تھے، پھر انکی روشنی میں تحریک کے اغراض و مقاصد، مذہبی و سیاسی پہلو اور ادبی حیثیت کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور وہابی تصنیفات کی اردو ادب میں اہمیت و ارتقاء میں اثرات

دکھائے گئے ہیں، مقالہ کے آخر میں تحریک سے متعلق کتابوں کی فہرست اور مختصر تعارف بھی ہے، مقالہ پُر از معلومات اور دلچسپ تو ہے ہی، خواجہ صاحب کے دلکش اندازِ بیان اور شگفتہ نگار قلم نے اس کو مزید دلچسپ تر بنا دیا ہے، مگر تعجب ہے کہ ان کے ذمہ دار قلم نے شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ وغیرہ کے بارہ میں بعض بے سروپا اور غیر مستند روایتیں نقل کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا ہے۔

احسن العقائد و آموزگار پارسی } مرتبہ جناب مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۲ و ۴۸، بلاقیمت

پتہ : شعبۂ نشریات اسلام مولانا آزاد تعلیمی مرکز، اسرہٹہ، شاہ گنج، جونپور

پہلے کتابچہ میں ملا محمود صاحب شمس بازغہ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے عقائد سے متعلق دو مختصر رسالے شامل ہیں، معلوم نہیں ملا صاحب کا رسالہ کبھی اور بھی چھپا ہے یا نہیں لیکن شاہ صاحب کا رسالہ بارہا چھپ چکا ہے اور اس کے فارسی و اردو ترجمے اور شرحیں بھی لکھی گئی ہیں، فاضل مرتب نے ان امور کی کوئی صراحت نہیں کی ہے، دونوں رسالوں میں اہلسنت والجماعت کے عقائد کی ترجمانی کی گئی ہے، اور بقول مرتب عقائد کی صحت ہی دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہے، اس لیے ان کی اشاعت ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے، دوسرا رسالہ فارسی کے مبتدیوں کو ضروری مبادی و قواعد اور روزمرہ محاورات سکھانے کے لیے جدید انداز میں لکھا گیا ہے، مرتب کو فارسی زبان و ادب کا ذوق ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ سے ملا ہے، جن کی عربی کی طرح فارسی اصول و قواعد پر بھی مجتہدانہ نظر تھی، زیر نظر رسالہ میں مولانا کے اشارات مزید اضافے کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں، یہ کتابچہ نصاب میں داخل کیے جانے کے لائق اور مبتدیوں کے لیے مفید ہے۔

"ض"

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب و ترکیہ، اسلامی رصد خانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت، لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو علوم قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبد السلام

مولانا عبد السلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ، قیمت: غعہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے مشہور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل، مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین، قیمت: عہ

صاحب المثنوی،

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت :- غعہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلم فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے، اور جنھوں نے اس کو رشک جناں بنا دیا، انکی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی ایم اے قیمت بعہ

(منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ)

مصنفات سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے

۱- بزم تیموریہ: تیموری بادشاہوں، شاہزادوں، شاہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۹۲ صفحے قیمت: [illegible]

۲- بزم مملوکیہ: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادباء کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے ۳۵۰ صفحے قیمت: [illegible]

۳- بزم صوفیہ: عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک
تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے۔ ۵۰۶ صفحے قیمت: [illegible]

۵- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام
اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملے گی۔ ۵۰۰ صفحے قیمت: [illegible]

۶- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے
اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت: [illegible]

۷- ہندوستان کے سلاطین، علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر
ضخامت: ۲۲۰ صفحے، قیمت: [illegible]

۸- ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں
ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت: [illegible]

۹- ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں
(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: [illegible]

۱۰- عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں
مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور بعد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۶ صفحے، قیمت: [illegible]

"مینیجر دار المصنفین اعظم گڑھ"

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) مئی ۱۹۶۲ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

۱۔ جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی،
۲۔ جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی الہ آبادی
۳۔ شاہ معین الدین احمد ندوی،
۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات واحکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب ملت نسل و رنگ نژاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اس کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات اُن کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

……((مرتبہ))……

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت:- ۲۲۰ صفحے قیمت:- ۔ـ/۳

جلد ۱۰۹ - ماہ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۲ء - عدد ۵

مضامین

مقالات

شذرات

اس سال جناب سیٹھ عبدالعزیز انصاری اور جناب سید شہاب الدین دسنوی پرنسپل صابو صدیق ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ کی دعوت پر دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ۲۹ راپریل کو بمبئی میں ہوا، یہ دونوں حضرات ہماری مجلس انتظامیہ کے رکن بھی ہیں، اس میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، کرنل بشیر حسن زیدی، مولانا حافظ عمران خاں ندوی، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی، جناب سید انصاری اور راقم نے بھی شرکت کی، جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی سفر کے دوران میں اچانک علیل ہو گئے، ان کو لکھنؤ اسٹیشن سے واپس ہونا پڑا، ان کی عدم شرکت جلسہ میں بہت محسوس کی گئی۔

اس جلسہ میں دارالمصنفین کے اور مسائل کے ساتھ اس کے مالی استحکام پر زیادہ غور و خوض ہوا، ابتک یہ زیادہ تر اپنی مطبوعات کی آمدنی سے چلتا رہا، ۱۹۶۵ء سے ہندو پاکستان کے تجارتی لین دین کے بند ہو جانے کے بعد سے اسکی تجارتی آمدنی بہت ہی کم ہو گئی ہے، گذشتہ سال سے تقریباً ساٹھ ہزار سالانہ خسارہ ہو رہا ہے، جو کسی نہ کسی طرح ابتک پورا کیا گیا، لیکن آیندہ اس خسارہ کے پورے ہونے کی امید نہیں، دو سال پہلے مجلس انتظامیہ میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ اس کیلئے دس لاکھ روپیے کا ایک سرمایہ محفوظ جمع کیا جائے اُس کے صدر ڈاکٹر سید محمود مرحوم نے اپنی ذاتی کوشش سے پانچ لاکھ روپے جمع کرنے کا وعدہ فرمایا تھا، انکی وجہ سے کچھ رقم تو ضرور جمع ہوئی لیکن انکی وفات کے بعد یہ امید جاتی رہی، پھر مطبوعات کی تجارتی آمدنی کی کمی سے مالی پریشانیاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں، بمبئی کی مجلس انتظامیہ میں یہ طے ہوا کہ فی الحال پورے ملک میں ادارہ کے لیے چار سو دوامی ارکین

بنانے کی مہم شروع کیجائے بمبئی ہی سے اس کی ابتدا کی گئی ہے، اور بقول کرنل بشیر حسن زیدی شہر دلانِ بمبئی سے توقع ہے کہ یہاں زیادہ سے زیادہ ارکین بنائے جائیں گے، دوامی رکنیت ایک ہزار روپے کے عطیہ سے بنائی جاتی ہے، اس کے بدلے میں پانچ سو کی قیمت کی مطبوعات فوراً پیش کر دیجاتی ہیں، بقیہ پانچ سو میں رسالہ معارف اور ہر سال کی نئی مطبوعات رکن کی خدمت میں اس کی پوری زندگی تک پیش ہوتی رہتی ہیں، بمبئی کے علاوہ ملک کے اہل استطاعت سے توقع ہے کہ اس طرح اس ادارہ کو اپنی مفید علمی خدمت میں سرگرم رہنے میں پوری مدد کرینگے، اگر یہ خدانخواستہ مالی حیثیت سے ڈگمگایا تو پھر اس کو سنبھالنا بہت مشکل ہو جائے گا،

بمبئی کے قیام میں مجلس انتظامیہ ایک علمی وفد بھی بن گئی تھی، یہاں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن عرصہ سے قائم ہے، استاذی المکرم علامہ سید سلیمان ندویؒ کی مشہور تصنیف عربوں کی جہازرانی اُسی کی طرف سے شائع ہوئی ہے، اس کے صدر جناب اے اے اے فیضی صاحب ہیں، جن کا قلم کبر سنی کے باوجود ابتک مختلف سمتوں میں رواں ہے، اس کے اہتمام میں دو مقالے پڑھے گئے، پہلا مقالہ ہندوستان کے عہد ماضی میں مذہبی رواداری کے عنوان سے راقم کا تھا، اس جلسہ کی صدارت ڈاکٹر رفیق زکریا وزیر حکومت بمبئی نے کی، دوسرا فاضلانہ مقالہ مولانا عبدالماجد دریابادی کا تھا، اس کا موضوع "قرآن مجید اور جدید تمدن" تھا، یہ کرنل بشیر حسن زیدی کی صدارت میں پڑھا گیا، تیسرے دن بمبئی کی انجمن اسلام کی دعوت پر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے "ہندوستان کے آیندہ سماج میں اسلام کا حصہ" کے عنوان پر ایک بہت ہی موثر اور دلنشین تقریر کی، یہ تینوں جلسے صابو صدیق انسٹیٹیوٹ کے الطیفی ہال میں ہوئے، سامعین بڑی تعداد میں شریک ہوتے رہے، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تقریر سننے کے لیے تو بڑا مجمع ہوا، اسی ہال میں ایک روز خواتین کے اہتمام میں میلادالنبی

کی ایک تقریب ہوئی تو اس میں مولانا حافظ عمران خاں ندوی نے سیرۃ النبیؐ پر ایک دلچسپ تقریر کی جس میں انھوں نے خواتین کو سیرت کے جلسہ میں پورے اسلامی آداب کے ساتھ شرکت کرنے کی تلقین کی، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی نے ایک مسجد میں کلام پاک کا درس دیا، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ابوالکلام آزاد روڈ پر اہل حدیث کی ایک مسجد اور خلافت ہاؤس میں بھی تقریریں کیں جو شوق سے سنی گئیں بمبئی کے لوگوں کی رائے تھی کہ یہ چند دن وہاں برابر یاد کئے جائیں گے، اس سفر کی کامیابی سیٹھ عبدالعزیز انصاری کی فیاضانہ میزبانی اور جناب سید شہاب الدین دسنوی کی کے غیر معمولی رسوخ کی وجہ سے ہوئی جس کیلئے دارالمصنفین ان دونوں حضرات کا شکر گذار ہے

---

۲۲ اپریل ۱۹۷۲ء کو ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مدرسہ ثانوی کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد عرب کے سفیر عالیجناب شیخ انس یوسف یٰسین اور جمہوریۂ شام کے سفیر استاذ محمود شوفی نے رکھا، یہ تین منزلہ ہوگی، اس کی تعمیر میں تقریباً پانچ لاکھ روپے صرف ہوں گے، ۱۹۴۷ء کے بعد سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی میں ندوہ کے احاطے میں رواق سلیمانی، رواق رحمانی اور ڈائیننگ ہال کی بڑی بڑی عمارتیں بن چکی ہیں، جن میں لاکھوں روپے خرچ ہوئے، یہ نئی عمارت ان کی برکت اور جواں ہمتی کی بدولت انشاءاللہ جلد ہی بن کر کھڑی ہوجائیگی، انکی زندگی خود تو بہت ہی متوکلانہ اور درویشانہ ہے لیکن وہ اپنی ذات کے علاوہ اور مسائل میں شیر کا دل اور شاہین کی نظر رکھتے ہیں، ندوہ کی تاریخ میں جہاں وہ اپنی گوناگوں ذاتی خوبیوں کی وجہ سے یاد کیے جائیں گے وہاں اس کی عمارتوں کے سلسلہ میں اس کے شاہجہاں بھی کہلانے کے مستحق ہوں گے، دارالعلوم ندوہ کے اراکین، اساتذہ اور طلبہ نے سعودی عرب اور شام کے معزز سفرا کا خیر مقدم ان کے رتبے اور شان کے مطابق کیا، اسی کے ساتھ اپنی خودداری اور روایات کو بھی قائم رکھا جس سے دونوں سفرا بھی متاثر ہوئے۔

مقالات

امیہ بن ابی الصلت

(ایک حکیم شاعر)

از

جناب مولانا عبدالحلیم صاحب ندوی، فاضل معلم استاد عربی جامعہ ملیہ دہلی

امیہ قبیلہ ثقیف کا شاعر اور اس کی عظمت و عزت کا نشان تھا، زمانۂ جاہلیت میں جن لوگوں کو حق کی تلاش تھی، اُن میں امیہ کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے[1]، اسکی کنیت ابو عثمان تھی، پورا سلسلۂ نسب یوں ہے: ابو عثمان امیہ بن ابی الصلت بن عبداللہ بن ابی ربیعہ بن عوف الثقفی ،

---

[1] جیسے ورقہ بن نوفل اور زید بن عمرو بن نفیل۔

زید نے بت پرستی چھوڑ رکھی تھی، اور بت پرستوں کا ذبیحہ بھی نہیں کھاتا تھا، کہتے ہیں کہ اس کے عقائد بالکل مسلمانوں جیسے تھے، اور عین ممکن تھا کہ وہ اسلام لے آتا لیکن بعثت نبوی سے ۵ سال پہلے ہی مرگیا، اس کے بیٹے سعید بن زید ان دس صحابیوں میں سے ہیں جنھیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی، اور جنھیں "عشرہ مبشرہ" کہا جاتا ہے۔

ابن سلام الجمحی نے اسے طائف کے شعراء میں شمار کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس کے کلام میں ایسی بہت سی عجیب وغریب باتیں ملتی ہیں جو اس سے پہلے کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتیں، جیسے زمین وآسمان کی پیدائش، ملائکہ، مرنے کے بعد حشر، جنت و دوزخ وغیرہ کا تصور، اس نے تورات وغیرہ کے مطالعہ سے پچھلی قوموں کے بہت سے واقعات کا علم حاصل کیا تھا، اور ان کو اپنے کلام میں اپنے خاص رنگ میں بیان کرتا تھا، چنانچہ اس کے کلام میں سدوم کے کھنڈرات اور حضرت ابراہیم واسحاق علیہما السلام کے واقعات بھی ملتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ امیہ فطرۃً حق پسند وحق جو تھا، چنانچہ جب اس نے گوش وہوش کی آنکھیں کھولیں اور کائنات اور اس کا نظام اور زندگی اور اس کی بوقلمونی دیکھی تو اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے، کون کر رہا ہے اور اس کا مقصد اور حاصل کیا ہے، اس نے اس کا جواب مختلف مذاہب میں تلاش کیا، اہل کتاب کے علماء سے پوچھا اور سمجھنے کی کوشش کی۔ مذہب عیسوی اور یہودیت کا مطالعہ کیا اور یہودیوں اور عیسائیوں کے بہت سے قصوں اور اسفار کی روایت بھی کی، ملت ابراہیمی اور سنت اسماعیلی کا حال جو کچھ اس زمانے کے بڑے بوڑھوں کو یاد تھا، ان سے معلوم کیا، پھر اپنی سمجھ بوجھ، غور وفکر اور مطالعہ وتحقیق کی روشنی میں سوالات کے جواب تلاش کیے اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس آسمان اور زمین کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے، یہ نظام کائنات یوں ہی اپنے آپ نہیں چل رہا ہے، بلکہ اس کے پیچھے ایک کارساز کا ہاتھ کارفرما ہے، اس نے نظام کائنات اور زمین پر انسانوں کے رہنے کے لیے ایک ضابطۂ حیات بخشا ہے جس کے ذریعہ انسان نے ایک صالح اور پاک زندگی بسر کرنے کے اصول بنائے ہیں تاکہ جس طرح نظام کائنات بغیر کسی رکاوٹ اور اکھاڑ پچھاڑ

کے سکون اور اطمینان کے ساتھ چل رہا ہے، انسانوں کی زندگی بھی سکون اور اطمینان کے ساتھ چلتی رہے، اور اس مقصد کو حاصل کرسکے جس کی خاطر اس کی آفرینش ہوئی ہے، یہ اصول اور زندگی بسر کرنے کا یہ طریقہ انبیا اور رسل لے کر آئے، انھوں نے اس کارساز کی نشاندہی کی اور لوگوں کو بتایا کہ وہ ایک ہے۔ اور مرکر ہر ایک کو اسکے پاس جانا ہے۔ ان مسائل میں غور وفکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ امیہ کی زندگی کا ڈھنگ بالکل بدل گیا، اس نے کملی اوڑھنی شروع کردی، بتوں کی کارفرمائی اور طاقت پر یقین نہیں رہا، اور راگ ورنگ کی محفلوں سے دل اچاٹ ہوگیا۔ شراب وکباب اپنے اوپر حرام کرلیے اور تلاش حق وحقیقت میں کھو گیا۔

تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ مختلف مذاہب کے مطالعہ سے امیہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ایک نبی عنقریب پیدا ہونے والا ہے، اور اسے امید تھی کہ وہ نبی میں ہی ہوں گا، مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا، اور آپ کی طرف سے اس کے دل میں حسد وکینہ بیٹھ گیا، چنانچہ اس نے نہ صرف آپ کا اور آپ کے دین کا انکار کیا بلکہ اہل مکہ کو بھی آپ کی مخالفت پر ابھارنے لگا، اور غزوۂ بدر میں اس نے مقتولین قریش کا مرثیہ بھی کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان اشعار کی خبر ہوئی تو آپ نے ان کی روایت کرنے اور پڑھنے سے منع فرمادیا، کہتے ہیں کہ یہ آیت واتل علیھم نبأ الذی آتیناہ آیاتنا فانسلخ منھا فاتبعہ الشیطان فکان من الغاوین۔ اسی کے بارے میں اتری تھی، یہ بھی روایت کیجاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب امیہ کے ایمان ویقین اور توحید ورسالت کے عقیدے سے معمور اشعار کو سنتے تھے تو فرماتے تھے کہ "اسکی زبان تو ایمان لے آئی مگر اس کا دل منکر رہا۔"

مگر مختلف حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ امیہ آخر تک اپنے آپ کو نبی موعود سمجھتا رہا، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو وہ محض کینہ اور حسد کی وجہ سے اسلام نہیں لایا اور آپ کی مخالفت کرتا اور قریش کو بھی آپ کے خلاف ابھارتا رہا، میرے اس خیال کی بنیاد مفسرین کا وہ اختلاف ہے جو اس آیت سے مراد شخصیت کے بارے میں ملتا ہے، اور وہ عقلی اور نقلی دلائل ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آیت مذکورہ امیہ کے بارے میں نہیں بلکہ کسی اور شخصیت کے بارے میں نازل ہوئی تھی،

مفسرین نے اس آیت کی شان نزول کے سلسلہ میں اس سے متعلق مختلف نام بتائے ہیں، اُن میں سے ایک امیہ بن ابی الصلت کا نام بھی ہے، ان مفسرین نے اپنے خیال کی تائید میں چند روایتیں بھی نقل کی ہیں، جن کے راویوں میں بعض بہت اہم اور جلیل القدر شخصیتوں کا نام آتا ہے، جیسے حضرت عبد اللہ بن عمر اور سعید بن المسیب وغیرہ، مگر یہ بات قابل بحث ہے کہ ان جلیل القدر شخصیتوں کے بعد جو رواۃ ہیں وہ کس پائے کے ہیں، اور اس سلسلۂ روایت میں غیر ثقہ اور وضع سے متہم رواۃ تو نہیں شامل ہو گئے ہیں،

مفسرین کرام نے اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں جس شخصیت کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے وہ بلعم بن باعورا ہے، اس کے بعد بعض نے امیہ بن ابی الصلت کا اور بعض نے ابو عامر راہب اور بعض نے اہل کتاب کے منافقین اور بعض نے بغیر نام بتائے "بنی اسرائیل کے ایک عالم" کا ذکر کیا ہے، اگر آپ ان ناموں پر غور کیجئے تو یہ دیکھکر حیرت ہوگی کہ ان میں سے کسی ایک میں بھی کوئی وجہ مشابہت نہیں ہے، نہ نسلی اعتبار

سے نہ وطنی، تہذیبی اور فکری و نظری لحاظ سے، چنانچہ ان میں سے ایک کنعانی ہے اور ایک عرب، ایک یہودی اور کچھ منافقین اہل کتاب، جن سے مراد یہود اور عیسائی دونوں ہو سکتے ہیں، کیونکہ وہ دونوں اہل کتاب ہیں، جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے، اور اگر ان شخصیتوں کے زمانے پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض کے درمیان سیکڑوں سال کا فرق ہے، چنانچہ ان بعض مفسرین کے قول کے مطابق بلعم بن باعورا حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں تھا، اور امیہ بن ابی الصلت آنحضورؐ کے عہد مبارک میں، اور ان دونوں پیغمبروں کے درمیان ہزاروں سال کا فرق ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایسی ان مل اور بے جوڑ شخصیتوں کو جنکے زمانے میں ہزاروں سال کا فرق ہے، کس طرح ایک ہی آیت سے متعلق کہا جا سکتا ہے، پھر جب ایک خاص واقعہ کی نسبت ان کی طرف کی گئی ہو؟

اس آیت کے امیہ بن ابی الصلت کے بارے میں نازل ہونے کا ذکر شاید پہلی مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر میں ملتا ہے، چنانچہ آپ سے اس آیت کی تفسیر مروی ہے کہ "آیاتنا" سے مراد الاسم الاعظم ہے، اس کے بعد ہے کہ "انسلخ" ای "خرج منہا" و ہو بلعم بن باعورا (یعنی وہ ہماری نشانیوں سے نکل گیا اور وہ بلعم بن باعورا تھا)، اللہ تعالےٰ نے اسے اسم اعظم سے نوازا تھا، مگر جب اس نے اس کے ذریعہ حضرت موسیٰؑ کے لیے بد دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے (بلعم بن باعورا) اس کا (اسم اعظم) حفظ سلب کر لیا۔" ویقال امیہ بن الصلت اکرمہ اللہ تعالیٰ بعلم حسن وکلام حسن ولما لم یومن اخذ اللہ منہ۔" یعنی اور کہا جاتا ہے کہ ہماری نشانیوں سے جو نکلا اس سے مراد امیہ بن ابی الصلت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اسے اچھے علم اور اچھے کلام سے عزت بخشی تھی، مگر جب وہ ایمان نہیں لایا تو اللہ تعالےٰ

نے اس سے وہ علم اور کلام چھین لیا۔"[1]

امام فخرالدین رازیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "لوگوں نے سب سے پہلے یہ ذکر کیا ہے کہ یہ آیت بلعم بن باعوراء کے بارے میں نازل ہوئی تھی، کیونکہ اس نے حضرت موسیٰؑ اور آپ کی قوم کو بد دعا دی تھی، جس کی وجہ سے وہ (صحرائے سینا میں) مارے مارے پھرتے رہے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ان کی صحرا نوردی کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ بلعم نے تم لوگوں کے لیے بد دعا کی ہے، اس پر حضرت موسیٰؑ بولے کہ اچھا تو اب آپ اس کے بارہ میں میری بد دعا قبول کر لیجیے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بد دعا قبول کر لی، اور بلعم سے علم و ایمان چھین لیا، یہ (علم و ایمان) اسم اعظم تھا، پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، سعید بن المسیب، زید بن اسلم اور ابو روق کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "یہ آیت امیہ بن ابی الصلت کے بارے میں نازل ہوئی تھی، اس نے کتابیں (یہودیوں اور عیسائیوں کی) پڑھ رکھی تھیں، اور جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک رسول بھیجنے والا ہے اور اسے امید تھی کہ وہ رسول میں خود ہوں گا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا تو اس کو آپ سے حسد پیدا ہو گیا، آپ پر ایمان نہیں لایا، اور کفر کی حالت میں مرا۔" آگے چل کر امام رازی لکھتے ہیں کہ "کہا گیا ہے کہ یہ آیت ابو عامر راہب کے بارے میں اتری تھی، جسے آنحضرتؐ نے فاسق کا نام دیا تھا، اور یہ بھی کہا ہے کہ اہل کتاب کے منافقین کے بارے میں اتری تھی، یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے تھے، الخ۔"[2]

قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر میں "بنی اسرائیل کے ایک عالم" اور امیہ بن ابی الصلت

---

[1] حاشیہ الدر المنثور للامام السیوطی ج ۳ ص ۱۴۰۔ [2] تفسیر کبیر، امام رازی ج ۴ ص ۳۹۴

کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے، اور کہا ہے کہ "فانہ (ای امیہ) کان قد قرأ الکتب۔ الخ"

اس نے (امیہ) کتابیں پڑھی تھیں (یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابیں) اور

اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک نبی اس زمانہ میں بھیجنے والا ہے اور اسے امید

تھی کہ وہ خود بھی نبی (موعود) ہوگا، مگر جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے

تو اسے آپ سے حسد پیدا ہو گیا اور آپ کا انکار کر بیٹھا، یا (اس آیۃ سے مراد)

بلعم بن باعوراء ہے، جو کنعانیوں میں سے تھا، جسے اللہ تعالیٰ کی کتاب کا کچھ علم عطا

کیا گیا تھا، مگر "انسلخ منہا" یعنی وہ اس سے نکل بھاگا، الخ۔ اس کے بعد بیضاوی

نے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ امام رازی کے الفاظ ہی دہرائے ہیں۔[1]

علمائے متاخرین میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ترجمہ قرآن پر مولانا شبیر احمد

عثمانی نے اپنی تفسیر میں اس آیت سے مراد بلعم بن باعوراء ہی کو لیا ہے،

مفسرین کا اس آیت کی شان نزول اور اس سے متعلق شخصیت کے بارہ میں مذکورہ

اختلافات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا ذہن اس بارہ میں صاف نہیں ہے، پھر قرآن مجید

"آیاتنا" (ہماری نشانیاں) بصیغۂ جمع کہتا ہے، اس لیے اس جمع سے واحد یعنی اسم اعظم

کیسے مراد لیا جا سکتا ہے، کیونکہ قرآن میں جہاں بھی "آیاتنا" کا لفظ استعمال ہوا ہے

اسے جمع ہی (نشانیاں) مراد لیا گیا ہے، واحد کے لیے "آیاتنا" شاید ہی کہیں استعمال

ہوا ہو، پھر یہ اسم اعظم بجائے خیر و برکت کا ذریعہ ہونے کے بددعا کرنے کا وسیلہ کیسے بن گیا،

یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر بلعم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم سے

کون سی دشمنی پیدا ہو گئی تھی جس کی بنا پر اس نے ان کے حق میں بددعا کی، پھر اللہ تعالیٰ

---

[1] تفسیر بیضاوی

نے اپنے ایک نبی کے حق میں اس سے کم رتبہ شخص کی بد دعا کیسے قبول کر لی۔ انبیا کی تاریخ میں اس کی مثال شاید ہی ملے کہ کسی شخص کی بد دعا کی وجہ سے اللہ نے اپنے کسی نبی کو کسی آزمائش میں مبتلا کیا ہو، کلام مجید میں مختلف مواقع پر اس کی صراحت ہے کہ بنی اسرائیل کے صحرائے سینا میں مارے مارے پھرنے کا سبب انکی مسلسل نافرمانی، حکم عدولی اور گناہوں پر ان کا اصرار تھا، نہ کہ کسی کی بد دعا کا اثر۔ اور اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام [illegible] [illegible] تعالیٰ سے عرض کیا کہ اچھا اب میری بد دعا قبول کر لیجئے تو اس نے بغیر کسی جرم و گناہ کے بلعم سے نہ صرف اس کا علم چھین لیا بلکہ یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ وہ گمراہوں میں ہو گیا، جہاں تک اس آیت کے امیہ بن ابی الصلت سے متعلق ہونے کا سوال ہے تو اس کے بارے میں ان ہی مفسرین کا قول ہے کہ اسے کتابوں کا علم تھا اور ان کے ذریعہ سے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کا علم ہو گیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا قرآن مجید نے امیہ کے مبہم اور غامض علم اور شعر و شاعری میں اس کی ندرت کو "آیات" سے تعبیر کیا ہے، اور کیا از روئے لغت و[illegible]ت اس قسم کے علم کو "اللہ کی نشانیاں" کہا جا سکتا ہے، اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔[1] قرآن کریم نے مختلف مواقع پر اپنے انبیاء کے لیے کہا ہے کہ ہم نے انھیں اپنی نشانیاں دیں تاکہ وہ اپنے مخالفوں کے سامنے انھیں پیش

---

[1] امام راغب اصفہانی نے "مفردات القرآن" میں "آیۃ" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "الآیۃ ہی العلامۃ الظاہرۃ وحقیقۃ لکل شئ ظاہر لشئ لایظہر ظہورہ فمتی ادرک المدرک الظاہر علم انہ ادرک الاخر الذی لم یدرکہ بذاتہ، اذکان حکمہا سواء وذالک ظاہر فی المحسوسات والمعقولات وقولہ تعالیٰ "ان فی ذٰلک لآیات للمومنین" فہی من الآیات المعقولۃ التی تتفاوت بہا المعرفۃ بحسب تفاوت منازل الناس فی العلم"۔ ص ۳۲ مادۃ (ای)۔

کر کے اپنے دعویٰ کی صداقت ثابت کر سکیں، ایسے مواقع پر یہ نشانیاں محسوسات و معقولات دونوں قبیل کی ہیں، جیسے حضرت موسیٰؑ کا ید بیضا اور عصا اور حضرت عیسیٰؑ کا مردوں کو زندہ کر دینا، حضرت سلیمانؑ کی جن و انس اور چرندو پرند پر قدرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزۂ شق القمر وغیرہ، اور اس پر سارے تذکرہ نگار متفق ہیں کہ اس قسم کی کوئی نشانی امیہ کو نہیں ملی تھی، رہ گیا شعر و شاعری یا ظن و تخمین کے ذریعہ بعض آیندہ کی باتوں کا جان لینا تو اس قسم کے علم کو از روئے لغت "آیۃ" نہیں کہہ سکتے کہ "آیۃ العلامۃ الظاہرۃ الخ" بہرحال نہیں ہے، دوسرے موقعوں پر "آیاتنا" کا استعمال قرآن مجید میں عبرت و موعظت کے لیے ہوا ہے، جو بہرحال یہاں منطبق نہیں ہوتا، اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ امیہ کو معروف اور مفہوم معنوں میں "آیات" نہیں ملی تھیں، اور جب آیات نہیں ملی تھیں تو وہ مذکورہ آیت کا مخاطب اور اس سے مراد بھی نہیں ہو سکتا۔

ابن سلام جمحی نے سفیان اور ابن داب سے روایت کی ہے کہ "امیہ ایک دفعہ یزید بن عمرو بن نوفل سے ملا جو زمانۂ جاہلیت میں ورقہ بن نوفل کے ساتھ طلب حق میں مشغول رہتا تھا، اور اس سے پوچھا کہ "اے خیر کے متلاشی کیا تجھے وہ ملا"۔ یزید نے جواب دیا کہ نہیں، میں جس چیز کی تلاش میں تھا وہ اب تک مجھے نہیں ملی، اس پر امیہ نے کہا کہ "الا انہ منا و منک او من اہل فلسطین"۔ یعنی وہ (نبی) یا تو ہم میں سے (عرب) ہوگا یا تم میں سے یا پھر اہل فلسطین میں سے"۔[۵]

اس روایت میں لفظ "منا" سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ

---

[۵] طبقات فحول الشعراء، لابن سلام الجمحی ص ۲۲۰

اس کا اندازہ تھا کہ ہماری قوم میں سے یا ہمارے خاندان میں سے کوئی نہیں ہوگا۔ اگر اس کو اپنے متعلق یقین ہوتا تو "منا" کہنے کے بجائے اس کی تصریح کر دیتا۔ جہاں تک "منا" یعنی عربوں کا سوال ہے تو اس کا اندازہ بالکل صحیح نکلا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریشی تھے۔ اور قریش کا سلسلۂ نسب اوپر جا کر قبیلۂ مضر سے مل جاتا ہے، اور اس مضر کی ایک شاخ قیس عیلان تھی جس سے قبیلہ باہلہ اور ہوازن پیدا ہوئے، اور ہوازن سے امیہ کا قبیلہ ثقیف تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جب امیہ کی پیشین گوئی صحیح نکلی اور وہ متلاشی حق بھی تھا تو پھر وہ کیوں اپنے کو نبوت کا امیدوار سمجھتا اور اگر سمجھتا تھا تو اسے دعویٰ نبوت میں کونسی چیز مانع تھی؟ لوگ اس کو متقی، پرہیزگار اور جویائے حق و صداقت سمجھتے ہی تھے، گویا ذہنی طور سے اس کی نبوت کی تصدیق کے لیے تیار تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل مکہ کو اس نئے دین کی وجہ سے کد پیدا ہوگئی تھی، اس سے بھی امیہ کے دعویٰ نبوت کو قبول کرنے کے لیے پوری طرح فضا ہموار تھی، اب اگر اس نے اس کا دعویٰ نہیں کیا اور حق جانتے ہوئے بھی اس سے روگرداں رہا، اور حسد کی وجہ سے قریش کو آپ کی مخالفت پر ابھارتا رہا تو وہ منافق تھا، اور یہ الزام اس پر کسی تذکرہ نگار نے نہیں لگایا ہے پھر اس کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ دین ابراہیمی کو مانتا تھا، اس کی مدح و توصیف کرتا تھا، اور یہ خود اس کو اور سارے عرب کو معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنیادی طور سے دین ابراہیمی ہی تھا، اور جب رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین دین ابراہیمی تھا جس کی تلاش میں امیہ نے پوری عمر صرف کر دی تھی، تو اس کے آنے کے بعد اس سے انکار کیوں کرتا، اور اس دین کے

حامل سے حسد کیوں کرتا ؟

حقیقت یہ ہے کہ امیہ بن ابی الصلت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی سچی اور صحیح خبر پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی، اور جب آپ نے دعوی نبوت کیا ہے تو امیہ ذہنی طور پر اس کو سننے کے لیے تیار تھا،

اس کے بارہ میں اغانی نے دو روایتیں نقل کی ہیں، ایک میں ہے کہ "امیہ قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا، ایک منزل پر امیہ ایک کنیسہ میں گیا، جہاں ایک پیر مرد بزرگ ملے، انھوں نے امیہ سے پوچھا کہ "تمھارے پاس آنے والا کس سمت سے آتا ہے"؟ امیہ نے جواب دیا بائیں طرف سے، پھر اس نے پوچھا کہ وہ تم کو کس رنگ کے کپڑے پہننے کا حکم دیتا ہے، امیہ نے کہا کہ کالے رنگ کے کپڑوں کا، اس پر اس بزرگ نے کہا کہ "یہ ایک الجن ہے، قریب تھا کہ تم عربوں کے نبی ہو جاتے مگر اب ایسا نہیں ہوگا، یہ آنے والا داہنے طرف سے آئیگا اور اس کا پسندیدہ کپڑا سفید رنگ کا ہوگا۔"

دوسری روایت میں قافلہ کے شام جانے کا ذکر ہے، یہاں بھی ایک منزل پر امیہ ایک کنیسہ میں جاتا ہے، اور وہاں ایک عالم راہب اس سے اس قسم کے سوالات کرنے کے بعد یہی فیصلہ دیتا ہے کہ تم نبی موعود نہیں ہو، بلکہ نبی موعود دوسرا ہے، جو پیدا ہو چکا ہے، [1]

ان روایتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امیہ کو آپ کی بعثت سے بہت پہلے یقینی خبر مل چکی تھی کہ نبی وہ نہیں ہوگا، بلکہ دوسرا عرب ہوگا، اور جو پیدا بھی ہو چکا ہے،

---

[1] الاغانی۔ ابو الفرج الاصفہانی ج ۳ ص ۱۸۸

اس علم کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ اپنے آپ کو نبی موعود کیوں سمجھتا، درحقیقت اس کا یہی علم تھا جس کی وجہ سے اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، ورنہ دوسرے قرائن اور حالات ایسے تھے کہ اگر وہ نبوت کا دعویٰ کر دیتا تو اسے شاید زیادہ مایوسی نہ ہوتی، اور اس کے اوصاف کی بنا پر اسکی تصدیق کرنے والے مل جاتے،

رہی یہ روایت کہ امیہ نے مقتولین بدر کا مرثیہ کہا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس کی روایت کرنے اور پڑھنے سے منع فرمادیا تھا، کیونکہ اس کی زبان مومن تھی لیکن دل کافر رہا، تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایسے بہت سے لوگ تھے، جو باوجود اسلام کو حق سمجھنے کے مسلمان نہیں ہوئے، ان اشخاص میں بعض آپ کے قریب ترین اعزہ بھی تھے، جنھوں نے ہر موقع پر تاحیات آپ کا ساتھ دیا، آپ کی خاطر تکلیفیں اٹھائیں، اہل مکہ کی مخالفت مول لی، اور سماجی بائیکاٹ کی سختیاں جھیلیں، اور جو اپنی فہم و فراست میں سارے عرب میں مشہور اور شرافت و دیانت داری میں ضرب المثل تھے، مگر وہ ایمان نہیں لائے، اس کی وجہ حسد نہیں، بلکہ جاہلی عزت نفس یعنی قبائل عرب میں خیالی بے عزتی کا خیال اور اپنے پرانے طور طریقوں کو چھوڑنے پر انگشت نمائی کا خوف تھا، اس کے باوجود ان میں سے کسی کے بارے میں کوئی آیت نہ اتری، حالانکہ علم و یقین کے بعد "انسلاخ" کا اطلاق ان لوگوں پر پوری طرح صحیح تھا،

اب ذرا قرآن مجید کی مذکورہ آیت پر امیہ کو سامنے رکھ کر غور کیجئے، قرآن کہتا ہے واتل علیھم نبأ الذی آتیناہ آیاتنا فانسلخ منھا۔ الخ یعنی آپ ان یہودیوں کو اس شخص کی خبر (قصہ) سنا دیجئے جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں"، اس انداز بیان

سے پتہ چلتا ہے کہ جسے نشانیاں دی گئی تھیں وہ کوئی بہت اہم شخصیت کا مالک تھا، اور نشانیاں محسوس و معقول تھیں، پھر اس شخص سے کوئی بہت اہم "نبا" متعلق تھی، اب سوال یہ ہے کہ کیا امیہ کی شخصیت اتنی اہم تھی کہ اس سے قرآن کے بلیغانہ انداز میں کوئی "نبار" متعلق ہو، اور کیا اسے ایسی ظاہری نشانیاں دی گئی تھیں جو محسوس بھی ہوں، اور عقل میں آجائیں؟ قرآن میں جہاں کہیں "نبا" کا ذکر آیا ہے وہ بہت ہی اہم مواقع ہیں، اور امیہ کی شخصیت یا اس کا اسلام لانا اتنا بڑا واقعہ نہیں ہے کہ اسے قرآن "نبا" کا مقام دیتا، اور نہ علم و عقل رکھنے کے باوجود اس کا ایمان نہ لانا اتنا بڑا حادثہ ہے کہ اسے "نبا" کہا جاسکے[1] کیونکہ اس "نبا" سے کوئی ایسا علم نہ حاصل ہوتا جو بہت اہم اور بہت مفید ہوتا۔ حقیقت جان لینے کے بعد بھی ایمان نہ لانے کے واقعات بے شمار پیش آتے رہتے تھے، ابوجہل ہمیشہ آپ سے کہتا تھا کہ محمدؐ میں تم کو جھوٹا نہیں سمجھتا، پھر بھی ایمان نہیں لایا[2]، اور حالت کفر میں قتل ہوا، یہاں بھی ایمان نہ لانے کی وجہ نخوت، سبکی کا خیال اور قبائلی تعصب تھا، آخر اعشیٰ بھی جو متفقہ طور سے امیہ کے مقابلہ میں بڑا شاعر تھا، صرف چند اونٹوں کی خاطر ایمان نہ لایا، حالانکہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھا تھا اور ایمان لانے کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر بھی ہوا تھا، مگر آخر کار کفر کی حالت میں مرا، قرآن نے اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ عبرت و موعظت کے اعتبار سے اس واقعہ میں بڑی جان ہے، کیونکہ

---

[1] "نبا" کی تشریح کرتے ہوئے امام موصوف نے لکھا ہے کہ "النبا" خبر ذو فائدۃ عظیمۃ یحصل بہ علم او غلبۃ ظن، ولا یقال للخبر فی الاصل نبا حتی یتضمن ہذہ الاشیاء الثلاثۃ وحق خبر الذی یقال فیہ "نبا" ان یتعری عن الکذب کالتواتر وخبر اللہ تعالیٰ وخبر النبی علیہ السلام۔ مفردات القرآن۔ مادہ (ص ۴۹۹)

[2] سیرۃ النبی۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ بحوالہ سیرۃ ابن ہشام

اگر اعشیٰ جیسا شاعر ایمان لے آتا تو اس سے اسلام کو بہت تقویت پہنچتی، اس لیے کہ اعشیٰ اتنا قادر الکلام، نامور اور ممتاز شاعر تھا کہ اپنے کلام سے جسے چاہتا گرا دیتا، اور جسے چاہتا مدح کے ذریعے اٹھا دیتا تھا۔ اس سلسلہ میں محلق کی ان لڑکیوں کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہے، جن کی شادی محلق کی غربت، گمنامی اور قبائل عرب میں بے حیثیت ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتی تھی، مگر جب اعشیٰ نے محلق کی تعریف میں اپنا قصیدہ عکاظ کے میلے میں پڑھا تو سال بھر بھی نہ گزرنے پایا کہ اس کی آٹھوں لڑکیاں امیروں، رئیسوں کے محلوں کی زینت بن گئیں، اسی خطرہ کے پیش نظر اہل مکہ نے اسے یہ کہکر واپس کر دیا تھا کہ اس سال رک جاؤ، اگر محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہم پر غالب آجاتے ہیں تو تم اسلام لے آنا، اسلیے اسکے اسلام نہ لانے کا واقعہ بیشک عبرت اور موعظت کے خیال سے قابل ذکر تھا کہ اس کا انجام کتنا دردناک ہوا، مکہ سے واپس جاتے ہوئے اونٹنی سے گر گیا اور چوٹ کے صدمہ سے مر گیا[1] مگر قرآن نے اتنے اہم واقعہ کا ذکر بھی مناسب نہیں سمجھا

اب رہی امیہ کو کسی خارق عادت عمل یا خدا کی طرف سے "آیات" ملنے کا سوال تو اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ کیونکہ امیہ کو پورے جزیرۂ عرب میں کیا شعرائے جاہلیت میں بھی کوئی بہت نمایاں حیثیت حاصل نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر "فحول الشعراء" میں نہیں کیا ہے، اس سے کہیں اہم شخصیت تو قس بن ساعدۃ الایادی اور ورقہ بن نوفل کی تھی، جو امیہ کی طرح خود بھی حق و حقیقت کے متلاشی تھے، اور اس آرزو میں دنیا سے رخصت ہو گئے،

مذکورۂ بالا بحث سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ امیہ کی نہ تو شخصیت اتنی

---

[1] اس کی تفصیل اعشیٰ کے حالات زندگی میں ملاحظہ کیجئے۔

بڑی تھی اور نہ اس کی ذات میں کوئی ایسی غیر معمولی امتیازی شان تھی کہ اسے یہ درجہ حاصل ہوتا کہ قرآن اس کے ایمان نہ لانے کے واقعہ کو اتنی اہمیت دیتا۔ اور اس کو نبا" کہہ کر پکارتا۔ یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت کا تعلق بہرحال امیہ سے نہیں ہے، ممکن ہے بقول مفسرین و رواۃ اس کا تعلق بلعم بن باعورا یا کسی دوسرے شخص سے ہو، جس میں پڑنے اور اس کی تحقیق کرنے کا یہاں موقع نہیں،

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ سیرت نگاروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مخالفین اور دشمنوں کی ایک فہرست اپنی کتابوں میں دیدی ہے، لیکن باوجود چھان بین کے اس فہرست میں امیہ بن ابی الصلت کا نام کہیں نہیں ملتا، اگر یہ صحیح ہے کہ وہ قریش کو آپ کی مخالفت پر اکساتا تھا، تو اس کا نام کسی نہ کسی سلسلہ میں ضرور آتا، اس سے بھی اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ مذکورہ آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں جو باتیں امیہ سے منسوب کی گئی ہیں، وہ شاید یقین کو نہیں پہنچتیں،

اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کی روایتیں آخر آ کیسے گئیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سی روایات جن کی بنیاد کسی ثقہ سند پر نہیں ہے، تفسیروں میں رواج پا گئی ہیں، اور چونکہ ان کا تعلق اسلام کے بنیادی عقائد، اس کی تعلیمات اور عبادات سے نہیں ہے، اس لیے ہمارے علماء نے ان کو نقل کرنے میں کوئی ہرج نہیں محسوس کیا، اور بغیر تحقیق کے ان کو جوں کا توں رہنے دیا، اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ قبائلی عصبیت کی وجہ سے اس قسم کی روایتیں بعد میں وضع کر کے انھیں مشہور کر دیا گیا ہو کہ قبیلے کے اس فرد کی اہمیت کے ساتھ خود قبیلہ کی اہمیت بھی اجاگر ہو جائے گی، اس مقصد کی خاطر خاص طور سے بنی عباس کے عہد میں بہت سی ادبی روایتوں کو گڑھا گیا،

ان میں ان روایات کو بڑی اہمیت دیجاتی تھی، جو شعراء و ادباء کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے وضع کی جاتی تھیں،[1]

امیہ بن ابی الصلت ثقفی تھا، بنو ثقیف نے زمانہ جاہلیت اور عہد اسلام دونوں زمانوں میں ایسے عظیم الشان کارنامے انجام نہیں دیے تھے، جن کی بنیاد پر وہ قبیلوں کے درمیان مفاخرت میں کوئی اونچا مقام حاصل کر سکتا، اس لیے عین ممکن ہے کہ اس قبیلہ کے افراد نے اپنے قبیلہ کے شاعر اور فلسفی کی اہمیت بڑھانے کے خیال سے اس قسم کے خیالات کو شہرت دی ہو، اور اس طرح اپنے قبیلہ کی اہمیت کو اجاگر کرنا چاہا ہو کہ قرآن مجید میں جس شخص کا ذکر اس انداز سے آجائے تو اسکی اور اس کے ساتھ اس قبیلہ کی اہمیت و عظمت سامنے آجائے گی، مگر جیسا کہ پہلے بیان ہوا، امیہ کی شخصیت ہرگز ایسی نہیں ہے کہ قرآن کریم اس کو یہ حیثیت اور اتنی اہمیت دیتا،

اس رائے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ قدیم تذکرہ نگاروں میں سے صاحب نظر ادباء اور نقادوں نے اس آیت کا ذکر نہیں کیا ہے، جیسے ابن سلام الجمحی نے، جاحظ اور ثعالبی وغیرہ، ابن سلام الجمحی نے امیہ کا وہ شعر ضرور نقل کیا ہے جو اس نے مقتولین بدر کے مرثیہ میں کہا ہے، مگر اس کے علاوہ اور کوئی شعر اس کا ذکر نہیں کیا ہے، البتہ ابو الفرج اصفہانی نے اپنی کتاب الاغانی میں اس آیت اور اس کی شان نزول کے طور پر امیہ کا مذکورۂ بالا واقعہ نقل کیا ہے، لیکن اصفہانی کی روایت پر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہ رطب ویابس ہر قسم کی روایات جمع کر دیتا ہے، وہ نہ تو سیرت کی مستند کتاب ہے اور نہ تاریخ کی، اور اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ

[1] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: ڈاکٹر طہ حسین کی کتاب: فی الادب الجاہلی۔

اغانی کی بہت سی روایات اور قصے محض من گھڑت اور جھوٹے ہیں، خود ابو الفرج نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ میں نے جو کچھ لوگوں کو کہتے سنا ہے بغیر تحقیق و تدقیق کے نقل کر دیا ہے،[۱] عرب تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکرے عام طور سے اغانی کی روایات سے مرتب کیے ہیں، اس لیے بعد کے سب تذکرہ نگاروں نے بغیر تحقیق و تدقیق کے اغانی کے بیان کو نقل کر دیا اور اس کی مطلق پرواہ نہیں کی کہ قرائن اور عقل سلیم کی روشنی میں یہ باتیں کہاں تک صحیح ہیں، متاخرین میں اس کی ابتدا جرجی زیدان نے اپنی کتاب تاریخ آداب اللغۃ العربیہ میں کی، اور اس کی تقلید میں دوسرے مصنفین نے بھی ان باتوں کو جوں کا توں نقل کر دیا، اس کی وجہ سے یہ غلط فہمی بلکہ غلط بیانی آج تک ہماری عربی ادب کی تاریخ میں چلی آرہی ہے۔

اب رہا امیہ کا مقتولین بدر کا مرثیہ کہنا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، وہ شاعر تھا، مسلمان نہیں ہوا تھا، اہل مکہ سے اس کے تعلقات تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ بدر کی شکست اور اس میں اہل مکہ کی رسوائی قریش مکہ کی تاریخ کا سب سے دردناک اور ذلت آمیز المیہ تھا، اس لیے اگر اس واقعہ پر امیہ کو رنج ہوا اور یہ رنج شعر کی شکل میں ظاہر ہوا، تو اس میں کونسی تعجب کی بات ہے؟ عبادت اور ذکر و فکر عام طور سے دل میں رقت پیدا کرتا ہے، امیہ کی زندگی اسی میں گزری تھی، اس لیے وہ رقیق القلب تھا، اس نے شدت تاثر میں آنسو بہا دیے جو شعر میں ڈھل کر زبان زد خاص و عام ہو گئے۔

امیہ بن ابی الصلت نے عبد اللہ بن جدعان کی شان میں بڑے پرزور مدحیہ قصیدے

---

[۱] اغانی کی روایات کے بارے میں ملاحظہ کیجئے: ڈاکٹر محمد احمد خلف اللہ کی کتاب "صاحب الاغانی ابو الفرج الاصفہانی الروایۃ، اور علی العمیر کا مضمون، مع ابن الفرج الاصفہانی فی کتاب الاغانی، مطبوعہ مجلۃ العرب، الریاض، ماہ رجب ۱۳۸۹ھ، اکتوبر ۱۹۶۹ء

کیے ہیں، عبد اللہ قریشی کا نامور سردار اور بہت ہی سخی داتا امیر تھا، کہتے ہیں کہ امیہ نے اس کی اس طرح مدح کی ہے جس طرح زہیر بن ابی سلمی ہرم بن سنان کی مدح کیا کرتا تھا،

امیہ کی پیدائش طائف میں ہوئی تھی یہیں اس کے باپ نے جو خود بھی بہت بڑا شاعر تھا، اس کی تعلیم و تربیت کی، بڑے ہو کر اس نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا، شام اور یمن مال تجارت بیچنے کے لیے جایا کرتا تھا. ان سفروں میں اس کی راہبوں اور پروہتوں سے ملاقاتیں ہو جاتی تھیں، اور وہ ان سے دین و ایمان کی باتیں کرتا تھا، جنھوں نے آگے چل کر اس کی زندگی کا نقشہ بدل دیا، مختلف ادیان کے مطالعہ نے اسے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ تمام ادیان باطل ہیں، صرف دین ابراہیمی صحیح ہے،

کل دین یوم القیامۃ عند اللہ، الا دین الحنیفۃ زور یعنی اللہ کے نزدیک قیامت کے دن تمام دین جھوٹے ثابت ہوں گے، سوائے دین حنیف (ابراہیمی) کے، اس دین ابراہیمی کی طرف اس طرح اشارہ کرتا ہے،

رب الحنیفۃ لم تنفد خزائنہ　　　　　ملوءۃ طبق الآفاق سلطانا

یعنی وہ دین حنیف کا مالک ہے، اس کے خزانے کبھی خالی نہیں ہوتے، ہمیشہ بھرے رہتے ہیں، اور جس نے اپنی بادشاہی اور کار فرمائی سے سارے آفاق کو گھیر رکھا ہے،

(باقی)

تہذیب کی تشکیل جدید

از جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۳)

انسان وکائنات دونوں سے متعلق تعلیم ضروری ہے

پرورش کے بعد تعلیم بھی والدین کے ذمہ ہے، اس میں شک نہیں کہ مغرب نے کائنات سے متعلق علم میں کافی ترقی کرلی ہے لیکن انسان سے متعلق علم میں ابھی بہت پیچھے ہے، چنانچہ کائنات کی گتھیاں سلجھانے میں کامیاب اور انسان کی گتھیاں سلجھانے میں بری طرح ناکام ہے۔ "Daved.C.Marsh" نے اعتراف کیا ہے کہ

طبیعیات کے متعلق ہمارا علم بہت وسیع ہے، اور ہم نے پہلے کے مقابلہ میں فطری طاقتوں کے ایک بڑے حصہ کو اپنے قابو میں کرلیا ہے، لیکن ابھی ہم انسانی معاملات کے بیشمار پہلوؤں سے افسوسناک حد تک لاعلم ہیں[۵]"

اور "A.W. Haslet" نے کہا ہے:-

سائنسداں کسی بحث ومسئلہ میں اس سے زیادہ عاجز ودرماندہ نہیں ہے، جتنا خود انسان کے معاملہ میں، وہ ایٹم کو توڑ سکتا ہے، بعید ترین ستاروں کی تحلیل وتجزیہ کرسکتا ہے، بجلی کو غلام بنا سکتا ہے۔ لیکن یہی سائنسداں جب زندگی کی حقیقت بلکہ خود اپنی یا انسان کی حقیقت سمجھنا چاہتا ہے تو مشکلات ہی مشکلات

---

[۵] David: C. Marsh. The changing social structure. England & Wales P. 263

سے دوچار ہوتا ہے، نہ زندگی قابو یافتہ تجربہ کی متحمل ہے نہ انسان ہی[۵]

قرآن حکیم سے دونوں قسم کی تعلیم کا ثبوت | تشکیل جدید میں انسان سے متعلق اس قدر علم موجود ہے کہ اس کے مسائل کے حل میں کوئی دشواری نہیں رہتی اور کائنات سے متعلق نہ صرف ہر مفید علم سے استفادہ کی تاکید ہے، بلکہ اس میں ارتقائی سلسلہ جاری رکھنا ضروری ہے، ورنہ بقا و بقا کی ضمانت نہ حاصل ہو سکے گی. چنانچہ قرآن حکیم کی ابتدا ہی پڑھنے کے حکم (لفظ اقرأ) سے ہوئی، جو آیتیں سب سے پہلے نازل ہوئیں ان میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی کہ جس مادہ (جما ہوا خون جو نطفہ کے بعد کا درجہ ہے) سے انسان کی پیدائش ہوئی، اس اعتبار سے اگرچہ وہ کسی عز و شرف کا مستحق نہیں ہے لیکن علم کی بدولت وہ ترقی کی ہر منزل پر پہونچ سکتا ہے۔

اقرأ باسم ربك الذی خلق	اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے پیدا
خلق الانسان من علق اقرأ	کیا، انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا
وربك الاكرم الذی علم	کیا، آپ پڑھیے آپ کا رب نہایت کریم ہے
بالقلم علم الانسان مالم يعلم	جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا انسان
(علق - ۱)	کو وہ سکھایا جو جانتا نہ تھا،

اسی طرح انسان (آدم) کی پیدائش کے فوراً بعد فرشتوں سے امتحانی مقابلہ کے ذریعہ یہ حقیقت بتائی گئی کہ حکومت و قیادت محض علم کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ فرشتوں نے ان الفاظ میں اس کا اعتراف کیا،

---

[۵] A. W. Haslet unsolved Problems. P. 195

از مولانا عبدالباری "مذہب و سائنس"

سبحنک لا علم لنا الا ما	آپ کی ذات پاک ہے، ہمارے پاس
علمتنا انک انت العلیم	وہی علم ہے جو آپ نے دیا ہے، بیشک
الحکیم (بقرہ : ۲)	آپ علم والے اور حکمت والے ہیں۔

طالوت کے واقعہ میں یہ واضح کر دیا گیا کہ حکومت و قیادت کی اہلیت مال و دولت اور خاندان و نسلی مذہب سے نہیں، بلکہ علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت سے حاصل ہوتی ہے، قرآن حکیم میں ہے:

وقال لھم نبیھم ان اللہ قد	ان کے نبیؑ نے کہا اللہ نے تمھارے لیے
بعث لکم طالوت ملکا قالوا	طالوت کو حکمراں مقرر کیا ہے، انھوں نے
انی یکون لہ الملک علینا	کہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کو ہم پر
ونحن احق بالملک منہ ولم	حکمرانی مل جائے، حالانکہ اس سے زیادہ
یؤت سعۃ من المال قال ان	حکمراں ہونے کے ہم حقدار ہیں، نیز یہ کہ
اللہ اصطفٰہ علیکم وزادہ	اس کو مال و دولت کی وسعت نہیں
بسطۃ فی العلم والجسم	حاصل نہیں ہے، نبی نے یہ سنکر کہا اللہ نے
(بقرہ : ۳۲)	طالوت کو تم پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے
	اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں
	میں اسے وسعت دی ہے۔

ہر دور میں قوت و طاقت کیلئے علم کا جو معیار ہو اس کی مطابقت ضروری ہے

بات صرف علم پر نہیں ختم ہوتی، بلکہ ہر دور کے لحاظ سے قوت و طاقت کے لیے علم کا جو معیار ہے، اس کے مطابق علم حاصل کرنا ضروری ہے، مثلاً یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے، اس میں حکومت و قیادت کے لیے

"پیمانہ" موجودہ معیار کے مطابق ہونا چاہیے،

قرآن حکیم میں لفظ "قوت" اور "الحدید" کا جس انداز سے تذکرہ ہے، اس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ قوت و طاقت کے سامان اور افادی صلاحیتوں میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا، جس کا ساتھ دیے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی،

واعدوا لهم ما استطعتم	حسب استطاعت قوت و طاقت کے
من قوة (انفال - ۷)	سامان پیدا کرکے تیار رہو،

دوسری جگہ ہے:

وانزلنا الحديد فيه باس شديد	اور ہم نے لوہا اتارا (نکالا) جس میں سخت
ومنافع للناس (حدید - ۳)	سزا اور لوگوں کے لیے کثیر منافع ہیں۔

احادیث سے دونوں قسم کی تعلیم کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انداز سے علم کی طرف توجہ دلائی مثلاً

بعثت معلما[1]	میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں

قلم (ذریعۂ علم) کے بارے میں فرمایا

ان اول ما خلق الله القلم[2]	اللہ نے پہلے قلم کو پیدا کیا،

علم کا خاصہ ترقی و سربلندی بیان کیا،

ان الحكمة تزيد الشريف شرفا	بیشک حکمت شریف کی شرافت میں اضافہ
وترفع المملوك حتى تجلسه	کرتی اور پست لوگوں کو ترقی دیکر بادشاہ
مجالس الملوك[3]	کی مجلسوں میں بٹھاتی ہے۔

---

[1] ابن عبد البر: جامع بیان العلم ج ۱ و مشکوٰۃ کتاب العلم الفصل الثالث [2] مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر الفصل الثالث
[3] جامع بیان العلم ج ۱ باب لاحسد الا فی اثنتین

علم کو قوموں کی قیادت اور ان کے نقش قدم کی اتباع کا سبب قرار دیا،

السلاح علی الاعداء و	علم دشمن کے مقابلہ کے لیے ہتھیار اور
الذین عند الاخلاء یرفع	دوست کے لیے زینت ہے، اللہ اسکے
اللہ بہ اقواما فیجعلھم فی	ذریعہ قوموں کا درجہ بلند کرتا اور انکو
الخیر قادۃ وائمۃ تقتنص	قائد و پیشوا بناتا ہے، جن کے نقش قدم
آثارھم ویقتدی بافعالھم	اور کام کی اتباع کی جاتی، نیز انکی
وینتھی الی رأیھم[1]	رائے آخری تسلیم کیجاتی ہے۔

علم کا دائرہ نہایت وسیع کیا اور کسی ایک (دینی یا دنیوی) دائرہ میں اس کو محدود نہیں رکھا،

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ الحکیم	حکمت و دانائی کی بات حکیم کی گمشدہ پونجی ہے
فحیث وجدھا فھو احق بھا[2]	جہاں بھی وہ ملے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مفید علم حاصل کرنے کیلیے دور دراز سفر کی تاکید کی اور اس راہ میں کسی قسم کا تعصب گوارا نہ کیا، (رسول اللہ نے ہر مفید علم کے لیے دور دراز سفر کرنے کی تاکید کی)

اطلبوا العلم ولو بالصین[3]	علم حاصل کرو اگرچہ چین میں ملے،

اس حدیث کو سند کے لحاظ سے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے[4]، لیکن اس کا مفہوم خلاف قیاس نہیں ہے، کیونکہ عرب اور چین کے درمیان بعد المشرقین ہے، مگر عرب کی بندرگاہوں میں چینی جہازوں کی آمد و رفت رہتی تھی، اور بعض شہروں

---

[1] ابن عبدالبر: جامع بیان العلم باب جامع فی فضل العلم [2] ترمذی ابن ماجہ و مشکوٰۃ کتاب العلم [3] ابن عبد البر: جامع العلم باب طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم [4] بیہقی: مدخل

میں چینی مال فروخت ہوتا تھا، مسعودی نے لکھا ہے:

ان مراکب الصین کانت تاتی	چینی جہاز عمان، سیراف، فارس
بلاد عمان وسیراف وساحل	اور بحرین کے شہروں اور بندرگاہوں
فارس وساحل البحرین الخ[1]	میں آتے تھے،

دبا (عمان میں) کے بارے میں ابن حبیب نے لکھا ہے،

ثم سوق دبا وھی فرضۃ العرب	"دبا" ایک بندرگاہ تھی، رجب کے
یاتیھا تجار السند والھند والصین	آخری دن وہاں بڑا بازار لگتا تھا
واھل المشرق والمغرب	جس میں سندھ، ہندوستان،
فیقوم سوقھا آخر یوم من	چین اور مشرق و مغرب کے تاجر
رجب[2]	آتے تھے،

رسول اللہؐ نے اپنے زمانہ کے اہم ترین نئے اسلحے استعمال کیے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اہم ترین آلاتِ حرب یہ تھے: دبابہ، یہ خاص قسم کی گاڑی تھی، جو تیر سے حفاظت کے لیے موٹا چمڑا منڈھ کر بنائی جاتی اور قلعہ شکنی کے لیے استعمال کی جاتی تھی،[3]

ضبر۔ لکڑی پر کھال منڈھ کر چھتری کی طرح بنائی جاتی جس کے ذریعہ پیٹھ کی تیر سے حفاظت ہوتی تھی،[4]

منجنیق۔ یہ جنگی ہتھیار تھا جس کے ذریعہ وزنی پتھر دشمنوں پر برسائے جاتے تھے،[5]

حسک یہ ایک خاردار گھاس (گوکھرو) کی شکل کا ہتھیار جس کو قلعہ اور لشکر

---

[1] مسعودی: مروج الذہب ومعادن الجوہر الباب الخامس عشر ذکر ملوک الصین والترک و تفرق ص ۳۰۸
[2] ابن حبیب المحبر اسواق العرب المشہورۃ فی الجاہلیۃ وما یعتمم فیہا [3] ابوالقاسم عبدالرحمٰن السہیلی الروض الانف شرح سیرۃ النبویہ لابن ہشام فصل ذکر قتلہ اہل الطائف [4] ایضاً [5] لسان العرب

کے چاروں طرف پھیر کر راستہ کو مسدود کیا جاتا تھا[1]

منجنیق سب سے پہلے اللہ کے رسول نے چلائی اور حسک آپنے پھیری	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بر آمد کر کے غزوہ طائف میں استعمال فرمایا[2] بلکہ منجنیق سب سے پہلے خود آپ نے چلائی

اور حسک آپ نے پھیری، ابن ہشام کا بیان ہے

حدثنی من اثق بہ ان رسول اللہ	جس شخص پر میں اعتماد کرتا ہوں اس نے
اول من رمی فی الاسلام	یہ مجھ سے بیان کیا کہ اسلام میں سب سے
بالمنجنیق رمی اھل الطائف[3]	پہلے طائف والوں پر رسول اللہ نے منجنیق چلائی،

مقریزی کہتے ہیں:

ونصب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کے
المنجنیق علی حصن الطائف[4]	قلعہ پر منجنیق نصب کی،

دوسری جگہ ہے

ونثر رسول اللہ الحسک حول الحصن[5]	رسول اللہ نے قلعہ کے گرد حسک پھیری

جس منجنیق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال کیا تھا، اس کے بارے میں مختلف قول ہیں، بعض کے نزدیک وہ باہر سے منگایا گیا تھا اور بعض کے نزدیک حضرت سلمان فارسیؓ نے اس کو بنایا تھا[6]

طائف فتح ہونے کے بعد ۹ھ میں عروہ بن مسعود ثقفی اور غیلان بن سلمہ ثقفی نے اسلام قبول کیا، اور جرش جاکر مذکورہ ایجادات میں مہارت حاصل کی تھی،

---

[1] القاموس المحیط [2] تقی الدین احمد بن علی مقریزی: امتاع الاسماع حصن الطائف [3] ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ ذکر غزوۃ الطائف [4] امتاع الاسماع حصن الطائف [5] ایضاً ص ۱۸۳ [6] ایضاً

لم یشهد حنینا ولا حصار	عروہ بن مسعود ثقفی اور غیلان بن سلمہ ثقفی
الطائف عروۃ بن مسعود	حنین اور طائف کے محاصرہ میں موجود
ولا غیلان بن سلمة کانا	نہ تھے، یہ دبابہ منجنیق اور ضبر کی صنعت
بجرش یتعلمان صنعة	سیکھنے جرش گئے تھے،
الدبابات والمجانیق والضبور[1]	

جرش میں ہتھیار سازی کا کارخانہ تھا جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتح ہوا

"جرش" دمشق کے مضافات میں ایک شہر تھا، جو اُس وقت کی دوسری بڑی طاقت روم کے قبضہ میں تھا. اس میں ہتھیاروں کا بڑا کارخانہ تھا، شرجیل بن حسنہ نے حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں اس کو فتح کیا تھا،

وکانت اذ ذالک فی ید الروم	اس وقت "روم" کے قبضہ میں تھا، حضرت
وفتحها شرحبیل بن حسنه فی	عمرؓ کے زمانہ میں شرجیل نے اس کو
زمان عمر بن الخطاب[2]	فتح کیا تھا،

رسول اللہؐ نے ہتھیار سازی کے علم میں بھی ترقی کرتے رہنے کیطرف توجہ دلائی

جرش فتح ہونے کے بعد ہتھیار سازی کا کارخانہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا تو انھوں نے اس کو اور ترقی دی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مختلف انداز میں فنون حرب سیکھنے کی ترغیب دلاتے تھے، ایک موقع پر فرمایا:

من علم الرمی ثم ترکه	جس نے تیراندازی سیکھی، پھر اس نے
فلیس منا[3]	چھوڑ دیا، وہ ہم میں سے نہیں

---

[1] ابن ہشام السیرۃ النبویۃ ج ۳ ذکر غزوۃ الطائف بعد حنین فی سنۃ ثمان والروض الانف فصل ذکر تعلم اہل الطائف. [2] ... [3] مسلم ومشکوٰۃ باب اعداد آلۃ الجہاد [4] امتاع الاسماع نزل رسول اللہ بالجرح حاشیہ ۳۲۲،

دوسری جگہ ہے

ان اللہ یدخل بالسھم الواحد ثلثۃ نفر الجنۃ صانعہ یحتسب فی صنعتہ الخیر والرامی بہ ومنبلہ[1]	اللہ ایک تیر کے ذریعہ تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرتا ہے، بنانے والا جو طالب ثواب ہو، چلانے والا اور اٹھا کر دینے والا۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ تعلیم کا دائرہ کسی ایک گوشہ میں محدود نہیں ہے، بلکہ ان کی ضرورت کے تمام گوشوں پر حاوی ہے،

شخصیت سازی کی طرف خاص توجہ کرنے کا حکم

تعلیم کے ساتھ شخصیت سازی کی طرف بھی خاص توجہ کرنے کا حکم ہے، جس کے مخاطب اصلاً والدین و اساتذہ ہیں، مغربی تہذیب میں اس کے لیے کوئی معیار مقرر نہیں ہے، لیکن تشکیل جدید میں "معیار" اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، یہ صفات جس طرح جمالی ہیں، اسی طرح جلالی اور کمالی بھی ہیں، ان کے عکس سے جو صفات نمودار ہوتی ہیں، ان کی تفصیل اوپر گذر چکی، ایک متوازن شخصیت کے لیے تناسب کے ساتھ ان سب کی نمود ضروری ہے، فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے تو ان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے، لیکن بالقصد کسی پہلو پر زیادہ زور دینے اور کسی کو بالکلیہ نظر انداز کرنے کی گنجایش نہیں ہے،

اس میں مشرق و مغرب دونوں ناکام ہیں

شخصیت سازی میں مشرق و مغرب دونوں ناکام ہیں، مغرب کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد صرف

---

[1] ترمذی و ابن ماجہ و مشکوٰۃ باب اعداد آلۃ الجہاد

دنیوی مفاد ہے، اس بنا پران ہی صفات کو نمایاں حیثیت دی گئی جن سے یہ مفاد وابستہ تھا، لیکن مشرق اپنے بلند دعووں کے باوجود چند اخلاقیات کی اصلاح سے آگے نہ بڑھ سکا،

تشکیل جدید میں متوازن شخصیت کا نمونہ اللہ کا رسولؐ ہے

تشکیل جدید میں متوازن شخصیت کا نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے،

لقد کان لکم فی رسول اللہ	بیشک اللہ کے رسولؐ میں تمہارے لیے
اسوۃ حسنۃ (احزاب-۳)	عمدہ نمونہ ہے۔

دوسری جگہ ہے

لیکون الرسول شہیدا علیکم	تاکہ رسول تمہارے لیے (عملی) گواہ (نمونہ)
وتکونوا شہداء علی الناس (حج-۱۰)	ہو اور تم لوگوں کے لیے گواہ ہو۔

ایک اور جگہ ہے:

وکذالک جعلناکم امۃ و	اسی طرح ہم نے تم کو نہایت معتدل
وسطا لتکونوا شہداء علی	امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے لیے گواہ
الناس ویکون الرسول	ہو اور رسولؐ تمہارے لیے گواہ
علیکم شہیدا (بقرہ-۱۷)	ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ جس قدر جامع صفات اور تمام گوشوں پر حاوی تھی وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے،

شخصیت سازی کا نمونہ صحابہ کرامؓ کی زندگی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شخصیت سازی کا نمونہ صحابۂ کرام کی زندگی ہے، جنھوں نے ہر میدان میں وہ کارہائے نمایاں

انجام دیے جس کی نظیر دنیا ابتک نہیں پیش کر سکی، اگر ان کی جدوجہد کسی ایک گوشہ میں محدود رہتی تو اسلامی تہذیب وجود ہی میں نہ آتی، اور اگر اس کی ترقی کا سلسلہ نہ جاری رہتا تو یہ تہذیب اتنے دنوں باقی نہیں رہ سکتی تھی۔

صحابہؓ کی شخصیت سازی کے لیے مسجد نبوی سے متصل صفہ نام کی ایک درسگاہ قائم تھی، جس کی جولانیاں نظم وضبط کے ساتھ اس وقت کی زندگی کے ہر گوشہ تک وسیع تھیں، اہل صفہ جن سے ایک خاص قسم کی زندگی پر استدلال کیا جاتا ہے، وہ بھی کسب معاش، تعلیم اور دیگر شہری ذمہ داریوں کی انجام دہی کے ساتھ فوجی مہمات میں رضاکارانہ شریک ہوتے تھے، اہل صفہ کے چند نام یہ ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، حذیفہ بن یمانؓ، عبداللہ بن عمرؓ، سلمان فارسیؓ، ابو درداءؓ، ابوہریرہؓ، سالمؓ، ابوذر غفاریؓ، حنظلہؓ، بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ وغیرہ[1]، ان لوگوں کے کارناموں سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی شخصیت سازی کس قسم کی کی تھی،

شخصیت سازی کیلیے بنیادی اصول قرآن حکیم سے شخصیت سازی کے حسب ذیل بنیادی اصول مستنبط ہوتے ہیں:-

(۱) معرفت (۲) افادیت (۳) امانت (۴) رعایت (۵) عدالت، (۶) عملیت

اس کی تشریح یہ ہے:-

معرفت (۱) معرفت یہ ہے کہ زندگی میں خود شناسی وخدا شناسی کے جوہر نمودار ہوں، جس سے ایک طرف عزت نفس، وسعت نظر، شجاعت، قناعت و استغنا، وغیرہ صفات

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۱ و ۲، مسند ابن حنبل ج ۱ وغیرہ۔

پیدا ہوں اور دوسری طرف انکساری، امید، خوف، توکل، ضبط وتحمل وغیرہ صفات ظاہر ہوں
قرآن حکیم میں ہے:۔

و فی انفسکم افلا تبصرون (ذاریات: ۱)	اور اپنے نفسوں میں کیا تم نہیں غور کرتے۔

دوسری جگہ ہے:

ذٰلک بان اللہ لم یک مغیراً	بے شک اللہ اس حالت کو کبھی نہیں بدلتا
نعمۃ انعمھا علی قوم حتی یغیروا	جو کسی قوم کو حاصل ہوتی ہے، جب تک
ما بانفسھم (انفال: ۷)	وہ خود ان چیزوں کو نہ بدلے جو اسکی ذات
	کے ساتھ وابستہ ہیں۔

خداشناسی سے بغیر صحیح معنوں میں خودشناسی نہیں پیدا ہوسکتی۔

ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ	ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنھوں نے اللہ
فانسٰھم انفسھم (حشر: ۳)	کو بھلا دیا پھر اللہ نے انکو اپنی ذات سے بھلا دیا۔

افادیت (۲) افادیت یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی فطری صلاحیت کے لحاظ سے مفید بنایا جائے
اس کے لیے مادی و اخلاقی اور روحانی وجسمانی دونوں قسم کی صلاحیتوں سے آراستہ ہونا ضروری ہے
قرآن حکیم میں ہے:

انزل من السماء ماءً فسالت	اللہ نے آسمان سے پانی برسایا جس سے نالے
اودیۃ بقدرھا فاحتمل	ندیاں اپنی مقدار کے مطابق بہنے لگیں۔
السیل زبداً رابیا و مما	اور سیلاب کی رو نے اوپر اوپر جھاگ
یوقدون علیہ فی النار	پیدا کردی، ایسی جھاگ اس وقت بھی
ابتغاء حلیۃ او متاع زبد مثلہ	پیدا ہوتی ہے جبکہ زیور اور دوسری

کذٰلک یضرب اللہ الحق والباطل فاما الزبد فیذہب جفاء و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (رعد : ۴)	چیزیں بنانے کے لیے دھاتوں کو آگ میں پگھلاتے ہیں، اللہ حق و باطل کی ایسی ہی مثال دیتا ہے، دیکھو جھاگ تو نا چیز اڑ ناکارہ ہوکر معدوم ہو جاتی ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے نفع بخش اور کارآمد ہے وہ باقی رہتی ہے۔

پانی، سونا، چاندی اور دوسری دھاتیں چونکہ نافع ہیں اس لیے باقی رہتی ہیں اور اوپر کی جھاگ چونکہ غیر نافع ہے، اس لیے ختم ہوجاتی ہے، اس سے یہ اصول نکلتا ہے کہ دنیا میں بحیثیت مجموعی جو نافع ہو اس کو بقاء و پائداری حاصل ہوتی اور جو غیر نافع ہو وہ بتدریج ختم ہوجاتی ہے،

مسلم معاشرہ میں نافعیت کچھ اخلاق کی اصلاح میں محدود کرکے مادی طاقت دنیا والوں کے حوالہ کردی گئی، جس کا نتیجہ ہر جگہ ذلت و پسپائی میں نکلا، بالفرض اگر یہ اخلاق درست بھی ہو جائیں تب بھی مادی طاقت کے بغیر ترقی و سربلندی نہیں حاصل ہو سکتی،

اس غلط روی کے دو سبب ہیں :۔

(۱) مذہب کے غلط تصور نے یہ خیال پیدا کر دیا کہ صرف مذہبی مراسم و اعمال کی پابندی سے وہ سب کچھ مل جائے گا جس کو دنیا والے انتھک جد و جہد اور محنت سے حاصل کرتے ہیں جو قانون عدل کے خلاف ہے،

(۲) معجزات و کرامت سے یہ سمجھ لیا گیا کہ جس طرح مادی سبب کے بغیر ان کا

ظہور ہو گیا تھا، اسی طرح مادی طاقت کے بغیر قومی ترقی و سربلندی حاصل بھی ہو جائے گی، حالانکہ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے، بلاشبہ آگ کی خاصیت جلانا ہے، جو شخص اس میں ہاتھ ڈالے گا، وہ لازمی طور سے جل جائے گا، اگر ابراہیم علیہ السلام کے حق میں آگ گلزار بن گئی تو یہ معجزہ ہے، جس کا عام قانون سے کوئی تعلق نہیں، دنیا کا نظام عام قانون کے تحت چلتا ہے، نہ کہ معجزہ و کرامت کے تحت،

امانت (۳) امانت، یہ تصور ابھارا جائے کہ زندگی کی بنیاد امانت پر قائم ہے، اور دنیا میں انسان کی حیثیت "امین" کی ہے، جس کو ہر کام اور ہر بات کی اصل مالک کے سامنے جوابدہی کرنی ہے، قرآن حکیم میں ہے:

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا	بیشک اللہ تمھیں اس بات کا حکم دیتا ہے
الامانات الی اھلھا (نساء۔ ۸)	کہ امانتوں کو انکے اہل تک پہنچاؤ،

آیت میں امانت کا مفہوم عام ہے، جو ہر قسم کی ذمہ داری کو شامل ہے، خواہ اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کو ایمان کا مدار و موقوف علیہ قرار دیا ہے:

لا ایمان لمن لا امانۃ لہ[1]	جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں،

دوسری حدیث میں ہے

اول ما تفقدون من دینکم	تم اپنے دین سے جس چیز کو سب سے پہلے گم کروگے
الامانۃ وآخر ما تفقدون الصلوٰۃ	وہ امانت ہے اور آخر میں جس کو گم کروگے وہ
وسیصلی قوم لا دین لھم[2]	نماز ہے، کچھ لوگ نماز پڑھتے رہیں گے لیکن دین

---

[1] بیہقی: شعب الایمان، مشکوٰۃ کتاب الایمان الفصل الثانی [2] بیہقی ج ۶ ص ۲۸۹

رعایت (۴) رعایت یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اور دوسروں کی ذمہ داری محسوس کرے اور جس کو جس وقت اخلاقی و مادی جس قسم کے تعاون کی ضرورت ہو اس کو اپنا فرض جانے، چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

یاایھا الذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا	اے ایمان والو اپنی جان کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

دوسری جگہ اللہ نے خلق خدا کی ضرورت پوری کرنے کو اپنے لیے قرض حسنہ دینے سے تعبیر کیا،

من ذالذی یقرض اللہ قرضاً حسنا (البقرہ۔۳۲)	کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا کلکم راع ومسئول عن رعیتہ (بخاری کتاب الاستقراض)	غور سے سن لو، ہر شخص تم میں کا راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں بازپرس ہوگی۔

"رعی" کے معنی

حفظ الغیر لمصلحتہ (بیضاوی)	دوسرے کی حفاظت اس کی مصلحت کے مطابق کرنا

اس لحاظ سے راعی

کل من ولی امر قوم (المنجد)	ہر وہ شخص ہے جو کسی کا منتظم و نگراں ہو

دوسری جگہ

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق	مخلوق اللہ کی عیال ہے، اللہ کے نزدیک

الی اللّٰہ من احسن الی عیالہ — زیادہ پسندیدہ وہ شخص ہے جو اسکے
(مشکوٰۃ باب فی الشفقۃ علی الخلق) — عیال کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

مذکورہ "رعایت" خاص جذبہ کے تحت ہونی چاہیے۔ جیسا کہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے ایک مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت کی ہے۔

"فرض کرو ایک بحری جہاز ہے جس کے اوپر نیچے لوگ بیٹھے ہیں، اور سب کی ضرورت کا سامان (پانی وغیرہ) جہاز کے بالائی منزل پر رکھا ہے۔ نچلے حصہ کے لوگ پانی کے لیے اوپر آتے رہتے ہیں، اگر اوپر والے جذبۂ اشتراک کے تحت پانی دیدیتے ہیں تو سب کا کام اطمینان سے چلتا رہتا ہے، کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں پیش آتا، لیکن اگر یہ لوگ اس بنا پر پانی دینے سے انکار کرتے ہیں کہ ان کے آنے سے معمولی تکلیف ہوتی ہے تو وہ پانی کی فراہمی کے لیے دوسری تدبیر کرنے پر مجبور ہوں گے، بالآخر ایسی حالت میں انھوں نے یہ سوچا کہ چھوٹا سوراخ کرکے سمندر سے پانی حاصل کیا جائے، چنانچہ وہ سوراخ کرنے لگے۔ اب اگر اوپر والے نہ اس سے روکیں اور نہ پانی کا بندوبست کریں تو ظاہر ہے کہ جہاز ڈوب جائے گا، پھر نہ سوراخ کرنے والے بچیں گے اور نہ اس سے چشم پوشی وغفلت کرنے والے۔"[1]

حدیث میں زندگی کو سمندری جہاز پر سواری کے ساتھ تشبیہ دینا اس کی ضروریات کو پانی جیسی اہم چیز کے ذریعہ بیان کرنا، تکلیف کے باوجود تعاون واشتراک کے جذبہ کو نظر انداز نہ ہونے دینا اور خلاف ورزی کی صورت میں جہاز میں سوراخ ہونا، (اگرچہ یہ سوراخ اہم ضروریات کے لیے کیا گیا ہو) اور اس کے نتیجہ میں جہاز ڈوب جانا یہ ساری باتیں زندگی کی نفسیات اور اس کی ذمہ داریوں کو سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

---

[1] بخاری و مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف

عدالت (۵) عدالت یہ ہے کہ زندگی کے تمام گوشوں میں عدل و توازن پیدا کیا جائے تاکہ افراط و تفریط سے بچ کر ہر شئی اعتدال کے ساتھ اپنے محل و حدود کے اندر رہے، عدالت کی تفصیل اوپر گذر چکی،

قرآن حکیم نے غلو پسندی کی ممانعت، زندگی میں عدل و اعتدال پیدا کرنے کے لئے کی ہے،

یاھل الکتب لاتغلوا فی دینکم ولاتقولوا علی اللہ الا الحق (نساء۔ ۲۳)	اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو (حقیقت و اعتدال سے گزر نہ جاؤ) اور اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا اور کچھ نہ کہو۔

دوسری جگہ ہے:

قل یاھل الکتب لاتغلوا فی دینکم غیر الحق ولاتتبعوا اھواء قوم قد ضلوا من قبل واضلوا کثیراً وضلوا عن سواء السبیل (مائدہ۔ ۱۰)	آپ کہہ دیجئے اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اس گروہ کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے گمراہ ہو چکا ہے، اور سیدھے راستہ سے وہ بھٹک گیا ہے،

عدل و اعتدال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لاتشددوا علی انفسکم فیشدد اللہ علیکم فان قوماً شددوا علی انفسھم فشدد اللہ علیھم فتلک بقایاھم فی الصوامع والدیار	تم اپنے اوپر سختی نہ کرو ورنہ اللہ تمھارے اوپر سختی کریگا کیونکہ پہلے جس قوم نے اپنے اوپر سختی کی اللہ نے بھی اس پر سختی کی، یہ عیسائیوں اور یہودیوں کے عبادت خانوں میں ان ہی کے بقایا لوگ (انھی کے مذہبی پیشوا) ہیں

ایک مرتبہ تین صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر اس غرض سے حاضر ہوئے کہ آپ کی گھریلو عبادت کا پتہ لگائیں، جب انھیں بتایا گیا تو ان کی نظر میں وہ عبادت زیادہ معلوم ہوئی، لیکن یہ سوچ کر اطمینان کر لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو بخشے بخشائے ہیں، اور ہم گنہگار ہیں، ہمارا آپ کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے؟ اسی وقت ایک نے عہد کیا کہ وہ ہمیشہ شب بیداری کرتا رہے گا، دوسرے نے کہا کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھے گا، تیسرے نے کہا کہ وہ شادی نہیں کرے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب باہر سے تشریف لائے اور اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو آپ نے ان تینوں کو بلا کر سختی کے ساتھ اعتدال کی زندگی گذارنے کا حکم دیا اور فرمایا:-

اما واللہ انی لاخشاکم للہ و اتقاکم لہ لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی (ابوداؤد و مشکوٰۃ کتاب الاعتصام بالکتاب السنۃ الفصل الاول بخاری و مسلم)

یاد رکھو، خدا کی قسم میرے اندر تم سے زیادہ تقویٰ اور خدا کا خوف ہے، لیکن میں کبھی روزہ رکھتا اور کبھی افطار کرتا ہوں، کبھی نماز پڑھتا اور کبھی سوتا ہوں اور عورتوں سے شادی کرتا ہوں، جو شخص میری سنت سے اعراض کریگا وہ مجھ (میری جماعت) سے نہیں ہے،

عملیت (۶) عملیت یہ ہے کہ انسان کی زندگی سرتاپا عمل بنجائے، یعنی خوش فہمی و خود فریبی کی دنیا سے نکل کر کارکردگی کی صلاحیت کو مرکزی حیثیت دیجائے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ (التوبہ - ۱۳)

آپ کہہ دیجئے تم کام کرو اللہ اور اس کا رسول تمھارا کام دیکھے گا۔

دوسری جگہ ہے

وان لیس للانسان الا ما سعی (النجم - ۳)	انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

ایک اور جگہ ہے:-

نوفّ الیھم اعمالھم فیھا (ہود-۲)	دنیا میں کام کا بدلہ ہم پورا پورا دیتے ہیں،

حسب ذیل حدیث سے کارکردگی کی صلاحیت اور اس کی وقعت کا اندازہ ہوتا ہے:

تین شخص کام کرنے والے ہیں، ایک نے صبح سے دوپہر تک کام کیا، دوسرے نے دوپہر سے عصر تک اور تیسرے نے عصر سے مغرب تک، پہلے دونوں کو ایک ایک قیراط اجرت ملی اور تیسرے کو دو قیراط ملے، پھر فرمایا کہ پہلے دو یہود و نصاریٰ ہیں اور آخری شخص یہ امت ہے (اس میں دونوں کے مقابلہ میں کارکردگی کی صلاحیت اتنی زیادہ ہے کہ) کم وقت میں کام کرکے دوگنی اجرت وصول کی۔[1]

اس صلاحیت کی بدولت بدعملیوں کی سزا کا التوا	کارکردگی کی صلاحیت کا اثر یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی بدولت بدعملیوں کی سزا ملتوی کردی جاتی ہے،

کیونکہ فوری سزا دینے سے نظام عالم میں خلل واقع ہوتا ہے، اور کائنات کی ترقی متاثر ہوتی ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں:-

ان الحق لایدع عاصیا الا ویجازیہ فی الدنیا مع رعایۃ ذٰلک النظام[2]	بیشک حق کسی گنہگار کو اس دنیا میں سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا (البتہ سزا میں دنیوی نظام کی رعایت ضروری ہوتی ہے)

---

[1] مشکوٰۃ باب ثواب ہٰذہ الامۃ [2] ولی اللہ حجۃ اللہ البالغۃ باب الجزاء علی الاعمال فی الدنیا۔

اس کے بعد کہتے ہیں

وربما کان حکم النظام اوجب	بسا اوقات "نظام" کا حکم اعمال کے حکم
من حکم الاعمال فیستدرج	سے زیادہ تاکیدی ہوتا ہے، اس
بالفاجر ویضیق علی الصالح	بنا پر فاجر کو ڈھیل دیجاتی اور
فی الظاہر ویصرف التضییق	صالح پر تنگی کی جاتی ہے۔ یہ تنگی
الی کسر بھیمتہ[1]	اس کی شہوانی قوت کے توڑنے میں

کام آتی ہے،

ہماری نظر صرف ایک پہلو کو دیکھتی ہے اور "قدرت" مجموعی حیثیت کو دیکھتی ہے

ترقی یافتہ ممالک میں لوگوں کو اگر بدعملیوں کی سزا نہیں مل رہی تو اس کی وجہ صرف کارکردگی کی قابلیت اور کائناتی تصرفات میں ترقی ہے، ایسا نہیں ہے کہ اس دور میں برائیوں کے خواص بدل گئے یا وہ بھلائیوں میں تبدیل ہوگئی ہیں، ہماری نظر صرف ایک پہلو پر ہوتی ہے، اور قدرت مجموعی حیثیت کو دیکھتی ہے، اگر ہم بھی تمام پہلوؤں کو دیکھنے لگیں تو قدرت کے کسی فیصلہ میں شکوک وشبہات نہ پیدا ہوں،

(باقی)

---

[1] ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ باب الجزاء علی الاعمال فی الدنیا

معارف کے پرانے پرچے

ماہنامہ معارف علم وادب کا ایک خزانہ ہے، ہر مہینہ اسکے کچھ پرچے بچ بھی جاتے ہیں جنکا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، لیکن وہ مسلسل نہیں ہیں، اسکے مستقل خریداروں اور عام شائقین کو جن پرچوں کی ضرورت ہو وہ خط وکتابت کے ذریعہ معلوم کرکے انکو طلب کرسکتے ہیں، ہدیہ فی پرچہ ۵۰ پیسے اور اگر کسی سال کے اتفاق سے مسلسل ہوں گے تو کل کا محض آٹھ روپے۔

منیجر

سیاست میں اسلام

مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے رفیق دار المصنفین

(۶)

سعودی عرب

۱۹۶۹ء تک سعودی عرب کے بارے میں مغربی خیالات میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہی، اور اخبارات اس عنوان پر خصوصی مقالے شائع کرتے رہے کہ عرب کی قدامت پرست سوسائٹی کو کس طرح تجدد کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، وہاں کا قانون عدل و انصاف تیل کی آمدنی کا فیاضانہ خرچ، اور ملک کی اسی قسم کی اور کئی خصوصیات ایک عرصہ تک اخبار کا موضوع سخن بنی رہیں، لیکن ۱۹۶۴ء میں جب شاہ فیصل نے اپنے نااہل بڑے بھائی کو ہٹا کر عنانِ حکومت خود سنبھالی، تو ان کی پالیسیاں ان کے ملک اور سعودی خاندان میں بڑی دلچسپی کا باعث بن گئیں، اب اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ یہ ملک پھر پرانی اقدار کی طرف لوٹے، اور شاہ سعود کے مضرت رساں اور مضحکہ خیز دورِ حکومت کے بعد فیصل نے بین الاقوامی افق پر سعودی عرب کے لیے جو راہ متعین کی ہے، اس سے واپس جا سکے، یہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ تغیرات ایک ایسے بادشاہ نے کیے ہیں، جو اپنی شخصی زندگی میں بہت ہی غور و فکر کرنے والا، ضمیر سے رہبری لینے والا اور خود ستائی سے دور رہنے والا ہے، انھوں نے سعودی عرب کے لیے جو نئی راہ متعین کی ہے، اسکا سبب

نمایاں پہلو اسلامی ممالک کے اتحاد کی کوشش ہے، کیونکہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ بین الاقوامی معاملات میں سعودی حکومت زیادہ دنوں تک منفی کردار کی حامل نہیں رہ سکتی۔

اسلامی اتحاد کی پالیسی کے متعلق عام خیال یہ ہو کہ یہ ایک غلط اور بے معنی قدم ہو، کچھ مبصرین کا یہ بھی خیال ہو کہ امریکہ کے اسوقت کے وزیر خارجہ نے شاہ سعود سے ملکر مشرق وسطیٰ کی کارروائیوں اور اقتدار کا مرکز دوسری جگہ ہٹانے کے لیے جو خاکہ مرتب کیا تھا، اسلامی اتحاد کی پالیسی اس کا ایک جز ہے لیکن شاہ فیصل کا خیال یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک میں انقلابی تحریکات سے دفاع کا بہترین ذریعہ یہی پالیسی ہے، اور قاہرہ، دمشق اور بغداد میں ہونے والا ردعمل ان ممالک کی باہمی چشمک کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ شاہ فیصل کسی طاقت کے بھی آلۂ کار نہیں ہیں، اور سعودی عرب کے دوسرے ممالک سے تعلقات قائم رکھنے کے بارے میں ان کا وہی طرز عمل ہے جو پامرسٹن کا تھا، ان کے خیال میں اسلامی اتحاد اس لیے بھی ضروری ہے کہ سعودی عرب کو بیرونی خطرات درپیش ہیں، لیکن ان کا یہ اندازہ غلط ہے، بغداد اور دمشق میں ہونے والے واقعات اور مصر میں بڑھتی ہوئی بے اطمینانی اس بات کا مظہر ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ان تمام حالات میں انقلاب کے علمبردار آپس ہی میں ایک دوسرے سے لڑتے رہنے کے عادی ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اسلامی اتحاد کی پالیسی پر نکتہ چینی کا کوئی معقول جواز نہیں ہے، کچھ مسلمان اس تحریک پر اس لیے نکتہ چینی کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس تحریک کے ذریعہ سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے اسلام کا نام لیا جارہا ہے۔

اگر یہ بات صحیح بھی ہو تب بھی اتنی نقصان دہ نہیں جتنی یہ کوشش کہ اسلام اور کمیونزم کو ہم پلہ قرار دیا جائے، یا قرآن کے معنی پہنا کر سوشلزم کو آگے بڑھایا جائے، بہرحال ان سب

صورتوں میں انسان اور خدا کے درمیان سیاست دخل انداز نظر آتی ہے، اور تجزیہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی اتحاد کی تحریک سے نہ تو کوئی نقصان ہوا نہ فائدہ، بلکہ یہ تحریک ایک غیر ضروری کوشش تھی۔

شاہ فیصل کی خارجہ پالیسی کے دوسرے پہلو بڑی حد تک کامیاب رہے یمن کی خانہ جنگی اور آئے دن مصری فضائیہ کی سعودی علاقوں پر بمباری نے اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیا ہے کہ سعودی عرب کا سب سے مخدوش خطہ مشرقی صوبہ الاحساء ہے، اس لیے یہ ضروری تھا کہ ریاض کی حکومت، ایران، بحرین، قطر اور برطانیہ سے اپنے تعلقات کو بہتر بنائے، چنانچہ سعودی عرب تیل والے ساحلی علاقوں اور خلیج فارس کی سرحد سے متعلق تنازعہ میں ایران سے معاملات طے کرنے میں کامیاب رہا، اس سے ملحق چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے اپنے ترقیاتی فنڈ سے شرکت اور روہام میں مقیم یمن کے امام پر اپنی گرفت مضبوط کرکے سعودی عرب کو مشرقی سرحدوں پر اپنا دفاع مضبوط کرنے میں بھی کامیاب ہوئی ہے، اس سے پہلے ساحلی علاقوں اور زمینی سرحدوں کے بارے میں قطر کے ساتھ پہلے ہی ایک سمجھوتہ ہو چکا تھا، خلیج فارس میں متحدہ دفاعی اقدامات کے بارے میں ایران اور عرب کی بات چیت بھی کم اہم نہیں ہے۔

شاہ فیصل اور شاہ سعود کا خیال تھا کہ خلیج فارس سے متعلق سعودی عرب کے حقوق کو سب سے زیادہ خطرہ صدر ناصر سے درپیش ہے، اس لیے ان کو تیل پیدا کرنے والے علاقوں کے صنعتی مزدوروں پر صدر ناصر کے اثرات کو نظرانداز

نہیں کرنا چاہیے۔[1] پھر بھی یہ اثر اب اتنا نہیں ہے جتنا یمن کی خانہ جنگی سے پہلے یا سوئز کی لڑائی کے بعد تھا۔ ناصر کو جن شکستوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، انکے علاوہ تین اور باتیں اس سلسلہ میں اہم ہیں، اول یہ کہ شاہ فیصل نے سعودی خاندان کے لیے ایک نیا وقار پیدا کیا ہے، دوسرے تیل کے ذخائر میں فلسطینی، شامی اور دوسرے عرب عناصر کو ہٹا کر ان کی جگہ سعودی عرب کے مزدور مقرر کیے گئے ہیں، تیسرے صدر ناصر کے امریکہ کے ساتھ تعلقات نہایت ہی مبہم اور مشکوک ہیں، سعودی عوام کے دعووں سے صدر ناصر کا وقار جاتا رہا ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ صدر ناصر کی بقا اس بات پر منحصر ہے، کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے امریکی تعاون حاصل کرتے رہیں،

یمن کی سرحد پر شاہ فیصل نے ایسی پالیسی اختیار کی ہے، جو مصری سامراجیت کا منہ توڑ جواب ہے۔ اور اس پالیسی میں شاہ فیصل نے نہ تو مرحوم احمد کے نظریہ کو اپنایا ہے، اور نہ ان کے بیٹے کے نظریہ کو، یمن میں ان کی موجودہ پالیسی ویسی ہی ہے جیسی عوبہ الاحساء میں، اس پالیسی کا سعودی خاندان سے تاریخی تعلق ہے، اور اس کو نظرانداز کرکے وہ خطرات میں مبتلا ہو سکتے ہیں، ریاض سے تھوڑے فاصلہ پر پرانے سعودی دارالسلطنت درعیہ (Dareya) کے کھنڈرات ہیں، جو مصری حملہ میں تباہ ہو گیا تھا یہ کھنڈر اس واقعہ کی تلخ یادگار ہے، کہ کس طرح اس پر جابرانہ قبضہ ہوا تھا اور امام عبداللہ بن سعود کو قید اور بعد میں قتل کر دیا گیا تھا، یہ کھنڈر یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ الاحساء کے بنو خالد اور قطر و بحرین کے خلفاء، خالد بن سعود کی طرح دشمنوں سے مل گئے

---

[1] یہ مضمون صدر ناصر کی موت سے بہت پہلے کا ہے۔

تھے، شاہ فیصل کا خیال ہے کہ اسی قسم کے حملہ آور اب یمن کے راستے سے آرہے ہیں، اس لیے ان کی پرانی پالیسی میں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے، پہلے ان کی سیاست اپنے خاندان کی تاریخ کے بجائے فلسطینی عربوں کی زبوں حالی سے وابستہ تھی،

فیصل کے خیال میں فلسطین مغربی عیاریوں کا نتیجہ ہے، اور شاہ فاروق مصر پر حکمرانی کے لیے بالکل نااہل تھے، اور سعودی خاندان کے حکمرانوں میں شاہ فیصل ہی وہ واحد فرد تھے، جو جمال عبدالناصر کی ابھرتی ہوئی طاقت کی تائید کرتے تھے، جب مصر کے نئے حکمراں نے سوویٹ بلاک سے فوجی اور معاشی امداد حاصل کی، اس وقت شاہ فیصل کا جو ولی عہد تھے، ردعمل یہ تھا کہ یہ معاہدہ ایک شیطانی قوت کے ساتھ نہیں ہوا ہے، بلکہ مغرب کی معاندانہ روش نے عربوں کو کمیونسٹوں سے لین دین کرنے پر مجبور کردیا ہے، اس لیے ۱۹۵۶ء میں شاہ سعود اور امام یمن کے درمیان ہونے والے معاہدہ کو شاہ فیصل نے پسند کیا تھا، اور ان کو یہ اعتراض نہیں تھا کہ اس معاہدہ سے یمن کو روسی اسلحہ خریدنے کے لیے رقم حاصل ہوسکے گی، ۱۹۵۶ء کے حادثۂ سویز کے دوران ولی عہد فیصل نے مصر کے ذریعہ سویز کی ناکہ بندی اور بحرین کے تیل کے کارخانوں کو بھیجے جانے والے سعودی خام تیل کو روکنے کی سخت تاکید کی تھی، حالانکہ ان باتوں سے زبردست معاشی نقصان ہونے کا اندیشہ تھا، لیکن یمن میں صدر ناصر کی پالیسی نے شاہ فیصل کو سعودی حکومت کی پرانی تاریخ کو سمجھنے کا موقع دیدیا، وہ سویز کے مشرق میں برطانوی حکومت کی پالیسی سے اتنے ہی نالاں ہیں، جتنا برطانوی پارلیمنٹ کا کوئی قدامت پرست ممبر ہوسکتا ہے، اور انھیں خوف ہے کہ برطانیہ کی آج پالیسی

جنوبی عرب میں خطرہ کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے، شاہ فیصل محسوس کرتے ہیں کہ سعودی عرب کا مستقبل یمن کی جنگ سے وابستہ ہے، وہ عرب کو جمہوریہ بنائے جانے کے مخالف نہیں ہیں، لیکن یہ جمہوریہ ایسی ہونی چاہیے جسے یمنی عوام کی اکثریت کی تائید حاصل ہو، مصری فوج کی قائم کردہ نہ ہو، اس لیے سعودی حکومت کی جانب سے یمن کے لیے حق خود اختیاری کا مطالبہ ہی مصری افواج کو وہاں سے نکالنے کا بہترین ذریعہ ہے

بین الاقوامی سیاست میں کویت نے اپنے وقار کو برقرار رکھنے اور ترقیاتی فنڈ کو دانشمندی سے استعمال کرنے میں متوازن رویہ اختیار کیا ہے، اس سے سعودی عرب کو بھی بہت کچھ سبق لینا چاہیے، شاہ فیصل اور سابق صدر جانسن کی ملاقاتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس خطہ کے ترقیاتی منصوبوں میں سعودی عرب بھی باقاعدہ طور پر شریک ہونے کو تیار ہے، لیکن سیاسی حالات سے قطع نظر سعودی عرب اپنی سوسائٹی کے ڈھانچہ کو نقصان پہنچائے بغیر اندرون ملک ترقیاتی اسکیموں پر تیزی سے عمل پیرا نہیں ہو سکتا، اور اس ترقی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں بھی ہیں، جن پر آسانی سے قابو حاصل نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اپنی آمدنی کا ایک حصہ بین الاقوامی میدان میں بھی صرف کرنا سعودی عرب کے لیے ضروری ہو گیا ہے، اس طریقہ سے سعودی حکومت کے زیادہ مضبوط ہونے کے روشن امکانات ہیں۔

سعودی عرب کے متعلق جن لوگوں کو مکمل معلومات حاصل نہیں ہیں، ان کے بیانات سے بھی اس ملک کو نقصان پہنچتا رہتا ہے، خصوصاً امریکن عربوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں، امریکہ کے ریڈ انڈین کی طرح عرب اپنے ملک کے اصلی باشندے ہیں، وہ سمندر پار کے کسی ملک سے نو آبادیاتی نظام قائم کرنے کی غرض سے اس خطہ میں

نہیں آ گئے تھے، اور نہ یہ چیز کبھی ان کی توجہ کا مرکز رہی کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جائے، عرب کا خطہ ہی ان کی سرزمین ہے، اور ان کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ وہ ہے جس نے ان کی زندگی کو بامقصد بنایا، اور مادہ پرستی کی غلامی سے نجات دلائی، یہ تاریخی واقعہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدایش تھی جنھوں نے عربوں کو نہ صرف ایک نیا طرزِ زندگی دیا، بلکہ زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ایک مذہب بھی دیا، لیکن موجودہ دور میں سیکولر ممالک کے جو لوگ بھی سعودی عرب کا دورہ کرتے ہیں، وہ اس واقعہ کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، مغربی مفکرین اس بات سے نہایت متاثر ہیں، کہ سعودی عرب میں کوئی معاشی بحران نہیں ہے، اس کے باوجود ان کی ترقی کی رفتار بہت سست اور غیر یقینی ہے، اس کے دو خاص اسباب بتائے جاتے ہیں، ایک یہ کہ اسلام کی روح وہاں مردہ ہو چکی ہے، دوسرے حکمراں خاندان جاگیردارانہ ذہنیت کا ہے، اس میں سے پہلا اعتراض بالکل غلط اور دوسرا صرف جزوی طور پر صحیح ہے، شاہ فیصل اس کا تہیہ کیے ہوئے ہیں، کہ اسلام کے دائرہ میں رہ کر وہ اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں گے، وہاں دوسری جنگ عظیم کے بعد سے، جب سے تیل کے ذخائر دولت پیدا کرنے کا ذریعہ بنے، ۱۹۶۲ء تک ملک میں کافی ترقی ہوئی ہے، ۱۹۶۶ء میں سعودی عرب جانے والے ہر شخص کو یہ اعتراف کرنا پڑا، کہ ملک کا معاشی ڈھانچہ آج نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جس کا بیس برس پہلے تصور بھی ناممکن تھا، لیکن سعودی عرب کو اس ترقی کی مادی اور اخلاقی قیمت بہت گراں ادا کرنا پڑی اور وہ تباہ کن موڑ پر پہنچ چکا تھا، اس لیے شاہ فیصل نے یہ طے کیا کہ اپنے بھائی کو تخت سے دستبردار کر کے ملک

کی قومی زندگی کو نئی بنیادوں پر استوار کریں، شاہ عبدالعزیز کے دورِ حکومت میں حکمراں کی نجی زندگی اور ان کی باریک بینی کو دیکھ کر مذہبی رہنماؤں نے یہ محسوس کیا تھا کہ قومی زندگی کی تبدیلی میں وہ بھی شریک ہیں، ملک میں ہونے والے حالات نے وہابی علمار کو پریشانیوں میں بھی ڈالا لیکن انھیں بادشاہ تک رسائی حاصل تھی، جو ان سے مشورے کیا کرتا تھا، اور مذہبی زندگی کے بنیادی پہلوؤں پر ان کا ہم خیال تھا، اس واقعہ نے سعودی عرب کو بلا کسی اندرونی خلفشار کے تجدد کے راستہ پر چلنے میں مدد دی لیکن شاہ سعود کے آخری دور میں ان کی خرابی صحت اور لوگوں کے غلط مشوروں نے وہابی علما، اور سیکولر نظریہ کے حامی لوگوں کے درمیان کا رابطہ منقطع کردیا، اور شاہ سعود ابن عبدالعزیز کے بارہ سالہ دورِ حکومت میں سعودی عرب کو ایک ایسے حکمراں سے سابقہ رہا جو وقت گذرنے کے ساتھ متلون مزاج ہوتا گیا، اور جس کے یہاں صلاح و مشورے کے لیے لوگوں کی رسائی نہیں تھی، اور جو ایک شاہی کونسل کے ذریعہ حکومت کرتا تھا، اور جس کا علمار سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور ان کے مشوروں کی کوئی شنوائی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے ہر قسم کی تبدیلی کی مخالفت کرنے کا وہابی رویہ پھر زور پکڑ گیا، اسی کے ساتھ اس زمانہ میں تعمیری اور ترقی کے کاموں کے لیے دولت کی فراوانی تھی، اس لیے رشوت ستانی اور ناجائز ذریعۂ آمدنی کی وبا عام ہوگئی، اس میں پرمٹ دینے والے بڑے بڑے سرکاری افسر ملوث تھے، اس معاملہ میں سعودی اور غیر سعودی باشندوں دونوں کا حال یکساں تھا، ان کی کوشش یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ دولت کمائی جائے،

وہابیوں کی تنگ نظری نے عوام کی اخلاقی گراوٹ کو جنم دیا جس سے قول و فعل

لے تضاد کی فضا عام ہوگئی، شاہ سعود نے قومی احساس پیدا کرنے کو یکسر نظر انداز کردیا جس کی ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں سخت ضرورت تھی، اس سے عوام میں صوبہ جاتی تعصب پیدا ہوگیا، اور لوگوں نے لفظ "حجازی"، "عسیری" یا "نجدی" پر زیادہ زور دینا شروع کیا، الاحسا میں معمر امیر سعود ابن جلاوی کی منصفانہ اور اصول پرست حکومت نے "عرب امریکی تیل کمپنی" کے ترقی پسندانہ اثرات سے مل کر کچھ بہتر حالات پیدا کیے، الاحسا سعودی عرب کا آزادی پسند صوبہ تھا، وہاں ریاض کی حکومت کو نفرت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا، اور فوجی افسروں اور سعودی عرب کے ان نوجوانوں کے دلوں میں جو بیرونی ملکوں سے تعلیم پاکر آئے تھے، یہ جذبہ پرورش پا رہا تھا کہ مصری طرز حکومت کو ملک میں نافذ کیا جائے۔

حالات کی یہ میراث شاہ فیصل کو اپنے بھائی شاہ سعود سے ملی، انھوں نے اپنی ولی عہدی کے زمانہ ہی میں یہ ثابت کردیا تھا کہ ان کے اندر معاشی اصلاحات اور ملک کی ترقی میں پرجوش حصہ لینے کی صلاحیت موجود ہے، مغربی مفکرین ان کی حد سے زیادہ محتاط طبیعت پر تنقید کرتے تھے، انھیں یہ بھی اعتراض تھا کہ انھوں نے علماء سے بھی تعلق قائم رکھنے کی پالیسی رکھی ہے، وہ لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ مشرق میں خودداری اور لیڈرشپ کا جو تخیل ہے، اس میں مادہ پرستی کی کوئی گنجائش نہیں، وہ فیصل کے پرجوش مذہبی کردار سے بھی واقف نہیں تھے، شاہ سعود کے رخصت ہونے سے کچھ ہی دنوں پہلے ولی عہد نے فضائیہ کے تربیت یافتہ افسران کے ایک جلسہ میں شرکت کی، اس جلسہ میں ان افسران کو پائلٹ کا عہدہ دیا جانے والا تھا، اس زمانہ میں چونکہ کئی افسران جہاز لیکر فرار ہوگئے تھے، اس لیے جہاز کی ٹنکی میں پورا پٹرول نہیں دیا جاتا تھا،

ولی عہد نے ان افسران سے کہا کہ یہ نہایت مذموم حرکت ہے، جو لوگ اپنی تقدیر سعودی عرب کی زندگی سے وابستہ نہیں کرنا چاہتے انھیں اختیار ہے کہ وہ کسی اور ملک کو چلے جائیں، اور حکم دیا کہ تربیت والے جہازوں کی ٹنکی میں پورا پٹرول دیا جایا کرے، اس کے بعد سے فضائیہ کا رکارڈ نہایت شاندار ہوگیا، اور اس میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی، اب بھی شاہ فیصل عوام سے ملتے جلتے اور انھیں باریابی کا موقع دیتے ہیں اس طرح عوام کو سعودی قومیت پر فخر کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے،

اب شاہ فیصل ملک کی ترقی میں علما، کو بھی شریک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے پیش نظر ان کی اسلامی اتحاد کی پالیسی بہت مفید ثابت ہوئی ہے مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کے متولی ہونے کی حیثیت سے وہ اس بات سے پوری طرح واقف ہیں کہ عربی خطوں میں قانون و تہذیب پیدا کرنے کا سہرا اسلام کے سر ہے، اس سے روگردانی خلفشار کا پیش خیمہ ہوسکتی ہے، قوم کے معاشرتی ڈھانچہ کی تعمیر نو اور ترقیاتی و صنعتی اسکیموں سے جو اثرات مرتب ہوسکتے ہیں، ان کا علاج یہی ہے کہ معاشرہ کی بنیاد میں شیرازہ بندی قائم رکھنے کے لیے اسلامی نظریۂ حیات کو استعمال کیا جائے شاہ فیصل اپنے پروگراموں میں جس حد تک علما، کا تعاون حاصل کرسکیں گے، اور صاحب اقتدار طبقہ میں جس حد تک اسلامی اخلاقیات کو سموسکیں گے، اور اہل دانش و افواج میں جس حد تک اسلامی اقدار کا احترام پیدا کرسکیں گے، اسی قدر وہ اپنے ملک کو اسلامی بنیادوں پر ترقی کی راہ پر لیجا سکیں گے۔

اس دور میں تجدد کا مطلب ہے ماہرانہ ٹیکنکی صلاحیت، صنعتی صلاحیت اور تربیت یافتہ مزدوروں کی دستیابی، ان چیزوں کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ

مغربی ٹیکنکی ماہروں کو ملک میں آنے کی اجازت دی جائے، اور سعودی عرب کی آبادی بہت مختصر ہے، اس لیے مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک کے تربیت یافتہ مزدوروں کو بھی بلایا جائے، یہ سب باتیں شاہ فیصل کے لیے بہت بڑے مسئلے پیدا کرتی ہیں،

پرانی قدریں آسانی سے ختم نہیں ہوتیں، خصوصاً وہ رسم و رواج جن کے پیچھے کوئی خاص نظریہ بھی کارفرما ہو، کبھی بھی فنا نہیں ہوتا، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری کے آخری ایام میں فرمایا تھا، کہ عرب میں دو مذہب نہیں رہیں گے،" یہ ایک ایسی پیشین گوئی تھی جس کی تکمیل حضرت عمرؓ نے اس طرح کی کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو نجران اور خیبر سے نکل جانے کا حکم دیا، پھر یہ روایت قائم ہوگئی کہ جو کوئی بھی اسلام قبول کرے گا، وہ عرب کہلائے گا، اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مختلف جنسوں کا مرکز عربوں کی سب سے بڑی پناہ گاہ ہے، صرف جنوب کے بہت ہی دور دراز اور ناقابل عبور علاقوں میں یہودی باقی رہ گئے، اور وہ اسرائیل کی حکومت قائم ہونے تک وہاں رہے، الاحسار میں امریکی عرب کمپنی کی تشکیل صرف شاہ عبدالعزیز کے ذاتی وقار سے ممکن ہوسکی ہے وہ بھی اس طرح کہ تیل کے یہ ذخائر مکہ اور مدینہ سے کافی دور ہیں، لیکن موجودہ سعودی عرب میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر طبقہ و خیال کے لوگ آزادی سے آجاسکیں، اس لیے مستقبل میں صرف مکہ اور مدینہ ہی غیر اسلامی نظروں سے بچے رہ سکیں گے، شاہ فیصل کو احساس ہے کہ یہ تبدیلی اچانک نہیں ہونی چاہیے، اس کے لیے علماء اور عوام کی تائید بھی ضروری ہے، یہ عوام مغرب کی بنی ہوئی سستی اور پرکشش چیزوں کی طرف بہت مائل ہوتے ہیں، لیکن انھیں مغربی نظریات سے بہرحال دو

رکھنے کی ضرورت ہے، یہ کام بہت مشکل ہے، اور ہو سکتا ہے کہ ان دونوں نظریات کے درمیان توازن برقرار نہ رہ سکے، شاہ سعود کی دست برداری کے ساتھ ساتھ اخلاقی زوال اور معاشرتی برائیوں کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا ہے، ملک میں اب بھی کارکردگی کی صلاحیت اور ملک کے لیے وقف کر دینے کے جذبہ کی کمی ہے، ابھی تک تو متحدہ سعودی حکومت اور سعودی قومیت کا احساس محض ایک خواب ہے بیرونی ممالک سے آنے والے مزدوروں کے سبب سے یہ کام اور بھی مشکل ہو گیا ہے ایک ایسے شخص کے لیے جو اپنی عمر کی پچاسویں منزل طے کر چکا ہے، یہ بڑا ہی آزمائشی قدم ہے، سعودی خاندان میں، جو واقعی باصلاحیت اور بامقصد لوگ ہیں، وہ سردست وراثت کی صف میں نہیں آتے، شاہ فیصل حتی الامکان پوری کوشش کر رہے ہیں، لیکن سعودی عرب کا مستقبل نہایت غیر واضح اور غیر یقینی ہے۔

جوزف جے میلون

امریکن یونیورسٹی، بیروت

مولانا وصی احمد محدث سورتی پیلی بھیتی

از جناب مولانا شاہ محمود احمد صاحب قادری استاذ مدرسہ احسن المدارس قدیم کانپور

(۲)

غیر مقلدوں کی تردید میں سرگرمی مولانا وصی احمد محدث سورتی کو غیر مقلدین کے افکار و مسائل و عقائد کی تردید سے بڑا شغف تھا، اور اس میں بڑی سرگرمی دکھاتے تھے، انھوں نے اپنی مشہور کتاب جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد کے ذریعہ جسے انھوں نے تین سوالوں کے جواب میں لکھا تھا، وہابیوں کے اخراج مساجد کا فتویٰ صادر کیا اور اس زمانے کے تمام مشاہیر علما، مولانا محمد علی کانپوری مونگیری المتوفی ۱۳۴۶ھ، مولانا عبد الحق صاحب تفسیر حقانی، مولانا عزیز الرحمٰن مفتی مدرسۂ دیوبند، مولانا رشید احمد گنگوہی المتوفی ۱۳۲۳ھ، مولانا محمود الحسن المتوفی ۱۳۳۹ھ، ملا محمود صدر مدرس مدرسۂ دیوبند ۱۳۱۶ھ، مولانا قاری عبد الرحمٰن محدث پانی پتی المتوفی ۱۳۱۴ھ وغیرہ نے جامع الشواہد پر تصدیقی و تائیدی دستخط ثبت کیے، یہ فتویٰ سنہ ۱۳۱۰ھ میں چھپ کر شائع ہوا، اور دوسری مرتبہ ادیب شہیر مولانا عبد العلی آسی، مدراسی المتوفی ۱۳۲۶ھ نے اپنی کتاب تنبیہ الوہابیین کے ص ۱۴۳ تا ۱۰۴ پر شائع کیا۔

غیر مقلدین کے مسائل کی تردید میں مولانا آسی اور محدث سورتی کی طرح مولانا منصور علی ابن مولانا حسن علی مراد آبادی بھی پیش پیش تھے، انھوں نے جب لظفر المبین

مؤلفہ مولانا غلام محی الدین کے رد میں فتح المبین لکھی تو محدث سورتی نے ذیل کا قطعہ اس کی تاریخ طباعت میں کہا :-

ذرا انصاف کی آنکھوں سے لے وہابیو دیکھو　　کتاب اب یہ مصنف نے لکھی کیا دلکشا
جو بات اس میں سب ثابت ہیں قرآن اور حدیثوں سے　　ہر اک بات اس کی اردو میں ہوئی کیا دلکشا
کتاب اس حسن و خوبی کی نہیں چھاپی گئی ابتک　　کہ خطاطان خوشخط نے لکھی کیا دلکشاء
عجب پھولا ہے باغ جو عنں اسکا نہر جدول سے　　اور اس کی لوح پیشانی بنی کیا دلکشاء
ہے اسکا نسخ و نستعلیق ہر اک خوشنما خوشخط　　خفی کیا دلکش عمدہ جلی کیا دلکشاء
غیمیے کو جو دیکھا خصم منکر بھی یہ بول اٹھا　　کہ حق بات اس میں ظاہر ہو گئی کیا دلکشا
جو پوچھا سال چھپنے کا لب ہاتف سے یوں نکلا　　کتاب رد محی الدین چھپی کیا دلکشا ء
　　۱۳۰۱ھ
جو کا ٹو سر وہابی کا، تماشا ہے اسی سن میں　　سن تصنیف ہو پیدا وصی کیا دلکشا ء

مولانا وصی احمد محدث سورتی نے منکرین تقلید کی تردید جس شد ومد سے کی تھی اس کا اندازہ مولانا حکیم سید عبد الحیٔ حسنی سابق ناظم دار العلوم ندوۃ لکھنو کی اس تحریر سے بخوبی ہوتا ہے :-

وکان من الفقهاء المتعصبين على من يعمل بنصوص الحديث، كثير الكلام عليهم جمع اقوالاً شتى من كتبهم وجعل تلك الاقوال مذهبهم و حملها على معان يكفر بها قائلوها تارةً على سبيل اللزوم واخرى على اعتبار مفهوم المخالف. فكفر بها كل من يعمل ويعتقد بالحديث وافتى باخراجهم من المساجد، وجد واجتهد فى اثبات

لہ فتح المبین ص ۶۳۷

التوقیعات عن الفقہاء[1]

علم و فضل | محدث سورتی علوم اسلامیہ پر گہری نظر رکھتے تھے، اور فقہ و تفسیر، منطق و فلسفہ کی امہات کتب کا درس دیتے تھے، لیکن ان کا خاص موضوع "فن حدیث" تھا، انھوں نے کامل چالیس سال درس حدیث میں گزارے، بے شمار احادیث مع اسناد ان کو یاد تھیں، صبح سے ظہر تک اور ظہر سے رات تک درس دیتے تھے، انھوں نے بے وضو کبھی کسی کتاب حدیث کو ہاتھ نہیں لگایا، اور نہ اس کا درس دیا، دوران درس میں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو ادا کرنے کے بعد قدرے توقف فرماتے تھے،[2]

حدیث کی تدریس میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری ان کو اپنا جانشین کہتے تھے، علامہ ہدایت اللہ خاں فاضل رامپوری المتوفی ۱۳۲۶ھ[3] مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا عبد الوہاب فرنگی محلی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا فضل الرحمن قدس سرہم فن حدیث میں ان کی مہارت کے معترف تھے، بلکہ اول الذکر تینوں بزرگ اپنے شاگردوں کو دورۂ حدیث کے لیے انکے پاس بھیجا کرتے تھے

اخلاق و عادات | عادات و اخلاق میں بڑے سادہ مزاج اور خلیق تھے، لباس محض معمولی اور بہت سادہ استعمال کرتے تھے، علماء و مشائخ اور سادات کرام کا بڑا اکرام کرتے تھے، عام مسلمانوں سے ہمدردی اور طلبہ سے بڑی محبت رکھتے تھے، غریب طلبہ کی امداد و اعانت ان کا خصوصی وصف تھا، عزور و تکبر اور غیبت و بد گوئی سے سخت نفرت تھی، ترویج سنت سے خصوصی شغف تھا، تصوف سے اگرچہ لگاؤ تھا، مگر خانقاہی

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۱۵ [2] تذکرہ قاری احمد صاحب [3] مولانا ہدایت اللہ رامپوری کے احوال کیلئے تذکرۂ علمائے اہل سنت، مرتبہ راقم سطور اور تذکرۂ کاملان رامپور مرتبہ حافظ احمد علی شوق دیکھی جائے

سے ہمیشہ گریزاں رہے، ان کا دل مسجد و مدرسہ میں زیادہ لگتا تھا سنت کی پیروی کو سب سے بڑی کرامت اور فقیری تصور کرتے تھے، غیر شرعی پیروں، فقیروں اور نام نہاد صوفیوں سے سخت بیزار تھے،

داڑھی منڈے حکیم اور ڈاکٹر سے علاج کرانا بھی ناگوار تھا، خلاف سنت مجالس و تقاریب میں شریک نہیں ہوتے تھے، انکو کسی کے ساتھ بد اخلاقی اور غصہ سے پیش آتے نہیں دیکھا گیا،

معاصر علماء سے تعلقات معاصر علماء و مشائخ میں مرشد زادہ مولانا احمد میاں جانشین حضرت مولانا فضل رحمٰن، تاج الفحول مولانا عبد القادر بدایونی، مولانا سلامت اللہ رامپوری المتوفی سنہ ۱۲۸۱ھ جانشین مولانا ارشاد حسین رامپوری المتوفی سنہ ۱۳۱۲ھ، مولانا ریاست علی خاں فاضل شاہجہانپوری[1] المتوفی سنہ ۱۳۴۹ھ مؤلف زلالین شرح جلالین، مولانا سید شاہ عبد الصمد سہسوانی[2] حافظ بخاری المتوفی سنہ ۱۳۲۲ھ، مولانا احمد حسن کانپوری المتوفی سنہ ۱۳۲۲ھ[3] مولانا حکیم نعیم الدین[4] مراد آبادی المتوفی سنہ ۱۳۶۷ھ، مولانا سید دیدار علی شاہ

---

[1] ان کے حالات کے لیے نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۱۵۴ اور تذکرہ علماء اہل سنت ملاحظہ ہو۔ [2] نامی گرامی عالم محدث صوفی تھے، نزہۃ الخواطر جلد ہشتم اور تذکرہ علماء اہل سنت، ملفوظ مصابیح القلوب مرتبہ حکیم ظہیر السجاد پھپھوندوی تذکرہ علماء حال، تاریخ مشائخ چشت، مرتبہ خلیق احمد نظامی ایم اے، اور نشاط حافظ، مرتبہ نواب حاجی غلام محمد حافظی اور اکمل التواریخ جلد دوم مرتبہ ضیاء القادری، ان کے احوال کے لیے دیکھی جائے۔

[3] مولانا احمد حسن کے حالات کے لیے نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۳۴ و تذکرۂ علمائے اہل سنت ص ۲۵ تا ۲۶ ملاحظہ ہو۔ [4] حیات صدر الافاضل مرتبہ مولانا معین الدین مرحوم، تذکرہ علماء اہل سنت، حیات اعلیٰ حضرت جلد چہارم آخری (قلمی) میں ان کے حالات تفصیل سے مذکور ہیں،

امروہی[1]، مولانا سید پیر مہر علی شاہ[2]، مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی[3] المتوفی ۱۳۲۲ھ، مولانا عبد الباری فرنگی محلی المتوفی ۱۳۴۴ھ، مولانا شاہ مطیع الرسول عبد المقتدر بدایونی المتوفی ۱۳۳۴ھ، مولانا احمد رضا بریلوی، شیخ المشائخ شاہ علی حسین[4] اشرفی کچھوچھوی المتوفی ۱۳۵۵ھ قدست اسرارہم سے محدث سورتی کے خصوصی تعلقات تھے۔

تلامذہ و اولاد | محدث سورتی کے چند خصوصی اور نامور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

(۱) مولانا سید سلیمان اشرف، قصبہ بہار شریف محلہ میرداد ضلع پٹنہ کے باشندے تھے، علامہ ہدایت اللہ خاں فاضل رامپوری سے تکمیل درسیات کر کے محدث سورتی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دورۂ حدیث کے بعد سند فراغت حاصل کی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ

---

[1] مولانا ارشاد علی شاہ امروہہ کے باشندے تھے، مولانا شاہ ارشاد حسین رامپوری، مولانا احمد علی سہارنپوری سے تکمیل علوم کر کے مولانا گنج مرادآبادی سے مرید ہوئے، خلافت پائی، وہ زبردست عالم محدث، معقولی اور صاحب تدریس بزرگ گزرے ہیں، ۱۳۵۳ھ سنہ وفات ہے، مرقد لاہور میں ہے تفصیل کے لیے نقوش لاہور نمبر ص ۹۳۸ و تذکرہ شعرائے پنجاب فارسی ص ۵۰، الیواقیت المہریہ ص ۱۱۱، تذکرہ علمائے اہل سنت ص ۲۳ و ۲۴ ملاحظہ ہو،

[2] پنجاب کے نامور بزرگ و متبحر عالم، احوال کے لیے تذکرہ علمائے اہل سنت ص ۴۴، ۴۵، ۴۶، تاریخ مشائخ چشت تذکرہ صوفیائے پنجاب، تذکرہ پیر گولڑہ مرتبہ مولانا فیض احمد (قلمی) الیواقیت المہریہ ص ۴۵ دیکھی جائے

[3] حالات کے لیے تذکرہ علمائے اہل سنت ص ۲۴۲ - ۲۴۵، نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸ مولانا محمد حسین الہ آبادی مرتبہ مولانا محمد میاں الہ آبادی ملاحظہ ہو[4] مرکز علم فرنگی محل کے نامور عالم و عارف تھے، انکی ذات سے علمائے ہند کو بڑا فیض پہنچا، بہت مختصر سی عمر پائی ۱۳۴۴ھ میں فوت ہوئے، تذکرۂ علمائے اہل سنت ص ۱۲۳، ۱۲۴، ونزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶ [4] کچھوچھہ ضلع فیض آباد کے ساکن اور حضرت مخدوم اشرف کے جانشینوں میں تھے، ان کے احوال و فضائل راقم سطور کی کتاب تاریخ بزرگان اشرفیہ میں بتفصیل مرقوم ہیں، عنقریب چھپنے والی ہے۔

دینیات کے چیرمین تھے، ۳۰ سال کے قیام علی گڑھ کے بعد رمضان ۱۳۵۳ھ میں وہیں انتقال کیا، بے مثال مقرر، متبحر عالم، نڈر اور بے باک حق گو تھے۔ ان کی تصانیف میں عربی زبان کی فضیلت میں "المبین" اور فارسی شعر و ادب کی تاریخ میں الانہار اور حج کے موضوع پر اچھی بہت ہی عمدہ کتابیں ہیں

(۲) مولانا مشتاق احمد کانپوری فرزند اکبر مولانا احمد حسن کانپوری اپنے والد ماجد اور ان کے شاگرد مولانا شاہ عبید اللہ سے درسیات تمام کرکے محدث سورتی سے دورۂ حدیث پڑھا، دار العلوم معینیہ اجمیر، مدرسہ شمس العلوم بدایوں، مدرسہ اسلامیہ میرٹھ، جامع نعیمیہ مرادآباد، مدرسہ کبیریہ سہسرام، شمس العلوم پٹنہ اور مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے صدر مدرس رہے، آخر عمر میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل مقرر ہوئے، ان کا شمار ہندوستان کے مشہور علماء و مدرسین میں ہوتا تھا، عید الفطر کی رات کو ۱۳۵۲ھ میں انتقال کیا تکیہ بساطیان کانپور میں والد ماجد کے حجرہ میں مدفون ہوئے،

(۳) مولانا امجد علی اعظمی محلہ کریم الدین پور گھوسی ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، علامہ ہدایت اللہ خاں سے علوم متعارفہ کی تکمیل کے بعد محدث سورتی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دو سال رہ کر سند حدیث حاصل کی، تکمیل الطب کالج کانپور میں طب پڑھی، تدریس کی ابتدا مدرسۃ الحدیث پیلی بھیت سے کی، وہاں سے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے پاس چلے گئے، مدرسہ منظر اسلام میں تدریس کے ساتھ مولانا بریلوی کی کتابوں کی طباعت کی نگرانی کا کام بھی انجام دیتے تھے، انھیں کے مرید و خلیفہ تھے، فقہ و حدیث اور علوم عقلیہ میں بڑی مہارت تھی، مولانا سلیمان اشرف کے اصرار پر درگاہ اجمیر شریف کے دار العلوم معینیہ عثمانیہ کے صدر مدرس ہوکر گئے، دار العلوم حافظیہ سعیدیہ دادوں علی گڑھ کے بھی

صدر مدرس رہے، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے ان کو منتخب علمائے ہند میں شمار کیا ہے[1]، ان کو درسیات پر بے نظیر دستگاہ تھی، ذو قعدہ ۱۳۳۶ھ میں حج و زیارت کو جاتے ہوئے بمبئی میں وفات پائی، ان کی تصانیف میں بہار شریعت، اردو میں فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتاب ہے، مزید حالات کی تفصیل تذکرہ علماء اہل سنت میں ہے،

(۳) مولانا محمد ظفرالدین ملا محب اللہ صاحب سلم العلوم و مسلم الثبوت کے خاندان کے نامور فرد تھے، ۱۴ محرم ۱۳۰۳ھ کو اپنے وطن میجرہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے، فصلی سنہ کے اعتبار سے غلام حیدر تاریخی نام ہے، جس سے ۱۲۹۱ فصلی برآمد ہوتا ہے، اپنے ننہال کے مدرسہ حنفیہ غوثیہ میں پڑھنے کے بعد قاضی عبدالوحید کے مدرسہ میں داخل ہوئے اور مولانا وصی احمد محدث سورتی سے درس شروع کیا، جب دوسرے سال ۱۳۲۱ھ میں محدث سورتی پیلی بھیت واپس گئے تو مولانا ظفرالدین کانپور چلے آئے، اور مولانا احمد حسن کانپوری کے علاوہ ان کے دو نامور شاگردوں مولانا عبیداللہ اور مولانا عبدالرزاق سے اخذ علوم کیا، اس کے بعد پھر پیلی بھیت جاکر محدث سورتی سے اکتساب علم شروع کیا، وہاں سے مولانا احمد رضا خاں کے پاس بریلی پہنچے، اور ان سے بخاری و مسلم کا دور کیا، ۱۳۲۵ھ میں سند فراغت مرحمت ہوئی اور مولانا بریلوی کے استدعا پر شاہ حیات احمد رودولوی سجادہ نشین شیخ العالم مخدوم احمد عبدالحق قدس سرہٗ نے ان کے سر پر دستار فضیلت باندھی، فراغت کے بعد مدرسہ منظر اسلام سے مدرسی کی ابتدا کی، ۱۹۱۳ء میں قیام شمس الہدیٰ پٹنہ کے بعد اس مدرسہ کے مدرس حدیث مقرر ہوئے، اور ۱۹۵۰ء میں پرنسپل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے، ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۲ھ میں وہیں وفات پائی، مرقد پٹنہ میں ہے، مولانا ظفرالدین کی حدیث پر وسیع اور گہری نظر تھی، انھوں نے

[1] رپورٹ دارالعلوم حافظیہ سعیدیہ ۱۳۳۰ھ ص ۷

مسائل احناف کی ماخذ حدیثوں کا مجموعہ جامع الرضوی جو صحیح البہاری کے نام سے مشہور ہے، چھ جلدوں میں مرتب کیا، جلد دوم کے چار جز مطبوعہ ہیں، ان کی نظر ہیئت، توقیت، ریاضی اور جفر پر بڑی گہری تھی، انھوں نے اوقات صوم وصلوٰۃ کے جو نقشے مرتب کیے وہ ہند و پاک میں بہت مستند مانے جاتے ہیں، ان کی تصنیف توضیح التوقیت چھپ چکی ہے، ان کو بیعت و خلافت مولانا احمد رضا خاں بریلوی سے تھی، انھوں نے ان کے حالات میں چار جلدوں میں "حیات اعلیٰ حضرت" لکھی، اس کی جلد اول چھپ چکی ہے، باقی جلدوں کو ان کے فرزند ارجمند ڈاکٹر پروفیسر مختار الدین احمد آرزو بی، ایچ، ڈی، فل، ڈی، لٹ (آکسن) صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مرتب کر کے شائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں، "مختار الدین" ان کا تاریخی نام ہے،

(۵) مولانا عبدالعزیز بجنوری، انھوں نے مولانا احمد حسن امروہوی سے پڑھنے کے بعد محدث سورتی کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور فراغت کے بعد انہی کی نگرانی میں مدرسہ حافظیہ پیلی بھیت میں درس شروع کیا، ۱۳۳۴ھ میں مدرسہ منظر اسلام بریلی میں مدرس ہوئے اور ۱۳۵۰ھ میں شیخ الحدیث مقرر کیے گئے، ان کو درس نظامی میں امتیازی و فنی خصوصیت حاصل تھی، ۸ جمادی الاولی ۱۳۶۹ھ میں بریلی ہی میں انکا انتقال ہوا، ان کے شاگرد مولانا مفتی محمد ابراہیم فریدی شیخ الحدیث مدرسہ شمس العلوم بدایوں نے "آج بزم دل ہوئی بے چراغ" تاریخ سال رحلت کہی، (تذکرہ علمائے اہل سنت ص ۹۴)

(۶) مولانا سید مصباح الحسن ابن مولانا سید شاہ عبدالصمد سہسوانی ۱۳۰۴ھ میں پھپھوند ضلع اٹاوہ میں پیدا ہوئے، والد ماجد اور دیگر علماء سے پڑھنے کے بعد علامہ ہدایت اللہ خاں رامپوری کے پاس جونپور گئے، ۱۳۲۳ھ تا ۱۳۲۶ھ ان سے علوم کی تحصیل کی، اس کے بعد پیلی بھیت جا کر محدث سورتی سے دورۂ حدیث کیا، ۱۳۲۸ھ میں سند حدیث حاصل کی، اپنے والد ماجد کے مرید و خلیفہ تھے، بڑے وسیع النظر اور متبحر عالم

محدث، صوفی و عارف تھے، انکے تبحر علمی کا اندازہ ان کے کتب خانہ کی نفن فنون کی سیکڑوں کتابوں کے ان نوٹس سے ہوتا ہے جو انھوں نے حواشی پر تحریر کیے ہیں، کاکوری کیس میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا، بلکہ بقول مولانا عبد القدیر بدایونی المتوفی ۱۳۷۹ھ وہ اس کے امیر تھے، مشائخ کاکوری کی شیعی روش پر انکی تنقیدیں بڑی فاضلانہ ہیں جس کا اعتراف اہل علم کو بھی ہے، دو سال مرض فالج میں مبتلا رہ کر ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ کو فوت ہوئے، مرقد پھپھوند ضلع اٹاوہ میں ان کی اپنی خانقاہ میں ہے، راقم سطور نے ان کے احوال، خدمات وفضائل پر فرید عصر مولانا مصباح الحسن" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے جو جلد ہی چھپنے والی ہے،

(۷) مولانا سید خادم علی ابن مولانا پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری

(۸) مولانا عبد القادر پشاوری صدر المدرسین دار العلوم نعمانیہ لاہور

(۹) مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی

(۱۰) مولانا ضیاء الدین ازاحفاد ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، سال ولادت ۱۳۱۴ھ، وطن کے علماء سے پڑھنے کے بعد ۱۳۱۳ھ تا ۱۳۱۵ھ مدرسۃ الحدیث میں تحصیل علم کرکے سند فراغت حاصل کی، ۱۳۱۴ھ میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی سے مرید ہوئے، ۱۳۱۸ھ میں ترک وطن کرکے بغداد چلے گئے اور دربار غوث اعظم میں مقیم رہے، ۱۳۲۶ھ سے مدینہ طیبہ میں حاضر ہیں، انکی نگاہ حدیث میں بڑی گہری ہے،

(۱۱) ماسٹر قاضی تلمذ حسین گورکھپوری،

اولاد | مولانا عبد الاحد عالم و فاضل اور تنہا اولاد نرینہ تھے، ۱۲۸۳ھ میں پیلی بھیت میں پیدا ہوئے مولانا غلام مہر علی نے ۱۲۸۷ھ صحیح نہیں لکھا ہے، انھوں نے علوم متعارفہ کی تکمیل

اپنے والد ماجد سے کی اور طب کی تعلیم ۱۹۱۳ء تکمیل الطب لکھنؤ میں پائی، ایک عرصہ تک پیلی بھیت اور پٹنہ میں درس دیا، کچھ عرصہ تک لکھیم پور کھیری میں طبابت کی، بڑے پرجوش اور شعلہ بیان خطیب تھے، درس میں بڑی مہارت تھی، ان کی شادی مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی نواسی بنت مولانا عبدالکریم سے ہوئی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے مرید و خلیفہ تھے، اور انہی کے ہمراہ ۱۳۲۳ھ میں حج و زیارت کے لیے گئے، ۱۳ر شعبان ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء کو لکھنؤ میں وفات پائی، اور گنج مرادآباد میں مولانا عبدالکریم کے برابر آموں کے باغ میں دفن ہوئے۔

تصانیف | (۱) حاشیہ سنن نسائی (مطبوعہ نظامی کانپور) (۲) حاشیہ طحاوی (مطبوعہ مصر) (۳) المجلی شرح منیۃ المصلی (مطبعہ یوسفی لکھنؤ) جلالین و مشکوٰۃ کے حواشی مولانا حسنین رضا (؟) لائل پوری سابق شیخ الحدیث مدرسہ منظر اسلام بریلی ان کی اہلیہ سے طباعت کے واسطے لے گئے تھے، پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کیا ہوئے اور اب کس کے پاس ہیں (۶) کتاب الدرۃ فی تحت عقد الایدی تحت السرہ (۷) جامع الشواہد باخراج الوہابیین عن المساجد۔

وفات | ۸ر جمادی الاخری ۱۳۳۴ھ کو وفات پائی، مدرسۃ الحدیث کے قریب مسجد کے احاطہ میں اس مجسمۂ فضل و کمال کا جسد خاکی سپرد خاک کر دیا گیا، مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے "یطاف علیھم بآنیۃ من فضۃ واکواب" سے تاریخ نکالی، اور انھوں نے فرمایا تھا کہ اگر اس میں "واو" شامل کر دیا جائے تو میری تاریخ ہو جائے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور انھوں نے ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی۔

مقالہ نما

مضامین الندوہ

از مولوی سلیمان شمسی صاحب ندوی

(۳)

ادبیات

اکرام اللہ خاں ندوی جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ

(۱) عربی کا اثر دیگر السنہ پر ص ۹ - ۱۵ حوالہ ۲۸۵

فارسی، ترکی اور یورپین زبانوں پر عربی زبان و ادب کے اثرات اور عجمی ممالک کے سماجی رسم و رواج پر عربی کی چھاپ کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

(۲) فارسی زبان کی گذشتہ تاریخ پر ایک نظر جون ۱۹۱۵ء

ص ۱ - ۱۱ حوالہ ۲۸۵

فارسی زبان کی گذشتہ تاریخ سے بحث کی گئی ہے، اور اس کے عہد بعہد کے ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے،

(۱) سلیمان ندوی (سید علامہ)

عربی زبان کی مختصر تاریخ شوال ۱۳۲۲ھ

(ماخوذ از اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان) ص ۱۴ - ۲۲ حوالہ ۲۶۹/۱

"زبان عربی کی تاریخ آفرینش کا پتہ نہیں لگتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس زبان سے نکلی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ زبان سامی یا آرامی سے پیدا ہوئی ہے جس کی

تین شاخیں کلدانی، عبرانی، نبطی بھی ہیں، عربی زبان کے اسماء وافعال، حروف، اشتقاقات اسی وقت مدون ہو چکے تھے، جب وہ آغوش مادر "سامی" میں تھی اور اسماء وحروف و اشتقاقات بھی اس سے پہلے کہ اس زبان والے متفرق ہوں یا فینقیہ اور جزیرہ عرب اور ما وراء النہرین میں جاکر بسے ہوں۔"

(۲) عربی زبان کی وسعت — جولائی ۱۹۰۷ء

ص ۵ - ۲۰ حوالہ ۲۷۹/۴

"عربی زبان کی تاریخ" اس زبان کے علمی سرمایہ کا جائزہ اور دنیا میں عربی بولنے والوں کی تعداد کے جائزہ کے ساتھ اس کی وسعت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شبلی نعمانی (علامہ) — اپریل ۱۹۰۹ء

(۱) ایرانی شاعری کا دور آخر — ص ۳ - ۲۴ حوالہ ۲۷۹/۶

[شعرالعجم جلد ۳ سے اقتباس] دور آخر کا جائزہ

(۲) فارسی شاعری اور عرفی شیرازی — شعبان ۱۳۲۳ھ

ص ۱ - ۵ حوالہ ۲۷۹/۲

عرفی کا باپ شیراز کے دارالحکومت میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز تھا، عرفی نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص عرفی رکھا، عرفی کی تعلیم و تربیت شیراز میں ہوئی، عرفی نے معمولی علوم کے ساتھ مصوری اور نقاشی کی بھی تعلیم پائی تھی، ــــ "شخصیت اور شاعری کا جائزہ۔"

(۳) عربی و فارسی شاعری۔ — اپریل ۱۹۰۸ء

ص ۱۴ - ۲۱ حوالہ ۱۷۹/۵

عربی و فارسی شاعری کا موازنہ
(ماخوذ از شعرالعجم)

(۴) فلسفہ اور فارسی شاعری ستمبر ۱۹۰۷ء

ص ۳ - ۱۰ حوالہ ۲۷۹/۴

سحابی نجفی کی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے،

"شعرالعجم سے ماخوذ ہے"

(۵) مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ مارچ ۱۹۰۶ء

ص ۹ - ۲۷ حوالہ ۲۷۹/۳

عرب میں جو فارسی اور اردو شاعری کا سرچشمہ ہو شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی اور یہی ہونا چاہیے تھا، عرب میں شاعری بالکل فطرت کے اصول پر ہوئی ہے، یعنی جو جذبات دل میں پیدا ہوتے تھے وہی زبان سے ادا کر دیے جاتے تھے۔

[موازنہ انیس و دبیر سے اقتباس]

عبدالرحمٰن صاحب جون ۱۹۱۲ء

عرب کی شاعری ص ۲۹ - ۳۲ حوالہ ۲۷۹/۹

مشہور مورخ ابو داؤد نے لکھا ہے کہ تمام ملک عرب کی چھان بین کر ڈالی جائے تو بہت مشکل سے کوئی ایسا شخص ملے گا جس کو شعر گوئی کا تھوڑا بہت سلیقہ نہ آتا ہو کیا بچہ کیا جوان کیا بڈھا، کیا مرد کیا عورت سبھی اس دریا کے غوطہ خور تھے، اور شاعری ان کے خمیر میں تھی،

عبدالماجد (دریابادی) مترجم اپریل ۱۹۱۱ء

شاعری اور اس کے اصناف ص ۱ - ۱۲ حوالہ ۲۷۹/۸

"شاعری کا مقصد جیسا کہ ہر شخص کو تسلیم ہے، جذبات پر اثر ڈالتا ہے، اور یہی ایک

خصوصیت شاعری کو (بقول ورڈزورتھ) اس کے منطقی نقیض سے ممتاز کر دینے کیلیے کافی ہے، جو نثر نہیں بلکہ سائنس ہے، شاعری اپنا مخاطب جذبات کو قرار دیتی ہے اور سائنس یقین کو، آخرالذکر استدلال سے کام لیتا ہے اور اول الذکر محرکات سے"۔

لیکن شاعری کی یہ تعریف مکمل نہیں.......!

یورپ میں آجکل شاعری کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، ان میں تل کا مضمون بسیط ہے، اسی کے ایک ٹکڑہ کا ترجمہ ہے۔

عمادی - عبداللہ

"ادب الہند یعنی اسلام میں ہندی لٹریچر کا رواج"۔ جمادی الاولی

ص ۲۰ - ۲۸ حوالہ $\frac{۲۷۹}{۲}$

اسلامی تاریخیں بتا رہی ہیں کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں کتابیں ترجمہ کیں، ہندوستان میں اس وقت آ کر رہے ہیں جب ہندو مسلمانوں کے نام سے بھی آگاہ نہیں تھے، سنسکرت میں مہابھارت بیداکی، شاستر کی کتابیں لکھیں پڑھیں ہندوؤں کے علوم میں اضافہ کیا۔ اور علاوہ ترجمہ کتب ہندیہ کے عربی کتابیں بھی ہندی میں ترجمہ کیں اور اس طرح ہندوؤں کو نہایت عمدہ موقع دیا کہ وہ مسلمانوں سے تعلقات قائم کر سکیں،

تعارف تنقید و تبصرہ

آزاد - ابوالکلام (مولانا) رمضان ۱۳۲۳ھ تا ذی الحجہ

المرأۃ المسلمۃ ص ۱۴ - ۲۷ حوالہ $\frac{۲۷۹}{۲}$

فرید وجدی کی کتاب المرأۃ المسلمۃ کا تنقیدی جائزہ،

فرید وجدی چونکہ یورپ کی متعدد زبانوں سے واقفیت رکھتا ہے اور خود تعلیم یافتہ سوسائٹی کا ایک فاضل ممبر ہے، اس لیے اس نے جو کچھ لکھا ہے محض یورپ کے اقوال وحالات کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے، اس بنا پر ظاہر ہے کہ "المرأۃ المسلمۃ" جس قدر نئے گروہ پر اثر ڈال سکتی ہے، ہمارے یہاں کی مذہبی تحریروں سے اس قدر توقع نہیں ہو سکتی،

اکرام اللہ خاں ندوی اپریل ۱۹۱۵ء

ایک جدید تاریخی کتاب ص ۱۶-۲۷ حوالہ ۲۸۵

"جنۃ المشرق"

حکیم سید عبد الحئی صاحب مرحوم مصنف نزہۃ الخواطر کی کتاب جنۃ المشرق کا تعارف،

اس کتاب کے چار حصے ہیں، پہلے حصہ کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کا قدیم وجدید جغرافیہ مختلف حیثیتوں سے دکھایا جائے، دوسرا حصہ تاریخ میں ہے، تیسرا حصہ اس کتاب کا الخطط والآثار ہے، اس میں تین باب ہیں اور یہی اس کتاب کی جان ہے"

انور محمد ندوی

ایک نادر قلمی تفسیر۔ "منتہی العلوم فی تفسیر کتاب الحی القیوم

ستمبر ۱۹۴۰ء

ص ۲۸-۳۱ حوالہ ۲۸۷

پیش نظر نسخہ ۰۰۰ میں یعنی مصنف کی وفات سے چار برس پہلے لکھا گیا ہے، عبداللہ المرعی مصنف کے تلمیذ رشید نے اسی نسخہ سے مصنف سے پڑھا تھا، اور انکے

علاوہ علمائے سلطنت کی ایک کثیر تعداد نے اس سے استفادہ کیا۔ ان صاحب کے نام عبد اللہ الصرعی کے قلم سے کتاب کے آخر صفحہ پر لکھے ہوئے ہیں۔

سلیمان ندوی (عید علامہ) مارچ ۱۹۰۹ء

(۱) "نہایۃ الارب" ص ۳۰ - ۳۲ حوالہ ۲۷۹/۲

نہایۃ الارب علامہ نویری کی مشہور تصنیف ہے، جو تیس جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ اور جامعیت کے لحاظ سے ہر قسم کے علوم و فنون کا مجموعہ ہے۔ فن اول فلکیات، ارض، عنصریات، فن دوم انسان اور اس کے متعلقات، فن سوم حیوانات اور فن پنجم تاریخ پر مشتمل ہے۔

(۲) تمدن اسلامی مصنفہ جرجی زیدان اکتوبر ۱۹۰۸ء

ص ۱۵ - ۲۴ حوالہ ۲۷۹/۵

جرجی زیدان کی کتاب پر تبصرہ ہے، اس میں مصنف کی فریب کاری کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

(۳) "ایک جرمن کا اسلام پر لکچر" دسمبر ۱۹۱۱ء

موسیو مونٹیٹ کے لکچر کے اقتباس ص ۲۳ - ۳۰ حوالہ ۲۷۹/۸

ہم نے اسباب اشاعت اسلام کے بیان میں اختصار سے کام لیا، ہمارے نزدیک اشاعت اسلام کے قوی اسباب وہی دو ہیں، یعنی مسلمانوں کا اخلاص اور شدت اعتقاد، جوش مذہبی اور عربوں میں قومی و وطنی احساس کا پیدا ہونا، یہی وہ سبب ہیں جو اسلام کی اشاعت میں کام کرتے ہیں،

(۴) کتب خانہ اسکندریہ دسمبر ۱۹۱۱ء

ص ۲۳ - ۳۰ حوالہ ۲۷۹/۸

لندن کے اخبار "ٹائمز" میں ایک مضمون نگار نے جرجی زیدان کی تصنیف "تاریخ مصر جدید" کے حوالہ سے کتب خانہ اسکندریہ کی نسبت کہا تھا کہ وہ مسلمانوں ہی کی راہ سے برباد ہوا، مسٹر بٹلر نے ۲۵ جون ۱۹۱۱ء میں اس مضمون کی دھجیاں اڑائی ہیں، اسی مضمون کی روشنی میں بعض تاریخی واقعات پر بحث کی گئی ہے،

(۴) طبقات ابن سعد مارچ ۱۹۱۲ء

ص ۳۱ - ۴۲ حوالہ ۲-۹/۹

طبقات ابن سعد تمام مورخین کے نزدیک نہ صرف معتبر ثقہ اور مستند ہے بلکہ اس عہد کے بعد کی تمام تصنیفات کی مرکز نقل و روایت ہے، تمام مورخین اپنی کتابوں میں اس کا حوالہ دیتے ہیں، اس موضوع پر کوئی اس کی برابری کا دعویٰ نہ کر سکے ...... اس جلیل القدر کتاب کا نسخہ کسی ایک کتب خانہ میں بھی مکمل موجود نہ تھا، آخر کار ایک جرمن فاضل پروفیسر "ساخو" نے اس کتاب کو چھاپنے کی ہمت کی،

شبلی نعمانی (علامہ) مارچ ۱۹۱۱ء

(۱) لغت فرس، از اسدی طوسی، ص ۳ - ۹ حوالہ ۹-۲

اسدی کو تمام دنیا صرف شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے، یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ فارسی لغت کا سب سے پہلا مدون ہے، اس نے اپنی کتاب کا نام لغت فرس رکھا ہے، اور صرف نادر اور غریب الفاظ جمع کیے ہیں، یورپ کے ایک مشہور مستشرق پاول ہارن نے آٹھ برس کتاب کی تصحیح و تحشیہ میں صرف کئے اور ۱۸۹۷ء میں اس کو شائع کیا۔

(۲) نظم القرآن و جمہرۃ البلاغہ شوال ۱۳۲۲ھ

ص ۱ - ۴ حوالہ ۲-۹/۱

مولوی حمید الدین صاحب نے اسی مسئلہ پر کتاب لکھی ہے، اور وہ اس رائے کے مدعی ہیں کہ ایک سورت میں جس قدر آیتیں ہیں، باہم متناسب ہیں ..... اسی بنا پر مصنف نے اصل فن پر توجہ کی۔ اور اس کو نہایت وسیع پیمانہ پر نئے سرے سے ترتیب دیا۔ اور فصاحت و بلاغت کے بہت سے جدید اصول قائم کیے، اسی طرح ایک اور مستقل کتاب تیار ہو گئی جس کا نام انھوں نے "جمہرۃ البلاغۃ" رکھا۔

(۳) کتاب العمدۃ ابن رشیق القیروانی، نومبر ۱۹۰۹ء

"شعر العرب" ص ۱ - ۱۰ حوالہ ۹/۲۷

ابن رشیق افریقہ کا رہنے والا تھا، اس کا باپ ایک رومی غلام تھا، اور زرگری کا پیشہ کرتا تھا، باپ نے ابتدا میں خاندانی پیشہ سکھلایا لیکن اس نے اسکے ساتھ علوم ادبیہ کی بھی تحصیل کی اور یہ مذاق غالب آیا،

کتاب اور صاحب کتاب کے تعارف کے ساتھ موضوع پر بھی روشنی ڈالی گئی، اور کچھ اقتباسات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے

(۴) ہمایوں نامہ۔ گلبدن بیگم اپریل ۱۹۰۸ء

ص ۳ - ۱۳ حوالہ ۹/۲۵

گلبدن بیگم بابر کی بیٹی، ہمایوں کی بہن اور شہنشاہ اکبر کی پھوپھی تھی، اس نے بابر اور ہمایوں کے حالات میں ایک کتاب لکھی، اور ہمایوں نامہ نام رکھا، ہمایوں نامہ چونکہ ایک خاتون کی تصنیف تھی، یورپ کی خوش مذاقی نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے ایک خاتون ہی کو انتخاب کیا، یعنی لیڈی اینٹ، ایس بیورج کو اسی کتاب کو بہم پہنچانے کا خیال ہوا،

(۱) سیرت نبوی جنوری ۱۹۱۲ء

ص ۵ - ۸ حوالہ ۲۷۹/۹

"سیرۃ النبی" کی تکمیل سے پہلے کا مجوزہ خاکہ پیش کیا گیا ہے، اور اس کام کی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۲) "مآثر رحیمی اور عبدالرحیم خانخاناں"۔ اپریل ۱۹۰۷ء

ص ۱ - ۱۶ حوالہ ۲۷۹/۴

ایشیاٹک سوسائٹی میں مآثر رحیمی کا ایک نسخہ نظر سے گذرا۔ یہ کتاب عبد الرحیم خانخاناں کے حالات میں ہے، جو اکبر شاہ کا سپہ سالار تھا، مصنف کا نام عبدالباقی ہے، جو ایران کا باشندہ اور ایک معزز خاندان کا ممبر تھا، کتاب خود خانخاناں کی زندگی میں لکھی گئی۔

(۷) تلفیق الاخبار دسمبر ۱۹۱۱ء

ص ۲ - ۸ حوالہ ۲۷۹/۸

یہ ایک ضخیم کتاب ہے، جو خاص ترک و تاتار کی تاریخ میں ہے جو ایک روسی مسلمان کی تصنیف ہے۔۔۔۔ مصنف تاتاری ترک ہے، اور قومیت کے نشہ میں چور ہے۔ چنگیز خاں کی برائی پر تمام دنیا کو متفق اللفظ سنتے آئے لیکن مصنف اس اجماع میں بھی شامل ہونا گوارا نہیں کرتا۔

(۸) "تفسیر کبیر امام رازی" (ریویو) مئی ۱۹۰۸ء

ص ۵ - ۱۰ حوالہ ۲۷۹/۵

یہ امر افسوسناک ہے کہ یہ تحقیق معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں تک اصل تفسیر ہے اور

کتاب سے تکملہ شروع ہوا ہے. شہاب نے شفائے قاضی عیاض کی شرح میں لکھا ہے کہ امام نے صرف سورہ انبیاء تک تفسیر لکھی، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، سورہ فتح تک امام صاحب کی تفسیر کا لکھا جانا یقینی ہے،

(۹) تحفۃ الہند — فروری ۱۹۱۱ء

ص ۳ – ۱۰ — حوالہ ۲۷۹/۸

"تحفۃ الہند" جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے، ایک کتاب کا نام ہے. جو اورنگزیب عالمگیر کے زمانہ میں تصنیف ہوئی. مصنف کا نام میرزا خان بن فخرالدین محمد ہے، دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب شاہنشاہ عالمگیر کے زمانہ میں شہزادہ اعظم شاہ کے مطالعہ کے لیے تصنیف کی، کتاب کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت، عروض و قافیہ وغیرہ ہیں،

(۱۰) "الملل والنحل اور علامہ ابن حزم" — اکتوبر ۱۹۰۵ء

ص ۱۶ – ۲۲ — حوالہ ۲۷۹/۲

اس کتاب میں مصنف نے فلاسفہ، ملاحدہ، مادیین، یہود و نصاریٰ، غرض اکثر اہل مذاہب کے عقائد و خیالات نقل کیے ہیں، اور ان کا رد لکھا ہے. غیر مذاہب کے رد میں علمائے اسلام کی بہت سی تصنیفات ہیں لیکن اس کتاب میں یہ خصوصیت ہے کہ دوسروں کے عقائد و خیالات کو نہایت تحقیق سے لکھا ہے،

کتاب کا علمی جائزہ

شروانی، حبیب الرحمٰن خاں — اکتوبر ۱۹۰۶ء

ریویو، سوانح عمری مولانا روم — ص ۲۴ – ۳۲ — حوالہ ۲۷۹/۲

مثنوی کے مطالب اور عام افہام کے درمیان جو دور دراز مسافت حائل تھی اسکے کم ہوجانے کا ایک ذریعہ خوبی قسمت سے ہاتھ آگیا ہے، علامہ شبلی نے سوانح مولانائے روم

تصنیف کرکے اس کے ضمن میں مثنوی پر ایک مکمل تبصرہ لکھا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ تبصرہ کے ضمن میں سوانح عمری تصنیف کی ہے۔

عبدالسلام ندوی (مولانا) جنوری ۱۹۱۱ء وفروری

"اخبار الحکماء قفطی" ص ۱۳-۳۲-۲۳-۳۴ حوالہ ۲۰۹/۹

اس کتاب کے مصنف کا پورا نام جمال الدین الاکرم ابوالحسن علی بن یوسف بن ابراہیم الشیبانی القفطی ہے۔ اس کا خاندان اگرچہ اہل کوفہ سے تعلق رکھتا تھا لیکن وہاں سے نکل کر مصر کے ایک گاؤں قفط میں آباد ہو گیا تھا ... مصنف نے اگرچہ کتاب صرف حکماء کے حالات میں لکھی ہے لیکن ان ہی کے ضمن میں ایسے دلچسپ فلسفیانہ نکتے بھی جمع کیے جن سے مسلمانوں کے فلسفہ کی پوری تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

(۲) روح الاجتماع۔ گستاولی بان مارچ ۱۹۱۱ء

ص ۶ - ۲۴ حوالہ ۲۷۹/۹

"زیر ریویو کتاب فلسفہ کی ہمہ گیری کے لحاظ سے فلسفۂ جماعت کے متعلق لکھی گئی ہے، پروفیسر گستاؤلی بان جو فرانس میں علم النفس کا بہت بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے، اور جس کی کتاب تمدن عرب اور تمدن ہند کے ترجمے نے اس کو ہندوستان میں بھی مشہور کر دیا ہے، اس کتاب کا مصنف ہے۔

بعض اقتباسات کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

(۳) "صحیح مسلم" دسمبر ۱۹۰۶ء وجنوری ۱۹۰۷ء

ص ۱۳ - ۳۲ حوالہ ۲۷۹/۹

امام مسلم اور ان کی کتاب جامع صحیح مسلم کی عظمت پر مضمون۔

بخاری کا نام کتاب اللہ کے بعد لیا جاتا ہے، تو مسلم بھی ہمیشہ بخاری کے ساتھ یاد کیجاتی ہے، اس لیے اس کتاب پر ایک مفصل ریویو کی ضرورت ہے، تاکہ اس کی خوبیاں عام طور پر نمایاں ہو جائیں،

عبدالسمیع صاحب ایم اے، بی ٹی — دسمبر ۱۹۴۱ء و جنوری ۱۹۴۲ء

روسو کا نظریۂ تعلیم — ص ۲۷ - ۳۱ — حوالہ ۲۸۰/۲

تعلیم نسواں کے بارے میں انفرادی تعلیم کے اصول سے انحراف کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ عورت کی تعلیم صرف مرد کی خاطر ہونا چاہیے، جسمانی تربیت ہو تاکہ حسن ظاہری اور تناسب اعضا پیدا ہو اور نسل انسانی میں اچھے قویٰ کے بچے پیدا ہوں، اسکے سوا اور کوئی تعلیم ضروری نہیں،

عبدالماجد دریابادی — اکتوبر ۱۹۴۱ء

"الندوہ" پڑھکر — حوالہ ۲۸۰/۲

علوی، پروفیسر بدرالدین — مئی ۱۹۴۰ء

"تقویم البلدان" — ص ۱۲ - ۱۴ — حوالہ ۲۸۷

آج سے پورے سو سال پیشتر ۱۸۴۰ء میں تقویم البلدان کو فرانسیسی پروفیسر رینا اور بیرن دی سلین نے اپنے اہتمام سے پیرس میں چھاپا تھا، مستشرقین کے طریقہ کے موافق اخیر میں ایک مقدمہ فرانسیسی زبان میں لکھا ہے، اور فہرست مضامین اور فہرست امکنہ لگائی گئی ہے۔"

عمادی عبداللہ — ستمبر ۱۹۰۸ء

"تاریخ ابن خلدون" — ص ۳ - ۲۲ — حوالہ ۲۷۹/۵

ابن خلدون نے تاریخ نویسی کے لیے چند اصول قرار دیے ہیں اور ایک ضابطہ

مقرر کیا ہے۔ ان اصول میں حاضر غائب کے اتفاق و اختلاف سے یہ مراد ہے کہ موجودہ زمانہ چونکہ قدیم زمانہ کے واقعات کا نتیجہ ہے لہذا موجودہ اور گذشتہ امور پر غور کرنا چاہیے کہ ان میں کتنی باتیں باہم ملتی جلتی ہیں اور کس قدر مختلف ہیں، تاریخ کی موجودہ تعریف اسی ضابطہ سے استنباط ہوئی ہے"۔

عمادی عبد اللہ — ستمبر ۱۹۰۵ء

"فرید و جدی بک" — ص ۲۵ - ۲۷

حوالہ ۹/۲۷۹

ایک عجیب بات ہے کہ باوجود تعلیم جدید کے عورتوں کی آزادی اور خود مختاری کے متعلق اس کے خیالات جدید تعلیم کے بالکل مخالف ہیں، قاسم بک امین کی کتاب تحریر المرأة کا اس نے جو جواب لکھا وہ درحقیقت لاجواب تھا،

عمادی عبد اللہ — ستمبر ۱۹۰۵ء

بلاغات النساء — ص ۲۲ - ۲۵ حوالہ ۹/۲۷۹

تیسری صدی ہجری کی ایک تصنیف ہے، جس میں عورتوں کی تقریریں اور خطبے جمع کیے ہیں قدما کی گمشدگی کی وجہ سے اسلامی تمدن، اسلامی اخلاق بلکہ خود شریعت اسلام کی جو تصویر ہمارے سامنے ہے، اس قدر اصلیت سے دور ہے کہ صحیح خط وخال کا تصور کرنا آج بھی مشکل ہے،

نذیر احمد شمس العلماء — نومبر ۱۹۰۵ء

"فرائض انسانی" — ص ۳۰ - ۳۲ حوالہ ۹/۲۷۹

شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی آخری تصنیف ہے اس میں عبارات کے تمام ابواب نہایت تفصیل اور بسط سے لکھے ہیں، مصنف کے طرز بیان نے فقہ کے روکھے پھیکے مسائل کو بھی دلچسپ بنا دیا ہے، کتاب کے بعض اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

خواجہ میر درد تصوف اور شاعری } مرتبہ ڈاکٹر وحید اختر صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۵۰۳ مجلد مع گرد پوش۔
قیمت [illegible] روپیہ: انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔

خواجہ میر درد جس درجہ کے شاعر تھے، اس سے بلند درجہ کے صوفی تھے، اور شاعری کے بجائے تصوف ہی کو اپنے لیے مایۂ فخر سمجھتے تھے، تصوف میں ان کا بڑا کارنامہ اس خاص سلسلہ "طریق محمدی" کی تشریح ہے، جو ان کے والد خواجہ ناصر عندلیب پر منکشف ہوا تھا مگر اس کے باوجود اس کی جانب کم اعتنا کیا گیا ہے، لائق مصنف نے اس کو اپنے تحقیقی مقالہ کا موضوع بنایا تھا، جس کو اب رد و بدل کرکے کتاب کی صورت میں مرتب کیا ہے، یہ دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں خواجہ صاحب کے عہد تک کے عام صوفیانہ نظریات کا جائزہ اور ان پر ان کی تنقیدوں کا ذکر ہے، اس ضمن میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی اہم بحثوں کے متعلق بعض اکابر صوفیہ کے نقطۂ نظر کی تشریح کی گئی ہے، اور آخر میں خواجہ صاحب کے خاص صوفیانہ افکار و نظام کی وضاحت ہے، دوسرے حصہ میں فارسی اور اردو شاعری میں تصوف کے عام اثرات و رجحانات کا جائزہ لینے کے بعد خواجہ صاحب کی صوفیانہ شاعری کے مختلف پہلوؤں اور تغزل کے خصوصیات اور شاعری میں انکی جدت و انفرادیت وغیرہ کا ذکر ہے، یہ حصہ درد کے تلامذہ کے تذکرہ پر ختم ہوتا ہے، شروع میں خواجہ صاحب کے عہد، حالاتِ زندگی اور تصنیفات کا ذکر ہے، مگر اوّلاً تو کتاب کا موضوع ہی خشک ہے، دوسرے مصنف

نے دونوں حصوں کی تمہید اتنی طویل کر دی ہے کہ اصل موضوع تک پہنچنے سے پہلے ہی عام قاری کو گھبراہٹ ہونے لگتی ہو، کہیں کہیں صوفیہ اور خود درد کی رواداری اور وسیع المشربی کا اس انداز سے ذکر کیا گیا ہے کہ گویا ان بزرگوں کے نزدیک کفر وایمان اور حق و باطل میں امتیاز کا کوئی معیار نہ تھا، جو صحیح نہیں، مصنف نے براہ راست اصل کتابوں کے بجائے ضمنی اور ثانوی ماخذ کا حوالہ دے کر اس کتاب کا تحقیقی پایہ ہلکا کر دیا ہے، راقم کے سامنے جو نسخہ ہے اس میں صفحات ۴۶۵ تا ۴۷۲ شامل نہیں ہیں، اور ۵۱۳ تا ۵۲۰ مکرر ہیں، ان باتوں سے قطع نظر یہ کتاب لائق مطالعہ ہے، اس میں درد کے تصوف و شاعری کے کمالات کو بڑی حد تک واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شعر و شعور: ۔ مرتبہ جناب حفیظ میرٹھی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۴۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ، پتہ مکتبہ دوام، ٹانڈہ، فیض آباد،

جناب حفیظ میرٹھی خوش فکر شاعر اور ادارۂ ادب اسلامی سے وابستہ ہیں، یہ رنگ انکے پورے کلام سے نمایاں ہے، اسی لیے وہ اپنے مقصد کو فن سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، ان کا قلب مومن اپنی زریں تاریخ کے ذریعہ دنیا کی تعمیر نو کا عزم اور اس کے لیے دار و رسن سے کھیلنے کا حوصلہ رکھتا ہے، ان کے خیالات کی طرح انداز بیان میں بھی اقبال کے کلام کی جھلک ملتی ہے، مثلاً

بہت اس سے اونچی ہے پرواز میری — میں ہرگز نہیں بندۂ آب و دانہ
اس اک مرکز دین و دنیا سے ہٹ کر — نہ تیرا ٹھکانا، نہ میرا ٹھکانہ
تو پڑ ماضی و حال کی الجھنوں میں — صداقت نہیں ہے اسیر زمانہ
کوئی مرحلہ ہو، کوئی معرکہ ہو — نظر عارفانہ، قدم غازیانہ

شعر و شعور حفیظ صاحب کا پہلا مجموعہ ہے، اور غالباً انکی نظر ثانی کے بغیر شائع کر دیا گیا ہے، اسلئے بعض اشعار میں ناہمواری رہ گئی ہے، لیکن ان کے جذبات کی صداقت و خلوص اور افکار و خیالات کی رفعت نے کلام میں سوز و تاثیر پیدا کر دی ہے۔

چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں۔ مرتبہ مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۵۰ قیمت ہے پتہ (۱) فرقانیہ اکیڈمی چک بالاد بنگلور، نارتھ (۲) آئیڈیل بک سنٹر ادینیو روڈ۔ بنگلور ۲

سائنس کی موجودہ ترقیوں خصوصاً خلائی پرواز اور چاند کی تسخیر نے جو شکوک و شبہات پیدا کر دیے ہیں، ان کے ازالہ کے لیے اردو میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر ان سب میں زیر نظر کتاب زیادہ مبسوط ہے، اس کے لائق مصنف نے دقت نظر سے قرآن مجید کا مطالعہ بھی کیا ہے، اور وہ ایک حد تک جدید نظریات سے بھی واقف ہیں، اس لیے انھوں نے ان دونوں کی روشنی میں یہ دکھایا ہے کہ تسخیر قمر اور اس طرح کے دوسرے سائنسی انکشافات قرآنی تصریحات کے منافی نہیں ہیں بلکہ یہ درحقیقت قرآن کے اعجاز و صداقت کی دلیل اور ایمان و یقین میں اضافہ و پختگی کا موجب ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے بعض آیتوں سے بڑے دلچسپ نکتے اور مفید حقائق اخذ کیے ہیں، اصولی حیثیت سے انکا نقطۂ نظر بالکل صحیح ہے مگر اس کو ثابت کرنے اور بعض مزعومات کی تردید کے لیے انھوں نے بعض آیتوں سے جو نتائج مستنبط کیے ہیں، ان سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، مصنف کی یہ پہلی کتاب ہے، اس لیے تکرار، طوالت اور حشو و زوائد سے خالی نہیں ہے۔ اور اکثر جگہ جذباتی اور مناظرانہ رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ مگر ان فروگذاشتوں کے باوجود یہ مفید اور معلوماتی ہے۔ ہونہار مصنف کا وقت کے اس اہم اور ضروری مسئلہ پر توجہ کرنا حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔ شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ایک مفید مقدمہ بھی ہے۔ "ض"

مصنفات سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

۱- **بزم تیموریہ**: تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعرا و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۰۴ صفحے قیمت للعہ

۲- **بزم مملوکیہ**: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادبا کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے ۳۵۰ صفحے قیمت معہ

۳- **بزم صوفیہ**: عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴- **ہندوستان عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک**

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہند و مسلمان مورخوں کے قلم سے۔ ۵۰۰ صفحے، قیمت: عہ ۲۵

۵- **ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام**

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰۰ صفحے قیمت: غہ

۶- **ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے**

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت: سعہ

۷- **ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر**

ضخامت:- ۲۲۸ صفحے، قیمت:- صہ

۸- **ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں**

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت ؎

۹- **ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں**

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: ہ

۱۰- **عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں**

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ جدید عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۰ صفحے، قیمت: لہ

مینجر دار المصنفین اعظم گڑھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) جون ۱۹۷۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات وہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب ملت نسل ورنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اس کو اختیار کرنے اور اُسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات اُن کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے

(مرتبہ)

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت :- ۲۲۰ صفحے قیمت :- ۳ ؎

جلد ۱۰۹ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۲ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

برسوں کے انتظار کے بعد بالآخر مسلم یونیورسٹی بل پاس ہوگیا اور سارے وعدوں اور یقین دہانیوں کے برخلاف اس کا اقلیتی کردار بڑی حد تک ختم کر دیا گیا، اس اہم بل کو جس پر بڑے غور و فکر اور بحث و مباحثہ کی ضرورت تھی اس عجلت سے پاس کیا گیا کہ اس جھگڑے میں پڑنے کی نوبت ہی نہ آئے، اس نے ہندوستان کے دستور سے اقلیتوں کا اعتماد متزلزل کر دیا، دستور نے اقلیتوں کو اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق تعلیمی ادارے قائم کرنے کا حق دیا ہے اور حکومت ان کو امداد دینے کی ذمہ دار ہے، وہ اپنی گرہ سے نہیں بلکہ اقلیتوں ہی کے ادا کردہ ٹیکس سے دیتی ہے اسلئے محض امداد دینے کی بنا پر اسکو کسی ادارے کے کردار کو بدلنے کا حق نہیں ہے، لال بہادر شاستری سے لیکر اس وقت تک حکومت کے سارے ذمہ دار اس کا یقین دلاتے رہے کہ مسلم یونیورسٹی کا کردار باقی رکھا جائیگا، مسز اندرا گاندھی نے بھی اپنے الکشن منشور میں اسکی طرف اشارہ کیا تھا، مسٹر نورالحسن اپنی تقریروں اور بیانات میں بھی اس کا یقین دلاتے رہے مگر یہ سارے وعدے طاق نسیاں کے حوالے کر دیئے گئے، اور مسٹر چھاگلہ نے جو کار خیر شروع کیا تھا مسٹر نورالحسن نے اس کو تکمیل تک پہنچا دیا، اور مسلمانوں کی جھوٹی تسلی کے لئے اقلیتی کردار کے بجائے تاریخی کردار کی نئی اصطلاح وضع کی گئی ہے، اور اس کو باقی رکھنے کا وعدہ کیا گیا ہے، ان دونوں کے دقیق فرق کو حکومت ہی سمجھ سکتی ہے یونیورسٹی کے آئینی کردار کے علاوہ اور کونسا تاریخی کردار باقی رکھا گیا ہے، اس بل میں یہی ایک چیز ایسی ہے جس سے کسی حد تک یونیورسٹی کا پرانا کردار باقی رہنے کی امید ہے،

مسلمان اقتصادی اور تعلیمی دونوں حیثیتوں سے پچھڑے ہوئے ہیں، اس لئے تعلیمی سہولتوں کے مستحق ہیں، ان کو مسلم یونیورسٹی میں جو سہولتیں حاصل تھیں، اس بل نے اس کا دروازہ بند کر دیا، مسلمانوں کی اقتصادی اور تعلیمی پسماندگی کی وجہ سے دوسری یونیورسٹیوں میں حصول تعلیم میں ان کے لئے مختلف قسم کی دشواریاں ہیں،

مسلم یونیورسٹی میں ان کو ایسی سہولتیں حاصل تھیں کہ غریب اور معمولی ذہن کے طلبہ بھی تعلیم حاصل کر لیتے تھے، یونیورسٹی کا نظم و نسق مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا، ہر شعبہ میں اُن کی اکثریت تھی، اس بل میں اسکی کوئی ضمانت نہیں ہے، اس لئے رفتہ رفتہ ان کی تعداد اتنی گھٹ جائیگی کہ بالکل غیر مؤثر ہو جائیگی، اس میں اور دوسری یونیورسٹیوں میں کوئی فرق نہ رہجائیگا، اس طرح مسلمانوں پر تعلیم کا دروازہ تنگ ہو جائے گا،

اور یہ سب کچھ سیکولرزم قومی وحدت و یکجہتی اور قومی دھارے کے نام سے کیا جا رہا ہے، جو درحقیقت اس کے خلاف ہے، سیکولرزم اور قومی یکجہتی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ملک کے سارے باشندوں کو ایک رنگ میں رنگ دیا جائے، صحیح سیکولرزم اور جمہوریت یہ ہے کہ ہر اقلیت کو اسکی تہذیب و ثقافت کے مطابق نشو و نما اور ترقی کا موقع دیا جائے جس میں تعلیم بھی داخل ہے اسی لئے ہندوستان کے دستور میں اسکی ضمانت دیگئی ہے کسی سیکولر اور جمہوری حکومت خصوصاً ہندوستان جیسے برّاعظم کا حسن جو مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے یکرنگی میں نہیں، بلکہ رنگارنگی میں ہے، قانون کے ذریعہ یکرنگی اور یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش دستور کے بھی خلاف ہے، اور تاریخی حقائق کے بھی، چنانچہ کبیر اور اکبر کے زمانہ سے اس وقت تک اسکی جس قدر کوششیں ہوئیں سب ناکام رہیں اور آئندہ بھی ناکام رہیں گی، کوئی خوددار اقلیت بھی اپنی خصوصیات بدلنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی اور مسلمان تو ایک شاندار تہذیب اور درخشاں تاریخ کے مالک ہیں، مولانا ابوالکلام اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے قوم پرور اپنی تہذیبی روایات کا ایک جز بھی چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے جس پر اُن کی تقریریں شاہد ہیں، حکومت کے قومی وحدت و یکرنگی کے اس تصور اور جن سنگھ کے بھارتیہ کرن میں الفاظ کی خوبصورتی اور بھدے پن کے علاوہ اور فرق کیا ہے؟

اس سے انکار نہیں کہ قومی وحدت و یکجہتی قومی دھارے میں اقلیتوں کی شرکت خود ان کے اور ملک دونوں کے لئے مفید اور ضروری ہے مگر اسکی جو شکلیں اختیار کی جاتی ہیں اس سے وحدت کے بجائے اور انتشار پیدا ہوتا ہے یہ چیزیں قانون اور جبر کے ذریعہ نہیں، بلکہ باہمی اتحاد اور خیرسگالی سے پیدا ہوتی ہیں، جبر سے اور دوری ہوتی ہے اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دستوری تحفظات کے ساتھ مسلمانوں کو عمل سے بھی اس کا یقین دلایا جائے کہ وہ اس

ملک کے شہری اور ملکی حقوق میں برابر کے حصہ دار ہیں، بے بس اقلیت نہیں، مگر عمل یہ ہے کہ اردو زبان قریب قریب ختم کر دی گئی، اب اتر پردیش کی حکومت نے اس کی طرف کچھ توجہ کی ہے، مسلمانوں کا یہ بل لا بدلنے کی تمہید شروع ہو گئی ہے، مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار باقی رکھ کر حکومت مسلمانوں کا دل جیت سکتی تھی، مگر ان کے متفقہ مطالبہ کے باوجود اسکو مسخ کر دیا گیا، اس کا ان پر کیا اثر پڑیگا، وہ قومی دھارے سے قریب ہوں گے یا دور ہو جائیں گے، یہ ایسا زخم ہے جو مشکل سے مندمل ہو گا، اب بھی حکومت اس بل میں مناسب ترمیم کر کے اس کی تلافی کر سکتی ہے، یہ چیز نہ صرف مسلمانوں بلکہ ملک کے لئے ضروری ہے، ہندوستان میں دو سو کے قریب اور اس صوبہ میں سات آٹھ خالص سیکولر، قومی وحدت و یکرنگی کی معلم اور قومی دھارے کی ساگر یونیورسٹیاں ہیں اگر ایک مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو قائم رکھا جاتا تو ان چیزوں پر کیا اثر پڑتا، جب کہ مسلم یونیورسٹی بھی اس حیثیت سے قومی اور سیکولر ہے کہ اس کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں ہے ورنہ تنہا لفظ مسلم سے کیا حاصل، اس کو بھی نکال دینا چاہئے تاکہ وہ ہر حیثیت سے خالص سیکولر بن جائے،

مسلمانوں کے مسائل میں حکومت بڑی غلطی یہ کرتی ہے کہ ان کے اصلی نمایندوں کے بجائے ان لوگوں پر اعتماد کرتی ہے، جن کو مسلمانوں کے مفاد سے کوئی ہمدردی نہیں ان کا مقصد صرف ذاتی جاہ و اقتدار ہے اس لئے اس کو ان کی ترجمانی پر کوئی حق نہیں ہے، جب تک مولانا ابو الکلام، ڈاکٹر ذاکر حسین بلکہ ہمایوں کبیر تک حکومت کے مشیر کار رہے انھوں نے اس کو غلط قدم اٹھانے سے روک رکھا، ان کے بعد ان کے جانشین وہ لوگ ہوئے جو اپنی غرض کے بندے اور حکومت کے چشم و ابرو کے اشارے کے پابند ہیں، ان کو مسلمانوں کے مفاد سے کوئی تعلق نہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک مولانا ابو الکلام تھے جنھوں نے اس وقت مسلم یونیورسٹی کو بچایا، جب اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا، اور ایک ان کے جانشین ہیں جنھوں نے اس کا کردار مسخ کر کے دم لیا، مگر یہ فیصلہ مشکل ہے کہ حکومت ان کو اپنے اغراض کے لئے استعمال کرتی ہے یا وہ حکومت کو اپنے اغراض کے لئے،

مقالات

تہذیب کی تشکیل جدید

از جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۴)

مغربی تہذیب میں عورت ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہو

مغربی تہذیب میں مرد کی قوامیت (سربراہی) ختم ہوگئی ہے جس سے خاندان کی ترتیبی وحدت باقی نہ رہی اور عورت ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہوگئی، اس آزادی میں اپنی اصلاح سے زیادہ غالباً مرد سے انتقام کا جذبہ کارفرما ہے، اس لیے وہ ہر میدان میں مرد سے مقابلہ کر رہی ہے، حتی کہ بداخلاقی (جنسی آزادی) میں بھی اس نے مرد سے برابر حقوق حاصل کر لیے ہیں، اور اس کے پرسنل معاملات میں شوہر یا اور کسی کو مداخلت کا کوئی حق نہیں رہ گیا ہے، حتی کہ شادی بھی ایک بوجھ بن گئی، جس سے آزادی میں خلل اور مسرتوں کا خون ہوتا ہے،

اس تہذیب نے عورت کو مرد کے مقابل تو کھڑا کر دیا لیکن اس نے جو مقام چھوڑا اس کا کوئی "بدل" نہ فراہم کر سکی جس سے خاندان میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا جو دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے، اور سیکڑوں خرابیوں کا باعث بن رہا ہے [۱]

---

[۱] *Marrage and Morals. P. 65, 69, 91, By Bertrand Russell and The American way of life. P. 649, 654, By H. E Barnes and oran M. Ruedi*

مذہب و اخلاق کے غلط تصور نے ایک عرصہ تک عورت کو اس کے فطری حقوق سے محروم رکھا جس کا ردعمل مکمل آزادی و بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوا، جس سے مرد و عورت دونوں پریشان ہیں، لیکن بات اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ اس کو "ڈک" لگانے میں سب بے بس ہیں، اگر کوئی کچھ ہمت کرتا بھی ہے تو اس پر رجعت پسندی کا الزام لگتا ہے۔ جو اس دور کا سب سے بڑا جرم ہے۔

تشکیل جدید میں مرد کی قوامیت

تشکیل جدید میں مرد کی "قوامیت" برقرار ہے، اور عورت کو اس کے مقام پر رکھتے ہوئے اس کے دائرہ کار کا تعین کیا گیا ہے تاکہ اس دائرے میں رہ کر تہذیب و تمدن کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کرتی رہے، اس سلسلہ میں جن باتوں کی طرف توجہ کی گئی ہے، وہ یہ ہیں:۔

(۱) صنفی تعلق کی نوعیت، (۲) صنفی تعلق کی حفاظت، (۳) عورت کی جدوجہد کے حدود،

اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

صنفی تعلق کی نوعیت

(۱) **صنفی تعلق کی نوعیت**: مرد و عورت کے درمیان آسمانی میں فعل و انفعال اور جذب و انجذاب کی کیفیت پائی جاتی ہے:۔ قرآن حکیم نے اس کو انسانوں کے ساتھ خاص نہیں کیا، بلکہ ہر شئے کے لئے عام بتایا ہے،

ومن کل شیٔ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون[1]	اور ہر چیز میں ہم نے جوڑے پیدا کئے، تاکہ تم غور کرو،

دوسری جگہ ہے،

---

[1] الذاریات - ۲

سبحٰن الذی خلق الازواج	پاک ہے اس ذات کے لئے جس نے
کلہا مما تنبت الارض ومن	زمین کی پیداوار میں اور انسان
انفسہم ومما لا یعلمون[1]	میں اور ان تمام مخلوقات میں جن کا
	انسان کو علم نہیں جوڑے پیدا کئے

ایک اور جگہ ہے

جعل لکم من انفسکم ازواجا	اس نے تمہارے لئے تمہارے
من الانعام ازواجا[2]	ہی جنس سے جوڑے بنائے، اور
	جانوروں میں بھی جوڑے بنائے

اس کو معاہدہ (نکاح) کے ذریعہ مستحکم کیا جاتا ہے

اس کا مقصد خواہشاتِ نفسانی کی وقتی تسکین نہیں، بلکہ اس کو معاہدہ (نکاح) کے ذریعہ مستحکم بنیاد پر ساری زندگی کے لئے قائم کیا جاتا ہے، جس سے ایک دوسرے کی نمو ہو، اور اُن کے قیام وبقا میں مدد ملے، قرآن حکیم میں ہے،

فانکحوھن باذن اھلھن	ان عورتوں سے ان کے سرپرستوں
وآتوھن اجورھن	کی اجازت سے نکاح کرو، اور
بالمعروف محصنٰتٍ غیر	قاعدہ کے مطابق ان کا مہر ان
مسافحٰتٍ ولا متخذاتِ	کے حوالہ کرو، اس طرح کہ وہ
اخدان[3]	قید نکاح میں رہنے والی ہوں
	نہ وہ بدکار ہوں، اور نہ خفیہ آشنائی

نکاح کا مقصد

---

[1] القرآن یٰسین - ع - ۳ - [2] القرآن الشوریٰ - ع - ۲ [3] ایضاً النساء ع - ۴،

دوسری جگہ ہے:۔

هن لباس لکم وانتم لباس	وہ تمہارے لئے لباس ہیں، اور
لهن[۱]	تم اُن کے لئے لباس ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

الدنیا کلها متاعٌ وخیر متاع	پوری دنیا فائدہ اٹھانے کا سامان
الدنیا المرأة الصالحة[۵۲]،	ہے، اور بہترین سامان صالح بیوی ہے

ایک جگہ ہے،

من استطاع منکم الباءة	جو شخص نکاح کی طاقت رکھتا ہے
فلیتزوج فانه اغض للبصر	اس کو نکاح کر لینا چاہئے، کہ وہ
واحصن للفرج[۵۳]	آنکھ کو (بدنظری سے) بچانے والا
	اور فرج کی حفاظت کرنے والا ہے

اس سے انس و محبت اور ایثار و قربانی | اس سے انس و محبت اور ایک دوسرے کے لئے ایثار و
کا جذبہ ابھرتا ہے | قربانی کا جذبہ ابھرتا ہے، اور زندگی کی مشقتوں میں سکون
حاصل ہوتا ہے،

هو الذی خلقکم من نفسٍ	اللہ ہی نے تم کو ایک جان سے
واحدة وجعل منها	پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا
زوجها لیسکن الیها[۵۴]،	بنایا، تاکہ اس کے ذریعہ سکون
	حاصل ہو،

---

[۱] بقرہ ع ۲۳ - [۵۲] مشکوٰۃ کتاب النکاح الفصل الاول [۵۳] ایضاً ، [۵۴] القرآن الاعراف ع ۲۳

دوسری جگہ ہے:-

خَلَقَ لَکُم مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً[1]

اللہ نے تمھارے لئے خود تمھیں میں سے جوڑے بنائے تاکہ تم اُن کے پاس سکون حاصل کرو، اور اس نے تمھارے درمیان دوستی و رحمت رکھدی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لم تر للمتحابین مثل النکاح[2]

نکاح کے مثل دو محبت کرنے والے تم نے نہ دیکھے ہوں گے،

دوسری جگہ ہے،

ما استفاد المومن بعد تقوی اللہ خیرا لہ من زوجۃ صالحۃ ان امرھا اطاعتہ وان نظر الیھا سرتہ وان اقسم علیھا ابرتہ وان غاب عنھا نصحتہ فی نفسھا ومالہ[3]

اللہ سے تقوی کے بعد صالحہ بیوی سے بہتر اور کوئی شے قابل استفادہ مومن کے لئے نہیں ہے، اگر وہ اس کو حکم دے تو اس کی اطاعت کرے اگر اس کی طرف دیکھے تو خوش ہو اگر اس پر قسم کھا بیٹھے تو اس کو پوری کرے، اگر وہ موجود نہ ہو تو اپنے نفس اور اس کے مال میں خیر خواہی کرے،

---

[1] روم - ۳ [2] مشکوٰۃ کتاب النکاح فصل ثالث [3] ایضاً،

اس سے خاندانی تنظیم کی بنیاد پڑتی ہے	اس سے خاندانی تنظیم کی بنیاد پڑتی، اور آزادروی اور بے راہ روی سے حفاظت رہتی ہے، قرآن حکیم میں ہے،

وھو الذی خلق من الماء بشراً فجعلہ نسباً وصھراً[۱]

اللہ ہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کے لئے خاندان اور سسرال بنایا،

دوسری جگہ ہے،

نساءکم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم وقدموا لانفسکم[۲]

تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتی ہیں، اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو کاشت کرو اور اپنے مستقبل کا سروسامان کرو،

عورت کو کھیت سے تشبیہ دینے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ صنفی تعلق کا مقصد محض شہوت رانی نہیں، بلکہ بقاء نسل ہے، اور جس طرح کاشتکار کے ذمہ صرف تخم ریزی نہیں، بلکہ کھیت کی ہر متعلقہ ضرورت کی فراہمی اور ہر طرح کی حفاظت ونگرانی ہے اسی طرح عورت کی ذمہ داری مرد پر ہے،

خاندانی تنظیم کا سربراہ مرد ہوتا ہے	خاندانی تنظیم کا سربراہ فطری طور پر مرد ہوتا ہے، کیونکہ دونوں میں خلقی تفاوت کی وجہ سے مرد میں فعل و جذب اور عورت میں

انفعال و انجذاب کی کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے، نیز مرد پر گھر کی معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے، قرآن حکیم میں ہے،

---

[۱] القرآن، الفرقان۔ ع۔ ۵۔ [۲] القرآن۔ البقرہ۔ ع۔ ۲۸،

الرّجال قوامون علی النساء بما فضّل اللہ بعضھم علی بعض و بما انفقوا من اموالھم[1]

مرد عورتوں کے سربراہ ہیں، اس لئے کہ اللہ نے ان میں بعض کو بعض پر (خلقی ساخت و ذمہ داری میں) فضیلت دی، اور اس لئے کہ مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

الرّجل راعٍ علی اھلہ وھو مسئولٌ،[2]

مرد اپنے اہل وعیال کی مصلحتوں کا محافظ، اور اس میں وہ اللہ کے سامنے جوابدہ ہے،

اس سے عورت کے حقوق میں کوئی فرق نہیں پڑتا،	لیکن اس سے نہ عورت کے حقوق میں فرق پڑتا اور نہ اعمال وکردار کے ثمرات میں مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہوتی ہے،

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف،[3]

عورتوں کے لئے اسی طرح کے حقوق مردوں پر ہیں، جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں،

دوسری جگہ ہے،

للرجال نصیب مما اکتسبوا

مرد جیسا عمل کریں گے، ویسا پھل

---

[1] القرآن - النساء - ع - ۶ - [2] بخاری کتاب النکاح، باب قوا انفسکم واھلیکم نارًا [3] البقرہ - ع - ۲۸،

وللنساء نصیب مما اکتسبن[۱] | ان کو ملے گا، اور عورتیں جیسا عمل کریں گی، اس کا پھل اُن کو ملے گا،

(۲) صنفی تعلق کی حفاظت

صنفی تعلق کی حفاظت

دل کو پاک و خیالات صاف رکھنے کا حکم

ازدواجی زندگی میں اس تعلق کو محدود کرکے ہر قسم کی غلط خواہشات و شہوانی ہیجانات سے حتی الامکان دل کو پاک اور خیالات کو صاف رکھنے کا حکم دیا، اس کے لئے اللہ کے سامنے جواب دہی کے تصور کو ابھارا گیا جو عفت وعصمت کے لئے نہایت موثر ذریعہ ہے، قرآن حکیم میں ہے،

ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم به اللّٰہ[۲] | جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اسے ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو، ہر حال میں اللہ جاننے والا ہے وہ تم سے اس کا حساب لے گا،

قل ان تخفوا ما فی صدورکم او تبدوہ یعلمه اللّٰہ[۳] | آپ کہہ دیجئے تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے، تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، ہر حال میں اللہ اُسے خوب جانتا ہے،

بری نظر ڈالنے سے منع کیا ہے

غیر عورت پر بُری نظر ڈالنے سے منع کیا، جس سے جذبات میں ہیجان ہوتا ہے،

---

[۱] النساء ع۔۵۔ [۲] البقرہ ع ۴۰۔ [۳] آل عمران ع ۳،

قل للمومنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم ذٰلک ازکیٰ لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون و قل للمومنٰت یغضضن من ابصارھن و یحفظن فروجھن[1]

اے پیغمبر آپ مومن مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو (غیر عورتوں کے دیکھنے سے) باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے جو وہ کرتے ہیں، اللہ اس سے باخبر ہے۔ اے پیغمبر آپ مومنہ عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو (غیر مردوں کے دیکھنے سے) باز رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

جریر بن عبداللہ کہتے ہیں:-

سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن نظر الفجأۃ فامرنی ان اصرف بصری،

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اچانک نگاہ پڑ جانے کے بارے میں پوچھا، تو آپ نے حکم دیا کہ اپنی نگاہ پھیر لیا کرو۔

حضرت علیؓ نے فرمایا:-

یا علی لا تتبع النظرۃ النظرۃ فان

اے علی ایک نظر کے بعد دوسری نظر

---

[1] النور - ۷ - ۵۲ مسلم و مشکوٰۃ باب النظر الی المخطوبۃ الفصل الاول،

لک الاولیٰ و لیست لک الآخرۃ[۵۱] — مت ڈالو، پہلی میں کوئی حرج نہیں، لیکن دوسری میں حرج ہے؟

زبان اور آواز پر کنٹرول کا حکم — عورتوں کو زبان اور آواز پر کنٹرول کا حکم دیا، کہ اس سے بھی دوسروں کو ترغیب ہوتی ہے،

ان اتقیتن فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض و قلن قولاً معروفاً[۵۲] — اگر تم اللہ سے ڈرتی ہو تو نرم و دلکش لہجہ میں بات نہ کرو، کہ جس شخص کے دل میں بدنیتی کی بیماری ہو وہ تم سے امیدیں وابستہ کریگا اور جب بات کرو تو سادہ طریقہ سے بات کرو،

بے حیائی و بے شرمی کی بات کی ممانعت — بے حیائی و بے شرمی کی بات کرنے سے منع کیا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

انّ الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین آمنوا لھم عذاب الیم فی الدنیا والآخرۃ[۵۳] — بیشک جو لوگ مسلمانوں میں بیحیائی کی اشاعت چاہتے ہیں، اُن کے لئے دنیا و آخرت میں دردناک سزا ہے،

شوہر کے سامنے دوسری عورتوں کی بات کرنے سے منع کیا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

---

[۵۱] الفصل الثانی [۵۲] الاحزاب ۔ ع ۔ ۴، [۵۳] النور ۔ ع ۔ ۲،

ب اور باریک لباس اور ن کی نمائش کی ممانعت | حسن کی نمائش سے منع کیا کہ اس سے ہیجانی کیفیات پیدا ہوتی ہیں،

ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى[1] — حسن وزیبایش کی نمایش نہ کرو جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں عورتیں کرتی تھیں،

تنگ اور باریک لباس پہننے سے روکا کہ اس سے حسن وزیبایش کی نمائش ہوتی ہے،

وليضربن بخمرهن على جيوبهن[2] — اپنے سینوں پر اپنے دوپٹہ کے آنچل مارلیا کریں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

" جو عورتیں کپڑے پہن کر بھی عریانیت کا مظاہرہ اور اُس کے ذریعہ دوسروں کو اپنی طرف مائل کریں اور خود دوسروں کی طرف مائل ہوں، ا‌ور بختی اونٹ کی طرح ناز و انداز سے گردن ٹیڑھی کرکے چلیں تو وہ جنت میں ہرگز داخل نہ ہوں گی نہ اس کی خوشبو پائیں گی،[3]

خوشبو لگا کر باہر نکلنے کی ممانعت،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ايما امرأة استعطرت — جو عورت خوشبو لگا کر لوگوں کے

---

[1] الاحزاب ع-۴، [2] النور، ع- ۴ [3] مسلم باب النساء الکاسیات العاریات،

فمرت على قوم ليجدوا من ريحها فهي زانية[1] — پاس سے گذرے تاکہ وہ محفوظ ہوں، تو وہ (گویا) بداخلاقی کی طرف دعوت دینے والی ہے،

مرد اور عورت کے تنہائی میں ملنے کی ممانعت

عورت اور مرد کے تنہائی میں ملنے کی ممانعت کہ اس سے شیطان کو دراندازی کا موقع ملتا ہے،

لا تلجوا على المغيبات فان الشيطان يجري من احدكم مجرى الدم[2] — جن عورتوں کے محرم نہ ہوں تنہائی میں ان کے پاس نہ جاؤ کیونکہ شیطان انسان کے اندر خون کی طرح گردش کرتا ہے،

عورت کی جد وجہد کے حدود

(۳) عورت کی جد وجہد کے حدود،

عورت اگر آزاد اور ہر قسم (جائز و ناجائز) کی جد وجہد میں حصہ لینے کی مجاز ہوگی، تو اس کا اثر لازمی طور سے جنسی تعلق اور خانگی نظام پر پڑے گا، اس لئے جدید تشکیل میں جد وجہد میں شرکت کو دفعی ضرورت اور شوہر کی اجازت کے ساتھ محدود کیا گیا ہے،

برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) نے مغربی تہذیب میں سماجی خرابیوں کے دو بنیادی سبب بیان کئے ہیں،

(۱) عورت کی آزادی اور (۲) مانع حمل آلات کی ایجاد،[3]

لیکن اصل بنیادی سبب سماجی کنٹرول کا خاتمہ ہے، جس نے بہت سے ضمنی اسباب پیدا کر دئے ہیں، سماجی کنٹرول ایک ایسی قوت ہے جو فرد کے خیال و عمل پر حاوی

---

[1] نسائی وابوداؤد [2] مسلم کتاب اللباس والزینۃ [3] Marriage and morals. P. 65

رہتی ہے، اس قوت کو حاصل کرنے کے لئے مختلف ذرائع سے کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ ہو سکی،

سماجی کنٹرول کا سب سے مؤثر ذریعہ مذہب | مذہب اس کا موثر ترین ذریعہ ہے جس سے تشکیل میں کام لیا گیا ہے اس کی شکلیں حسب ذیل ہیں،

۱۔ مذہب کے صحیح استعمال سے اللہ کا خوف اور اس کے سامنے [illegible] ابھرتا ہے، جو انسان کے خیال و عمل پر حاوی رہتا ہے،

۲۔ خیالات، احساسات اور جذبات پر کنٹرول قائم ہوتا ہے [illegible] ان میں توازن اور دوسری طرف سماج میں اتحاد کی فضا پیدا ہوتی ہے،

۳۔ روح کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا اور اندرونی و بیرونی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے،

۴۔ جنسی اخلاق و سماجی کردار کا معیار مقرر ہوتا، اور انسانی تعلقات پر نگرانی قائم ہوتی ہے،

۵۔ اعلیٰ اصولوں کے ذریعہ سماج کی برائیوں اور بیماریوں پر قابو پایا جاتا، غیر سماجی عناصر کے غلبہ سے حفاظت ہوتی ہے۔

مذہب کا یہ کردار تاریخ کے ہر دور میں مسلم رہا ہے جس سے ماہرین سماجیات کو بھی اتفاق ہے[1] خود برٹرنڈ رسل نے اس کا اعتراف کیا ہے،

"ناجائز [illegible] اور جہنم کا خوف یہ دو محرکات تھے جن سے ماضی میں عورت کی عفت و عصمت کی ضمانت تھی، اب مذہبی اثر کے زوال اور مانع حمل آلات کی ایجادات سے دونوں رکاوٹیں ختم ہو گئیں[2]"

---

[1] معاصر الدین سماجیات مذہب کے عوامل، [2] Marriage and morals, P.69

عورت کے میدانِ عمل میں حالات کے لحاظ سے اختلاف ممکن ہے	عورت کس کام میں حصہ لے سکتی، اور کس کام میں نہیں لے سکتی، اس کا تعلق شوہر کی اجازت اور قوم و ملت کی واقعی ضرورت

سے ہے، جس میں حالات کے لحاظ سے اختلاف ممکن ہے، البتہ کام کے انتخاب میں دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے

۱۔ عورت کی حیثیت اور خاندانی نظام میں خلل نہ واقع ہو،

۲۔ ان کے متعلقہ قوانین پر عمل درآمد برقرار رہے،

ان احتیاطی تدبیروں پر عمل کے ساتھ کسی کام میں حصہ لینے اور باہر نکلنے کے لئے چہرہ ہاتھ اور قدم کی پردہ پوشی ضروری نہیں ہے قرآن حکیم میں ہے،

ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا	اور عورتیں اپنی زینت نہ دکھلائیں مگر وہ جو اس میں سے کھلی چیز ہے

الا ما ظھر منھا کی تفسیر میں مختلف قول ہیں لیکن درج ذیل روایت کی بنا پر مذکورہ تفسیر کو ترجیح دی جاتی ہے،

حضرت عائشہ کہتی ہیں،

ان اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنھما دخلت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیھا ثیاب رقاق فاعرض عنھا رسول اللہ	ایک مرتبہ ابو بکر کی بیٹی اسماء باریک کپڑے پہنے ہوئے رسول اللہؐ کے پاس آئیں آپ نے ان سے منہ پھیر کر فرمایا کہ عورت جب بالغ ہو جائے تو ہاتھ اور چہرہ کے

فقال لہا یا اسماء ان المرأۃ	علاوہ اور کسی حصہ جسم کا کھولنا
اذا بلغت المحیض لم یصلح	درست نہیں ہے،
ان یری منہا الا ھذا	
واشار الی وجہہ وکفیہ[۱]	

قدم کا معاملہ چہرہ اور ہاتھ کے مقابلہ میں کم اہم ہے، غالباً اسی بنا پر علٰحدہ ذکر کی ضرورت نہ ہوئی لیکن اگر معاشرہ فاسد ہو اور باہر نکلنے میں عزت و ناموس پر حملہ کا اندیشہ ہو، تو حالات کے لحاظ سے مزید احتیاط اور پابندی کی ضرورت ہے، جس کا ثبوت قرآن مجید کی اس آیت سے ملتا ہے،

یا ایہا النبی قل لازواجک	اے نبی آپ اپنی بیویوں بیٹیوں
وبنٰتک ونساء المومنین	اور مومنہ عورتوں سے کہہ دیجئے کہ
یدنین علیہن من جلابیبہن	اپنے اوپر چادر کا کچھ حصہ ڈال
ذالک ادنیٰ ان یعرفن فلا	لیا کریں، یہ اس بات سے زیادہ
یوذین[۲]،	قریب ہے کہ پہچانی جائیں تو ستائی
	نہ جائیں،

"ذالک ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین" سے حالات کی رعایت کا ثبوت ملتا ہے، بعض روایتوں سے عہد رسالت سے پہلے اور بعد کے معاشرہ میں چہرہ کے حجاب کا رواج معلوم ہوتا ہے جس سے اس کی اولیت ثابت ہوتی ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے مزید تحقیق کے لئے المنار (رشید رضا مصری) جلد ۱۰ جزء ۱۱، اور جلد ۱۲ جز و ۹، ۱۰ و ۱۱

---

[۱] ابوداؤد [۲] احزاب - ۸،

نیز حجاب المرأۃ المسلمۃ فی الکتاب والسنۃ (محمد ناصر الدین البانی) مطبوعہ قاہرہ و بیروت کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

معاشرتی نظام

مغربی تہذیب میں معاشرہ — معاشرتی زندگی کی بنیاد خاندانی تنظیم ہے، اس کی جو شکل ہو گی، اسی کی مناسبت سے معاشرتی نظام قائم ہوگا، مغربی تہذیب میں خاندانی نظام کی تباہی نئے نئے فلسفوں کی ایجاد اور حصول دولت کی حرص نے معاشرہ کی تنظیم بنیاد نہ فراہم ہونے دی جب سے زندگی میکانکی بن کر رہ گئی ہر شخص اپنے کو تنہا اور دوسروں کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ اور لکھ پتی باپ کی بیٹی بھی معاش کے لئے معمولی ملازمت پر مجبور ہوگئی، اور باپ اس کی کفالت سے سبکدوش ہو گیا،

تشکیل جدید میں معاشرہ — تشکیلِ جدید میں معاشرہ کی بنیاد خاندانی تنظیم ہے، اور جس طرح اس چھوٹی اکائی (Unit) میں انس و محبت کے ساتھ حقوق و فرائض کا نظم ہے، اسی طرح بڑی اکائی (معاشرہ) میں بھی ایک نظم ہے جس کا ہر فرد اللہ کے خاندان سے تعلق رکھتا، اور ہر ایک دوسرے کا بھائی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ[1]

مخلوق اللہ کا خاندان ہے، اللہ کو زیادہ محبوب وہ ہے جس کا سلوک اسکے خاندان کے ساتھ اچھا ہے

دوسری جگہ ہے:-

---

[1] بیہقی فی شعب الایمان و مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق الفصل الثالث۔

الناس کلھم اخوۃ[1]، تمام لوگ بھائی بھائی ہیں،

معاشرتی نظم کو سمجھنے کے لئے تین چیزوں سے واقفیت ضروری ہے،

(۱) خاندان کی نوعیت (۲) زندگی کی حیثیت، اور (۳) اُس کے فرائض۔

ہر ایک کی تفصیل درج ذیل ہے،

خاندان کی نوعیت

(۱) خاندان کی نوعیت

(ا) اللہ نے سب کو ایک ماں باپ سے پیدا کیا،

یاایھا النّاس انا خلقنکم من ذکر وانثیٰ[2] اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا،

رسول اللہؐ نے فرمایا،

الناس بنو آدم وآدم خلق من تراب[3]، سب لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں،

(ب) پیدائش کے لحاظ سے تمام انسان پاک اور بے گناہ ہیں،

فطرۃ اللّٰہ التی فطر النّاس جمیعا[4] اللہ کی وہ فطرت جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا،

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے،

کل مولود یولد علی فطرۃ[5]، ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے،

فطرت سے مراد وہ نیچرل کانسٹی ٹیوشن ہے، جس پر بچہ ماں کے پیٹ میں بنایا جاتا ہے[6]

---

[1] مسلم ابوداؤد [2] الحجرات ع ۲۔ [3] طبری [4] الروم ع ۔۲ [5] بخاری ومشکوٰۃ کتاب القدر

[6] Arabic. English lexican. Boo-1-part-6 By Edward william lane

اس مرحلہ میں ہر انسان پاک اور بے گناہ ہوتا ہے،

(ج) تمام انسان دوسری مخلوقات سے بلند و برتر ہیں،

ولقد کرمنا بنی آدم[1]	ہم نے انسان کو معزز بنایا،

دوسری جگہ ہے،

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم[2]	ہم نے انسان کو بہتر ساخت میں پیدا کیا،

ایک حدیث قدسی میں ہے،

لا اجعل من خلقته بیدی ونفخت فیه من روحی کمن قلت له کن فکان[3]	جس مخلوق (انسان) کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اور اس میں اپنی روح پھونکی، اس کو ان مخلوقات کے برابر نہ کروں گا جن کے لیے میں نے لفظ "کن" کہا اور وہ وجود میں آگئے،

(د) تمام انسان اللہ کی آواز (وحی) کے مخاطب رہے ہیں،

لکل قوم ھاد[4]	ہر قوم کے پاس ہدایت کرنے والا آیا ہے،
وان من امة الا خلا فیھا نذیر[5]	کوئی امت ایسی نہیں ہے کہ جس کے پاس اللہ کی طرف سے ڈرانے والا نہ آیا ہو،

---

[1] بنی اسرائیل۔ [2] التین ع ۱۔ [3] مشکوٰۃ باب بدء الخلق [4] الرعد ۱ [5] فاطر ع ۳،

(۳) اللہ نے سب کے لئے یکساں مواقع فراہم کئے ہیں، اس میں کسی کی تخصیص و تفریق نہیں کی ہے،

ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا، (فاطر ۳)	جو کچھ زمین میں ہے وہ اللہ نے تم سب کے نفع کے لئے پیدا کیا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لیس لابن آدم حق فی سوی هذه الخصال بیت یسکنه وثوب یواری به عورته وجلف الخبز والماء (ترمذی)	تین چیزوں کے علاوہ اور کسی میں انسان کا کوئی حق نہیں، (۱) اپنے کے لئے گھر، (۲) تن ڈھکنے کے لئے کپڑا، اور (۳) پانی اور روٹی کا

ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت پر ایک نظر

از

جناب مولانا عبدالجبار صاحب استاد مفتاح العلوم مئو

معارف مجریہ ستمبر ۱۹۷۱ء میں جناب ڈاکٹر حامد علی صاحب لکچرار عربی ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، اس کا عنوان ہے "ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت"۔ فاضل مضمون نگار نے ہندوستان کی عربی شاعری میں دو قسم کی خامیوں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ ان کی شاعری فارسی محاورات سے متاثر ہے، دوسرے ان کے کلام میں کچھ عربی قواعد کی غلطیاں ہیں"۔

پہلی قسم کی خامی پر جو اجمالی اور مختصر حقیقت پر مبنی اظہار خیال محترم مدیر معارف جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے کیا ہے، اس کے بعد کوئی ضرورت نہیں ہے کہ مضمون کے اس پہلو پر کوئی بحث کی جائے۔

البتہ دوسری قسم کی خامی یعنی عربی قواعد کی غلطیوں اور عربی کلمات و محاورات کے بے موقع استعمال پر مدیر محترم نے تعرض نہیں کیا۔ اس سے انکار نہیں کہ اس قسم کی خامیاں ہندوستانی شعراء کے کلام میں ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب ان کے کلام پر اس پہلو سے بحث میں عربی قواعد کی ایسی خلاف ورزیاں بھی بیان کر گئے جن کی کتب لغت ونحو سے

تائید نہیں ہوتی، اور چند خالص عربی محاورات کو جنھیں عرب شعرا نے اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے، یا عربی لغت میں مذکور ہیں، فارسی محاورات میں داخل کر دیا ہے اس پر تبصرہ کرنا مقصود ہے۔ اب ان کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

یدعوا البرایا مد ظل محمد — وعلاہ تعدم مثل ظل محمد
(امیر خسرو)

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں اس شعر میں امیر خسرو نے اگرچہ ذو معنی لفظ محمد کا استعمال کر کے فن بدیع کی صنعت دکھائی ہے، مگر "مد ظل محمد" فارسی محاورہ ہے، عربی میں سایہ کی درازی کے لیے ظل بمعنی صار ذا ظل رائج ہے۔ فارسی دانوں نے ہی مد الظل، مد ظلکم، دام الظل دام ظلکم، دامت اظلالکم وغیرہ کو عربی مرکبات بنا کر استعمال کیا ہے۔

اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ الظل کے ساتھ مد یا دام کا استعمال فارسی محاورہ ہے یا خانہ ساز عربی ہے، شعر میں مد ظل محمد کے بجائے اگر ظل محمد ہوتا تو عربی محاورہ کے مطابق ہوتا حالانکہ یہ دونوں محاورے قرآن کریم میں موجود ہیں۔ ایک آیت میں "کیف مد الظل"[1] اور دوسری میں ظل ممدود[2] ہے، تیسری میں اکلہا دائم وظلہا[3] یہ مثالیں انکے عربی ہونے کی شاہد ہیں۔

حتی علا فوق السماء سریرہ — ورؤسھم غابت بہ تحت الثری

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں، پہلے مصرعے میں فارسی خیال ہے، دوسرے میں رؤس کے ساتھ غابت کا استعمال عربی لغت کے مطابق نہیں ہے، مگر عرب شعرا بھی جب اپنے ممدوح کی رفعت شان اور ان کے رتبہ اور مقام کی برتری بیان کرتے ہیں، تو آسمان سے کم بات نہیں کرتے، اور ممدوح کو یا اس سے نسبت رکھنے والی چیزوں، سما، بدر، نجم، کواکب اور ثریا یا اس سے اوپر تک پہنچا دیتے ہیں، مثال کے طور پر چند اشعار عرب شعرا کے

---

[1] سورہ فرقان [2] سورہ واقعہ [3] سورہ رعد

ملاحظہ ہوں :

(۱) لنا جبل یحتلہ من نجیرہ منیف یرد الطرف وھو کلیل
رسا اصلہ تحت الثری وسما بہ الی النجم فرع لاینال طویل
(سموأل بن عادیا)

ہمارے قبضہ میں ایسا اونچا قلعہ ہے کہ آنکھیں اس کو دیکھنے سے پتھرا جاتی ہیں، اس پر رسائی اس کی ہوگی جو ہمارے زیر پناہ ہو، قلعہ کی بنیاد تحت الثریٰ میں راسخ ہے اور اس کی چوٹی ثریا تک پہنچنے سے دسترس سے باہر ہے،

(۲) وماسلمت فوقک للثریا ولاسلمت فوقک للسماء
(متنبی)

(اے ممدوح) تیری بلندی نہ میں ثریا کے لیے مانتا ہوں نہ آسمان کے لیے ۔

(۳) فبایما قدم سعیت الی العلی ادم الھلال لاخمصیک حذاء
(ایضاً)

کیسا تیرا قدم تھا کہ اتنے اونچے رتبے پر پہنچ گیا، تیرے پاؤں کے لیے چاند کی ادھوڑی جوتا ہونا چاہیے

وقد کان ید نی مجلسی فی سمائہ احادث فیھا بدرھا والکواکبا
(ایضاً)

(ممدوح) کی مجلس آسمان تھی مجھے اس میں قریب جگہ دیتے تھے میں اس آسمان کے چاند تاروں سے بات کرتا تھا

یہ فیصلہ بھی کہ رؤس کے ساتھ غابت کا استعمال عربی لغت کے مطابق نہیں ہے، صحیح نہیں ہے، اقرب الموارد میں ہے، غاب الشمس وغیرھا من النجوم غیابا وغیبوبۃ غربت واستقرت عن العین، وغیبوبۃ والشیٔ فی الشی غیابۃ وغیابا بطن فیہ واستتر اگر بالفرض اس سے غابت الرؤس کا استعمال عربی لغت کے مطابق ثابت نہ بھی ہو تب بھی ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد کہ عربی میں ایسے موقع پر باب مفاعلت واری یواری مواراۃ کا استعمال کیا جاتا ہے، قطعاً عربی لغت ومحاورہ کے مطابق نہیں ہے، کیونکہ غابت لازم ہے جس کا

ترجمہ "غائب ہوگئے" ہوگا اور کیا گیا بھی ہے، اور واری یواری مواراۃ باب مفاعلہ سے عربی لغت میں متعدی مستعمل ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے، اعجزت ان اکون مثل ھذا الغراب فاواری سوءۃ اخی۔ ما ووری عنھما کسی فعل کا مجہول ہونا اس کے متعدی ہونیکی دلیل ہے، لہذا اگر اس موقع پر غابت کے بجائے وارت باب مفاعلۃ استعمال کیا جائے تو اس کا ترجمہ "غائب کر دیا یا چھپا دیا" ہوگا جو اس موقع پر یقیناً صحیح نہیں ہے، صحیح محاورہ توارت باب تفاعل سے ہے، جو لازم ہے، اور اس باب سے قرآن کریم میں بھی لازم آیا ہے، یتواری من القوم من سوء ما بشر بہ۔ حتی توارت بالحجاب اگر ڈاکٹر صاحب کو اپنی تحقیق پر اصرار ہے تو کتب لغت یا کلام عرب سے واری یواری باب مفاعلہ کا لازم استعمال پیش فرمائیں، ؎

ثم اغتنم فرصۃ من قبل ان ضعفت قوالک من سطوۃ الامراض والعلل

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "من قبل ان ضعفت" میں ان مصدریہ کے بعد فعل مضارع کی جگہ فعل ماضی لایا گیا ہے جو عربی قواعد کی صریح خلاف ورزی ہے، مگر اس کی کوئی سند انھوں نے نہیں پیش کی ہے کہ ان مصدریہ کے بعد فعل ماضی لانا عربی قواعد کے خلاف ہے، عربی قواعد کی مشہور اور مسلم کتاب کافیہ ہے، اس میں حروف مصدریہ تین بتائے گئے ہیں، ما۔ ان۔ ان، ان میں سے کسی کی مثال خود متن کافیہ میں نہیں ہے، البتہ شارح کافیہ ملا جامی نے اس کی مثالیں دی ہیں، اَن کی مثال نحو قولک اعجبنی ان خرجت ای خروجک

مولانا عبدالحق خیرآبادی شرح کافیہ مسمی بہ تسہیل الکافیہ میں فرماتے ہیں و ثانیھا ان المصدریۃ نحو اعجبنی ان ضربت زیداً ای ضربک زیداً، اسی طرح عربیت کے امام علامہ زمخشری

نے اِن مصدریہ کی نسبت اپنی کتاب مفصل میں "من اصناف الحروف حروف الاستقبال"
کے تحت لکھتے ہیں وان تدخل علی المضارع والماضی فیکونان معہ فی تاویل
المصدر واذا دخل علی المضارع لم یکن الا مستقبلا" اور "من اصناف الحروف
الحرفان المصدریان" کے تحت تحریر فرماتے ہیں۔ نقول بلغنی ان جاء عمرو وان
ان تفعل وانہ اھل ان یفعل ای اھل الفعل۔ وقال اللہ تعالیٰ فما کان
جواب قومہ الا ان قالوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان مصدریہ کے بعد ماضی اور
مضارع دونوں آتا ہے۔ عربی زبان کی مشہور و مستند اور مبسوط لغت لسان العرب
میں بھی اس کی تشریح ہے کہ ان مصدریہ کے بعد فعل مضارع اور فعل ماضی دونوں عربی
زبان میں مستعمل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔ وان قد تکون مع الفعل المستقبل فی معنی مصدری
فتنصبہ تقول ارید ان تقوم والمعنی ارید قیامک فان دخل علی فعل ماضی
کانت معہ بمعنی مصدر قد وقع الا انہا لا تعمل تقول اعجبنی ان قمت
والمعنی اعجبنی قیامک الذی مضی وان قد تکون مخففۃ من المثقلۃ فلا تعمل۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "اور تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ
یہاں ان نہ مخففہ ہو سکتا ہے نہ حرف تفسیر، البتہ ان زائدہ قرار دیا جا سکتا ہے، اہل عرب
نے حروف زوائد میں ان کو بھی بتایا ہے"۔

بیشک اہل عرب نے حروف زوائد میں اَن کو بھی بتایا ہے، مگر علماے عربیت نے ان
مقامات کو بھی بتایا ہے جہاں اَن زائدہ آتا ہے جس طرح انھوں نے ان مصدریہ
مخففہ اور ان حروف تفسیر کے مقامات کی نشاندہی بوضاحت کی ہے، چنانچہ
ڈاکٹر صاحب نے علماے عربیت کے بیان کردہ قواعد کی روشنی میں فرمایا ہے کہ یہاں

اَن نہ مخففہ ہو سکتا ہے اور نہ حرفِ تفسیر لہٰذا اس کو اَن زائدہ قرار دینے کے لیے بھی ان قواعد کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوگا، اور معلوم کرنا ہوگا کہ یہ مقام بھی ان مقامات میں سے ہے جہاں اہلِ عرب نے ان کو زائدہ قرار دیا ہے، ان مقامات کو معلوم کرنے کے لیے اقرب الموارد کی عبارت نقل کرتا ہوں :۔

الوجه الرابع ان تكون زائدة للتوكيد وذلك بعد لمّا التوقيتية وهو الاكثر نحو ولما ان جائت رسلنا لوطا سيئ بهم۔ وبين لو وفعل القسم مذكوراً كقوله :

فاقسم ان لو التقينا وانتم لكان لكم يوم من الشر مظلم

او متروكاً كقوله اما والله ان لو كنت حيا وبين الكاف ومخفوضها كقوله كان ظبية تعطوا الى وارق السلم وهو نادر وبعد اذا كقوله فامهله حتى اذا ان كانه۔ جب عربی قواعد کی رو سے اَن زائدہ ہونے کی یہی پانچ صورتیں ہیں اور شعرِ مذکور میں اَن نہ لمّا کے بعد واقع ہوا ہے نہ قسم اور لو کے درمیان، نہ کاف اور اس کے مجرور کے درمیان نہ اذا کے بعد تو اس کو اَن زائدہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، نیز اگر اَن کو یہاں زائدہ قرار دیا جائے تو قبل مضاف اور مضاف الیہ ضعفت فعل ماضی ہوگا اور کوئی بھی فعل فعل ہوتا ہوا مضاف الیہ نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ اضافت اسم کے خواص سے ہے، ہاں فعل جب کسی حرف مصدری کے ذریعہ خواہ لفظاً ہو یا تقدیراً بتاویل مصدر اسم قرار دیا جائے گا تو مضاف الیہ واقع ہوگا،

کلامِ عرب میں جس جگہ کوئی فعل مضاف الیہ واقع ہوا ہے وہ بتاویل مصدر ہے، چنانچہ ملا جامی فرماتے ہیں: " المضاف اليه كل اسم حقيقة او حكما ليشمل الجمل التى يضاف اليها نحو يوم ينفع الصادقين صدقهم فانها فى حكم المصادر۔

یعنی مضاف الیہ اسم ہی ہوگا خواہ وہ حقیقت میں اسم ہو یا اسم کے حکم میں ہو، اس تعمیم سے وہ جملے بھی اسم قرار دیے جائیں گے جو مضاف الیہ واقع ہوتے ہیں، جیسے یوم ینفع الصادقین صدقہم، اس لیے کہ اس طرح کے جملے مصدر کے حکم میں ہیں، پس اگر اَن ضعفت میں اَن کو مصدریہ قرار دیا جائے اور اَن ضعفت بتاویل مصدر ہوکر مضاف الیہ ہو جائے تو قواعد عربی کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی، اور اگر اَن کو زائدہ قرار دیا جائے جو ڈاکٹر صاحب کی تجویز ہے ضعفت فعل ماضی کو مضاف الیہ بنانا پڑے گا جو عربی قواعد کی مذکورۂ بالا تصریحات کے بالکل خلاف ہے، یا یہ کہیے کہ ان موجودہ زائد ہے، اور ضعفت ان مقدرہ سے بتاویل مصدر ہوکر مضاف الیہ قرار دیا جائے گا، مگر یہ کلام کی کتنی بھونڈی توجیہ ہوگی،

لاتغترر بزمان کان شیمتہ ان غرّ غرّا لبعض منہ منتقل

اس شعر پر بحیثیت عربی یہ اعتراض ہے کہ دوسرے مصرعہ میں جن الفاظ وتراکیب سے مفہوم ادا کیا گیا ہے وہ محاورۂ عرب کے خلاف ہے، ڈاکٹر صاحب نے اپنے خاص ذوق عربیت کی بنا پر مصرعۂ ثانیہ کے الفاظ وتراکیب کو محاورۂ عرب کے خلاف قرار دیا ہے، کاش وہ الفاظ وتراکیب پر تفصیلی بحث کرکے ان کا محاورۂ عرب کے خلاف ہونا بیان کرتے تو دوسروں کو بھی اس کے سمجھنے اور اس میں غور وفکر کی گنجایش نکلتی، اگر ڈاکٹر صاحب کی یہ مراد ہو کہ یہاں بھی اَن مصدریہ کے بعد فعل مضارع کی جگہ فعل ماضی لایا گیا ہے تو اس پر بحث گذر چکی ہے کہ اَن مصدریہ کے بعد فعل ماضی لانا عربی قواعد کے خلاف نہیں ہے،

لہ المکارم ابقی من نجوم دجی لہ العزائم امضی من قنا البطل

اس شعر کی عربیت پر کلام کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "عربی میں رمح

اور قناۃ کی صفت ذبول ہے، اور ذابلہ کی جمع ذوابل۔ رماح (تیروں) کے لیے صفت غالبہ کی طرح مستعمل ہے، اس لیے قنا کی اضافت بطل کی۔۔۔۔طرف عربی زبان کے خلاف ہے، غالباً بطل کا استعمال ضرورت قافیہ کے تحت کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب تو دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ قنا کی اضافت بطل کی طرف عربی زبان کے خلاف ہے، اور اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ عربی میں رمح اور قناۃ کی صفت ذبول آتی ہے، ایسی بے ربط بات ڈاکٹر صاحب جیسے فاضل سے مستبعد معلوم ہوتی ہے، وہ خود ہی غور فرمائیں کہ اگر ذبول عربی میں رمح و قناۃ کی صفت آئی ہے تو یہ عربی زبان میں اضافت قنا الی البطل کے ممنوع ہونے کی دلیل کیسے ہوگی۔

کسی مدعا کے اثبات کے لیے ضروری ہے کہ دلیل مدعا کی مثبت ہو، یہاں مدعا میں اضافت قنا کے ابطال کا مسئلہ ہے، اور دلیل میں صفت رمح و قنا کا اثبات ہے۔

مضمون کے لحاظ سے بہادر کا نیزہ کہنے میں کوئی خرابی معلوم نہیں ہوتی، بلکہ مضاف اور مضاف الیہ میں غایت مناسبت ہے، جیسا کہ مصنف کا قلم کہتے ہیں،

لولا سھول جمالکم فی ذاتی
ماکنت ارضی ساعۃ بحیاتی

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں: "عربی میں "جمال" اور "ذات" کا استعمال ایک ساتھ نہیں ہوتا، یہ کلام محتاج تشریح ہے، اگر اس سے مراد یہ ہے کہ عربی میں ذات کا جمال نہیں بولا جاتا، تو شاعر نے ذات کا جمال نہیں کہا ہے، بلکہ شعر میں جمال کی اضافت ضمیر مخاطب "کم" کی طرف ہے، ذات اس کا ظرف اور مظہر و مرکز ہے، پھر فرماتے ہیں "نیز ذات کے ساتھ جمال کا استعمال بمعنی خوبصورتی درست نہیں، عربی

میں ایسے موقع پر "حسن" استعمال ہوتا ہے"، مگر انھوں نے اس کی کوئی مثال نہیں پیش کی تاہم اس سے اتنا معلوم ہوگیا کہ ان کے نزدیک اگر شعر میں جمالکم کے بجائے حسنکم لایا گیا ہوتا تو عربی محاورہ کے موافق ہوتا، جمال کا استعمال جن مختلف قسم کی خوبصورتیوں پر عربی میں ہوا ہے، اس کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں: (۱) شکل وصورت کی خوبصورتی کے لیے، جیسے حدیث شریف میں ہے

تنکح المرأۃ لمالھا وجمالھا — عورت سے شادی اس کی مالداری کی وجہ سے کیجاتی ہے اور خوبصورتی کی وجہ سے

(۲) لباس وہیئت کی خوبصورتی، (۳) خاندانی شرف (۴) اخلاق وکردار کی عمدگی۔ عمرو بن معدیکرب کا شعر ہے ؎

لیس الجمال بمیزر ۔۔۔ فاعلم وان ردیت بردا
ان الجمال معادن ۔۔۔ ومناقب اورثن مجدا

لباس کی خوبصورتی جمال نہیں ہے۔ گرچہ کتنا ہی عمدہ لباس زیب تن کر لو۔ یہ بات خوب سمجھ لو۔ تمھارا خاندان اچھا ہو اور تمھارے اندر شریفانہ اخلاق ہوں تو البتہ یہ جمال ہے۔

(۵) صبر کی خوبصورتی، فصبر جمیل: پس مجھے صبر کرنا ہے، اور عمدہ قسم کا۔

(۶) معشوق کے وعدہ خلافی کی خوشنمائی، متنبی کہتا ہے ؎

تفرد فی الاحکام فی اھلہ الھوی ۔۔۔ فانت جمیل الخلف مستحسن الکذب

یعنی عشق کا حکم عاشقوں پر دنیا سے نرالا ہے، اسی وجہ سے عاشق کو تمھاری وعدہ خلافی اچھی لگتی ہے، اور جھوٹ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

(۷) دولت کی شان وشوکت، قرآن کریم میں مویشیوں کے منافع بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا

ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون — یعنی مویشیوں کو جب شام کو چرا کر واپس لاتے ہو اور جب چرانے لیجاتے ہو تو تمھاری دولتمندی کی شان وشوکت نمایاں ہوتی ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں، عربی لغت میں لفظ "ذات" کے معنی "والی" اور "صاحب" کے ہیں، جیسا کہ قرآن میں ذات الجنب اور ذات الشمال مذکور ہے، بیشک ذات الشمال کا استعمال قرآن مجید میں ہے، مگر ذات الجنب باوجود تلاش کے مجھے قرآن مجید میں نہ ملا، رہا یہ مسئلہ کہ لفظ ذات بمعنی حقیقت فارسی ہے، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے حقیقت کے خلاف ہے، عربی لغت کی کتابوں میں ذات کے معنی حقیقت بھی بیان کیے گئے ہیں، لسان العرب میں ہے: وقال ابو اسحٰق معنی ذات بینکم حقیقۃ وصلکم .... قال ابن الانباری فی قولہ عزوجل انہ علیم بذات الصدور، معناہ بحقیقۃ القلوب من المضمرات، قاموس میں ہے: ذو معناہ صاحب صیغت لیتوصل بھا الی الوصف بالاجناس۔ ج ذوون، وھی ذات وھما ذاتان۔ ج ذوات وذات بینکم حقیقۃ وصلکم او ذات البین الحال التی بھا یجتمع المسلمون۔ السراج المنیر میں جو اقرب الموارد کے ماخذ میں سے ہے، تصریح ہے کہ وقد یجعل اسما مستقلا فیعبر بھا عن الاجسام فیقال ذات الشی بمعنی حقیقۃ وماھیتہ پھر اس قول کی پرزور تردید کی ہے کہ ذات بمعنی حقیقت عرب کے کلام قدیم میں استعمال نہیں ہوا ہے، اور دلائل کے ساتھ صحیح قول پیش کرنے کے بعد لکھا ہے واذا نقل ھذا

فالکلمة عربية ولا التفات الى من انكر کونها من العربية فانها فی القرآن وهو افصح کلام العرب۔ یعنی منقولہ دلائل سے ثابت ہو گیا کہ ذات بمعنی حقیقت عربی کلمہ ہے اور جو اس کے عربی ہونے کا انکار کرے، اس کی بات قابلِ التفات نہیں ہے، کیونکہ اس معنی میں قرآن کریم میں آیا ہے، اور قرآن عرب کا سب سے فصیح کلام ہے،

ندا لك اكثر لا ينتهى ابداً لكن ادناه اندى من ندى السيل

ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں اس شعر میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی خامی ہے، لفظی یہ ہے کہ اس میں 'ندی السیل' استعمال کیا گیا ہے، جو عرب کا محاورہ نہیں ہے، اور معنوی خامی یہ ہے کہ اس مضمون میں کوئی بلند پردازی نہیں ہے،

لفظی خامی کی نسبت عرض ہے کہ متنبی عرب شاعر ہے اور محاوراتِ عرب پر اسکی وسعت نظر کی وجہ سے اس کے دیوان کو علماے ہند نے مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل کیا اور فن عربیت میں اس دیوان کو خاص اہمیت و مقبولیت حاصل ہوئی، حتیٰ کہ کم و بیش اس کی چالیس شرحیں لکھی گئیں، اسی عرب شاعر کا یہ شعر ہے، مساور بن محمد رومی کی مدح میں کہتا ہے، ؎

نفديك من سيل اذا سئل الندى هول اذا اختلطا دم و مسيح

تم پر ہماری جانیں قربان یعنی تو وہ ہے کہ جب اس سے بخشش طلب کیجائے تو سیلاب ثابت ہوتا ہے، یعنی اس کی بخشش سیلاب کی طرح ہوتی ہے، اور میدانِ جنگ میں جب خون پسینہ ایک کیا جاتا ہے تو دشمنوں کے لیے ہول و دہشت ہے۔

کیا اس مثال کے بعد بھی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ندی السیل عربی کے خلاف ہے، مدیر محترم نے سچ فرمایا کہ "انھوں نے ان کے کلام میں جس قسم کی خامیاں دکھائی ہیں ان سے عرب شعرا

کا کلام بھی خالی نہیں ہے ،

اب معنوی خامی کا جائزہ لیجئے' اسیل کا مفہوم عربی زبان میں وہی ہے جس کو اردو میں سیلاب سے تعبیر کرتے ہیں ،یعنی بارش کا رواں پانی بہت زیادہ مقدار میں اکٹھا ہوکر بہتا ہے' جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دریا سیلاب کے زمانے میں اپنے محدود دائرہ سے نکل کر دور دور تک پھیل جاتا ہے ،عرب ممالک میں یہ سیلاب زمین کی کاشت اور اس کی پیداوار کی فراوانی کا واحد ذریعہ تھا، چنانچہ اسلام سے پہلے دریائے نیل کی طغیانی کے لیے مصر کی کوئی حسین وجمیل لڑکی آراستہ پیراستہ کرکے بھینٹ چڑھائی جاتی تھی ،کیونکہ مصر کی خوشحالی اور اقتصادی فلاح دریائے نیل کی طغیانی پر موقوف تھی ، اور یہ حقیقت ہے کہ دریا کے پانی سے مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے ،مگر اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہ از افادہ وہاں حاضر ہوگا، جانوروں کو لائے گا . اگر کھیت کی سینچائی کرنی ہے تو بہزار کلفت کھیت تک پانی پہنچانا پڑے گا ، دریا کی سخاوت کا تصور یہ ہے کہ حاجتمند اس کے دروازہ پر جائے گا تب تو اس سے مستفید ہوگا ،بخلاف سیلاب کے کہ اس میں پانی کی فراوانی کے علاوہ اس کی افادیت وسخاوت کا یہ تصور ہے کہ وہ اپنی بخشش ضرورتمندوں کے دروازوں پر خود لیجاتا ہے' اور ان کے جانور' کھیت اور خود ان کو سیراب کرتا ہے ، اور اس راہ میں ان کو خود کوئی کوشش نہیں کرنا پڑتی ، سیلاب کے اسی قسم کی فیض رسانی اور سخاوت کی وجہ سے شعرائے عرب اپنے ممدوحین کی سخاوت کو سیلاب سے تشبیہ دیتے ہیں ، کہ ممدوح کی بخشش لوگوں کے گھروں پر خود پہنچ جاتی ہے ، لوگوں کو اس کے دروازہ پہ حاضر ہونے کی ضرورت نہیں پڑتی، کیا اس انداز فکر سے " اندی من ندی السیل" میں مضمون کی بلند پروازی نہیں ہے ۔

اسی مضمون کو متنبی نے اس شعر میں بیان کیا ہے : ؎

فلم یبق خلق لم یردن فناءہ　　　　وھن لہ شرب ورود المشارب

یعنی ممدوح کی بخشش لوگوں کے دروازوں پر خود اس طرح پہنچ جاتی ہے جیسے لوگ پانی کے گھاٹ پر پہنچتے ہیں، حالانکہ بخشش بمنزلہ گھاٹ کے ہے، لہذا پیاسوں کو گھاٹ پر جانا چاہیے، یہاں خود گھاٹ پیاسوں کے پاس آرہا ہے۔

لھا عارض بتریقۃ غیر عارض　　　　اسیل صیقل حسنہ کالسجنجل

اس شعر کا بے تکلف ترجمہ یہ ہے کہ محبوبہ کے رخسار کی چمک عارضی نہیں ہے، وہ چکنا چمک دار ہے، اس کی چمک دمک آئینہ کی چمک کی طرح ہے۔"

اس ترجمہ کی رو سے شعر کی ترکیب یہ ہے کہ شعر میں محبوبہ کے عارض کی چار نحوی صفت لائی گئی ہے (۱) بتریقۃ غیر عارض (۲) اسیل (۳) صیقل (۴) حسنہ کالسجنجل، شعر میں عارض کی دو صفت مفرد ہے اور دو صفت جملہ ہے، جملہ سے بھی نکرہ کی صفت نحوی قاعدہ سے درست ہے، جب کہ جملہ میں کوئی ضمیر ہو جو موصوف کی طرف لوٹے اور شعر کے اندر دونوں جملوں میں یہ شرط موجود ہے، لہذا شعر میں عارض موصوف کی جو مسلسل چار صفتیں لائی گئی ہیں، عربی قاعدہ سے اس میں کوئی خامی نہیں ہے، اور جو خامی شعر کی ترکیب میں ڈاکٹر صاحب نے بتائی ہے، غلط فکر کی پیدا وار ہے، اگر خامی ہے تو انکی فکر میں نہ کہ شعر میں۔

ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ میں اس شعر پر کلام کیا ہے:

"اس شعر کا پہلا مصرعہ محتاج تشریح ہے، نیز عارض کی صفت مصرعہ دوم میں واقع ہے، اس لیے صفت موصوف کے درمیانی فاصلہ ہو جانے کے باعث تعقید لفظی کا عیب پیدا ہو گیا، پھر صیقل کا فاعل حسنہ ہے، اور اس

ترکیب کے ماتحت یا معنی ہوگئے کہ محبوبہ کے رخسار کی خوبصورتی آئینہ کی طرح پالش کی ہوئی ہے"

دیکھئے ڈاکٹر صاحب نے عارض کی صفت اول کو مہمل قرار دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مصرعۂ دوم میں اسجل اور عارض کے درمیان فاصلہ کا عیب شعر میں پیدا ہوا، اگر تبریقہ میں عارض کو صفت اول قرار دیتے تو فاصلہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، اسی طرح انھوں نے حسنہ کو صقیل کا فائل ٹھہرایا، اسی ترکیب کے باعث شعر کا قابل اعتراض معنی پیدا ہوا جو ڈاکٹر صاحب نے لکھا، اگر حسنہ کو مبتدا اور کا سجل کو خبر قرار دیا جائے تو اس صحیح ترکیب سے شعر کا عیب بھی ختم ہوجائے گا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شعر کا سارا عیب ڈاکٹر صاحب نے اپنی ترکیب سازی سے پیدا کر دیا، ورنہ صحیح ترکیب کے ماتحت جو اوپر لکھی گئی، شعر میں کوئی عیب ہی نہیں ہے۔

(باقی)

بزم تیموریہ جلد اول

یعنی تین مغل سلاطین بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے شعراء، علماء اور ارباب فضل و کمال خصوصاً دربار اکبری کے اکثر اہل کمال مثلاً ملا عبدالقادر بدایونی، ابوالفضل فیضی، حکیم ابوالفتح گیلانی اور عبدالرحیم خانخاناں کے علمی ذوق اور ان کے فضل و کمال، ان کی علم دوستی و علم پروری وغیرہ کی دلچسپ تفصیل ہے تو اس کتاب کا دوسرا اڈیشن لیکن اس میں اتنے اضافے ہوئے ہیں کہ بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، پہلے سے کہیں زیادہ پرمغز، پرازمعلومات اور دلچسپ،

(زیر طبع)

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

قطب الاقطاب دیوان محمد رشید جونپوری عثمانی

(از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدرس مرکز علوم مدرسہ قرآنیہ شہر جون پور)

قدرت کا یہ عجیب نظام ہے کہ ایک کی بربادی دوسرے کی آبادی کا سبب ہوتی ہے، ایک جانب ایک شہر اجڑتا ہے تو دوسری طرف دوسرا آباد ہوتا ہے یہی ہمیشہ ہوتا چلا آرہا ہے اسی قانون فطرت کے تحت جب فتنۂ تیموری کی ہلاکت خیزیوں سے مغرب میں دلی کی علمی، تمدنی اور معاشرتی دنیا میں بادخزاں کے تند جھونکے چل رہے تھے تو دوسری جانب دیار پورب کے شہر جونپور میں علم و فن اور تمدن و معاشرت کے چمنستان میں بہار آئی ہوئی تھی تاجدار سلطنت شرقیہ ابراہیم شاہ المتوفی ۸۴۴ھ کے حسن انتظام علم دوستی اور علماء نوازی اور فیاضی سے جونپور مرجع ارباب کمال بن گیا تھا یہاں کے مواضعات و قصبات میں علم و فضل کی مندیں بچھ گئی تھیں اہل علم و دانش دور دراز مقامات سے کھینچے چلے آرہے تھے اور شہر جونپور یاقوت حمویؒ کل فصیح کا مصداق بنا ہوا تھا، ان نوادر اہل کمال میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی ذات گرامی بھی ہے قاضی صاحب کے جونپور میں آتے ہی اس کے گلستان علم میں بہار نو آگئی، در حقیقت جونپور کی علمی تاریخ کا آغاز قاضی دولت آبادی کی ذات گرامی سے ہوتا ہے، اس میں سلطان الشرق ابراہیم شاہ بھی برابر شریک رہا، سلطنت شرقیہ اگرچہ اسی برس کی قلیل مدت میں ختم ہوگئی لیکن ملک العلماء، ملک الشرق نے جس گلستانِ علم کی آبیاری کی تھی وہ تقریباً ساڑھے تین سو سال تک پھولتا پھلتا رہا۔ اور سرزمین جونپور سے ایسے ایسے باکمال افراد ابھرے جن کے کارناموں پر ملت اسلامیہ کو آج بھی فخر ہے۔

ان ہی باکمال افراد میں زبدۃ الاخیار، عمدۃ الابرار، استاذ العلماء، ملاذ الفضلاء، فرید العصر، وحید الدہر، صاحب الرشاد والسداد فی مقام الارشاد قدوۃ اہل العلم والتجرید ابو البرکات الشیخ دیوان محمد رشید الجونپوری العثمانی کی ذات گرامی بھی ہے،

گیارہویں صدی ہجری کے علماء میں دیوان صاحب امامت وعبقریت کے مقام پر فائز اور شریعت وطریقت کے مسلّم مقتدا تھے، آپ کے اساتذہ ومعاصرین آپ کی جودت طبع، ذہانت، فطانت اور علمی وفنی مہارت کے معترف تھے آپ کے معاصر اور استاذ بھائی شیخ رکن الدین بحریاآبادی تلمیذ خاص شیخ مفتی شمس الدین بردنوی المتوفی ۱۰۴۰ھ کو جب کوئی علمی شبہہ وارد ہوتا تو اپنے تبحر علمی کے باوجود دیوان صاحب کی طرف مراجعت فرماتے اور تشفی بخش جواب سے مطمئن ہوتے،[۱]

استاذ الملک شیخ محمد افضل بن حمزہ عثمانی جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ جو آپ کے استاذ ہیں ایام طالب علمی ہی سے آپ کی قابلیت و فطانت کے قائل تھے، ایک مرتبہ مختصر المعانی کے درس کے وقت ایک صاحب نے عرض کیا کہ نیز کان یکون کے معنی بھی سمجھتے ہیں یا یوں ہی پڑھ رہے ہیں، استاذ الملک نے برجستہ فرمایا کہ آپ "کان یکون" کے معنی کے متعلق فرماتے ہیں یہ تو "میکون" کے معنی بھی بیان کرتے ہیں[۲]، اسی اعتماد ووثوق کی بنا پر تحصیل وتکمیل سے فراغت کے بعد ایک تقر آپ استاذ الملک کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت استاذ شریفہ کا جو فن مناظرہ میں اہم متن ہے کسی طالب علم کو درس دے رہے تھے دیوان صاحب کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا کہ

متن خوب است اگر کسے شرح ایں نویسد بہتر است،[۳]

یہ ایک بہترین متن ہے اگر کوئی اسکی شرح لکھ دیتا تو اچھا ہوتا،

---

[۱] گنج ارشدی ورق ۱۴، [۲] ایضاً ۱۴، [۳] ایضاً ۱۴،

دیوان صاحب استاذ الملک، کے اشارہ کو سمجھ گئے اور ایک ہفتہ کے بعد جب پھر حاضر خدمت ہوئے تو رشیدیہ شرح شریفیہ تالیف فرما کر استاذ عالی مقام کی خدمت میں پیش کر دی استاذ الملک نے بیحد پسند فرمایا اور بہت تحسین فرمائی، رشیدیہ جلیسی اہم تصنیف اور ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں دیوان صاحب کی خداداد ذہانت و قابلیت ہی کا کرشمہ ہے ورنہ ایک ہفتہ میں اس کے مضامین کو حل اور اخذ کرنا بھی غیر معمولی بات ہے، چہ جائیکہ تصنیف کرنا۔ حاشیہ چلپی کی قرأت کے زمانہ میں دیوان صاحب کا یہ اعلان عام تھا کہ چلپی کے اقوال کو میں رد کر سکتا ہوں جس کا جی چاہے پیش کر کے دیکھ لے چنانچہ کبھی کبھی ملا محمود جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ یا کوئی دوسرا رفیق درس چلپی کے قول کو پیش کرتا اور دیوان صاحب اس کی ایسی مدلل تردید فرماتے کہ استاذ الملک بھی داد تحسین دئے بغیر نہ رہتے[1]

زمانہ طالب علمی ہی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ملا موہن الہ آبادی جو ایک متبحر عالم اور جید مناظر تھے استاذ الملک کی ملاقات کی غرض سے تشریف لائے۔ استاذ الملک اس وقت دیوان صاحب کو درس دے رہے تھے، ملا موہن کی خاطر سے درس موقوف کر دینا چاہا، ملا موہن نے کہا کہ سبق جاری رکھا جائے تاکہ ان کی استعداد کا پتہ چلے، چنانچہ درس جاری رہا، دیوان صاحب قرأت کر رہے تھے ملا موہن نے ایک اعتراض کیا دیوان صاحب نے جواب دیا اور مباحثہ شروع ہو گیا، قریب تھا کہ ملا موہن لاجواب ہو کر خاموش ہو جاتے یہ صورت دیکھ کر استاذ الملک نے تیز نگاہوں سے دیوان صاحب کی جانب دیکھا، آپ استاذ کا منشا سمجھ کر خاموش ہو گئے[2]

یوں تو دیوان صاحب جملہ علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے لیکن فقہ، اصول اور تصوف میں خاص امتیاز حاصل تھا[3]، اسلئے استاذ الملک مقدمات اصول و فقہ دیوان صاحب

---

[1] گنج ارشدی ورق ۱۳، [2] ایضا، ۱۴، [3] نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۳۶۷،

سے پوچھتے تھے اور مبادیات حکمت و فلسفہ ملا محمود جونپوری سے،[۵]

۱۔ دیوان صاحب کے تذکرہ کے مآخذ و مراجع گنج رشیدی قلمی میں دیوان صاحب اور ان کے خاندان کے بیشتر اصحاب کا تذکرہ ہے یہ کتاب دیوان صاحب کا بسیط ملفوظ ہے جس کو آپ کے تلمیذ خاص اور خلیفہ اجل شیخ محمد نصرت جمال عرف شاہ ملتانی نے جمع کیا ہے، اس میں ۱۰۷۲ھ سے ۱۰۸۲ھ تک کے ملفوظات درج ہیں، یہ دیوان صاحب کے حالات کا سب سے قدیم اور مستند ماخذ ہے،

۲۔ گنج ارشدی قلمی یہ شیخ محمد ارشد بن شیخ محمد رشید دیوان کا ملفوظ ہے، جس کو شیخ ارشد کے خلیفہ شیخ شکر اللہ نے جمع اور شیخ غلام محمد رشید بن شیخ محب الدین بن شیخ ارشد نے مرتب کیا ہے، یہ کتاب اپنے حسن ترتیب و تفصیل کے اعتبار سے خاندان رشیدیہ کے حالات میں سب سے مفصل اور جامعیت و افادیت کے لحاظ سے اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے،

(۳) مناقب العارفین مولفہ شیخ محمد یسین جانشین شیخ محمد طیب بنارسی، بزرگان چشتیہ کے ذیل میں مؤلف نے دیوان صاحب کا مفصل و مکمل تذکرہ لکھا ہے، اس کتاب پر خود دیوان صاحب کا لکھا ہوا حاشیہ بھی ہے، چونکہ یہ کتاب آپ کی حیات ہی میں مرتب ہوئی ہے، اس لئے یہ بھی قابل اعتماد ہے، یہ تینوں مذکور الصدر کتابیں خانقاہ رشیدیہ جونپور میں موجود ہیں،

(۴) بحر ذخار کے نہر دوم کے شعبۂ دوم میں بزرگان رشیدیہ کا مکمل تذکرہ ہے، اولیائے کرام کے حالات میں بڑی مشہور کتاب ہے، مگر اپنی ضخامت و طوالت کی وجہ سے آج تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی، اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا فصیح الدین جونپوری استاد مسلم انٹر کالج جونپور کے پاس موجود ہے،

---

[۵] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۶۷، گنج ارشدی ورق ۱۱۴،

(۵) تجلی نور۔ مؤلفہ ابوالبشارت نورالدین زیدی ظفرآبادی ص ۲، ۱۰۷ میں دیوان صاحب کا تذکرہ ہے،

(۶) نزہتہ الخواطر جلد پنجم ص ۳۰۷، میں بھی دیوان صاحب کا مختصر مگر جامع تذکرہ ہے ان کتابوں کے علاوہ (۷) سمات الاخیار، سبحۃ المرجان، تذکرہ علمائے ہند[۹]، حدائق حنفیہ[۱۰]، تحفۃ الابرار[۱۱]، تاریخ شیراز ہند[۱۲] وغیرہ میں بھی دیوان کا ذکر ہے، مگر ان میں کوئی نئی اور مزید باتیں نہیں ہیں، سب نے مذکورہ بالا چار کتابوں کی باتوں کو دہرایا ہے، البتہ سمات الاخیار میں دیوان صاحب کی اولاد اور تین خلفاء کا مفصل ذکر ہے، اس مضمون کی ترتیب کے سلسلے میں ان سب کتابوں سے مدد لی گئی ہے، مگر اصل ماخذ کی حیثیت گنج ارشدی وگنج رشیدی ہی رکھتی ہیں،

دیوان صاحب کے بارے میں اہل باطن کے خیالات

جس دن استاذ الملک شیخ محمد افضل جونپوری کی وفات ہوئی، اسی دن لاہور میں ملا خواجہ نے جو سلسلۂ قادریہ کے مشائخ میں ہیں، فرمایا کہ

امروز قطب جونپور وفات یافتہ و بعد چند شیخ محمد رشید نامی خواہد گشت[۱]

آج قطب جونپور کی وفات ہوگئی اور چند دن کے بعد اس مقام پر محمد رشید نامی فائز ہوں گے،

۲۔ شیخ عبدالعزیز جونپوری دہلوی خلیفہ قاضی خاں ظفرآبادی نے اپنی آخری عمر میں فرمایا کہ

بعد ما مردے فقیر پیدا خواہد کہ

میرے بعد ایک مرد فقیر پیدا ہوگا

۱؎ گنج ارشدی ورق ۱۲۳،

نام وے محمد رشید خواہد بود۔ (گنج ارشدی ورق ۱۴۸) جسکا نام محمد رشید ہوگا۔

شیخ عبد العزیز بڑے باکمال و صاحب حال و قال بزرگ تھے ۹۷۵ھ میں آیت پاک سبحان الذی بیدہ ملکوت کل شئی والیہ ترجعون کے سماع پر واصل بحق ہو گئے، دیوان صاحب کے ایام طفولیت میں ایک تقریب کے سلسلہ میں شیخ عبد الجلیل لکھنوی بروہ نہ تشریف لائے حصول برکت کے لئے آپ کو شیخ کی خدمت میں حاضر کیا گیا، شیخ نے آپ کو دیکھتے ہی فرمایا،

عارف کامل و عامل خواہد بود دیشکر — عالم باعمل و عارف اجل ہونگے اور

بسیار تناول نمود۔ (ایضاً ورق ۱۲) — گنا بہت ہی پسند کریں گے۔

ان پیشگوئیوں سے پتہ چلتا ہے کہ دیوان صاحب کا مقام علم و ولایت کس درجہ کا تھا،

پیدائش اور نشو نما | آپ دس ذیقعدہ ۱۰۰۰ھ موضع بروہ نہ میں پیدا ہوئے، موضع بروہ نہ شہر جونپور سے تقریباً چھ میل کی مسافت پر مشرق میں واقع ہے اور اس وقت حدود اعظم گڈھ میں ہے،

دیوان صاحب نے چار بادشاہوں کا زمانہ پایا، جلال الدین اکبر ۱۰۰۰ھ میں کے عہد میں پیدا ہوئے، جب آپ کی عمر چودھویں سال کو پہنچی تو جہانگیر مسند آرائے سلطنت ہوا آپ کے سینتیسویں سال میں شاہجہان تخت نشین ہوا اور جب آپ چھہتر سال کے ہوئے تو اورنگزیب عالمگیر سریر آرائے حکومت ہوئے آپ کے والد شیخ مصطفیٰ جمال نے آپ کی طفولیت ہی کے زمانہ میں اپنے مرشد کے ایماء پر بروہ نہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اس لئے آپ کی نشو نما اپنے حقیقی ماموں شیخ شمس الدین ابن نور الدین بروہ نوی کے زیر نگرانی ہوئی،

شیخ شمس الدین بڑے عابد و زاہد اور خوش اوقات بزرگ تھے اور ساتھ ہی زیور علم سے بھی آراستہ تھے اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں گنے جاتے تھے اوائل عمر میں ملازمت شاہی سے منسلک تھے آخر میں ترک فرما کر عزلت گزیں ہو گئے تھے ۱۰۴۷ھ میں وفات پائی آپ کا مزار محلہ مفتی شہر

جونپور میں ہے رکن الدین بحریابادی آپ کے شاگرد رشید تھے،[۱]

نام ونسب اور آبائی وطن محمد رشید نام شمس الحق، فیاض اور دیوان لقب ہے ابوالبرکات کنیت ہے شمسی تخلص، آپ کی بعض تحریروں سے اسم گرامی عبدالرشید بھی ظاہر ہوتا ہے مگر محمد رشید ہی آپ کو پسند ومحبوب تھا آپ کے کمالات ظاہری و باطنی کو دیکھ کر مشایخ واہل اللہ قطب الاقطاب کہا کرتے تھے،

سلسلۂ نسب باختلاف روایت اٹھارہویں یا بیسویں پشت میں شیخ سری بن مغلس سقطی عثمانی سے مل جاتا ہے[۲] آپ کی بارہویں پشت میں ایک بزرگ شیخ بخشی نامی ہیں انہی کے اجداد میں سے کسی نے عرب سے ہجرت کرکے کلدہ میں سکونت اختیار کرلی تھی کلدہ ملک روم کا ایک مشہور مقام ہے اسی نسبت سے شیخ بخشی کو شیخ رومی کہا جاتا ہے، شیخ بخشی نے مرشد کامل کی تلاش میں ہندوستان کی طرف رخت سفر باندھا اس وقت دلی میں سلطان المشایخ شیخ نظام الدین دہلوی کے فیوض وبرکات کا دریا بہ رہا تھا اس لئے شیخ رومی دلی پہونچکر سلطان المشایخ کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور مدت دراز تک شیخ کی صحبت میں رہ کر کسب فیض کرتے رہے اس سے فراغت کے بعد شیخ کے اشارے سے موضع سکلائی پرگنہ امیٹھی ضلع بارہ بنکی میں خلق خدا کی اصلاح وتربیت کی غرض سے مستقل سکونت اختیار کرلی شیخ رومی کو سلطان المشایخ کے علاوہ شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی سے بھی اجازت وخلافت حاصل تھی، شیخ رومی نے سکلائی ہی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے شیخ رومی کے بعد ان کی اولاد سکلائی میں مقیم رہی اور آجتک آپکی نسل وہاں پائی جاتی ہے،[۳]

---

[۱] سمات الاخیار [۲] گنج ارشدی ص ۲، گنج رشیدی سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سری تک کل اٹھارہ پشتیں ہیں لیکن گنج ارشدی اور دوسرے تذکروں سے دو نام اور درمیان میں معلوم ہوتے ہیں، [۳] سمات الاخیار، ص ۱۰،

دیوان صاحب کے والد بزرگوار شیخ مصطفیٰ جمال بھی موضع سکلائی ہی میں متولد ہوئے،
اور وہیں نشوونما پائی بڑے ہونے کے بعد انھیں طلب علم کا شوق پیدا ہوا اور وہ حصول علم کے لئے سکلائی سے جونپور آئے اپنی زاد بوم کو خیرباد کہکر جونپور میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور یہاں کے اساتذہ ومشائخ سے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل فرمائی شیخ نور الدین بن عبد القادر بروفوی کی صاحبزادی سے نکاح کیا جو آیندہ کے لئے سکلائی کے بجائے بروضلع جونپور کی وطنیت کا سبب[له] بنا یہیں آپ کے تینوں صاحبزادے شیخ محمد سعید، شیخ محمد رشید (صاحب الترجمہ) اور شیخ محمد ولید پیدا ہوئے، شیخ مصطفیٰ جمال کا ابتدائی ایام ہی سے تدین وتقوی اور اصلاح باطن کی طرف میلان تھا چنانچہ سکلائی کے قیام کے زمانہ ہی میں شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے اور وقتاً فوقتاً شیخ کی صحبت میں جاکر اکتساب فیض کرتے رہتے تھے۔

جونپور آنے کے بعد شیخ قیام الدین بن قطب الدین جونپوری کی جانب رجوع کیا اور انھیں سے اجازت وخلافت حاصل ہوئی، شیخ مصطفیٰ عین کمال ورع کا زہد وتقوی توکل وورع تھا مشتبہ چیزوں سے انتہائی پرہیز کرتے تھے اپنے شیخ کے ایما پر اہل وعیال کو بروہ چھوڑکر بنڈرہ ضلع پورنیہ میں اقامت فرمائی تھی اور وہیں ۱۰ رذی الحجہ ۱۰۴۳ھ میں وفات پائی اور پورنیہ محلہ چمنی بازار میں مدفون ہوئے۔

دیوان صاحب نے اپنے ایک شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے،

چوں یار بہ بنگالہ کند مسکن و ماوی　　شمسی بہ بدخشاں نہ رود لعل بہ بنگالست

درس وتدریس | دیوان صاحب کے اساتذہ کی فہرست بہت طویل ہے، جہاں کوئی صاحب کمال

له نزہۃ الخواطر کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ مصطفیٰ جونپوری کی سکونت کے زمانہ میں سکلائی بھی جاتے رہتے تھے لیکن گنج رشیدی وارشدی اس تفصیل سے خاموش ہیں،

بلا اس کے سامنے زانوئے ادب تہ کر دیا اور اس کے فیوض علمیہ سے استفادہ کیا، ذیل میں ان اساتذہ کی اجمالی فہرست پیش کی جارہی ہے جن سے دیوان صاحب نے بلا واسطہ استفادہ فرمایا ہے جس سے اقلیم علم وفن کے تاجدار اور آسمان علم کے آفتاب عالمتاب کے علمی شغف کا صحیح اندازہ ہو سکے گا،

(۱) الشیخ محمد اخوند البردلوی (۲) الشیخ کبیر نور البردنوی (۳) الشیخ محی الدین السدھوروری (۴) الشیخ مخدوم عالم السدھوروی (۵) الشیخ محمد قاسم (۶) الشیخ مبارک مرتضیٰ (۷) الشیخ نور محمد المداری (۸) الشیخ محی الدین عبدالشکور (۹) الشیخ عبدالغفور بن عبدالشکور (۱۰) الشیخ حبیب اسحاق (۱۱) الشیخ محمد الاہوری (۱۲) الشیخ میر سید عبدالعزیز (۱۳) الشیخ میر سید عبداللہ بہادر عبدالعزیز (۱۴) الشیخ المفتی شمس الدین البردنوی (۱۵) استاذ الملک الشیخ محمد افضل بن حمزہ الجونپوری العثمانی (۱۶) الشیخ المحدث الشاہ نور الحق بن الشاہ عبدالحق المحدث الدہلوی،[۱]

جس لائق، ذکی، فطین شاگرد کی علمی تربیت میں مذکورۂ بالا باکمال اور اپنے عہد کے ماہر فنون اساتذہ کے دامن میں ہوئی ہو اس سے اس کے کمالات علم وفضل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

ان اساتذۂ عظام میں دیوان صاحب کے علمی جوہر کے نکھارنے میں سب سے زیادہ ہاتھ آپ کے حقیقی ماموں علامۂ عصر مفتی شیخ شمس الدین بردنوی اور فرید عصر وحید دہر استاذ الملک شیخ محمد افضل جونپوری کا ہے، دیوان صاحب نے ان دونوں سے علمی استفادہ زیادہ کیا ہے، اور اکثر کتابیں ان ہی سے پڑھیں،

علوم متداولہ کی تحصیل وتکمیل کے بعد بھی شوق طلب کو سیری نہ ہوئی اور عہد شباب گذر جانے کے بعد پیرانہ سالی یعنی ساٹھ سال کی عمر میں کمر باندھی اور قدوۃ المحدثین شاہ عبدالحق محدث

---

[۱] تذکرت الخواطر ج ۵ و سمات الاخیار ص ۱۵ و گنج ارشدی،

دہلوی کے فرزند وشاگرد شیخ نور الحق دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشکوٰۃ اور بخاری کو شیخ سے پڑھکر اجازت حاصل کی، شیخ نور الحق نے فراغت کے بعد جو سند اجازت عطا کی ہے اس کے لفظ لفظ سے دیوان صاحب کی علمی جلالت نمایاں ہوتی ہے قارئین کی دلچسپی کیلئے اس کو نقل کیا جاتا ہے،

نقل سند اجازت :۔ ان الشیخ الاجل، الاوحد الافضل جامع الکمالات الالوہیۃ المتوجہ الی اللہ خلیفہ قدوۃ المتورعین الشیخ طیب بن معین طلب منی الاجازۃ بسنن اہل الحدیث وحفظا لہذہ السلسلۃ الشریفۃ مع انی لست باہلہا وکان الاعتذار احری والیق من الاجازۃ لکن لما کان امتثال امرہ جب علی وکان اجری ہذا الطریق مما اوصی بہ الشیوخ احیت مسئولہ واجزت رفعہ اللہ ست

اس کے نیچے یہ عبارت دیوان صاحب نے اپنے قلم سے تحریر فرمائی ہے،

وانا العبد الاحقر المفتقر الی اللہ الوحید المدعو بین الناس محمد رشید بن مصطفیٰ الجونپوری موطنا والعثمانی نسبا والچشتی ارادۃ والقادری والقلندری والمنظاری مشربا المرجو من الشیخ الاوحد ان لا ینسانی من صالح دعائہ لعل اللہ یرزقنی صلاحا وکان ذالک فی ذی قعدہ سنۃ ستین والف من الہجرۃ النبویۃ۔[1]

دیوان صاحب کی اس تحریر سے صاحب سمات الاخیار کے اس قول کی پوری تردید ہوجاتی ہے کہ دیوان صاحب جب دہلی پہنچے تو شیخ عبد الحق محدث دہلوی ضعف پیری کیوجہ سے درس دینا بند کرچکے تھے لیکن دیوان صاحب کی درخواست پر یہ منظور فرمالیا تھا کہ درس تو نور الحق دیں گے لیکن میں بھی درس میں موجود رہا کرونگا، کیونکہ دیوان صاحب نے سنہ ۱۰۶۰ھ میں اجازت حاصل کی ہے اور شاہ عبد الحق محدث دہلوی کی وفات خود صاحب سمات الاخیار کی تصریح کے

---

[1] گنج ارشدی ص ۱۳۴،

مطابق ۱۰۱۰ھ میں ہوگئی، پھر محدث دہلوی کا درس میں حاضر رہنا چہ معنی دارد،

تحصیل وتکمیل کے بعد دیوان صاحب مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے اور تشنگان علوم کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کرنا شروع کر دیا، بیشمار بندگان خدا آپ کے علمی فیوض سے مستفید ہوئے، طلبہ کے ساتھ انتہائی شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے تھے اور انکی تعظیم وتکریم میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ ہونے دیتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وفات کے وقت وصیّت فرمائی کہ جس پتھر پر طلبہ جوتیاں اتارتے تھے اس کو میری قبر میں تختہ کے طور پر رکھدیا جائے۔[۵۱]

آپ کے درس وتدریس کو علماء ومشائخ بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس شغل کو باقی رکھنے کی تاکید کرتے رہتے تھے، شیخ طیب بنارسی اپنے ایک مکتوب میں آپ کو خطاب فرماتے ہیں کہ،

ہموارہ بدرس وتدریس بودہ بر رضائے رحمت چشم دارند کہ حق تعالیٰ را در روز شبی ہزار شبی ہزار نعمت است کہ بر خلق نازل می شود تسعمایۃ وتسع تسعون للعلماء والمتعلمین و واحدۃ لجمیع الخلق ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء، انتہی[۵۲]

ایک دوسرے مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں،

بندہ می خواہد کہ از برائے شما فرمان بوساطت نواب از بادشاہ طلب نماید کہ شما درین بنارس استقامت نمودہ درس وتدریس فرمائید کہ درین کان کفر رواج اسلام نمود۔[۵۳]

---

۵۱ گنج ارشدی ج ۱ ص ۱۳۴، ودیعات الاخیار ص ۳۵،

۵۲ گنج ارشدی ج ۱ ص ۱۲۸، ۵۳ ایضاً ص ۱۲۸،

دیوان صاحب کو طلبہ یا مریدین سے خدمت لینا پسند نہ کرتے تھے اور ارادتمندوں کی خواہش کے باوجود اسکا موقع نہ دیتے تھے، ایک مرتبہ آپ کے تلمیذ خاص اور مرید جان نثار میاں شیخ اسماعیل پرپونوی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا دیوان جیو تو کسی قسم کی خدمت کا موقع ہی نہیں دیتے کہ ہمارے لئے ذریعۂ سعادت ہو، حضرت دیوان صاحب نے فرمایا کہ میرے استاذ شیخ محمد افضل بھی خدمت لینا پسند نہیں کرتے تھے، اپنا سارا کام خود ہی انجام دیا کرتے تھے، اسی لئے مجھے بھی یہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ضروریات خود ہی پوری کر لیا کروں، پھر فرمایا،

تا کار بدست خود توان میکر دو دگیرے	جبتک اپنے ہاتھ سے کام ہوتا رہے
گفتن خوب نیست در صحبت یار شاطر	دوسروں سے لینا بہتر نہیں دوستوں
باید نہ بار خاطر۔[۱]	کی صحبت میں چاق و چوبند رہنا چاہئے
	نہ کہ بوجھ بنا رہے،

دیوان صاحب کو طلبہ کا تعلیمی نقصان گوارا نہیں تھا ان کو مطالعہ در رہمہ وقت درس کیلئے مستعد رہنے کی تاکید کرتے رہتے تھے اور اپنے آپ کو بھی اس کے لئے فارغ رکھتے تھے لیکن آخری وقت میں جب عبادت اور ریاضت اور سیر الی اللہ میں انہاک بڑھ گیا اور اکثر جذب اور استغراق کی کیفیت طاری رہنے لگی اور درس میں ناغہ ہونے لگا تو تلامذہ کو اپنے تلمیذ رشید و خلیفہ اجل شیخ نور الدین مداری کے حوالہ کر دیا، اور اس وقت سے تدریس کا کام موقوف ہو گیا۔[۲]

دیوان صاحب کے اکثر شاگرد علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی میں بھی دیوان صاحب ہی سے استفادہ کرتے تھے، اور ان میں اکثر خلعتِ خلافت سے بھی مشرف ہوئے،

---

[۱] گنج ارشدی، ص ۱۲۰، ج ۱۔ [۲] گنج ارشدی و نزہتہ الخواطر و مقصود الطالبین،

عرفان وسلوک دیوان صاحب جس طرح علوم ظاہری میں شہرۂ آفاق تھے اسی طرح علوم باطنی میں بھی طاق تھے، نو برس کی عمر میں جو کھیلنے کھانے کا زمانہ ہوتا ہے کسی مرشد سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کرنا تو درکنار اس کا تصور آنا بھی غیر معمولی بات ہے،

دیوان صاحب اسی زمانہ میں اپنے والد شیخ مصطفیٰ جمال سے بیعت ہو گئے تھے، اور خرقۂ خلافت سے بھی مشرف ہوئے، صاحب مناقب العارفین رقمطراز ہیں،

"در مدتِ طفلی کلاہ ارادت بلکہ خرقۂ اجازت وخلافت از دست والد شریف خود کہ مرشد دہر وشیخ عصر بودند، پوشند، واثر آن لباس در وکار ہا کرد"
(انتہی)[۵۱]

لیکن کم سنی اور تعلیم وتحصیل کی مشغولیت سے طریقۂ صوفیہ کے اخذ وکسب کی جانب پوری توجہ نہ ہو سکی تھی، تکمیلِ علوم وفنون کے بعد شیخ کامل ومرشد صادق کی تلاش وجستجو ہوئی، اتفاقاً اسی زمانہ میں شیخ طیب بنارسی جونپور تشریف لائے ہوئے تھے، خبر پاتے ہی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مگر اس ملاقات میں قلب شیخ کی جانب مائل نہ ہوا، کچھ دنوں کے بعد ایک تقریب کے سلسلے میں شیخ طیب کی قیام گاہ منڈواڈیہ ضلع بنارس جانا ہوا، اور چند دن کی صحبت بھی اٹھائی، اس صحبت نے اپنا اثر دکھایا، اور قلب میں شیخ طیب کی کی عقیدت ومحبت کا طوفان موجزن ہو گیا، چنانچہ سارے علائقِ دنیوی حتی کہ درس وتدریس کے مشغلے کو ترک کر کے مستقل قیام کے ارادہ سے شیخ طیب کی خدمت میں حاضر ہو گئے مگر شیخ نے تدریس کے التوا کو پسند نہیں فرمایا، اور یہ کہکر جونپور واپس کر دیا کہ

"بجائے وظیفہ صبح درس طلبہ دانند، ایں ہم عبادت است"[۵۲]

---

۵۱ مناقب العارفین ص ۱۲۵، ۵۲ گنج ارشدی ۶: ۱۲۶، ج اول ایضاً ج ا، ص ۱۲۷

منڈواڈیہہ سے واپسی کے بعد حسب ارشاد مرشد پھر درس وتدریس میں مشغول ہو گئے اور وقتاً فوقتاً شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے، دو ایک دن کے بعد واپس آجاتے، رمضان میں چونکہ درس موقوف ہوجاتا تھا اس لئے پورا رمضان شیخ کی خدمت میں گذارنے کا ارادہ کیا شیخ نے اخیر عشرے کے اعتکاف کا حکم دیا، آپ نے اعتکاف کیا، عید کے دن ۱۰۰۰ھ میں شیخ طیب نے مجمع عام میں سلسلہ چشتیہ کے خرقہ خلافت سے نوازا اور اس سلسلے کے اوراد و اذکار کی تلقین فرماکر جونپور رخصت کیا۔

حصول ملازمت کے بعد دیوان صاحب نے مجاہدہ اور ریاضت میں اور اضافہ کردیا اور چند ہی دنوں میں اتنی صلاحیت بہم فرمائی کہ طیب شاہ نے سلاسل قادریہ اور سہروردیہ کی اجازت وخلافت بھی عطا فرماکر اپنا خلیفہ مطلق بنا دیا۔[1]

اس کے بعد دیوان صاحب نے سلسلہ سہروردیہ میں شیخ تاج الدین سے بھی اجازت وخلافت حاصل کی۔ شیخ یسین جانشین طیب شاہ بنارسی لکھتے ہیں۔

قطب الاقطاب در سلسلۂ سہروردیہ بلا واسطہ از قطب المتورعین حضرت شیخ تاج الحق والشرع والدین جھوسی مجاز است۔[2]

سلسلہ قادریہ میں طیب شاہ کے علاوہ شیخ شمس الدین کاپی سے خلافت حاصل ہوئی۔

حصول خلافت کے واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے، اس واقعہ سے دیوان صاحب کی عظمت و جلالت وشوکت کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے، شیخ شمس الدین بھی ایک مرتبہ جونپور آئے تو دیوان صاحب کی خانقاہ میں تشریف لائے، دیوان صاحب اسوقت درس میں مصروف تھے جب درس سے فارغ ہوئے تو شیخ شمس الدین نے اپنے پاس بلاکر فرمایا۔

---

[1] گنج ارشدی و : ۱۲۶ [2] مناقب العارفین

خدا تعالیٰ حوالہ نمودن نعمت مراد پیش شما فرستادہ خدا مفت دادہ است بگیرید آنچہ داشتہ انتہی[۱]

ان سلاسل میں حصول خلافت ہی پر آپ نے قناعت نہیں کی اور اشغال قلندریہ میں استفادہ کی غرض سے شیخ عبد القدوس جونپوری نبیرۂ شیخ قطب بینائے دل کی خدمت میں حاضری دینے لگے مگر پورے ایک سال تک نہ شیخ نے آنے کی غرض دریافت کی اور نہ آپ نے از خود بتانا مناسب سمجھا ایک سال گذرنے کے بعد ایک دن شیخ عبد القدوس نے خود ہی فرمایا کہ نصف شب گذر جانے کے بعد آیا کرو،

اس زمانہ میں نصف شب کے بعد پل کا دروازہ بند ہو جاتا تھا اور شیخ کی خانقاہ دریا کے اس پار تھی مگر اس سے آپ کے پائے طلب میں لغزش تک نہ آتی اور آپ ہر روز آدھی رات کے بعد تیر کر دریا کے پار جاتے اور شیخ سے کسب فیض کرتے آخر میں شیخ نے سلسلۂ قلندریہ کے ساتھ ساتھ سلسلۂ مداریہ فردوسیہ اور شطاریہ کی خلافت بھی عطا فرمائی، شیخ عبد القدوس کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ جب شیخ عبد القدوس کے پاس کوئی طالب آتا تو فرماتے کہ میں اب ضعیف ہو گیا ہوں میاں محمد رشید بہت اچھا ذکر کرتے ہیں ان کے پاس جاؤ،[۲]

ان سلاسل میں تکمیل کے بعد بھی ذوق طلب نے چین نہیں لینے دیا اور خواہش پیدا ہوئی کہ سلسلہ قادریہ چشتیہ میں شیخ حسام الحق مانکپوری کے خاندان سے نسبت حاصل کرنا چاہیئے چنانچہ شاہ راجی سید احمد مانکپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے، شاہ راجی نے بکمال شفقت و محبت چند دن اپنے پاس رکھکر خلعتِ خلافت سے مشرف فرمایا۔[۳]

---

[۱] گنج ارشدی ج ۱، ۲۹:۱۲۹، [۲] سمات الاخیار ص ۴۷،

[۳] گنج ارشدی ۱۲۴ و نزہتہ الخواطر ۵،

ان مشایخ کے علاوہ اس دور کے دوسرے مشایخ سے بھی آپ کو اجازت حاصل ہوئی بخوف طوالت ان کو نظر انداز کر دیا گیا ،

اب آخر میں مؤلف مناقب العارفین کی رائے کو جو دیوان صاحب کے متعلق ظاہر کی ہے نقل کیا جاتا ہے ، وہ لکھتے ہیں

(بحذف القاب) بندگی میاں شیخ عبد الرشید ابد اللہ تعالیٰ ظلال عاطفتہ علیٰ روس المعتقد والمرید کہ فرید عصر است و وحید دہر در شریعت استادہ است و در طریقت صاحب الرشاد مخزن حقائق است و منبع دقائق طالب مجاہدہ است و صاحب مشاہدہ است قطب ولایت است و یگانۂ زماں غوث وقت است و قبلۂ جہاں با وجود ایں ہمہ کمالات اعتقاد بجماعت فقراء و صوفیہ آنقدر دارد کہ ہر کجا نام فقیرے می شنود بلا توقف پیش وے می رود و قصد ملاقات وے می کند و شدتِ مجاہدہ کہ وے دارد خارج طوق بشر است نفس امارہ را تابع و مطمئن ساختہ وے سلمہ اللہ قبل از اختیار ایں طریقہ مدتے در تحصیل علم می گذرانند و بعد از تحصیل کتب متداولہ در درس می مادند . انتہیٰ بلفظ

یہ تحریر دیوان صاحب کی زندگی کا صحیح و کامل مرقع ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دیوان صاحب کا مقام خود ان کے معاصرین و متعلقین کی نگاہ میں کیا تھا . (باقی)

حیاتِ شبلی
طبع دوم

یعنی مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری جسکے طویل محققانہ مقدمہ میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی و دیوان محمد رشید وغیرہ کا بھی بہت تفصیل کیساتھ ذکر آیا ہے ،

منیجر

امیّہ بن ابی الصلت

(ایک حکیم شاعر)

از جناب مولانا عبدالحلیم صاحب ندوی فاضل مصر استاد عربی جامعہ ملیہ دہلی

(۲)

امیہ کی امتیازی خصوصیات | امیہ بن ابی الصلت جزیرۂ عرب کے قصبات کے شعراء میں سب سے ممتاز اور مشہور شاعر شمار کیا جاتا ہے، زبان، اسلوب بیان اور معانی و مطالب میں ندرت، دلکشی اور فنی اعتبار سے کسوٹی پر پورے اترنے کے باوجود بعض علمائے لغت اس کو سند نہیں مانتے، اگرچہ وہ خالص عرب تھا، اور اس کے کلام سے مثال نہیں پیش کرتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے کلام میں عبرانی اور سریانی زبان کے الفاظ بھی ملتے ہیں، جن کا تعلق عربی زبان سے نہیں، یہ اس وجہ سے ہوا کہ امیہ پہلے تو تجارت کی غرض سے اور بعد میں حق کی تلاش کی راہ میں عجمیوں اور دوسرے غیر عرب اقوام سے اکثر ملتا جلتا رہتا، ان کی کتابیں پڑھتا رہتا، ان کی باتیں سنتا، چنانچہ ان کی زبان کے بعض الفاظ اسکی زبان پر چڑھ گئے، اور پھر اس کے کلام میں بھی غیر شعوری طور پر در پا گئے، چنانچہ وہ آسمان کو حاقورہ کہا کرتا تھا، اور چاند کو الساہور، اس کا خیال تھا کہ

جب چاند گرہن پڑتا ہے تو درحقیقت چاند ایک غلاف کے اندر چھپ جاتا ہے، اسی طرح اس کا خیال تھا کہ سورج جب ڈوب جاتا ہے تو پھر دوبارہ طلوع ہونے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایسے لوگوں پر طلوع نہیں ہوں گا جو اللہ کو چھوڑ کر مجھے پوجتے ہیں، اس پر اسکے کوڑے لگتے ہیں، دھکے دیے جاتے ہیں، تب وہ دوبارہ طلوع ہوتا ہے، چنانچہ امیہ کہتا ہے:

لیست بطالعة لهم فی رسلها الا معذبة والا تجلد

اسی طرح اس نے اپنے اشعار میں اللہ کو "السلطیط" اور "التغرور" کے نام سے یاد کیا ہے، اس کے علاوہ امیہ ایسی انوکھی باتیں بھی کہتا تھا جنھیں عام طور سے عرب نہیں جانتے تھے۔ ان باتوں کو وہ گذشتہ مقدس کتابوں سے اخذ کرکے عربی میں بیان کرتا تھا، اسکی مثال اس کا یہ شعر ہے:

بایة قام ینطق کل شئ وخان امانة الدیك الغراب

کہتے ہیں کہ ایک مرغ ایک کوّے کا جگری دوست اور یار غار تھا، مگر کوّے نے شراب کی خاطر ایک شراب بیچنے والے کے یہاں اسے گروی رکھ دیا، پھر اسے چھڑانے کے لیے لوٹ کر کبھی نہیں آیا، شراب بیچنے والا جب انتظار کرکے تھک گیا تو اپنی رقم کے عوض اس نے مرغ کو اپنی دکان کا چوکیدار بنا دیا، اسی طرح ہدہد کے بارے میں بھی اس کے چند اشعار مروی ہیں، جن کا ماحصل یہ ہے کہ ہدہد کے سر پر جو کلغی ہے درحقیقت اس کی ماں کی لاش ہے، جسے اس نے مرنے کے بعد اپنے سر پر رکھ لیا تھا،... دفن کرنے کے لیے مناسب جگہ نہ ملی تو اس کی لاش مستقل طور سے اس کے سر پر جم کر رہ گئی، اور جب لاش سڑی تو اس کی بدبو اس کے رگ وپے میں سرایت کر گئی، یہی وجہ ہے کہ ہدہد کے جسم سے ایک خاص قسم کی بدبو آیا کرتی ہے، (تفصیل کے لیے دیکھئے: کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ ص ۲۰۹ اور اسکے آگے)

امیہ کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسکا کلام تعقید معنوی اور تعقید لفظی دونوں سے پاک ہے۔ البتہ ابتدائی زمانے کی شاعری میں جاہلی رنگ پورا پورا جھلکتا ہے۔ یعنی الفاظ کا وہی شان وشکوہ اور گھمبیرپن ہے جو امرؤ القیس کے یہاں ملتا ہے۔ مگر معنی میں وہ رفعت اور ندرت نہیں جو ایسے الفاظ کا تقاضا ہے۔ بلکہ معانی ومطالب بالکل سادہ اور معمولی ہیں۔ جیسے اس کے یہ اشعار

ومايبقى على الحدثان غفر بشاهقة له ام رؤوم
تبيت الليل حانية عليه كما يخرمش الارخ الاطوم
تصدى كلما طلعت لنشز وودت انها منه عقيم

یعنی مصائب زمانہ (یعنی موت) سے پہاڑی بکری کا وہ بچہ بھی نہیں بچ سکتا جو پہاڑی کی چوٹی پر ہو اور اس کے پاس اس کی شدید محبت کرنے والی ماں ہو جو اس کی نگہداشت اور دیکھ ریکھ میں راتوں کو جاگ کر اس طرح گزار دیتی ہو جس طرح کہ ایک نیل گائے جو اپنے بچے پر جان دیتی ہے، چپ چاپ دائیں بائیں اس خیال سے بار بار مڑکر دیکھتی ہے کہ اس کے بچے کو نقصان پہنچانے والا کوئی جانور تو کہیں آس پاس نہیں ہے، چنانچہ اپنے بچے کو بری طرح چاہنے والی یہ گائے جب بھی کسی بلند ٹیلے پر چڑھتی ہے تو سب سے پہلے کان لگا کر سنتی ہے کہ کہیں اس کے بچے کو مار کر داغ جدائی دینے والا کوئی جانور ادھر ادھر تو نہیں ہے۔ اور اس طرح بچے کی خاطر بے چینی اور پریشانی کی تکلیف سے عاجز آکر یہ چاہتی ہے کہ کاش اس نے اسے جنم ہی نہ دیا ہوتا۔

مذکورۂ بالا اشعار میں ایسے بھاری بھرکم اور غریب الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو عام طور سے شعرا کے یہاں نہیں ملتے۔ اسی طرح اس کے یہ اشعار بھی جو اس نے

مقتولین بدر کے مرثیہ کے لیے کہے تھے، موٹے موٹے الفاظ لیکن سطحی معنی کے مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں:

ماذا ببدر فالعقنقل من مرازبة جحاجح

هلا بکیت علی الکرا م بنی الکرام اولی الممادح

یعنی بدر اور اس کے ریت کے ٹیلے پر بڑے بڑے بہادروں، سرداروں اور شہسواروں پر کیا کچھ نہ گذری، تم شریف اور شریف زادوں اور اخلاق و عادات میں بلند ترین اشخاص پر روئے نہیں۔

لیکن اس کا کچھ کلام ایسا بھی ہے جس میں سہل الفاظ اور دلکش اسلوب بیان پایا جاتا ہے، غالباً یہ اس دور کا کلام ہے جب اس کا دل معرفت حقیقت سے معمور ہو چکا تھا، اور اس میں جلا پیدا ہو گئی تھی، اس قسم کے اشعار میں اس نے ابعد الطبیعاتی اور عام ڈگر سے ہٹی ہوئی باتیں کہی ہیں، جیسے دنیا کی پیدائش اور اس کا ایک دن فنا ہو جانا، یا قیامت کے حالات، خالق اور اس کی صفات اور شان اور پھر اس سے تعلق جوڑنے کی وہ باتیں جو اس سے پہلے کسی شاعر نے نہیں کہیں، جیسے اس کے یہ اشعار

الحمد للہ ممسانا و صبحنا بالخیر صبحنا ربی و ممسانا

رب الحنیفة لم تنفد خزائنہ مملوءة طبق الآفاق سلطانا

وقد علمنا لوان العلم ینفعنا ان سوف تلحق اخرانا باولانا

یعنی شکر اس خدا کے لیے سزاوار ہے جو ہماری شامیں اور ہماری صبحیں لاتا ہے۔ اے میرے رب خیر اور بھلائی سے ہماری صبحیں اور شامیں لا، وہ ملت ابراہیمی کا رب ہے، اس کے خزانے ہمیشہ بھرے رہتے ہیں کبھی ختم نہیں ہوتے، اس نے

ساری کائنات کو اپنی طاقت اور کارفرمائی سے گھیر رکھا ہے۔ اگر ہمیں علم سے کوئی فائدہ پہنچ سکے تو ہمیں یہ خوب معلوم ہے کہ ہمارے بچھڑے لوگ آگے جانے والوں سے عنقریب مل جائیں گے یعنی بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

یا اپنے بیٹے سے ناراض ہوکر۔۔۔۔ اس کو ڈانٹتے ہوئے یہ شعر اس نے کہے ہیں

(۱) غذوتك مولوداً ومنتك يافعاً — تعل بما اجنى عليك وتنهل
(۲) اذا ليلة نابتك بالشجو لم ابت — لشكواك الا ساهراً تململ
(۳) كانى انا المطروق دونك بالذى — طرقت به دونى فعينى تهمل
(۴) تخاف الردى نفسى عليك وانى — لاعلم ان الموت حتم موجل
(۵) فلما بلغت السن والغاية التى — اليها مدى ما كنت فيك اومل
(۶) جعلت جزائى غلظة وفظاظة — كانك انت المنعم المتفضل

(۱) تیری پیدائش کے وقت سے تجھے میں نے کھلایا پلایا اور پالا پوسا اور جب تو سیانا ہوا تو تیری تمام ضرورتیں پوری کیں، چنانچہ تو میری کمائی سے گل چھرّے اڑاتا رہا اور جی بھر کر مزے کرتا رہا۔

(۲) اگر کسی رات کو تجھے کوئی تکلیف ہوئی تو میں پوری رات تیری تکلیف کی وجہ سے بیکل ہوکر آنکھوں میں کاٹ دیتا۔

(۳) گویا کہ جو تکلیف تجھے ہو رہی ہے وہ تجھے نہیں بلکہ مجھے ہو رہی ہے۔ اور اس وجہ سے میری آنکھیں گنگا جمنی بہاتی ہیں۔

(۴) میرے دل کو ہر وقت تیری موت کا دھڑکا لگا رہتا تھا، حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ موت کا ایک دن معین ہے۔ اور وہ اس دن آکر رہے گی۔

(۵) مگر جب تو اس عمر اور اس منزل کو پہنچ گیا جس سے میں اپنی امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھا تو

(۶) تو تونے اس کا صلہ سنگدلی اور درشتی سے دیا، گویا کہ تم ہی میرے کرم فرما اور محسن تھے۔

عبد اللہ بن جدعان جو زمانۂ جاہلیت میں اپنی جود وسخا میں بہت مشہور تھا، امیہ کا ممدوح تھا، اس کی تعریف میں اس نے وہ مدحیہ قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع ہے

أأذكر حاجتي ام قد كفاني حياؤك ان شيمتك الحياء

یعنی کیا میں اپنی ضرورت کو کھول کر آپ سے بیان کروں (تب مجھے اپنے انعام واکرام سے نوازیں گے) یا میرے لیے آپ کی خوئے شرم کافی ہے، آپ کی جبلت ہی لحاظ وشرم کرنا ہے۔

اغانی نے روایت کی ہے کہ جب اس نے عبد اللہ بن جدعان کی تعریف میں وہ قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

عطاؤك زين لامرئ ان حبوته ببذل وما كل العطاء يزين

یعنی آپ کی بخشش مانگنے والے کے حق میں زیب وزینت بن جاتی ہے، حالانکہ تمام قسم کے عطیات آدمی کے لیے زیب وزینت نہیں بنتے ہیں یعنی جس کو آپ دیتے ہیں اتنے اعزاز واکرام سے دیتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ وہ اس کو اپنی بے عزتی سمجھے، عزت کا تمغہ سمجھنے لگتا ہے، چنانچہ عبد اللہ بن جدعان اتنا خوش ہوا کہ اپنی دو پسندیدہ لونڈیاں جن کا نام جرادتان تھا اسے انعام میں دے دیں۔

امیہ نے ایک قصیدہ ایسا بھی کہا ہے جس میں اللہ اور فرشتوں کا ذکر کیا ہے،

اس کا مطلع ہے :۔

لک الحمد والنعماء والملک ربنا فلا شئی اعلی منک مجدا و امجد

یعنی اے ہمارے رب تیرے ہی لیے ساری تعریفیں، ساری نعمتیں اور ساری بادشاہی ہے، عزت میں تجھ سے بڑھ کر کوئی شے نہیں ہے۔

اسی قصیدہ میں جبرئیل اور میکائیل فرشتوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے،

امین لوحی القدس جبریل فیہم ومیکال ذو الروح القوی المسدد

یعنی ان فرشتوں میں وحی قدس کے امین جبرئیل بھی ہیں اور میکائیل بھی جو بڑی طاقتور اور پاکیزہ روح کے مالک ہیں،

امیہ بن ابی الصلت کے اس قصیدہ کا جسے مجمہرات میں شمار کیا جاتا ہے، مطلع ہے

عرفت الدار قد اقوت سنینا لزینب اذ تحل بہا قطینا

یعنی میں نے زینب کی وہ جائے رہائش پہچان لی جس میں وہ رہا کرتی تھی، اور جو اب ویران و سنسان پڑی ہوئی ہے

اس کے بعد اپنے آبا و اجداد پر فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ہم لوگ اتنے طاقتور اور رعب داب کے مالک ہیں کہ جس جگہ چاہتے ہیں اتر پڑتے ہیں اور اتنے بہادر ہیں کہ جب دشمنوں سے مقابلہ ہوتا ہے تو خوب تلوار کے جوہر دکھاتے ہیں، اور جس وقت ہم چاہتے ہیں لوگوں کو روک دیتے ہیں اور ہمیں مدد کے لیے بلایا جائے تو ہم مہربانی کا سلوک کرتے ہیں، اور جب آزمانے کے لیے خاندان پر مصیبتیں آن پڑتی ہیں تو ہم لوگ بڑھ کر ان مصیبتوں کو اٹھا لیتے ہیں۔

بانا الناصرون بکل ثغر وانا الضاربون المقتینا

وانا لما نعون اذا اردنا وانا المطعمون اذا دعينا
وان الحاملون اذا اناخت خطوب فی العشيرة تبتلينا

اس کے بعد لڑائی میں اپنی قوم کی بہادری کے کارناموں کو بیان کرنے کے بعد اس قصیدہ کو ختم کر دیتا ہے۔ امیہ کے اس قصیدہ کے بہت سے اشعار معنی اور وزن دونوں میں عمرو بن کلثوم کے مشہور معلقہ سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

اوپر کی مثالوں سے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ امیہ بن ابی الصلت بلاشبہ قادر الکلام شاعر ہے۔ لیکن اسلوب بیان اور معانی و مطالب کے اعتبار سے اس کو کوئی امتیازی شان نہیں حاصل ہے، کیونکہ مابعد الطبیعیاتی تصورات کو چھوڑ کر عام معانی و مطالب پسے ہوئے ہیں۔ بعض علماء نے اسے جاہلی شعراء کے طبقۂ اولیٰ تک میں شمار کیا ہے۔ لیکن اس کے کلام کو دیکھ کر اس میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی کہ ہم اسے طبقۂ اولیٰ میں شامل کر سکیں۔ امیہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے اس زمانہ میں مذہب اور مابعد الطبیعیاتی مسائل پر گفتگو کی ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جو جاہلی شاعری میں ناپید تھے۔ اس لیے بعض علماء کا خیال ہے کہ امیہ نے ان مسائل پر خود تو کم کہا ہے لیکن بعد میں آنے والوں نے ان مسائل سے متعلق اشعار کہہ کر اس کے نام سے مشہور کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے اکثر اشعار ناموزوں، رکیک اور معنی و مطالب کے اعتبار سے بہت گھٹیا ہیں۔

بعض علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ اس قسم کے نامانوس اور جاہلی معاشرہ میں غیر معروف خیالات و افکار کو اس نے دوسرے مذاہب کی کتابوں سے اخذ کر کے عربی کا جامہ پہنا دیا تھا۔ اور چونکہ یہ خیالات عام رجحانات اور سماجی حالات سے میل نہیں کھاتے تھے۔ اور شاید ان سے متعلق خود اسکا ذہن بھی صاف نہیں تھا۔ اس لیے ان اشعار

میں تعقید، ژولیدہ بیانی اور ابہام پیدا ہو گیا ہے، اور اس ژولیدگی اور ابہام کو بڑھانے میں ان تعبیرات اصطلاحات اور ناموں کو بھی دخل ہے جنھیں وہ دوسری کتابوں سے اخذ کر کے عربی میں بیان کرتا تھا، اور لوگ انھیں اچھی طرح نہ سمجھتے تھے، اور نہ اُن کے صحیح معنی اور مفہوم کو جانتے تھے،

کہتے ہیں کہ جب امیہ پر نزع کی کیفیت طاری ہوئی اور مرنے سے تھوڑی دیر پہلے اُسے ہوش آیا، تو وہ فضا میں دیکھ کر کہنے لگا کہ "یہ لو میں تم دونوں کی خدمت میں حاضر ہوں، تم دونوں کی خدمت میں حاضر ہوں، یہ دیکھو تمھارے پاس ہی یہ میں ہوں، اب تو مال نہ مجھے چھٹکارا دلا سکتا ہے، اور نہ خاندان مجھے بچا سکتا ہے، خداوندا اگر تو بخشندہ ہے تو میرے تمام گناہوں کو بخش دینا کیونکہ تیرا کونسا بندہ ایسا ہے جس سے گناہ سرزد نہ ہوئے ہوں، پھر اس نے اپنے پاس کے لوگوں پر ایک نظر ڈالی، اور یہ شعر اس کی زبان پر رواں ہو گئے،

کل عیش وان تطاول دھرا ۔۔۔ منتھی أمرہ الی أن یزولا

لیتنی کنت قبل ما قد بدا لی ۔۔۔ فی رؤس الجبال ارعی الوعولا

اجعل الموت نصب عینیک واحذر ۔۔۔ غولۃ الدھر ان للدھر غولا

ہر زندگی خواہ اس کی مدت کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو، اس کا انجام یہ ہے کہ وہ ایک دن اُسے زوال آکر رہے گا، کاش کہ اس حقیقت کے منکشف ہونے سے پہلے میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر جنگلی بکروں کو چرایا کرتا، تو موت کو اپنا مقصد اور مرکز بنائے رکھ، اور آفاتِ زمانہ سے ہمیشہ ہوشیار رہ کیونکہ زمانہ کی مصیبتیں یکایک آجاتی ہیں،

اس کے بعد اُس نے آنکھیں موند لیں، اور دنیا سے رخصت ہو گیا، اس کی وفات ۶۲۴ء مطابق ۹ھ میں ہوئی،

حوالہ جات :-

(۱) الاغانی جلد ۳ و ۱۲۱ ، (۲) طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی (۳) سیرۃ ابن ہشام ، (۴) الملال السنۃ التاسعہ (۵) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ لجرجی زیدان (۶) الوسیط احمد الاسکندری (۷) تاریخ الادب العربی احمد حسن الزیات (۸) تاریخ العرب قبل الاسلام جواد علی جلد ۵ (۹) البیان والتبیین جلد اول ص ۲۲، و ص ۱۲۹ جاحظ (۱۰) تفسیر امام رازی (۱۲) تفسیر امام بیضاوی (۱۳) مفردات القرآن امام راغب اصفہانی ، (۱۴) کتاب الشعر والشعراء ابن قتیبہ (۱۵) جمہرۃ اشعار العرب : ابو زید القرشی ۱۹۰ (۱۶) حاشیہ الدر المنثور للسیوطی (۱۷) سیرۃ النبی علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸) صاحب الاغانی ابو الفرج الاصفہانی ، دکتور محمد احمد خلف اللہ (۱۹) مع ابی الفرج الاصفہانی فی کتاب الاغانی ، علی العمیر (۲۰) فی الادب الجاہلی الدکتور طہٰ حسین

مقالہ نما

مضامین الندوہ

از مولوی سلطان شمسی صاحب ندوی

(۴)

تذکرہ و سوانح

اکرام اللہ خان ندوی — نومبر ۱۹۱۴ء

۱۔ شمس العلماء شبلی نعمانی

ص ۔ ۲۴ ۔ ۲۸

حوالہ ۲۵/۱

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی وفات ایک ایسا حادثہ جانگداز اور واقعہ ہوشربا ہے جس نے ارباب علم و فن کی مجالس کو ماتم کدہ بنا دیا ہے، اس دور انحطاط میں جب اسلامی علوم و فنون زوال پذیر ہیں، علامۂ مرحوم کی ذات ایک آفتاب روشن تھی، جس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام روشنی حاصل کر رہی تھی،

۲۔ حاجی معین الدین — جولائی ۱۹۳۱ء

ص ۔ ۱۰ ۔ ۲۲

حوالہ ۲/۳

حاجی صاحب دارالمصنفین کے اولین رفقاء میں تھے، اور انھوں نے ایک خوشگوار

اصول میں اپنا کام شروع کیا، اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ ... ابتدا میں سب کام کرنے والے ندوی تھے، اس سے ان کے خیالات و افکار میں یکسانیت تھی، اس کے علاوہ وہ سب علامہ کی بارگاہ فضل و کمال کے حاشیہ نشین تھے، اور کم و بیش ان کے علمی فیوض و برکات سے مستفید ہو چکے تھے۔"

ریاض الحسن صاحب — رجب ۱۳۲۳ھ

۔ "قاضی احمد بن داؤد" — ص ۔ ۱۷ ۔ ۳۲

$\frac{۲۷۹}{۲}$

عہد بنو عباس کے مشہور و ممتاز قاضی تھے، ان کا علم و فضل تشریح و بیان کا محتاج نہیں، اپنے زمانہ میں قبولیت عام اور ہر دلعزیزی جیسی انھیں نصیب ہوئی کسی کو نہ تھی، مامون، معتصم، واثق اور متوکل چار خلیفوں کا زمانہ پایا، زمانہ شباب میں ان کی جاہ و ثروت روز افزوں تھی، لیکن آخری زمانہ نہایت تنگی سے بسر ہوا، اوسط عمر کے ایام خیر الامور بڑے مزے میں گذرے،

مختصر سوانحی اور شخصی حالات

ریاض الحسن صاحب خیال — دسمبر ۱۹۰۸ء

۲۔ ابو الاسود دوئلی — ص ۔ ۲۰ ۔ ۲۹

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۵}$

مختصر سوانح اور حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے،

سلیمان ندوی (سید علامہ) — جون ۱۹۱۱ء

۱۔ دنیا کا بزرگ ترین انسان، — ص ۔ ۱ ۔ ۳ — حوالہ $\frac{۲۷۹}{۸}$

(محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم)

دنیا کا علی الاطلاق سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس کی قلیل مدت میں مذہب، فلسفہ، قانون، معاشرت، قانون تمدن اور قانون سیاست وضع کیا،

"سیرت نبوی سے متعلق مضمون"

۲- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپریل ۱۹۰۸ء

ص ۲۱ - ۳۱

سیرت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حوالہ - ۲۷۹/۵

۳- ابن خلکان اور تاریخ ابن خلکان اکتوبر ۱۹۰۸ء نومبر ۱۹۰۸ء

کے حالات خود تاریخ ابن خلکان سے ! حوالہ ۲۷۹/۵

"اگلن وی اسلین" کا ابن خلکان پر ریویو دیکھ کر تحریک پیدا ہوئی، کہ ابن پر ریویو کیا جائے، ناظرین کو اس میں وہ واقعات نظر نہ آئیں گے، جو بعض دوسرے تذکروں میں موجود ہیں، کیونکہ اس مضمون میں التزام کیا گیا ہے، کہ کوئی واقعہ ابن خلکان سے باہر نہ ہو،"

۴- اعیان و ارکان ندوہ اپریل ۱۹۴۲ء

"تذکرہ سید تجمل حسین صاحب" ص ۴ - ۱۸

حوالہ ۲۸۰/۳

منجملہ اُن بزرگوں کے جو ندوۃ العلماء کے ابتدائی شرکاء میں تھے، ایک قابلِ ذکر ہستی مولانا شاہ سید تجمل حسین صاحب دسنوی بہاری کی ہے، جن کا ذکر الندوہ میں ضمناً آیا ہے، گو اب اکثر لوگ ان کو بھول چکے ہوں گے، لیکن اخلاف سعید کا فرض ہے کہ اسلاف کرام کے ناموں اور کاموں کو محفوظ رکھیں، (سوانح اور شخصی حالات)

۵۔ امام بخاری ، جنوری ۱۹۰۶ء

ص ۔ ۶ ۔ ۲۵

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۳}$

"صحیح بخاری کو مسلمانوں میں جو عام مقبولیت حاصل ہے اس کا اندازہ صرف اس امر
ہو سکتا ہے، کہ صحت کے لحاظ سے کتاب اللہ کے بعد اس کو جگہ دی گئی، لیکن افسوس ہو کہ
ت کم لوگ اس کے نامور جامع کے حالات سے واقف ہوں گے، اس لئے اس مضمون
ہم امام موصوف کے حالات جمع کر کے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں"

۶۔ امام مالک جنوری ۱۹۰۷ء

ص ۔ ۱ ۔ ۱۵

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۳}$

"مسلمانوں نے جس طرح سے امام صاحب کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے وہ
ں سے ظاہر ہے، کہ مورخین نے امام کے سوانح کا کس جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے
لامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ میں نے ایک مستقل کتاب امام مالک کے حالات میں لکھی ہے
ریخ کبیر میں بھی بسط کے ساتھ حالات لکھے ہیں"

۷۔ مولانا بحر العلوم اور ان کی اپریل و مئی ۱۹۰۷ء
یک صدی سالگرہ حوالہ ۔ $\frac{۲۷۹}{۴}$

ہندوستان کے مطلع پر ۹ سو برس تک اسلامی ہلال چمکتا رہا۔ اس عرصہ میں آسمان علم
کے سیکڑوں ستارے نکلے، اور ڈوبے اور سیل علوم بڑھے اور گھٹے، مگر بحر العلوم اس شان
سے معقولات کے افق پر طلوع ہوا، کہ اکثر ستارے اس کے آگے ماند پڑ گئے، ۱۲۲۵ء میں

بحر العلوم نے وفات پائی، اور یہ ۱۲۳۵ھ ہے، اس تقریب سے یہ مضمون بحر العلوم کی
یک صدی سالگرہ کی یادگار ہے۔"

۸۔ سید رشید رضا مصری . مارچ ۱۹۱۲ء

۳۔ ۵۔

حوالہ ۲۷۹

"سید رشید رضا جو ندوہ کے ۱۹۱۲ء کے جلسۂ سالانہ کی شرکت کی غرض سے ہندوستان
پہنچے ہیں، چونکہ ان کے حالات سے لوگوں کو بہت کم واقفیت ہے، اس لئے ایک عام واقفیت
کے لئے اُنکا کسی قدر تذکرہ مناسب ہوگا "

" مختصر حالات "

۹۔ لارڈ کالون مارچ ۱۹۰۸ء

ص ۔ ۲۲۔ ۲۹

حوالہ ۲۷۹/۵

ہمارے علما اور طلبہ کو ارسطو، فلاطون، بقراط کے نام ان کے کارنامے اس
طرح حفظ ہیں کہ مذہبی پیشواؤں کے بھی نہ ہوں گے لیکن یورپ کے موجودہ حکما اور
ان کی ایجادات اور اختراعات سے اس قدر بے خبر ہیں کہ ان کو ایزک ٹیلر، ڈیکارٹ
پاسٹور، ہیکل، نیوٹن کے نام معلوم ہیں، چونکہ ندوہ کا ایک مقصد دونوں مذاقوں کا باہم
آشنا کرنا ہے، اس لئے یورپ کے حکما اور ان کی تحقیقات سے بھی الندوہ کے ناظرین
متمتع ہوتے رہیں"

" لارڈ کالون کی شخصیت کا جائزہ "

شبلی نعمانی علامہ جولائی ۱۹۰۹ء

۱۔ابن تیمیہ، ص ۔ ۵ ۔ ۱۹

حوالہ ۲۷۹/۵

" علامۂ موصوف نے جن اساتذۂ علوم سے تحصیل کی اُن کی تعداد ۲۰۰ تک پہنچتی ہے جن میں مشاہیر کے نام یہ ہیں، ابن ابی الیسر، کمال بن عبد، شمس الدین حنبلی، قاضی شمس الدین بن عطا الحنفی، شیخ جمال الدین صیرفی، مجد الدین بن عساکر، نجیب مقداد، ابن ابی الخیر، ابن علان، ابوبکر ہروی، کمال، عبد الرحیم فخر الدین بن البخاری، ابن شیبان، شرف بن القواس "

۲۔ابن رشد ۔ رجب ۱۳۲۲ھ و ذی قعدہ ۱۳۲۲ھ

ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ

حوالہ ۲۷۹/۱

عرب مورخ متفق اللفظ ہیں کہ اندلس میں فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا عام طور پر ناممکن تھا، اگر یہ صحیح ہے تو ابن رشد، ابن طفیل، ابن باجہ جیسے حکماء کا اس ملک میں پیدا ہونا اسبابِ تاریخی کے خلاف ہے، اس لئے ہم اس عقدہ کو حل کرنا چاہتے ہیں،

۳۔ابوطالب کلیم، نومبر و دسمبر ۱۹۰۹ء

حوالہ ۲۷۹/۲

ملک الشعرا شاہجہانی۔

یہ یگانۂ فن صحیفۂ شاعری کا اخیر ورق ہے، اور اس کے نام پر شعر العجم بھی تمام ہوئی، شاہجہان نے اس کے صلہ میں روپیہ کے برابر تلوایا، چنانچہ ۵۰۰۰ روپے وزن میں آئے،

اور اس کو دیئے گئے،

۴۔ ڈاکٹر برٹن جون ۱۹۰۹ء

ص ۔ ۱۰ ۔ ۱۲

حوالہ ۲۷۹/۶

"ڈاکٹر برٹن جرمن کا مشہور فاضل ہے، وہ کثرت سے مختلف زبانیں جانتا ہے اور اس نے تین یونیورسٹیوں سے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی ہے، چار برس سے اُس نے اپنی زندگی صرف عربی فلسفہ کی تحقیقات پر وقف کر دی ہے"

۵۔ زیب النساء اکتوبر ۱۹۰۹ء

ص ۔ ۴ ۔ ۱۴

حوالہ ۲۷۹/۶

مسلمانوں میں بازاری اہل قلم نے زیب النساء کے جو حالات تجارتی غرض سے قلم بند کئے، وہ بالکل بے سروپا ہیں، اس بنا پر خیال ہوا کہ زیب النسا کے متعلق صحیح معلومات یکجا کر دیئے جائیں ۔۔ جس سے یہ فائدہ ہوگا کہ غلط معلومات کی اصلاح ہو جائے گی،

۶۔ عالمگیر دسمبر ۱۹۰۶ء تا جولائی ۱۹۰۷ء

حوالہ ۲۷۹/۳ ۔ ۴

عالمگیر کی بدنامی کا قصہ ... کچھ کم نہیں اس کی فرد قرارداد جرم اتنی لمبی ہے کہ شاید کسی مجرم کی نہ ہوگی، باپ کو قید کیا، بھائیوں کو قتل کرایا، دکن کی اسلامی ریاستیں مٹادیں، ہندوؤں کو ستایا، بت خانے ڈھائے، مرہٹوں کو چھیڑ کر تیموری

سلطنت کے ارکان متزلزل کر دئے لیکن اور تمام باتوں سے قطع نظر کرکے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس خاندان میں عادل سے عادل بادشاہ پر قریب قریب یہ قرار داد جرم قائم ہوسکتی ہے یا نہیں؟

۷۔ متنبی۔ ربیع الآخر ۱۳۲۳ھ

ص۔ ۵۔ ۲۴

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۲}$

"متنبی اگرچہ چوتھی صدی کا شاعر ہے جبکہ شعرائے عرب کے تمام اوصاف مٹ چکے تھے، اور جب کہ شاعری صرف بھٹئی اور گداگری رہ گئی تھی، تاہم چونکہ متنبی کا بچپن صحرائے عرب اور بدویوں میں گذرا تھا، اس لئے عرب کے بہت سے شریفانہ اخلاق اس میں نظر آتے ہیں،

متنبی پر مبسوط مقالہ شخصیت اور شاعری کا جائزہ اور تجزیہ"

۸۔ ملک الشعراء فیضی ستمبر ۱۹۰۸ء

ص۔ ۲۷۔ ۳۲۔

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۵}$

"فن شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا ہوئے جس کو اہل زبان کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا، خسرو اور فیضی ... فیضی کے مذہبی اور علمی خیالات کا برائے نام کچھ پتہ چلتا ہے، تو ان اتہامات سے جو بدایونی نے نہایت بے دردی سے اس پر لگائے ہیں،"

۹۔ مرزا صائب مئی ۱۹۰۶ء ص۔ ۵۔ ۲۰

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۳}$

ایران میں شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور مرزا صائب پر ختم ہو گئی ......
مرزا صائب بھی اس عہد کی یادگار ہیں، اور سچ یہ ہے کہ کلیم کے سوا اس دور میں کوئی شخص اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور اس کے بعد تو عالمگیر کے زہد خشک نے شاعری کا چراغ ہی گل کر دیا۔"

۱۰- طالب آملی، جون ۱۹۰۶ء

ص - ۱ - ۱۹

حوالہ ۲۷۹/۳

طالب آمل کا رہنے والا تھا، جو ماژندران کا ایک شہر ہے، بچپن میں درسی علوم وفنون کی تعلیم پائی، اور اگر اس کی شہادت پر اعتبار کیا جائے، تو ۱۵-۱۶ برس کی عمر میں اس نے ہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف اور خوشنویسی میں کمال حاصل کر لیا"

۱۱- عمر بن عبدالعزیزؒ ذی الحجہ ۱۳۲۲ء

ص - ۱ - ۱۱

حوالہ ۲۷۹/۱

مناقب عمر ابن عبدالعزیز کے موضوع پر ابن جوزی کی کتاب سیرۃ العمرین پر مختصر ریویو کے بعد اس سے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں، جس سے شخصیت اور سیرت پر روشنی پڑتی ہے

شیروانی حبیب الرحمٰن خاں صدر یار جنگ مارچ ۱۹۰۲ء

۱- ندوہ کا مشرقی مطلع ص - ۹ - ۱۴

(حضرت فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی) حوالہ ۲۰۷

اس مضمون میں بتایا ہے کہ اس سلسلہ کا رابطہ ایک اور روحانی مرکز سے بندھا ہے

جس کا نامِ نامی حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی تھا،.... مشرق و مغرب کے یہی دو مطلع تھے، جن سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع ہوا۔"

۲۔ شیخ محمد طاہر گجراتی، جولائی ۱۹۰۷ء

ص ۔ ۱ ۔ ۵ ۔

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۴}$

خاکِ ہندوستان سے جو نامور علماء پیدا ہوئے، اُن میں شیخ محمد طاہر رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ شیخ ممدوح اس ملک کے ان معدودے چند علماء میں سے ہیں، جن کی قسمت میں فنِ حدیث کی خدمت اور احیاء سُنّت کی سعادت لکھی تھی، مغلیہ سلطنت جہاں اور بہت سی برکتیں لائی تھی، وہاں حدیث و سُنّت کے رواج کی نعمت بھی لائی تھی،

۳۔ امام لیث مصری ذی الحجہ ۱۳۲۲ء

ص ۔ ۱۸ ۔ ۲۸

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۱}$

"یہ امر قابلِ غور ہے کہ امام لیث جو علومِ دینیہ میں طبقہ تبع تابعین میں فائق تھے، اُن کا دنیاوی جاہ و جلال امرائے زمانہ سے بدرجہا فائق تھا، فی الواقع اس حریت اور آزادی جو عہد کا (جو تعلیم اسلام کی پابندی نے اس عہد کے مسلمانوں میں پیدا کر دی تھی) یہ جلوہ تھا کہ دینی و دنیاوی دونوں میدانوں میں وہ مردانہ وار آگے تھے۔

۴۔ مولانا محمد حسین الٰہ آبادی شعبان ۱۳۲۲ھ

ص ۔ ۱۹ ۔ ۲۰ حوالہ $\frac{۲۷۹}{۱}$

"حالِ وفات"

ادبیات

محسنِ انسانیت (اردو احناف)

از

جناب وارث القادری

نہ مثال ہے مری صبح کی نہ جواب ہے مری شام کا
ہوں فدائے جلوۂ مصطفیٰ یہ کرم ہے ربِّ انام کا

وہ نبی حق کہ سکھا گیا جو شعور امن و سلام کا
ہے جہانِ حیات میں روشنی یہ کرم اُنہی کے پیام کا

ہو نصیب قرب و وراس طرح ہو نصیب بابِ سلام کا
کہ سلام شوق یہ مرتے ہیں مدعا ہے غلام کا

ہے عجیب مومنِ دورِ نو کہ فقط ہے نام ہی نام کا
نہ رکوع کا نہ سجود کا، نہ قعود کا نہ قیام کا

جو نگاہِ لطف و کرم اُٹھے تو سنوار دیں وہ آنِ میں
کہ بس انحصار انھیں پہ ہے مری زندگی کے نظام کا

یہ شرف عجیب عطا ہوا کبھی کر سکوں گا نہ شکر ادا
کہ خدا کے فضل سے اُمتی ہوں شفیعِ روزِ قیام کا

ہے سحر امید کی جلوہ گر انھیں آنسوؤں میں اگر دو قمر
کہ یہ دردِ عشق پیامبر ہے امینِ عیشِ دوام کا

مرا میکدہ وہ ہے میکدہ ہے جہاں خمارِ الست کا
اسے میکدہ میں بناؤں کیا جہاں صرف دور ہے جام کا

نہ تو نور ہی ہو نہ یہ ضیا نہ یہ چاندنی کا ہی سلسلہ
جو فلک کے چاند میں عکس ہو نہ حضور کے ماہِ تمام کا

بس انھیں کے حکم پہ کر عمل جو غلط ہو راہ نہ اس پہ چل
اسی بات میں تری بات ہے یہی کام ہے ترے کام کا

یہ مرے حضور کا آستاں ہے پناہ گاہ ہر انس و جاں
نہ تو شرط ہے کوئی خاص کی نہ سوال ہے کوئی عام کا

کبھی اس خیال پہ تو نہ جا یہ ہجوم یہ ہے نسب ترا
کہ بروزِ حشر　معاملہ ہے حساب نام پہ نام کا

ترے رخ سے جس کی نظر ہٹی تری زلف سے جو جدا ہوا
نہ اِدھر کا ہے نہ اُدھر کا ہے نہ وہ صبح کا نہ وہ شام کا

تری عظمتوں کا شمار کیا تری رفعتوں کی مثال کیا
کہ حریف کوئی نہ بن سکا ترے آستاں کے غلام کا

ہے خدا کا اس پہ بڑا کرم کہ بنا ہوا ہو جو شیفتہ
تری ذات کا تری بات کا ترے کام کا ترے نام کا

وہ بشیر ہیں وہ نذیر ہیں وہ رؤف ہیں وہ رحیم ہیں
کوئی مرتبہ نہ سمجھ سکے گا نبیؐ عرش مقام کا

جو خلاف دورِ جہاں ہوا جو زمانہ دشمنِ جاں ہوا
تو کچھ اور رنگ نکھر گیا مرے نقش ہائے دوام کا

مری چشم دل میں ہیں جھلکیاں رخِ پر ضیائے رسول کی
نہ مری نظر کو فریب دے کوئی جلوۂ سر بام کا

یہی چیز باعثِ فخر ہے مرے حق میں وآسیِ بے نوا
کہ جو دو جہاں کے ہیں پیشوا ہوں غلام اُن کے غلام کا

نعت

از جناب وفا براہی

دل ہے مستِ جامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
لب پہ ہو وردِ نامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

دینِ دو عالم دیں ہوا انکا حکمِ خدا آئین ہوا انکا
کلمۂ حق پیغامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اہلِ زمیں بھی اہلِ فلک بھی حور و پری بھی جن و ملک بھی
سب پہ ہے فیضِ عامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

شانِ فروغِ نورِ تجلی، جلوۂ بامِ طورِ تجلی
رونقِ صبح و شامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

مدرسۂ تسلیم و رضا ہے قبلۂ اہلِ صدق و صفا ہے
سایۂ قصر و بامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نفسِ اہلِ حل و حرم کیا، طائرِ جاں تک روحِ قدس کا
سب ہیں اسیرِ دامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ہبطِ وحیِ خاصِ الٰہی، منبعِ فیضِ لا متناہی
ہیں لبِ شیریں کامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نوحؑ و خلیلؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ کہتے تھے جس اسلام کا دعویٰ[عہ]
ہے یہ وہی اسلامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

لاکھ غریقِ بحرِ گنہ ہو جانتے ہیں سب لیکن آ وفا کو
رندِ قدح آشامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

[عہ] شرع لکم من الدین ما وصی به نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصینا به ابراهیم و موسیٰ و عیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه ۱۰

صلّ علیٰ کہیے

از

جناب ماہرالقادری

رسول مجتبیٰ کہیے، محمد مصطفیٰ کہیے
خدا کے بعد بس وہ ہیں پھر اس کے بعد کیا کہیے

شریعت کا ہے یہ اصرار ختم الانبیا کہیے
محبت کا تقاضا ہے کہ محبوب خدا کہیے

جبین و رُخ محمد کے تجلی ہی تجلی ہیں
کسے شمس الضحیٰ کہیے، کسے بدرالدجیٰ کہیے

جب ان کا ذکر ہو دنیا سراپا گوش ہو جائے
جب ان کا نام آئے مرحبا صلّ علیٰ کہیے

غبار راہ طیبہ سرمۂ چشم بصیرت ہے
یہی وہ خاک ہے جس خاک کو خاک شفا کہیے

مرے سرکار کے نقش قدم شمع ہدایت ہیں
یہ وہ منزل ہے جس کو مغفرت کا راستہ کہیے

محمد کی نبوت دائرہ ہے نور وحدت کا
اسی کو ابتدا کہئے اسی کو انتہا کہیے

مدینہ یاد آتا ہے تو پھر آنسو نہیں رکتے
مری آنکھوں کو ماہر چشمۂ آب بقا کہیے

مطبوعات جدیدہ

تفسیر ارجوزۃ ابی نواس ترتیب و تحقیق الاستاذ محمد بہجۃ الاثری، تقطیع کلاں کاغذ و کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۸ قیمت تحریر نہیں۔ پتہ:۔ مجمع اللغۃ العربیہ دمشق

دولت عباسیہ کا مشہور وزیر فضل بن ربیع علم و ادب کا بڑا قدر داں اور سرپرست تھا، متعدد شعراء اور فضلا اس سے متوسل تھے، ان میں زیادہ مقرب ابونواس تھا، اس نے فضل کی مدح میں کئی قصیدے کہے تھے، ایک قصیدہ بحر رجز میں ہے جو بعض حیثیتوں سے خاص اہمیت رکھتا ہے، چوتھی صدی ہجری کے مشہور ادیب اور امام لغت و نحو ابوالفتح عثمان ابن جنی نے اسکی شرح لکھی تھی، اس میں قصیدہ کے مشکلات حل کئے گئے ہیں اور غریب الفاظ اور نحوی مسائل سے خاص طور پر بحث کی گئی ہے، اس شرح کا ایک قلمی نسخہ مدینہ کے کتبخانہ شیخ الاسلام اور دو لندن کے کتبخانہ میں ہیں، اب دمشق کی مجمع اللغۃ العربیہ کے ایک فاضل ممبر محمد بہجۃ الاثری نے اسکو ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، گو فاضل مرتب کے پیش نظر صرف مدینہ ہی کا قلمی نسخہ تھا اور لندن کے دونوں نسخوں تک رسائی نہیں ہو سکی، تاہم انھوں نے اس ایک نسخہ کی مدد سے بڑی محنت و کاوش سے اسکی تصحیح کرکے حواشی و تعلیقات لکھے ہیں، حواشی میں متن کے اسماء و اعلام کے تراجم، بلاد و اماکن کی تحقیق، آیات و احادیث کی تخریج اور ان تحقیق طلب باتوں کی تشریح کی گئی ہے جن سے شارح نے تعرض نہیں کیا تھا یا اختصار کے ساتھ کیا تھا، شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے، اس میں ارجوزہ کی شرح کے متعلق ضروری باتیں، ممدوح (فضل بن ربیع) قصیدہ نگار (ابونواس) اور شارح (ابن جنی)

کے حالات درج ہیں، اس نادر و کمیاب کتاب کو شائع کر کے فاضل مرتب نے عربی زبان و ادب کی مفید خدمت انجام دی ہے،

مدارج سلوک | مرتبہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۸۰ مجلد مع گرد پوش قیمت صر، پتہ:- مجلس معارف القرآن دار العلوم دیو بند۔

سلوک و تصوف مصنف کا خاص موضوع ہے اور اس پر ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکل چکی ہیں یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں وصول الی اللہ کے مندرجہ ذیل چار مدارج کی مفصل تشریح کی گئی ہے، (۱) تزکیہ نفس (۲) تصفیہ قلب (۳) تخلیہ سر (۴) تجلیہ روح۔ فاضل مصنف نے ان طریقوں کی حقیقت و غایت اور ان کے حصول کی صورتیں اور ان میں درجۂ کمال حاصل کرنے کے ذرائع اور ان کے موانع بیان کئے ہیں، اور قرآن و حدیث سے انکی سند پیش کی ہے مگر اس میں بعض ضعیف روایات بھی درج ہو گئی ہیں، تصفیۂ قلب کی بحث میں جو در اصل ذکر الٰہی کا نتیجہ ہے، ذکر و صلوٰۃ کی اہمیت و مقصد اور ذکر کی مختلف صورتوں، اور تصوف کے تین مشہور سلاسل قادریہ، نقشبندیہ اور چشتیہ میں مروج اذکار و اوراد کا مفصل تذکرہ ہے، فاضل مصنف کو تصوف کے دقیق مسائل و مصطلحات کو سلیس انداز میں بیان کرنے کا خاص ملکہ ہے، یہ کتاب بھی اس کا نمونہ ہے اور علمی اور دینی ذوق رکھنے والوں خصوصاً سالکانِ طریقت کے مطالعہ کے لائق ہے،

مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش | مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۱۴ مجلد مع گرد پوش قیمت سے، پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ،

اس کتاب کے پہلے عربی اور اردو اڈیشنوں پر معارف میں تبصرہ کیا جا چکا ہے، اب اس کا دوسرا

اردو اڈیشن اہم اور مفید اضافوں کے بعد شائع کیا گیا ہے، اس میں اسلامی ملکوں ترکی، پاکستان، مصر شام، عراق، ایران، انڈونیشیا، تونس اور الجزائر کے تجدد نواز اور مغربیت پسند عناصر اور اصلاحی تحریکوں اور دینی حلقوں کی کشمکش کا جائزہ لیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ ان ملکوں کے حکمرانوں نے غیر اسلامی اقدار اور مغربی انداز فکر کو اختیار کر لیا مگر عوام میں اسلام سے ذہنی وجذباتی لگاؤ اور گہری وابستگی پائی جاتی ہے، آخر میں مغربیت کے ہمہ گیر غلبہ کے اسباب، اس کے علاج اور مسلمانوں کے داعیانہ اوصاف کردار کی وضاحت کرکے ان ملکوں خصوصاً ان کے سربراہوں کو ان کی اصل ذمہ داری کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، مصنف نے جس دلسوزی اور جذبۂ صادق سے یہ کتاب لکھی ہے ضرورت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان خاص طور سے اس پر غور کریں (یا قوسنا اجیبوا داعی اللہ) یہ کتاب ظاہری حیثیت سے نہایت دیدہ زیب ہے،

بنو ہاشم اور بنو امیہ کے تعلقات

مرتبہ جناب سلام اللہ صدیقی صاحب

تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۱۱۲ قیمت عہ پتہ: مکتبۂ اسلامی ادب، للہ پورہ، فاطمان، دارالسنی،

بنو ہاشم اور بنو امیہ کی چشمک ومخاصمت مشہور ہے جس میں اصلیت کم اور مبالغہ زیادہ ہے، اس کتاب میں لائق مصنف نے دکھایا ہے کہ دونوں خاندانوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے، جاہلی اور اسلامی عہد ہی میں نہیں بلکہ صفین اور کربلا کے واقعات کے بعد بھی دونوں گوناگوں رشتوں میں جکڑے ہوئے تھے اور اسلام میں سبقت اور ایثار وقربانی میں بھی بنو امیہ بنو ہاشم سے پیچھے نہ تھے اور بعض اعتقادی وسیاسی امور میں اختلاف کے باوجود حضرت عثمانؓ و امیر معاویہؓ کو حضرت علیؓ کی اور یزید کو امام حسینؓ کی عظمت کا پورا اعتراف تھا اس کتاب کا موضوع بڑا نازک ہے تاہم مصنف نے افراط وتفریط سے بچنے کی پوری کوشش

کی ہے، اس لئے یہ قصیدہ اور نثر دونوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

تسہیل الاملاء از لالہ تیج رام صاحب ایم۔ اے تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۱۱۲ قیمت ۶/ روپیہ پتہ کتبخانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی

متقارب الصوت حروف مثلاً ا،ع، ت، ط، ث، س، ص، ذ، ز، ض، ظ اور چند دوسری نوعیت کے مفرد و مرکب الفاظ کے املا و تحریر میں اشتباہ اور غلطی سے بچانے کیلئے مصنف نے یہ رسالہ لکھا تھا جس میں اس طرح کے متعدد الفاظ یکجا کر کے ان کے املا کی صحت کے متعلق ہدایات تحریر کی گئی ہیں، منشی عبدالقدیر صاحب نے لفظوں کے اعراب و معانی کا اضافہ کر کے اسکو شائع کیا ہے، اس زمانہ میں عربی و فارسی بلکہ اردو کا رواج کم ہو جانے سے عام لوگ خصوصاً اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ املا میں فاحش غلطیاں کرتے ہیں، اس کتاب کی اشاعت نے وقت کی ایک ضرورت کو پورا کیا ہے، اردو زبان کے طالب علموں کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

بانگ درون مرتبہ ع۔م ساجد صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۱۴۰ مجلد مع گردپوش قیمت ۸/ پتہ کتاب منزل، سبزی باغ۔ پٹنہ

یہ جناب عبدالماجد اختر سابق صدر شعبۂ فارسی واردو مظفر پور کالج کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے، مصنف پرانی وضع کے سنجیدہ بزرگ ہیں، انکو تصوف سے بھی ذوق ہے، اسلئے انکا کلام عارفانہ و حکیمانہ خیالات، اخلاق اور دنیا کی بے ثباتی وغیرہ کے مضامین پر مشتمل ہے، زبان و بیان سادہ ہے اس لئے کلام میں بیساختگی ہے مگر کہیں کہیں سپاٹ اور روکھا پن آگیا ہے، شروع میں جناب عطا کاکوی کے قلم سے مصنف کا عقیدتمندانہ تعارف ہے۔

(ض)

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب و امریکہ، اسلامی رصد خانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت، لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ۔ قیمت: عہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین، قیمت: عہ

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت: عہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے، اور جنھوں نے اس کو دیگر ستان جنان بنا دیا، کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی ایم اے قیمت: بعہ

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

مصنفات سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

۱- **بزم تیموریہ**: تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۰۴ صفحے قیمت: لعہ

۲- **بزم مملوکیہ**: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادباء کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے ۳۵۰ صفحے قیمت: ۔ عہ

۳- **بزم صوفیہ**: عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴- **ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک**

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے، ۵۰۷ صفحے، قیمت: عہ ۲۵

۵- **ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام**

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰۰ صفحے قیمت: عللہ

۶- **ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے**

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت: سعہ

۷- **ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر**

ضخامت: ۲۲۸ صفحے، قیمت: صہ

۸- **ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں**

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت: عہ

۹- **ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں**

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: صہ

۱۰- **عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں**

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد یا بیدعہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۶ صفحے، قیمت: لعہ

منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)
جولائی سنہ ۱۹۷۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

مجلسِ ادارت

۱ - جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی،
۲ - جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی الہ آبادی،
۳ - شاہ معین الدین احمد ندوی،
۴ - سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے۔

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت و نسل و رنگ و زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اس کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے حقوق، جن میں اہلِ کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

..... (مرتبہ) .....

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت :- ۳۳۰ صفحے   قیمت :- ہے

جلد ۱۱ ماہ جمادی الاولیٰ و جمادی الاخریٰ سنہ ۹۲ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۷۲ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

شملہ کانفرنس پر ساری دنیا کے امن پسند ملکوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں، اگرچہ اس میں اہم متنازعہ فیہ مسائل کا تصفیہ نہیں ہوسکا، اور ایسے پیچیدہ مسائل کا تصفیہ اتنی جلد ہو بھی نہیں سکتا تھا، مگر ایسی بنیادی باتوں پر دونوں کا اتفاق ہوگیا ہے جس سے آئندہ مصالحت کی راہ ہموار ہوگئی ہے، اس کانفرنس کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے، امید ہے کہ جلد ہی دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات قائم ہوجائیں گے اور ڈاک و آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوجائے گا، اس کامیابی میں مسز اندرا گاندھی اور مسٹر بھٹو دونوں کے تدبر کو دخل ہے، اور مسز اندرا گاندھی کی کشادہ دلی خصوصیت سے لائق تحسین ہے، اگر اسی جذبہ سے کام لیا جائے تو متنازعہ فیہ مسائل کا تصفیہ دشوار نہیں ہے۔

یہ مسلم ہے کہ دونوں ملکوں کی فلاح امن و صلح پر موقوف ہے، دونوں کو اس کا تجربہ ہوچکا ہے کہ جنگ سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں، پاکستان ہندوستان کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے بہت چھوٹا ملک ہے، تنہا اس میں اسکے مقابلہ کی طاقت نہیں اور دوسروں کے سہارے کا اسکو پورا تجربہ ہوچکا ہے، اسلئے اس کیلئے امن و صلح کے سوا سلامتی کی کوئی راہ نہیں ہے، ہندوستان سے جنگ کرنا اس کیلئے خودکشی ہوگی، ہندوستان اگرچہ پاکستان سے بڑا ملک ہے لیکن جنگ اور باہمی کشمکش اور بے اعتمادی کی فضا میں وہ بھی امن و سکون سے نہیں رہ سکتا، اسلئے اسکے لئے بھی صلح و مفاہمت ہی کی راہ مفید ہے، ہندوستان و پاکستان اگرچہ سیاسی حیثیت سے دو ملک ہوگئے، لیکن جغرافی حیثیت سے ان میں ایسی وحدت ہے کہ دونوں کا استحکام اور ترقی ان کے اتحاد و اتفاق ہی پر موقوف ہے، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ و کشمکش کا خمیازہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے، اس لئے اس مصالحت سے انکو خصوصیت کے ساتھ زیادہ مسرت ہے،

آج کل قوم پرستی، فرقہ پرستی اور سیکولرزم کا بیجا استعمال اتنا بڑھ گیا ہے کہ ان کا صحیح مفہوم اور شناخت مشکل ہے، جہاں کسی اقلیت نے اپنے کسی حق کا مطالبہ کیا، خواہ وہ کتنا ہی جائز اور دستوری کیوں نہ ہو، اس کو

قومیت اور سیکولرزم کا مخالف اور فرقہ پروری کا مجرم قرار دیدیا گیا، اردو زبان کا مسئلہ ہو یا پرسنل لا کا یا تعلیم کا ہو یا مسلم یونیورسٹی کا، سب پر فرقہ پروری کا لیبل لگ چکا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثریت کی مرضی کا نام قوم پروری ہے اور اقلیت کے مطالبات کا فرقہ پرستی،

ہندوستان کے جمہوری اور سیکولر دستور نے ملک کے سارے باشندوں کو اس کا شہری اور ملکی حقوق میں برابر کا حصہ دار مانا ہے، اور اقلیتوں کے مذہب، زبان اور کلچر کے تحفظ کی پوری ضمانت دی ہے، اگر کسی سبب سے اس پر عمل میں کوتاہی ہوتی ہے تو اس کا مطالبہ اور اس کے لئے پرامن احتجاج کو فرقہ پروری کس طرح کہا جاسکتا ہے، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ تو جمہوریت اور سیکولرزم کی جان ہے اور اس کے لئے کوشش اس کی بہت بڑی خدمت اور تحفظ وہی معتبر مانا جائیگا جس کا خود اقلیتوں کو اعتراف ہو، ہندوستان میں صحیح معنوں میں سیکولرزم اسی لئے قائم نہیں ہو سکی کہ اقلیتوں کے مسائل کو نظر انداز کیا گیا،

سیکولرزم کا مفہوم یوں تو بہت وسیع ہے لیکن زیر بحث معاملہ میں اس کا تعلق صرف حکومت اور ملکی معاملات سے ہے، سیکولر حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا کوئی مذہب نہیں، اس کی نگاہ میں سارے مذاہب اور ان کے ماننے والے برابر اور ملکی حقوق میں یکساں ہیں، اور وہ مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتی، سیکولر نقطۂ نظر کے معنی یہ ہیں کہ ملکی معاملات کو مذہبی نقطۂ نظر کے بجائے ملکی مصالح اور مفاد کے لحاظ سے دیکھا جائے، اس میں اقلیتوں کے مذہبی، لسانی و تہذیبی حقوق کے مسئلے نہیں آتے، کیونکہ خود سیکولر دستور نے ان کے تحفظ کی ضمانت دی ہے، اسلئے ان کا مطالبہ اور اس کیلئے آئینی احتجاج کسی حیثیت سے بھی سیکولرزم کے خلاف نہیں، ورنہ پھر جمہوریت اور ڈکٹیٹر شپ میں فرق کیا رہجاتا ہے، قومی وحدت اور سیکولرزم کا دائرہ اتنا وسیع کر دینا کہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے باہر نہ رہجائے، نہ صحیح ہے اور نہ ملک کے لئے مفید،

قوم پروری اور سیکولرزم کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ہندوستان کے سارے باشندے ایک رنگ میں رنگ دیئے جائیں، ایسی وحدت و یکرنگی تو سیکولرزم کے سراسر خلاف ہے، صحیح سیکولرزم کے معنی یہی ہیں کہ ملک کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ کو اس کی خصوصیات کے ساتھ زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا جائے، وطنی حیثیت اور مشترک ملکی مفاد کے لحاظ سے بلاشبہ ہندوستان کے سارے باشندے ایک قوم ہیں، لیکن مذہبی تہذیبی اور لسانی حیثیتوں میں اتنا اختلاف ہے کہ مسلمان تو مسلمان

سارے ہندوؤں کو بھی ایک قوم کہنا مشکل ہے چنانچہ خود ہندوستان کے بہت سے مفکرین کا خیال ہے کہ ہندوستان ایک قومی ملک نہیں بلکہ مختلف قوموں کا مجموعہ ہے اسلئے ان میں تہذیبی وحدت پیدا کرنے کی کوشش جمہوریت اور سیکولرزم کے بھی خلاف ہے اور ملکی مفاد کے بھی، ملک کی بہی خواہی اسی میں ہے کہ ان میں تہذیبی وحدت پیدا کرنے کی کوشش نہ کیجائے، بلکہ ہر فرقہ کو اس کی خصوصیات کے ساتھ زندہ رہنے کا موقع دیا جائے،

اس کا اعتراف ہے کہ اس قسم کے معاملات میں حکومت اور اکثریت کے کچھ مسلمان بھی ہمنوا بن جاتے ہیں، مگر ان کی کوئی حیثیت نہیں یہ نسب ہر زمانہ میں رہی ہے اور حکومتیں ان کی پرورش کرتی اور ان سے فائدہ اٹھاتی رہی ہیں، ان کا کام ہی حکومت سے خود فائدہ اٹھانا اور اس کو فائدہ پہنچانا ہے، غیر مذہبی معاملات تو الگ رہے مذہبی معاملات میں بھی ایسے لوگ حکومت کے اشارے کے پابند ہوتے ہیں، اور قرآن مجید کے صریح احکام کو بھی قابل ترمیم بلکہ مذہب اسلام کو نام نہاد ترقی کی راہ میں حائل سمجھتے ہیں، یہ لوگ مسلمان کب ہیں اور ان کو مسلمانوں کی ترجمانی کا کیا حق ہے لیکن بدقسمتی سے حکومت انہی کو ان کا نمائندہ سمجھتی ہے،

اگر حکومت کا مقصد مسلمانوں پر اپنی مرضی مسلط کرنا نہیں ہے بلکہ وہ واقعی ان کو مطمئن کرنا چاہتی ہے تو اس کو قوم پروری، فرقہ داریت اور دستوری حقوق کے مطالبہ میں فرق کرنا چاہئے، مسلمانوں پر فرقہ داریت کا الزام لگا کر ان کو خاموش تو کیا جا سکتا ہے لیکن مطمئن نہیں کیا جا سکتا، مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں ان کے اصلی نمائندے اور ترجمان علماء اور دیندار مسلمان ہیں، اور دوسرے مسائل میں مسلم عوام، اسلئے ان دونوں معاملات میں علماء اور مسلم عوام کی رائے معتبر ہے، نام نہاد مسلمانوں کی نہیں، ہندوستان کی حکومت جمہوری ہے اسمیں فیصلہ جمہور کی رائے سے ہوتا ہے، اس لئے مسلمانوں کے معاملات میں بھی جمہور مسلمانوں کی رائے اصل رائے ہے اشخاص کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں، مسلمانوں کو مطمئن کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے، لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کو بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ وہ احتجاج میں کوئی غیر آئینی طریقہ اختیار نہ کریں جس سے حکومت کو دشواری پیدا ہو، بلکہ اپنا مطالبہ جمہوری طریقہ سے پیش کریں،

مقالات

تہذیب کی تشکیل جدید

از

جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۳)

۲- زندگی کی حیثیت

زندگی کی حیثیت

(ا) زندگی کا مالک انسان نہیں بلکہ اللہ ہے،

انّ اللہ اشتریٰ من المومنین انفسہم ۱؎	بیشک اللہ نے مومنوں سے ان کی زندگیوں کو خرید لیا ہے،

(ب) زندگی فعل عبث نہیں، بلکہ ایک فرض و امانت ہے -

افحسبتم انّما خلقنکم عبثًا وانکم الینا لا ترجعون،	کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے، کہ میں نے تم کو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے،

(ج) زندگی - بے قید مختار و آزاد نہیں، بلکہ اس کے لئے قوانین مقرر ہیں،

۱؎ توبہ - ۱۴ ۲؎ مومنون - ۶

ایحسب الانسان ان یترک سدی۔[۱] | کیا انسان کا خیال ہے کہ اس کو یونہی آزاد چھوڑ دیا جائے گا،

فرائض کے دو حصے ہیں

(۳) زندگی کے فرائض

فرائض کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

(۱) کائنات سے متعلق اور (۲) انسان سے متعلق،

کائنات سے متعلق فرائض

پہلے حصہ میں مثلاً

(۱) قوت وطاقت اور اختیار کو استعمال کرکے کائنات کی چیزوں کو مفید بنانا،

ولقد مکنکم فی الارض و جعلنا لکم فیھا معائش،[۱] | ہم نے تمہیں زمین میں قدرت و طاقت اور اختیار کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے اس میں زندگی کے سامان پیدا کئے،

وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمومنون[۲] | آپ کہہ دیجئے کہ کام کرو، اللہ اور اس کا رسول اور مومنین کام کو دیکھیں گے

(ب) ذریعۂ معاش کو اس قدر وسعت دی کہ کوئی محروم نہ رہنے پائے،

وجعلنا لکم فیھا معایش و من لستم لہ برازقین،[۳] | اور ہم نے تمہارے لئے معیشت کا سامان مہیا کر دیا، اور ان کے لئے بھی جنھیں تم دینے والے نہیں ہو،

والارض وضعھا للانام،[۵] | اور زمین کو اللہ نے مخلوق کی نفع کے لئے

---

[۱] القیامہ ۲ ع۲ [۲] اعراف ع۱ [۳] حجر ۳ [۵] رحمن ۱،

(ج) جدوجہد اور محنت سے کائنات کی چیزوں کو ترقی دینا،

وان لیس للانسان الا	انسان کو وہی ملتا ہے جس کی
ما سعیٰ[۱]	وہ سعی کرتا ہے،
نوف الیھم اعمالھم[۲]	عمل کے نتائج ہم پورے پورے دیتے ہیں،

حالات کے لحاظ سے قوت وطاقت کے سامان بدلتے رہتے ہیں، مثلاً اس زمانہ کے فوجی اسلحہ میں بندوق رائفل مشین گن، مزائل، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں وغیرہ ہیں، اور غیر فوجی اسلحہ میں سائنس ٹیکنالوجی صنعت حرفت تجارت، صحافت، لٹریچر اور تمام علوم وفنون ہیں جن سے جدید تمدنی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے،

فرائض کی ادائگی میں اللہ کی مرکزیت اور اس کی ماتحتی مسلم ہونی چاہیے

کائنات سے متعلق فرائض کی ادائگی اور ہر جدوجہد و عمل میں اللہ کی ذات کی مرکزیت اور اسکی ماتحتی مسلم ہونی چاہئے، ورنہ ان کے بھیانک نتائج سے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ رہے گی، جس کا مشاہدہ موجودہ مادی تہذیب میں کیا جا سکتا ہے، اسی لئے قرآن حکیم کی جن آیتوں میں نظام کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی، اس پر غور وفکر کی دعوت یا تسخیر کائنات کی خبر دی گئی ہے ان سب میں تقریباً کسی نہ کسی عنوان سے اللہ کا ذکر ضرور آگیا ہے، جس سے اس کی طرف اشارہ ہے، کہ کائناتی جدوجہد میں مرکزی نقطۂ نگاہ اللہ کی ماتحتی ہونی چاہئے اس کے بعد عقل و تجربہ کی رہنمائی کافی ہے، اور مزید ہدایتوں کی ضرورت نہیں،

انسان سے متعلق فرائض

دوسرے حصہ میں مثلاً :-

---

[۱] النجم ع-۳- [۲] ھود- ع-۲،

ہر فرد کو دوسرے سے اسی طرح وابستہ سمجھنا کہ کسی ایک کا ناحق قتل گویا پوری نوع انسانی کو قتل کرنا اور کسی ایک کو ہلاکت سے بچا لینا گویا تمام نوع انسانی کو بچا لینا ہے قرآن حکیم میں ہے،

من قتل نفسا	جس شخص نے کسی کو ناحق قتل کیا
بغیر نفس او فساد فی	تو گویا اُس نے تمام نوع انسان
الارض فکانما قتل الناس	کا خون کیا، اور جس نے کسی کی
جمیعا ومن احیاھا فکانما	زندگی بچا لی، تو گویا اُس نے نوع
احیا الناس جمیعا،[1]	انسان کو زندگی دیدی،

(۲) ہر فرد کو دوسرے کی نگہداشت کا ذمہ دار سمجھنا، یہ نگہداشت جس طرح مادی وجسمانی ہوتی ہے، اسی طرح اخلاقی وروحانی، پھر جس کو جس درجہ کا قرب ہوگا، اسی لحاظ سے ذمہ داری میں تقدم حاصل ہوگا،

مادی وجسمانی فرائض | کلام مجید میں مادی وجسمانی فرائض کے بارے میں ارشاد ہے،

واعبدوا اللہ ولا تشرکوا	اللہ کی عبادت کرو کسی کو اس
بہ شیئا وبالوالدین احسانا	کے ساتھ شریک نہ کرو، ماں باپ
وبذی القربیٰ والیتمیٰ و	کے ساتھ قرابت داروں کے
المساکین والجار ذی	ساتھ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ،
القربیٰ والجار الجنب و	پڑوسیوں کے ساتھ خواہ قرابت
الصاحب بالجنب وابن	والے ہوں یا اجنبی ہوں، پاس

[1] المائدہ ۲- ع - ۵ -

السَّبِیْلِ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ[1]	کے افتخ بیٹھا والوں کے ساتھ
	ان لوگوں کے ساتھ جو مسافر ہوں
	یا تمھارے قبضہ میں ہوں احسان
	اور سلوک کے ساتھ پیش آؤ،

دوسری جگہ ہے،

وَآتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ	قرابتداروں کو اُن کا حق دو،
وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ	اور مسکین و مسافر کو دو، اور
وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا[2]	فضول خرچی نہ کرو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماتحتوں کے بارے میں فرمایا،

ھُمْ اِخْوَانُکُمْ جَعَلَھُمُ اللّٰہُ	وہ تمھارے بھائی ہیں، اللہ نے ان
تَحْتَ اَیْدِیْکُمْ فَمَنْ جَعَلَ اللّٰہُ	کو تمھارے ماتحت کر دیا ہے جس
اَخَاہُ تَحْتَ یَدِہٖ فَلْیُطْعِمْہُ	کے ماتحت اللہ اُس کے بھائی کو
مِمَّا یَاْکُلُ وَلْیُلْبِسْہُ مِمَّا	کرے تو چاہئے کہ جو خود کھائے
یَلْبَسُ وَلَا یُکَلِّفُہٗ مِنَ الْعَمَلِ	وہ اپنے بھائی کو کھلائے، جو
مَا یَغْلِبُہٗ فَاِنْ کَلَّفَہٗ مَا	خود پہنے وہ اُس کو پہنائے اور
یَغْلِبُہٗ فَلْیُعِنْہُ عَلَیْہِ[3]	اور جو کام اس کی طاقت سے باہر
	ہو اس کے سپرد نہ کرے، اور اگر
	سپرد کرے تو خود اُس کی مدد کرے

---

[1] النساء ع - ۶، [2] بنی اسرائیل ع - ۳، [3] بخاری کتاب الایمان،

عورتوں کے ساتھ خصوصیت سے حسن معاشرت کا حکم ہے،

وعاشروھن بالمعروف	عورتوں کے ساتھ معاشرت میں
فان کرھتموھن فعسیٰ	حسن سلوک کو ملحوظ رکھو، اگر تم
ان تکرھوا شیئًا ویجعل	ان کو ناپسند کرتے ہو تو ممکن ہے
اللہ فیہ خیرًا کثیرًا[1]	تم ایک بات کو ناپسند کرو۔۔۔
	اور اللہ نے تمھارے لئے اس میں
	خیر کثیر رکھا ہو،

دوسری جگہ ہے:۔

لینفق ذو سعۃ من سعتہٖ	وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق
ومن قدر علیہ رزقہ	خرچ کرے اور جس کو کم روزی ملی ہے
فلینفق مما اٰتٰہ اللہ[2]	تو وہ اللہ کے دیے ہوئے کے مطابق
	خرچ کرے،

آخری حج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

فاتقوا اللہ فی النساء فانکم	عورتوں کے معاملہ میں تم اللہ سے
اخذتموھن بامان اللہ[3]	ڈرو، تم نے ان سے اللہ کے عہد کے
	ساتھ معاملہ کیا ہے،

عام انسانوں کے متعلق رسول اللہؐ نے فرمایا،

---

[1] النساء۔ ع۔ ۳ [2] الطلاق۔ ع۔ ۱ [3] مسلم و مشکوٰۃ باب حجۃ الوداع،

من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ[۱]، — جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگتا ہے، اللہ اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگتا ہے،

دوسری جگہ ہے:-

لا یومن عبد حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ[۲]، — بندہ پورا مومن اس وقت تک نہیں ہوتا، جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے،

اخلاقی و روحانی فرائض — اخلاقی و روحانی فرائض کے بارے میں ہے،

یاایھا الذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم ناراً[۳]، — اے ایمان والو! اپنے اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ،

دوسری جگہ ہے،

وتعاونوا علی البر والتقوی[۴] — نیکی اور تقوی کی چیزوں میں ایک دوسرے کی مدد کرو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ[۵]، — غور سے سن لو تم سب نگراں (چرواہا) ہو، اور سب سے اسکی رعیت کی نگرانی سے متعلق بازپرس ہوگی،

---

[۱] بخاری مسلم مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق الفصل الاول [۲] ایضاً [۳] التحریم ع۔ ا [۴] المائدہ ع۔ ا،
[۵] بخاری کتاب النکاح، باب المرأۃ رعیتہ،

ضرورت پر دوسروں ضرورت کو ترجیح — اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح ،

لَن تنالوا البرّ حتّٰی تنفقوا ممّا تحبّون[1] — تم کمال نیکی نہیں حاصل کرسکتے ہو، جب تک اپنی محبوب چیزیں اللہ کی راہ میں نہ خرچ کرو،

انصار صحابہ کی سب سے بڑی صفت ایثار و ترجیح بیان کی گئی ہے، جس سے اس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے،

ویؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ[2] — وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ اُن کو فاقہ ہو،

دوسروں کی کوتاہیوں اور زیادتیوں کو نظر انداز کرنیکا حکم — دوسروں کی کوتاہیوں اور زیادتیوں کے باوجود حسن سلوک کو برقرار رکھنا قرآن حکیم میں ہے،

ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یؤتوا اولی القربٰی والمسٰکین والمھٰجرین فی سبیل اللہ ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبّون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم[3] — جو لوگ تم میں بزرگی اور وسعت والے ہیں، وہ قرابت داروں اور مسکینوں کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دینے سے قسم نہ کھا بیٹھیں (حضرت ابوبکرؓ) بلکہ ان کو معاف اور درگذر کرتے رہیں، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کردے، اللہ

---

[1] آل عمرٰن - و [2] حشر ۱ [3] نور ۳

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر جھوٹی تہمت لگائی جس میں حضرت ابوبکرؓ کے بعض رشتہ دار بھی ملوث تھے جن کی وہ مدد اور کفالت کرتے تھے، حضرت صدیقہؓ کی برأت ثابت ہونے کے بعد طبعی طور پر حضرت ابوبکرؓ کو احساس ہوا، انھوں نے ان عزیز کی امداد نہ کرنے کی قسم کھائی، اُن کو دیکھ کر بعض دوسرے صحابہ نے بھی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، کہ دوسروں کا رویہ اپنی جگہ ہے لیکن تم اس سے اپنا رتاؤ نہ متاثر ہونے دو، بلکہ صرف اللہ سے رضا جوئی اور صلہ کی امید رکھو،

معاشرتی نظم برقرار رکھنے کے لئے چند چیزوں کی ضرورت ہے،

معاشرتی نظم کو برقرار رکھنے کے لئے بالعموم درج ذیل چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے،

۱۔ عزو شرف کا ایسا معیار ہو، جو سب میں مشترک اور سب کے لئے مساوی ہو

۲۔ حسب و نسب رنگ و نسل اور قوم و وطن کے بتوں کا خاتمہ

۳۔ میل جول و ملاقات میں عملاً مساوات،

تشکیل جدید میں ان چیزوں کی طرف جس قدر توجہ دی گئی ہے اس کا اندازہ ذیل کی تفصیلات سے ہوگا،

عزت و شرف کا صحیح معیار

۱۔ عزت و شرف کے لئے حسب و نسب اور دولت و وجاہت کے بجائے اخلاق و کردار کا معیار مقرر کیا گیا، جو اختیاری ہونے کے ساتھ سب کے لئے قابل قبول ہے، قرآن حکیم میں ہے،

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم[1] اللہ کے نزدیک تم میں معزز وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی ہے،

---

[1] الحجرات ۔ ۶ ۔ ۲،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

لیس لاحدٍ علیٰ احدٍ فضل الا بالدین و تقویٰ[1]

کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت صرف دین اور تقویٰ کی بنا پر ہوتی ہے،

حسب و نسب وغیرہ کا خاتمہ (۲) حسب و نسب وغیرہ کے بتوں کا خاتمہ حد درجہ مشکل کام ہے چنانچہ ہر دور میں مختلف تدبیروں کے باوجود اس میں ناکامی ہوئی ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو و بیرونی زندگی میں ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے ادنیٰ و اعلیٰ دونوں محسوس کرنے لگے کہ خود ساختہ بلندیوں اور پستیوں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی، اس کے لئے پہلے ذہنی و فکری اصلاح کی گئی، پھر ان اضافتوں کے بے اثر ہونے کا اعلان کیا گیا،

قرآن حکیم میں ہے

وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا[2]

اور ہم نے تمھاری ذاتیں اور قبیلے محض اس لئے بنائے تاکہ ایک دوسرے کی پہچان ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

لا فضل لعربی علی عجمی ولا عجمی علی عربی[3]

کسی عربی کو عجمی (غیر عربی) پر اور عجمی کو عربی پر فضیلت نہیں ہے،

رنگ اور زبان کے بارے میں ہے،

ومن آیٰتہٖ خلق السمٰوٰت و

اور اللہ کی نشانیوں میں زمین و

---

[1] مشکوٰۃ فی شعب الایمان [2] الحجرات ع ۲۔

الارض واختلاف السنتکم — آسمان کی پیدائش اور زبان ورنگ
والوانکو[۵۱] — کا اختلاف ہے،

مذکورہ امتیازات شادی بیاہ میں زیادہ نمایاں ہوتے، اور اپنے اندر مختلف قسم کی نزاکتیں اور پیچیدگیاں رکھتے ہیں، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے سب سے پہلے اپنے گھر میں ان بتوں کو توڑا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح ایک آزاد غلام زیدؓ بن حارثہ سے کیا اور حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے "عاصم" کا نکاح ایک دودھ فروش کی بیوہ لڑکی سے کیا، دونوں واقعات مشہور ہیں، گھر کی اصلاح کے بعد حضرت عمرؓ نے ولی کی مرضی کے خلاف غیر کفو میں نکاح کا حکم دیا، جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہوگا، موالی (آزاد شدہ غلاموں) میں سے ایک مالدار شخص نے قریشی کی بہن کا پیام بھیجا، قریشی نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ

ان لنا حسبًا انه لیس لها — ہم حسب نسب والے ہیں، وہ لڑکی
بکفو، — کا کفو نہیں ہے،

اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو پہنچی، تو آپ نے قریشی کو بلا کر کہا کہ وہ شخص مالدار بھی، اور پرہیزگار (متقی) بھی، اگر بہن راضی ہے تو اس کا نکاح کر دو، بھائی نے بہن سے پوچھا تو وہ راضی ہوگئی، اور نکاح کر دیا گیا،[۵۲]

فقہاء نے "کفو" پر طویل بحث کی ہے، جس کی موجودہ دور میں قطعًا ضرورت نہیں ہے، یہ بحث حالات کے ساتھ سمجھوتہ کا نتیجہ ہے، کوئی شرعی فیصلہ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا، اور فقہاء کے درمیان اس میں کافی اختلاف ہوا،

---

[۵۲] ازالۃ الخفاء، مقصد دوم سیاست فاروق اعظم رض،

کفارت میں حریت، نسب، پیشہ، مالی، عمر اور دین (اخلاق و کردار) کا اعتبار کیا جاتا ہے لیکن دین کے علاوہ حالات کے لحاظ سے سب میں اختلاف ہے، دین پر اتفاق اور سب میں اختلاف خود اس کی دلیل ہے، کہ شرعی حیثیت صرف دین کو حاصل ہے، اور بقیہ کی حیثیت محض ازدواجی زندگی خوشگوار بنانے کی ہے، اس زمانہ میں کفارت میں مذکورہ چیزوں کے اعتبار سے ازدواجی زندگی منتشر ہوتی، اور اسلامی زندگی پر حرف آتا ہے، اس لئے تشکیل جدید میں عہد نبوی کے مطابق دین کے ساتھ معاشرتی حیثیت (Social Status) کا لحاظ کافی ہوگا اور اس میں تعلیم و معاش کو حالات کے لحاظ سے زیادہ اہمیت ہوگی، اس سے ازدواجی زندگی خوشگوار بنانے میں مدد ملتی ہے،

میل جول اور آپس میں مساوات

(۳) میل جول اور ملاقات میں مساوات پر عمل درآمد کا اندازہ ان واقعات سے ہوگا، کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے سرداروں سے اسلام پر گفتگو فرما رہے تھے، اتنے میں ایک شکستہ حال نابینا صحابی (ابن ام مکتومؓ) تشریف لائے اور انھوں نے کچھ معلوم کرنا چاہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مداخلت ناگوار ہوئی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

عبس وتولّٰی ان جاءہ الاعمٰی	آپ چیں بجبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا،
وما یدریک لعلہ یزکّٰی او یذکّر	اس بات سے کہ آپ کے پاس نابینا
فتنفعہ الذکرٰی اما من	آیا، آپ کو کیا معلوم کہ وہ اپنی درستی
استغنٰی فانت لہ تصدّٰی	کر لیتا یا غور و فکر کرتا، اور آپ کو اس
وما علیک الا یزکّٰی واما	کا سمجھانا نفع دیتا، جو پروا نہیں کرتا
من جاءک یسعٰی وھو یخشٰی فانت	اس کے پیچھے پڑتے ہیں، حالانکہ اس کے

عَنَتَ تَدْعُ ل ٹ | درست نہ ہونے کا الزام آپ پر نہیں ہے اور جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے اور ڈرتا ہے، اس سے آپ اعراض کرتے ہیں

مساوات کے لئے امتیاز کو مٹانا | معاشرہ میں جب معمولی فساد ہو تو اصلاح کی معمولی تدبیروں سے کام چل جاتا ہے لیکن جب یہ فساد قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جائے، تو اعتدال پیدا کرنے کے لئے سخت اقدامات اور عملاً پست کو بلند اور بلند کو پست کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس سہیل بن عمرو، حارث بن ہشام، ابوسفیان بن حرب اور قریش کے دوسرے رؤسا، حاضر ہوئے، اسی وقت صہیب بلالؓ اور دوسرے آزاد شدہ غلام بھی آگئے، حضرت عمرؓ نے ملاقات میں ان غلاموں کو سرداران قریش پر ترجیح دی، اس پر ابوسفیان نے کہا،

لم ار کالیوم قط یاذن لھولاء العبید ویترکنا علی بابہ لا یلتفت الینا، | ایسا میں نے کبھی نہیں دیکھا، ان غلاموں کو اجازت ملتی ہے، اور ہم دروازے پر کھڑے رہتے ہیں، ہماری طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی،

سہیل زیادہ سمجھدار تھے، انھوں نے کہا یہ سچ ہے لیکن ہم کو عمر کی نہیں بلکہ اپنی شکایت کرنی چاہئے، اسلام نے سب کو ایک آواز سے بلایا، ان میں سے جو اپنی شامت سے پیچھے رہ گئے، وہ آج بھی پیچھے رہنے کے مستحق ہیں،[۲]

معاشرتی نظم میں خلل ڈالنے والی چیزوں سے تزکیہ | معاشرتی نظم میں جو چیزیں رخنہ ڈالنے والی

---

۱ عبس ع ۱ - [۲] اسد الغابہ ج ۲ تذکرہ سہیل بن عمرو،

قیں، ان سے تزکیۂ نفس کا حکم دیا گیا، تزکیہ کے معنی کسی کو اس حد تک صاف ستھرا بنانا کہ وہ نشوونما کے قابل بن سکے، مثلاً زمین کا تزکیہ گھاس پوس صاف کرنا، اس کو برابر کرنا، کھاد ڈالنا، اور آبپاشی کر کے اس قابل بنانا کہ وہ تخم کو نشوونما دے سکے، اسی طرح نفس کا تزکیہ فکری و عملی خرابیوں کو دور کر کے انسان کو اس قابل بنانا کہ وہ اپنی فطرت کے مطابق نشوونما پا سکے، تزکیہ کی مشابہت بڑی حد تک علم طب سے ہے، جس طرح طب کا تعلق جسم کی بیماریوں اور اُن کے علاج سے ہے، اسی طرح تزکیہ کا تعلق روح کی بیماریوں اور اُن کے علاج سے ہے اس کی ضرورت زندگی کے تمام شعبوں میں ہوتی ہے، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کا اہم مقصد تزکیہ قرار دیا گیا، اور قرآن حکیم کی کئی آیتوں میں تعلیم کتاب و حکمت کے ساتھ ویزکیکم یا ویزکیھم کا ذکر کیا گیا ہے، اس موقع پر صرف ان چیزوں کا بیان کرنا مقصود ہے جو معاشرتی تعلقات میں رخنہ ڈالنے والی ہیں اور تشکیل میں ان سے صفائی و ستھرائی کا حکم دیا گیا ہے، وہ یہ ہیں مثلاً

مذاق اڑانا، طعن و تشنیع کرنا	کسی کا مذاق اُڑانا، طعن و تشنیع کرنا، برے خطاب سے مخاطب کرنا، بدگمانی
اور غیبت وغیرہ کی ممانعت	عیب جوئی اور غیبت کرنا، دوسرے کے بھید تلاش کرنا وغیرہ،

یا ایھا الذین آمنوا لا یسخر قوم	اے ایمان والو! کوئی کسی کا مذاق
من قوم عسیٰ ان یکونوا	نہ اڑائے، ممکن ہے جن مردوں کا مذاق
خیراً منھم ولا نساء من	اُڑایا جاتا ہو، وہ ان سے بہتر ہوں
نساء عسیٰ ان یکن	اسی طرح جن عورتوں کا مذاق اڑایا
خیرا منھن ولا تلمزوا	جاتا ہو، وہ ان سے بہتر ہوں، ایک
انفسکم ولا تنابزوا	دوسرے پر طعن و تشنیع نہ کرو، اور

بالالقاب[1]، | اور کسی کو برے القاب سے نہ پکارو،

دوسری جگہ ہے،

یاایھاالذین آمنوااجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضاً ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً فکرھتموہ واتقوااللہ،[2]	اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، کسی کا عیب نہ تلاش کرو، ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو، کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس کو تو تم ناگوار سمجھتے ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو،

کسی کی ذلت پر خوشی کے اظہار اور عار دلانے اور چغلی کھانے کی ممانعت

کسی کی ذلت و حقارت پر خوشی ظاہر کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لاتظھرالشماتۃ لاخیک فیرحمہ اللہ ویبتلیک،[3]	اپنے بھائی کی ذلت وحقارت پر خوشی نہ ظاہر کرو، (ورنہ) اس پر اللہ رحم کرے گا، اور تم کو اس میں مبتلا کر دے گا،

گناہ پر عار دلانا:۔

من عیّر اخاہ من ذنب | جس شخص نے کسی کو توبہ کیے ہوئے

---

[1] و [2] حجرات ع ۲ -[3] ترمذی و مشکوٰۃ باب حفظ اللسان، الفصل الثانی

لم یمت حتی یعملہ یعنی من ذنبٍ تاب منہ[۱]
گناہ پر عار دلائی تو موت آنے سے پہلے اس میں مبتلا ہوگا،

چغلی کھانا:-

مشاء بنمیم[۲]،
اس کا کنا نا تو جا دھر اُدھر چغلی لگاتا پھرتا ہے،

حدیث شریف میں ہے:-

المشاؤن بالنمیمۃ المفسدون بین الاحبۃ[۳]،
جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں وہ دوستوں کے درمیان فساد پھیلاتے ہیں،

عہد توڑنے دورُخی پالیسی اختیار کرنے اور قطع رحم کی ممانعت

عہد و پیمان کرکے توڑنا،

ان العھد کان مسئولا[۴]،
بیشک عہد کی بازپرس ہوگی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد توڑنے کو منافق کی نشانیوں میں قرار دیا ہے،

واذا وعد اخلف[۵]،
جب وہ وعدہ کرتا ہے تو خلاف کرتا ہے،

دورُخی پالیسی اختیار کرنا،

تجدون شر الناس یوم القیامۃ ذالوجھین الذی
قیامت کے دن دورخا بدترین شخص ہوگا، کچھ لوگوں کے پاس ایک رُخ

---

۱ ترمذی و مشکوٰۃ باب حفظ اللسان، الفصل الثانی، ۲ قلم ۔ ۳ مسند احمد جلد ص ۴۵۹، ۴ بنی اسرائیل ۳۴

یاتی ھؤلاء بوجہ وھؤلاء بوجہ، [1] — سے جاتا ہے، اور دوسرے کے پاس دوسرے رُخ سے،

دوسری جگہ ہے،

زبان آتش

من کان ذا وجھین فی الدنیا کان لہ یوم القیامۃ [2] — جو دنیا میں دورُخا ہوگا، قیامت کے دن اس کی زبان آگ کی ہوگی

قطع رحمی کرنا:-

قرآن حکیم نے قطع رحمی کرنے والوں کو فاسق قرار دیا ہے،

الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویفسدون فی الارض، [3] — فاسق وہ ہیں جو اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں، اور اللہ نے جس کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اس کو توڑتے ہیں، اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں،

فخر و غرور کرنے، حسد کرنے، اور بہتان لگانے کی ممانعت

فخر و غرور کا سب سے پہلے ظہور شیطان سے ہوا، جب اس نے آدم کے مقابلہ میں کہا،

انا خیر منہ، [4] — میں آدم سے بہتر ہوں،

اس سے دل پر مہر لگ جاتی ہے،

کذلک یطبع اللہ علی کل قلب متکبر جبار، [5] — اسی طرح اللہ مغرور اور سرکش کے دل پر مہر کر دیتا ہے،

---

[1] بخاری کتاب الادب، [2] ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی ذی الوجھین، [3] البقرہ ع ۳، [4] الاعراف ع ۲۔ [5] المومن، ۴۔

اللہ کی محبت سے محرومی ہوتی ہے،

انّ اللہ لا یحب من کان مختالًا	بیشک اللہ اس سے محبت نہیں کرتا
فخورًا (ا) [1]	جو مغرور اور فخر کرنے والا ہو،

اخلاق کے دروازے بند کرتا ہے جو جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

"جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر غرور ہوگا (اس کا خاصہ ہے کہ) وہ جنت میں نہ داخل ہوگا [2]"

حسد بداخلاقیوں کا سرچشمہ اور نہایت خطرناک چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر مسلمان کو اس سے پناہ مانگنے کی ہدایت کی ہے،

ومن شر حاسد اذا حسد	پناہ مانگتا ہوں حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ایاکم والحسد فان الحسد	تم لوگ حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں
یاکل الحسنات کما تاکل	کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح
النار الحطب [3]	آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے،

بہتان لگانا (کسی کی طرف ایسی برائی منسوب کرنا جو اس میں نہ پائی جاتی ہو، اور اگر برائی پائی جاتی ہو تو وہ غیبت ہے)

---

[1] نساء ع - ۶ [2] ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی الکبر، [3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحسد،

قرآن حکیم میں ہے،

ومن یکسب خطیئۃ او اثما ثم یرم بہ بریئا فقد احتمل بھتانا و اثما مبینا[۱]

جو شخص خود کوئی خطا یا گناہ کرے پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے تو اس نے بہتان اور کھلا گناہ اپنے سر پر لیا،

دوسری جگہ ہے:-

والذین یؤذون المومنین والمومنت بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتانا و اثما مبینا[۲]

جو لوگ مسلمان مردوں اور عورتوں کو بغیر کئے (تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہیں، انھوں نے بہتان اور کھلا گناہ اپنے سر لیا،

غصہ کرنا، بغض و کینہ رکھنا، اور فحش کلامی کرنا

غصہ کرنا قرآن حکیم نے غصہ پی جانے والوں کو متقیوں میں شمار کیا ہے،

والکاظمین الغیظ[۳]

وہ لوگ غصہ کو پی جانے والے ہیں

دوسری جگہ ہے،

واذا ما غضبوا ھم یغفرون[۴]

اور جب اُن پر غصہ آتا ہے، تو معاف کر دیتے ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"پہلوان وہ نہیں ہے، جو دوسروں کو پچھاڑ دے، بلکہ وہ ہے جو غصہ میں

---

[۱] نساء ع-۱۶، [۲] احزاب ع-۷، [۳] آل عمران ع-۱۴، [۴] شوریٰ-۱۴

اپنے کو قابو میں رکھے[۱]"

دوسری جگہ ہے،

"غصہ شیطان سے ہے، اور شیطان آگ سے بنا ہے، اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے، اس لئے جب کو غصہ آجائے اس کو وضو کر لینا چاہئے"[۲]

بغض و کینہ رکھنا (کسی کی دشمنی و ضرر رسانی کے جذبہ کو دل میں رکھنا) یہ حق العباد کی ادائگی میں اسی طرح رکاوٹ ڈالتا ہے جس طرح شرک حق اللہ کی ادائگی میں رکاوٹ ڈالتا ہے اس سے برأت کے لئے دعا مانگنے کا حکم ہے،

ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا،[۳]	اے پروردگار! ہمارے دلوں میں ایمان والوں کا کینہ مت رکھیو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

ولا تباغضوا ولا تحاسدوا وکونوا اخوانا،[۴]	آپس میں بغض نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، اور بھائی بنکر رہو

خودبینی و نمایش۔

ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرا ورئاء الناس[۵]	ان لوگوں کی طرح مت ہو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھانے نکلے،

دوسری جگہ ہے،

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب [۲] ابوداؤد کتاب الادب باب من کتم غیظا،
[۳] حشر ع۔۱، [۴] بخاری و مسلم وغیرہ [۵] الانفال، ع۔۶

وکم اھلکنا من قریۃ بطرت معیشتھا،[1]

اور ہم نے بہت سی بستیاں ہلاک کردیں، جب وہ اپنی معیشت پر اترانے لگیں،

ایک اور جگہ ہے،

تذکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقی،[2]

تم اپنی پاکیزگی نہ جتایا کرو، پرہیزگاروں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے،

فحش گوئی خواہ شہوانی قوت سے ہو، یا غضبی قوت سے، دونوں کی سختی کے ساتھ ممانعت ہے،

فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج،[3]

حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے نہ فسق و فجور کی اور نہ جھگڑے کی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سباب المسلم فسوق و قتالہ کفر،[4]

مسلمان کو برا بھلا کہنا فسق اور مسلمان سمجھ کر اس کو قتل کرنا کفر ہے،

دوسری جگہ ہے،

لیس المومن بالطعان و

مومن لعن طعن نہیں کرتا، بدزبانی

---

[1] قصص - ع - ۶، [2] النجم - ع - ۲، [3] بقرہ ۱۷ - ع - ۲۵،

[4] بخاری کتاب الادب،

ولا اللعان ولا الفاحش ولا (فحش کلامی نہیں کرتا ہے،)
البذی[1]

ان کے علاوہ جس قسم کے طرز گفتگو اور طرز عمل سے بھی معاشرتی زندگی میں خلل پڑتا ہوتا ہے، ان سب سے سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے،

کھانے پینے لباس اور وضع قطع کے چند احکام

تشکیل جدید میں معاشرتی نظم کا یہاں تک لحاظ کیا گیا ہے کہ کہ کھانے پینے، لباس اور وضع قطع کے بھی احکام و آداب مقرر کر دیئے گئے ہیں تاکہ ان راہوں سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا سد باب ہو سکے۔

کھانے پینے کے بارے میں ہے،

۱۔ کھانا سیدھے ہاتھ سے کھایا جائے،

۲۔ کھانا کھاتے وقت ادب و احترام ملحوظ رہے،

۳۔ کھانا بیٹھ کر کھانا چاہئے، کھڑے ہو کر کھانا، یا اونچی جگہ پر بیٹھ کر، اور کھانا نیچے رکھ کر کھانا، اسلامی معاشرت کے خلاف ہے،

۴۔ اتنا کھائے کہ بدہضمی نہ ہو،

۵۔ حرام اور مشتبہ چیز نہ کھانا چاہئے،

اسی طرح لباس اور وضع قطع کے بارے میں ہے کہ

۱۔ کسی قوم کی پیروی یا ان کی مشابہت نہ ہو،

۲۔ مغرور و متکبر یا غیر ثقہ لوگوں کی وضع قطع نہ ہو،

۳۔ مردوں کے لئے ریشمی لباس حرام ہے،

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلۃ،

۴- ایسا لباس نہ ہو جس سے ستر کی حفاظت نہ ہو سکے، یا شہوت برانگیختہ ہونے کا اندیشہ ہو،

۵- عورتوں کو خصوصیت سے لباس اور وضع قطع میں احتیاط کا حکم ہے،

فضول خرچی اور دکھاوے کی ممانعت

خرچ و اخراجات کے ہر معاملہ میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے،

۱- محل اور مقدار کسی لحاظ سے فضول خرچی نہ ہو،

۲- خرچ کرنے میں دکھاوا، نمایش یا غریبوں پر اپنی امارت و سیادت کا سکہ جمانا نہ ہو،

تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے کتابوں میں مکمل بحث موجود ہے،

قرونِ وسطیٰ کی تاریخ

اور

مورخین کا ایک تنقیدی جائزہ

از

جناب الطاف حسین خاں شروانی، اسلامیہ کالج اٹاوہ

عہد گذشتہ کے مورخین پر ایک ناقدانہ نظر

ہندی قرونِ وسطیٰ کے مورخین نے اپنے عہد اور اس سے پہلے کی جو تاریخیں مرتب کی ہیں، ان میں قطع نظر دوسری کمزوریوں کے جن کا تذکرہ ہم آگے چل کر کریں گے، فاتح کی زبان استعمال کی ہے، مورخ بن کر واقعات نہیں لکھے، اگر مسلم فوجوں اور دیسی راجاؤں سے جنگ کا ذکر آگیا ہے تو زیب داستان کے لئے ہندوؤں کے قتل عام اور مندروں کی عام تباہی شامل کر دی ہے، بادشاہوں کا تذکرہ آگیا ہے تو ان کی شخصیت القاب و آداب میں گم ہوگئی ہے، اگر درباری ماحول کی نقش آرائی کی ہے تو حقیقت کم اور مبالغہ آمیزی زیادہ ہے، سماجی حالات کے تذکرے کے لئے مورخین کو موقع ہی نہیں ملا، کسی کی مدح سرائی کی ہے تو کسی کے خلاف چھوٹے افسانے گھڑے ہیں، غرض ساری داستانیں شاہی محلوں اور میدانِ جنگ تک محدود ملتی ہیں[1] حقیقت یہ ہے کہ ہندی قرونِ وسطیٰ کے مورخین نے تاریخ کو تاریخ سمجھ کر نہیں لکھا، بلکہ اپنے

[1] الفاروق جلد اول، ص ۹ - ۱۰،

ماحول اور گذرے ہوئے عہد کا تقاضا پورا کیا ہے جو آج ہمارے لئے نہ صرف ناکافی بلکہ خطرناک بھی ہے[1]، ڈاکٹر سید محمود نے مرحوم نے صحیح فرمایا ہے،

مسلمان مورخوں نے مسلمانوں کے دور حکومت میں جو تاریخیں لکھی ہیں ان میں انکی فتح وکامرانی کا غرور اور غلبہ چھایا ہوا نظر آتا ہے اور انھوں نے واقعات قلمبند کرنے میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا اور جس طرح ایرانی اہل قلم کے شعر وادب میں غیر معمولی مبالغہ آرائی نظر آتی ہے اسی طرح جو تاریخیں ایرانی طرز پر لکھی گئیں انہیں بھی مبالغے نظر آتے ہیں مثلاً دو چار ہندو مشرف باسلام ہوئے تو یہ مورخین لکھتے ہیں کہ تمام علاقے حلقہ بگوش اسلام ہوگئے اسی طرح مندروں کے انہدام کے اکّا دکّا واقعہ کو اسطرح پیش کرتے ہیں جس کے پڑھنے کے بعد یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ ہندوستان کے مندر بالکل منہدم کردئے گئے تھے، انگریزوں نے مسلمان مورخوں کی اس مبالغہ آرائی سے پورا فائدہ اٹھا کر اس دور حکومت کی جو تاریخیں قلمبند کیں انہیں ہندوؤں کے اشتعال کو بڑھانے کیلئے پورا مواد فراہم کردیا[2]"

ان مورخین پر ایک نظر ڈالی جائے تو سلاطین دہلی کے دور میں ضیاالدین برنی، منہاج سراج، شمس سراج عفیف، فخر مدبر اور یحیٰی بن احمد سرہندی وغیرہ دکن کے مورخین میں محمد قاسم ہندوشاہ فرشتہ، رفیع الدین شیرازی

---

[1] "مقالہ" وسطی ہندوستان کی تاریخ نویسی میں فرقہ واریت" مصنفہ ہربنس مکھیا مترجمہ امیر اللہ شاہین، عصری ادب، دہلی، جولائی ۱۹۷۰ء

[2] پیش لفظ" ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام دار المصنفین ۱۹۶۰ء ص ۱۶-۱۷

علی بن عزیز اللہ طباطبائی، محمد ابراہیم زبیری، ملا عوض شیرازی اور ملا نظام الدین احمد شیرازی وغیرہ اور دور مغلیہ میں ابوالفضل علامی، نظام الدین بخشی، ملا عبدالقادر بدایونی ملا شریف معتمد خاں، مرزا کامگار حسینی، عبدالحمید لاہوری، محمد صالح کنبوہ، مرزا محمد طاہر آشنا، عاقل خاں رازی، مرزا مبارک واضح اور خافی خاں وغیرہم نے اسلامی ہندوستان کے مختلف ادوار پر تاریخیں لکھی ہیں ان میں بادشاہوں کی زندگی کے واقعات، درباری ماحول کی نقش آرائی، فتوحات کے حالات، جنگوں کی ہماہمی اور سیاسی کشمکش کے علاوہ عوامی زندگی کا ایک بھی گوشہ روشن نہیں ہوتا، علم وفن، معاشرت، تمدن، اقتصادی حالت تعمیر وغیرہ کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہوتے ہیں، حقیقت میں ان تاریخی کتابوں کو فتح نامے کہنا زیادہ مناسب ہوگا بیسویں صدی کے مورخین ان تاریخوں کے متعلق بڑی سخت رائے رکھتے ہیں، مولانا شبلی لکھتے ہیں،

"ایشیائی مورخین کی عادت ہے کہ وہ واقعات میں صرف جنگ وجدل، بغاوت اور خونریزی کے واقعات کو لیتے ہیں اور ان کو خوب پھیلاتے ہیں اس لئے یورپ والے ہماری تاریخوں کو قصائی کی دوکان کہتے ہیں اور واقعی ان تاریخوں سے اس عہد کے تمدن، شائستگی، پالٹکس، معاشرت، خانگی زندگی کا پتہ لگانا چاہیں تو بہت کم کامیابی ہوتی ہے[1]"

مولانا سید عبدالحیٔ فرماتے ہیں،

"ملک کی بدمذاقی دیکھئے کہ ابتدا سے اب تک ہندوستان کی سیکڑوں تاریخیں لکھی گئیں اور مختلف عنوانوں سے لکھی گئیں مگر ان میں سے کوئی کتاب تاریخ

---

[1] مقالات شبلی جلد چہارم ص ۵۹

نویسی کے صحیح معیار پر نہیں اتری جس کتاب کو اٹھا کر دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ رزم بزم کا کوئی افسانہ ہے قرنا و کوس کے ذکر سے اگر کوئی صفحہ خالی ملے گا تو چنگ و رباب کے ذکر سے اس کو آپ خالی نہ پائیں گے،،[1]

مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک موقع پر فرمایا ہے،

"آجکل قوموں کی تاریخ کی نقش آرائی میں خون ہی کا رنگ درکار نہیں بلکہ اس زمانے کے تمدن، اقتصاد، تعمیر، معاشرت، علم و فن اور طریق جنگ وغیرہ کے ایسے معلومات کی ضرورت پڑتی ہے جس سے قوموں کی پوری تصویر کھڑی ہو جائے لیکن اس زمانہ کے پرانے مورخوں نے اپنے مذاق کے مطابق اپنی تاریخیں لکھیں اس لئے جو مسائل انکے نقطہ نظر سے اہم تھے وہ ہمارے لئے غیر اہم ہیں اور جن مسائل کو ہم ضروری سمجھتے تھے انکو انھوں نے غیر ضروری سمجھ کر یا تو نظر انداز کر دیا یا بہت ہی اختصار کے ساتھ لکھا ہے،،[2]

ہندوستانی مورخین نے معاشرہ کے سماجی حالات لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی حالانکہ البیرونی اپنی تصانیف کے ذریعہ مورخین کی نظریں وسیع کر چکا تھا۔ ابوالفضل بیہقی اور ابن خلدون تاریخ کے فن کو اتنی ترقی دے چکے تھے کہ موجودہ دور کے مورخین بھی اسپر کوئی قابل لحاظ اضافہ نہ کر سکے، ایشیا، شمالی افریقہ اور اسپین وغیرہ عربی مورخین پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی بڑی تعداد تاریخیں لکھنے میں مصروف نظر آتی ہے جسکا سلسلہ ساتویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک قائم رہا،[3]

---

[1] یاد ایام ص ۵۸، [2] معارف، اپریل سنہ ۱۹۴۵ء

[3] تفصیل کیلئے دیکھیے! "قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات" عبدالرحمن خاں دہلی سنہ ۱۹۵۰ء جلد اول دوم،

یورپ کے مورخین بھی کارل مارکس سے پہلے اپنی تاریخوں میں حکمرانوں، فوجی سرداروں اور وزیروں کے حالات اور کارنامے سپرد قلم کیا کرتے تھے، ہندوستان میں قرون وسطیٰ سے پہلے تاریخ نام کا کوئی فن ہی نظر نہیں آتا اگر کچھ ملتا بھی ہے تو کتھاؤں کی شکل میں اپنے ہیرو کی پرستش نظر آتی ہے[۵]، ہزاری پرشاد دویدی کا مصنف سنکمشیت پرتھوی راج راسو لکھتے ہیں،

فی الواقع اس دیس میں تاریخ کو موجودہ معنی میں کبھی نہیں لیا گیا، تاریخی شخصیات کو تخیل کا پیکر بنا دینا ہمارا شیوہ رہا ہے بعض میں الوہیت کی خصوصیات شامل کرکے ورا او الوہرا بنا دیا گیا جیسے رام، بدھ، کرشن اور بعض کو بڑی ہی رنگین ورومان پرور بنا کر کتھاؤں کا ہیرو بنا دیا گیا ہے جیسے آدین بکرما دیت اور عال،[۶]

ابتدائی مسلمان مورخین کو ہندوستان میں ان ہی حالات کا سامنا ہوا، ان کو اس ملک میں علم تاریخ کا کوئی ایسا نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا جن کی تقلید کرتے اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں جن کی بنا پر علم تاریخ ہندوستان میں اپنا صحیح مقام حاصل نہ کر سکا اور ہم شدید غلط فہمیوں کے شکار ہوتے رہے یہ اسباب حسب ذیل ہیں:

(۱) دہلی سلطنت کی بنیاد رکھتے وقت مسلمانوں کا علمی انحطاط شروع ہو چکا تھا،[۷]

---

۱ خطبۂ صدارت پروفیسر ہمایوں کبیر مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس منعقدہ دہلی سنہ ۱۹۶۴ء، معارف فروری سنہ ۱۹۶۴ء، ۲ ۵ دیکھئے: ہندوؤں کی تاریخ نویسی، مصنفہ اکبر شاہ خاں عبرت (نجیب آباد) جون سنہ ۱۹۱۶ء، ۳ ۵ معارف اپریل سنہ ۱۹۶۸ء، ۴ ۵ ابتدائی سلاطین دہلی کے جاہ و جلال کو پیش کرنے کے لئے مغلوں کی طرح کوئی ابوالفضل (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳ پر)

(٢) ابتدائی ہندو علماء مسلمان مورخین کی کوئی مدد نہ کر سکے۔

(٣) ہندی قرون وسطیٰ کے درباری نظام نے تاریخ کو شدید نقصان پہونچایا۔

(٤) مورخین اور بادشاہوں کے تعلقات تاریخ نویسی پر اثر انداز ہوئے،

(٥) مسلمان مورخین نے محض اسلئے کہ انکے ہمعصر حکمرانوں کی شہرت دوسرے اسلامی ملکوں میں بحیثیت مجاہد اسلام ہو، ہندوؤں کے خلاف جوش و خروش کا اظہار کرنا اپنا شیوہ بنا لیا،

(٦) غیر ملکی مسلمان مورخین نے ہندی نژاد مسلم عوام کے جذبات کا صحیح تصور قائم نہیں کیا اور انکے خلاف غلط رویہ اختیار کیا، اس عہد کے فارسی مآخذوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے[1]،

(صفحہ ٣٣ کا بقیہ حاشیہ) نظام الدین بخشی اور عبد الحمید لاہوری کا پیدا نہ ہوا جس کی وجہ سے سیکڑوں سال کی تاریخ موجودہ مورخین کے لئے ایک مصیبت بن گئی اگر صوفیائے کرام اور شعراء عظام کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو شاید آج ہم اندھوں کی طرح ہاتھ پیر چلاتے،

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے۔ Religious Bias in Modern Indian History writing by Dr. M. Yaseen. Kashmir University Radiance No. 15, 1970.

نیز دیکھئے اسی مصنف کا اردو مقالہ "ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ"

الجمعیت (ہفت روزہ) دہلی،

٥ جون ١٩٧٠ء

ہندی قرون وسطیٰ کی تاریخ اور انگریز مورخین

سلاطین دہلی اور مغلیہ عہد کے مورخین نے جو بھی کچھ لکھا ہے اس میں اپنے عہد کے ماحول سے چشم پوشی، عوام کے حالات سے گریز اور بادشاہوں کی مدح سرائی اور اس قبیل کی دوسری خامیاں نظر آرہی ہیں، لیکن حقیقت میں ہماری تاریخ کو انگریز مورخین نے نہ صرف نقصان پہونچایا ہے بلکہ خطرناک بنا دیا ہے۔[1]

۱۸۵۷ء میں جب ہندو مسلمان عوام اور ملک کے کمزور حکمرانوں نے برطانوی استبداد کے خلاف آزادی کی جنگ کی تو انگریز مدبروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر ہندوستانی عوام مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے سے دست و گریباں نہ ہوئے تو ان کی حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکے گی چنانچہ اسی کو بنیاد بنا کر انگریز مورخوں، سیاست دانوں اور عالموں (مستشرقین) نے ایک منصوبہ کے مطابق اپنا کام شروع کر دیا۔[2]

پروفیسر خلیق احمد نظامی رقمطراز ہیں:-

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد انگریزوں نے ہندوں اور مسلمانوں کے تعلقات خراب کرانے کے لیے منظم کوششیں شروع کر دیں، سیاست، سماج زبان اور ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جہاں یہ زہر نہ پھیلایا گیا ہو، سرہنری ایلیٹ نے (جس کی تاریخ ہند کی آٹھ جلدیں گذشتہ پچہتر سال سے ہماری ساری چھوٹی بڑی تاریخوں کا ماخذ رہی ہیں) حکومت کو لکھا کہ اگر اس کی مرتب

---

[1] امیر خسرو اور ہندوستان، ڈاکٹر تارا چند، ص ۵-۶

[2] نیشنل آرکائیوز دہلی میں ۱۸۵۸ء کا لکھا ہوا ایک خط محفوظ ہے جس سے اس منصوبے کی تصدیق ہوئی،

کی ہوئی تاریخ ہند شائع کر دی گئی تو ہندوستان میں ساری قومی تحریکیں خود بخود سرد پڑ جائیں گی، چنانچہ ہندو مسلم اختلاف کو تا حد طوفان پہنچانے کے لئے یہ کتاب شائع کر دی گئی۔[1]

جیمس مل پہلا انگریز مورخ ہے جس نے ہندوستان کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے، ہندو دور، مسلم دور اور دور جدید، اس نے ہندو مسلم تہذیب کی کش مکش پر جس قدر زور دیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ واریت کی چنگاریوں کو ہوا دی جا رہی ہے، اس کی بہت سی مثالیں ان انگریز مورخین کی پیش کی جا سکتی ہیں جنھوں نے قرون وسطیٰ کے ہندوستان کو "بحر طوفاں خیز" بنا دیا تھا اور مسلم تہذیب و ہندو تہذیب کو باہم ٹکرانا اپنا مشغلہ بنا لیا تھا،

ایم مجیب راؤ ایم، اے (عثمانیہ) فرماتے ہیں:۔

تاریخ کے اس دور کی اہمیت کو سمجھنے اور اس عہد کی نسبت رائے قائم کرنے میں موجودہ زمانے کے مورخین نے عام طور پر غلطی کی ہے اس غلط فہمی کی بنا پر لوگ اس عہد کو یا تو دور ابتری یا دور استبداد خیال کرنے لگے اور تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کے ذہن میں یہ غلط تصور سما گیا کہ مسلم راج کا خیال گویا ہندو ہندوستان کی تباہی و بربادی تھی اور مسلمانوں کے آتے ہی قتل و غارتگری لوٹ مار و منافرت کا وہ دور شروع ہوا جس نے ہندو تہذیب و تمدن کی بنیادوں کو اکھیڑ دیا۔ ہندوؤں کے مقدس مقامات کو منہدم کر دیا اور ان کی شائستگی کا خاتمہ کر دیا، اس غلط فہمی کا اہم سبب

---

[1] مقدمہ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۲۲

یہ تھا کہ تاریخ مرتب کرنے والوں نے اس دور میں ہندو مسلمان معاشروں مذہبوں اور شائستگیوں کے درمیان جو شعوری و غیر شعوری میل ملاپ و امتزاج ہو رہا تھا اسے یا تو غیر اہم خیال کیا یا عمداً نظر انداز کر دیا اور تاریخ کے اس پہلو کی تحقیق کی بہت کم کوشش کی گئی ورنہ بہت جلد اصلی حالات روشنی میں آتے اور غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا،،[1]

جب انگریز ہندوستان میں آئے تو انھیں ہماری تاریخ عیسائیوں کی مذہبی موشگافیوں سے پاک ملی، معصر ماخذوں کی قیمتی دولت جو ہم مشرقیوں کا اہم اثاثہ ہے ان نو واردوں نے نہ اس کی قدر کی اور نہ ایماندارانہ طور پر اس سے کام لینا چاہا حالانکہ مشرق کے ان ہی علوم سے یورپ کو تاریخ نویسی کا ایک نیا انداز ملا ہے۔[2]

انگریز مورخین نے اپنے سیاسی اغراض کے لئے ہماری تاریخ کے صرف اس رخ کو دیکھا جس میں مسلمان مورخین کے انفرادی جذبات تھے ان میں مسلمان سپاہی صرف ہندوؤں ہی سے جنگ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں حالانکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جنگیں زیادہ تر مسلمانوں ہی سے ہوئی ہیں کاش ان مورخین نے مسلمان سلاطین کے عدل و انصاف کے واقعات کو پیش نظر رکھا ہوتا مسلمان امراء کی مسلم و غیر مسلم فنکاروں کی سرپرستی دکھائی ہوتی، خانقاہوں میں ہندو مسلم عوام کے اجتماع پر نظر ڈالی ہوتی اور ان مسلمان درویشوں کی آنکھوں کی طرف دیکھا ہوتا جو ہر وقت بیکس عوام کیلئے رویا کرتی تھیں، انکے

---

[1] مقالہ "ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی عمرانی اور مذہبی زندگی کے چند پہلو"
سیاست حیدرآباد، جولائی، اکتوبر ۱۹۴۲ء ص ۳۶۵ - ۳۶۶

[2] تفصیل کیلئے دیکھئے: خطبۂ صدارت استشرقین کی بین الاقوامی کانگریس منعقدہ دہلی ۱۹۶۴ء معارف نومبر ۱۹۶۴ء

قدموں کی طرف نظر کی ہوتی جو نادار وں کی فریاد رسی کے لئے درباروں کی طرف اٹھا کرتے تھے،

انگریز مورخین نے ہمارے اتحادِ قومی کو نقصان پہونچانے کے لئے ہندوؤں کو یہ باور کرایا کہ وہ اسلامی عہد میں مسلمان حکمرانوں کے ظلم وستم کے شکار رہے ہیں، انکی عبادت گاہوں کو نقصان پہونچایا گیا ہے اور ان کے مذہب کی توہین کی گئی ہے لیکن اگر غائر نظر سے واقعات کا مطالعہ کیا جائے تو عجیب تضاد نظر آتا ہے ایک طرف انگریز مورخین کے یہ بیانات ہیں دوسری طرف اس ایک ہزار سال کی طویل مدت میں حکمراں قوم اپنی تعداد ایک چوتھائی سے زیادہ نہ بڑھا سکی ان کے پایہ تخت کے گرد تک ہندوؤں کی آبادی کی اکثریت رہی جو اپنی مذہبی رسوم بخوبی انجام دیتی تھی[۱]، جہاں تک معاشی خوشحالی کا سوال ہے ایک مشہور مسلمان مورخ ضیاء الدین برنی اس بات کی سخت شکایت کرتا ہے کہ اس کے عہد میں ہندوؤں کو اتنی مراعات کیوں حاصل ہیں[۲]، صوفیائے کرام کے تذکروں میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ بازاروں میں سور کا گوشت بکتا ہے[۳]، اور مسجدوں میں مسلمان قتل کئے جاتے ہیں[۴] مسلمان بادشاہ بے بس نظر آتے ہیں،

ہندوؤں کی عبادت گاہوں کا مسئلہ محمد بن قاسم کے حملہ کے وقت طے ہو چکا تھا کہ شریعت اسلامی میں ان کو کیا مقام دیا جائے اور صلح ہو جانے کے بعد انکی عبادتگاہوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:-

---

۱؎ تاریخ فیروز شاہی، جلد اول، ص ۲۱۷

۲؎ فتاویٰ جہانداری (روٹوگراف شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) ص ۱۲۰ الف

۳؎ لطائف قدوسی، ص ۳۱

۴؎ اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار، ص ۶۹

"غور کیجئے کہ محمد بن قاسم ثقفی کی عربی فوج نے ۹۲ھ میں جب بودھوں کے بلادِ پُر سندھ پر قدم رکھا تو پہلے ہی دن ان عربوں نے ہندوؤں کی حیثیت شرعی کو متعین کر لیا اور ان کو وہی حیثیت دی جو ان سے پہلے صحابہ نے اہل فارس کو قرار دی تھی یعنی شبہ اہل کتاب جس کے معنی یہ ہیں کہ دو باتوں کے سوا یعنی نکاح اور ذبیحہ کے علاوہ اور تمام امور میں انکے ساتھ اہل کتاب کا برتاؤ کیا جائے نیز یہ کہ یہاں کے مندروں کی حیثیت ایران کے آتشکدوں کی ہے جس طرح صحابہ نے آتشکدے نہیں توڑے اسی طرح مصالحت ہو جائے تو یہ مندر بھی توڑے نہیں جائیں گے چنانچہ منصورہ اور ملتان میں چوتھی صدی تک اسلامی حکومتوں کے باوجود یہ مندر اسی طرح قائم رہے، مورخ بلاذری نے حالات لکھے اور اکثر عرب سیاحوں نے ان کی کیفیت بیان کی ہے[1]"

اسلام نے دنیا کی اقوام کو چار حصوں[2] میں تقسیم کیا ہے،

(۱) مسلمان (۲) اہل کتاب (۳) شبہ اہل کتاب (۴) کفار

اسی تقسیم کی رو سے ہندوستانی مسلمان حکمرانوں اور رفتار نے ہندوؤں کو شبہ اہل کتاب قرار دیا ہے (حضرت مظہر جانجاناںؒ نے ہندوؤں کو اہل کتاب قرار دیا ہے) اور ان پر اہل کتاب کی طرح جزیہ مقرر کیا، فیصلہ کے تحت علماء نے مندروں کو توڑنا اسلام کے منافی قرار دیا ہے، سکندر لودی کے عہد میں تھانوں کے متعلق ایک استفسار کے جواب میں ملک العلماء میاں عبداللہ اجودھنی نے بادشاہ کو لکھا تھا،

---

[1] مقالات سلیمان (حصہ تاریخی) جلد اول، ص ۳۸۵، ۳۸۶

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے:- عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۹۲، ۱۹۳

"بت خانہ قدیم را ویران ساختن جائز نیست[1]"

درویشوں کی مجالس میں تو بتخانوں کا تذکرہ احترام سے کیا جاتا تھا اور بتخانوں میں صنم یائے کرام کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔[2]

اس عہد کے متعدد شعراء نے بتخانوں کا ذکر بڑے ذوق شوق سے کیا ہے،

(۱) خسرو فرماتے ہیں ؎ [3]

بسی بتخانہ دید از سنگ سازش   زطرز سیم و زر بستہ طرازش

(۲) ہمایوں کے عہد کا شاعر ہجری مغلوں کے ابتدائی دور میں مندروں کی کثرت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے، [4]

ہر طرف بتخانہ ہا پر از بتان دلربا   کز لطافت ہر یکے رشک بتان آزر است

(۳) عہد اکبری کا شاعر غزنی جلوہ شانی (متوفی ۱۰۱۹ھ) مندروں اور برہمنوں

---

[1] تاریخ داؤدی، مصنف عبد اللہ علی گڑھ ۱۹۶۹ء ص ۲۹ نیز دیکھئے: طبقات اکبری ص ۳۳۶ مسلمانوں نے تو دنیا کا سب سے بڑا بتخانہ کعبہ کو بھی تاحت و تاراج نہیں کیا صرف بتوں سے عمارت کو خالی کرا لیا گیا اور اسکی حرمت، عظمت اور بزرگی قائم و دائم رکھی ؎

بریں کرامت بتخانہ مرا اے شیخ   کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

[2] دُرر نظامی، مصنفہ مولانا علی محمود بن جاندار و مترجمہ یٰسین علی نظامی، دہلی ۱۹۳۳ء ص ۱۴۱، پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے دوران گفتگو ایکمرتبہ فرمایا کہ دُرر نظامی موضوع ہے لیکن پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اسکو مستند قرار دیا ہے، دیکھئے مقالہ ملفوظات کی تاریخی اہمیت "اندر سرتی ص ۲ اسلامک کلچر [illegible] ۱۹۴۶ء" حالات شیخ علی شاہ ابن شیخ محمود جاندار کے لئے دیکھئے گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۸۹

[3] مفتاح العلوم علیگڈھ اڈیشن ۱۹۲۷ء ص ۳۲ نیز دیکھئے خزائن الفتوح علیگڈھ اڈیشن ص ۱۱۷

کے متعلق لکھتا ہے ،

تو کی من و در دیر زدہ تجانہ کہ معشوق — انوار حقیقت بدل برہمناں ریخت [1]

(۴) اویس بیگ فطرت کاشانی کہتا ہے ،

من از اں ہندو پسر خود ترک ایماں میکنم
کافری زاہد بیں در حلقۂ زنار کیست

دلبستہ ام بصحبت شکر لبان ہند
طوطی صفت گرفتہ زہندوستاں ردم [2]

دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی بہت سی حکومتیں قائم ہوئیں ان کے زیر سایہ عیسائی، یہودی، زرتشتی، بدھ اور ہندو مختلف مذاہب کے لوگ امن و سکون کے ساتھ رہے کسی قوم کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا گیا ، ہندوستان کے چھ سو سالہ (۱۲۰۶ء تا ۱۸۵۷ء) دور حکومت میں بھی اس پر عمل رہا ،

(۱) مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں ،

"میں دنیا کے مورخوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ ہزار سال سے زیادہ طویل مدت جس میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوتی رہیں لیکن کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ غیر قوم کے کسی فرد کو حکومت نے محض اسلئے قتل کر دیا ہو کہ وہ مسلمان نہیں ہے یا یہ کہ کسی کو مجبور کیا گیا ہو کہ وہ اپنے موروثی مذہب کو ترک کر دے [3] "

---

[1] معارف جون ۱۹۶۷ء ،

[2] معارف اپریل ۱۹۶۳ء ص ۲۶۳

[3] معارف جون ۱۹۵۰ء ص ۴۱۴ ، ۴۱۵ ،

(۲) پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں،

"مغلوں کی پوری تاریخ میں کوئی جلیانوالہ باغ نہیں ملتا، انکے یہاں کوئی مانچسٹر نہ تھا جس کی خاطر وہ ڈھاکہ کی ململ بنانے والوں کے ہاتھ کاٹ ڈالتے، ان کے یہاں کعبہ تھا لیکن انھوں نے قشقہ لگانے میں تامل نہ کیا"[۱]

[۱] علی گڈھ میگزین، اکبر نمبر ۱۹۵۳ء نیز دیکھئے "اسلامی حکمرانوں سے مسلمانوں کی ایک بیجا شکایت" مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی، معارف اگست تا دسمبر ۱۹۴۳ء،

بزم تیموریہ حصہ اول

بزم تیموریہ کا پہلا اڈیشن تمام عظیم مغل سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، عالمگیر ظفر شاہ آخری مغل بادشاہ اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں اور ان سب کے درباروں کے متوسل امرار، فضلاء اور شعراء کے تذکرہ، اور ان کے علمی و ادبی و شعری کمالات پر مشتمل تھا جسکو ارباب ذوق نے بہت پسند کیا اور اپنی کتابوں اور مضامین میں اس دور کے مستند ترین ماخذ کی حیثیت سے اس کے حوالے دئے اور ناقدین نے مصنف کی محنت و جانفشانی کی داد دی، اب نظر ثانی کے بعد اس میں اس کثرت سے اضافے ہوئے اور اس کا حجم اتنا بڑھ گیا کہ قدر دانوں اور مستفیدین کی آسانی کیلئے اس کو دو جلدوں میں کر دیا گیا، تاکہ بانی سلطنت تیموریہ سے لیکر ظفر شاہ تک کے عہد کے علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، اس جلد میں جو زیر طبع ہے تین متقدم الذکر مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے تمام قابل الذکر امرار، شعراء اور فضلاء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، خصوصاً دربار اکبری کا تو پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آگیا ہے،

کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحۃً بعض متفقہ اسلامی احکام میں تبدیلی کی ہے؟

مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے رفیق دارالمصنفین

حضرت عمر فاروقؓ کی شخصیت نہ صرف اسلام اور عرب بلکہ پوری نوع انسانیت کیلئے باعث فخر ہے، ان کی عبقریت کی شہادت جہاں اُنکے دوستوں اور محبین نے دی ہے وہیں ان کے دشمنوں اور مخالفین نے بھی اسکا اعتراف کیا ہے وہ صرف ایک جلیل المرتبت صحابی رسول، ماہر سیاستدان اور فاتح اعظم ہی نہ تھے بلکہ امامت و اجتہاد کے بلند منصب پر بھی فائز تھے، مسائل فقہیہ میں حضرت عمرؓ کے اجتہادات، ان کی نکتہ سنجی، دقیقہ رسی اور بردقت فکر کے ٹھوس واقعات بکثرت ہیں، اس کی بناپر آج کے بعض نام نہاد محققین شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ عمر فاروقؓ نے بہت سے مسائل میں نص قطعی سے انحراف کیا ہے یا اس پر "مصلحت" اور رائے کو ترجیح دی ہے، اور فقہ فاروقی[1] پر جن لوگوں کی گہری اور وسیع نظر نہیں ہے انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت عمرؓ کے علاوہ بھی ہر شخص کو نصوص قطعیہ کے مقابلہ میں مصلحت کو ترجیح دینا جائز ہے خواہ وہ نص کتنا ہی قطعی الثبوت

[1] حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

اور قطعی الدلالۃ کیوں نہ ہو،

یہ صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ اجتہاد کے معاملہ میں معصوم عن الخطا نہیں تھے لیکن انھوں نے کسی مصلحت اور ضرورت کی خاطر نص قطعی کو کبھی ترک یا منسوخ نہیں کیا بلکہ ان کے زمانہ میں جو نئے مسائل پیدا ہوئے ان کو حل کرنے کے لئے نصوص کے مالہٗ وماعلیہ کو سمجھنے کی امکانی کوشش کی اور شریعت کی روح اور نص کے منشا پیش نظر رکھکر مسئلہ کا حل نکالا، اس سلسلہ میں ان سے بعض لغزشیں بھی ہوئیں مگر جیسے ہی وہ اپنی غلطی سے آگاہ ہوئے بلا کسی پس وپیش کے انھوں نے اس سے رجوع کر لیا، یہاں ہمارا مقصد حضرت عمرؓ کے تمام اجتہادات کا استقصا نہیں ہے اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے ذیل میں صرف چند ایسے مسائل پیش کئے جاتے ہیں جنھیں مخالفین اپنے دعوے کے ثبوت میں بار بار پیش کرتے ہیں،

مؤلفہ قلوب کا مسئلہ اس کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدوی قبائل کے بعض بڑے سرداروں مثلاً زبرقان بن بدر، اقرع بن حابس اور عباس بن مرداس وغیرہ کو ان کی تالیف قلب کے لئے زکوٰۃ کے مال میں سے ایک خاص حصہ دیا کرتے تھے، حالانکہ یہ لوگ خود دولت مند تھے، حضور اکرمؐ کا یہ عمل اس آیت کے مطابق تھا جس میں مولفہ قلوب کو بھی مصارف زکوٰۃ میں شمار کیا گیا ہے،

(حاشیہ صفحہ ۴۲) [1] مترجم:- علامہ شبلی الفاروق جلد دوم میں لکھتے ہیں:- فقہ کے جسقدر مسائل حضرت عمرؓ سے بروایات صحیح منقول ہیں ان کی تعداد کئی ہزار تک پہونچتی ہے ان میں سے تقریباً ہزار مسئلے ایسے ہیں جو فقہ کے مقدم اور اہم مسائل ہیں، اور ان تمام مسائل میں ائمہ اربعہ نے ان کی تقلید کی ہے...... مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں یہ مسائل منقول ہیں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کی مدد سے فقہ فاروق پر ایک مستقل رسالہ لکھکر ازالۃ الخفا میں شامل کر دیا ہے" (ص ۲۱۷)

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (توبہ)

زکوٰۃ حق ہے مفلسوں کا محتاجوں کا، زکوٰۃ کے کا پر جانے والوں کا جن کا دل پرچانا منظور ہے انکا، گردن چھڑانے والوں کا اور قرضداروں اللہ کے راستہ میں اور مسافروں کا، یہ اللہ کی ط سے ٹھہرایا ہوا ہے اللہ سب کچھ جاننے والا اور

عہد صدیقی میں ان قبائل کے لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ سے زکوٰۃ میں سے اپنے اس حق کا مطالبہ کیا، انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں عمال زکوٰۃ کے نام حکم نامہ جاری کردیا پھر جب یہ لوگ حضرت عمرؓ سے ملے تو انھوں نے غور و فکر کے فرمایا،

> اللہ جل شانہٗ نے اسلام کو تمام دنیا میں سربلند اور غالب کردیا ہے، اب جسکا دل چاہے اپنے سینہ کو نور ایمان سے معمور کرے اور جو چاہے ضلالت کفر میں بھٹکتا رہے، آیت ربانی فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر کی یہی تفسیر ہے، البتہ اگر تمہارا شمار فقراء اور مساکین میں ہے یا تم میں کوئی ایسا وصف ہے جسکی بنا پر تم مال زکوٰۃ کے مستحق ہو تو یقیناً ہم تمھیں دیں گے، لیکن تالیف قلب کیلئے اب کچھ نہ دیا جائے گا،

یہ سن کر وہ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں واپس آئے اور بڑی ناگو سے کہا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمرؓ؟ فرمایا ھو ان شاء اللہ، اور اس کے بعد حضرت عمرؓ فیصلہ سے اتفاق کرکے اس کو برقرار رکھا،

مذکورہ بالا واقعہ صحاح ستہ سے اسی طرح ثابت ہے، آج کے بعض اہل قلم اد

محققین اس واقعہ کی بنا پر حضرت عمرؓ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے اس لئے نص قرآنی کو باطل قرار دیا کہ تغیر پذیر حالات میں اب زکوٰۃ کا یہ مصرف باقی نہیں رہا، بلاشبہہ کسی شخص کو بھی حکم ربانی کے بدلنے یا اس سے روگردانی کرنے کی اجازت نہیں، لیکن حضرت عمرؓ کا مذکورہ عمل اس ذیل میں نہیں آتا، اللہ جل شانہ نے اپنے ارشاد میں زکوٰۃ کا مستحق اشخاص یا افراد کو قرار نہیں دیا بلکہ صفات کو اس کا معیار بنایا ہے، مثلاً فقر، مسکینی زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کا کام اور تالیف قلب " المؤلفۃ قلوبھم " میں دراصل تالیف القلوب استحقاق زکوٰۃ کی شرط ہے نہ کہ زبرقان وغیرہ اشخاص جنھوں نے مال زکوٰۃ میں سے ملنے والے حصہ کو اپنا لازمی حق سمجھ لیا تھا، خواہ حکومت کو ان کی تالیف قلب کی ضرورت ہو یا نہ ہو، اور ان کے دل اسلام سے مطمئن ہوں یا نہ ہوں، حضرت عمرؓ نے اپنی دوراندیشی اور دانشمندی سے اس کو سمجھ لیا کہ اسوقت جب کہ قیصر و کسریٰ اسلامی پایہ تخت کے زیر نگیں ہو چکے ہیں کسی فرقہ یا افراد کی تالیف قلب کی قطعی ضرورت باقی نہیں رہی آیندہ جب کبھی اس کی ضرورت پیش آئے گی تو پھر زکوٰۃ کا یہ مصرف استعمال میں لایا جائے گا اسلئے یہ معاملہ تمام تر خلیفۂ وقت کی صوابدید پر منحصر ہے اسی لئے جب زبرقان اور اقرع وغیرہ نے صدیق اکبرؓ سے حضرت عمرؓ کی شکایت کی کہ وہ مال زکوٰۃ سے مولفۃ قلوب کے مصرف کو ختم کر دینا چاہتے ہیں تو انھوں نے عمر فاروقؓ کی رائے کو لغت اور نص کے اصلی مقصد کے مطابق ہونے کی بنا پر پسند کیا اور انکے فیصلہ کو برقرار رکھا،

اس وضاحت کے بعد کوئی منصف مزاج شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت عمرؓ نے مصلحت کی وجہ سے نص کو باطل اور کالعدم کر دیا، بلکہ واقعۃً انھوں نے نص پر پوری دیانت داری کے ساتھ عمل کیا،

اس سلسلہ کے دو اور واقعات نقل کرنا بے محل نہ ہوگا، ایک کا تعلق قحط سالی میں حد سرقہ ساقط کرنے سے ہے اور دوسرے کا حاطب بن بلتعہ کے اونٹ چرانے والے غلاموں پر چوری کی حد نہ جاری کرنے سے ہے، صحاح میں ان دونوں واقعات کی تفصیل موجود ہے، پہلے واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک سال ایسا بھیانک قحط پڑا کہ وہ اپنی عدیم المثال خشک سالی کی وجہ سے تاریخ اسلام میں "عام الرمادۃ" کے نام سے مشہور ہوگیا، اسی زمانہ میں ایک شخص حضرت عمرؓ کے پاس فریاد لے کر آیا کہ ایک شخص نے اسکا اونٹ چرا کر ذبح کر دیا، حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا کہ کیا تم اپنے اس اونٹ کے بدلے دو موٹی تندرست اور حاملہ اونٹنیاں لینا پسند کرو گے؟ کیونکہ ہم قحط سالی میں حد سرقہ جاری نہ کریں گے،

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ بنی عامر بن لوی کے چار افراد نے کسی شخص کا ایک اونٹ پکڑ کر ذبح کر دیا، جب یہ معاملہ بارگاہ فاروقی میں پیش ہوا تو حسن اتفاق سے بنی عامر کے بھائی حاطب بن بلتعہ بھی موجود تھے، حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا "حاطب فوراً اٹھو اور مذبوحہ اونٹ کے مالک کو اس کے اونٹ کے بدلے دو اونٹ خرید کر دو" حاطب نے فوراً اس کی تعمیل کی، پھر حضرت عمرؓ نے چاروں ملزمان کو کوڑے لگوا کر نکال دیا۔

ان دونوں واقعات میں فی الواقع حضرت عمرؓ نے کسی حد شرعی کو باطل قرار نہیں دیا بلکہ فرمان نبوی "ادرؤا الحدود بالشبہات" سے فائدہ اٹھایا ہے، پہلی صورت میں بھیانک قحط نے اونٹ ذبح کرنے پر مجبور کیا تھا، مجرموں نے اپنے رشتہ جاں کو باقی رکھنے کیلئے ایسا کیا تھا، دوسرے موقع پر حاطب کے غلاموں نے بھوک سے نڈھال ہونے کے سبب یہ حرکت کی تھی کیونکہ یہ بات ثابت شدہ تھی کہ حضرت

حاطبؓ بہت بخیل تھے اسی لئے حضرت عمرؓ نے حاطبؓ کو حکم دیا کہ وہ اونٹ کے مالک کو اس کے معاوضہ میں دو اونٹنیاں خرید کر دیں اور غلاموں کو کوڑے کی سزا دی تاکہ آئندہ دوسرے لوگ اس واقعہ کو حجت بنا کر لوٹ کھسوٹ کی جرأت نہ کر سکیں اگر ان دونوں صورتوں میں حضرت عمرؓ حد شرعی نافذ کرتے تو درحقیقت قانون اسلامی کے مسلم اصول "ادرؤا الحدود بالشبہات" کے صریحی خلاف ہوتا۔

سواد عراق کی مفتوحہ زمینوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کا موقف

عہد فاروقی میں اسلام کو جیسی عظیم اور وسیع فتوحات حاصل ہوئیں اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی انہی کے عہد میں عراق، فارس، شام، مصر اور لیبیا وغیرہ کی سرزمین پر اسلام کا پرچم لہرایا ان فتوحات نے خلیفۂ وقت کیلئے آراضی مفتوحہ کی تقسیم کا ایک بڑا مسئلہ پیدا کر دیا، مجاہدین کا خیال تھا کہ دوسرے مال غنیمت کیطرح ان زمینوں کا چار خمس بھی ان میں تقسیم ہونا چاہیے، لیکن حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ ان زمینوں کو قومی مصالح کے پیش نظر محفوظ رکھا جائے اور ان کے مالکوں کے قبضہ میں چھوڑ کر ان پر خراج مقرر کر دیا جائے اور اس کی آمدنی کو امور عامہ مثلاً سرحدوں کی حفاظت، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر اور فوجیوں کی تنخواہ میں صرف کیا جائے۔

مخالف جماعت صحابہ جس میں عبد الرحمن بن عوف، زبیر بن العوام اور بلالؓ بن رباح پیش پیش تھے کی دلیل یہ تھی کہ مفتوحہ زمینیں بھی منقولہ جائداد کی طرح غنیمت ہی کا مال ہے اور اس کی نظیر میں خیبر کی زمین کو پیش کرتے تھے جس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین میں تقسیم کر دیا تھا[۱]، حضرت عمرؓ کی دلیل یہ تھی کہ مفتوحہ آراضی بنو نظیر اور بنو قریظہ کی

---

[۱] حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو۔

طرح "اراضی فے" کی قبیل سے ہیں اور اس کی تائید میں سورہ حشر کی ان آیات سے استدلال کیا تھا،

ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل القری فللہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین و ابن السبیل کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم،	اللہ بستیوں والوں سے اپنے رسول کو جو کچھ ہاتھ لگا دے وہ اللہ کے لئے ہے اور رسول کیلئے، اور قرابت داروں یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے لئے، تاکہ (مال) تمہارے مالدار لوگوں ہی کے درمیان نہ گردش کرتا رہے،

اس کے بعد کی آیات ہیں،

للفقراء المہاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً وینصرون اللہ ورسولہ اولئک ھم الصادقون	یہ مال ان مفلس مہاجرین کیلئے ہے جن کو ان کے گھروں اور دوسرے اموال سے زبردستی بے دخل کرکے نکال دیا گیا ہے یہ لوگ اللہ کی رضامندی اور اسکے فضل کے طلبگار بن کر اللہ اور اسکے رسول کی مدد کرنے آئے ہیں یہی لوگ صحیح معنی میں ہیں۔

---

[1] مترجم: دراصل غنیمت اور فے کو لوگوں نے ایک ہی سمجھا اسلئے مغالطہ میں پڑگئے، ائمہ مجتہدین میں امام شافعی بھی انہی لوگوں کے ہمرائے ہیں، انکے نزدیک مفتوحہ زمینیں بھی مجاہدین میں تقسیم کردینی چاہئیں، امام شافعی اور انکے ہم خیالوں نے بھی ارض خیبر سے استدلال کیا ہے، لیکن انھوں نے یہ بات غالباً ملحوظ نہیں رکھی کہ خیبر کے بعد اور مقامات بھی تو فتح ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت سے قبل تمام عرب پر قبضہ ہوچکا تھا لیکن حضور نے اسکا کوئی حصہ بھی تقسیم

اس کے بعد فرمایا۔

والذین تبوؤا الدار والایمان
من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم
ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ
مما اوتوا ویؤثرون علیٰ انفسھم
ولو کان بھم خصاصۃ ومن یوق
شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون

اور (یہ مال ان لوگوں کیلئے ہے) جنھوں نے ایمان لاکر ان مہاجرین سے پہلے اس گھر (دار الہجرت) کو آباد کر رکھا ہے جو لوگ ہجرت کرکے انکے یہاں آتے ہیں، انھیں یہ محبوب رکھتے ہیں اور انھیں جو کچھ دیا جائے اسکے لئے اپنے دل میں کوئی غرض محسوس نہیں کرتے، یہ لوگ اگر خود فاقہ مست ہوں تو بھی ان مہاجرین کو اپنے اوپر مقدم رکھتے اور جو لوگ اپنی طبیعت کے لالچ سے محفوظ رکھے گئے وہی درحقیقت فلاح یافتہ ہونگے،

پھر ارشاد ہے،

والذین جاؤا من بعدھم
یقولون ربنا اغفر لنا و
لاخواننا الذین سبقونا بالایمان
ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین
آمنوا ربنا انک رؤف رحیم،

اور (یہ مال ان لوگوں کیلئے ہے) جو ان کے بعد یہ کہتے ہوئے آئے کہ اے پروردگار ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں ہمارے دلوں میں ایمان لانے والوں کیلئے کوئی بیر نہ رکھ اے پروردگار تو بڑا شفیق و رحیم ہے،

ان آیات کو پیش کر کے حضرت عمر فاروقؓ نے دوسری جماعت کے لوگوں سے فرمایا کہ،

فکانت ھذہ عامۃ لمن جاء — یہ سب آیندہ آنے والوں کیلئے ہے
من بعدھم فقد صار ھذا الفیٔ — اس بنا پر یہ ممالک لوگوں کا حق ٹھہرے
بین ھؤلاء جمیعاً فکیف نقسمہ — پھر میں اسکو موجودہ لوگوں میں کیسے تقسیم
لھؤلاء وندع من یخلف بعدھم — کردوں اور انکو لوگوں کو محروم کردوں
جو آیندہ آئیں گے،

"انھوں نے یہ بھی فرمایا،

اللہ تعالیٰ نے تمھارے بعد آنے والے لوگوں کو بھی اس فے میں شریک قرار دے دیا ہے اب اگر میں اسے تقسیم کر دیتا ہوں تو تمھارے بعد آنے والوں کیلئے کچھ بھی باقی نہ بچے گا، اور اگر میں زندہ رہا تو صنعار کے ایک چرواہے کو بھی اس فے میں سے اس کا حصہ پہونچ جایا کرے گا جب کہ اس کا خون اس کے چہرہ ہی میں ہوگا،،

مخالفین نے جن کے سرخیل حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے، فاروق اعظمؓ سے کہا کہ جو علاقے اللہ جل شانہ نے ہماری تلواروں کے بل پر ہمیں عطا کئے ہیں ان کو کیا آپ ان لوگوں کیلئے روک رکھیں گے جو نہ اسوقت موجود تھے اور نہ جنگ میں شریک ہوئے، آپ ان کو آیندہ نسل در نسل کے لئے روک رکھنا چاہتے ہیں جو موجود بھی نہیں، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ یہ میری رائے ہے" لوگوں نے کہا پھر آپ باقاعدہ مشورہ کیجئے" چنانچہ حضرت فاروق اعظمؓ نے مہاجرین و انصار کے اکابر و اشراف کو جمع کر کے فرمایا

میں نے آپ حضرات کو صرف اس لئے تکلیف دی ہے کہ میرے کاندھوں پر آ چکے

معاملات کی جو ذمہ داری ہے اس میں آپ میرا ہاتھ بٹائیں، کیونکہ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں، آج آپ حضرات کو حق متعین کرنا ہوگا، بعض لوگوں نے مجھ سے اختلاف کیا ہے اور بعض نے اتفاق، میں نہیں چاہتا کہ آپ حضرات بہرحال وہی رائے قبول کریں جو میں نے اختیار کی ہے آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے جو حق بات کہتی ہے بس خدا کی قسم اگر میں نے کوئی بات ایسی کہی جس پر میں عمل کا ارادہ رکھتا ہوں تو اس سے میرا ارادہ سوائے اتباع حق کے کچھ اور نہیں "

یہ سن کر ان لوگوں نے کہا "امیر المومنین! آپ فرمایئے ہم سنیں گے اور غور کریں گے "

آپ نے فرمایا:۔

آپ نے ان لوگوں کی باتیں سن لی ہیں جنکا خیال ہے کہ میں ان کی حق تلفی کر رہا ہوں میں ظلم کے ارتکاب سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، اگر میں نے کوئی ایسی چیز جو ان لوگوں کا حق تھی ان کو نہ دی ہو اور دوسروں کو دے دی ہو تو میں بڑا ہی بدبخت ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ کسریٰ کی زمین کے بعد اب کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے جو فتح ہو، اللہ نے ان کے اموال، زمینیں اور کاشتکار ہمیں بطور غنیمت عطا کر دئے ہیں، ان لوگوں کو غنیمت میں جو مال ملا تھا اسے تو میں نے اس کے مستحقین میں تقسیم کر دیا ہے، اور ایک خمس نکال کر اسے اس کے متعینہ مصارف میں تقسیم کر دیا ہے بلکہ اب بھی اس کی تقسیم میں مصروف ہوں، میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ زمینوں کو مع کاشتکاروں کے سرکاری ملکیت قرار دے دوں اور اس کے کاشتکاروں پر خراج عائد کردوں اور خود ان پر فی کس جزیہ عائد کردوں جسے وہ ادا کرتے رہیں اسطرح یہ جزیہ اور

خراج مسلمانوں کے لئے متقل فے کا کام کریگا جس کی آمدنی میں فوجی لمبن افراد اور آیندہ نسلیں حصہ دار ہوں گی، دیکھئے ان سرحدوں کی حفاظت کیلئے کچھ آدمی تعینات کرنے ہوں گے جو مستقلاً وہاں رہیں، یہ بڑے بڑے شہر جیسے شام، الجزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر، ان میں فوجی چھاؤنیاں قائم رکھنا اور ان کو وظایف دیتے رہنا ناگزیر ہے، اب اگر یہ زمینیں اور ان پر محنت کرنے والے کاشتکار تقسیم کر دئے جائیں گے تو ان لوگوں کو کہاں سے دیا جائیگا،،

یہ مدلل اور دلنشین تقریر سن کر حضرت عثمان، علی، طلحہ، ابن عمر اور دوسرے کبار انصار نے حضرت عمر فاروق رضی کی رائے سے اتفاق کیا اور بیک زبان کہا،

"آپ ہی کی رائے صحیح ہے، آپ نے جو فرمایا وہ خوب ہے اور جو رائے قائم کی ہے وہ بہت موزوں ہے"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں حضرت عمر رض نے نصوص شرعیہ کی گہرائی تک پہونچکر جو رائے مصلحت سے زیادہ قریب سمجھی اسی کو اختیار کیا، اور صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت نے ان کی پوری تائید کی، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عمر فاروق رض نے کسی نص قطعی کو ترک کیا بلکہ ایک مجتہد کی طرح ظاہر نص اور اسکی روح کی رعایت کرتے ہوئے اپنے خیال کو مرجح قرار دیا ہے،

تمتع حج اور متعہ کی تحریم | بلاشبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات کے موقع پر عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی لیکن پھر بعد میں بتدریج اس کو حرام قرار دے دیا، حضرت عمر رض نے اپنے عہد خلافت میں اس پر سختی کے ساتھ عمل کیا اور صحابہ کے بھرے مجمع میں اس بات کا اعلان کیا کہ تحریم متعہ خود ان کا کوئی ذاتی اجتہاد

نہیں ہے بلکہ یہ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہی کے فرمان کا عملی نفاذ ہے، ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ جب خلیفہ ہوئے تو ایک تقریر میں فرمایا،

اِن رَسُولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم	بلا شبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں
اذن لنا فی المتعۃ ثلاثاً ثم حرمھا	تین بار متعہ کی اجازت مرحمت فرمائی پھر اسے حرام قرار دے دیا،

انہی سے یہ بھی منقول ہے کہ ایک بار حضرت عمرؓ نے منبر پر چڑھکر خدا کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا،

ما بال رجال الذین ینکحون ھذہ	آخر وہ لوگ کیوں نہیں باز آتے جو رسول
المتعۃ بعد نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ	اکرمؐ کی ممانعت کے باوجود متعہ کرتے اور
علیہ وسلم عنھا ،	غیر مناسب کام کرتے ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ اگر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں تحریم متعہ پہ شدت کے ساتھ عمل کرایا تو یہ انکا کوئی شخصی اجتہاد یا عمل نہ تھا بلکہ نص کے عین مطابق اور رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے فرمان کا عملی نفاذ تھا،

تمتع حج یہ ہے کہ انسان ایام حج میں پہلے عمرہ کا احرام باندھے اور اس کے ارکان کی ادائیگی کے بعد احرام کھول دے پھر یوم عرفہ کو حج کا احرام باندھ لے، ان دونوں احراموں کے درمیانی وقفہ میں اس کے لئے ہر کام جائز اور حلال رہتا ہے، حضرت عمرؓ کو اندیشہ ہوا کہ بعض لوگ اس سہولت سے فائدہ اٹھاکر اپنی بیویوں سے اختلاط کرنے میں مضائقہ نہ تصور کریں گے، اس لئے انھوں نے اس پر پابندی عائد کرنی چاہی لیکن جب ان سے کہا گیا کہ رسول اکرمؐ نے اسے جائز قرار دیا ہے تو حضرت عمرؓ مطمئن ہو گئے اور

اپنے خیال سے رجوع کر لیا،

یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ جب عمر فاروق رضؓ کے نزدیک نص کی صحت ثابت ہو جاتی تو وہ اپنی رائے سے رجوع کر لیتے یا اپنے فیصلہ سے باز آجاتے تھے، حالانکہ خلیفہ وقت کو شرعاً پوری آزادی حاصل ہے کہ اگر وہ مباحات میں بھی امت کا حد سے تجاوز اور شر کو خیر کے پہلو پہ غالب دیکھے تو قومی مصالح کے پیش نظر مباحات پر بھی پابندی عائد کرسکتا ہے کیونکہ اسلامی قانون کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ "درء المفاسد مقدم علی جلب المصالح"

طلاق ثلاثہ کا مسئلہ | اس مسئلہ میں بنائے اختلاف حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کی وہ روایت ہے جسے امام احمد، مسلم اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے،

کان الطلاق علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر و سنتین من خلافۃ عمر طلاق الثلاث واحدۃ،	عہد نبوی، عہد صدیقی اور عہد فاروقی کے دو برس تک تین طلاق ایک شمار کی جاتی تھی،

پھر جب اس معاملہ میں لوگوں نے حد سے تجاوز اختیار کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا،

قد استعجلوا فی امر قد کانت لھم فیہ اناۃ فلو امضیناہ علیھم فامضاہ علیھم،	جس معاملہ میں (یعنی طلاق) لوگوں کو صبر سے کام لینا چاہئے تھا اس میں عجلت کرنے لگے ہیں، کاش ہم اسکو نافذ کر سکتے چنانچہ انھوں نے اسے نافذ ہی کر دیا۔

یہاں ایک اشکال یہ پیش آتا ہے کہ کتب حدیث میں بعض ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں جو مذکورۂ بالا حدیث (مروی عن عبداللہ ابن عباس) کے خلاف ہیں، ان سے یہ ثابت ہوتا

ا ہے کہ ایک لفظ سے تین طلاقیں دینے سے تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، حضرت عبد اللہ
عباسؓ اور صحابۂ کرام کی ایک بڑی جماعت اسی مسلک پر عامل تھی، کتاب اللہ کی جن
ت میں مطلق طلاق کا ذکر آیا ہے، وہ ایک لفظ اور اس کی تکرار کے درمیان کوئی تفریق
ں کرتیں، بلکہ ابن عباسؓ کی مذکورہ روایت میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس میں طلاق ثلاثہ
رار الفاظ اور بیک مجلس مراد ہے، رسول اکرم، صدیقؓ اکبر اور عمر فاروقؓ کے ابتدائی
میں اسی پر عمل تھا کہ تین طلاقیں ایک نشست میں دینے سے صرف ایک طلاق واقع ہوتی
ان کا خیال یہ تھا کہ پہلی بار یا پہلے لفظ ہی سے طلاق واقع ہو جاتی ہے اب دوسری دو
لاقیں محض تاکید کا حکم رکھتی ہیں،

لیکن بعد میں جب لوگ اس میں بے احتیاطی کرنے لگے تو حضرت عمرؓ نے حکم دے دیا
اس صورت میں تین طلاقیں واقع ہونگی، اسے نص سے روگردانی نہیں کہہ سکتے بلکہ
ضرت عمرؓ نے مصلحت و حسن و تدبیر کے تقاضے سے ایک احتمال کو دوسرے احتمال پر ترجیح
ی تھی،

الفاروق

یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مفصل سوانح عمری، اور ان کے مجاہدات اور کارناموں
تفصیل،

(مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی (رحمۃ اللہ علیہ) مطبوعہ معارف پریس طبع دوم،

قیمت: عہ/ ضخامت: ۵۱۲ صفحے

"منیجر"

قطب الاقطاب دیوان محمد رشید جونپوری عثمانی

از

مولانا حبیب الرحمن اعظمی مدرس مرکز علوم مدرسۂ قرآنیہ
شہر جونپور

(۲)

شعر و سخن | دیوان محمد رشید کو شعر و سخن میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا جس پر انکا دیوان شاہد ہے،

ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو،

گرد شو گرد کہ تا گرد نہ گردی در راہ   کے بدانی کہ دریں راہ سوارے باشد

اپنے والد ماجد کے جائے مدفن کے متعلق کتنا عمدہ شعر کہا ہے،

چوں پدر بنگالہ کند مسکن و ماوٰی   شمسی بہ بدخشاں نہ رود لعل بہ سنگ است

غزل کا نمونہ

ہر نگاہ از دعاے دیگر است   پیچش زلفش بلائے دیگر است

من بیکدم سیر عالم می کنم   روح را دستے و پائے دیگر است

بر بدن صد زخم خنجر گر زنی   کے بمیرم جاں بجائے دیگر است

از دل شمسی دمے تمکین مجوے   ہر دمش چوں ہوئے بادِ دیگر است[۱]

تصنیف و تالیف | دیوان صاحب درس و تدریس کے علاوہ تالیف و تصنیف میں اپنے معاصرین میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے،

---

[۱] دیوان شمسی قلمی

سرعت تالیف میں آپ کے معصروں میں آپ کا کوئی ثانی نہیں، آپ نے بعض ایسی اہم کتابیں لکھیں جو گیارہویں صدی کی علمی یادگار بن گئیں۔ ان کے ہر تذکرہ نگار نے اُنکے دوسرے کمالات کے ساتھ تصنیفی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے اور اکثر کتابوں کا تعارف کرایا ہے مگر افسوس کہ ان کتابوں میں دو کے سوا ابتک کوئی کتاب بھی طبع نہ ہو سکی اور نہ آیندہ اس کی امید ہے،

تلاش و جستجو سے دیوان صاحب کی مندرجہ ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے،

(۱) رشیدیہ عربی:۔ اسکے متعلق صاحب نزہتہ الخواطر رقمطراز ہیں،

ومن مصنفاتہ الرشیدیہ فی فن المناظرۃ وہی اشہر مصنفاتہ تلقاہا العلماء بالقبول تعلیقا و تدریسا۔ [۵]	آپ کی تصانیف میں رشیدیہ بہت مشہور ہے علماء نے اسکی جانب خاص توجہ کی ہے اور اس پر حواشی و شروح لکھے ہیں اور درس میں داخل کرلیا ہے،

رشیدیہ دیوان صاحب کی حیات ہی میں بہت مشہور ہو گئی تھی اور اسی زمانہ میں ملا محمود کے ایک شاگرد ملا عبدالباقی جونپوری نے اس پر کچھ اعتراضات کئے تھے اسکے جواب میں دیوان صاحب کے ایک شاگرد نے ردالباقیہ نامی ایک کتاب لکھی تھی جسمیں ملا عبدالباقی کے اعتراضات کے جواب کیا تھا رشیدیہ کے مغلقات کو بھی خوبی سے حل کیا ہے یہ رشیدیہ کی بہترین شرح ہے اس کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جونپور کے کتبخانہ میں موجود ہے،

حافظ امان اللہ بنارسی المتوفی ۱۱۳۳ھ نے بھی رشیدیہ کی ایک مختصر شرح لکھی ہے اسکے علاوہ اور علماء نے بھی شروح و حواشی سے اس کی اہمیت و افادیت کو دوبالا کر دیا ہے، اس

---

[۵] نزہتہ الخواطر ج ۵

کتاب کو دیوان صاحب نے ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں تصنیف کیا تھا جس کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے،

۲۔ تذکرۃ النحو:۔ یہ مبادیات نحو میں مختصر سا رسالہ ہے اُسے دیوان صاحب نے اپنے منجھلے صاحبزادے شیخ ارشد کے لئے لکھا تھا۔ یہ رسالہ آجکل خلاصہ کے نام سے نحومیر کے آخر میں شائع ہوا ہے، تقریباً دو صفحہ میں دیوان صاحب نے نحو کے جملہ عوامل کو بڑے دلنشین انداز میں بیان کر دیا ہے،

۳۔ ترجمہ معینیہ:۔ یہ تذکرۃ النحو کی چار ورقی شرح ہے جو اپنے صاحبزادے معین الدین کے لئے لکھی تھی، یہ شرح عصر وعشا کے درمیانی قلیل وقفہ میں تحریر کی تھی۔

۴۔ ہدایۃ النحو:۔ یہ بھی فن نحو میں ہے جیساکہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ رسالہ خانقاہ رشیدیہ میں نہیں ہے،

۵۔ شرح ہدایہ الحکمۃ (عربی)

۶۔ شرح اسرار المخلوقات (عربی) صاحب تجلی نور: اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں۔ شرحی بعربی بغایت مستحسن وخوب، عربی میں نہایت عمدہ اور بہتر شرح ہے،

۷۔ زاد السالکین:۔ فن تصوف میں مختصر سا گر جامع رسالہ ہے جس میں تصوف کے مسائل کو سلیس فارسی زبان میں قریب الفہم بنا کر پیش کیا گیا ہے،

۸۔ مقصود الطالبین:۔ اوراد و اذکار میں مختصر سا رسالہ ہے،

۹۔ حاشیہ شرح مختصر عضدی (عربی) ۱۰۔ حاشیہ کافیہ ابن حاجب، ۱۱۔ دیوان شمسی

۱۲۔ مکتوبات۔[۱]

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۹ و نزہۃ الخواطر ج ۵ تجلی نور ص ۲، وسمات الاخیار ص ۴۵

ان کتابوں میں صرف رشیدیہ۔ تذکرۃ النحو۔ مکتوبات طبع ہو چکی ہیں بقیہ کتب میں چند تو خانقاہ میں ابتک موجود ہیں اور اکثر معدوم ہو چکی ہیں صرف کتابوں میں انکا ذکر رہ گیا ہے۔

وفات آپ کو شعبان کی آخری تاریخوں سے بخار آنا شروع ہوا علاج معالجہ کے باوجود حالت دن بدن بگڑتی گئی نقاہت و ضعف میں اضافہ ہوتا رہا، لیکن معمولات میں فرق نہیں آنے پایا، نماز باجماعت معمول کے مطابق ادا کرتے رہے، مگر رمضان کی آٹھویں تاریخ یوم پنجشنبہ کو کمزوری بے حد بڑھ گئی اور تیمم کر کے پلنگ ہی پر نماز پڑھی رات کو حالت زیادہ خراب ہو گئی لیکن نصف شب کے بعد کچھ افاقہ ہوا تو آپ نے تیمم کیا اور تہجد میں مشغول ہو گئے اس سے فراغت کے بعد معمول کے مطابق ذکر بالجہر میں مشغول ہو گئے، آواز اتنی بلند تھی کہ باہر والوں کو سنائی دیتی تھی ذکر پورا کرنے کے بعد فجر کیلئے تحریمہ باندھنا چاہا تو لوگوں نے بتایا کہ ابھی وقت نہیں ہوا ہے فرمایا کہ میاں ہو گیا ہے اور لیٹ گئے صبح صادق کے قریب اٹھے تیمم کیا لیکن اس بار شدت ضعف سے تیمم کرنے میں بھی دشواری پیش آئی مگر کسی طرح تیمم کر کے فوراً لیٹ گئے لوگ نماز پڑھنے مسجد چلے گئے اور آپ بھی تحریمہ باندھ کر نماز میں مصروف ہو گئے دوسری رکعت کے سجدہ میں تھے کہ نویں رمضان ۱۰۸۳ھ یوم جمعہ کو روح مبارک قفس عنصری سے پرواز کر گئی،

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر　　　　کیا دیوانے نے موت پائی ہے

آپ کے تلمیذ خاص و خلیفہ اجل شیخ محمد ماہ دیوگامی اعظم گڈھی نے نماز جنازہ پڑھائی اور رشید آباد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس گنجینۂ علم و فن اور مخزن رشد و ہدایت کو سپرد خاک کر دیا گیا[1]

---

[1] سماۃ الاخیار ص ۱۶ تجلی نور ص ۲، ج ۱ و نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۶، ۳ تذکرہ علمائے ہند میں ہے کہ تحریمہ کیوقت وفات ہوئی،

اخلاق و سیرت | مزاج میں حد درجہ قناعت و استغنا تھا، امراء و سلاطین کے دربار میں جانا قطعاً پسند نہ کرتے تھے، چنانچہ نواب سعد اللہ خاں جب شاہجہاں کی وزارت سے مستعفی ہوئے تو شاہجہاں نے ان سے کہا کہ اپنا قائم مقام تجویز کرلو، انھوں نے دیوان صاحب کا نام نامی پیش کیا، شاہجہاں نے ایک شخص حاجی محمد سعید نامی کے ذریعہ دو ہزار روپئے زاد راہ کے لئے اور ایک عریضہ دیوان صاحب کی خدمت میں ارسال کیا اور اشتیاق ملاقات ظاہر کیا، دوسرا خط حاکم جونپور مرزا اکرم خاں کے نام روانہ کیا کہ جس طرح ہو سکے دیوان صاحب کو آمادہ کرکے میرے پاس دہلی بھیجدو لیکن زبردستی نہ کرنا، دیوان صاحب نے شاہجہاں کی پیش کش کو قبول نہیں کیا، بعد میں دو ہزار روپئے بطور نذرانہ پیش کئے مگر اسے بھی قبول نہیں فرمایا،[1]

سنت نبوی کو حتی الوسع ترک نہ فرماتے،[2] جملہ امراض میں شہد اور کلونجی استعمال فرماتے اور شفایاب ہوتے، ایک مرتبہ بخار آیا ملا محمود جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ نے علاج کیا مگر صحت نہ ہوئی تو آپ نے کلونجی اور شہد منگا کر استعمال کیا اور بخار زائل ہو گیا، ملا محمود نے تعجب کے لہجے میں فرمایا "کہ دوائے گرم در تپ صفراوی چگونہ مفید شد" دیوان صاحب نے ارشاد فرمایا کہ "شمارا بر قول حکما اعتماد است و مرا بر قول خدا و رسول"[3]

وضو، نماز اور مصلی کی پاکی میں حد درجہ اہتمام تھا، جب تک دریا کا پانی ملتا کنوئیں کے پانی سے وضو اور غسل نہیں کرتے تھے،[4]

اکثر فرمایا کرتے تھے کہ،

---

[1] گنج ارشدی ج ۱ و ۲: ۳۰۲ و نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۳۷۶ و سمات الاخیار ص، تذکرہ علمائے ہند ص: ۱۱۹

[2] تجلی نور ص ۲، ج ۱۔

[3] سمات الاخیار۔ گنج ارشدی د: ۱۴۰ [4] گنج ارشدی ۱۴۷

تا کسے بجمعیت خاطر با حتیاط وضو کند نماز ادا ہم بجمعیت میسر آید وچوں در وضو احتیاط نمی کند در نماز تفرقہ خاطر آید[۱]

مائے مستعمل اگر کپڑے میں لگ جاتا تو اسے دھوتے اور فرماتے کہ ہر چند موافق فتویٰ آب آن طاہر است امّا تقویٰ شستن را می خواہد[۲]

علمی کمالات کے ساتھ بڑے شجاع و دلیر تھے، تیر اندازی میں مہارت رکھتے تھے، ایک مرتبہ سیر کو نکلے آپ کے شاگرد شیخ عبد الشکور منیری بھی ہمراہ تھے، راستے میں نواب شاہ نواز خاں قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، آپ اس کے قریب پہنچے تو ایسے مقام پر بیٹھ گئے جو تیر کی آماجگاہ تھا اور شیخ عبد الشکور منیری سے فرمایا کتاب لاؤ کچھ پڑھ پڑھا لیا جائے اور درس شروع کر دیا، اثنائے درس میں ایک تیر بالکل چہرے کے پاس سے گذر گیا مگر تقریر میں کسی طرح کا انتشار نہیں پیدا ہوا، نواب آپکی اس جرارت و شجاعت پر متحیر ہو گیا[۳]

زہد و بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ پختہ تعمیر پسند نہ تھی، اگر کسی کو مضبوط عمارت بناتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے کہ کیا بے خبری ہے کہ شئی فانی کو باقی رکھنے کی کوشش میں لگا ہے، خانقاہ کا چھپر بہت معمولی تھا، ایک دفعہ کثرت بارش کی وجہ سے اس قدر پانی ٹپکا کہ گدّی میں پانی بھر گیا، ایک صاحب نے کہا کہ عمدہ قسم کا چھپر بنا دیا جائے تو آپ نے منع فرما دیا اور کہا

چھپر برائے مانع آب ساختند برائے منع آفتاب است چرا کہ ایام بارش چہار ماہ است اول و آخر کم بارد و درمیان ہم شب و روز باستیعاب بارش نمی شود اگر کسے حساب نماید پانزدہ شانزدہ روز خواہد بود دریں کار عاقل نیست کہ برائے اینقدر ایام خانہ سازد و آفتاب تمام روز می باشد خانہ برائے آنست[۴]

---

[۱] گنج ارشدی ۱۴۰، [۲] تجلی نور ج ۱ ص ۱۰، و گنج ارشدی ج ۱ و ۱۳، [۳] گنج ارشدی ج ۱ و : ۱۵ [۴] گنج ارشدی ق ۱۰۱،

پالکی کے مقابلہ میں گھوڑے کی سواری پسند تھی اکثر پیدل چلتے تھے اور بہت تیز چنانچہ نماز فجر کے بعد جونپور سے چلتے اور رمنڈواڈیہہ میں جو جونپور سے ۳۴ میل کے فاصلہ پر ہے ظہر کی نماز جماعت سے ادا کرتے۔[۱]

وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ کفن میں عمامہ نہ دیا جائے اور نہ ایصال ثواب کے لئے گوشت وغیرہ دعوت کی صورت میں پکایا جائے اور نہ تین دن سے زیادہ سوگ منایا جائے، نہ قبر کو پختہ بنایا جائے[۲]

اولاد خدائے فیاض نے دیوان صاحب کو جملہ نعمتوں کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔ آپ کے نو بچے پیدا ہوئے جن میں تین لڑکیاں اور دو لڑکے ایام رضاعت ہی میں فرط آخرت بن گئے۔[۳]

چار لڑکے زندہ رہے اور اپنے باپ کے صحیح جانشین ہوئے، سب سے بڑے شیخ محمد حمید تھے اور سب سے چھوٹے شیخ غلام قطب الدین درمیان میں شیخ محمد ارشد و شیخ غلام معین الدین تھے ان چاروں کے مختصر حالات درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) شیخ محمد حمید یہ ۱۰۳۰ھ میں پیدا ہوئے دیوان صاحب نے تاریخی نام ابوعضد محمد حمید تجویز فرمایا، اوائل عمر میں شاہی فوج میں داخل ہوئے اور فن سپہ گری کے جوہر دکھائے لیکن آخر میں ملازمت ترک کرکے درس و تدریس و افادۂ خلق میں مشغول ہو گئے چند کتب کے علاوہ جملہ کتابیں دیوان صاحب ہی سے پڑھی تھیں اور اجازت و خلافت بھی دیوان صاحب سے حاصل کی تھی، ان کی ذکاوت و فطانت اور مہارت علم پر خود دیوان صاحب کو پورا اعتماد تھا، ایک دفعہ ایک تقریب کے سلسلہ میں دیوان صاحب شیخ پورہ ضلع الہ آباد تشریف لے گئے ساتھ

---

[۱] گنج ارشدی و سماۃ الاخیار [۲] نزہۃ الخواطر ۵ ص ۲۰۰ [۳] گنج رشیدی [۴] گنج ارشدی ج ۱ ص ۱۵

میں شیخ محمد حمید بھی تھے، قاضی الہ آباد شیخ محمد آصف دیوان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ایک تصنیف (حاشیہ تفسیر بیضاوی) ملاحظہ کیلئے پیش کی، دیوان صاحب نے شیخ حمید کو دیدیا، قاضی کو یہ بات گراں گذری کہ خود نہیں دیکھا اور صاحبزادے کو دے دیا وہ کیا دیکھیں گے، اور شیخ محمد حمید کا امتحان لینے کی غرض سے کہا کہ چند مقامات پر کچھ اشکال ہیں، اگر آپ رفع فرمادیں تو نوازش ہوگی اور چند سخت اشکالات پیش کردئے، شیخ محمد حمید نے سنتے ہی مدلل تشفی بخش جواب دیا، قاضی صاحب اس حاضر دماغی اور تبحر علمی پر حیرت زدہ ہوئے،[۱]

سرعت تحریر میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے ایک دفعہ ایک طالب علم نے درخواست کی کہ مجھے حسامی عنایت فرمادیں تو نوازش ہوگی، آپ نے اسی رات کو پوری حسامی لکھ کر اس طالب علم کے حوالہ کردی،[۲]

دیوان صاحب کے مرض الموت میں امامت آپ ہی کے سپرد تھی، دیوان صاحب کی وفات کے بعد شہر کے علماء ومشایخ نے دستار جانشینی آپ کے سر پر باندھ کر آپ کو دیوان صاحب کی جگہ پر بٹھانا چاہا جسکے آپ مستحق بھی تھے لیکن آپ نے اسے قبول نہیں کیا اور مجلس کے اختتام پر فرمایا،

عزیزان خواستند کہ درمیان برادران منازعت پیدا نمایند الحمد للہ کہ نشد،[۳]

اپنے جد امجد شیخ محمد مصطفیٰ کے مزار کی زیارت کے لئے پورنیہ تشریف لے گئے، واپسی پر راستے میں بحالت مسافرت ۲۴ رمضان ۱۰۸۶ھ کو بعمر ۴۹ سال رحلت کی، نعش جونپور لاکر رشید آباد میں دیوان صاحب کے جوار میں دفن کی گئی،[۴]

(۲) شیخ محمد ارشد: - ان کی ولادت ۱۰۴۰ھ میں ہوئی، دیوان صاحب نے ابی الکشف

۱؎ گنج ارشدی ج: ۲، ۱۶۲، ۲؎ ایضاً ورق ۱۶، ۳؎ ایضاً ورق ۱۶، ۴؎ ایضاً ورق ۱۶،

محمد ارشد سے تاریخ پیدائش نکالی اور بدر الحق لقب عنایت فرمایا، اکثر کتابیں دیوان صاحب سے پڑھیں اور چند استاذ الملک سے، بیس سال کی عمر میں علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی کمال حاصل کر لیا اور دیوان صاحب نے خرقۂ خلافت سے مشرف فرمایا،[له] روزانہ کا معمول تھا کہ دوپہر تک درس وتدریس میں رہتے اور ظہر کی نماز اول وقت جماعت کے ساتھ ادا کر کے پھر افادۂ طلبہ میں منہمک ہو جاتے اس مشغولیت کے باوجود وظائف اور اشراق وچاشت کی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی تھی، ریاضت شاقہ کے برداشت کرنے میں بالکل دیوان صاحب کے مثیل تھے،[له] سنت نبوی پر شدت کیساتھ عمل تھا، بیماروں کی تیمار داری اور جنازوں میں بیدل شرکت کا خاص اہتمام تھا، توکل اتنا تھا کہ اگر کبھی فاقہ کی نوبت آ جاتی تو بھی خوشی کا اظہار فرماتے، دیوان صاحب کو آپ کے زہد وتقویٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک مرتبہ پورنیہ کے سفر میں ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت دستور ہے کہ جب دوست دوست کے پاس جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ تحفہ پیش کرتا ہے آپ جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہونگے تو کیا ہدیہ پیش کریں گے، دیوان صاحب یہ سنکر آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ ارشد پیش کردونگا،

تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ خاندان رشیدیہ میں شیخ محمد ارشد کا مقام دیوان صاحب کے بعد سب سے بلند ہے آپ کو ۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۳ھ کو بخار آنا شروع ہوا خاندانی طبیب گلشن مراد بید کا علاج ہوا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا، متعلقین نے دوسرے اطباء کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیا لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا، بخار بدستور قائم رہا اور ضعف ونقاہت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا، دوران مرض میں ایک دن مفتی محمد جمیل صاحب عیادت کے لئے تشریف لائے اور حال دریافت کیا تو آپ نے یہ اشعار پڑھے،

[له] گنج ارشدی ورق ۱۰۰، [له] ایضاً ورق ۱۰۱، گنج ارشدی ورق ۱۱، دستات الاخیار

دل بعشق آں پری پیکر نمی دانم چہ شد　　درد سر باقی بجا و سر نمی دانم چہ شد
ای کہ میگوی چرا آشفتہ خاطر گشتہ　　دل بزلفش بستہ ام دیگر نمی دانم چہ شد

غرض مرض بڑھتا گیا نقل و حرکت کی طاقت سلب ہوگئی ۲۴ جمادی الآخری کو عصر کی نماز شروع کی تو کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے ارکان پورے طور سے ادا نہ ہوسکے، یہ حالت دیکھ کر آپ کے جانشین اور خلیفہ شیخ غلام محمد رشید بن محب الدین بن ارشد رونے لگے اور عرض کی کہ جس ولی کی نماز میں دنیا میں فرق آجائے وہ دنیا میں باقی نہیں رہتا، ایسا ہی ہوا، ۲۴ جمادی الآخری ۱۱۱۳ھ کی شب میں کلمۂ لا الٰہ کا ورد کرتے ہوئے واصل بحق ہوگئے، پسماندگان میں تین[۳] صاحب زادے اور ایک صاحبزادی اور تقریباً ۸۰ خلفاء اور بے شمار تلامیذ وارادتمند چھوڑے[۱]،

۴۔ شیخ غلام معین الدین:۔ ان کی پیدائش ۲۴ شوال ۱۰۶۳ھ کو ہوئی انکے اور شیخ ارشد کے درمیان میں دیوان صاحب کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں مگر بچپنے ہی میں سب کے سب فوت ہوگئے،

دیوان صاحب نے آپ کا تاریخی نام ابوالواعظ رکھا[۲]، دیوان صاحب کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت انہی سے تھی، ان کی اکثر معروضات کو دیوان صاحب کے دربار میں قبولیت حاصل تھی[۳]، انھوں نے ابتدائی کتابیں دیوان صاحب سے پڑھیں اور متوسطات کو شیخ ارشد سے، ۲۹ رمضان ۱۰۸۰ھ کو جمعہ کے دن دیوان صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور ۱۰۸۳ھ کو ان کی وفات سے چند ماہ پہلے خلعت خلافت سے مشرف ہوئے[۴]

غلام معین الدین نے درس و تدریس کے بجائے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا لیکن اصلاح

---

[۱] سماۃ الاخیار ص ۸۵، [۲] گنج ارشدی ورق ۲۱، [۳] گنج ارشدی ۶۵ او ۲۱، [۴] ایضاً ۲،

باطن و تزکیۂ نفس سے کبھی غافل نہیں ہوئے، تقویٰ، طہارت، عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا، آپ فرماتے تھے کہ

مرا در سپاہگری از ہیچکس شرمندگی نمی آید امّا وقتی کہ کمالات قطب الاقطاب و نام پیر دستگیر مذکور می شود شرمساری گردم کہ ازاں بزرگان نسبت دارم و ہیچ وصف حضرات ایشاں در خود نمی بینم۔[1]

شاہ عالم کے ہمراہ حیدرآباد کی مہم پر گئے ہوئے تھے، اثنائے راہ میں ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۲۰ھ کو وفات پائی، تابوت جونپور لایا گیا اور اپنے آبائی قبرستان رشید آباد میں شیخ ارشد کے پائیں دفن ہوئے، وفات کے وقت آپ کی عمر ۵۲ سال ۱۱ ماہ ۲ دن تھی، آپ کے چھوٹے بھائی غلام قطب الدین نے یہ تاریخ وفات لکھی،

حریف نفس را دولت قرین بس	شہید زہد را قصر بریں بس
فنا فی اللہ چوں گشتی رسالت	معین الدین ترا ایزد معین بس[2]

۴۔ شیخ غلام قطب الدین:- ۱۱ ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ کو جمعہ کے دن پیدا ہوئے، اپنی تاریخ پیدائش آپ نے خود بیاں کی ہے،

روز آدینہ یازدہم ربیع الثانی[3]

۱۰۸۰ھ میں دیوان صاحب سے بیعت اور مشرف بخلافت ہوئے[4]، ایک دن شیخ ارشد اہل تصوف کا لباس زیب تن کئے ہوئے مجلس میں بیٹھے تھے ملا محمد نصیب خلیفہ شیخ محمد ارشد نے عرض کیا کہ آپ درویش ہیں یا سپاہی، برجستہ جواب دیا کہ،

---

[1] گنج ارشدی و ۲۱۔ [2] گنج ارشدی ۲۱، سمات الاخیار [3] گنج ارشدی و ۲۲

[4] ایضاً و ۲۲

نہ سپاہی نہ درویش من طالب علم ام — میں سپاہی ہوں نہ ولی بلکہ ایک طالب العلم ہوں

شیخ ارشد یہ جواب سنکر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ سچ کہا ہے[1]

صبح دو گھنٹہ تلاوت کے بعد ذکر و اذکار میں مشغول ہو جاتے اس سے فراغت کے بعد مطالعہ کتب میں لگ جاتے فارسی اور ہندی کے اشعار بہت عمدہ کہتے تھے تاریخ نویسی میں کمال حاصل تھا، جرأت و شجاعت میں یکتا ے روزگار تھے،

گنج رشیدی ملفوظات قطب الاقطاب (دیوان صاحب) اکثر مطالعہ میں دیکھتے تھے اور کہتے تھے کہ

از مطالعہ ایں خود را در مجلس قطب — اس کے مطالعہ سے اپنے آپ کو
الاقطاب می یابیم[2] — دیوانصاحب کی مجلس میں پاتا ہوں،

اسّی برس کی عمر میں جمادی الاولیٰ ۱۱۴۷ھ کو چہار شنبہ کے دن رحلت فرمائی، شیخ غلام محمد رشید جانشین شیخ ارشد نے نماز جنازہ پڑھائی[3]

دیوان صاحب کے خلفا و مجازین:- آپ کے خلفا کی تعداد تقریباً چالیس[4] ہے اُن میں مشاہیر کے نام یہ ہیں،

(۱) شیخ محمد ارشد:- انکا مفصل ترجمہ گذر چکا ہے،

(۲) شیخ میر سید قیام الدین:- یہ تحصیل سگڑی ضلع اعظم گڈھ کے باشندہ تھے لیکن گورکھپور میں سکونت اختیار کر لی تھی اسی لئے گورکھپوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

(۳) شیخ میر سید جعفر پٹنوی:- دیوان صاحب کے خلفا میں آپکا مقام بہت بلند ہے،

---

[1] گنج ارشدی ۷۷ [2] گنج ارشدی و ۳۲ و سمات الاخیار، [3] سمات الاخیار بحوالہ گنج فیاضی قلمی، گنج ارشدی و ۲۰۵

دیوان صاحب فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ مجھے جعفر کے طفیل بخش دینگے، آپکا دور
شیخ میر قیام الدین کا مفصل حال سمات الاخیار میں مذکور ہے ،

(۴) شیخ نصرت جمال عرف ملتانی شاہ جامع گنج رشیدی المتوفی سنہ ۱۰۹۰ھ

(۵) شیخ نور الدین مداری المتوفی سنہ ۱۰۹۳ھ آپ دیوان صاحب کے ارشد تلامذہ سے ہیں

(۶) شیخ عبد الشکور منیری المتوفی سنہ ۱۰۹۰ھ آپکو بھی دیوان صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہے ،

(۷) شیخ محمد ماہ دیوگامی دیوان صاحب کے خاص شاگرد ہیں آپ نے ہی دیوان صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی تھی ،

(۸) شیخ آیت اللہ المتوفی سنہ ۱۱۰۷ھ

(۹) شیخ محی الدین متوکل جونپوری

(۱۰) قاضی محمد مودود جونپوری تلک عشرۃ کاملہ ،

حیاتِ شبلیؒ
طبع دوم

یہ صرف اس عہد کے ایک جامع کمالات بزرگ کی سوانح عمری ہی نہیں بلکہ صاحب سوانح مولانا شبلی کے دور تک ہندوستان کے مسلمانوں کے پچاس سالہ علمی و ادبی، سیاسی تعلیمی مذہبی ملی و قومی تحریکات اور واقعات کی ایک مستند تاریخ بن گئی ہے، شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا گیا ہے جن سے اس کتاب کی تالیف میں مدد ملی ہے، اس کے بعد ایک طویل مقدمہ ہے جس میں دیار مشرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت و خدمت کی محققانہ تاریخ کے ساتھ ہر عہد کے مشہور اکابر کے حالات بھی آگئے ہیں، اسی ذیل میں سلطان ابراہیم شرقی کے دور کے ممتاز عالم قاضی شہاب الدین دولت آبادی، اور دیوان محمد رشید عثمانی جونپوری کا ذکر بھی اجمالاً آیا ہے، جن کا حال اس مضمون میں تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے ،

قیمت :- ۱۲

منیجر :-

ہندوستان کی عربی شاعری

میں

عجمیت پر ایک نظر

از جناب مولانا عبدالجبار صاحب استاد مفتاح العلوم مئو

(۲)

حنانک رسول اللہ یجولہ بہ　　شفیعاً وفتاحاً لباب المواہب

یہ شعر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ہے، ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد کہ مصرعہ اول میں یجو کا صلہ لغت عرب کے خلاف ہے، بالکل صحیح ہے، مگر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو صحیح بنانے کی جو توجیہ ڈاکٹر صاحب نے کی ہے کہ اصل کلام "یدعو لہ بہ" تھا مگر تصحیف کی وجہ سے اس کی جگہ "یجو لہ بہ" تحریر ہو گیا، ہرگز صحیح نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب نے دیکھا کہ یجو کا صلہ لام عربی زبان میں نہیں اور یدعو کا صلہ لام آتا ہے اس لئے یجو کی جگہ یدعو کر دیا جائے تو کلام صحیح ہو جائے گا، حالانکہ عربی زبان میں جب یدعو فعل دعا کرنے اور مانگنے کے معنی میں آتا ہے تو جس ذات سے مانگا جائے گا اور دعا کی جائے گی وہ بے صلہ ہو گا اور جس شخص کے لئے دعا کیجائے گی اس کا صلہ لام آئیگا جیسا کہ "قالوا ادع لنا ساربک" سے ظاہر ہے لغت عرب کی رو سے ڈاکٹر صاحب کی توجیہ کا یہ مطلب ہوا

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے لئے کسی شفیع اور فتاح لابواب المواہب سے دعا کرتے ہیں نعوذ باللہ من ذلک اس لئے ایسی توجیہ ایک عالم ربانی کے کلام کی کیسے صحیح ہوگی،

میرے نزدیک شعر میں کوئی تصحیف نہیں ہے اور شعر کی توجیہہ یہ ہوسکتی ہے کہ "یجز" چونکہ یخشع کے معنی کو متضمن ہے اور یخشع کا صلہ لام آتا ہے اس وجہ سے یہاں لام آیا، اسطرح کی توجیہہ شراح کرتے رہتے ہیں"

عندی علوم لایکاد یحیطہا سماء و لا بر و بحر و ساحل

یہ شعر بھی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، اس پر یہ اعتراض ہے کہ یحیط کے بعد "ب" نہ لانا محاورہ عرب کے خلاف ہے" ڈاکٹر صاحب، کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے مگر متقدمین شعراء کے کلام میں بھی صلہ کی اسطرح فروگذاشت ہوئی ہے مگر ان کے شراح نے یہ نہیں فرمایا کہ شاعر نے عربی محاورہ کی خلاف ورزی کی ہے بلکہ یہ توجیہہ کی ہے کہ یہ منصوب بنزع الخافض ہو یعنی یہاں پر حرف جر تھا مگر ہٹا دیا گیا اس لئے اسم کو منصوب رکھا گیا اس توجیہہ کے مطابق یحیطہا اصل میں یحیط بہا تھا مگر "ب" کو دور کر دینے کی وجہ سے یحیط کے بعد ہا منصوب ہوگیا،

مروان بن الحکم کے عہد کا ایک شاعر ہے جس کو حبیب بن اوس طائی نے باب الحماسہ میں درج کیا ہے ؎

وسائلہ بالغیب عنی وسائل ومن یسئل الصعلوک این مذہب

کتنی عورتیں اور کتنے مرد مجھکو پس پشت پوچھتے ہیں آخر بھوکا محتاج عرب کو کون پوچھتا ہے کہ اس کا راستہ کہاں ہے،

عربی محاورہ یہ ہے کہ جس کو پوچھا جائیگا اس پر عن کا صلہ ضرور

داخل ہوگا جیسا کہ پہلا مصرعہ اور یسألونك عن الساعة میں عن مسئول عنہ پر داخل ہے اسی قاعدہ سے دوسرے مصرعہ میں من یسأل عن الصعلوك تھا عن نکال دینے سے الصعلوك منصوب بنزع الخافض ہوگیا۔

جاہلی شاعر عنترہ کے قول ؎ ولقد ابیت علی الطوی واظلہ کی توجیہ کرتے ہوئے صاحب اقرب الموارد لکھتے ہیں ای اظل علیہ فحذف حرف الجر ثم احذف من قول لولا الاسی لقضانی ای لقضی علیّ۔

جب عرب شعراء کے کلام میں اس قسم کی توجیہات کی گئی ہیں تو ہندوستانی شعراء کے کلام کو کیوں اس سے محروم رکھا جائے۔

؎ لاح دار العمل وحال الحول دار کاس الملام رام الحول

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "دار" اور "کاس" مؤنث سماعی ہیں اس لئے ان فاعلوں کے فعل عربی قواعد کے مطابق لاحت اور دارت ہونا چاہئے"

اس اعتراض کو پڑھ کر اس لئے تعجب ہوا کہ فعل کے مذکر و مؤنث لانے کا قاعدہ نحو میر اور نحو کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں مثال کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ جب مونث سماعی مظہر فعل کا فاعل واقع ہو جیسا کہ اس شعر میں ہے تو فعل کو مذکر اور مؤنث لانا دونوں صحیح ہے، نحو میر میں ہے "بدانکہ چوں فاعل مؤنث حقیقی باشد یا ضمیر مؤنث علامت تانیث در فعل لازم باشد چوں قامت ہند وہند قامت، و در مظہر مؤنث غیر حقیقی و در مظہر جمع تکسیر دو وجہ روا باشد چوں طلع الشمس وطلعت الشمس وقال الرجال، و قالت الرجال"،

پھر ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ عربی زبان میں دو ساکن حروف متصل نہیں ہوا کرتے

علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، کیا وقف کی حالت میں دو حرف ساکن متصل نہیں ہوتے جبکہ کلمہ کے آخری حرف سے پہلے حرف ساکن ہو، جیسے غفور، شکور، علیم، حساب، کتاب، یعلمون، کافرون وغیرہ سینکڑوں ایسے کلمات ہیں جنہیں وقف کی حالت میں دو حرف ساکن متصل ہوتے ہیں اور تلاوت قرآن کریم کے وقت تمام علماء و قراء اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں بغیر وقف میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے جیسے وَلَا الضَّآلِّیْنَ، میں ضاد کے بعد الف اور لام اوّل دونوں ساکن ہیں اور ایسے بہت سے کلمات قرآن کریم میں موجود ہیں "

ڈاکٹر صاحب نے یہی اعتراض باقر آگاہ کے اس شعر پر کیا ہے،

۵ ومر بیت غوی کالنسیم تلطفا فوتفت من طرب افاح ذکاء

کہ ذکاء عربی زبان میں مؤنث ہے اس لئے فاح ذکاء کی جگہ فاحت ذکاء چاہیئے،

۵ ما زار طرفی غمض بعد بعدکم ولا الخیال سروراً دار فی خلدی

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرعہ میں خیال سرور فارسی کا اثر ہے عربی میں خیال محبوبہ کی اس تصویر کو کہتے ہیں جو خواب میں نظر آئے "

ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال ہے کہ "خیال" عربی میں محبوبہ کی اس تصویر ہی کو کہتے ہیں جو خواب میں نظر آئے لیکن شیخ احمد تھانیسری کے علاوہ غیر عجمی محقق علماء نے خیال کو اس معنی میں استعمال کیا ہے جس کو ڈاکٹر صاحب فارسی کا اثر کہتے ہیں، علامہ سید محمود آلوسی بغدادی اپنی کتاب تفسیر روح المعانی میں قرآن کریم کے حروف مقطعات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "والذی یغلب علی الظن ان تحقیق ذالک علم مستور وسر محجوب عجزت العلماء کما قال ابن عباس عن ادراکہ وقصرت خیول الخیال عن لحاقہ[۱]

---

[۱] روح المعانی،

علامہ ابن الہمام خطِ سترہ کی بحث میں لکھتے ہیں: "والسنة اولیٰ بالاتباع مع انه یظهر فی الجملة اذ المقصود جمع الخاطر بربط الخیال به کیلا ینتشر"[1]۔

سترہ کی بحث میں علامہ ابن عابدین شامی ناقلاعن الحلیة لکھتے ہیں: "ویظهر ان الاولیٰ اتخاذ ہما فی ہذا الحال وان لم یکره الترک لمقصود آخر وهو کف بصره عما وراءه وجمع خاطره وربط الخیال بہا کذا فی رد المحتار"[2]۔

لغت کی کتاب سے بھی اس استعمال کی تائید ہوتی ہے۔

الخیال ما تشبه لک فی الیقظة والحلم من صورة والظن والوهم وشخص الرجل و طیفه و طلعته

ان محقق علماء اور کتب لغت کی شہادت کے بعد اس محاورہ کو فارسی کا اثر کہنا صحیح نہیں، آخر میں ایک جاہلی شاعر حارث ابن عباد کا شعر پیش کیا جاتا ہے جس نے لفظ خیال کو اپنے شعر میں استعمال کیا ہے ؎

قربا مربط النعامة منی ... لقحت حرب وائل عن حیال

کیا اس شعر میں خیال کے وہی معنی ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کئے ہیں؟ یا وہم و خیال مراد ہے۔

ص جفتنی فذبتنی فغضت بغیظة ... فذہبت بتنص بین جنبی یشقق

ڈاکٹر صاحب نے اس شعر کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ "محبوبہ بدسلوکی کے ساتھ مجھ سے پیش آئی اور مجھے دھکے دئے پھر سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا، بعد ازاں ایسا غم و اندوہ دیکر نکال دیا جو میرے پہلوؤں کے درمیان کسک پیدا کرتا ہے" یہ ترجمہ بتاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب

---

[1] فتح الملہم ج ۲ صفحہ ۱۰۳، [2] ملاحظہ ہو فی رنات الطرب من اغانی العرب فی قصیدة حارث العباد۔

غظت کو واحد مؤنث غائب کا صیغہ غاظ یغیظ سے قرار دیتے ہیں حالانکہ فن صرف کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ غاظ سے واحد مؤنث غاظت ہوگا جیسے باع سے باعت لطف یہ ہے کہ غظت سے شعر کا وزن بھی درست نہیں ہوتا، شاعر کے نزدیک واحد مؤنث غائب کا صیغہ نہیں ہے ورنہ وہ غاظت کہتا اور شعر کا وزن بھی درست ہو جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے نزدیک غظتُ ربعتُ کے وزن پر غاظ واحد متکلم کا صیغہ ہے، اسی طرح ڈاکٹر صاحب دوسرے مصرعہ میں ذبتُ کو ذبّ یذب سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ بھی واحد متکلم کا صیغہ ذبتُ ہے، ذَابَ یذُوبُ سے قُلتُ کے وزن پر۔

ڈاکٹر صاحب کی تجویز سے شعر لفظاً تو درست ہو جاتا ہے اور اس کے وزن میں انکسار نہیں پیدا ہوتا مگر معناً بالکل بے معنی ہو جاتا ہے، فطری بات ہے کہ جو دھکہ کھاتا ہے اس کو غم و غصہ ہوتا ہے، چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ میرے ساتھ محبوبہ نے ناروا سلوک کیا اور مجھے دھکا دیا تو مجھے غصہ آیا اور گویا غم سے آگ لگ گئی اور میں پگھل گیا اور غم میرے پہلو میں موجزن رہا، اس لئے یقیناً شعر میں غظتُ واحد متکلم کا صیغہ ہے، عربی قواعد سے کسی طرح واحد مؤنث غائب کا نہیں ہو سکتا لیکن غظت کا استعمال یہاں پر عربی زبان کے محاورہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ غاظ یغیظ دوسرے کو غصہ دلانے کیلئے عربی زبان میں بولا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے "یغیظ بہم الکفار" خود غصہ ہونے کے لئے اغتاظ باب افتعال سے مستعمل ہے اور تغیظ باب تفعل سے۔

ادبیات

غزل

از جناب عروجؔ زیدی

لمحہ بہ لمحہ رنگِ تغیر بشر میں ہے — عمرِ رواں کیساتھ ہر انساں سفر میں ہے
آسودگیٔ زیست کب اسکی نظر میں ہے — انساں ہنوز کشمکشِ خیر و شر میں ہے
تحریک اور جمود کے فرق آشنا ہیں ہم — منزل رسی میں کب ہے جو لذت سفر میں ہے
جب چشمِ التفات اٹھی تھی مرے لئے — وہ حسن اتفاق ابھی تک نظر میں ہے
مانگے کی چیز ہیں نکہت و نور و دلکشی — اپنا بھی کوئی حسن نمودِ سحر میں ہے
کیونکر بیاں ہو اشکِ محبت کی آب و تاب — وہ بات رنگِ گُل میں نہ آبِ گہر میں ہے
دامن سے خار الجھے ہیں وہ بھی کبھی کبھی — پھولوں نے جو سلوک کیا ہو نظر میں ہے
اب اسکے بعد کوئی تغیر نہ انقلاب — یہ پہلوئے سکوں بھی غمِ معتبر میں ہے
میرا خدا شفیق، مرا ناخدا رفیق — یہ اور بات ہے مری کشتی بھنور میں ہے

مجکو مجالِ عرضِ تمنا تو ہے عروجؔ
لیکن مآلِ عرضِ تمنا نظر میں ہے

غزل

از جناب سید رفیع الدین صاحب سالک رحمانی

دل خستگیٔ گل آج برہم ہے مگر کیوں ہے — تلاطم خیز موجِ قلبِ شبنم ہے مگر کیوں ہے
ہزاروں سال سے فطرت ہے مصروفِ خود آرائی — پراگندہ ابھی تک زلفِ عالم ہے مگر کیوں ہے

جراحت دل کی تھی وجہ فروغ دل مگر کیوں تھی
ترے نالوں میں اب تاثیر غم کم ہے مگر کیوں ہے

حیات افروز تک پیغام ہم لائے تھے دنیا میں
ہماری زندگی اب شور ماتم ہے مگر کیوں ہے

شکست جام و مینا سے ہے میخانہ میں ہنگامہ
شکستہ ساز دل تقدیر آدم ہے مگر کیوں ہے

یہ راز آفرینش راز بن کر رہ نہیں پایا
شعور آدمیت پھر بھی مبہم ہے مگر کیوں ہے

ہم اہل دل ہیں عالم کے حقائق ہم پہ روشن ہیں
فریب خود نگاہی پھر بھی پیہم ہے مگر کیوں ہے

ہمیں ترک تعلق سے تمہارے کچھ نہیں شکوہ
کہ اب اس شہر میں جنس وفا کم ہے مگر کیوں ہے

وہ دھڑکن جس سے تھی احساس میں خوشگری سالک
وہ دھڑکن زندگی کی آج مدھم ہو مگر کیوں ہے

غزل

از جناب ساحل ناگپوری

میں اپنی محبت کا چھیڑوں اگر افسانہ
سن لے جو کوئی ساحل ہو جائے وہ دیوانہ

پینے کا ہمارے ہے انداز جداگانہ
مخمور تو ہیں لیکن بادہ ہے نہ پیمانہ

اسرار حقیقت ہیں جو میری زباں پر ہو
کہنے کے لئے کہہ لے دنیا مجھے دیوانہ

ویرانے کی وسعت کو ارباب خرد جانیں
میں نے تو یہ دیکھا ہے ذرّے میں ہے ویرانہ

محسوس یہ ہوتا ہے تو دور نہیں مجھ سے
معلوم یہ ہوتا ہے میں تجھ سے ہوں بیگانہ

ہم سوختہ جاں وقف آداب محبت ہیں
پھرتا ہے نگاہوں میں جلتا ہوا پروانہ

میں کون ہوں اے ساحل یہ راز نہیں کھلتا
دیوانوں میں دیوانہ فرزانوں میں فرزانہ

مطبوعات جدیدہ

آپ بیتی یا یادِ ایّام :- چار حصے از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ تقطیع چھوٹی ضخامت بالترتیب ۱۲۴، ۱۸۰، ۳۰۴، ۲۰۲ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ/

پتہ کتب خانہ یحیوی مظاہر العلوم سہارنپور،

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کی ذات با برکات اس دور میں شریعت و طریقت کی شمع فروزاں اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا روحانی فیض آپ ہی کی ذات سے جاری ہے، اور گنگوہ، نانوتہ تھانہ بھون اور رائے پور کی خانقاہوں کا جلوہ سہارنپور میں یکجا نظر آتا ہے،

ع انچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری

بزرگوں کے حالات و ملفوظات وہ صحیفہ ہدایت ہیں جن کی رہنمائی ہمیشہ قائم رہتی ہے اس لئے حضرت شیخ کے متوسلین کی دیرینہ تمنا تھی کہ آپ اپنے حالات قلمبند فرما دیتے مگر آپکے مشاغل میں اتنی فرصت کہاں تھی اتفاق سے آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں دو مرتبہ علی گڈھ میں نسبۃً طویل قیام کا اتفاق ہوا، اس زمانہ میں ہر قسم کے علمی و تعلیمی کاموں کی ممانعت

تھی اس لئے متوسلین کی درخواست پر اپنے حالات املا کرا دئے جنکو مزید ترمیم و اضافہ کے بعد کتب خانہ یحیوی نے چار حصوں میں شائع کیا ہے اس میں بچپن سے لیکر اب تک کے حالات آ گئے ہیں،

حضرت شیخ کی پوری زندگی درس و تدریس تالیف و تصنیف، ارشاد و ہدایت اور تجدید و اصلاح خصوصاً حدیث نبوی کے درس و تالیف میں گذری اس لئے آپ بیتی کا ہر ورق بصیرت افروز سلوک و معرفت کا درس اور مذہبی علمی اور تعلیمی معلومات کا خزانہ ہے اس ضمن میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کی بھی تاریخ آ گئی ہے،

حضرت شیخ کا تعلق ایسے دودمانِ عالی اور تصوف کے ایسے سلسلۃ الذہب سے ہے جو علم و عمل اور شریعت و طریقت کا مجمع البحرین تھا جس میں ہر زمانہ میں بڑے بڑے علماء و مشائخ اور اہل اللہ پیدا ہوتے رہے انھیں کے دامن میں حضرت شیخ کی نشو و نما ہوئی اور زندگی کے ہر حصہ میں ان سے گہرا ربط رہا ہے، اس لئے آپ بیتی کے ضمن میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا خلیل احمد انبیٹھویؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ مولانا محمد یحییٰؒ، شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاسؒ شاہ عبد الرحیمؒ اور شاہ عبد القادر صاحب رائے پوریؒ اور اس دور کے دوسرے بزرگوں کے جستہ جستہ سبق آموز حالات آ گئے ہیں، اسطرح یہ کتاب اس دور کے بزرگوں کا اجمالی تذکرہ بھی ہو جس سے اس زمانہ کا پورا علمی مذہبی اور روحانی ماحول سامنے آجاتا ہے اسکو پڑھکر ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے، یہ اس کتاب کا نمایاں پہلو ہے اور وہ جن مذہبی علمی تعلیمی اور اخلاقی و روحانی فوائد اور گوناگوں مفید معلومات پر مشتمل ہے اسکا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے اس میں ان سب کے طالبین کے ذوق کا پورا سامان موجود ہے، یہ کوئی مرتب تصنیف نہیں بلکہ ارتجالاً املا کرائی

گئی ہے اس لئے انداز بیان سادہ اور بے تکلف مگر شگفتہ اور دل آویز ہے، جابجا لطائف و ظرافت کی چاشنی حضرت کی جمالی شان کا مظہر ہے۔

صحبتے با اولیاء : مرتبہ مولانا محمد تقی الدین صاحب ندوی مظاہری،

تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۶ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۵ر

پتہ (۱) کتب خانہ یحیوی مظاہر العلوم سہارنپور (۲) مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

یہ کتاب حضرت شیخ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، یوں تو حضرت کا چشمۂ فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے مگر رمضان المبارک میں جو نزول برکات اور اہل اللہ کے ذوق و شوق کا خاص مہینہ ہے اس میں اور ہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، حضرت پورے مہینہ کا اعتکاف فرماتے ہیں اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے استفادہ کیلئے طالبین کا ہجوم ہو جاتا ہے اور سہارنپور کی نو تعمیر جامع مسجد درسگاہ صفہ اور یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً و علی جنوبہم کا مظہر بن جاتی ہے، اس زمانہ کے ملفوظات خصوصیت کے ساتھ قلمبند کرنے کے لائق ہوتے ہیں جس کی طرف اب تک کسی نے توجہ نہیں کی تھی، خوش قسمتی سے مولانا تقی الدین کو جو حضرت کے شاگرد بھی ہیں اور مرید باختصاص بھی، اس طرف گذشتہ دو تین سال رمضان میں حضرت کی خدمت میں رہنے کی سعادت حاصل ہوئی، انھوں نے اس زمانہ کے ملفوظات و ارشادات قلمبند کرلئے، اب اس گنج گرانمایہ کو مجلس معارف ترکیزہ سورت نے صحبتے با اولیاء کے نام سے شائع کیا ہے یہ ملفوظات اصلاح نفس کا نسخہ، احسان و تصوف کا عطر اور سلوک و معرفت کا درس ہیں، شروع میں مرتب کے قلم سے کتاب کا تعارف اور مولانا علی میاں کے قلم سے ایک مؤثر اور دلنشین مقدمہ اور حضرت شیخ کے معمولات کا نقشہ ہے جو بجائے خود سلوک و طریقت کے سبق کی حیثیت رکھتا ہے، دونوں کتابیں اپنے فوائد کے لحاظ سے مسلمانوں خصوصاً سالکین طریقت کے

مطالعہ کے لائق ہیں۔

ہندوستانی مسلمان پر ایک نظر:- مؤلفہ جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع بڑی ضخامت صفحات ۳۲: کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد [illegible]
پتہ ادارۂ تحقیقات ونشریات اسلام دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مولانا علی میاں کا قلم ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے اور نئے نئے رنگ میں جلوہ دکھاتا ہے، ہندوستانی مسلمان انکی تازہ تصنیف ہے اس میں ان کی مذہبی ومعاشرتی زندگی آداب وتہذیب رسم ورواج اور عادات وخصائل کا نقشہ دکھایا ہے، کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں پیدائش سے لیکر بلوغ تک دوسرے میں بلوغ سے موت تک کے رسوم تیسرے میں تہذیب ومعاشرت کا نقشہ چوتھے میں مذہبی تہواروں، پانچویں میں عبادات وفرائض کا ذکر چھٹے میں بعض مذہبی وملی خصوصیات پر تبصرہ ہے جس سے اسکا ہر رخ سامنے آجاتا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور رسوم کا دائرہ بہت وسیع ہے، مصنف کا مقصد صاف ستھرے دیندار گھرانوں کی اسلامی معاشرت کا نقشہ دکھانا ہے اس مقصد میں یہ کتاب پوری طرح کامیاب ہے اس سے اس کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے کہیں کہیں بعض غیر اسلامی رسوم بھی نقد وتبصرہ کے بغیر نقل کردی ہیں، مصنف کی دوسری علمی تصانیف کے مقابلہ میں یہ کتاب اگرچہ ہلکی پھلکی ہے لیکن افادہ عام کے لحاظ سے انسے زیادہ مفید ہے اور علمی کتابوں کی محنت وکاوش کا بار ہلکا کرنے کیلئے اس قسم کی تصنیف مصنف کے لئے ضروری ہے۔

"م"

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب اور ترکیہ، اسلامی رصدخانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں، قیمت: لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو زیادہ تر قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبد السلام

مولانا عبد السلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ، قیمت: غعہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے مشہور صاحب تصنیف محدثین کرام و نیز کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل، مرتبہ ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین، قیمت: ععہ

صاحب المثنوی،

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت: غعہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

یہ کتاب کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے اور جنھوں نے اس کو دیکھ کر جنت نشان بنا دیا، ان کی بہت ہی مستند و مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی ندوی ایم اے، قیمت: بعہ

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

مصنفاتِ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے

۱- بزمِ تیموریہ: تیموری بادشاہوں شہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۹۲ صفحے قیمت

۲- بزمِ مملوکیہ: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادباء کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے۔ ۲۵۰ صفحے قیمت

۳- بزمِ صوفیہ: عہدِ تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحبِ ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات کثرت مضامین کے ساتھ نیا ایڈیشن قیمت

۴- ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک
تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے۔ ۵۰۰ صفحے، قیمت: ۲۵ روپے

۵- ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام
اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰۰ صفحے قیمت

۶- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے
اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت:

۷- ہندوستان کے سلاطین، علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر
ضخامت: ۲۲۰ صفحے، قیمت:

۸- ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں
ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و خیالات قیمت:

۹- ہندوستان کے بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں
(جلد اول) ۲۲۲ صفحے، قیمت:

۱۰- عہدِ مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں
مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے عہدِ مغلیہ و جدید عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی علمی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۰۰ صفحے، قیمت:

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

اگست ۱۹۷۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(مکتبہ اقبال احمد)

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں

مصر و شام و حجاز وغیرہ اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں ہمارے ملک ہندوستان میں بھی اسلامی علوم و فنون پر کچھ کم کام نہیں ہوا ہے، تقریباً تمام علوم پر ہندوستانی علما، اور مصنفین کی بہترین کتابیں موجود ہیں جن سے تمام دنیا متمتع ہو رہی ہے، لیکن اُن کی کوئی جامع فہرست اُردو میں کیا کسی زبان میں بھی مرتب نہیں ہوئی تھی، اسی خلا کو پُر کرنے کے لئے مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب نزہۃ الخواطر نے الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے نام سے عربی میں ایک فہرست مرتب کی تھی جو اب دمشق سے شائع بھی ہو گئی ہے، یہ اسی عربی کتاب کا ترجمہ ہے، اس میں ہندوستانی علما، و مصنفین کی تمام معروف تصانیف کے ذکر کے ضمن میں اجمال کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے علمی و تعلیمی و دینی و فکری تاریخ بھی آگئی ہے، اس طرح سے یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی دور کے محققین کے لئے ایک مستند ترین ماخذ بن گئی ہے،

ضخامت:۔ ۴۰۰ صفحے قیمت:۔ دس روپئے،

مترجمہ مولانا ابوالعرفان ندوی

جلد ۱۱۰ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۲ء عیسوی عدد ۲

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ ہماری علمی بزم کی ایک اہم یادگار ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے گذشتہ مہینے انتقال کیا، وہ اس دور کے مشہور فاضل اور نامور محقق تھے، اُن کا موضوع عربی لسانیات تھا، اس کے متعلقات علم الاشتقاق، رسم الخط، حروف و اصوات وغیرہ پر اُن کی نظر بڑی دقیق تھی، اور اپنی تحریروں میں اس کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، اُن کی پوری زندگی علمی و تعلیمی خدمات میں گذری، مگر لکھتے کم تھے، اس لئے غالباً متفرق مضامین کے علاوہ کوئی مستقل تصنیف یادگار نہیں چھوڑی، مگر اُن کے یہ مضامین اُن کی محققانہ نظر کا ثبوت ہیں، عرصہ ہوا الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کی صدارت سے ریٹائر ہوئے تھے، اور الٰہ آباد ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی، ایک زمانہ میں ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد کے رکن رکین تھے، یونیورسٹیوں اور دوسری علمی مجالس میں ان کا بڑا وقار تھا، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بھی رکن تھے، ان کا رہن سہن تو جدید تھا لیکن شرافت و وضعداری اور شفقت و محبت میں مشرقی تہذیب کا نمونہ تھے، ادھر کئی سال سے بالکل معذور ہو گئے تھے، آخر میں ہوش و حواس نے بھی جواب دیدیا تھا، اسی حالت میں گذشتہ جولائی میں انتقال کیا، انتقال کے وقت ۸۷ سال کی عمر تھی، مسلمانوں میں ایسے محقق اب مشکل سے پیدا ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے

نسلی، لسانی اور جغرافی عصبیت نے مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہنچایا ہے مگر اس سے انھوں نے کوئی سبق نہیں لیا، ایک حد تک ان چیزوں کی بھی اہمیت ہے لیکن اتنی نہیں کہ اس کے لئے وسیع ملی مفا

و قربان کر دیا جائے بلکہ اپنے وجود کو بھی خطرہ میں ڈال دیا جائے۔ اس عصبیت نے دولتِ عثمانیہ کو ختم کیا، دو عرب دنیا کو چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم کرکے ان کی قوت اتنی کمزور کر دی کہ وہ اپنا وجود قائم رکھنے میں دوسروں کی دست نگر ہیں، پھر جغرافی وطنیت نے ان میں بھی ایسا اختلاف پیدا کر دیا کہ وہ اب تک متحد نہ ہو سکیں، اور وہ اسرائیل جیسی چھوٹی اور نومولود حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اسی عصبیت نے پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیئے، اور وحشت و بربریت کا ایسا برا نمونہ پیش کیا جس کی مثال اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی، اور اب یہی عصبیت مغربی پاکستان میں بھی ابھر رہی ہے،

........o☼o........

کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس مذہب نے ساری عصبیتوں کو مٹا کر ملتِ اسلامیہ کی بنیاد اسلامی وحدت و اخوت پر رکھی تھی، اور انصار نے اس کا یہ نمونہ پیش کیا تھا، کہ اپنی املاک تک مہاجرین میں آدھی تقسیم کر دی تھی، آج اس مذہب کے ماننے والے محض زبان، نسل، اور جغرافی وطنیت کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے، پاکستان کا ہر حصہ آزادی کا طالب ہے، مہاجرین پر جن کی قربانیوں کی بدولت پاکستان قائم ہوا، اور جنھوں نے اپنا سارا خانماں لٹا کر پاکستان میں پناہ لی تھی، اس کی سرزمین اتنی تنگ ہو رہی ہے کہ ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے مسلمان مخالف حالات کے باوجود زیادہ امن و سکون سے ہیں، دوسری طرف ہندوستان ہے جہاں اخوت و وحدت کی کوئی تعلیم نہیں، بلکہ اس کا پرانا نظام طبقاتی ہے، اور جہاں پاکستان سے کہیں زیادہ مذہبی، نسلی، لسانی، اور تہذیبی اختلافات ہیں، مگر ملک کی سالمیت اور وحدت پر سب متفق ہیں، اگر اس کے خلاف کوئی کمزور آواز اٹھتی ہے، تو وہ حقوق طلبی سے آگے نہیں بڑھتی، یہاں کے مقامی باشندوں اور شرنارتھیوں میں کوئی تفریق و منافرت نہیں، یہ مسئلہ یہاں کب کا حل ہو چکا، شرنارتھی اپنے نئے وطن میں پورے اطمینان اور سکون کی زندگی

بسر کر رہے ہیں،

....

مذہبی اخوت سے قطع نظر خالص ملکی مفاد کے نقطۂ نظر سے، یہ عصبیت پاکستان کے لئے انتہائی مہلک ہے، اگر سندھ اور بلوچستان جیسے چھوٹے صوبے جن کی آبادی ہندوستان کے بڑے ضلعوں کے برابر بھی نہیں ہے آزاد ہو گئے تو ان کی حیثیت پرانی دیسی ریاستوں سے زیادہ نہ ہوگی، وہ اپنا وجود کس طرح قائم رکھ سکیں گے، مشرقی بنگال کی مثال سامنے رکھنا صحیح نہیں ہے، وہ مذہب کے علاوہ ہر حیثیت سے مغربی پاکستان سے الگ اور اس سے مختلف ہے، اگرچہ وہ مسلمان ملک ہے لیکن اس کو اسلامی تہذیب کا اثر اور دنیا کے مسلمانوں سے اسکا تعلق بہت کم رہا، اس لئے وہاں سے اسلامی وحدت کی مخالفت کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے لیکن سندھ وہ علاقہ ہے، جہاں اسلام کا پرچم سب سے پہلے لہرایا، اور سب سے پہلے اسلامی حکومت قائم ہوئی، اور شمالی ہند سے مدتوں پہلے وہ اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب کا مرکز رہا، یہاں کے علماء نے دنیائے اسلام میں سندھ کا نام اونچا کیا، سندھی زبان میں عربی و فارسی الفاظ کی کثرت ہے، اس کا رسم الخط بھی فارسی ہے، سندھ اور ملتان میں جتنے اسلامی آثار ہیں، دلی اور لاہور کے علاوہ اور کسی شہر میں مشکل سے ملیں گے، ان خصوصیات کے ہوتے ہوئے وہاں سے جاہلی عصبیت کے نعروں کا بلند ہونا حیرت انگیز ہے، اگر یہ عصبیت قائم رہی تو مغربی پاکستان ... کو بھی لے ڈوبے گی، ان حالات کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم غلط تھی، اس سے ہندوستان کے مسلمان الگ برباد ہوئے، اور پاکستان کا تخیل بھی کامیاب نہ ہوا، ملت اسلامیہ کا جو حصہ بھی واعتصموا بحبل اللہ کو چھوڑیگا ان کا انجام یہی ہوگا، بلکہ اس کو یستخلف ربی غیرکم" کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے ۔

....

مقالات

تہذیب کی تشکیل جدید

معاشی نظام

(۵)

از مولانا محمد تقی امینی، ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مغربی تہذیب میکانکی نظریۂ حیات پر قائم ہے

مغربی تہذیب میکانکی نظریۂ حیات پر قائم ہے، جو انسان کی طبعی زندگی (Physical life) اور اس کے ذاتی مفاد تک محدود ہے، اس بنا پر اس کے معاشی نظام میں صرف ان ضرورتوں کو زیر بحث لایا گیا ہے، جن کا تعلق انسان کی مادی ضرورتوں اور حیوانی تقاضوں سے ہے، اور جن میں عقل کی رہنمائی کافی سمجھی گئی ہے، ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے عقل نے پہلے نظام سرمایہ داری کو جنم دیا، جب اس میں کامیابی نہ ہو سکی تو سوشلزم اور کمیونزم کو ایجاد کیا، جن کا ابھی تجربہ ہو رہا ہے،

تشکیل جدید ربانی نظریۂ حیات پر قائم ہے

تشکیل جدید ... کی بنیاد ربانی نظریۂ حیات پر قائم ہے جس نے زندگی کو دو حصوں مادی وغیر مادی میں تقسیم کیا، اور تکمیل انسانیت کیلئے دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا، اس بنا پر اس کے معاشی نظام میں دونوں کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے اور تنہا عقل کی رہنمائی کو ناکافی سمجھا گیا،

تکمیلِ انسانیت کے لئے زندگی کا ماورائی عنصہ کم اہم نہیں، بلکہ مقابلۃً زیادہ اہم ہے کیونکہ اصلاً یہی حصہ صفاتِ الٰہی کا مظہر اور اقدارِ حیات کا حامل ہوتا ہے، اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو انسان کی حیثیت گوشت پوست کے لوتھڑے سے زیادہ نہ رہے گی،

عقل ذاتی مفاد کی، اور وحی اقدارِ حیات کی حفاظت کرتی ہے،

صفاتِ الٰہی کے عکس سے زندگی میں جو صفات نمودار ہوتی ہیں ان کو "اقدارِ حیات" کہتے ہیں، ان میں تبدیلی اور زمان و مکان کی پابندی نہیں ہوتی، اُن کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے، جہاں عقل کی سرحد ختم ہوتی ہے اس بنا پر ان کی رہنمائی کے لئے ایک بلند و برتر شے کی ضرورت ہے، اور وہ وحی ہے، اس طرح تشکیل جدید میں ذاتی مفاد کی حفاظت عقل کے ذریعہ ہوتی، اور ان اقدار کی حفاظت وحی کے ذریعہ، ظاہر ہے کہ جو نظام ان دونوں کی حفاظت پر مبنی ہو، وہی انسانی فلاح و بہبود کا ضامن ہو سکتا ہے،

اقدارِ حیات کی حفاظت سے نہ صرف ہر شخص دوسرے کی دست برد سے محفوظ رہے گا، بلکہ دوسرے کے مفاد کو اپنا مفاد اور اس کے نقصان کو اپنا نقصان جانے گا، اور ضرورت کے وقت خود نقصان اٹھا کر دوسرے کے فائدہ کا سامان فراہم کرنے سے بھی دریغ نہ کرے گا۔

چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:-

وَیُؤثِرُوْنَ علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ[1]	وہ لوگ اپنے اوپر دوستوں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ ان کو فاقہ ہی کیوں نہ ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

---

[1] القرآن۔ حشر۔ ع۔ ۱،

لا یومن عبد حتی یحب
لاخیہ ما یحب لنفسہ[۱]

بندہ پورا مومن اُس وقت تک
نہیں ہوتا، جب تک کہ اپنے بھائی
کے لئے وہی نہ پسند کرے، جو اپنی
ذات کے لئے پسند کرتا ہے،

...ار حیات کی حفاظت سے ...رمایہ داری کی لعنت ختم ہو جائیگی ...ں کو کارل مارکس نے تاریخی وجوب سے کم کرنا چاہا

"اقدار حیات" کی حفاظت سے سرمایہ داری کی لعنت ختم ہو جائیگی اور معاشی استحصال سے نجات مل جائے گی، جس کے لئے کارل مارکس[۲] کو کوئی مضبوط بنیاد نہ مل سکی، اور مجبوراً اس کو تاریخی وجوب (L. Laural Histori. al. neiessily) کا سہارا لینا پڑا، جیسا کہ لکھا ہے:-

"مارکس اور انجلز نے اپنی اشتراکی تمناؤں کا جواز اخلاقی بنیادوں پر نہیں رکھا، بلکہ یہ کہا کہ اشتراکیت تاریخی وجوب کا تقاضہ ہے، (یعنی تاریخ سے ثابت ہے کہ کوئی نظام مستقلاً ایک حالت پر قائم نہیں رہتا، بلکہ کچھ دن کے بعد اندر سے ایک دوسرا نظام ابھرتا ہے جو بڑی حد تک اس کی ضد ہوتا ہے[۳]"

لیکن "تاریخی وجوب" کا سہارا اتنا مضبوط نہ تھا کہ وہ معاشی نظام کے لئے کوئی مستحکم بنیاد فراہم کرتا، یہی وجہ ہے کہ لینن اور پھر اس کے بعد اسٹالن نے اشتراکی تصورات میں کافی تبدیلی کر دی، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے،

...دار حیات کی حفاظت کے ...ریق کار میں حکومت کے اختیارات کافی وسیع ہیں

اقدار حیات کی حفاظت کا تعلق صرف وعظ و تبلیغ سے نہیں بلکہ حکومت کے قانون سے بھی ہے یعنی حکومت ذرائع پیداوار کی تنظیم اور پیداوار کی

---

[۱] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق الفصل الاول [۲] Karl Marx

Democracy

تقسیم اس طرح کرنے پر مامور ہے کہ ہر سطح پر ان کی حفاظت کا بندوبست ہوتا رہے، اس لئے تشکیل جدید میں صرف اصل مقصد پر زور دیا گیا ہے یعنی اللہ کی مخلوق کو رزق حلال میسر ہو، اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق عدل وانصاف کے ساتھ اس کی حاجتیں پوری ہوتی رہیں، اس کی تنظیم و تقسیم کی تفصیلات سے بحث نہیں کی گئی ہے، ان میں حالات زمانہ کے لحاظ سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے، بلکہ امانت و نیابت کے دو بنیادی اصول بتا کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ انفرادی و اجتماعی جو صورت بھی ہو، ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے، انسان کو ساری چیزیں نائب ہونے کی حیثیت سے بطور امانت استعمال کے لئے دی گئی ہیں، اس سلسلہ کی چند آیتیں عمومی انداز کی یہ ہیں،

اِنَّ اللّٰہَ یَامُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا[1]، — بیشک اللہ تمھیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اُن کے اہل تک پہنچاؤ،

امانات سے تمام حقوق واجبہ اور فرائض مراد ہیں جس کی تفصیل پہلے گذر چکی،

دوسری جگہ ارشاد ہے،

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ[2] — اور اس میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تمھیں نائب بنایا ہے،

تنظیم و تقسیم سے متعلق سوالات کے مختلف جواب سے استدلال

تنظیم و تقسیم کے بعض احکام ذکر کرنے کے بعد ہے،

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ[3]، — تاکہ دولت تم میں مالداروں کے درمیان سمٹ کر نہ رہ جائے،

صرف کے بارے میں ایک موقع پر سوال کا جواب یہ دیا گیا،

---

[1] نساء - ۳۰ - [2] حدید - ۱ - [3] حشر - ۲

قل العفو[۵] — آپ کہدیجئے جو ضرورت سے فاضل ہو سب خرچ کردو

دوسرے موقع پر یہ جواب ہے،

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ[۶]

آپ کہدیجئے جو بھی تم اپنے مال سے نکال سکتے ہو نکالو، اس کے مستحق تمھارے ماں باپ عزیز و اقربا، یتیم مسکین اور مسافر ہیں،

جواب کا یہ اختلاف معاشی ضرورت کے لحاظ سے تقسیم کے فرق کو ظاہر کرتا ہے، اور "العفو" سے تو اس حد تک ثبوت ملتا ہے کہ حالات کے زیادہ دباؤ کے وقت ضرورت سے زائد میں صاحب مال کا کوئی حق نہیں ہے، کل خرچ کر دینا چاہئے،

ان آیتوں کے علاوہ بہت سی آیات میں خرچ کرنے کی تاکید ہے، اور اس کے مستحقین کی تفصیل بھی کر دی ہے لیکن مقدار اور تقسیم کی نوعیت سے کوئی بحث نہیں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کے احکام حالات و زمانہ کی رعایت سے بدلتے رہتے ہیں اور ان میں تبدیلی کی جا سکتی ہے،

حالات کے لحاظ سے عدل و توازن پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے قوانین مختلف ہوں گے

جس طرح معاشی زندگی کے حالات ہر دور میں یکساں نہیں ہوتے، اسی طرح عدل و توازن پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے قوانین میں بھی یکسانیت قائم نہیں رہ سکتی، جب قوم طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہو، سرمایہ ایک طبقہ میں سمٹ کر رہ گیا ہو، اور دوسرا طبقہ وسائل معاش سے محروم اور نانِ جویں کا محتاج ہو، تو ایسی حالت میں عدل و توازن پیدا کرنے کے قوانین اس وقت

---

۵ بقرہ - ۲۷ ۶ بقرہ - ۲۶

سے یقیناً مختلف ہوں گے جب قوم خوش حال ہو، اور معاشی عدم توازن کسی طبقہ کی محرومی کی حد تک نہ پہنچا ہو، ایسی صورت میں قرآن حکیم اگر تنظیم و تقسیم کا کوئی ایک طبقہ متعین کر دیتا، یا مروجہ انفرادی و اجتماعی ملکیت کو اصولی اور بنیادی قرار دیدیتا تو اس کی عالمگیریت کو نقصان پہنچتا، اور تکمیلِ ہدایت کا مقصد پورا نہ ہوتا،

مقصد عدل کا قیام ہے جس طرح بھی ہو

ابن قیمؒ کہتے ہیں :-

ان مقصودہ اقامۃ العدل	شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں
بین عبادہ و قیام الناس	کے درمیان عدل و انصاف کا قیام ہے
بالقسط فای طریق استخرج	جس طریق کے ذریعہ عدل و انصاف
بہا العدل و القسط فھی	قائم کیا جائے گا، وہی دین ہوگا،
من الدین لیست مخالفۃ لہ[1]	اس کو دین کے خلاف نہ کہا جائے گا،

ایک اور جگہ اس حقیقت کو دوسرے انداز میں بیان کیا ہے،

فان الشریعۃ مبناھا و اساسہا	شریعت کی بنیاد حکمتوں اور دنیاوی و
علی الحکم و مصالح العباد فی	اُخروی زندگی کی مصلحتوں پر ہے
المعاش و المعاد وھی عدل کلھا و	وہ تمام تر عدل و رحمت اور حکمت و
مصالح کلھا حکمۃ کلھا فکل مسئلۃ خرجت	مصلحت ہے، جو مسئلہ بھی عدل سے جور
من العدل الی الجور و عن الرحمۃ الی	کی طرف، رحمت سے زحمت کی طرف
ضدھا و عن المصلحۃ الی المفسدۃ	مصلحت سے مفسدہ کی طرف اور حکمت

[1] الطرق الحکمیہ ص ۱۴،

وعن الحکمۃ الی العبث	سے فعل عبث کی طرف لے جائے، وہ
فلیست من الشریعۃ وان	شریعت کا مسئلہ نہ ہوگا، اگرچہ اس کو
ادخل فیھا بالتاویل[۱]	تاویل کے ذریعہ شریعت میں داخل
	کر لیا جائے،

قانون میں اوسط درجہ کی طرز معیشت کا لحاظ رکھنا چاہئے دنیوی مصالح کے تین درجے ہیں جن کے لحاظ سے عدل و توازن کے قوانین میں تفاوت ہو سکتا ہے،

(۱) ادنیٰ (۲) اوسط (۳) اعلیٰ،

ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کھانے پینے لباس، مکان، نکاح، اور دیگر ضروریات زندگی میں اتنی سہولت حاصل ہو کہ کام چلتا رہے، اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ عمدہ غذا، بہترین لباس عالی شان مکان، خوبصورت عورتوں سے شادی کے سامان میسر ہوں،

اوسط درجہ ان دونوں کے درمیان ہے یعنی نہ اس قدر وسعت ہو کہ اعلیٰ تک پہنچ سکے، اور نہ اس قدر تنگی ہو کہ ادنیٰ کے درجہ میں رہ جائے،

معاشی زندگی میں عدل و مساوات کا اعتبار اوسط درجہ میں کیا جائے گا، اور اسی اعتبار سے قوانین بنانے کا اختیار ہوگا، فقہا نے اس درجہ کو حاجات سے تعبیر کیا ہے،

تقدیر النفقات بالحاجات	نفقات (اخراجات) میں عدل و
مع تفاوتھا عدل وتسویۃ	مساوات کا اعتبار حاجات کے لحاظ
من جھۃ انہ سوی بین	سے ہوگا یعنی یہ ضروری ہے کہ اوسط
المنفق علیہ فی دفع حاجاتھم	درجہ کے معیار سے لوگوں کی ضرورتیں

۱؎ اعلام الموقعین جلد ۳- ص ۳۷-

لا فی مقادیر ما وصل الیھم لان دفع الحاجات ھو المقصود الاعظم فی النفقات وغیرھا من اموال المصالح۔[۱]

پوری ہوں، یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کو ایک مقدار میں دیا جائے، کیونکہ اخراجات میں شریعت کا مقصود اعظم اوسط درجہ ر حاجات) کا لحاظ ہے،

وضع قوانین میں وسعت | اس اوسط درجہ کو حاصل کرنے کے لئے جس قسم کی تنظیم و تقسیم درکار ہوگی اور جیسے قوانین وضع کرنے پڑیں گے، وہ سب شرعی اور اسلامی ہوں گے، ان سب کا تعلق طریق کار سے ہے، اور یہ ضروری نہیں ہے کہ طریق کار کا ثبوت قرآن وسنت سے ہو، حالات کے لحاظ سے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اس لئے کسی ایک طریقہ کار پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا،

ابن قیم کہتے ہیں:۔

فاذا ظھرت امارات الحق واد لتہ بای طریق فثَمَّ من شرعہ ودینہ ورضاہ وامرہ۔[۲]

حق کی علامتیں اور دلیلیں جس طریقہ سے بھی ظاہر ہوں وہ سب شرع اور دین ہوگا، اور اسی میں اللہ کی رضا اور اس کا حکم ہوگا،

حکومت کی معاشی ذمہ داری سے متعلق تفصیلات | ذیل میں حکومت کی معاشی ذمہ داری سے متعلق بعض تفصیلات ذکر کی جاتی ہیں، جن سے وضع قوانین میں اس کے اختیارات کی وسعت کا بھی ثبوت ملتا ہے،

حضرت عمرؓ نے حکومت و عوام کے درمیان معاشی تعلق کو ایک مثال کے ذریعہ اس

۱؎ قواعد الاحکام ج ۱ ص ۲۰، ۲؎ اعلام الموقعین ج ۳ ص ۳۷۵،

طرح سمجھایا ہے،

انما مثلنا کمثل قوم سافروا	ہماری (خلافت) مثال اور قوم کی
فدفعوا نفقاتھم الی رجل	مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگوں نے سفر
منھم فقالوا لہ انفق علینا	کیا، اور اپنے اخراجات کی رقم اپنے
فھل لہ ان یستاثر علیھم	میں سے کسی شخص کو یہ کہکر حوالہ کردی
بشیٔ قال لا[1]،	کہ ہمارے اوپر خرچ کرتے رہو، کیا
	ایسی صورت میں ان کے ساتھ کسی
	قسم کا ترجیحی سلوک روا ہوسکتا ہے؟
	فرمایا، ہرگز نہیں،

فتح قادسیہ کی خوشخبری سناتے وقت حضرت عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داری یہ بیان کی تھی، :-

"جب تک لوگوں میں اس قدر وسعت ہے کہ اُن کے مال کے ذریعہ ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں، میں تمھاری ضروریات پوری کرتا رہوں گا، اور جب یہ وسعت نہ ہوگی تو ہم زندگی میں تنگی کریں گے، یہاں تک کہ کفاف (بقدر ضرورت) میں ہم سب برابر ہوجائیں، کاش ہم جان سکتے کہ مجھے تمھارا کس قدر خیال ہے؟ اس کو میں اپنے عمل کے ذریعہ ہی سمجھا سکتا ہوں، خدا کی قسم میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمھیں غلام بناؤں، بلکہ خود اللہ کا غلام ہوں، اور حکمرانی کی امانت میرے سپرد ہے، اگر میں اس کو امانت سمجھ کر تمھیں واپس کردوں اور خدمت کے لئے تمھارے پیچھے

---

[1] ابن جوزی تاریخ عمر الباب التاسع والثلثون،

پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا ؤ پیو، تو اس حکمرانی کے ذریعہ فلاح پاؤں گا، اور اگر اس کو ذاتی ملکیت سمجھوں اور (مطالبہ حقوق) کے لئے اپنے پیچھے چلنے اور گھر آنے پر مجبور کروں تو میرا انجام خراب ہو جائے گا۔[1]

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ (گورنر بصرہ) کو یہ ہدایت کی،

الا أوسعوا الناس فی بیوتهم	غور سے سن لو، لوگوں کے گھروں
واطعموا عیالهم[2]	میں ان کی فراخی کا سامان کرو، اور
	ان کے اہل و عیال کو کھانا کھلاؤ،

حضرت عمر بن عبد العزیز جب خلیفہ[3] ہوئے تو ذمہ داری محسوس کر کے رونے لگے یہاں تک کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھی تر ہو گئی، ان کی بیوی فاطمہؓ نے رونے کا سبب پوچھا کر

احدث شیٔ	کیا کوئی نئی بات پیش آگئی،

حضرت عمر بن عبد العزیز نے جواب میں فرمایا،

"میں نے پوری امت کی ذمہ داری لی ہے، اس میں ہر قسم کے لوگ ہیں، بھوکے فقیر بے سہارا، مریض، بے سروسامان مجاہد، بے بس، مظلوم، غریب، قیدی، بہت بوڑھے کثیر العیال، جن کے پاس مال کم ہے، اسی طرح مختلف علاقوں کے رہنے والے دوسرے ضرورت مند ہیں، قیامت کے دن ان سب کے بارے میں مجھ سے بازپرس ہوگی اور ان کے مقدمہ کی پیروی کرنے والے اللہ کے رسول ہوں گے، مجھے اندیشہ ہے کہ میں جرح میں ٹوٹ جاؤں گا، اسی لئے اپنی جان پر ترس کھا کر رو رہا ہوں"[3]

---

[1] البدایۃ والنہایہ ج ۷، ص ۴۷، [2] سراج الملوک ص ۱۰۹ (طرطوسی)

[3] تاریخ الکامل ج ۵ ص ۳۲ و کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۰،

ومت دو قسم کے انتظام کی ذمہ دار ہے | تشکیل جدید میں حکومت دو قسم کے معاشی انتظام کی ذمہ دار ہے
(الف) وہ جن سے (درجہ اوسط میں) قوم کی ضرورتیں پوری

دں،

(ب) جس کے ذریعہ معاشی لحاظ سے قوم خود کفیل ہے،

ہ جن سے قوم کی روتیں پوری ہوں | (الف) ضرورتوں میں بنیادی و غیر بنیادی سب شامل ہیں، مثلاً غذا، لباس، مکان، علاج تعلیم، اہل و عیال کی کفالت، قرض کی

دائگی، شادی اور (وقت ضرورت) خادم وغیرہ، اصولی حیثیت سے بنیادی ضرورتوں کے بارہ میں حکومت کی ذمہ داریوں کا تذکرہ مختلف روایات میں ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ حمیر کو مخاطب کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا،

انی امرکم یا حمیر خیراً فلا تخونوا ولا تحادوا ان رسول اللہ مولیٰ غنیکم و فقیرکم[1]	اے حمیر! میں تمھیں بھلائی کا حکم دیتا ہوں، خیانت نہ کرو، آپس میں مخالفت نہ کرو۔ بیشک اللہ کا رسول (بحیثیت سربراہ حکومت) مالدار اور فقیر سب کا سرپرست ہے،

دوسری جگہ ہے:۔

السُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَا وَلِیَّ لَہٗ[2]	حکمراں اس کا سرپرست ہے جس کا کوئی سرپرست نہیں،

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید ۲۱ [2] ترمذی ابواب الفرائض باب ما جاء فی میراث المال

ایک اور جگہ ہے،

اللّٰہ ورسولہ مولیٰ من لا مولیٰ لہ[1]	اللہ و رسولؐ (حکومت) اس کے سرپرست ہیں، جس کا کوئی سرپرست نہیں،

اسی طرح ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا،

ایہا الناس ان اللّٰہ قد کلفنی ان اصرف عنہ الدعاء،[2]	اے لوگو! اللہ نے مجھے اس بات کا مکلف کیا ہے، کہ اس سے کی جانے والی دعاء کو رد کر دوں،

عزیز الدین عبدالعزیز (مشہور شافعی فقیہ) کہتے ہیں:۔

"دعاء رد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے اللہ سے اُن کو انصاف طلب کرنے کی حاجت نہ رہے، اور لوگوں کی ضرورتیں پوری کرے، اللہ سے مانگنے کی نوبت نہ آنے دے،[3]

پھر اس کے بعد ہے:۔

فما افصح ھذہ الکلمۃ وما اجمعھا لمعظم حقوق المسلمین،[4]	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ کس قدر فصیح اور حقوق کے کس قدر جامع ہیں،؟

غذا لباس اور مکان | اصولی اور عمومی حیثیت کے علاوہ حدیثوں میں بنیادی ضرورتوں کی

۱؎ ابوداؤد کتاب النکاح باب العطی، ۲؎، ۳؎، ۴؎ قواعد الاحکام مصالح الانام ج ۱، ص ۱۴۷

تصریح بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لیس لابن ادم حق فی سوی	تین چیزوں کے علاوہ اور کسی میں
هذا الخصال بیت یسکنه	انسان کا کوئی حق نہیں، (۱) رہنے
وثوب یواری به عورته	کے لئے گھر، (۲) تن ڈھکنے کے لئے
وجلف الخبز والماء،[۱]	کپڑا، اور (۳) پانی اور روٹی کا ٹکڑا،

ابن قیم کہتے ہیں :-

وحاجة المسلمین الی	غذا، لباس وغیرہ کا تعلق مصالح عامہ
الطعام واللباس وغیر ذالک	سے ہے، جن میں کسی کا خاص حق نہیں
مصلحة عامة لیس الحق	ہے، بلکہ سب ان میں شریک ہیں،
فیها الواحد بعینه،[۲]	

علاج تعلیم | علاج و تعلیم کا ذکر حضرت عمرؓ نے فرمایا،

لو ترکت عنز جرباء الی	اگر نہر کے کنارے خارشتی بکری اس حال
جانب ساقیة لم تدهن	میں چھوڑ دی جائے کہ اس پر (بطور علاج)
لخشیت ان اسأل علیها	تیل کی مالش نہ ہو تو ڈر ہے کہ قیامت
یوم القیمة،[۳]	کے دن عمر سے اس کی باز پرس
	ہوگی،

انسان کا معاملہ جانور سے زیادہ اہم اور اس کے بارہ میں باز پرس کا زیادہ اندیشہ ہے

[۱] ترمذی، [۲] الطرق الحکمیہ ص ۲۶۲، ابن قیم رح، [۳] التبر المسبوک صفحہ ۱۷ غزالی،

جو حکومت جانور کے علاج میں ذمہ داری محسوس کرتی ہے، وہ انسانوں کے علاج میں کس قدر ذمہ دار ہوگی؟

تعلیم کے سلسلہ میں مختلف انتظامات کا ثبوت ملتا ہے، جن کو موجودہ دور کے مطابق وسیع کیا جا سکتا ہے،

حدیثوں میں تحصیلِ علم کی بڑی فضیلت آئی ہے، اور اس کو ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا ہے، طَلَبُ العلمِ فریضۃ علی کل مسلمٍ و مسلمۃ "

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعیدؓ بن العاص کو لکھنا سکھانے کے لئے مقرر کیا[1] زید بن ثابتؓ کو یہودیوں سے سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا،[2] دیہاتی علاقوں میں تعلیم کے لئے مختلف صحابہ کو بھیجا،[3] ڈاکٹر حمید اللہ نے عہدِ رسالت کے تعلیمی نظام پر پوری کتاب لکھی،

حضرت عمرؓ نے تعلیم کی اشاعت کے بڑے وسیع ذرائع اختیار کئے، مدرسے قائم کرکے تنخواہ دار معلم مقرر کئے، تفصیل کا یہ موقع نہیں، مولانا شبلی نے اس کی پوری تفصیل لکھی ہے حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے زمانہ میں دیہاتی علاقوں میں معلم مقرر کئے وغیرہ[4]

تحصیلِ علم کے لئے وظیفہ (اسکالرشپ) جاری کرنے کا بھی ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ ابو عبید نے کتاب الاموال میں الفرض علی تعلم القرآن والعلم (قرآن اور علم حاصل کرنے پر وظیفہ مقرر کرنا) کے تحت کئی روایتیں نقل کی ہیں،[5] علماء نے علم و تعلیم کی اہمیت اور اس کے نظام پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں ابن عبد البر اندلسی کی مختصر جامع بیان العلم والعلماء، اور شیخ بدر الدین کی تذکرۃ السامع والمتکلم قابلِ ذکر ہیں، اسلامی حکومتوں اور علماء نے تعلیم کی اشاعت اور علوم و فنون کی جس قدر خدمت کی ہے، اس پر تاریخ شاہد ہے

---

[1] الاستیعاب فی معرفۃ الصحابۃ ج ۱ ص ۲۹۳ [2] ابو داؤد کتاب العلم باب روایۃ اہل الکتاب [3] بخاری کتاب المغازی [4] کنز العمال ج ۲ بحوالہ مسند ابن ابی شیبہ [5] ایضاً ج ۱ ص ۲۱۷، [6] کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۶۱

اہل وعیال کی کفالت قرض کی ادائگی

اہل وعیال کی کفالت اور قرض کی ادائگی کا ذکر ان روایتوں میں ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

من ترک مالاً فلاھلہ ومن ترک ضیاعاً فالیّ[1]

جس شخص نے مال چھوڑا، وہ اُس کے گھر والوں کے لئے اور جس کو بے سہارا چھوڑا، اس کی کفالت میرے (رسول اللہ بحیثیت سربراہ حکومت) ذمہ ہے،

ترمذی میں ترک ضیاعاً کے یہ معنی بیان کئے گئے ہیں،

ضائعاً لیس لہ شئی[2]

ضائع وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو،

اور الیّ کے معنی یہ ہیں، کہ

انا اعولہ وانفق علیہ،[3]

میں اس کی کفالت کروں گا، اور اس پر خرچ کروں گا،

دوسری روایت ہے،

من ترک کلاً فالی اللہ و ربما قال فالی اللہ ورسولہ[4]

جس شخص نے بوجھ (ذمہ داری) چھوڑا وہ اللہ کے ذمہ ہے، بسا اوقات فرمایا کہ اللہ ورسول کے ذمہ ہے،

ابو عبید نے "کل" کے یہ معنی بیان کئے ہیں،

الکل عندنا کل عیل والذریۃ

"کل" میں اولاد اور وہ سب لوگ

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۰۱ [2] و [3] ترمذی ابواب الفرائض، [4] کتاب الاموال لابی عبید الفرض للذریۃ من الفئ

منہ شئ[1] (کتاب الاموال ص ۲۳۴) لابی عبید القرض للذریۃ من الفی — شامل ہیں جن کی کفالت متوفی کے ذمہ ہے،

ایک اور روایت میں ہے،

انا اولی بالمومنین من انفسہم لمن توفی من المومنین فترک دینا فعلیّ قضاءہ و من ترک مالا فلورثتہ[1] — مومنوں سے میرا تعلق اُن کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ ہے، جس نے وفات کے بعد قرض چھوڑا، اُس کی ادائگی میرے ذمہ ہے، اور جس نے مال چھوڑا وہ اس کے ورثہ کے لیے ہے،

ایک روایت میں قال اللہ ورسولہ (اس کی ادائگی اللہ اور رسول یعنی حکومت کے ذمہ ہے) کے الفاظ ہیں[2]

حضرت عمرؓ نے معاشی کفالت کے اعلان میں قرض کی ادائگی کو شامل کیا تھا،

ولا مدیونا الا قضی عنہ دینہ[3] — ہر مدیون کا دین ادا کیا جائے،

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے قرض کی ادائگی کے لئے جو فرمان جاری کیا تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں،

انظر کل من ادان فی غیر سفہ ولا سرف فاقض عنہ[4] — دیکھو ہر اس ادھار خریدنے والے کا قرض ادا کر دو، جو صاحب استطاعت اور فضول خرچ نہ ہو،

(باقی)

---

[1] بخاری کتاب النفقات باب قول النبی من ترک کلًا [2] کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۲۰، [3] شرح شرعۃ الاسلام سید علی زادہ [4] کتاب الاموال،

حافظ امان اللہ بنارسیؒ

از

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

گذشتہ دور میں جونپور، ظفرآباد، لکھنؤ اور الہ آباد کی طرح بنارس بھی دیار پورب میں اسلامی علوم و فنون اور ارباب فضل و کمال کا مرکز رہا ہے، اور یہاں کے علماء و مشایخ نے ہر زمانہ میں مدرسوں اور خانقاہوں کو اپنی علمی اور روحانی سرگرمیوں سے آباد رکھا ہے، شیخ داؤد بن قطب بنارسی ۹۰۶ھ، شیخ مبارک بن ازرانی بنارسی ۹۸۰ھ، شیخ محمد ماہ بنارسی، شیخ طیب بن معین بنارسی ۱۰۴۲ھ، شیخ لیسین بن احمد بنارسی، شیخ نظام الدین بنارسی، حافظ امان اللہ بن مفتی نور اللہ بنارسی ۱۱۳۳ھ، مولانا محمد وارث رسول نما بنارسی ۱۱۶۶ھ، مولانا ابوالبرکات بن فضل امام بنارسی ۱۲۸۹ھ، مفتی ابراہیم ابن عمر بنارسی ۱۲۵۴ھ، مفتی سخاوت علی بن مفتی ابراہیم بنارسی ۱۲۸۱ھ، مفتی واحد علی بن مفتی ابراہیم بنارسی ۱۲۷۹ھ، شیخ عمر بن غوث بنارسی ۱۲۲۵ھ، مولانا خالق علی بنارسی، مولوی جلال الدین احمد بنارسی ۱۲۷۹ھ وغیرہ اپنے اپنے دور میں یہاں کے مشائخ کبار

اور علمائے فحول میں گذرے ہیں، ان میں جامع المعقول والمنقول صاحب تصانیف کثیرہ حضرت مولانا حافظ امان اللہ بن مفتی نور اللہ حنفی بنارسی اپنے معاصرین میں خاص شہرت اور مخصوص مقام و مرتبہ کے مالک ہیں، آپکی بزم شرق میں ان ہی کا ذکر سرنامۂ داستان ہے،

ہماری تحقیق میں ان کے سب سے قدیم تذکرہ نگار شیخ غلام علی آزاد بلگرامی سنہ ۱۲۰۰ھ ہیں، جنھوں نے ان کی وفات کے سینتالیس برس بعد مآثر الکرام سنہ ۱۱۸۰ھ میں ان کا تذکرہ کیا اور سبحۃ المرجان میں بھی ان کا ذکر کیا ہے، ان دونوں کتابوں میں جو کچھ درج ہے وہی بعد کے سوانح نگاروں کا ماخذ ہے، چنانچہ تذکرہ علمائے ہند اور نزہتہ الخواطر وغیرہ میں ان ہی کتابوں کے حوالے سے ان کے حالات درج کئے گئے ہیں، اگر شاذ و نادر کوئی نئی بات دوسری کتابوں میں ملتی ہے تو ان کے معاصرین کے حالات کے ضمن میں ملتی ہے،

نام و نسب اور خاندانی حالات حافظ امان اللہ بن مفتی نور اللہ بن حسین بنارسی کا سلسلہ نسب اس سے زیادہ نہ مل سکا، ان کا خاندان کہاں سے اور کب بنارس میں آکر آباد ہوا، اس بارے میں بھی ان کے تذکرہ نویس خاموش ہیں، البتہ انکے والد مفتی نور اللہ ابن حسین عہد عالمگیری میں بنارس کے قاضی و مفتی اور صوفی صافی بزرگ ہونے کے ساتھ فقہائے احناف میں شمار ہوتے تھے، سلطان عالمگیرؒ ان کے بڑے معتقد تھے اور ان کے لئے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی تھی، گنج ارشدی میں ہے کہ مفتی نور اللہ نے طریقت کی تعلیم و تربیت حضرت شیخ دیوان محمد رشید جونپوری سنہ ۱۰۸۳ھ سے حاصل کر کے ان کے فرزند حضرت شیخ محمد ارشد جونپوری سنہ ۱۱۱۳ھ سے خرقۂ خلافت و خلعت

پایا تھا، ان کا شمار مشاہیر فقہائے حنفیہ میں سے تھا، اور وہ اپنے زمانہ کے مشہور مشائخ چشت میں تھے، ۱۱۰۰ھ میں بنارس میں وفات پائی،[۱] سلطان عالمگیر نے مفتی صاحب کے لئے محلہ دارانگر تیرتھ تالاب کے پاس ۱۰۷۶ھ میں ایک شاندار سنگین مسجد تعمیر کرائی تھی جو مسجد عالمگیری اور مسجد فوارہ کے نام سے آج بھی موجود ہے، اس کی تعمیر مفتی صاحب کے مشورہ سے ہوئی تھی، محراب میں آیت "فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" کندہ ہے جس سے تاریخ تعمیر نکلتی ہے، اس کی تعمیر کے تقریباً بیس سال بعد ۱۰۹۶ھ میں عالمگیر کے حکم سے مفتی صاحب کے لئے ایک عالیشان خانقاہ بھی تعمیر ہوئی، اس کا مادۂ تاریخ "دولت خانہ" ہے جس سے ۱۰۹۶ھ نکلتا ہے، خیال ہے کہ یہی خانقاہ دار القضاء بھی رہی ہوگی، اس کی دیوار پر ابتک یہ کتبہ موجود ہے،

زحکم شاہ سلطان شریعت	دلیل زہد برہان طریقت
شہاب آسمان سرفرازی	محمد شاہ عالمگیر غازی
باستصواب نور اللہ مفتی	غلام درگہ پیران چشتی
بنائے خانقاہے مسرت پیدا	ز "دولت خانہ" تاریخش ہویدا

اس وقت مفتی صاحب کے فرزند حافظ امان اللہ سن رشد کو پہونچ چکے تھے، اور انھوں نے ۱۰۹۶ھ ہی میں خانقاہ کی تعمیر کے وقت والد کی حیات میں ان کے لئے مقبرہ اور روضہ تیار کرایا تھا جس میں مفتی صاحب اور ان کے بعد خود حافظ صاحب بھی دفن کئے گئے،[۲]

حافظ صاحب کا مولد و منشا بنارس ہے، مگر کب پیدا ہوئے؟ اس کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی، اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے ۱۰۹۶ھ میں خانقاہ کی تعمیر کے وقت اپنے والد

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۶ صفحہ ۳۹۲، [۲] تاریخ آثار بنارس صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶

کا روضہ تعمیر کرایا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت انکی عمر چالیس سے کم نہ رہی ہوگی، اس حساب انکی پیدائش

تعلیم و تربیت | حافظ صاحب نے ایسے گہوارے میں آنکھ کھولی جو علم وفضل کا مرکز تھا،

آپ کے والد صوفی صافی ہونے کے ساتھ عالم فقیہ، مفتی اور قاضی بھی تھے، سلطان عالمگیر کی قدرشناسی اور علم پروری نے اس گھر میں جاہ وجلال بھی پیدا کر دیا تھا، اس زمانہ میں پورب کا علاقہ عالمگیر کی توجہ سے خانقاہ اور مدرسہ بنا ہوا تھا، شہر شہر، قریہ قریہ میں علماء وفضلاء سکون قلب کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول تھے، خصوصاً جونپور اور اس کے اطراف مدارس کا بہت بڑا مرکز تھے معلوم ہوتا تھا کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا دور لوٹ آیا ہے، مولوی خیر الدین محمد جونپوری نے تذکرۃ العلماء میں شیخ محمد ماہ کے ذکر میں لکھا ہے،

اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ خود عالم	حضرت اورنگ زیب عالمگیر عالم باعمل
باعمل اور عامل باعلم بود، قدردانی ر	اور عامل باعلم تھے، شاہزادگی ہی کے زمانہ
علماء بیش از بیش می نمود واز عہد شاہ	سے علماء کی زیادہ سے زیادہ قدردانی
زادگی منظور داخت، تا جونپور شل	کرتے تھے یہاں تک کہ اسی زمانہ میں
زمان سلاطین شرقیہ از کثرت فضلاً	جونپور سلاطین شرقیہ کے دور کے
ومشائخاں وانبوہ وہجوم طلبۂ علوم	مانند ہو گیا اور علماء ومشائخ کی کثرت
دکاسبانِ فیوض رونق پذیر باشد	اور طالبان علوم وفیوض کے انبوہ
یوں بر سریر سلطنت نشست یرلیغ	سے رونق پیدا ہوگئی اور جب ۱۰۶۸ھ
واجب التبلیغ بناظم جونپور جہت	میں تخت سلطنت پر رونق افروز
ترفیہ احوال مدرسان ومشائخان	ہوئے تو ناظم جونپور کے نام خصوصی حکمنامہ

این شہر صادر گردانید د سوانح نگاران	جاری کیا تاکہ وہ یہاں کے اساتذہ
وقائع نویسان را احکام تہدید بلیغ	ومشائخ کے حالات لکھ کر روانہ کرے
تحقیقات کوائف بودو باش این گروہ	نیز وقائع نویسوں کو سخت تاکید کی کہ
فرستاد، القصہ جونپور در عہد آنحضرت	وہ اس طبقہ کی معاش و معشیت کی خبر
نمونۂ گلزار ارم شدہ، در تمام شہر	گیری کریں، الغرض عہد عالمگیری میں
و قصبات و نواحی آن مدرسہائے قدیم	جونپور گلزار ارم بن گیا اور اس کے اطراف
تاسیس یافتند و بے خانقاہ و مدرسہ	وجوانب کے شہر و قصبات میں قدیم مدارس
تعمیر جدید شدند، ؎۱	کی ترقی کے ساتھ نئے مدارس اور خانقاہیں
	تعمیر ہوئیں،

علم دین اور روحانیت کے اس دور شباب میں حافظ صاحب پروان چڑھے، خود ان کا گھر اس کا نمونہ تھا،

حافظ صاحب نے کس کس سے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی؟ اس کے بارے میں بھی تفصیل نہیں ملتی ہے، آزاد نے سبحۃ المرجان میں اجمالی طور سے یہ لکھا ہے،

والحافظ امان اللہ حفظ القرآن	حافظ امان اللہ نے قرآن حفظ کیا، اور
واخذ العلوم من علماء الزمان ؎۲	اپنے زمانہ کے علماء سے علوم حاصل کئے،

نزہۃ الخواطر میں اس اجمال کی کسی قدر تفصیل ملتی ہے

وحفظ القرآن وسافر للعلم	انھوں نے حفظ قرآن کے بعد طلب علم
فقرأ الکتب الدراسیۃ	کے لئے سفر کیا اور شیخ محمد ماہ دیوگانوی اور

؎۱ تذکرۃ العلماء ص ۱۱، الطافی پریس کلکتہ، ؎۲ سبحۃ المرجان ص ۷۸

علی الشیخ محمد ماہ الدیوگامی	شیخ قطب الدین شمس آبادی
وعلی الشیخ قطب الدین الحسینی	وغیرہ سے کتب درسیہ پڑھیں،
الشمس آبادی وعلی غیرھما من	
العلماء، ۱؎	

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب نے اپنے زمانہ کے کئی علماء سے پڑھا جن میں مذکورہ بالا دو حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور تحصیل علم کے لئے بنارس سے باہر کا سفر کیا، ان کے علمی سفر کے سلسلے میں دو مقامات اہم ہیں، ایک جونپور جہاں ملا محمد ماہ دیوگامی نے پچیس ۲۵ سال تک درس دیا تھا، تجلی نور میں ہے

اگرچہ او باشندہ قصبہ دیوگام ضلع اعظم گڈھ	ملا محمد ماہ اگرچہ دیوگام ضلع اعظم گڈھ
بود، الا بعد فراغ تا بست وپنج سال در جونپور	کے باشندے تھے مگر انھوں نے فراغت کے
قیام ورزیدہ درس داد ۲؎	بعد پچیس سال تک جونپور میں قیام کر کے
	درس دیا،

قاضی صاحب کے سفر کی دوسری منزل شمس آباد ہے جہاں سید قطب الدین نے بود و باش اختیار کر لی تھی، مآثر الکرام میں ہے،

اصلش از سادات امیتھی من مضافات	دراصل وہ مضافات اودھ امیٹھی کے
اودھ است، از وطن خود نقل کردہ	سادات سے ہیں مگر اپنے وطن سے نقل مکانی
شمس آباد را مشرق انوار ساخت شمس آباد	کر کے شمس آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی
از توابع قنوج است ۳؎	جو کہ قنوج کے توابع میں ہے،

۱؎ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۵، ۲؎ تجلی نور ج ۲ ص ۴۲، ۳؎ مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۰،

حافظ صاحب کو اپنے والد ماجد کے سایۂ عاطفت میں نشوونما کا موقع ملا تھا، اور غالبا حفظ قرآن کے بعد ابتدائی کتابیں ان ہی سے پڑھیں پھر بنارس سے جونپور میں آکر ملا محمد ماہ دیوگامی کے مدرسہ میں داخل ہوئے اور وہاں سے شمس آباد جاکر شیخ قطب الدین سے بقیہ کتابیں پڑھیں، آزاد کے اس بیان "من علماء السلف" اور نزہۃ الخواطر کی عبارت "وعلی غیرھما من العلماء" سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ صاحب نے دوسرے اساتذہ سے بھی تحصیل علم کی تھی مگر ان کے ناموں کا پتہ نہیں چلتا،

ملا محمد ماہ دیوگامی | ملا محمد ماہ دیوگامی حافظ صاحب کے والد مفتی نور اللہ کے استاد بھائی تھے، دونوں نے شیخ محمد رشید جونپوری سے اکتساب فیض کیا تھا، تجلی نور میں ہے کہ ملا محمد ماہ اپنے دیار کے ... مشہور علماء میں تھے، ان کی جامعیت کا یہ حال تھا کہ ملا رکن الدین بجریابادی سے تحصیل علم کے بعد مزید تکمیل و تحقیق ملا نور الدین مدارس سے کی اسکے بعد دیوان محمد رشید سے فیض اٹھایا، وہ اپنے دور کے عالم اکمل اور فاضل اجل تھے اور پچیس سال تک جونپور میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی اور سیکڑوں علماء و فضلاء ان کی درسگاہ سے پیدا ہوئے، ملا عبد الرسول ستر کھی، حافظ امان اللہ بنارسی، اور مفتی ابو البقاء جونپوری ان کے خاص شاگردوں میں تھے، آخر عمر میں سلس البول کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے، اسی میں انتقال کیا اور ایک قول کے مطابق بیاسٹھ سال کی عمر میں ۲۵ر جمادی الاخری ۱۰۹۵ھ میں وفات پائی، انکا مزار دیوگام (اعظم گڈھ اور بنارس کے درمیان) میں آج بھی موجود ہے[1]،

ملا قطب الدین شمس آبادی | انکا اصل وطن امیٹھی تھا، ملا قطب الدین سہالوی شہید

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۶۳،

۱۱۰۳ھ کی درسگاہ کے فیض یافتہ تھے اور یہیں فاتحۃ الفراغ پڑھی تھی، ملا قطب الدین سہالوی اپنے شاگرد قطب الدین شمس آبادی کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "کسے کہ خواہد مغز سخن را دریابد، سید قطب الدین را دریابد" فراغت کے بعد شمس آباد میں مسند تدریس بچھائی، آپ کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں قاضی محب اللہ بہاری، حافظ امان اللہ بنارسی اور سید طفیل محمد اترولوی خاص شہرت کے مالک ہیں، تقریباً ستر سال کی عمر میں ۱۱۲۱ھ میں فوت ہوئے[۱]،

علمی تبحر | حافظ صاحب نے حفظ قرآن کے بعد مروجہ علوم و فنون بنارس، جونپور، اور شمس آباد وغیرہ کے مشہور اساتذہ سے حاصل کئے، طریقت ان کے گھر کی دولت تھی اور ورثہ میں ملی تھی مگر اس راہ میں آخر عمر میں اس وقت آئے جب افتاد زمانہ سے پریشان ہو کر دہلی گئے، واپسی میں شیخ خوب اللہ الہ آبادی ۱۱۴۴ھ سے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی اس کی تفصیل بعد میں آئے گی، ان کے سوانح نگاروں نے ان کے علمی تبحر کا تذکرہ شاندار الفاظ میں کیا ہے، آزاد سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں،

وَتَبَرَّعَ فی المعقول والمنقول وتبحّر فی الفروع والاصول[۲]	وہ معقولات ومنقولات میں بہت آگے اور اصول وفروع میں تبحر عالم تھے،

ماثر الکرام میں لکھا ہے،

از حفاظ قرآن واز فحول علمائے ہندوستان است، در معقول ومنقول کوس شہرت می نواخت و در علم فقہ علم امتیاز می افراخت[۳]	وہ حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ہندوستان کے جید علماء میں سے ہیں، معقولات ومنقولات میں انکی شہرت کا ڈنکا بجتا تھا، فقہ میں ممتاز تھے،

---

[۱] ماثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۰، [۲] سبحۃ المرجان ص ۸۷، [۳] ماثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲،

تذکرہ علمائے ہند میں ہے،

حافظ قرآن جامع معقول ومنقول حادی فروع واصول،[1]	حافظ قرآن جامع معقول ومنقول حاوی فروع واصول،

اور نزہتہ الخواطر میں ہے

الشیخ العالم الکبیر العلامۃ احد العلماء المشہورین فی الفقہ والاصول والکلام،[2]	شیخ عالم کبیر علامہ اور فقہ اصول فقہ اور علم کلام کے مشہور علماء میں سے ایک ممتاز عالم تھے،

فقہ اور اصول فقہ کا فن حافظ صاحب کو ورثہ میں ملا تھا، ان کے والد مفتی نوراللہ اپنے زمانہ کے مشہور فقہائے احناف میں تھے، اس لئے اس فن سے ان کو فطری تعلق تھا، اس کا ثبوت ان کی کتاب المُفسّر اور اس کی شرح المحکم سے ملتا ہے اور معقولات ومنقولات میں ان کی جامعیت ان شروح وحواشی سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے مختلف کتب کلامیہ ومعقولیہ پہ لکھے ہیں، حافظ صاحب سلوک ومعرفت کی بزم میں آخر عمر میں داخل ہوئے اور اس کے گوہر شب چراغ بنے اور شیخ محب اللہ الہ آبادی کے رسالہ تسویہ کی شرح لکھی جو بڑی سخت مختلف فیہ کتاب تھی اور اس پر شدید ہنگامہ ہوا تھا،

لکھنؤ کی صدارت عالمگیر حافظ صاحب کے والد مفتی نوراللہ کے قدر دانوں میں تھا اور بنارس میں ان کے لئے مسجد اور خانقاہ تعمیر کی تھی اور وہاں کے عہدہ قضا پہ ان کو مامور کیا تھا، حافظ صاحب بھی فراغت کے بعد سلطان کی عنایات وتوجہات

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰، [2] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۳۹

شاہی کے مستحق قرار پائے اور اس نے ان کو لکھنؤ کی صدارت عطا کی، سبحۃ المرجان میں ہے،

وکان الحافظ متقلداً بصدارۃ	حافظ صاحب سلطان عالمگیر کی طرف
لکھنؤ من السلطان عالمگیر،	سے شہر لکھنؤ کی صدارت پر مامور تھے
وکان القاضی محب اللہ البہاری	اور قاضی محب اللہ بہاری وہاں کے
قاضیا بھا،[۱]	قاضی تھے،

مآثر الکرام میں ہے،

واو چندے از خلد مکان بہ منصب	وہ کچھ دنوں خلد مکان سلطان عالمگیر
صدارت بلدہ لکھنؤ مامور بود، مشارٌ	کی طرف سے لکھنؤ کی صدارت پر فائز
الیہ بہ تقریب صدارت، و قاضی محب اللہ	تھے اس تقریب سے وہ اور عہدہ قضا کی
صاحب سُلَّم بہ تقریب قضا دران بلدہ	تقریب سے قاضی محب اللہ صاحب سلم
فاخرہ مجتمع بودند، [۲]	اس شہر میں ایک ہی زمانہ میں تھے،

مغل دور میں صدارت کا عہدہ بڑی اہمیت رکھتا تھا، صدر صوبائی دار الحکومت میں رہتا تھا اور پورے صوبہ کے علماء و مشایخ، ائمہ اور معذوروں کے حقوق اور ان کے سارے امور و معاملات، عطیات اور وظائف وغیرہ کی نگرانی اور دیکھ بھال اسکے متعلق ہوتی تھی، قاضیوں کی کارگذاری اور ان کے استحقاق و عدم استحقاق کا نگراں و محتسب بھی ہوتا تھا انکی تقرری بادشاہ کی طرف سے صدر الصدور کی توثیق کے بعد ہوتی تھی قاضیوں کے فرائض نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور شرعی قضایا معاملات مثلاً زوجین کے مسائل

---

[۱] سبحۃ المرجان ص ۸۷، [۲] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲ ،

اور قرضہ جات کے مرافعات وغیرہ کی نگرانی تک محدود تھے[۱]، اس لئے حافظ امان اللہ کا عہدہ ان کے استاد بھائی قاضی محب اللہ بہاری سے بڑھا ہوا تھا، قاضی محب اللہ بہاری فراغت کے بعد سلطان عالمگیر کی خدمت میں دکن جاکر لکھنؤ کے عہدہ قضا کا پروانہ لائے تھے اور حافظ صاحب کو بغیر کسی سعی و کوشش کے یہ منصب ملا تھا اسی اعتبار سے ان کا پلہ بھاری تھا مگر علم و تحقیق فضل و کمال میں دونوں برابر تھے اور ملا قطب الدین شمس آبادی کے فیض سے معقولات و منقولات میں یدطولیٰ رکھتے تھے،

حافظ امان اللہ اور قاضی محب اللہ کے درمیان علمی مباحث

لکھنؤ میں تقرری کے بعد دونوں میں بحث و مباحثہ اور علمی مناقشہ کا دروازہ کھل گیا اور لکھنؤ علمی مباحثہ کا اکھاڑہ بن گیا، جانبین سے رسالہ بازیاں ہوئیں اور ایک نے دوسرے کے رد میں صفحات کے صفحات سیاہ کر دیئے، تذکرہ نویسوں نے اس نوک جھونک کا ذکر خاص طور سے کیا ہے، سبحۃ المرجان میں ہے،

وکانا مجتمعان وتجری بینهما	دونوں حضرات لکھنؤ میں رہتے تھے اور
مباحث علمیة[۲]	انہیں علمی بحثیں جاری رہتی تھیں،

مآثر الکرام میں ہے دو باہم طریق مباحثہ علمی سلوک می داشتند (ج ۱، ص ۲۱۲) ان مباحث کی کثرت کا اندازہ نزہۃ الخواطر کی اس تصریح سے ہوتا ہے،

فجرت بینهما من المباحثات	ان دونوں کے درمیان اس قدر
والمطارحات ما تفعم بها	زیادہ مباحثے اور مناظرے چلے کہ ان سے
بطون الصفحات[۳]	صفحات کے صفحات بھر جائیں گے،

۱؎ الہند فی العہد الاسلامی ص ۲۳۳، ۲؎ سبحۃ المرجان ص ۸۰، ۳؎ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۰۹،

ان مباحثوں کی تفصیل کتابوں میں درج نہیں ہے، اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ کن کن مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں، قیاس ہے کہ اس زمانہ کے ذوق کے مطابق ان کا تعلق فقہ، اصول فقہ، کلام اور منطق و فلسفہ کے مسائل سے رہا ہوگا، لکھنؤ کی صدارت اور عہدۂ قضا سے دونوں حضرات جلد ہی الگ ہو گئے، مگر بحث و مباحثہ کی سرگرمی اس کے بعد بھی جاری رہی اور تصانیف میں رد و قدح کا سلسلہ چلتا رہا، قاضی محب اللہ نے اپنی بعض کتابوں میں "قال الفاضل البنارسی" سے حافظ صاحب ہی کو مراد لیا ہے،

بنارس میں تدریسی خدمات | غالباً اسی منافشہ کے نتیجہ میں دونوں حضرات بہت جلد اپنے عہدہ سے الگ ہو گئے، حافظ صاحب نے اپنے وطن بنارس میں مدرسہ قائم کرکے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور قاضی محب اللہ نے شاہی عہدے حاصل کئے، بقول آزاد،

اختر طالع قاضی محب اللہ عروج کرد، و	قاضی محب اللہ کو بڑا عروج حاصل ہوا
بہ مرحمت منصبے بلند و صدارت مجموعہ	اور وہ بلند منصب کے مالک اور پورے
ممالک ہندوستان، و خطاب "فاضل خاں"	ہندوستان کے صدر اور "فاضل خاں"
سرمایہ مباہات بدست آورد،[1]	کے خطاب سے سرفراز ہوئے،

قاضی صاحب معزولی کے بعد دوبارہ دکن گئے، اور حیدرآباد منصب قضا پر مامور ہوئے پھر سلطان عالمگیر کے پوتے رفیع القدر بن شاہ عالم کے معلم بنائے گئے اور جب سلطان عالمگیر نے شاہ عالم کو کابل کا صوبہ دار بنا کر بھیجا تو قاضی صاحب بھی اسکے ساتھ کابل گئے، ۱۱۱۸ھ میں عالمگیر کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشنی کے بعد ان کو

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۱،

بڑا عروج حاصل ہوا اور وہ پورے ہندوستان کے صدر الصدور کے جلیل القدر منصب پر سرفراز ہوئے، ان کے حریف حافظ صاحب اس سے پہلے صرف صوبہ اودھ کے صدر تھے مگر اس کے بعد قاضی صاحب کی حیات مستعار کے دن بہت جلد پورے ہوگئے اور ۱۱۰۹ھ میں انھوں نے وفات پائی، مآثر الکرام کے اس بیان سے کہ "و او چندے از خلد مکان بہ منصب صدارت بلدۂ لکھنؤ مامور بود" اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب زیادہ دنوں تک لکھنؤ کی صدارت کے عہدے پر نہیں رہ سکے اور اس سے علیحدہ ہوتے ہی اپنے وطن بنارس آکر مدرسہ قائم کیا اور درس و تدریس میں ایسے منہمک ہوئے کہ پھر کہیں کا رخ نہیں کیا، ان کے والد کے زمانہ سے ان کے خاندان پر جو شاہی عنایات تھیں ان ہی پر قانع رہ کر علمی و دینی خدمت میں لگے رہے، عمر کے آخری حصہ میں بعض حوادث کی وجہ سے دہلی گئے، مگر جلد ہی بنارس واپس آگئے،

افسوس کہ حافظ صاحب کی تعلیمی و تدریسی خدمات کی تفصیلات کتابوں میں نہیں ملتیں حالانکہ ایک مدت دراز تک انھوں نے تشنگان علم و فن کو سیراب کیا اور بہتوں نے آپ سے تحصیل علم کی، البتہ حضرت ملا نظام الدین فرنگی محلی (م ۱۱۶۱ھ) کے بارے میں مآثر الکرام میں تصریح ہے کہ وہ حافظ صاحب کے خاص شاگردوں میں اور اپنے والد کی شہادت کے بعد انہی سے تحصیل علم کی تھی،

تحصیل علوم متعارفہ بعد از شہادت	انھوں نے اپنے والد کی شہادت کے بعد
والد ماجد خود از حافظ امان اللہ	حافظ امان اللہ بنارسی اور مولوی قطب
بنارسی و مولوی قطب الدین نمودہ، [۱]	الدین سے علوم متعارفہ کی تعلیم حاصل کی،

---

[۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۱، تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۷

ملا نظام الدین کے والد ماجد حضرت ملا قطب الدین سہالی کی شہادت ۱۱۰۳ھ میں ہوئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے حافظ صاحب لکھنؤ کی صدارت سے الگ ہو چکے تھے اور اس وقت ان کی تدریسی خدمات کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا، نزہۃ الخواطر میں ہے کہ اس وقت ملا نظام الدین کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی، قیام فرنگی محل لکھنؤ کے بعد جب اطمینان نصیب ہوا تو انھوں نے سب سے پہلے جائس جاکر ملا علی قلی جائسی سے کتبِ درسیہ پڑھیں، پھر بنارس میں حافظ صاحب سے شرح مواقف کا درس لیا،

ثم ذھب الی بلدۃ بنارس	جائس کے بعد بنارس جاکر حافظ امان اللہ
وتلمذ علی الحافظ امان اللہ	کی شاگردی کی اور ان سے شرح مواقف
بن نور اللہ البنارسی وقرع	کا درس لیا،
علیہ شرح المواقف،[۱]	(نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۸۴)

ملا نظام الدین جیسے فاضل روزگار کا حافظ صاحب کی درسگاہ سے پیدا ہونا انکے دریائے فیض کا سب سے بڑا ثبوت ہے،

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۸۴،

قرونِ وسطیٰ کی تاریخ

اور

مورخین کا ایک تنقیدی جائزہ

از جناب الطاف حسین خاں شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ

(۲)

مسلمان حکمرانوں پر ہندو بیزاری کا الزام اس کی تردید سے پہلے تزک جہانگیری سے ایک رباعی پیش کی جاتی ہے،

بہر نگہبانیٔ خلق خدا ۔۔۔ شب نکنم دیدہ بخواب آشنا

نے پئے آسودگیٔ جملہ تن ۔۔۔ رنج پسندم بہ تن خویشتن

اس رباعی میں جہانگیر نے جس خلق خدا کا تذکرہ کیا ہے اس کی تقریباً اسّی فیصدی آبادی ہندو تھی اس کے باوجود انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں پر ہندو بیزاری کا الزام لگایا ان میں علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق اور اورنگ زیب سرفہرست ہیں لیکن تاریخی شواہد اسکے خلاف ہیں، علاء الدین کے عہد میں ہندو جوتشیوں کا احترام کیا جاتا تھا[1]، علائی سکوں پر سنسکرت کی عبارت درج ہوتی تھی اور شاہی جشنوں کے موقع پر ہندو مسلمان عوام محلات شاہی میں آتے تھے[2]، شادی اور بیاہ میں ہندوانہ طور طریقے اپنائے جاتے تھے[3]، علاء الدین کی انصاف پسندی کا تذکرہ خسرو جیسے شاعر نے

لہ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۳، ۳۶۶، ؎۲ تاریخ مبارک شاہی ص ۷۹، ؎۳ دولرانی خضر خاں علی گڑھ اڈیشن ص ۱۵۲ ۔

جنکو ہندو بھی مانتے ہیں، کیا ہے، فرماتے ہیں ؎

(۱) چو عدلش ذرہ ذرہ فاش گشتہ | دہان فتنہ پر خشخاش گشتہ
ز عدلش جان مظلوماں سحر گاہ | فرامش کردہ تیر اندازی آہ
ترازو دست انصافش جہانگیر | کہ ہم سنگست در روے جاکر و میر
زمیں را دور او بس کز بداں رفت | ہمہ جا دزد مرد و پاسباں خفت
جہاں را خلعت امن آنچناں داد | کہ تیغ از ننگ عریانی شد آزاد
ہمیشہ خشمش در چارہ سازی | بظالم سوزی و عاجز نوازی[۵۱]

(۲) حسن دہلوی نے کئی موقعوں پر اسکے عدل و انصاف کا ذکر کیا ہے،

دریں میزاں کہ عدلش شاہ آمد راست میدارد
بیک پلہ مواجب ہیں بدیگر پلہ انعامش[۵۲]

ز عدل او خلفائے عرب شدہ حیراں
چو از کمال جہانگیریش ملوک عجم[۵۳]

فدایگان سلاطین علائے دین محمد
کشید دائرہ عدل گرد مرکز عالم[۵۴]

علاءالدین کے عہد میں مخلوق خدا کو بڑی راحت نصیب تھی اور سماج کا سب سے کمتر طبقہ بھی آرام سے زندگی گذارتا تھا،[۵۵]

مسلمان بادشاہوں میں محمد بن تغلق سب سے بدنصیب حکمراں تھا۔ یہ اپنی

---

[۵۱] شیریں خسرو، علی گڈھ اڈیشن، ص ۱۶ا نیز دیکھئے، خزائن الفتوح علی گڈھ ۱۹۲۷ء ص ۲۷،

[۵۲] دیوان حسن سجزی دہلوی، ص ۳۰۲، [۵۳] [۵۴] ایضاً ص ۷، ۵، [۵۵] خیر المجالس، اردو ترجمہ، ص ۲۹۰،

روشن دماغی کے اعتبار سے وقت سے پہلے پیدا ہوا، اس کو دوسو سال بعد شیر شاہ سوری کا جانشین ہونا چاہئے تھا، اس سے مورخ [1] اس لئے خفا ہوئے کہ یہ انکو خوش نہ رکھ سکا، شعراء [2] اس لئے خفا ہوئے کہ اس میں مذہبی رواداری تھی اور اپنی قصیدہ خوانی پسند نہ تھی، اس کے عہد کا سیاح ابن بطوطہ اس لئے ناراض ہوا کہ اس کی عقلیت پسندی اس کو ناگوار تھی، اس سے کام لے کر انگریز مورخوں نے تعصب اور ظلم و ستم کی ایک گمراہ کن داستان محمد بن تغلق کے خلاف کھڑی کر دی لیکن مورخوں اور تذکرہ نگاروں کی تصانیف اور درویشوں و شعراء کے ملفوظات و دواوین [3] میں اس بادشاہ کی رواداری، انصاف پسندی اور ہندو نوازی کی مثالیں بھی ملتی ہیں، محمد بن تغلق کے عہد میں ہندوؤں سے میل جول اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ شادی و بیاہ میں ہندوانہ رسوم ادا کئے جاتے تھے، ابن بطوطہ نے محمد بن تغلق کی بہن کی شادی کی جن رسوم کا ذکر کیا ہے اس میں ہندو اثرات نمایاں نظر آتے ہیں [4] مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں "ہندوؤں کے ساتھ ازدواجی تعلقات کا سلسلہ بھی اسی تغلق خاندان سے شروع ہوتا ہے" [5] محمد بن تغلق کے ہندو نجومیوں، جوگیوں اور ہندو اور جینی [6] فنکاروں سے گہرے تعلقات تھے، مولانا عصامی لکھتے ہیں :

---

[1] اس سلسلہ میں دیکھئے: سلطان محمد بن تغلق کی سیرت تاریخ فیروز شاہی کی روشنی میں از رسالہ معنف، علیگڈھ دسمبر ۱۹۴۳ء

[2] مولانا عصامی، [3] دیکھئے قصائد بدر چاچ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۶۹ء، [4] عجائب الاسفار جلد دوم ص ۱۲۵،

[5] مقالات سلیمان حصہ اول ص ۴۱۷، [6] دیکھئے "فارسی کی ہندوانہ تصانیف" از ڈاکٹر بنارسی داس، اورینٹل کالج میگزین (ضمیمہ) اگست ۱۹۲۴ء ص ۳۵، ۳۶، نیز دیکھئے "محمد بن تغلق کی ہندو نوازی" آئینہ حقیقت نما، جلد دوم ص ۲۱

ابا جوگیاں گشتہ خلوت گرا بدل راہ کفار را دادہ جا[1]

انصاف پسندی کا جہانتک تعلق ہے ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہندو کے استغاثہ پر بادشاہ قاضی کی عدالت میں بحیثیت ملزم حاضر ہوا تھا،[2] اسی کا بیان ہے کہ جب بادشاہ دولت آباد میں تھا تو روزانہ گنگا جل اس کے استعمال کے لئے پہونچایا جاتا تھا،[3] بادشاہ ہندوؤں کی تہواروں میں شرکت کرتا تھا، ؎

جماعت بجمعہ در راندا ختہ ابا ہندواں ہولئ باختہ[4]

انگریز مورخین نے سب سے زیادہ اورنگ زیب کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے، انکی تقلید ہندو مورخین نے بھی کی، ممکن ہے اس قسم کے کچھ واقعات بھی ملجائیں لیکن اسکے بالمقابل اس کی ہندو نوازی کے بھی بکثرت واقعات ملتے ہیں، اس کے زمانہ میں تریسٹھ ہندو امرا ہفت ہزاری کے منصب پر سرفراز تھے، مسلمان اتنی تعداد میں اس منصب پر نہ تھے،[5] اورنگ زیب کے عہد کے ہندو اہل قلم جن القاب و آداب اور جن اوصاف سے اسے یاد کرتے ہیں اس سے اس کی انصاف پسندی اور رواداری کا احساس ہوتا ہے، بہاری لال[6] نے ۱۰۹۸ھ میں سوبھاسکر پنڈت کی مدد سے سنسکرت کی ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا جو "مت اچھرا" کے نام سے جامعہ دہلی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اسکے

---

[1] فتوح السلاطین ص ۱۹۱، [2] عجائب الاسفار ص ۱۳۰، [3] ایضاً جلد دوم ص ۳، [4] فتوح السلاطین ص ۱۹۱، [5] ملاحظہ ہو: عہد عالمگیر کے تین ہندو مورخ، عالمگیر لاہور، جلد شمارہ ۱، ۱۹۶۰ء دیکھئے،

Alamgir's Tolerance in the light of the contemporary Jain Literature, by Jnan chandra, Journal of the Pakistan Historical society. Vol. VI No. 4, 1958, Vol. VII No. 1, 1959,

[6] مولانا سید سلیمان ندوی نے مقالات سلیمان حصہ اول تاریخی میں لال بہاری لکھا ہے لیکن میرے مسودہ پر محترمی جناب ڈاکٹر تاراچند صاحب نے بہاری لال تجویز فرمایا ہے،

دیباچہ میں لکھتا ہے،

"اکنوں کہ دریں عہد بادشاہ خلافت پناہ، عادل، مظفر،...... مجسم داد و کرم قاطع آثار جفا وستم...... ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ کہ دورش چوں قدح پُر نشاط، وزمانش مانند ایام شباب پر سرور و انبساط، روزبازار فضل و دانش است، ہندی نژادان فارسی دوست را بنظم و نثر ازحد بیشتر است [۱]"

اورنگ زیب کی ہندو نوازی اور رواداری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آج بھی ہندوستان کے بہت سے مندروں میں اس کی دی ہوئی مدد معاش کے فرمان موجود ہیں [۲] تیج بہادر سنہا صاحب فرماتے ہیں:

ان ہندو مندروں کے لئے جنہیں اسلام کے بنیادی عقیدے کے خلاف بت پرستی ہوتی ہے مسلمان حکمرانوں نے فراخدلی سے جاگیریں عطا کی ہیں تاریخ کے نہایت بدنام اور متعصب ہیرو اورنگ زیب کے چھ سو سے زیادہ فرمان برآمد ہو چکے ہیں جن کے ذریعہ ہندو مندروں کے اخراجات چلانے کے لئے بیش قیمت جاگیریں دی گئی تھیں [۳]،

---

[۱] مقالات سلیمان حصہ اول، ص ۲۵۴-۲۵۵، [۲] ہمارے ضلع فتحپور میں دریائے گنگا کے کنارے آباد ایک برہمن خاندان کے پاس عالمگیر کا مدد معاش کا دیا ہوا ایک فرمان موجود ہے، ایک مقدمہ کے سلسلہ میں جس کے وکیل میرے والد (محمود حسن خان شروانی مرحوم) تھے یہ فرمان عدالت میں داخل کیا گیا تھا اور برہمن کامیاب ہوا، [۳] روزنامہ دعوت (سہ روزہ اڈیشن) دہلی ۱۶؍مئی ۸۲ء
نیز دیکھئے: ① Moghals and the Jogis of Jakhbar, Indian Institute of Advanced Study, Simla.
(۲) مقالہ "عالمگیر کے عہد میں مندروں کا انہدام" معارف ستمبر ۱۹۴۳ء،

ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریۂ ہند لکھتے ہیں :

اگر کوئی ریسرچ اسکالر ان مندروں اور مٹھوں وغیرہ کی فہرست تیار کرے جنھیں اس ملک کے مسلمان بادشاہوں نے جاگیریں عطا کی تھیں تو یہ فہرست بہت طویل ہوگی[۱]

جب کبھی کسی مسلمان حکمراں نے غیر مسلم عوام کے خلاف قدم اٹھانا چاہا تو وہ علما و صوفیائے کرام سامنے آئے جن کا مسلک یہ تھا،

(۱) مسلمانان بردین خود باشند و ہندواں بر کیش خود، آیت لکم دینکم ولی دین بیان ایں معنی است[۲]

(۲) در طریق ما ہیست کہ با مسلمان و ہنود صلح باید داشت و ایں بیت شاہد آوردند

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام[۳]

مسلمانوں پر وطن دشمنی کا الزام | انگریزوں نے مسلمانوں پر وطن دشمنی کا بھی الزام لگایا ہے جو سراسر غلط ہے، ایک حدیث میں وطن کی محبت کو ایمان کا جز قرار دیا گیا ہے "حب الوطن من الایمان"[۴]

خسرو کہتے ہیں :

حب وطن ہست ز ایماں بہ یقین
ویں ز رسول آمدہ کای زمرۂ دین[۵]

---

[۱] India divided اس کتاب کے خاص خاص حصوں کا ترجمہ "مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک" میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے کیا ہے، [۲] مکتوبات شیخ احمد سرہندی جلد اول ص ۶۵ بحوالہ Naqshbandi Influance on Moghal Rulers and Polities by prof. K. A. Nizami Islamic culture, Jan. 1965, P. 45.
[۳] نافع السالکین، ملفوظات حضرت شاہ سلیمان تونسوی بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۶۵۱، [۴] محدثین نے اس حدیث کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، اسکے باوجود اس سے وطن کے متعلق مسلمانوں کے نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، [۵] مثنوی نہ سپہر

(باقی حاشیہ ص)

مولانا شبلی فرماتے ہیں،

اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی فضیلت نے مذہبی حیثیت پیدا کی اور حدیث و تفسیر کی مقدس کتابوں میں اس قسم کی روایتیں درج کی ہیں[1]"

یہ ملک ہمیشہ سے مسلمانوں کا منظور نظر رہا،

لیک ہندا ست نسیمش دگر | کانش درون میرہد از جنت اثمر
زاں سبب خاص پر اصحاب یقیں | ہند تواں گفت کہ خلد است برین[2]

مسلمانوں کے حب وطن کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اجنبی حکمرانوں کی طرح ہندوستان کو محض مال غنیمت نہیں سمجھا بلکہ اس کو اپنا وطن بنا لیا، یہیں پیدا ہوئے اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے،

ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق اور اسکی تعمیر و ترقی میں اس کا حصہ

مسلمان حکمرانوں اور امرار نے اس سرزمین کو ہر حیثیت سے سنوارا ہے اور نکھارا ہے، ایران و ترکستان کے گل بوٹوں سے یہاں کے چمن میں اضافے کئے ہیں[3]، سمرقند و شیراز کے علماء کو یہاں بلا کر ہندوستانیوں کے ذہنی دریچوں کو روشن کیا ہے[4] ؎

جاں نثاروں نے ترے کر دئے جنگل آباد

خاک اڑتی تھی جہاں اہل وفا سے پہلے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۰) ہ تصیر ڈاکٹر وحید مرزا کلکتہ ۱۹۴۸ء ص ۱۵۰، [1] مقالات شبلی تاریخی حصہ دوم جلد ششم صفحہ ۲۲۲-۲۲۳، [2] نہ سپہر ص ۱۵۷، [3] ابوالفضل نے آئین اکبری میں ایران و ترکستان سے لائے ہوئے پھولوں کی فہرست دی ہے دیکھئے: The A'in-i-Akbari, Translated by H. Blochmann Delhi, 1965, P 93, نیز دیکھئے: اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے، مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی، معارف اگست تا نومبر ۱۹۲۹ء [4] تفصیل کے لئے دیکھئے، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول دہلی ۱۹۶۶ء،

یہاں کے فنکاروں کو کسب علوم کے لئے ایران بھیجا،

(۱) عبدالباقی نہاوندی لکھتا ہے:

ایران مکتب خانہ ہندوستان است و مستعدان کسب حیثیات در انجا می نمایند کہ در ہندوستان در مجلس سامی این سپہ سالار بکار برند[۱]

(۲) عبدالرحمن چغتائی لکھتے ہیں:

ہندی آرٹسٹوں نے ایرانی آرٹسٹوں سے فن سیکھا اور مغل دربار پر چھا گئے، میر سید علی تبریزی اور راست عبدالصمد شیرازی کی تعلیم نے انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا، جہانگیر نے بعض ہندو آرٹسٹوں کو ان کی قابلیت کی بنا پر تعلیم کے لئے ایران بھیجا تھا۔ ان پر بڑی بڑی نوازشیں کی گئیں تاکہ یہاں کا فن مصوری درجہ کمال حاصل کر سکے[۲]

فن تعمیر موسیقی اور شعر و سخن وغیرہ سارے فنون لطیفہ میں ایران و ترکستان کا تازہ خون شامل کیا گیا خطاطی و تزئین کاری مسلمان اپنے ساتھ لائے اور اس سرزمین کو لالہ و نسترن کا تختہ بنا دیا،

اسلام امن و صلح کا مذہب ہے اس نے انسانیت کے رشتے سے سارے انسانوں کو بھائی قرار دیا ہے اور سب کے ساتھ محبت و رواداری کی تعلیم دی "کونوا عباد اللہ اخوانا" اگر کچھ حکمرانوں نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر اس پر عمل نہیں کیا تو یہ انکا قصور ہے لیکن اگر کچھ علماء حق اور صوفیائے کرام کا ایک طبقہ جو اسلامی تعلیمات کے سچے حامل تھے ہمیشہ ان کی اصلاح کیلئے

---

[۱] بحوالہ ایران میں طبی تعلیم کا نظام (عہد صفویہ میں) مصنفہ کوثر چاندپوری، ص۵ [۲] فنون لطیفہ اور تحریک اسلام نذر عرشی دہلی، ۱۹۶۵ء

موجود رہا ہے جو انکو راہ راست دکھاتا رہتا تھا ان کے یہاں ظاہر کے ساتھ باطنی اصلاح پر زیادہ زور رہتا ان کے دروازے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے کھلے رہتے تھے انکا نظام سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا دہلی، ملتان، لاہور، سرہند، اجمیر، ہانسی، بدایوں، اجودھن اور ناگور انکے خاص مرکز تھے جہاں وہ اصلاح اخلاق و تعمیر کردار کا کام انجام دیتے اور شکستہ دلوں کی دلداری کرتے تھے[۱]۔ ۔ ۔ ہندو ریشیوں نے بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹایا بھکتی تحریک[۲] کا مقصد بھی یہی تھا اس کے اثر سے ہندوستان کے زمین و آسمان بدل گئے۔

کز قدوم شاں مثال بوستاں جنت الماوٰی شدہ ہندوستان[۳]

خسرو نے بھی اس کو جنت نشان قرار دیا ہے۔

بہشتے فرض کن ہندوستان را کز آنجا نسبت است ایں بوستاں را[۴]

کشور ہند است بہشتے بزمیں صحبتش اینک برخ صفحہ ببیں[۵]

ان صوفیائے کرام نے ہندوستانی سماج کے سدھار کے لئے بڑی عظیم جدوجہد کی اور سارے انسانوں کو برابری کا درجہ دیا شیخ حمید الدین ناگوری ناگور کے ایک ہندو کی نسبت فرماتے تھے کہ خدا کا ولی ہے[۶]، صوفیائے کرام اپنے عہد کے حکمرانوں کو بھی ہندو و مسلمان عوام کے ساتھ عدل و انصاف کی تعلیم دیتے تھے،

(۱) خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ التمش کو ہدایت کرتے ہیں:

---

[۱] حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں: بزرگوں نے بطور مجاز فرمایا ہے کہ شکستہ دلوں کی دلداری معرفت ہے "درر نظامی" اردو ترجمہ ص ۱۵، [۲] جب صوفیائے کرام نے اپنی تعلیم (توحید و مساوات) کو عوام میں پھیلایا تو بھکتی کے رہنماؤں نے بھی اپنی بھولی ہوئی تعلیم کو دوبارہ زندہ کیا، خدا کی عبادت اور محنت پر زور دیا اور چھوت چھات اور ذات پات کی مخالفت کی، عہد سلاطین دہلی کے خاص بھکتی کے رہنما حسب ذیل ہیں: رامانند، ولبھ اچاریہ، چیتنیہ، نام دیو، کبیر اور گرونانک، [۳] سیر العارفین، شیخ جمالی، دہلی ۱۳۱۱ھ ص ۴ [۴] دولرانی خضر خاں، ص ۴۴، [۵] نہ سپہر ص ۱۵۱، [۶] فوائد الفواد، ترجمہ غلام احمد خاں بریاں ص ۱۹۴ نیز دیکھئے سیر العارفین ص ۱۴۔

"اے والیٔ دہلی! ...... با خلق نیکوئی کن و رعیت پرور باش، ہر کہ با رعیت رعایت کند و با خلق نیکوئی کند خدائے تعالےٰ او را نگاہ دارد و جملہ اعداء او (را) دوست دارد۔"[1]

(۲) حضرت بو علی شاہ قلندرؒ اپنے ایک خط میں علاء الدین خلجی کو لکھتے ہیں:

"علاء الدین ...... مقرر داند کہ با بندگان خدائے نیکو کند۔"[2]

(۳) حضرت امیر خسرو اپنے دور کے سلاطین کو عدل و انصاف اور عوام کی بھلائی کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے، قطب الدین مبارک خلجی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

بخشش آں شد کہ نماید مدام ... جہد در آسودگیٔ خاص و عام
بر ہمہ دارد بہ بیاباں و کاخ ... جا خوش و رہ ایمن و نعمت فراخ
آنچہ بظہرست رقم یافت چست ... باز نمایم بہ بیان درست[3]

علاء الدین خلجی کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

یاد کن زاں گدائے بے توشہ ... کہ شب افتد گرسنہ در گوشہ
کہ چو فردا شمار کار کند ... اوّل از مفلساں شمار کند
پیل چوں مور را تہِ پا سود ... پرسش از پیلبان خواہد بود[4]

(۴) ۱۳۵۱ء میں فیروز شاہ تغلق جب تخت نشین ہوا تو حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے کہلا بھیجا کہ بادشاہ وعدہ کرے کہ مخلوق خدا کے ساتھ انصاف کریگا ورنہ میں ان غریب عوام کے لئے خدا سے دوسرا فرماں روا طلب کروں، فیروز شاہ تغلق

---

[1] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۱۱۶ [2] ایضاً ص ۲۶۹ بعض کتابوں میں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کے ایک ملازم کو کوتوال نے پیٹ ڈالا تو انھوں نے شاہ وقت کو لکھا ع بازخواں ایں عامل بد گوہرے + ورنہ بخشم ملک تو با دیگرے [3] نہ سپہر ص ۲۲۹ - ۲۲۸ [4] بحوالہ حیاتِ خسرو، مصنفہ محمد سعید احمد مارہروی آگرہ ۱۹۰۳ء ص ۵۱

نے عدل کرنے کا وعدہ کیا، اس پر حضرت چراغ دہلویؒ نے اسے دعائے خیر دی[۱]۔

(۵) حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے ان بیس[۲۰] ٹیکسوں کی مخالفت کی تھی جو عوام پر بوجھ بنے ہوئے تھے اور فیروز شاہ نے ان ٹیکسوں کو معاف کر دیا تھا،

(۶) حضرت شیخ نجم الدینؒ (متوفی ۱۱۳۹ھ) اورنگ زیب کو لکھتے ہیں:

بادشاہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کثیر مخلوق کا نگراں مقرر کیا ہے اور آپ انکے حقوق کے ذمہ دار ہیں، اگر آپ کو تکلیف پہونچ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن رعیت کو تکلیف نہ پہونچے[۲]،

صوفیہ مظلوم کی دادرسی کی خاطر دربادوں میں جانا اپنے لئے ثواب دارین سمجھتے تھے[۳]، اور عوام کی خدمت کرنا اپنا فرض اولین جانتے تھے[۴]، قرون وسطیٰ میں عوام کے صحیح رہنما یہی صوفیہ تھے جب کبھی انکو کسی پر ظلم کی اطلاع ہوتی تھی تو ان کے چہرے آنسو سے تر ہو جاتے تھے، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ان آنسوؤں کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے جو ایک غریب ہندو لڑکی کے لئے نکلے تھے جسے اس کے ماں باپ سے چھڑا کر پانچ ٹکوں میں دیوگیر میں فروخت کیا گیا تھا[۵]۔

ان درویشوں کی چھ سو سالہ جد و جہد رنگ لائی اور یہاں کی فضا میں توحید کے ترانے گائے جانے لگے اہل قلم اس روحانی تحریک سے اتنا متاثر ہوئے کہ اٹھارویں وانیسویں صدی

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف ص ۲۹، [۲] رسالہ آستانہ، مارچ ۱۹۵۰ء ص ۵۰،

[۳] سیر العارفین، ص ۱۵۷، [۴] حضرت چراغ دہلویؒ فرماتے ہیں "دن بھر مخلوق کے ساتھ رہنا ہوتا ہے بلکہ قیلولہ بھی اکثر میسر نہیں ہوتا، خیر المجالس (اردو ترجمہ) ص ۵۹، [۵] دیکھئے: محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء - حیات و تعلیمات، مصنفہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم،

میں انھوں نے اپنی تصانیف میں ہندوؤں کے لئے لفظ کافر[۱] کے استعمال سے اجتناب کیا۔[۲]
(حالانکہ ہندو مصنفین اپنے ہندو بھائیوں کے لئے لفظ کافر بلا تکلف استعمال کرتے رہے)
متاخرین میں حضرت مظہر جانجاناں ہندوؤں کو موحد مانتے تھے، اس کا اثر ہندوؤں
پر یہ پڑا کہ وہ اپنی فارسی تصانیف کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کرنے لگے۔

خسرو سے اقبال تک ہم کو ہندوستان اور ہندوستان سے محبت ہی کی تلقین ملتی ہے۔

ے　خورشید پرست شد مسلماں　　زیں ہندوگان شوخ و سادہ[۳]

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری　　ہم ز وے آموز پرستش گری خسرو

تو از ملک عراقی واز گوں کن عادت بیشیں

اگر خواہی کہ حسن روئے ہندوستاں بینی (عرفی)

می ندانی خطۂ ہندوستاں　　آں عزیز خاطر صاحب (اقبال)

دیکھئے ہندوستان کو امیر خسرو، تلسی داس، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں
فیضی اور مظہر جانجاناں کب نصیب ہوتے ہیں۔ ے

خزاں رسید گلستاں بآں جمال نماند　　سماع بلبل شوریدہ رفت و حال نماند

نشان لالۂ ایں باغ از کہ می پرسی　　بروکہ انچہ تو دیدی بجز خیال نماند

ہمارے وہ روشن ضمیر مفکرین جنھوں نے رواداری نہ سماج کی تشکیل دینے میں اپنی ساری
توانائیاں صرف کر دی تھیں، اگر زندہ ہو جائیں تو انھیں یہ دیکھ کر انتہائی قلق ہوگا کہ آج کا

---

[۱] صوفیائے کرام کے ملفوظات کے صفحات الٹتے جائیے آپ کو ان کی زبان سے لفظ کافر نہیں
ملے گا کسی انسان کو کافر کہنا ان کے مسلک کے خلاف تھا۔ حرف بد را بہ لب آوردن خطا مست × کافر و مومن ہمہ
خلق خدا ست۔ [۲] وقائع عالم شاہی، بحوالہ ہندو تہذیب اور مسلمان مورخان، جون ۱۹۶۸ء۔ [۳] قرآن السعدین ص ۲۷۔

ہندوستان ان کے خوابوں کے ہندوستان سے بالکل مختلف ہے ،

مغربی تدبر نے ہمارے مذہب اور ہمارے سماج اور ہماری تعلیم کو ایسا مسخ کر دیا ہے کہ ہم اپنی تمام قومی اور مذہبی خوبیوں سے محروم ہو گئے ہیں، دوسری قومیں ہم سے آگے نکل چکی ہیں اور ہم ابھی اپنے چمن کے خاشاک بھی صاف نہیں کر سکے ہیں ،

۵. ز بہار دیگراں آمد بہارم بر نگشت ابر برگشت و ہوا برگشت و یارم بر نگشت

بزم تیموریہ حصہ اول

بزم تیموریہ کا پہلا اڈیشن تمام عظیم مغل سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر، ظفر شاہ آخری مغل بادشاہ اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں اور ان سب کے درباروں کے متوسل امراء، فضلاء اور شعراء کے تذکرہ اور ان کے علمی و ادبی و شعری کمالات پر مشتمل تھا جس کو ارباب ذوق نے بہت پسند کیا، اور اپنی کتابوں اور مضامین میں اس دور کے مستند ترین ماخذ کی حیثیت سے اس کے حوالے دیے، اور ناقدین نے مصنف کی محنت و جانفشانی کی داد دی، اب نظر ثانی کے بعد اس میں اس کثرت سے اضافے ہوئے اور اس کا حجم اتنا بڑھ گیا کہ قدر دانوں اور مستفیدین کی آسانی کے لیے اس کو دو جلدوں میں کر دیا گیا، تاکہ بانی سلطنت تیموریہ سے لیکر ظفر شاہ تک کے عہد کے علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، اس جلد میں جو زیر طبع ہے، تین متقدم الذکر مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے تمام قابل الذکر امراء، شعراء اور فضلا کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، خصوصاً دربار اکبری کا تو پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آگیا ہے۔

مولفہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے۔

منیجر

لفظ گجری کی تحقیق

(ناقدینِ اردو کے نظریات کی روشنی میں)

از ڈاکٹر سید احتشام احمد صاحب ندوی

قدیم اردو زبان کے ناموں میں ایک نام گجری یا گوجری بھی ملتا ہے، یہ امر بادی النظر میں تو آسان معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ہندوستان کے مشہور صوبہ گجرات سے قائم کیا جائے اور اس رشتہ سے اس کو گجری کہا جائے، مگر یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے، چونکہ دکنی اور گجری کے علاقے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اس لیے ان دونوں زبانوں میں مشابہت اور اشتراک کے باعث غلط فہمی کے بڑے مواقع ہیں، اس سلسلہ میں بڑا مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ دکنی کے اساطین ادبا و شعراء اپنی زبان کو گجری کہنا شروع کر دیتے ہیں، جس کی تاویل خاصی پیچیدہ اور اہم ہے، محققین اردو نے اس بارے میں مختلف نظریات قائم کیے ہیں، اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، ان نظریات کے بارے میں اختلاف کی بڑی گنجایش ہے۔

اب میں اردو کے ان محققین کے افکار کا جائزہ لینا چاہتا ہوں، اس سلسلہ میں سب سے پہلا نظریہ پروفیسر محمود شیرانی کا ہے، ان کا خیال ہے کہ جب اردو دکن میں رائج ہوئی تو اس کا نام دکنی رکھا گیا اور جب وہ گجرات پہنچی تو مقامی زبان کے اثر

سے گجری کہلائی، وہ لکھتے ہیں:

"ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ جب اہلِ دکن نے اردو کا نام دکنی رکھا، اہلِ گجرات نے اس کا نام گجراتی یا گوجری رکھ دیا، لطف یہ ہے کہ خود ان ممالک کے باشندے اس کو ان ناموں سے پکارتے رہے، شیخ خوب محمد چشتی نے مثنوی خوب ترنگ ۹۸۶ھ میں لکھی ہے۔ اس تصنیف کی زبان گجراتی کے مقابلہ میں زیادہ تر اردو کے ذیل میں داخل ہے، لیکن شیخ اس کو گجراتی بولی کہتے ہیں

جیوں دل عرب عجم کی بات سن بولی، بولی گجرات[1]

پروفیسر شیرانی کا یہ خیال صحیح ہے کہ دکن اور گجرات دونوں نے تعلقوں کے دور کی اردو کو رواج دیا ہے، اور بعد میں اردو کے مولد میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُن سے وہ کسی حد تک محروم رہے، البتہ شیرانی مرحوم نے اس امر کی وضاحت نہیں کی کہ برہان الدین جانم اور دوسرے دکنی ادبا نے اپنی زبان کو گجری کیوں کہا ہے، انھوں نے یہ ضرور لکھا ہے کہ دکنی ادبا نے بھی اپنی زبان کو گجری کہا ہے، مگر اس مسئلہ کے حل کرنے سے انھوں نے احتراز کیا ہے،

"گجری" کی تاویل و تفسیر میں ایک نظریہ وہ ہے جو ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" میں پیش کیا ہے، یہ عقل کو ۔۔۔۔ زیادہ اپیل کرتا ہے، اور واقعات سے مناسبت رکھتا ہے، اس میں اس امر کی وضاحت بھی ملتی ہے کہ دکنی شعراء نے اپنی زبان کو گوجری یا گجری کیوں کہا؟ ان کا بیان انکی زبان سے سنیے:

"گجرات کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا، شاعر اور ادیب بے سروسامانی کی حالت میں

---

[1] پنجاب میں اردو مصنفہ پروفیسر محمود خاں شیرانی، دسمبر ۱۹۲۸ء لکھنؤ، ص ۴۹

ادھر اُدھر مارے مارے پھرنے لگے، ایسے نازک موقع پر دکن کی ایک سلطنت بیجاپور کے حکمراں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فیاضی دکھائی اور اپنے آدمیوں کو بیش تحائف اور سوغات دے کر گجرات روانہ کیا تاکہ وہاں کے علماء اور شعراء کو بیجاپور کے دربار میں آنے کی دعوت دیں، اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں گجرات کی ادبی عظمت کا پرچم بیجاپور پر لہرانے لگا مشہور و معروف ہستیوں کے علاوہ اکثر عام لوگ بھی بیجاپور آگئے، ان گجراتیوں کا اس قدر اثر ہوگیا تھا کہ بعض دکنی مصنف اپنی گجراتی آمیز ہندوستانی کو گجری کے نام سے موسوم کرنے لگے۔[1]

بظاہر یہ دلیل دل کو لگتی نظر آتی ہے، مگر پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی اس نظریہ پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کے یہ دلائل میران جی شمس العشاق یا برہان الدین جانم کے متعلق صحیح نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ اکبر اعظم نے مظفر شاہ والیٔ گجرات کے مقابلہ کے لیے عبدالرحیم خانخاناں کو مامور کیا جس نے اس کو شکست دے کر گجرات پر قبضہ کر لیا، اور مظفر شاہ کو آگرہ روانہ کر دیا، مگر اس نے اثنائے راہ میں خودکشی کر لی، گجرات کی تسخیر سنہ ۱۰۰۱ھ مطابق ۱۵۹۲ء ہوئی، اس زمانہ میں جانم کے سنہ وفات کے لحاظ سے ان انتقال ہوچکا تھا، مگر ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے اس لیے ایک روایت کے مطابق وہ اس واقعے کے ۵ برس بعد تک زندہ رہے۔[2]

مولوی عبدالحق صاحب ارشاد نامہ کا سنہ تصنیف سنہ ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۲ء کو قرار دیتے ہیں[3] برہان الدین جانم کا سنہ وفات ایک روایت کے مطابق سنہ ۱۰۰۶ھ ہے،

---

[1] ہندوستانی لسانیات مصنفہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ص ۱۰۳ [2] ارشاد نامہ مصنفہ برہان الدین جانم تحقیق پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی حیدرآباد ۱۹۷۱ء ص ۴۱ [3] اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ از مولوی عبدالحق طبع دوم ص ۴۵

اور ایک بیاض کی درج تاریخ کے مطابق ۹۹۲ھ ہے۔[1] ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گجرات کی حکومت کا زوال اس وقت ہوتا ہے جب گجراتیوں کے بیجاپور آنے کا اثر حضرت جانم کی زبان پر اتنا نہیں پڑسکتا کہ وہ اپنی زبان کو دکنی کے بجائے گجری کہنا شروع کر دیں؟

اب مسئلہ پھر وہی رہ جاتا ہے کہ دکنی شعراء نے اپنی زبان کو گجری کیوں کہا؟ اس سلسلہ میں اردو کے محقق مولوی عبدالحق بابائے اردو نے اس کے بارہ میں اپنے خیالات بڑے مدلل طریقہ سے پیش کیے ہیں۔ انھوں نے ان مضامین میں جو وقتاً فوقتاً قدیم اردو کے بارے میں رسالہ اردو میں لکھتے تھے، اس بحث کو بڑی اہمیت دی ہے اور بتایا ہے کہ گجراتی زبان کے اثرات اور الفاظ ہی کی بنا پر برہان الدین جانم اپنی زبان کو گجری سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ برہان الدین جانم کا اپنی زبان کو خصوصیت کے ساتھ گجری کہنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ "اگرچہ وہ زبان جس میں ان کا کلام ہے، ہندی ہے لیکن گجری ہندی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر گجرات کا اثر ہے، اور یہ قدرتی بات ہے، ہندی کہو یا اردو، یہ جہاں گئی مقامی رنگ کی جھلک اس میں ضرور آگئی۔"[2]

قدیم دکنی پر اور خاص اس زبان کی اس شاخ پر جو گجرات اور بیجاپور میں بولی جاتی تھی، گجراتی زبان کا اثر پڑا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسے بعض اوقات گجری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔[3] گجری سے مطلب اردو کی اس شاخ سے ہے جو

---

[1] ارشاد نامہ، ص ۱۳۱ [2] قدیم اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی طبع اول ۱۹۶۱ء ص ۴۴

[3] ایضاً ص ۴۷

گجرات میں بولی جاتی تھی، اور جس میں مقامی گجراتی کے لفظ مل جل گئے تھے۔[1]

اس طرح ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اور بابائے اردو کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ گجری اردو کی ایک شاخ ہے جس میں گجراتی زبان کے الفاظ کی آمیزش ہے۔ دونوں اس امر پر بھی متفق ہیں کہ بیجاپور کے شعراء اپنی زبان کو "گجری" اس بنا پر کہتے ہیں کہ ان کے یہاں گجراتی زبان کے اثرات ملتے ہیں، البتہ ڈاکٹر زورؔ صاحب اس کی تاویل زوال سلطنت گجرات اور گجری ادیبوں کی بیجاپور میں آمد سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنے گجری ادیب بیجاپور آ گئے کہ مقامی لوگ بھی اپنی زبان کو گجری کہنے لگے۔ مولوی عبدالحق صاحب بغیر کسی خاص واقعہ کے حوالہ کے کہتے ہیں کہ گجری زبان کا رواج گجرات اور بیجاپور میں تھا، جہاں گجراتی زبان کے الفاظ اردو سے مل جل گئے تھے۔ انھوں نے اس کی کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں، انکی بحث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بیجاپور کے علاوہ دوسرے دکنی علاقوں کے لوگ اپنی زبان کو "گجری" نہیں کہتے تھے۔ اس لیے اس کی چھان بین بھی ضروری ہے، کہ کتنے دکنی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی زبان کو "گجری" کہا ہے؟ پروفیسر اکبرالدین صدیقی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ برہان الدین جانم کے والد میراں جی شمس العشاق نے اپنی زبان کو کبھی گجری نہیں کہا ہے،[2] چونکہ گجرات کا زوال میراں جی کے زمانہ میں نہیں بلکہ برہان الدین جانم کی عمر کے آخر میں یہ واقعہ پیش آیا، اس لیے ایک لحاظ سے ان کے گجری لکھنے کی اس تاویل کو تسلیم کیا جا سکتا تھا جو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ نے پیش کی ہے، لیکن چونکہ ان کی تصنیف ارشاد نامہ کا سال تصنیف ۹۹۰ھ ہے

---

[1] قدیم اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی طبع اول ۱۹۶۱ء ص ۹۰ [2] ارشاد نامہ ص ۴۸

اور اس کے دو برس یا ۱۹ برس بعد ان کی وفات ہوئی، لہٰذا ڈاکٹر زور کے بیان کردہ واقعہ کا اثر ان پر پڑنا ناممکن ہے۔

اس بحث میں ایک ماہر دکنیات و گجریات کا نام لینا ضروری ہے جس نے بمبئی میں اردو ادب کے چراغ کو برسوں روشن رکھا یعنی پروفیسر نجیب اشرف ندوی، انھوں نے اپنی مشہور کتاب "لغات گجری" کے مقدمہ میں اس زبان پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اور تفصیل سے بتایا ہے کہ گجرات اور دکن کے سیاسی حالات نے اردو کی عظمت کو بڑھایا، ان دونوں علاقوں کے حکمرانوں نے بدیسی چیزوں کے مقابلہ میں دیسی چیزوں کو اہمیت دینی شروع کی، اسی اصول کے تحت انھوں نے فارسی کے مقابلہ میں اردو کو اہمیت دی، اور دکن اور گجرات میں فرق صرف یہ ہے کہ گجرات میں اردو کو طویل عرصہ تک پروان چڑھنے کا موقع نہ ملا، اس کے مقابلہ میں دکن میں مختلف مسلم حکومتیں مدت دراز تک قائم رہیں، جن کی وجہ سے صدیوں تک اردو سرکاری سرپرستی میں ترقی و عظمت کی منزلیں طے کرتی رہی، وہ مزید لکھتے ہیں کہ گجرات میں جو ادبی اردو پروان چڑھی اس کے تین نام ملتے ہیں: (۱) گوجری (۲) گجری (۳) بولی گجرات۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"مجھے اردو کی ابتدا اور نشو ونما میں گجرات کے کارناموں کو دیکھنے کا موقع ملا، اور ایک سال کی تلاش و جستجو اور غور و فکر کے بعد میں نے یہ کہنے کی جرأت کی کہ اردو کی ابتدائی ادبی تعمیر میں گجرات کو بڑی حد تک اولیت کا درجہ حاصل ہے، میں خوش ہوں کہ اردو کے محققین نے اس کو تسلیم کر لیا ہے۔"[1]

---

[1] لغات گجری مرتبہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی طبع اول بمبئی، ص ۵ - ۶

اب تک جو نظریات گجری زبان کے بارے میں پیش کیے گئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ گجری اردو کی وہ شاخ ہے جس نے علاقہ گجرات میں نشو ونما پائی، اور گجری میں گجراتی زبان کے الفاظ شامل ہیں، مگر ان نظریات سے بالکل مختلف ایک نظریہ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کا ہے، ڈاکٹر گیان چند جین نے چٹرجی کے نظریہ کی تشریح اس طرح کی ہے،

"اس کا گجرات سے کوئی تعلق نہیں، یہ نام گجران والا اور گجرات (پنجاب) کے دکن وارد سپاہیوں کا عطا کردہ ہے، چنانچہ دکنی شعراء شاہ برہان الدین جانم اور امین الدین دکنی نے اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔[1]

سنیتی کمار چٹرجی کا نظریہ اس لیے قابل غور ہے کہ ضلع گجران والا کے سپاہی اتنی تعداد میں دکن میں نہیں آئے جس کی بنا پر زبان کا نام ہی بدل جائے، اسکی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی، فوج میں دلی اور پنجاب کے سپاہی تھے، دراصل چٹرجی کو یہ شبہہ دکنی کے پنجابی پن سے ہوا، یہ وہی شبہہ ہے جو اس سے قبل محمود خاں شیرانی کو بھی ہوا تھا، واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام علامتیں جو دکنی کے پنجابی پن کو ظاہر کرتی ہیں، کھڑی بولی والے گروہ کی ساری زبانوں میں موجود ہیں، جن کو پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب "مقدمہ تاریخ زبان اردو" کے آخری ابواب میں تفصیل سے پیش کیا ہے، پنجاب کے لوگ اردو بولیں یا ہندی مگر ان کی اصل زبان پنجابی رہی ہے، جو وہ اپنے گھروں میں ہمیشہ استعمال کرتے ہیں، اس بنا پر یہ قیاس صحیح نہیں معلوم ہوتا،

گجری کے سلسلہ میں ایک بالکل نیا نظریہ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی نے پیش کیا ہے، حال ہی میں انھوں نے ارشاد نامہ مصنفہ برہان الدین جانم کو مرتب کرکے

---

[1] اردو نے معلی لسانیات نمبر ص ۱۳۲

بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کے مقدمہ میں وہ اپنے نظریہ کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"دکن میں اکثر قصبات میں خواہ وہ حیدرآباد ریاست کے ہوں یا میسور ریاست کے، شاہراہ پر کسی مخصوص جگہ روزانہ بھاجی، ترکاری یا دیگر ضروریات زندگی کی متعلقہ سامان کی عارضی دوکانیں لگتی ہیں اور بازار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے چونکہ یہ دوکانیں مستقل نہیں ہوتیں اس لیے ان کاروبار دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتا اور چونکہ یہ دوکانیں گذرگاہ پر ہوتی ہیں، اس لیے ان کو گذری کہا جانے لگا اور کثرت استعمال سے گجری ہوگیا۔"

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان بازاروں کی زبان فصیح نہ ہوتی تھی، گاہکوں کی آسانی کیلئے دو تین زبانوں کے الفاظ ملا کر گفتگو کی جاتی تھی، برہان الدین جانم نے اپنی زبان کو گجری اسی لحاظ سے قرار دیا ہے یعنی گذرگاہ کی آسان زبان جس کو ہر شخص سمجھ سکے۔"[1]

لفظ گجری تجارت کرنے کے معنی میں اردو میں استعمال ہوتا ہے، چنانچہ باغ و بہار میں خواجہ سگ پرست کے قصہ میں یہ لفظ اسی معنی میں میرامن نے استعمال کیا ہے میں نے اس سلسلہ میں کچھ معلومات مشاہدات کی روشنی میں جمع کی ہیں تحقیق سے معلوم ہوا کہ "گجری" کے نام سے آج بھی ہندوستان کے کئی شہروں میں بازار موجود ہیں، مثلاً بمبئی میں ایک بازار گجری کہلاتا ہے، کانپور میں بھی گذری بازار ہے، البتہ الہ آباد میں ایک بازار گدڑی بازار کہلاتا ہے، اس سے پروفیسر صدیقی کے نظریہ کی تائید ضرور ہوتی ہے، مگر یہ مسئلہ اردو کے ماہرین لسانیات کی توجہ کا مستحق ہے۔

---

[1] ارشاد نامہ ص ۴۲

در اصل صدیقی صاحب نے گجری کی اصل، تاریخ اور عام روایتوں سے صرف نظر کرکے لسانیات کے میدان میں تلاش کی ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دکنی ادیبوں کے گجری لکھنے کی یہ تاویل تسلیم کرلی جائے، جیسا کہ بعض حقایق اس طرف اشارہ کرتے ہیں تو پھر یہ طے کرنا ہوگا کہ گجری کوئی زبان نہیں اور یہ دکنی ہی کا دوسرا نام ہے۔ یا پھر گجری کے دو مفہوم تسلیم کرنے پڑیں گے یعنی ایک وہ زبان جو گجرات میں مسلم دورِ حکومت میں رائج تھی دوسری دکنی جو گذری سے گجری بن گئی۔

یہاں یہ سوال بھی ذہن میں اٹھتا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اکثر دکنی ادبا، شعرا اپنی زبان کو "گجری" کہتے، صرف ادبائے بیجاپور ہی نے کیوں اپنی زبان کو گجری قرار دیا، یہی اعتراض سینتی کمار چیٹرجی کے نظریہ پر بھی وارد ہوتا ہے۔

در اصل گجری زبان کے اتنے شواہد ہیں کہ اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں خصوصاً خوب محمد چشتی ـــــ وغیرہ کی تخلیقات اس زبان کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں، سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ دکنی شعرا اپنی زبان کو گجری کیوں لکھتے ہیں؟

اس سلسلہ میں جو نظریات اس مقالہ میں زیر بحث آئے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱) ڈاکٹر زور اور مولوی عبد الحق کا کہنا ہے کہ گجراتی زبان کے اثرات کی بنا پر ایسا ہے۔

(۲) چیٹرجی کہتے ہیں کہ گجرانوالا ضلع پنجاب کے دکن جانے والے سپاہیوں کا دیا ہوا نام ہے۔

(۳) پروفیسر اکبر الدین صدیقی لکھتے ہیں کہ گجری در اصل گذری تھا، جو کثرت استعمال

سے گوجری بن گیا۔ مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ بعض شعراء، بول گجرات یا بولی گجرات لکھتے ہیں تو اس کی کیا تاویل ہوسکتی ہے[1]۔ نیز یہ کہ دوسرے دکنی شعرا نے اپنے آپ کو گجری کیوں نہیں لکھے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ صدیقی صاحب کے دلائل کافی وزنی ہیں، اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے ان کا نظریہ غور و فکر کا مستحق ہے۔

در اصل دکنی اور گجری کے علاقے اتنے متصل ہیں کہ ان میں فروق بہت کم ہیں اور راقم کا نظریہ ہے کہ زوال سلطنت گجرات ۱۵۷۲ء کے بعد جب شعراء و ادباء کثرت سے بیجا پور آ گئے تو کچھ دن تک تو گجری کا نام باقی رہا اور بیجا پوری ادباء اس سے متاثر ہوئے، مگر بعد میں وہ دکنی میں ضم ہو گئی، اور اپنی انفرادیت کھو بیٹھی، اس بنا پر دکنی اور گجری میں اختلافات ایک خاص دور تک رہے، پھر بعد میں اردو کی وہ شاخ جو گجری کے نام سے گجرات میں پروان چڑھ رہی تھی، وہ دکنی میں ضم ہو گئی، اسی بنا پر ولی دکنی مشہور ہوئے۔ حالانکہ تمام تذکروں سے ان کا گجراتی ہونا ثابت ہے۔ سید ظہیر الدین مدنی نے اپنے رسالہ "ولی گجراتی" میں اس موضوع پر تذکروں سے ناقابل انکار شہادت پیش کی ہے۔ کہ ولی گجراتی تھے، نہ کہ دکنی یا اورنگ آبادی، مگر چونکہ ولی کے دور میں "گجری" دکنی میں ضم ہو چکی تھی، اس لیے وہ دکنی کے شاعر مشہور ہوئے نہ کہ گجری کے۔

---

[1] صدیقی صاحب ایک نجی خط میں اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ "بولی گجرات اور بول گجرات سے مراد گجراتی زبان یا گجراتی آمیز زبان ہو، اس کو گجری سے تعلق نہیں، گجراتی زبان نے کبھی شاہوں کی سرپرستی نہیں پائی، ایسا کوئی کارنامہ نہیں جس میں گجراتی بادشاہوں کی تعریف کی گئی ہو۔

وقت کی ناپ

اور

مساواتِ وقت

از جناب بدیع الزماں صاحب اعظمی

تاریخ کی ابتدا کے قبل ہی انسان نے وقت کی ناپ کا تصور کر لیا تھا، اور سال مہینہ اور دن کی تقسیم کر لی تھی، اُس کی یہ کامیابی انسانی ارتقار کی ایک کڑی ہے، دن کا رات میں بدلتے رہنا، موسموں کی باقاعدہ تبدیلی، اور سورج، چاند، ستاروں اور ستاروں کا طلوع و غروب ان سب باتوں کے مشاہدہ ہی نے غالباً انسان کو وقت کی ناپ کا راز بتایا ہوگا،

آج سے ہزاروں سال قبل کے ہیئت داں رات رات بھر آسمان کو تکتے رہتے تھے، انھوں نے ستاروں کی رفتار اور چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد قمری مہینوں کی تشکیل کر لی تھی، اگرچہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں اسی نہج پہ کام ہوتا رہا، مگر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کونسا ملک اس سلسلے میں سب سے آگے تھا، گمان غالب ہے کہ اہلِ بابل نے آج سے چھ ہزار قبل سورج کے فلکی راستے کو بارہ برجوں میں بانٹ رکھا تھا، جو بارہ مہینوں سے منسوب تھے، انھوں نے قمری سال کو مہینوں اور دنوں میں، اور دنوں کو ساعتوں اور دقیقوں میں

تقسیم کر رکھا تھا، اُن کے نزدیک ۶۰ کا عدد، یا اُس کے اجزاے ضربی متبرک مانے جاتے تھے، پورا دن ۱۲ گھنٹے کا، اور ایک گھنٹہ ۳۶۰۰ سکنڈ کا ہوتا تھا، ان کا سال ۳۶۰ دنوں پر مشتمل ہوتا تھا، ہمارا موجودہ کلنڈر بھی انہی کا بنایا ہوا ہے، مگر تصحیح شدہ،

سال کو دنوں میں ترتیب دینا، اور دنوں کو گھنٹوں میں تقسیم کرنا دراصل وقت کی ناپ نہیں ہے ہیئت دانوں نے تو اپنے مشاہدات سے سال کی پوری ناپ کرلی تھی، مگر گھنٹے اور منٹوں کو ناپنا کچھ آسان نہ تھا، انسان نے اس کا معقول حل تلاش کرنے میں ہزاروں سال گذار دیئے، یہ مسئلہ لاینحل ہی رہا ہوتا، اگر سترہویں صدی عیسوی میں ایک قابلِ اعتماد گھڑی کی ایجاد نہ ہوئی ہوتی،

اس سلسلے میں خلدانیوں نے جو کامیابی حاصل کی، وہ دھوپ گھڑیوں کی شکل میں تھی، ان گھڑیوں میں ایک بڑا عیب یہ تھا، کہ ابر آلود مطلع کے وقت یہ کام نہ دیتی تھیں، اور غروبِ آفتاب کے بعد تو اپنا کام ہی بند کر دیتی تھیں، دوسرا عیب یہ تھا کہ جس عرض البلد کے لئے یہ تیار کی جاتی تھیں، اسی مخصوص عرض البلد میں کام دیتی تھیں، وقت کی ناپ کا دوسرا طریقہ آبی گھڑیوں کی شکل میں تھا، یہ بھی عام طور پر مستعمل تھیں،

گھڑیوں کی ایجاد اور اُن کے استعمال نے پرانے طریقوں کو پس پشت ڈال دیا، کلاک کی ایجاد کا سہرا ایک جرمن مسمی ہنری ڈی وک (Henry de Vick) کے سر ہے، اس کی بنائی ہوئی کلاک ۱۳۷۹ء میں منظرِ عام پر آگئی تھی، ۱۶۵۷ء میں ایک ڈچ مسمی ہیوگنس (Huygens) نے ایک ایسی کلاک بنائی تھی، جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ پنڈولم والی پہلی کلاک تھی، ہیوگنس کی تحقیق نے گھڑی سازی کے فن کا ایک نیا دور شروع کر دیا، چنانچہ سترہویں صدی کے اختتام تک کسی حد تک صحیح وقت دینے والی گھڑیاں بننے لگی تھیں، آج تو غالباً

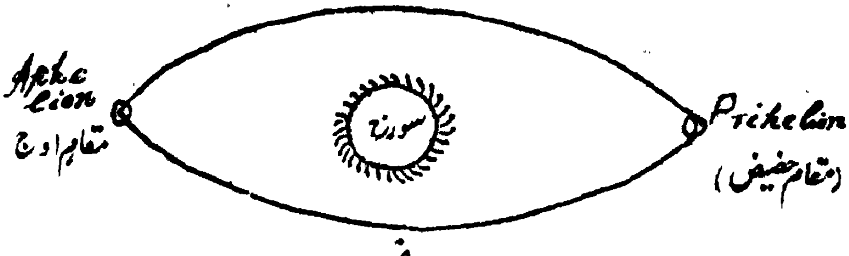
کی بڑی بڑی رصدگاہوں میں ایسی صحیح وقت دینے والی گھڑیاں موجود ہیں جن میں صرف ۱/۱۰۰۰ سکنڈ یومیہ کا فرق پڑنے کا امکان ہوتا ہے۔ ان رصدگاہوں میں اب تو خاص قسم کی دوربینوں کی مدد سے جنھیں (Photographic Zenith Tubes) کہتے ہیں، گھڑیوں کا وقت صحیح کیا جاتا ہے۔ اور وہاں سے بذریعہ ریڈیو نشر ہوتا رہتا ہے۔

صحیح وقت معلوم کرنے کے لئے ہمیں مساوات وقت (Equation of time) کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے، کیونکہ دھوپ گھڑیوں کا وقت تو مقامی اصلی شمسی وقت (Local True Solar Time) کہلاتا ہے، مقامی وقت اس لئے کہ دھوپ گھڑیاں جہاں نصب ہوتی ہیں، وہ وہیں کے وقت کو بتاتی ہیں، اس لئے کہ اُن کا تعلق براہ راست سورج کی روشنی سے ہوتا ہے۔ دھوپ گھڑیوں والا وقت آج کی دنیا میں ہماری روزمرہ کی زندگی کے لئے قابلِ عمل نہیں ہوتا، کیونکہ نہ تو سال بھر دن ہی یکساں ہوتے ہیں، اور نہ ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک کا وقفہ ہی یکساں ہوتا ہے، اس لئے صحیح وقت جاننے کے لئے سورج کے مقابلہ میں ستاروں کا سہارا لینا زیادہ مناسب ہے۔

ماہرین ہیئت زمین کی محوری گردش اور ستاروں کے محلِ وقوع ہی سے دن کی لمبائی ناپتے ہیں۔ کوکبی دن (Sidereal Day) لمبائی کے لحاظ سے شمسی دن (Solar Day) کے مقابلہ میں کسی قدر چھوٹا ہوتا ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ اگر سورج اور کوئی ستارہ ایک سیدھ میں سمت الراس پر ہوں تو زمین کی ایک پوری محوری گردش کے بعد وہی ستارہ پھر سمت الراس پر آجائے گا، مگر اسی اثناء میں چونکہ

سورج ذرا مشرق کی سمت کھسک چکا ہوگا، اس لئے سورج کو سمت الراس پر آنے میں تقریباً ۳ منٹ ۵۶ سکنڈ اور لگ جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوکبی دن شمسی دن کے مقابلہ میں ۳ منٹ ۵۶ سکنڈ چھوٹا ہوتا ہے، ہم جانتے ہیں کہ شمسی دنوں کے لحاظ سے پورا سال ۳۶۵ ¼ دنوں کا ہوتا ہے، مگر ایک سال میں ۳۶۶ ¼ کوکبی دن ہوتے ہیں،

اس لئے ماہرین ہیئت ایک ایسے فرضی سورج کا وجود تسلیم کرتے ہیں، جس کا مدور نہ صرف گول ہے، بلکہ زمین کے مدور پر زاویہ قائمہ بھی بناتا ہے، اسی فرض سورج سے حاصل کردہ دنوں کو اوسط شمسی دن (Mean Solar Day) کہتے ہیں جو نہ صرف سال بھر یکساں ہوتے ہیں، بلکہ اصلی شمسی دنوں (True Solar Day) کے اوسط کے برابر ہوتے ہیں، زمین اپنے محور پر ۲۳ گھنٹہ اور ۵۶ منٹ میں ایک گردش کرلیتی ہے، مگر ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک کا وقفہ ۲۴ گھنٹہ مانا جاتا ہے، چونکہ اسی اصول پر گھڑیاں بنائی جاتی ہیں اور وہی وقت دیتی بھی ہیں، اس لئے چار منٹ یا صحیح طور پر ۳ منٹ اور ۵۶ سکنڈ کی اوسط رعایت گھڑیوں کے وقت میں کرنی پڑتی ہے، اس کے علاوہ مدار ارضی بیضوی ہونے کی وجہ سے سورج کے سالانہ طواف میں ہماری زمین کبھی سورج کے قریب آجاتی ہے، اور کبھی دور ہوجاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی محوری گردش کبھی تیز ہوجاتی ہے اور کبھی سست، اس لئے شمسی دنوں میں یکسانیت نہیں رہ جاتی، شروع جنوری میں جب کرۂ ارض مدار ارضی کے مقام حضیض Perihelion پر ہوتا ہے، تو سورج سے کسی قدر قربت کی وجہ سے اس کی گردش تیز تر ہوجاتی ہے، اس لئے ان ایام میں گھڑیوں کا رعایتی وقت کچھ اور زیادہ کافی ہوجاتا ہے، جیسا کہ نیچے دی ہوئی شکل سے ظاہر ہوتا ہے:-



مدار ارضی

گھڑیاں تو ہمیں اوسط شمسی وقت اور دھوپ گھڑیاں ظاہری شمسی وقت بتاتی ہیں ان دونوں کے اوقات کے فرق کو "مساداتِ وقت" کہتے ہیں، خاص خاص جنتریوں، اور کیلنڈروں میں تاریخ وار یہ فرق درج رہتا ہے جس کی مدد سے ہم طلوع و غروب آفتاب و ظہر کے اوقات کو آسانی کے ساتھ معلوم کر سکتے ہیں، چونکہ دھوپ گھڑیاں دوران سال میں کبھی سست چلتی ہیں، اور کبھی تیز، اس لئے ان کا وقت ان گھڑیوں کے مقابلہ میں کبھی آگے رہتا ہے اور کبھی پیچھے، ان دونوں کے اوقات میں سب سے زیادہ فرق ۱۶ منٹ اور ۲۰ سکنڈ کا ہوتا ہے جو نومبر اور فروری کے مہینوں کی وسطی تاریخوں میں رہتا ہے،

نومبر کی وسطی تاریخوں میں جب دھوپ گھڑیاں نصف النہار کا وقت دیتی ہیں، تو ہماری گھڑیوں میں ۱۱ بجکر ۴۳ منٹ اور ۴۰ سکنڈ ہوتے ہیں، اور فروری کی وسطی تاریخوں میں جب نصف النہار ہوتا ہے تو ہماری گھڑیوں میں ۱۲ بجکر ۱۶ منٹ اور ۲۰ سکنڈ ہو جاتے ہیں، گویا ماہ فروری میں سورج کو سمت الراس پر آنے میں یا نصف النہار ہونے میں گھڑی کے وقت کے اعتبار سے تاخیر ہونے لگتی ہے، یہی وجہ ہے کہ موسم سرما کے چھوٹے دنوں کے بعد جب دن بڑھنے لگتا ہے، تو دوپہر کے بعد کا وقت تیزی کے ساتھ بڑھتا ہے جس کی وجہ سے نومبر کے مقابلہ میں فروری کے مہینہ میں غروب آفتاب دیر میں ہونے لگتا ہے، یعنی طلوع آفتاب سے ۱۲ بجے تک کے وقفہ کے مقابلہ میں بارہ بجے سے غروب آفتاب تک کا وقفہ بڑھ جاتا ہے

ماہرین ہیئت کو کبھی اوقات ہی سے گھڑیوں کا وقت ٹھیک کرتے رہتے ہیں، مگر کوکبی اوقات ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہوتے، کیونکہ کوکبی نصف النہار دوران سال میں دن اور رات کے مختلف اوقات میں پڑا کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آج کوئی ستارہ ٹھیک بارہ بجے دن میں سمت الراس پر آئے تو ۴ منٹ یومیہ کے حساب سے پندرہ دن بعد وہی ستارہ گیارہ بجے سمت الراس پر آجائے گا، اور ایک مہینہ بعد دو گھنٹہ کا فرق پڑ جائے گا، چھ مہینہ بعد بارہ گھنٹہ کا فرق پڑ جائے گا، یعنی وہی ستارہ آدھی رات کو سمت الراس پر آجائے گا، علیٰ ہذا لقیاس، اس لئے ہم کوکبی وقت کو ہیئت دانوں ہی کے لئے چھوڑتے ہیں، ہمارے لئے تو اوسط شمسی وقت (mean solar time) یا دوسرے الفاظ میں گھڑیوں کا وقت ہی مناسب ہے کیونکہ ہماری عملی زندگی تو سورج کے طلوع و غروب سے ہی وابستہ ہے،

افکارِ عصریہ

مُصنفہ

چارلس آر گبسن ایف، آر، ایس - ای -

مترجمہ

محمد نصیر احمد عثمانی نیوتنوی، ایم۔ اے بی۔ ایس سی علیگ

انیسویں صدی عیسوی سائنس کی گوناگوں ترقی کے لئے بہت مشہور ہے لیکن بیسویں صدی خصوصاً پہلی جنگ عظیم کے بعد سے مصنف کے دور تک جو حیرت انگیز ترقیاں اور تبدیلیاں سائنس میں ہوئی تھیں، ان سب کا اس کتاب میں اجمال کیسا ذکر آگیا ہے، اسمیں کل ۲۰ باب ہیں اور ہر باب میں سائنس کے مختلف اہم مسائل کی تحقیق و تشریح کیگئی ہے، یہ کتاب شروع ہی سے یورپ میں داخل ہو سائنس کے طلبہ کے لئے بیحد مفید ہے، (طبع دوم، قیمت - ۶ر (چھ روپئے) منیجر دارالمصنفین

مقالہ نما

مضامین الندوہ

از

مولوی سلمان شمسی صاحب ندوی

(۵)

خلیفہ منصور اور اس کے قاضی ذی الحجہ سنہ ۱۳۲۲ء

ص - ۲۸ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۱

ماخوذ از تاریخ الخلفاء/امام جلال الدین سیوطی،

عبدالسلام ندوی دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء

۱- امام مسلم. ص - ۱۳ - ۳۲

حوالہ - ۲۷۹/۳

امام صاحب کی تنقید اور حقیقت شناسی کا اس قدر شہرہ تھا کہ ابوزرعہ اور ابوحاتم جیسے اوثناس بزرگ ان کو معرفتِ حدیث میں اپنے زمانہ کے تمام مشائخ پر ترجیح دیتے تھے، اسحٰق کوسیخ خود امام صاحب سے خطاب کرکے فرماتے تھے،

۲- شیخ شہاب الدین سہروردی جولائی سنہ ۱۹۰۶ء،

ص - ۱ - ۲۰ حوالہ ۲۷۹/۳

شیخ الاشراق نے جس طرح فلسفہ ارسطو کے عام مسائل پر طرز استدلال پر مقدمات پر خردہ گیریاں اور نکتہ چینیاں کی ہیں، اسی طرح اپنے خاص مسائل کو ایسے جدید پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ فلسفۂ ارسطو کی مطلق آمیزش نہیں پائی جاتی اور درحقیقت یہی خصوصیت اُن کے فلسفہ کو علمِ کلام اور فلسفۂ ارسطو دونوں سے ممتاز کرتی ہے"

عبدالحئی حسنی حکیم

ندوہ کا مشرقی مطلع — اپریل ۱۹۴۰ء

(تذکرہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی) — ص - ۱۵ - ۲۱

حوالہ ۲۸۷

حضرت مراد آبادی سے ایک ملاقات کے تاثرات)

عبدالرحمن ندوی نگرامی — جون ۱۹۱۶ء و جولائی ۱۹۱۶ء

۱- ابو تمام — ص ۲۵

(عرب کا مشہور شاعر) — حوالہ ۲۸۶

۱۹۲ھ میں پیدا ہوا اور ۲۳۱ھ میں انتقال کیا، عام ابتدائی حالات سے مورخین نے زیادہ بحث نہیں کی ہے، نسب کے لحاظ سے طائی ہے، شاعری میں خاص کمال پیدا کیا"

۲- اسماعیل بن عباد — مئی ۱۹۱۶ء

ص - ۲۶ - ۳۲

حوالہ ۲۸۶

سلطنتوں میں الپویہ خاندان کو بھی علوم و فنون کی سرپرستی میں ایک خاص مقام حاصل ہے، ہم ذیل میں اسی خاندان کے فاضل رکنِ سلطنت اسماعیل بن عباد کا تذکرہ

کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ دولت اور علم کیونکر ہمارے اسلاف کی گود میں ہم آغوش ہوکر پرورش پاتے تھے۔"

۳۔ قاضی ابویوسف فروری ۱۹۱۲ء

ص ۲۲ - ۳۲

حوالہ ۲۸۷

علامہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں قاضی صاحب کے جن مصنفات کا تذکرہ کیا ہے، ان میں بعض تو اس قسم کے ہیں، کہ چند ابواب فقہیہ لئے ہوئے ہیں، اور انہی میں سے ایک ایک باب پر مستقل تصانیف ہیں، مثلاً کتاب الصلواۃ، کتاب الزکوۃ، کتاب الصوم ان کے علاوہ مستقل تصانیف یہ ہیں، "کتاب اختلاف الامصار" کتاب الرد علی مالک بن انس کتاب الخراج وغیرہ،

مولانا عبدالماجد دریابادی اگست ۱۹۴۰ء

عہد قریب کا ایک گمنام عالم ص ۔ ۴ ۔ ۱۴

"مولانا مظہر کریم دریابادی" حوالہ ۲۸۰/۲

"پچھلی صدی میں صوبہ اودھ کی خاک سے متعدد علماء ایسے اٹھے کہ اپنے معاصرین میں ممتاز سمجھے گئے، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے گمنام ہوگئے، کوئی یادگار اپنی ایسی نہ چھوڑی کہ نام عرصہ دراز تک چلتا۔ انہی گمنام مشاہیر میں ایک مولانا مظہر کریم صاحب دریابادی تھے۔"

علوی، ضیاء الحسن اگست ۱۹۰۸ء

۱۔ "ابن خلکان اور یورپ" ص ۔ ۱۳ ۔ ۲۷ ۔ حوالہ ۲۶۹/۵

"مستشرق موسیو میک گلکن ڈی اسلین فرانسیسی کے دیباچہ ابن خلکان کا اردو ترجمہ جس میں اس کی شخصیت اور کتاب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔"

۲۔ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی ص صفر ۱۳۲۳ھ

ص ۔ ۱۳ ۔ ۲۷

حوالہ ۲۷۹/۵

اُن کی تصنیفات ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہیں، فنِ رجال اور تاریخ اگرچہ مسلمانوں کا گویا خاص فن ہے لیکن ہندوستان کی علمی حالت کی کچھ ایسی افتاد پڑی تھی کہ ابتدا سے اس زمانہ تک ہزاروں علماء و فضلا کے حالات پر گمنامی کا پردہ پڑا ہے، آزاد سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان کے علماء اور اربابِ عمائم کے حالات قلمبند کئے، آزاد نے اس اوّلیت پر فخر کا اظہار کیا ہے، اور بجا کیا ہے،

۳۔ ابنِ خلدون جون ۱۹۰۸ء و جولائی ۱۹۰۸ء

حوالہ ۲۷۹/۵

"آٹھویں صدی میں علامہ ابنِ خلدون کا دور تھا، جو نہ صرف اس صدی بلکہ تمام عہد اسلام کے شہرۂ آفاق مورخ تھے، اور جن کا نام موضوعِ کلام کا عنوان ہے، انھوں نے اپنی تاریخ کی آخری جلد میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اپنے واقعات لکھے ہیں،"

۴۔ ابو موسیٰ جابر بن حیان طرطوسی محرم ۱۳۲۴ھ

ص ۔ ۹ ۔ ۱۹

حوالہ ۲۷۹/۴

مذکورۂ بالا شخصیت کا تفصیلی تعارف، اس کی ایجادات و انکشافات کا تذکرہ، تصانیف

کی تعداد اور اُن کا سرسری جائزہ اور علمی خصوصیات پر فاضلانہ تبصرہ!

۵۔ ذوالنون مصری جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ

ص۔ ۱۔ ۱۰

حوالہ ۲۷۹/۲

مسلمانوں میں ذوالنون کی غیر معمولی شہرت ہے، اُن کا نام ادب سے لیا جاتا ہے، "اُن کی کرامتیں نہایت دلچسپی سے بیان کی جاتی ہیں، بایں ہمہ شہرت یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ذوالنون کیمیا میں بھی صاحبِ فن تھے، اور مرکبات کے تجزیہ و تحلیل اور مفردات کی ترکیب و تالیف میں اُن کو خاص دستگاہ تھی،"

۶۔ شیخ محمد عبدہٗ جمادی الآخر ۱۳۲۳ھ

ص۔ ۲۵۔ ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۲

تاریخ، تفسیر، ادب، اور علم توحید میں ان کی کتابیں یادگار ہیں، جن میں کتاب التوحید، تفسیر سورۂ فاتحہ، تفسیر سورۂ عصر، تفسیر عم یتساءلون، حواشی بصائر نصیریہ، شرح نہج البلاغۃ، شرح مقامات بدیع الزماں شائع ہو چکی ہیں، صاحب موصوف ۱۳۱۷ء میں مصر کے مفتی اعظم ہوئے،

" شخصیت اور اُن کی دعوت پر روشنی ڈالی گئی ہے،"

معشوق حسین، ایم۔ اے، اپریل ۱۹۰۷ء

باباطاہر ہمدانی ص۔ ۲۶۔ ۳۱۔ حوالہ ۲۷۹/۴

حوالہ ۲۷۹/۴

طاہر عریاں ہمدانی اُن کا نام بابا طاہر تھا، اپنے زمانہ کے صوفیائے کرام میں سے تھے بعض مصنفین کا بیان ہے کہ یہ سلاطین سلجوقیہ کے زمانہ میں تھے، مگر یہ غلط ہے، یہ دیلمیوں کے زمانہ میں گذرے ہیں، قدمائے شیوخ میں اُن کا بھی شمار ہے، اُن کا زمانہ ۴۱۰ھ ہے، اور عنصری و فردوسی اپنے تمام معاصرین سے پہلے ہی انتقال فرمایا، اُن کی رُباعیاں آج تک مقبول ہیں۔"

"اخلاقیات وسماجیات"

سیلمان ندوی - سید علامہ جنوری ۱۹۰۸ء

"علمائے سلف میں استغنا،" ص - ۱۷ - ۲۷

حوالہ ۲۷۹/۴

ہمارا خیال ہے کہ استغنا تمام اخلاق کی جان ہے تکمیل اخلاق نہیں ہوسکتی جب تک انسان کا دل دنیا اور اس کی دولت سے غنی نہ ہو، اور اس کی آنکھوں میں دنیاوی زخارف کی کچھ عزت نہ ہو، فن اخلاق کے جلی عنوان یہ ہیں، راست بازی آزادی رائے صبر و شکر، علوئے ہمت، استقلال، صدق، خودداری، عزت نفس، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو استغنا، کے بغیر حاصل ہوسکتی ہے،

شبلی نعمانی علامہ جمادی الاولی ۱۳۲۲ء

"اخلاق عرب" ص - ۲۰ - ۲۴

حوالہ ۲۷۹/۱

"جدید تعلیم میں ابتدا سے اخیر تک اس بات کا موقع ہی نہیں ملتا کہ اسلاف کے کارناموں سے واقفیت حاصل کی جائے، اس لئے جب فضائل انسانی کا ذکر آتا ہے، تو خواہ مخواہ ان ہی لوگوں کی زبان پر آتا ہے جن کے واقعات کی آوازیں کانوں میں گونج رہی ہیں"
عربوں کے بعض اخلاقی واقعات کا تذکرہ،

شروانی حبیب الرحمن خاں شعبان ۱۳۲۲ء

"اخلاق" ص - ۱ - ۸

حوالہ ۲۷۹/۱

اسلام نے اخلاق کو اپنی تعلیم میں کیا مرتبہ دیا، پاکیزہ اخلاق کو حاصل کرنے اور بُرے اخلاق سے بچنے کی کس درجہ تاکید کی، تعلیم اسلام میں اخلاق حسنہ کیا ہیں، اور بُرے اخلاق کیا، ان امور کو احادیث نبویہ کی رو سے بیان کرنا مقصود ہے"

عبدالسلام قدوائی ندوی فروری ۱۹۴۲ء

فقر کی شان استغنا" ص - ۱۸ - ۲۰ حوالہ ۲۸۰/۲

اخبار الاخیار سے بعض بزرگوں کے شان استغنا کے واقعات ترجمہ کئے گئے ہیں،

عبدالسمیع، ایم - اے، اپریل ۱۹۴۲ء تا اگست ۱۹۴۲ء

بچہ اور تعلیم حوالہ ۲۸۱/۱

"مختلف اقوام نے بچہ کی تعلیم و تربیت پر کس طرح توجہ کی، آیندہ صفحات پر ان کی کوششوں کا تذکرہ ہوگا، ازمنہ ماضی کی تاریخی اوراق پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے گا کہ قدیم نظریات کیا تھے، اور اب ماہرین علم النفس نے جو جدید نظریات پیش کئے ہیں، وہ کیا ہیں، اور کن اصولوں کے ماتحت بچہ کی تعلیم و تربیت کے موثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے،

عبدالماجد دریابادی (مولانا) جون ۱۹۱۱ء

حکمائے یورپ کے اقوال۔ ص ۔ ۲۵ ۔ ۳۰ حوالہ ۲۷۹/۸

حکمائے یورپ کے اقوال مختلف موضوعات پر پیش کئے گئے ہیں،

عزالدین ندوی، اکتوبر ۱۹۴۱ء

"معاشی توازن کے نئے تخیل، ص ۔ ۲۱ ۔ ۳۰

حوالہ ۲۸۰/۴

میں چاہتا ہوں تمام نوزائیدہ نظام آپ کے سامنے آئیں، پھر اشتراکیت نظام کو نمایاں کرکے اسلام کے اقتصادی اور فطری نظام کو پیش کروں تاکہ دنیا کو یہ معلوم ہوجائے کہ اسلام انسانی ہمدردی اور معاشی نظام کی کتنی اعلیٰ دلکش اور صحیح تصویر پیش کرتا ہے،

عام نظریات اور اسلامی نظریہ کا جائزہ،

علوی، ضیاء الحسن رمضان ۱۳۲۲ھ

عمر اور صحت کی تدابیر، ص ۔ ۳۰ ۔ ۳۳

حوالہ ۲۷۹/۱

اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ تدابیر صحت سے عمر میں ترقی ہوتی ہے لیکن ثبوت ان ممالک میں علم الاعداد کی رو سے کچھ آسان نہیں، کیونکہ آبادی وولادت اور اموات کا شمار یہاں رائج ہوئے بہت کم عرصہ گذرا ہے بخلاف یورپ اور انگلستان کے جہاں یہ طریقہ مدت سے رائج ہے،

ہادی شاہ محمد ہادی شعبان ۱۳۴۰ء

"اخلاق کا حصہ قومی تعمیر میں! ص ۱۴ ۔ ۲۲ حوالہ ۲۸۰

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی پکار ایک بجلی کا کڑکا تھا، یا ایک صوتِ ہادی تھی، جس نے عرب کی ساری زمین ہلا دی، اور سارے عرب میں اصلاح کا شور مچ گیا، ایک زمانہ کے بگڑے ہوئے بنے، اور بہت دن کے سوئے ہوئے جاگے، اور آن کی آن میں ساری دنیا پر چھا گئے،"

مندرجہ ذیل موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے،

قرآن مجید کا اخلاق پر اثر۔ آنحضرت ؐ کی تعلیمات کا اخلاق پر اثر، صحابۂ کرام اخلاقی حیثیت سے اسلامی قوت کا انحطاط۔ یورپ کا عروج، یورپ کا اخلاقی انحطاط،

مباحث منطق، حکمت و فلسفہ

سلیمان ندوی، (سید علامہ) جنوری ۱۹۱۲ء

"فنائے مادہ" ص۔ ۱۵۔ ۲۶

حوالہ۔ ۲۷۹/۹

سائنس اور مذہب کے متنازع فیہ مسائل میں ایک مسئلہ فنا و بقا کے مادہ کا مسئلہ ہے، یہ مسئلہ بذات خود کوئی متنازع فیہ مسئلہ نہیں ہے لیکن چونکہ اس کے ثبوت و عدم ثبوت کا لازمی نتیجہ حدوث وقدم عالم ہے، اس لئے اس مسئلہ کی سرحد پر آکر خواہ مخواہ سائنس اور مذہب کا حریفانہ مقابلہ ہو جاتا ہے،

"قوت باصرہ اور نور" اکتوبر ۱۹۰۶ء

ص۔ ۱۳۔ ۲۳

حوالہ۔ ۲۷۹/۲

"مسلمانوں نے ان دونوں شاخوں پر کثرت سے بحثیں کی ہیں، فلسفہ اشراق کی عمارت

کا ننگ بنیاد یہی نور ہے، گو اس علم نے بھی یونانی لباس میں رہ کر عربی لباس پہنا ہے، مگر مسلمانوں کی علمی کوششوں نے اس فن کی حیثیت ایسی بدل دی ہے، کہ وہ خود اس کے موجد کہے جا سکتے ہیں"

مادہ کے اجزاے ترکیبی" فروری ۱۹۰۸ء

ص - ۱۷ - ۲۹

حوالہ ۲۷۹/۵

"کیمیائی تحقیق کا جب اور قدم آگے بڑھا، تو خود ان عناصر کی بساطت، حقیقت اور خواص پر بحث ہونے لگی، ابتداءً علماے کیمیا کا خیال تھا، کہ عناصر کی حقیقت جداگانہ ہے مگر وقت نظر نے یہ ظاہر کیا کہ یہ عناصر خود ایک نہایت ہی لطیف عنصر سے مرکب ہیں، اور یہی لطیف عنصر کل عناصر کی حقیقت ہے، اور یہی ایک چیز تمام کائنات کی اصل ہے"

(باقی)

الفاروق

(حصہ اوّل و دُویم)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح عمری، ان کا طرز حکومت، اور ان کے دور خلافت میں حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح و حضرت عمروؓ بن العاص اور دیگر صحابہؓ کے فتوحات، عراق و شام، مصر و ایران وغیرہ کے فتح کے ولولہ انگیز واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل، اور اسلام کی عملی تعلیم کا ایمان افروز منظر، مسائل فقہیہ میں حضرت عمرؓ کے اجتہادات کی تفصیل،

مؤلفہ: حجۃ الاسلام مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

قیمت غیر مجلد ۱عہ ۔۔۔ "منیجر"

ادبیات

غزل

جناب ڈاکٹر ولی الحق انصاری،

اے دوست مسرت کے پہلو میں الم بھی ہیں — رقصاں ہے خوشی جن میں آنکھیں وہی نم بھی ہیں

ہے نام خدا لب پر اور دل میں صنم بھی ہیں — اک طرفہ بشر یارو اس دور میں ہم بھی ہیں

کچھ ایسے بھی بت ہیں گھر جن کا ہے صنم خانہ — رہتے ہیں دلوں میں جو کچھ ایسے صنم بھی ہیں

دنیا کو بناتے ہیں کچھ ہوش و خرد والے — تخریب کے میداں میں کچھ اہل قلم بھی ہیں

ایام گذشتہ کی پرکیف حسیں یادیں — سرمایۂ شادی بھی ہیں مایۂ غم بھی ہیں

اغیار ستم پیشہ کے جور کا شکوہ کیا — مٹنے کا میرے باعث اپنوں کے کرم بھی ہیں

اک وہ بھی زمانہ تھا جب لطف کی بارش تھی — اب وقت وہ ہے جب ہم محروم ستم بھی ہیں

اے چشم حقیقت بیں ہشیار کہ دنیا میں — گلزار براہیمی اور باغ ارم بھی ہیں

ہے ایک سی حالت سب کی قلزم ہستی میں — گرداب میں گر تم ہو منجدھار میں ہم بھی ہیں

اوضاع زمانہ کو سمجھا ہے ولی ہم نے — ہیں محرم شادی بھی اور خوگر غم بھی ہیں

غزل

از جناب ماہر القادری

نگاہ مست کی جو خیر تشنگی کیا ہے — وہ آگئے تو ضرورت شراب کی کیا ہے،

ادھر سے بندہ نوازی کی کوئی حد نہ رہی　　میں سوچتا ہی رہا فرضِ بندگی کیا ہے
سفر کا لطف تو جب ہے ٹھہر ٹھہر کے چلو　　یہ راہِ شوق ہے ایسی روا روی کیا ہے
نیاز مندوں سے وحشت ہے ربط غیروں سے　　حضور! آپ کا معیارِ دوستی کیا ہے
خیال و فکر کے سب جھلملا رہے ہیں چراغ　　ہجوم ہے یہ اندھیروں کا روشنی کیا ہے
بڑے بڑوں کی نہیں اُس جگہ پذیرائی　　ہم ایسے خاک نشینوں کا ذکر ہی کیا ہے

نہ حُسن ہی کو خبر ہے نہ عشق کو معلوم
وصال و ہجر میں یہ ربط باہمی کیا ہے

غزل

از

جناب چندر پرکاش بجنوری

محبت اپنا خود آئین بھی ہے　　یہی ایمان بھی ہے دین بھی ہے
تڑپنے کا سلیقہ ہو تو ناداں　　تڑپنے میں بڑی تسکین بھی ہے
محبت ہے بظاہر جتنی سادہ　　مزاجاً اتنی ہی رنگین بھی ہے
پرِ پرواز اور فکرِ اسیری　　پرِ پرواز کی توہین بھی ہے
نہ راس آئے اگر غم اہلِ دل کو　　تو پھر یہ حادثہ سنگین بھی ہے

کئی دن سے عجب عالم ہے جوہر
طبیعت شاد بھی غمگین بھی ہے

نوائے عصر

جناب محی اعظمی کا دوسرا مجموعۂ کلام،　　قیمت :- تین روپئے،

مطبوعاتِ جدیدہ

احکامِ شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت } مرتبہ مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۲۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت لعہ، ناشر ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی ۶ء۔

شریعت کے احکام و مسائل میں زمانہ کے حالات کی رعایت ضروری ہے، اور ہر زمانہ کے فقہا نے اس کا لحاظ رکھا ہے، مولانا محمد تقی امینی نے جو فقہ و اجتہاد کے مختلف پہلوؤں پر مفید کتابیں اور محققانہ مضامین لکھ چکے ہیں، زیرِ نظر کتاب میں اس مسئلہ پر مفصل اور مبسوط بحث کی ہے، یہ کتاب ایک مقدمہ اور تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں قرآن مجید سے، دوسرے میں حدیث نبوی سے اور تیسرے میں صحابۂ کرام (شیخینؓ) کے تعامل سے احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت کے دلائل فراہم کیے ہیں، حضرت عمرؓ کے عہد میں فتوحات کی وسعت نے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیے تھے، جن کو انھوں نے اپنے اجتہاد سے حل کیا، مولانا شبلی نے الفاروق میں اسکو تفصیل سے لکھا ہے، اس کتاب میں بھی ان کو پیش کیا گیا ہے، لیکن شریعت کے منصوص اور قطعی الثبوت احکام میں کوئی تبدیلی نہیں کیجا سکتی، اور نہ حالات و زمانہ کی رعایت سے احکام کا موقع و محل متعین کرنے کی اجازت و ضرورت بالکل عام اور مطلق ہے، جس کی وضاحت مولانا امینی اپنی دوسری کتاب "مسئلۂ اجتہاد پر تحقیقی نظر" میں کر چکے ہیں،

س کتاب میں بھی اس کا ذکر آجانا چاہیے تھا، ورنہ اس کے بعض مباحث سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، فقہاء کے مسالک کے سلسلہ میں ان کے مذاہب کی مشہور اور معتبر کتابوں کا حوالہ دینے کی ضرورت تھی، مگر صفحہ ۷۶ پر امام ابوحنیفہؒ کی جانب منسوب ایک خاص مسئلہ میں یہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے، اس قسم کی بعض معمولی باتوں سے قطع نظر فاضل مصنف کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی عالمانہ، مدلل اور لائق مطالعہ ہے۔

تذکرہ نکات الشعراء - مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۷۶، مجلد مع گرد پوش، قیمت للعہ، پتہ: ادارۂ تصنیف ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن، دہلی ۹

اردو شعراء کے قدیم تذکروں میں نکات الشعراء کو اس کی قدامت اور میر جیسے عظیم شاعر کی نسبت کی وجہ سے بڑی اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوئی، انجمن ترقی اردو ہند نے پہلے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے مقدمہ اور دوبارہ بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم کے مقدمہ و حواشی کے ساتھ اس کو ۔۔۔ شائع کیا تھا، مگر اب یہ دونوں اڈیشن کمیاب ہیں، اس لیے گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے لائق صدر ڈاکٹر محمود الٰہی نے اس کو مزید اہتمام سے شائع کیا ہے، انھوں نے اسکی تصحیح و ترتیب میں مطبوعہ اڈیشنوں کے علاوہ پیرس کے ایک مخطوطہ اور بعض دوسرے مخطوطات سے بھی مدد لی ہے، اور نسخوں کے فرق و اختلاف کو ظاہر کرنے کے لیے متن میں علامتیں اور حاشیے میں وضاحتیں کر دی ہیں، اس طرح یہ اڈیشن نسبۃً زیادہ جامع ہو گیا ہے، شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس کے شروع میں تذکرہ کے سبب تصنیف، اہمیت و خصوصیت اور قریب قریب اسی زمانے میں لکھے جانے والے

ایک دوسرے تذکرہ ریختہ گویاں سے اس کا ایک گونہ تقابل اور آخر میں دونوں مطبوعہ اڈیشنوں اور قلمی مخطوطات کی نوعیت وکیفیت اور زیر نظر نسخہ کی ترتیب وغیرہ کے متعلق معلومات تحریر کیے ہیں، اس مفید ادبی وتحقیقی خدمت کے لیے لائق مرتب اردو شعر وادب کے شائقین کے شکریے کے مستحق ہیں،

اردو کے اہم رسالے اور اخبار۔ مرتبہ جناب عابد رضا بیدار صاحب، تقطیع خورد کاغذ اچھا، کتابت وطباعت غنیمت، صفحات ۱۹۱ مجلد مع گرد پوش، قیمت ع۱۰/

پتہ: رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورنٹیل اسٹڈیز، ۸۰۶، کلاں محل، دہلی ۶

جناب عابد رضا بیدار نے اردو کے اہم ادبی اخبارات ورسائل کے اشاریے تین جلدوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، یہ اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے، اس میں انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے حسب ذیل مجلات ورسائل کی پرانی فائلوں کا محنت اور دیدہ ریزی سے جائزہ لے کر ان کے اشاریے مرتب کیے گئے ہیں

(۱) اخبار سینٹیفک سوسائٹی علی گڑھ (سرسید کا گزٹ)، (۲) اودھ پنچ (منشی سجاد حسین)، (۳) علی گڑھ میگزین (ایم، اے، او کالج اور مسلم یونیورسٹی) (۴) افسر (مولوی عبد الحق) (۵) دکن ریویو (ظفر علی خاں) (۶) تعلیم وتربیت (سید عابد حسین) (۷) مصنف (الطاف علی بریلوی) (۸) معارف (وحید الدین سلیم) (۹) معلومات (سید عابد لوائی) (۱۰) سہیل (رشید احمد صدیقی)

لائق مرتب نے ان رسالوں کے صرف قابل ذکر مضامین اور ان کے لکھنے والوں کے ناموں کی فہرست ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اہم اور قابل توجہ مضامین کا کسی قدر تفصیل سے

ذکر کیا ہے، اور ان رسالوں ہی کی زبانی ان کے خصوصیات و مقاصد بیان کیے ہیں،
قول مرتب "اردو ادب کے خاصے وقیع اور قابل لحاظ سرمایہ کا ایک بڑا حصہ ابتک
ن بھولے بسرے مجلوں میں دفن ہے...... اور کیفیت اور مقدار کے اعتبار سے یہ
سرمایہ اردو کے موجودہ کتابی سرمایہ سے کسی طرح کم نہیں" اس لحاظ سے یہ انڈکس اردو
بان کے طلبہ اور محققین کے لیے بہت کارآمد ہے، مصنف کی اور کتابوں کی طرح اسکی
بت بھی بہت زیادہ ہے،

نظم سائیکلوپیڈیا۔ مرتبہ ذکی کاکوروی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت
وطباعت غنیمت، صفحات ۲۳۲ مجلد قیمت للعہ پتہ مرکز ادب اردو، ۱۳۶۔ شاہ گنج لکھنؤ

جناب ذکی کاکوروی نے غزل سائیکلوپیڈیا کے بعد نظم سائیکلوپیڈیا مرتب کی ہے
ں میں قدیم عہد سے لیکر موجودہ عہد تک کے اردو کے نظم گو شعراء کے کلام کا انتخاب
یا گیا ہے، عموماً شعرائے متقدمین و متوسطین کی توجہ نظم کے بجائے دوسرے اصناف
ن خصوصاً غزل کیجانب زیادہ تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ان کے کلام کا
ئی بیانیہ حصہ اس میں شامل کر دیا گیا ہے، لیکن اصلاً اس میں جدید ادب کے
ماروں حالی و آزاد اور ان کے بعد کے نظم گو اور موجودہ دور کے ترقی پسند شاعروں
، کلام کی زیادہ نمائندگی ہے، مرتب نے بعض نظم گو شعراء، مثلاً ڈپٹی نذیر احمد
یرہ کو نظر انداز کر دیا ہے، مگر معروف اور اہم شعراء میں قریب قریب سب کا کلام
یا ہے، انتخاب کے معاملہ میں لوگوں کا ذوق مختلف ہوتا ہے، مگر مرتب صاحب ذوق
عر ہیں، اس انتخاب میں بھی انھوں نے حسن مذاق کا ثبوت دیا ہے، دیباچہ میں ابتک کے
نب مجموعوں کو ناقابل ذکر، غیر اہم، سطحی اور گمراہ کن کہنے سے اس مجموعہ کی قدر و قیمت میں

کوئی اضافہ نہیں ہوا،

ارمغان کیرلا ۔ از جناب ایس، ایم سرور صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۸۰، قیمت ۵۰ پیسے، پتہ: ایس، ایم سرور صاحب پوسٹ منڈو پرمبا، ملاپرم، کیرلا۔

جناب ایس، ایم سرور صاحب کا وطن ملاپرم، کیرلا اور مادری زبان ملایالم ہے، مگر اردو کی کشش نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ اپنی موزونی طبع سے اس میں شاعری بھی کرنے لگے، ارمغان کیرلا ان کے کلام کا مجموعہ ہے، اس میں ۲۳ نظمیں ہیں، جو قومی و ملی درد اور اسلامی جذبات کی ترجمان ہیں، اس لیے ان کے کلام میں اقبال کے افکار و خیالات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، لیکن اردو سرور صاحب کی مادری زبان نہیں ہے، اس لیے زبان و طرز ادا میں کہیں کہیں خامی ہے، جو رفتہ رفتہ دور ہو جائیگی، مصنف اس لحاظ سے قابل تعریف ہیں کہ مادری زبان نہ ہونے کے باوجود انھوں نے اردو میں اتنی قدرت حاصل کر لی۔

فضائل علم و مناقب علماء ۔ مرتبہ مولانا صدر الدین عامر الانصاری صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲ روپیہ: ادارہ باب العلوم، مزمل منزل بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں علم دین کی فضیلت و اہمیت اور اہل علم کے مناقب بیان کیے گئے ہیں، پہلے علم و علماء کی فضیلت و منقبت میں وارد قرآنی آیات مع ترجمہ نقل کی گئی ہیں، پھر اس سے متعلق حدیثیں درج کرکے ان کا ترجمہ اور آسان زبان میں انکی تشریح کی ہے، علم دین سے بے اعتنائی اور لاپروائی کے زمانہ میں اس کتاب کی اشاعت ایک مفید دینی خدمت ہے۔ "ض"

مکتبۂ دارالمصنفین

سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، وسیر تابعین و تبع تابعین، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، سوانح، ادبی و فلسفیانہ
،ادر مولانا شبلی کے مقالات کے مستقل سلسلوں کے علاوہ جو بیحد مقبول ہیں، اور جن میں سے ہرکتاب
ل کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں مختلف موضوع پر اور بھی بہت سی کتابیں دارالمصنفین نے شائع کی
،کی مجمل فہرست یہ ہے:-

اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ
رحوم کا دلنشین ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دَور
ات بتفصیل بیان کی گئی ہیں، ۴۹۰ صفحے قیمت عہ
یاسی نظام: اس میں کتاب و سنت کی روشنی
ابواب کے تحت اسلامی دستور کے تقریباً تمام اُصول
لوا گئے ہیں، ۳۰۰ صفحے قیمت -/۰ روپئے
ام (حصۂ اول) پانچویں صدی ہجری تک کے
فلاسفہ کے سوانح و حالات، اور اُن کے
، ۵۰۴ صفحے، قیمت عہ
ام (حصۂ دوم) متوسطین و متاخرین حکما
اوراُن کی علمی خدمات اور فلسفیانہ
، ۳۵۱ صفحے قیمت -/۰
ں کے نامور فاضل ما مدا برلسی
اردو ترجمہ، ۱۵۰ صفحے قیمت عہ

انقلاب الامم ڈاکٹر لیبان کی کتاب کے عربی ترجمہ
سر تطور الامم کا ادیبانہ و انشا پردازانہ ترجمہ؛
۱۸۰ صفحے، قیمت: ۰۰-۴
ارض القرآن (حصۂ اول) سرزمین قرآن یعنی عرب
کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام و ملل و قبائل کا
ذکر ہے، اُن کی تاریخی و اثری تحقیق، ۳۲۰ صفحے قیمت ۲۵-۶
ارض القرآن (حصۂ دوم) بنو ابراہیم کی تاریخ
اور عربوں کے قبل از اسلام، تجارت، زبان و مذہب
پر تحقیقات و مباحث، ۲۳۰ صفحے، قیمت: ۲۵-۴
خطبات مدراس مولانا سید سلیمان ندوی کے سیرت نبوی
سے متعلق خطبات کا مجموعہ، جس میں دارالمصنفین کے
سلسلۂ سیرۃ النبی کا پورا خلاصہ اور حیات نبوی کے
تمام پہلو آگئے ہیں، ۲۰۰ صفحے قیمت ۰۰-۴

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

سلسلۂ مقالاتِ سلیمان

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف موضوع پر متعدد و بلند پایہ اور اہم تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی و مذہبی و فقہی و تاریخی و ادبی و تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں، اب اُن کی وفات کے بعد ان کے ان مقالات کی ترتیب و تدوین و اشاعت کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے، اب تک اُن کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن کی فہرست یہ ہے،

مقالاتِ سلیمان حصۂ اوّل

(تاریخی)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی
بدنصیب کشمیر اور عدل شاہجہانی کا نقش سنگی
لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان
تاج محل اور لال قلعہ کے معمار
استاد احمد معمار کے خاندان کی ایک ا
یادگار،
نالندہ کی سیر
قنوج،
سلطان ٹیپو کی چند باتیں،
۴۱۵ صفحے، قیمت ۹ روپیے،

مقالاتِ سلیمان حصۂ دوم

(علمی)

ہندوستان میں علم حدیث،
فرنگی محل اور علم حدیث
محمد بن عمر الواقدی اور سیرت
عرب و امریکہ اسلامی رصد خانے
کتب خانہ اسکندریہ،
اسلامی ہندوستان کا عہد آخر
مرزا بیدل حکیم ثنائی کے سنین عمر
سفر گجرات کی چند یادگاریں،
انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ
کتب خانہ حمیدیہ بھوپال،
۴۱۵ صفحے قیمت ۹ روپیے

مقالاتِ سلیمان حصہ سوم

(مذہبی)

علوم القرآن، اسماء القرآن
القرآن والفلسفۃ الجدیدۃ،
مسئلۂ ارتقاء اور قرآن مجید،
قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات
تذکار نزول
لفظ صلوٰۃ قرآ
قربانی کا اقتہ
سود اور صحف
قرآن پاک کا
خلیل اللہ کی
۴۲۵ صفحے قیمت

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۷)
ستمبر ۱۹۷۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۱۱۰ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۲ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ یوں تو مسلمانوں کے بہت سے مسائل ہیں مگر ان میں تین زیادہ اہم ہیں، ابتدائی تعلیم، اردو زبان، اور مسلم یونیورسٹی، ان تینوں کے بارہ میں حکومت کی پالیسی صحیح نہیں ہے، ابتدائی تعلیم کا نصاب تمامتر اکثریت کے مذہب اور کلچر کا ترجمان ہے جو مسلمانوں کے عقائد کے سراسر خلاف ہے، ان کے احتجاج اور حکومت کی مقرر کردہ تحقیقاتی کمیٹی کی سفارش کے باوجود نہیں بدلا گیا، اور مسلمان بچے اسکو پڑھنے پر مجبور رہیں، مسلمانوں نے اسلامی مکاتب قائم کرکے اس کی تلافی کی کوشش کی ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ وہ حکومت کے نظام تعلیم کے متوازی نظام قائم نہیں کر سکتے، جس سے ان کو بڑا تعلیمی نقصان پہنچ رہا ہے، مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ تو ان کا کام تھا، ایک سیکولر حکومت کا فرض کیا ہے۔

اردو کی حق تلفی کا اعتراف فرقہ پرست پارٹیوں کے علاوہ اکثریت کے بھی ہر طبقہ کو ہے، اور اسکی حمایت میں آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں، اس لیے اب مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے بھی اس طرف توجہ کی ہے، مرکزی حکومت نے اردو بورڈ قائم کیا ہے، اور دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کی ترقی کے لیے بھی ایک کرور کی رقم منظور کی ہے، اردو کے مسائل کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی قائم کی ہے جو مختلف ریاستوں کا دورہ کرکے ان مسائل کا جائزہ لے رہی ہے، اتر پردیش کی حکومت نے اردو اکیڈمی قائم کی ہے، اور اردو کی تعلیم کیلئے وقتاً فوقتاً احکام جاری کرتی رہتی ہے، اور اس کی نگرانی کے لیے ایک افیسر بھی مقرر کیا ہے لیکن اردو کے تحفظ اور ترقی کی جو واقعی شکل ہے، اس کو نہ مرکزی حکومت اختیار کرتی ہے اور نہ صوبائی حکومتیں اصل مسئلہ اردو کی قانونی حیثیت کا ہے، جب تک یہ متعین نہ ہوگی، ساری تدبیریں بے کار ہیں، حکومت کی نیت کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو لیکن اردو کے معاملہ میں اس کے پورے عملہ کی ذہنیت

خراب ہے، اور اس سے کوئی مواخذہ بھی نہیں ہوتا، اس لیے اردو کے بارہ میں اس کے احکام کی تعمیل نہیں ہوتی،

دوسرے اردو کی تعلیم کا جو فارمولا بھی بنایا جاتا ہے اس میں بھی بہانہ جوئی اور اردو کا راستہ روکنے کی پوری گنجایش رہتی ہے، چنانچہ سہ لسانی فارمولا اس لیے بنایا گیا تھا کہ علاقائی زبانوں کی تعلیم کی گنجایش نکل سکے لیکن اترپردیش کی حکومت نے اس میں سنسکرت کو ٹھونس کر اردو کی تعلیم کا دروازہ بند کر دیا، مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کا اصول سب کے نزدیک مسلم ہے، لیکن دس اور چالیس فی صدی طلبہ کی قید نے اردو کی تعلیم عملاً ناممکن بنادی ہے، جہاں یہ تعداد پوری بھی ہوجاتی ہے، وہاں بھی مختلف بہانوں سے اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا جاتا، ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی یہی حال ہے، بلکہ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ اسکول کے منتظمین اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتے ہیں، مگر افسران بالا اس میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں، ان ساری مشکلات کا حل صرف یہ ہے کہ جن صوبوں میں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد ہے، خاص طور سے اترپردیش اور بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے یا کم سے کم آٹھویں تک اردو کی تعلیم لازمی اور اہم سرکاری کاموں میں اردو کا استعمال ضروری قرار دیا جائے، اس کے بغیر اردو کا تحفظ ممکن نہیں ہے، اب آخری امید گجرال کمیٹی سے ہے، دیکھیں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے،

مسلم یونیورسٹی ایکٹ نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ جمہوری نقطۂ نظر سے بھی قابل ترمیم ہے، اس سے اس کا اقلیتی کردار ہی ختم نہیں ہوگیا بلکہ اسکی آزادی بھی سلب ہوگئی، وائس چانسلر کو مختار کل بنادیا گیا ہے، اور اس کا انتخاب حکومت کریگی، کورٹ ایگزیکٹیو کونسل اکیڈمک کونسل سب میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت کے نامزد کردہ ارکان کی کثرت ہے، کورٹ کی حیثیت جو سب سے بڑی اور بااختیار مجلس تھی

اب صرف مشیر کی رہ گئی ہے، یونین کی موجودگی میں طلبہ کی کونسل کا قیام ایک مستقل فتنہ ہے، غرض اب مسلم یونیورسٹی وزارت تعلیم کا ایک ماتحت شعبہ بن گئی ہے اسلیے اب یہ مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں رہا بلکہ آزادی اور جمہوریت کے تحفظ کا بن گیا ہے، اسی لیے کانگریس کے علاوہ ساری پارٹیاں اس کی مخالفت میں شریک ہیں، مسلمانوں میں ان کے علاوہ جن کے اغراض حکومت سے وابستہ ہیں، کوئی بھی اسکا حامی نہیں، جنکی حیثیت حکومت کے کارندوں سے زیادہ نہیں ہے، وہ حقیقۃً حکومت کے بھی مخلص نہیں، ان کا مقصد صرف اظہار وفاداری ہے، وہ اپنے غلط مشوروں سے حکومت کو بھی مشکل میں پھنسا دیتے ہیں، ان کا کردار یہ ہے کہ ایک طرف وہ مسلمانوں کے ترجمان بنتے ہیں، مگر پھر حکومت کا منشا دیکھکر اس کے ہمنوا بنجاتے ہیں، چنانچہ اس طبقہ کے مسلمان وزراء سے لیکر پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبران تک برابر اپنے بیانات اور تقریروں میں اس کا یقین دلاتے رہے کہ یونیورسٹی کا کردار نہ بدلا جائیگا بلکہ وزیر اعظم کو اس کے لیے میمورنڈم بھی پیش کیا، مگر جب اس کے خلاف ایکٹ بن گیا تو اس کے پرزور وکیل بن گئے، ایسے لوگوں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے، حقیقۃً وہ حکومت کے اعتبار کے بھی قابل نہیں، مگر اس کو کام ان ہی سے لینا ہے،

مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ اگر دب بھی جائے تو اس کا زخم مسلمانوں کے دلوں سے مندمل نہ ہوگا اور ناسور بنکر رستا رہے گا، جو نہ ملک کے لیے مفید ہے اور نہ خود مسلمانوں کیلیے، دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ حکومت اس کو اپنے وقار کا سوال نہ بنائے اور اس میں ایسی ترمیم کر دے کہ کم سے کم یونیورسٹی کی آزادی باقی رہے، جب دوسری مرکزی یونیورسٹیوں کا ایکٹ بنے گا تو اتنی ترمیم بہرحال کرنا پڑے گی، اگر پہلے سے یہ ترمیم کر دیجائے تو مسلمانوں کی بھی دلجوئی ہو جائے گی، جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ نے جو ترمیمیں پیش کی ہیں وہ بہت مناسب ہیں، اس سے حکومت کو سچے قوم پرور مسلمانوں کے جذبات کا بھی اندازہ ہوگا۔

مقالات

بعض شبہات اور اُن کا جواب

از شاہ معین الدین احمد ندوی

مسلمانوں کے اعمال و کردار اور اُن کے زوال و پستی اور ان کے مقابلہ میں مغربی قوموں کی ترقی کو دیکھکر اکثر دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام موجودہ دور کے مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی اور ان کی ضروریات کی کفالت سے قاصر ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو پوری مسلمان قوم پر کیوں زوال طاری ہے، اور وہ ہر شعبۂ زندگی میں انحطاط میں کیوں مبتلا ہے، اور مغربی قوموں کی ترقی روز افزوں ہے، اس لیے ان کا نظامِ حیات ہی قابل تقلید ہے،

بظاہر یہ خیال با وزن ہے، لیکن صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے اس کے تجزیہ کی ضرورت ہے، ہر نظام حیات کا ایک مقصد اور نصب العین ہوتا ہے، اسی کے مطابق اس کی ترتیب عمل میں آتی ہے، اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس کے سارے یا کم از کم اہم اجزا پر عمل ضروری ہے، ورنہ اس سے مطلوب نتائج برآمد نہ ہوں گے، اس کی مثال مشین کی جیسی ہے، جس کے سارے پرزے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں، اور مشین اسی وقت کام دے سکتی ہے جب یہ سب پرزے اپنی جگہ پر ٹھیک چل رہے ہوں،

ورنہ پوری مشین معطل ہو جائے گی، اس لیے دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کا عمل اسلامی تعلیمات پر کہاں تک ہے، دوسرا بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا مغربی تہذیب سراسر خیر ہے، اور وہی انسانی تہذیب و ترقی کا اصلی معیار ہے، اور اس کے سارے عناصر قابل تقلید ہیں،

اسلام مستقل ایک نظام حیات ہے، وہ دنیا کے کسی نظام کا مقلد نہیں، اس کے ظہور کے وقت دنیا میں دو بڑی پرشوکت اور متمدن سلطنتیں ایران و روم کی موجود تھیں، جن کی حکومت مشرق و مغرب کے بڑے حصہ میں پھیلی ہوئی تھی، اور وہ مادی حیثیت سے ایک اعلیٰ تمدن کی مالک تھیں، اس زمانہ میں ان کی وہی حیثیت تھی، جو آج مغربی قوموں اور ان کی تہذیب کی ہے، لیکن اسلام نے ان میں سے کسی کی تقلید نہیں کی، اور اپنا مستقل نظام حیات بنایا، جو ان نظاموں سے نہ صرف مختلف بلکہ ان کی ضد اور ان کے لیے پیام موت تھا، اسکے عقائد تصورات، زندگی کا نصب العین، نظام معاشرت ہر چیز ان نظاموں سے مختلف تھی، اس نے ہر قسم کے شرک کی مخالفت کی، اور ملت اسلامیہ کی بنیاد شرک اور اوہام پرستی کے بجائے توحید، غیر اللہ سے بے خوفی، نسلی اور جغرافی قومیت اور وطنیت کے بجائے عالمگیر اسلامی اتحاد، انسانی غلامی اور طبقاتی تقسیم کے بجائے آزادی اور عدل و مساوات، نسلی برتری کے بجائے عمل صالح پر رکھی، اس طرح اس نے اس دور کے سارے بتوں کو توڑ دیا،

اس نے قومی سربلندی اور مادی ترقی کے بجائے خداشناسی، معرفت حق، رذائل اخلاق کے ترک اور فضائل اخلاق سے آراستگی، نیکی اور بھلائی کی تبلیغ اور بدی اور برائی کے ترک کو اس نظام حیات کا مقصد قرار دیا، کلام پاک کی آیات ان احکام و ہدایات سے معمور ہیں، مسلمانوں کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے؛

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف ونھوا عن المنکر (حج)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دیں تو وہ نمازیں پڑھیں گے زکوٰۃ دیں گے، اچھی باتوں کا حکم دینگے اور بری باتوں سے روکیں گے۔

دوسری آیت میں ہے:۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی رہنمائی کے لیے پیدا کیے گئے ہو، اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

یہ وصف کسی آیت میں بیان نہیں کیا گیا ہے کہ ان کا نصب العین دنیاوی اور مادی ترقی ہے، لیکن اسلام نے ان میں جو روح پیدا کر دی تھی اور جو نظام حیات بنایا تھا، اس پر عمل کا لازمی نتیجہ دنیاوی شوکت وعظمت ہے، خود قرآن مجید کا وعدہ ہے " انتم الاعلون ان کنتم مومنین " اگر تم سچے مسلمان ہو تو تم کو ہر طرح کی سربلندی حاصل ہوگی،

دوسری آیت میں ہے

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم و لیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا (نور)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو روئے زمین کی حکومت ضرور دیگا جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں کو دی تھی اور جس دین کو ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو ان کے لیے جما کر رہیگا اور خوف کے بعد امن سے بدل دیگا

یعنی دین و دنیا دونوں کی بھلائی ایمان اور عمل صالح پر منحصر ہے، جب تک مسلمانوں میں یہ وصف رہا، خدا کا وعدہ پورا ہوا، اسلام نے ان میں ایسی روح اور خدا کی راہ میں جانبازی کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ انھوں نے اس دور کی سب سے بڑی ایران اور روم کی حکومتوں کا تختہ الٹ دیا اور ان کے ملک کے وارث بنے،

یہ محض خوش عقیدگی نہیں بلکہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کا لازمی نتیجہ ہے، اسلام دین و دنیا کا جامع ہے، اس کی دعا ہی یہ ہے " ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة" حدیث میں ہے کہ "دنیا کا کام اس انہماک سے کرو کہ تم کو ہمیشہ زندہ رہنا ہے اور دین کا کام اس انہماک سے کرو کہ کل ہی مرجانا ہے"، اسلام محکومیت کے لیے آیا ہی نہیں، اس لیے اس میں محکومی کی زندگی کے قوانین ہی نہیں ہیں، اس کا مقصد دنیا میں خدائی قانون کا نفاذ ہے، چنانچہ جیسے ہی اس میں طاقت آئی، اس نے حکومت الٰہیہ کی بنیاد رکھ دی، اس لیے اس نے مذہبی تعلیمات کے ساتھ ان اصول و قوانین کی تعلیم بھی دی ہے جن پر قوموں اور ملتوں کی موت و حیات اور ترقی و تنزل کا دارومدار ہے، چنانچہ کلام مجید میں جس طرح عقائد و عبادات وغیرہ کی تعلیم ہے، اسی طرح اسلامی نصب العین پر اعتقاد جازم، اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد و توکل، اس کے سوا ہر طاقت سے بے خوفی، اسلامی وحدت و اخوت، عدل و مساوات، انفاق فی سبیل اللہ جہاد یعنی دین و ملت کی راہ میں ہر قسم کی جد و جہد اور جانی و مالی قربانی، مادی طاقت کے حصول اور ان ساری چیزوں کی تعلیم اور ان پر عمل کی تاکید ہے، جو اسلام اور ملت اسلامیہ کی سربلندی کے لیے ضروری ہیں، یہ اصول مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ جو قوم بھی اس پر عمل کرے گی وہ دنیا میں کامیاب و سربلند ہوگی، فرق یہ ہے کہ

قرآن مجید نے ان اصولوں کو مذہبی زبان میں ادا کیا ہے، مسلمانوں کا مقصد دین و دنیا دونوں کی سربلندی ہے، اور دوسری قوموں کا مقصد صرف مادی ترقی اور قومی سربلندی،

آج ان میں سے کس اصول پر مسلمانوں کا عمل ہے، بیشک کلمہ گو کی حیثیت سے وہ مسلمان کہلاتے ہیں، لیکن اسلام پر ان کا وہ ایمان نہیں جو ان کو خدا کے سوا دنیا کی ہر طاقت سے بے خوف کردے، ملی مفاد کے بجائے ذاتی اغراض ہیں، سخت کوشی اور جفاکشی کے بجائے راحت طلبی اور تن آسانی ہے، وہ اسکی راہ میں ادنیٰ زحمت بھی برداشت نہیں کر سکتے، ملی وحدت کے بجائے اختلاف اور گروہ بندی اور نسل و وطن کی پرستش ہے، تفریحی اور لایعنی مشاغل میں ہزاروں روپے برباد کر دیتے ہیں، اور قوم و ملت کی راہ میں حقیر رقم صرف کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی، بڑی بڑی شخصیتیں ذاتی جاہ و اقتدار کیلئے بڑے سے بڑے ملی مفاد کو قربان کر دیتی ہیں، جس کا تجربہ آئے دن ہوتا رہتا ہے، ایسی حالت میں جب دنیاوی ترقی کے اسلامی اصولوں پر بھی ان کا عمل نہیں ہے، وہ کس طرح دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں،

مغربی قوموں کی ترقی کا سبب مذہب سے آزادی، عریانی و عیش پرستی، جنسی بے راہ روی اور شراب اور جوا نہیں بلکہ انکی قومی وحدت، ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح، اس کے لیے ایثار و قربانی، اپنے مقصد کے حصول کے لیے جانبازی، علوم و اکتشافات کی راہ میں جانکاہ محنت اور جانی و مالی قربانی ہے، انھوں نے مادی ترقی اور قومی سربلندی کو زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے، اور اس کی راہ میں

کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتیں، اس لیے اس مقصد میں وہ کامیاب ہیں، مسلمانوں میں یہ وصف بھی نہیں، وہ اپنے مذہب و ملت کے لیے ان کی عشر عشیر قربانی نہیں کرسکتے جتنی مغربی قومیں دنیاوی ترقی کے لیے کرتی ہیں، اسی لیے وہ خسرالدنیا والآخرۃ کے مصداق ہیں،

وہ مغربی تہذیب کے اندھے مقلد ہیں، ان کو مغربی قوموں کی خوبیوں کی تقلید کی توفیق نہیں ہوتی، صرف ان کے ظواہر اور ان کے عیوب کے نقال ہیں، چنانچہ ان میں مغرب زدہ تو بکثرت ملیں گے، لیکن ان کے جیسے جانباز، مغربی علوم کے ماہر، سائنسی علوم و اکتشافات کے محقق و موجد مشکل سے نکلیں گے،

اسلام کا اصل مقصد دین و دنیا دونوں میں مسلمانوں کی فلاح تھی، لیکن مغربی قوموں کی طرح انھوں نے بھی حکومت اور مادی ترقی کو نصب العین بنا لیا ہے، اور انہی کے خطوط پر ترقی کرنا چاہتے ہیں، مگر اس کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے اس سے تہی دامن ہیں، اس لیے اس سے بھی محروم ہیں، حکومت و سلطنت، علوم و فنون، سائنس کے ایجادات و اختراعات خیر بھی ہیں اور شر بھی، اس کا دار و مدار نقطۂ نظر کی صحت اور عدم صحت پر ہے، صحیح اور متوازن انسانی ترقی کے لیے، اخلاقی نقطۂ نظر، عارفانہ بصیرت، اعلیٰ انسانی اقدار کا احترام اور مادیت و روحانیت میں توازن ضروری ہے، ورنہ یہ ساری چیزیں انسانیت کے لیے وبال بنجاتی ہیں، جس کا مشاہدہ موجودہ تہذیب و ترقی میں کیا جاسکتا ہے، اگر ایک طرف سائنس کی ایجادات نے انسانیت کی خدمت کی ہے تو دوسری طرف اس کو ہلاکت کے دہانہ پر بھی پہنچا دیا ہے، روحانیت کے فقدان اور اخلاقی قیود

سے آزادی نے مغربی قوموں کو حیوانیت میں غرق کر دیا ہے جس پر وہ تحریکیں شاہد ہیں، جن کا انسانی شرافت کے لیے تصور میں لانا بھی ناگوار ہے، جہاں تک مغربی قوموں کی خوبیوں، ان کے کردار و قوت عمل، علوم و اکتشافات حکومت کے اداروں کی تنظیموں کا تعلق ہے، یقیناً قابل تقلید ہیں، اس کے بغیر آج کسی قوم کا وجود قائم نہیں رہ سکتا، لیکن خیر و شر کے امتیاز کے بغیر ہر شعبہ زندگی میں ان کی اندھی تقلید مسلمانوں کے لیے ملی خودکشی ہے، دوسری قوموں کی اچھی اور مفید چیزوں سے استفادہ ان کی خصوصیت رہی ہے۔ خود رسول اکرمؐ نے بعض غزوات میں ایرانیوں کے طریقۂ جنگ کو اختیار فرمایا اور لباس میں ان کی بعض چیزیں پسند فرمائیں، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکومت کے اداروں کی تنظیم میں ایرانیوں اور رومیوں کے نظام سے فائدہ اٹھایا، دوسری قوموں کے علوم کی تحصیل مسلمانوں نے بنی امیہ ہی کے زمانہ سے شروع کر دی تھی، اور بنی عباس اور بنی امیۂ اندلس کے زمانہ میں سارے علوم و فنون کے امام بن گئے اور ان کو اوج کمال تک پہنچا دیا، انکی مختلف شاخوں میں نئے نئے تجربات و اکتشافات کئے، ہر فن پر سیکڑوں کتابیں لکھیں اور ان فنون کی روشنی یورپ میں پھیلائی، انہی کی ڈالی ہوئی بنیاد پر موجودہ علوم کا عظیم الشان قصر تعمیر ہوا ہے، ہمارا مقصد ان کی علمی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے، صرف یہ دکھانا ہے کہ مسلمانوں نے ہر دور میں دوسری قوموں کی مفید چیزوں سے استفادہ کیا ہے، اس زمانہ میں اس کی اور بھی ضرورت ہے، اس کے بغیر ان کا وجود قائم نہیں رہ سکتا، بلکہ بعض پہلوؤں سے مذہب کی بھی پوری خدمت نہیں ہو سکتی، مگر انھوں نے دوسری قوموں کی جو چیزیں بھی اختیار کیں، اس کی روح میں

پر نہیں گئے، بلکہ اس کو اپنے رنگ میں رنگ کر ان سے دین و ملت کی خدمت کا کام لیا۔ وہ منطق و فلسفہ پڑھتے تھے، مگر بسم اللہ سے شروع کرتے تھے، اور اس سے مذہبی عقائد کے اثبات کا کام لیتے تھے، اور جہاں فلسفہ، مذہب سے متصادم ہوتا، اسکا دلائل سے رد کرتے تھے، اطبا نسخہ کی پیشانی پر ہوالشافی لکھتے تھے، ہیئت یعنی افلاک کے نظام میں ان کو خدا کی عظمت و کبریائی نظر آتی تھی، تہذیب و معاشرت میں بھی ان کا طریقہ یہی تھا۔ آج بھی مسلمانوں کا عمل یہی ہونا چاہیئے، ان کا منصب و مقام دوسروں کی تقلید نہیں، بلکہ ان کی رہنمائی ہے۔

لیکن مغربی تہذیب کا سیلاب اتنا پُرزور ہے اور اس میں نفس کی تسکین کا اتنا سامان ہے کہ ساری قومیں اس میں بہی چلی جا رہی ہیں، اور اپنے عقائد، اعمال، افکار و تصورات، نظام معاشرت ہر چیز کو اسی قالب میں ڈھال دینا چاہتی ہیں، مغربی تہذیب ہی، تہذیب و شائستگی کا معیار بن گئی ہے، دوسرے قوموں کو اس میں اس لیے دشواری نہیں ہوتی کہ انھوں نے مذہب سے آزادی حاصل کر لی ہے، یا اس کو دنیاوی حالات کا تابع بنا دیا ہے یا عبادت گاہوں میں محدود کر دیا ہے، اور وہ بھی صرف چند رسوم تک محدود ہے، زندگی کے معاملات و مسائل سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے، بعض مذاہب محض معاشرتی نظام ہیں، ان کے کوئی بنیادی عقائد نہیں جن کا ماننا ضروری ہو، ان میں بڑی وسعت ہے اور وہ ہر قالب میں ڈھل سکتے ہیں، اس لیے ان کو نیا قالب اختیار کرنے میں دقت نہیں ہوتی، اس کے مقابلہ میں اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، جس سے زندگی کا کوئی پہلو بھی باہر نہیں ہے، وہ دین توحید ہے، اس لیے اپنے

پیروؤں کی پوری زندگی میں ایسی وحدت و یکرنگی پیدا کرنا چاہتا ہے کہ وہ دوسری قوموں میں ممتاز نظر آئیں اور فوج کی طرح اسلامی قوانین کے ایسے پابند ہوں کہ حزب اللہ معلوم ہوں اور دوسری قومیں ان سے سبق حاصل کریں،

لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اور وہ ساری دنیا کے لیے آیا ہے۔ اور مختلف ملکوں اور قوموں کے جغرافی و طبعی حالات اور تہذیب و تمدن میں بڑا اختلاف ہے، جس کا اثر ان کی زندگی پر پڑنا ضروری ہے، پھر ہر زمانہ میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن کی نظیر اسلامی قوانین میں موجود نہیں ہوتی، اس لیے اسلام نے بنیادی وحدت کے ساتھ فروعات میں کثرت کی پوری گنجائش رکھی ہے، عقائد و عبادات وہ بنیادی عناصر ہیں جن میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں، لیکن معاملات اور معاشرات میں تبدیلی کی گنجائش ہے مگر انہیں بھی اُن چیزوں میں جن پر ملت اسلامیہ کے تشخص اور انفرادیت کا دار و مدار ہے اور جن کے متعلق کلام مجید اور احادیث نبویؐ میں صریح احکام ہیں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس سے اس کی انفرادیت اور اس کا ملی وجود ختم ہو جائے گا اور وہ دوسری قوموں میں ضم ہو جائے گی، لیکن معاملات و معاشرات کے دوسرے پہلوؤں میں خود شریعت نے زمانہ کے حالات کی رعایت رکھی ہے، مثلاً جن احکام کی علت بیان کر دی گئی ہے جب وہ علت باقی نہ رہے گی تو حکم بھی باقی نہ رہے گا، اس سے بہت سے مسائل میں تبدیلی ہو جائے گی، اسی طریقہ سے مصالح عامہ اور عرف و عادت کا بھی اعتبار کیا ہے، ان کے لحاظ سے بھی بعض احکام بدل جائیں گے، اور اس پر ہر زمانہ کے علماء و مجتہدین کا عمل رہا ہے، بعض مسائل کا حل خود مذاہب فقہ میں سے کسی نہ کسی

مذہب میں نکل آئے گا۔ معاشرات میں تو معاملات سے بھی زیادہ وسعت ہے، مسلمانوں نے ہر زمانہ میں دوسری قوموں کی ان تہذیبی چیزوں کو جو کسی صریح اسلامی حکم کے خلاف نہیں ہیں، اختیار کیا ہے، اور ان کو اسلامی مزاج کے مطابق بنا لیا، چنانچہ ایرانیوں کی قریب قریب پوری تہذیب اختیار کر لی لیکن اس پر اسلام کی ایسی گہری چھاپ لگا دی کہ وہ اسلامی تہذیب کہلانے لگی، آج بھی مختلف ملکوں کے مسلمانوں میں اسلام کے بنیادی عناصر میں وحدت کے ساتھ تہذیبی کثرت کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے، ان سب کا کلچر تو ایک ہے لیکن تہذیبی نقش و نگار جدا جدا ہیں۔

شریعت کا منشا سختی اور تنگی نہیں بلکہ امت اسلامیہ کی دینی و دنیوی فلاح کے ساتھ اس کی مصلحت اور سہولت ہے، جس سے بھی یہ چیزیں حاصل ہوں، وہ شریعت کے دائرے سے باہر نہیں، لیکن شریعت میں مصلحت اور سہولت کا معیار، خواہش نفس، تعیش، زمانہ کا مذاق و رجحان نہیں ہے کہ ایک چیز نفس کی خواہش کے مطابق ہے۔ یا زمانہ میں چل پڑی ہے، اور اس کو قبول عام حاصل ہے، یا تہذیب جدید میں پسندیدہ ہے، اس لیے اسلامی قانون کو بھی اس کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے، اگر یہ معیار مان لیا جائے تو شریعت کا کوئی حکم اپنی جگہ پر باقی نہ رہے گا، اور محرمات کو بھی جائز کرنا پڑے گا بلکہ صحیح معیار یہ ہے کہ اس کے بغیر حقیقۃً مسلمانوں کو سیاسی اقتصادی یا معاشرتی حیثیت سے نقصان پہنچے یا دشواری میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہو، ایسے مسائل کا حل سب کے نزدیک ضروری ہے، لیکن یہ محض اٹکل پچو نہ ہوگا بلکہ اس کے لیے شریعت نے اصول کلیہ بنا دیے ہیں، ان کی روشنی میں ان کا حل نکالا جا سکتا ہے، اور ہر زمانہ کے علما و مجتہدین ان کا حل نکالتے رہے ہیں،

آج بھی اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے، لیکن اس کا حق صرف ان لوگوں کو ہے جو اسلام کے مزاج شناس ہیں، کتاب وسنت، عمل صحابہؓ ان کے اور ائمہ و مجتہدین کے فتاویٰ اور اجتہادات پر ان کی پوری نظر اور اس میں بصیرت حاصل ہے، ہر شخص اس کا مجاز نہیں ہے، دنیاوی قوانین میں بھی ان کے ماہرین ہی کی رائے معتبر مانی جاتی ہے، اور ان ہی کی رائے ومشورے سے قانون بنتے اور ان میں ترمیم ہوتی ہے، بلکہ دنیا کے سارے معاملات میں ماہرین ہی کی رائے معتبر مانی جاتی ہے، اس لیے جدید مسائل کے حل میں بھی قانون شریعت کے ماہرین ہی کی رائے معتبر ہوگی۔

لیکن اس دور کے مجتہدین کا مقصد مسائل کا اسلامی حل نہیں ہے، بلکہ اسلامی قوانین کو کھینچ تان کر جدید مسائل کے مطابق بنانا ہے، اس لیے وہ عربی جاننے تک کی ضرورت نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک ہر شخص کو اجتہاد کا حق ہے، اس آزادی رائے کا جو انجام ہوگا وہ ظاہر ہے۔

آج کل جو نئے مسائل پیش کیے جاتے ہیں، ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن سے مسلمانوں کا حقیقۃً کوئی نفع و نقصان متعلق نہیں ہے بلکہ وہ تہذیب جدید کی صدائے بازگشت ہیں، تاہم ایسے مسائل کے وجود سے انکار نہیں، ان کے حل کی صحیح شکل یہ ہے کہ علما، اور جدید تعلیم یافتہ دیندار مسلمان مل کر ان مسائل کی ایک فہرست تیار کریں، پھر جو مسئلہ جس فن یا جس شعبہ سے متعلق ہو اسکے ماہرین اور علما، مل کر اس کا حل نکالیں، اب یہ کام زیادہ دشوار نہیں رہ گیا ہے، اس پر بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، مصر وشام وغیرہ میں جدید فقہ اور اصول فقہ پر بعض

اچھی اور مستند کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اسلامی ملکوں نے جدید مسائل کو جس طرح حل کیا ہے، وہ سب نگاہ کے سامنے ہے، گو یہ سب قابل اعتماد نہیں لیکن اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ادارۂ تحقیقات اسلامی پاکستان نے کئی جلدوں میں مجموعۂ قوانین اسلام شائع کیا ہے، اس میں بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا گیا ہے، خود ہندوستان میں جب سے پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ پیدا ہوا ہے، بہت سے مفید اور محققانہ مضامین نکل چکے ہیں، مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی نے اس موضوع پر بہت قابل قدر مضامین اور بعض مفید کتابیں لکھی ہیں، ادارۂ تحقیقات شرعیہ دار العلوم ندوۃ العلماء نے بھی کچھ کام کیا ہے، پرسنل لا پر غور و فکر کیلئے مولانا محمد طیب صاحب نے علماء کا ایک اجتماع کیا تھا، جس کا سلسلہ ابھی جاری ہے، اس لیے اب یہ راہ آسان ہو گئی ہے، ضرورت ہے کہ اس سارے ذخیرہ کو سامنے رکھکر اجتماعی طور سے اس کام کی طرف قدم بڑھایا جائے، ورنہ اگر یہ مسئلہ سیکولر مسلمانوں کی مدد سے حکومت کے ہاتھوں میں چلا گیا تو پھر اسلامی قوانین میں تبدیلی کا دروازہ کھل جائے گا، اور مسلمان زبانی احتجاج کے علاوہ کچھ نہ کر سکیں گے، اور اگر خود مسلمانوں نے اسکو حل کر لیا تو شاید حکومت کو مداخلت کی ضرورت پیش نہ آئے،

تہذیب کی تشکیل جدید

معاشی نظام

از

مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۶)

شادی اور مجبوری کے وقت خادم

شادی و خادم کا ذکر بھی روایتوں میں ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ثلاثۃ کلھم حق علی اللہ عونہ الغازی فی سبیل اللہ والمکاتب الذی یرید الاداء والناکح الذی یرید التعفف،[۱]	تین قسم کے آدمیوں کی مدد اللہ کے ذمہ ہے، (۱) اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا (۲) مکاتب جو کتابت کی رقم ادا کرنا چاہتا ہے، (۳) نکاح کرنے والا جس کا مقصد پاکیزہ زندگی گذارنا ہے،

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ فرمان جاری کیا تھا،

ان انظر کل بکر لیس لہ مال	دیکھو جو جوان شادی کرنا چاہے

---

[۱] ابن ماجہ ابواب العتق باب المکاتب،

فشاء ان تزوجہ فزوجہ[۵۱] اور اس کے پاس مال نہ ہو تو اس کی شادی کرادو،

حضرت عمر بن الخطاب نے ایک شخص کو بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے دیکھ کر وجہ پوچھی معلوم ہوا کہ دایاں ہاتھ جنگ موتہ میں شہید ہوگیا ہے، یہ سن کر آپ دیر تک روتے رہے، اور مختلف کاموں کے بارے میں پوچھتے رہے، کہ تمہارا یہ کام کون کرتا ہے؟ پھر آپ نے اس کو ایک خادم اور دوسری ضرورت کا سامان دینے کا حکم دیا،

فدعا لہ بخادم وامر لہ براحلۃ وطعام ومایصلحہ ومایبنغی لہ[۵۲] ایک خادم دیا، سواری دینے کا حکم دیا، اور ضرورت کے دوسرے سامان دیئے،

غرض حکومت ایک خاص نظم کے تحت (جس سے غیر معتدل زندگی کو فروغ نہ ہو، اور جس کی شکل حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے) مذکورہ ضرورتوں کے انتظام کی ذمہ دار ہے خواہ یہ ضرورتیں خود فراہم کرے، یا رکاوٹیں دور کرکے آسانیاں فراہم کردے،

(ب) معاشی لحاظ سے قوم کو خودکفیل بنانے کا ذکر درج ذیل قسم کی تصریحات میں ہے، قرآن حکیم میں ہے، | وہ جس سے قوم خودکفیل ہو

ھو انشأکم من الارض و استعمرکم فیھا،[۵۳] اللہ نے تمھیں زمین سے پیدا کیا، اور تم سے اس زمین میں آبادی کرائی،

ابوبکر جصاص کہتے ہیں:۔

---

۵۱ کتاب الاموال ص ۲۵۱، ۵۲ کتاب الآثار باب فضائل الصحابہ حدیث ۸۵۲

۵۳ سعد، ہود، رکوع ۶،

فیہ الدلالة علی وجوب العمارة للزراعة والغراس والابنیة[1] — اس آیت میں دلالت ہے کہ کھیتی، باغبانی اور عمارتوں کے ذریعہ زمین کی آبادکاری واجب ہے،

قاضی بیضاوی نے خلافت کی بحث میں لکھا ہے،

وكذالك كل نبي استخلفهم في عمارة الارض وسياسة الناس وتكميل نفوسهم وتنفيذ امره فيهم[2]، — اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو زمین کی آبادکاری، لوگوں کی سیاست، ان کے نفوس کی تکمیل اور اللہ کا حکم نافذ کرنے کے لئے اپنا خلیفہ بنایا ہے،

ایک حدیث قدسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

عمروا بلادی نعاش فیها عبادی[3]، — میرے ملک کو آباد کرو تاکہ میرے بندے اس میں خوشحال زندگی بسر کرسکیں،

ایک اور حدیث میں ہے،

اطلبوا الرزق ولو فی خبایا الارض[4]، — رزق کو زمین کی پہنائیوں میں تلاش کرو،

حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے،

سبت العجوہ بینا سیدی — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

---

[1] احکام القرآن للجصاص ج ۲، ص ۱۰۵ [2] بیضاوی ص ۵۹ [3] و [4] المبسوط للسرخسی ج ۲۳، ص ۱۵،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | مجوسیوں کو برا کہا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ
فنہی عن ذلک وقال لاتسبوھا | اُن کو بُرا نہ کہو انھوں نے اللہ
فانہا عمرت بلاد اللہ فعاش | کے ملک کو آباد کیا جس سے اللہ کے
فیہا عباد اللہ[۵۱] | بندوں نے خوشحال زندگی گذاری،

ماوردی نے حکومت کی ذمہ داری گناتے ہوئے لکھا ہے،

والثالث عمارۃ البلدان | تیسری یہ ہے کہ ذرائع نقل وحمل
باعتماد مصالحہا وتہذیب | شاہراہوں اور دوسری تمام مصلحتوں
سبلہا ومسالکہا،[۵۲] | (زمانہ کے مطابق) کی رعایت کے ساتھ
| ملک کو آباد و خوشحال رکھنا،

آمدی لکھتے ہیں:-

ان ما لا یتم الواجب الا بہ | جس چیز کے بغیر واجب کی تکمیل نہ
واجب مثلہ[۵۳]، | ہو سکے، وہ بھی اسی طرح واجب ہوگی،

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:-

وما لا یتم الواجب الا بہ فھو | جس کے بغیر واجب کی تکمیل نہ ہو، وہ
واجب[۵۴]، | بھی واجب ہے،

تنظیمات کے بارے میں حکومت کے اختیارات وسیع ہیں | مذکورہ دونوں قسم کے انتظام میں حکومت کو اختیار ہے کہ جدید تنظیم قائم کرے، یا موجودہ تنظیم سے کام چلائے، اپنی ماتحتی میں تنظیم قائم کرے

---

[۵۱] ادب الدین والدنیا ص ۲۰۸ [۵۲] الاحکام السلطانیہ للماوردی [۵۳] اصول الاحکام ج ۱ ص ۱۵۸، [۵۴] الحراسۃ فی السیاسۃ الالہیہ ص ۱۶،

لوگوں کو آزادانہ قائم کرنے کا حکم دے لیکن بنیادی حیثیت سے دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے،

تنظیم مقابلۃً مفید تر ہو | (۱) تنظیم مقابلۃً مفید تر ہو کہ اس کے بغیر بقار کا جواز نہ حاصل ہو سکے گا،

(۲) اس میں نفع ونقصان کا مدار اخلاقی ہو، اس کے بغیر مفاسد کا دروازہ نہ بند ہو سکے گا

قرآن حکیم میں مقابلۃً مفید تر کا ثبوت درج ذیل ہے،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالعدلِ وَ الاحسان[۱]	بے شک اللہ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے،

عدل و احسان نہایت وسیع اور جامع لفظ ہیں، اُن کے ذریعہ مصالح کے حصول اور مضرت کے دفعیہ پر ابھارا گیا ہے جس سے حالات و زمانہ کی رعایت سے مفید تر تنظیم کو اختیار کرنے کا ثبوت ملتا ہے[۲]

دوسری جگہ ہے،

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ[۳]	اے پیغمبرؐ ہم نے آپ کو محض اس لئے بھیجا کہ رحمتِ عامہ کا ظہور ہو،

"رحمتِ عامہ" میں حالات و زمانہ کی رعایت سے مفید تر تنظیم بھی داخل ہے، کیونکہ اگر کسی ایک طریق کار پر اکتفا کیا گیا، تو لوگ تنگی میں مبتلا ہوں گے، جس سے رحمت کے منافی بات لازم آئے گی[۴]

نفع ونقصان کا مدار اخلاقی ہو | قرآن حکیم میں نفع ونقصان کے مدار کا ثبوت یہ ہے،

---

[۱] سورۂ نحل رکوع ۱۳، [۲] تعلیل الاحکام ص ۲۰۰، [۳] سورہ انبیار رکوع ، [۴] تعلیل الاحکام ص ۲۸۷،

یسئلونک عن الخمر والمیسر	لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں،
قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس	آپ کہدیجئے ان دونوں میں بڑا
واثمھما اکبر من نفعھما[1]،	گناہ ہے، اور لوگوں کے لئے فائدے

[illegible]

کلام عرب میں "اثم" اخلاقی وروحانی نقصان اور ضرر، مادی وجسمانی نقصان کے لئے استعمال ہوتا ہے، اسی لئے آیت میں ضرر کے بجائے لفظ اثم لایا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جواز وعدم جواز یا حلال وحرام کے لئے مدار اخلاقی وروحانی نقصان ہے، نہ کہ مادی وجسمانی نقصان،

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ خود قرآن مجید میں ہے کہ انھوں نے قحط کے زمانہ میں غذائی اشیاء محفوظ کرکے بقدر ضرورت لوگوں میں تقسیم کرنے کا نظم قائم کیا تھا[2]، جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کو حالات کی رعایت سے مفید تر راہ اختیار کرنے کا حکم ہے،

حکومت کی ماتحتی میں تنظیم ہو | عہد نبوی میں اس کے لئے کوئی باقاعدہ تنظیم نہ تھی، بلکہ جو آمدنی آتی تھی آپ اسکو اسی وقت مستحقین میں تقسیم فرما دیتے تھے، البتہ حضرت ابو ہریرہؓ کو مامور کیا تھا کہ جو ننگا بھوکا مسلمان آتا، وہ اس کو آپ کی خدمت میں لے آتے، آپ اس کے کھانے پینے کا انتظام فرماتے[3]،

حضرت ابو بکرؓ نے بھی اپنے زمانہ میں یہی طریقہ رکھا جو آمدنی ہوتی تھی، اس کو تقسیم فرما دیتے، چنانچہ پہلے سال کی آمدنی میں بلا تفریق مرد عورت، بوڑھے بچے، اور آزاد و غلام دس دس درہم تقسیم کئے، دوسرے سال کی آمدنی میں بیس بیس درہم، (طبقات ابن سعد قسم اول جلد ۲)

---

[1] بقرہ - ۲۷ [2] یوسف [3] السنن الکبری کتاب الوکالۃ باب التوکیل فی المال وطلب الحقوق نیز التراتیب الاداریہ جلد ۲

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں باقاعدہ بیت المال قائم کیا جس کے مصارف میں بلا امتیاز مسلم و غیر مسلم سارے غربا و مساکین کی امداد و دستگیری بھی تھی، اس کی تفصیل حدیث و فقہ کی کتابوں میں ہے، آپ کا عام حکم تھا کہ

"مملکت میں ہر تنگدست کو دیا جائے، ہر مدیون کا دین ادا کیا جائے، ہر کمزور کی مدد کی جائے، ہر ظالم کو ظلم سے روکا جائے، ہر ننگے کو کپڑا پہنایا جائے، وغیرہ" [1]

حضرت معاویہؓ نے سرکاری سطح پر کفالت عامہ کے لئے افسر اعلیٰ کا تقرر کیا تھا،

فجعل معاویۃ رجلا علی حوائج الناس [2]	حضرت معاویہؓ نے لوگوں کی ضرورت پر ایک آدمی مقرر کیا،

آزاد تنظیم جو| آزاد تنظیم کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانۂ جاہلیت کی اس قسم کی آزاد تنظیم عاقلہ وغیرہ کو برقرار رکھا، اور عوام کو بھی کفالت کا ذمہ دار ٹھہرایا جس سے جدید تنظیم قائم کرنے کی طرف اشارہ ملتا ہے،

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

من کان معہ فضل ظھر	جس شخص کے پاس سواری، اور
فلیعد علی من لا ظھر لہ	دوسرے سامان ضرورت سے زائد
ومن کان لہ فضل من زاد	ہوں، وہ اس شخص کو دیدے جس
فلیعد بہ علی من لا زاد لہٗ	کے پاس یہ سامان نہ ہوں جس کے

---

[1] شرح شرعۃ الاسلام سید علی زادہ، [2] ترمذی ابواب الاحکام باب ماجاء فی امام الرعیۃ،

قال فذكر من اصناف المال ما ذكر حتى رائينا انه لا حق لاحد منا في فضل،

پاس کھانے پینے کی چیزیں ضرورت سے زائد ہوں، وہ زائد چیزیں مفلس و نادار کو دیدے، ابوسعید خدریؓ کا قول ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح مال کی مختلف قسموں کا ذکر کرکے زائد مال دوسروں کو دینے کی تاکید فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے سمجھا کہ زائد مال میں ہمارا کوئی حق نہیں ہے،

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر فرمایا:-

انّ اللّٰہ تعالیٰ افرض على الاغنياء في اموالهم بقدر ما يكفي فقرائهم فانْ جاعوا اعرُوا وجهدوا فبمنع الاغنياء حق على الله انْ يحاسبهم يوم القيمة و يعذبهم عليه.

اللہ تعالیٰ نے بقدر کفایت غرباء کی ضرورت پوری کرنا مالداروں پر فرض کیا ہے اگر وہ بھوکے ننگے یا اور کسی معاشی مصیبت میں مبتلا ہوں، تو یہ مالداروں کے نہ دینے کی وجہ سے ہے، اللہ کا حق ہے کہ قیامت کے دن ان سے حساب لے اور ان کو سزا دے،

یہ احکام عام ہیں ان میں انفرادی صدقہ وخیرات اور اس کی تنظیم دونوں شامل ہیں،

تشکیل میں انفرادی و اجتماعی ملکیت دونوں کی اجازت ہے۔

بدقسمتی سے اس زمانہ میں ذرائع پیداوار کی تنظیم میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلۂ ملکیت کو دی گئی ہے، جس کے غلط تصور نے بڑے بڑے نتائج پیدا کیے، آج بھی اس کی وجہ سے بہت سے ملکوں میں ایک طبقہ میں محنت و مشقت کے بغیر دولت و سامان عیش کی انتہائی فراوانی ہے اور دوسرے طبقہ میں محنت و مشقت کے باوجود فلاکت و نکبت ہے، ایک طرف ذرائع پیداوار پر چند افراد کا قبضہ ہے، اور دوسری طرف ملک معمولی معمولی چیزوں میں دوسروں کا محتاج ہے۔ ایسی حالت میں تشکیل جدید میں نہ ملکیت کی بحث کی کوئی اہمیت ہوگی اور نہ تنظیم کو (انفرادی یا اجتماعی) میں محدود کرکے تنگی پیدا کی جائیگی بلکہ انفرادی و اجتماعی دونوں کی اجازت ہوگی اور سردست حالات کے لحاظ سے ذرائع پیداوار درج ذیل حصوں میں تقسیم کر دیے جائیں گے،

ذرائع پیداوار کی تقسیم

(۱) وہ جن پر اجتماعی ملکیت ہوگی یعنی حکومت براہ راست انتظام کریگی،

(۲) وہ جن پر بتدریج اجتماعی ملکیت ہوگی،

(۳) وہ جن پر انفرادی ملکیت ہوگی،

پہلے حصہ کی تفصیل

پہلے حصہ میں حکومت کی نامزد کردہ بنیادی صنعتیں اور اس قسم کی چیزیں شامل ہوں گی:-

(الف) فولاد و لوہا۔ اس میں کان کنی، مشینی اوزار اور ڈھالنے کے لیے بڑی بڑی مشینیں،

(ب) اسلحہ جات۔ اس میں دفاع سے متعلق صنعتیں ہیں،

(ج) برقی پلانٹ۔ اس میں بجلی پیدا کرنے کی طاقت اور اس سے متعلق صنعتیں ہیں،

(د) اٹامک انرجی (ایٹمی طاقت)

(س) کوئلہ کی کان۔ تارکول، پٹرول اور گیس کی صنعت

(ش) خام میگنیز

(ص) جواہرات۔ سونا، چاندی، تانبا، جستہ، سیسہ،

(ط) ہوائی، بحری اور ریلوے ٹرانسپورٹ

(ع) ٹیلیفون، ٹیلیگراف اور وائرلیس

(ف) کپڑوں کے مل، بڑے کارخانے اور ڈاک خانے

دوسرے حصہ کی تفصیل | (۲) دوسرے حصہ میں مثلاً یہ چیزیں شامل ہوں گی

(الف) المونیم اور ٹین کی صنعت

(ب) کوئلہ سے کاربن بنانے کی صنعت

(ج) چھوٹے اوزار کے لیے چھوٹی مشینیں

(د) رنگ سازی و پلاسٹک کی چیزیں

(س) انگریزی دوائیں اور جراثیم کش دوائیں

(س) روڈ ٹرانسپورٹ

(ص) سمنٹ کے کارخانے

(ط) کاغذ کے کارخانے

(ع) چائے کے باغات اور اس سے متعلق چیزیں

(ف) ان کے علاوہ اور چیزیں جو ان میں شامل ہونے کے لائق ہوں،

تیسرے حصہ کی تفصیل | (۳) تیسرے حصہ میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتیں اور گھریلو صنعتیں شامل ہیں

(الف) چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے نجی و عوامی کمپنیاں قائم ہوں گی، یا

وہ انفرادی طور پر انجام پائیں گی، ان کے لیے قواعد وضوابط شریعت کی روشنی میں مقرر ہوں گے اور حکومت (بشرط مصلحت) ان کے لیے سرمایہ کی ایک حد (مثلاً دس بیس لاکھ وغیرہ) مقرر کرنے کی بھی مجاز ہوگی جس کے بعد وہ انفرادی سے نکل کر اجتماعی میں آسکتی ہیں،

(ب) گھریلو صنعتوں کے لیے سرمایہ کی حد بندی نہ ہوگی، ان میں گھر کے ہی اکثر افراد کام کرتے ہیں، باہر کے مزدوروں سے کام لیا جاتا ہے، اس بنا پر نہ کام کرنے کے اوقات کا تعین ہوتا ہے اور نہ کام کی باقاعدہ تنظیم ہوتی ہے۔ حکومت چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے لیے قرض دیگی اور ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کرے گی۔

اس طرح ایک طرف اجتماعیت کا تجربہ ہوگا تو دوسری طرف افراد کو کاربار کا موقع ملتا رہے گا، ان میں نہ کوئی آخری شکل ہوگی، اور نہ کسی شکل کو ذاتی وقار واقتدار کے لیے باقی رکھا جائے گا کہ وہ سرچشمۂ رزق پر قابض ہو کر اللہ کی مخلوق کو غلامی پر مجبور کر سکے،

جدید تشکیل میں ملکیت کے صحیح تصور پر عمل درآمد ہوگا

تشکیل جدید میں انفرادی و اجتماعی بحثوں کے بجائے ملکیت کے صحیح تصور پر عمل درآمد ہوگا اور تعلیم وتربیت پر زور دیا جائیگا، صحیح تصور یہ ہے کہ ہر شی کا حقیقی مالک اللہ ہے اور انسان بحیثیت "امین" اس پر قابض ہے، یعنی ذرائع پیداوار افراد کے سپرد ہوں یا جماعتوں کے، ان سب کی حیثیت محض "امین" کی ہے، جس کو مالک کے مقررہ قانون کے مطابق استعمال و انتفاع کا حق حاصل ہے، اور اسی وقت تک یہ حق حاصل رہے گا جب تک وہ حصول مقصد (خلق خدا کی خوشحالی و فارغ البالی) میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں اور ایسی فضا

پیدا کرنے میں مددگار بنیں، جو عام مخلوق کی خوشحالی و ترقی کی ضامن ہو،

تشکیل میں اسی حق استعمال و انتفاع کو حقِ ملکیت سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ آراضی کے بارے میں شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں:

وحق الملک فی الارض انہ احق بالانتفاع من غیرہ[1]	حق ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنے غیر کے مقابلہ میں زیادہ انتفاع کا حق حاصل ہو،

تعلیم و تربیت کے ذریعہ اخلاقی فضا اور قانون و اخلاق میں ربط پیدا کیا جائے گا۔ | اخلاقی فضا اور قانون و اخلاق میں باہمی ربط پیدا کیا جائیگا

اسکے بغیر مذکورہ تنظیمات سے خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا، اگر محض تنظیمی تبدیلی کے ذریعہ معاشی مسائل حل بھی ہو گئے تو اخلاقی اصلاح نہ ہونے سے دوسرے بہت سے نفسیاتی و اجتماعی مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے جن پر قابو پانا سخت مشکل ہوگا،

مذکورۂ بالا اشیاء کی فہرست نہ آخری ہے اور نہ کوئی فہرست آخری ہو سکتی ہے ۔ حالات کے لحاظ سے حکومت کو نئی فہرست بنانے اور پرانی فہرست میں رد و بدل کرنے کا پورا اختیار ہے، اسی طرح چند معدنیات کو چھوڑکر انفرادی کو اجتماعی اور اجتماعی کو انفرادی میں تبدیل کرنے کا بھی پورا اختیار رہے ۔ البتہ حکومت و عوام دونوں کے ہر اقدام میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا تصور ضروری ہے اور حقوق سے زیادہ فرائض پر زور ہوگا،

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ

دین رحمت

حافظ امان اللہ بنارسی

از مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

دہلی کو روانگی اور واپسی پر شیخ خوب اللہ الہ آبادی سے بیعت و ارادت

سلطان عالمگیر کی حکومت کا پچاس سالہ دور (۱۰۶۸ھ سے ۱۱۱۸ھ تک) پورے ملک کے لیے امن و امان، عیش و رفاہیت کا دور تھا، خاص طور سے دیار پورب شاہی توجہات و عنایات سے ارباب علم و فضل کے حق میں گلزار تھا، اسی زمانہ میں حافظ صاحب نے نشو و نما پائی، خود ان کا گھر بھی گلزار بنا ہوا تھا، اس پر عالمگیر کی خصوصی توجہ تھی، مگر سلطان کی آنکھ بند ہوتے ہی ایسا انتشار پیدا ہوا کہ پورے ملک میں ابتری پھیل گئی، دیار پورب کی علمی و دینی اور روحانی محفلیں اجڑنے لگیں، اور علماء و فضلاء اور مشائخ سکون و اطمینان کی نعمت سے محروم ہو کر مدرسوں اور خانقاہوں سے نکلنے پر مجبور ہو گئے، ۱۱۳۱ھ میں محمد شاہ بادشاہ ہوا، اسی سال اس نے محمد امین نیشاپوری (برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری) کو اودھ کا حاکم بنایا، جس نے یہاں آتے ہی ایک طوفان برپا کر دیا، قدیم خانقاہوں اور مدرسوں اور علماء و مشائخ کی جاگیریں ضبط کر لیں، ان کو طرح طرح سے پریشان کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسے اور خانقاہیں اجڑنے لگیں اور علماء و مشائخ پریشان ہو کر ادھر اُدھر رخ کرنے لگے، آزاد نے مآثر الکرام میں ملا نظام الدین فرنگی محلی کے تذکرہ میں لکھا ہے:

تا عہد دولت ۱۱۳۱ھ ہنگامۂ علم و علماء در ایں گل زمین گرمی داشت، تا آنکہ برہان الملک سعادت خان نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبۂ اودھ شد، و اکثر بلاد صوبہ الہ آباد نیز مثل دار الخیر جونپور و بنارس و غازیپور و کڑا مانک پور و کوڑہ جہان آباد وغیرہ ضمیمۂ حکومت گردید، و وظائف و سیورغالات خانوادہ ہائے قدیم جدید یکقلم ضبط شد، و کار شرفاء و نجباء بہ پریشانی کشید، و اضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم باز داشتہ در پیشۂ سپاہ گری انداخت و رواج تدریس و تحصیل بآن درجہ نماند مدارسے کہ از عہد قدیم معدن علم و فضل بود یکقلم خراب افتاد، و انجمن ہائے ارباب کمال بیشتر برہم خورد، انا للہ و انا الیہ راجعون[1]

۱۱۳۱ھ تک اس سرزمین میں علم و علماء کی سرگرمی باقی رہی، یہانتک کہ محمد شاہ کے آغاز جلوس میں برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری صوبہ اودھ کا حاکم ہوا، اور صوبہ الہ آباد، جونپور، بنارس، غازیپور، کڑا مانک پور، کوڑا جہان آباد وغیرہ کے شہروں کو اپنی سلطنت میں شامل کرکے جدید و قدیم علمی اور دینی خانوادوں کے وظائف یکقلم ضبط کرلیے، جس سے شرفاء و نجباء کو سخت پریشانی برداشت کرنی پڑی اور معاش و معیشت کی پریشانی نے وہاں کے لوگوں کو علم سے باز رکھ کر سپہ گری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا، اور پہلے کی طرح درس و تدریس کا رواج باقی نہیں رہا، جو مدرسے قدیم زمانہ سے علم و فضل کے معدن تھے، یکقلم ویران ہوگئے اور ارباب کمال کی اکثر انجمنیں برباد ہوگئیں۔

[1] ماثر الکرام ج۱ ص۲۲۲

جونپور، الہ آباد، غازیپور، کڑا مانک پور اور کوڑہ جہان آباد وغیرہ کی طرح بنارس کے اربابِ فضل وکمال بھی محمد امین نیشاپوری حاکم اودھ کے ظلم کا شکار ہوکر جاگیروں اور وظائف سے محروم ہوگئے، حافظ صاحب بھی اس کا نشانہ بنے، انکے خاندان کو جو مراعات حاصل تھیں وہ ختم کردی گئیں، اس لیے ان کو آخری عمر میں محمد شاہ کے پاس دہلی جانا پڑا، مگر یہ نہیں معلوم کہ دہلی میں ان کی شنوائی اور وظائف وجاگیر کی واپسی ہوئی یا نہیں ہوئی، البتہ واپسی پر الہ آباد میں حضرت شیخ خوب اللہ الہ آبادی سے بیعت وارادت کا شرف حاصل ہوا، جو اس دورِ فتن وپریشانی میں سکونِ قلب کا باعث بنا، مآثر الکرام میں مجمل طریقہ پر صرف اتنی تصریح ملتی ہے:

در آخر ایام حیات از شاہجہان آباد وارد الہ آباد شد، واز خدمت والائے شیخ محمد یحیی المدعو بہ شیخ خوب اللہ قدس سرہ استفادہ طریقۂ نقشبندیہ نمود وبآں مشغولی ورزید[1]

حافظ صاحب اپنی زندگی کے آخر ایام میں شاہجہان آباد (دہلی) سے الہ آباد وارد ہوئے، اور شیخ محمد یحییٰ المعروف بہ شیخ خوب اللہ قدس سرہ سے طریقہ نقشبندیہ کا استفادہ کرکے اس میں مشغول ہوگئے۔

سلوک ومعرفت کی راہ بڑی پرسکون ہوتی ہے، اس راہ کے راہی غمِ زمانہ سے آزاد ہوکر عافیت کی زندگی بسر کرتے ہیں، مگر جہاں یہ چیز اشخاص وافراد کے حق میں نعمت ہے، اقوام وملل کے لیے نہایت پرخطر ہے، اگر پوری قوم اجتماعی طور سے اس راہ پر چل پڑے تو سکون کی تلاش تباہی کا ذریعہ بن جائے گی،

حافظ صاحب کا سفرِ دہلی انتقال سے دو تین سال پہلے ہوا تھا، اس کے بعد

---

[1] مآثر الکرام ج۱ ص ۲۱۲

انھوں نے درس وتدریس سے علٰحدہ ہوکر سلوک ومعرفت کی راہ اختیار کرلی، غالباً دہلی میں ان کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، اس لیے تعلیم وتدریس کے ہنگامہ سے علٰحدگی اختیار کرکے، روحانی سکون واطمینان کی قلیل مدت میں طریقۂ نقشبندیہ کے اکابر مشائخ میں شمار ہونے لگے۔

شاہ خوب اللہ الہ آبادی کا اصل نام محمد یحییٰ ہے، وہ شیخ محمد افضل الہ آبادی ۱۱۲۴ھ کے برادر زادہ، داماد اور مرید وخلیفہ ہیں، اصل وطن سید پور ضلع غازیپور تھا، شاہ خوب اللہ تیرہ سال کی عمر میں علوم متعارفہ کی تحصیل سے فارغ ہوگئے تھے، علم شریعت وطریقت کے بحر زخار تھے، پوری عمر اپنے استاذ ومرشد کی تعلیم و تربیت کے مطابق بسر کی، رشد وہدایت کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی سلسلہ جاری رکھا، ۱۱ رجمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ میں الہ آباد میں وفات پائی، حافظ صاحب نے دہلی سے واپسی پر ان سے بیعت کی اور طریقۂ نقشبندیہ کے مطابق ریاضت کرکے چند ہی دنوں میں اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئے، اور زندگی کے باقی دو تین سال اسی روحانی سکون میں بسر کیے، ان کے روحانی ارتقاء میں خود ان کے خاندانی مذاق اور گھریلو تعلیم وتربیت کو بڑا دخل تھا، ان کے والد شیخ محمد رشید جونپوری اور ان کے بیٹے شیخ محمد ارشد جونپوری کے روحانی فیض سے "غلام درگہ پیران چشتی" تھے، اور مفتی وفقیہ اور قاضی کے لباس میں ایک صوفی صافی کی زندگی بسر کرتے تھے، حافظ صاحب اپنے والد کے روحانی فیض سے بہرہ یاب تھے، لیکن انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ دینی علوم کی تعلیم اور علماء کے انداز پر گذارا، آخر میں اس ہیزم خشک میں شاہ خوب اللہ کی ایک نگاہ نے آگ لگادی۔

مرشد کی نگاہ اور مسترشد کی استعداد نے تھوڑے ہی دنوں میں نسبت نقشبندیہ کے مخصوص اثرات بہ کمال و تمام ظاہر ہوگئے۔ ماثر الکرام میں ہے:

بعد ظہور اثر معہود ایں طائفہ علیہ حضرت شیخ فرمودند کہ ظاہراً بعد اجتماعے کہ سید سند را با خواجہ علاء الدین عطار قدس سرہ اتفاق افتاد ایں قسم اجتماع نشدہ باشد ولکن شما از سید درین طریق راجح اید، و من در جنب خواجہ رتبہ ندارم	حافظ صاحب پر حضرات نقشبندیہ کے مخصوص اثر کے ظہور کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا کہ سید سند اور خواجہ علاء الدین عطار کے باہمی اجتماع کے بعد بظاہر میرے تمہارے درمیان اس قسم کا یہ دوسرا اجتماع ہے مگر تم اس معاملہ میں سید سند سے سبقت لے گئے، اور خواجہ علاء الدین عطار کے مقابلہ میں کوئی مقام و رتبہ نہیں رکھتا،

یہ سنکر حافظ صاحب نے عرض کیا

حافظ امان اللہ تواضع کرد کہ شما قدم بہ قدم خواجہ اید و من با سید مساسے ندارم[1]	حضرت والا خواجہ علاء الدین کے ہم پلہ ہیں، البتہ میں سید سے کوئی نسبت نہیں رکھتا،

مرشد و مرید کی اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب اگرچہ اس بزم میں بہت دیر سے آئے مگر بہت جلد صف اول میں پہنچ گئے، اور شیخ محب اللہ الہ آبادی ۱۰۵۸ھ کے رسالہ تسویہ کی شرح لکھی، جو ایک زمانہ میں زبردست ہنگامہ

[1] ماثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۳

کا باعث تھا، اور جس کی موافقت اور مخالفت میں کتابیں لکھی گئی تھیں، میر سید محمد ترمذی ۱۰۴۰ھ، شیخ محمد افضل الہ آبادی ۱۱۲۴ھ اور شیخ محمد بن عیسیٰ ہرگامی اکبرآبادی ۱۰۳۱ھ وغیرہ نے بھی اس کی شرحیں لکھیں، شیخ محب اللہ الہ آبادی مشاہیر علمائے صوفیہ میں ہیں، حضرت شیخ ابوسعید گنگوہی کے خلیفہ تھے، فن تصوف میں ان کی تحقیقات و تدقیقات مرتبۂ اجتہاد کو پہنچی تھیں رجب ۱۰۵۸ھ میں الہ آباد میں فوت ہوئے تصوف کے اسرار و حکم پر ان کی متعدد کتابیں ہیں، جن میں سے ایک رسالہ تسویہ بھی ہے، مولوی عبد الحق نے مآثر الکرام کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ رسالہ تسویہ میں علاوہ اور امور کے جبرئیل و وحی کی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"جبرئیل محمد در ذات محمد بود صلی اللہ علیہ وسلم، و ہمچنیں جبرئیل ہر پیغمبرے در ذات وے بود، و آں قوت باطنی ایشاں بود کہ در غلبہ آں قوت وحی بر ایشاں نازل می گردید، و لہذا جبرئیل با ہر پیغمبرے بزبان وے سخن گفتہ"[1]

اور آزاد نے میر سید محمد ترمذی کالپوی ۱۰۴۰ھ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے وارد وات کے نام سے رسالہ تسویہ کی شرح لکھی تھی، اس زمانہ کے علمائے ظاہر نے شیخ محب اللہ الہ آبادی کے رسالہ تسویہ پر ہنگامہ برپا کرکے سلطان عالمگیر کو خبر پہنچائی کہ اس رسالہ میں شریعت کے خلاف باتیں ہیں، سلطان نے حکم دیا کہ پورے ملک کے درویش اور مشائخ کو معسکر سلطانی میں حاضر کرکے سب سے اس کے متعلق سوال کیا جائے، اس موقع پر شیخ محمد افضل الہ آبادی کو میر سید محمد ترمذی کی کتاب وارد وات کے بارے میں تشویش ہوئی کہ غلبۂ حال میں یہ کتاب سپرد قلم ہوگئی ہے، اور رسالہ تسویہ کے بارے میں بہت

زیادہ اشتعال پھیلا ہوا ہے، اس لیے واردات کو پانی میں ڈال دیا جائے، چنانچہ ایسا کیا گیا، مگر کتاب محفوظ رہی، اور یہ نسخہ شیخ خوب اللہ (محمد یحییٰ) الہ آبادی کے پاس محفوظ رہا، آزاد نے لکھا ہے:-

شیخ محمد یحییٰ الہ آبادی قدس سرہ درکتاب اعلام الانام می گوید من ایں رسالہ بعینہا با رسائل دیگر از تصانیف حضرت سید میر قدس سرہ یکجا جلد کردہ
حرز جان و ایمان دارم"[1]

علمائے شریعت کی طرح سلطان عالمگیر نے اس رسالہ پر شدید نکیر کی اور صوفیہ و مشائخ کے محضر میں شیخ محب اللہ کے مریدوں سے کہا کہ اس رسالہ کے مندرجات کو احکام شریعت کے مطابق کرکے بتاؤ، ورنہ شیخ کی بیعت و ارادت سے توبہ کرو۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ تسویہ کس قدر مختلف فیہ رسالہ تھا، اور اس کے مباحث بظاہر فلسفیانہ افکار و نظریات پر مشتمل تھے، اس کی شرح کے لیے قلم اٹھانا اور اس کے معتویات کو شریعت کے مطابق ثابت کرنا باطنی اسرار و حکم کے ماہرین ہی کا کام ہو سکتا ہے، اس لیے حافظ صاحب کی شرح تسویہ علوم باطنی میں ان کے تبحر کی بین دلیل ہے۔

تصانیف حافظ صاحب علوم مروجہ و فنون متعارفہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی شغل رکھتے تھے، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، تصوف، کلام اور فلسفہ وغیرہ پر ان کی متعدد معیاری کتابیں ہیں۔

---

[1] مقدمہ ماثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲ و ۲۱۳

(۱) المختصر اصول فقہ میں عربی زبان میں نہایت جامع متن ہے، (۲) المحکم رسالہ مختصر کی شرح ہے، محکم الاصول کا قلمی نسخہ حضرت مفتی محمد ابراہیم صاحب بنارسی کے کتب خانہ میں موجود ہے، مگر اس کی موجودہ بے ترتیبی کی وجہ سے اس کی زیارت نہیں ہوسکی، (۳) شرح رسالہ تسویہ شیخ محب اللہ الہ آبادی، (۴) ملا محمود جونپوری اور میر باقر استرآبادی کے درمیان حدوث وقدم کے مباحث پر محاکمہ، (۵) حاشیہ تفسیر بیضاوی، (۶) حاشیہ حکمۃ العین، (۷) حاشیہ عضدی، (۸) حاشیہ بر حاشیہ قدیمہ (۹) حاشیہ تلویح، (۱۰) حاشیہ شرح مواقف (۱۱) حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی، (۱۲) حاشیہ رشیدیہ شیخ محمد رشید جونپوری، اس میں جابجا ابحاث باقیہ کا رد بھی ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ ملا محمود جونپوری اور شیخ محمد رشید جونپوری کے استاد ملا محمد افضل استاد الملک نے ایک مرتبہ رسالہ شریفیہ کی تعریف کی، شیخ محمد رشید نے ان کے ہاتھ سے لیکر آٹھ دن میں اس کی بہترین شرح لکھ دی جس سے ملا محمد افضل بہت خوش ہوئے، اس سے ملا محمود کو انقباض ہوا، اور انھوں نے اپنے ایک شاگرد ملا محمد باقی کو حکم دیا کہ تم رسالہ شریفیہ کی شرح لکھو، جس میں شیخ محمد رشید کی شرح کی بھی شرح ہو، چنانچہ ملا محمد باقی نے چند دن میں شریفیہ کی شرح آداب باقیہ کے نام سے لکھکر اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کردی اور اسی کے ساتھ شیخ محمد رشید کی شرح کی ایک شرح ابحاث باقیہ کے نام سے لکھی، جس میں جگہ جگہ شیخ محمد رشید پر اعتراضات کیے، حافظ صاحب نے شیخ محمد رشید کی فن مناظرہ کی کتاب رشیدیہ کی شرح میں ملا محمد باقی کی کتاب ابحاث باقیہ کے ان ہی اعتراضات کا رد کیا ہے،[1] افسوس ہے کہ حافظ صاحب کی ان تصانیف میں سے

---

[1] تجلی نور ج ۴ ص ۹۶،

کوئی کتاب راقم کی نظر سے نہیں گذر سکی کہ اس کا تفصیلی تعارف کرایا جا سکے، انکی سب سے آخری تصنیف شرح تسویہ ہے،

وفات | شیخ خوب اللہ الہ آبادی سے بیعت کے بعد دو تین سال تک ترک و تجرید کی زندگی بسر کر کے ۱۱۳۳ھ میں بنارس میں فوت ہوئے، آثر الکرام میں ہے

عنقریب ہماں ایام در بنارس کہ	قریب قریب ان ہی ایام میں اپنی
مسقط الراس اوست انتقال کرد،	جائے پیدائش بنارس میں ۱۱۳۳ھ
وکان ذلک فی سنۃ ثلث وثلثین	میں فوت ہوئے، اور اپنی جگہ
ومائۃ والف، وہمانجا مدفون گردید[۱]	دفن کیے گئے،

تمام تذکرہ نویسوں نے حافظ صاحب کا سنہ وفات اور مدفن یہی بتایا ہے، لیکن کسی میں مہینہ اور تاریخ کی صراحت نہیں ہے، اسی روضہ میں ان کا بھی مزار ہے جسے انھوں نے ۱۰۹۶ھ میں اپنے والد وغیرہ کے لیے تعمیر کرایا تھا، جو اس وقت علوی پورہ میں سٹی اسٹیشن کے جنوب میں سڑک کے اس پار واقع ہے، اسی کے پاس یتیم خانہ مظہر العلوم کی عمارت ہے، مقبرہ کے کتبہ میں یہ اشعار ہیں، جو حافظ امان اللہ بنارسی کے والد مفتی نور اللہ کے بارے میں ہیں، ان کے مادۂ تاریخ سے ۱۱۰۴ھ نکلتا ہے:۔

نماند کسے دائم اندر جہاں	ندارد بنا گنبد آسماں
بغلطند زیر زمیں مہوشاں	بخاک اندر آمیز کیخسرواں
گدا و شہ و قانع تاجراں	گذشتند چوں برق در یک زماں

---

[۱] آثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۳

بسا بادشاہ و سکندر نشاں — نشانش نماند دریں کارواں

درحقیقت دل است روضۂ دوست

ہر کہ صافش گرفت دوست ازاوست

دریں دہر ہر کس کہ آمد رواں — بدنیا کجا یافت آرام جاں

چہ شد آں سلیمان و نوشیرواں — چہ جمشید در آخر گلستاں

نہ آں شہ سواران لشکرکشاں — نہ آثار ترکش، نہ تیر و کماں

روضۂ چشم کن صفا اے دوست

اوست در ہر مقام خلق از دوست

کجا خاک و کو باد و آب رواں — کجا آتش گرمی دیگراں

نہ افلاک پائندہ و سائباں — مگر ذات حق "کل یوم بشاں"

صاف کن روضۂ دل خود دوست

صوفی ز روضۂ دل خود اوست

بنا کرد حافظ دریں بوستاں — ز بہر خدا مرقد دوستاں

مورخ نہ امداد غیب اللساں — نکو یافتہ "روضۂ طالباں"
سنہ ۱۱۵۵ھ

چشم بکشا در آب روضۂ دوست

ہر چہ بینی بداں کہ مظہر اوست ہے،

ان اشعار میں جگہ جگہ فنی اور شعری اسقام ہیں جو انکے صحیح طور سے پڑھ نہ جانے کا نتیجہ ہیں۔

برہان الملک سعادت خاں کے پرآشوب دور میں آپ کا خاندان محفوظ رہا مگر بعد میں نوابان اودھ کی کوشش سے دوسرے سنی خاندانوں کی طرح آپکے خاندان کے افراد بھی شیعہ ہوگئے۔

برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال

از

جناب لطف الرحمٰن صاحب پٹنہ

یہ امر مسلّم ہے کہ زبان جب تک زندہ رہتی ہے دوسری زبانوں سے اثر قبول کرتی رہتی ہے۔ ان کے الفاظ اس زبان کے اپنے الفاظ بنجاتے ہیں، دنیا کی تقریباً سبھی زندہ زبانوں میں یہ اصول پایا جاتا ہے۔ اگر انگریزی زبان سے فرانسیسی، جرمن، لاطینی اور دوسری زبانوں کے الفاظ اور اردو سے فارسی، عربی اور ترکی الفاظ خارج کر دیے جائیں تو یہ زبانیں بے مایہ ہوکر رہ جائینگی۔

اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ دو مختلف زبانیں بولنے والی قومیں جب ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور آپس میں رشتۂ اتحاد قائم ہوتا ہے تو قانون فطرت کے مطابق مذہب، اخلاق، زبان اور طرز رہایش وغیرہ ایک دوسرے کا اثر نامعلوم طریقہ سے شروع ہو جاتا ہے، جو رفتہ رفتہ زیادہ واضح اور نمایاں شکل اختیار کر لیتا ہے، پوری دنیائے لسانیات میں یہ اصول کارفرما ہے، اور دنیا کی تقریباً سبھی زبانیں اسی اشتراک و اتحاد کی رہین منت ہیں، اس میں کوئی استثنا نہیں کیونکہ اظہار مطلب اور افہام و تفہیم کے لیے ہر شخص ایسا لفظ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کو دوسری قوم کا فرد سمجھ لے، یہ سلسلہ

برابر چلتا رہتا ہے۔ یہانتک کہ ایک زبان کے بہت سے الفاظ دوسری زبان کے اصلی الفاظ بن جاتے ہیں،[1]

برج بھاشا۔ شورسنی اپ بھرنش کی ایک شاخ ہے۔ اپ بھرنش کا زمانہ پراکرت کے بعد کا ہے۔ پراکرت کے انحطاط کے بعد مختلف علاقوں میں جو مختلف اپ بھرنشیں ابھریں اُن میں شورسنی اپ بھرنش اس لحاظ سے بہت اہم تھی کہ اس عہد میں ادب کے وجود کا سراغ اسی زبان میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے:۔

"Possibly Sourseni was the polite language of the day when people employed a vernacular, and in the Apaleransa period, eastern poet employed the Sourseni-Apaleransa to the exclusion of their local pation (The origin & The devlopment of Bengali lang) p. 91

اور ڈاکٹر سمپتی آریانی اپنے ڈی۔ لٹ کے مقالے میں فرماتی ہیں:۔

"اشوک کے بعد کے ایتہاس (تواریخ) سے گیات (معلوم) ہوتا ہے کہ اشوک کے بعد ماگدھی کے وکاس (فروغ) پر دھیان نہیں دیا گیا۔ اس کا ویوہار (استعمال) نمن سرینی (نچلے طبقے) کے لوگ کرنے لگے .... ودوانوں (علما) کا انومان (اندازہ) ہے کہ اکیلے شورسنی اپ بھرنش نے ہی ماگدھی اور اردھ ماگدھی بھاشاؤں کا استھان لیا

[1] محمد یحییٰ تنہا۔ سیر المصنفین جلد اول ص ۳۵

(ادبی علاقہ) ادھیکرت (محفوظ) کرلیا، اس ادوان کا آدھار یہ ہے کہ کیول شورسینی اپ بھرنش میں ہی ساہتیہ ایلبدھ ہوتا ہے اتہاس (حقیقت) کی پشٹی (تصدیق) اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اپ بھرنش کال میں پوربی چھیتروں کے کوی اپنی چھیتریہ بولیوں (علاقائی زبانوں) اپیکچھا (نظرانداز) کرکے شورسینی اپ بھرنش کا ویوہار ساہتک ڈیشیوں کیلئے کرتے تھے۔" (لکھی بھاشا کا ادھین)

مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور یہاں باضابطہ توطن اختیار کیا تو ہندوستان کے باشندے ان کی زبان و تہذیب اور اخلاق وعادات سے قدرتاً متاثر ہوئے، مسلمان اپنے ساتھ ایک اعلیٰ مذہب، ایک مکمل دین اور بلند اخلاق لے کر آئے تھے، اخوت و مساوات کے معلم تھے اور کمزوروں سے ہمدردی، عورتوں پر رحم، عبادت خانوں کا تحفظ دینی فرض سمجھتے تھے، اس کے برعکس ہندوستان اونچ نیچ کی تفریق، اور برہمن اور شودر کے اختلاف میں مبتلا تھا، ان حالات میں یہاں کے باشندوں کے لیے اسلام کی تعلیمات عجیب اور قابل تقلید تھیں، چنانچہ دونوں قومیں پہلے سندھ اور اس کے نواح میں، پھر پنجاب، دلی، دکن، بہار اور بنگال میں ملیں اور صدیوں تک یہ ارتباط قائم رہا، اس ارتباط سے دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا، اس کی جھلک دونوں قوموں کی زبان میں بھی نظر آتی ہے، چنانچہ ہندوستان میں بولی جانے والی تقریباً سبھی زبانوں مثلاً برج، کھڑی بولی، بندیلی، ہریانی، پنجابی، قنوجی وغیرہ میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں،

ہمارا موضوع برج بھاشا میں عربی، فارسی کے استعمال کا جائزہ ہے، برج بھاشا کا مرکز برج کا علاقہ ہے، اس میں متھرا کی برج معیاری مانی جاتی ہے،

اس کا تعلق اردو زبان سے خاصا گہرا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اردو اسی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں[1] برج بھاشا کو اردو کا ماخذ قرار دینا جو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے، جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے، صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس وجہ سے کہ برج بھاشا جو متھرا اور اس کے اطراف میں بولی جاتی ہے، بہت مشابہت رکھتی ہے، مگر یہ اپ بھرنش کی ایک علاحدہ شاخ ہے، پروفیسر محمود شیرانی فرماتے ہیں :۔

"ہم اردو کو برج بھاشا کی بیٹی سمجھتے رہے ہیں، لیکن جب ان دونوں کی صرف و نحو اور دوسرے خط و خال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے راستے مختلف ہیں۔ اردو جہاں اپنے اسما و افعال کو الف پر ختم کرتی ہے، برج واؤ پر ختم کرتی ہے، اس لیے اردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں، ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں، بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے۔"

(پنجاب میں اردو مقدمہ)

برج بھاشا کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زبان کے شعراء نے اپنے کلام میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے، برج کے مشہور شعراء میں سورداس، کونبھن داس، پرمانند داس، چترَبھج داس اور میرابائی وغیرہ نے عربی، فارسی کے الفاظ نہ صرف استعمال کیے ہیں بلکہ حتی الوسع صحت کا بھی خیال رکھا ہے، خصوصاً سورداس نے اس کثرت اور مہارت کے ساتھ ان الفاظ کا استعمال کیا ہے کہ پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ان کو عربی سے واقفیت تھی، اس میں حیرت کی کوئی بات

---

[1] سکینہ : تاریخ ادب اردو ص ۲۶

نہیں ہے، کیونکہ نابغۂ فن تعصب و تنگ نظری سے پاک ہوتا ہے، پھر اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کا تقاضا بھی یہی تھا، فارسی دفتری زبان تھی، اس لیے ایک زندہ زبان ہونے کی حیثیت سے برج نے عربی فارسی کے الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹا، اس کی تصدیق ڈاکٹر پی، ان، منڈل کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"....... عربی، فارسی اور ترکی کے انیک شبد (متعدد الفاظ) اتری بھارت میں سامانیہ بول چال کی بھاشا میں پرچلت (مروج) ہو گئے تھے، یہی کارن ہے کہ ان بدیشی بھاشاؤں کا ودھی وت ادھین (باضابطہ مطالعہ) نہ کرنے والے کویوں نے بھی ان کا سوتنترتا پوروک (آزادانہ) پریوگ کیا، اور اس پرکار اپنی بھاشا کو ویوہارک روپ دینے میں سمرتھ ہو سکے۔" (سور کی بھاشا)

ذیل میں ہم برج بھاشا کے چند مشہور شعراء کے کلام سے اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں؛ سورداس :- فارسی اور عربی الفاظ کو اپنی شاعری میں جس کثرت سے اور جس خوبصورتی کے ساتھ سورداس نے استعمال کیا ہے، برج کے کسی شاعر نے نہیں کیا ہے، سورداس، کرشن بھگت اپنے زمانے کے عدیم المثال شاعر اور بڑے اچھے زبان داں تھے، ان کی زبان دانی کا اعتراف ہندی ادب کے تقریباً سبھی نقادوں نے کیا ہے، اور بحیثیت ماہر السنہ آپ کی اہمیت تسلیم کی ہے، ذیل میں ان کے کلام کے حوالے سے ان الفاظ کی ایک مختصر فہرست نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہے جسے سور نے استعمال کیا ہے :-

عربی الفاظ | عبیر ۔ اُڑت گلال عبیر نرت تہہ پرت دیپ اجیار ر

عمل ۔ آنند کند چند مکھ نسی دن اَو لوکت پہ عمل پریو

امین ۔ نین امین اُدھر منی کیں بس جنہ کو تنہہ چھیو

اصل ۔ کری اور جا پریم پرتی کو اصل کہاں کھتیا وے

قلعی ۔ دیکھے ما دھو کی چتورائی اُدھری کنک قلعی دینچ گئے دمک

جمع ۔ سابق جمع ہوتی جو جوری من ذٰلک تلپا یو

جواب ۔ سو رآپ گذران مصاحب لے جواب پہنچا وے

مصاحب ۔ ,, ایضاً ,, ,,

عقل ۔ اندر ڈھیٹ بلی کھائی ہمری دیکھو عقل گنوائی ،

خطا ۔ سورداس چرنن کی بلی بلی کون خطا تیں کرپا بساری

فارسی الفاظ | ترکش، کمان ۔ کرید ھی کمان چڑھائی کوپ کری بُدھی ترکش ریتا

گمان ۔ بھری گمان ولیو کتی ٹھاڑی اپنے رنگ رنگیلی

در ۔ جیوت جاچت کن کن نردھن در در رٹت بے حال

دربار ۔ جانت پانت (ذات پات) کو و پوچھت ناہیں سری پتی کے دربار

دستک ۔ سورداس کی یہی ونتی دستک کی جے معاف

دامن گیر ۔ ان پاپن تیں کیوں اُب روگے دامن گیر تمھارے

سردار ۔ تم تو بڑے گل جنمے اَرو سب کے سردار

یہاں سورداس کا ایک دوہا نقل کیا جاتا ہے، جس میں انھوں نے بڑے سلیقے سے عربی، فارسی الفاظ کا استعمال کیا ہے :-

سانچو سو لکھنہار کہاویں

کایا گرام مساحت کری کے جمع باندھی ٹھہراوَے
من مہتو کری قید اپن میں گیان جتیا لاوَے
انڑی مانڑی کھریہاں کر ودھ کو پاتا بھن بھراوَے
بٹہ کائی قصور بھرم کو فرد تلے لَے ڈارَے
نیچے ایک اصل پر راکھے ہڑے نہ کبھو ٹارَے
کری اور جاپریم پریتی کو اصل کہاں لکھتیاوَے
دوجے قرض دور کری دیتہ نیکو نہ تامے آوَے
مجمل جورے خرچ نی کے کری راکھے لیکھا سموجھی بتاوَے
سور آپ گذران مصاحب لے جواب پہنچاوَے

اس کے علاوہ دربان، خاک، آواز، جہاز، سرتاج، باز، نقیب، خواص نوبت، ضمانت، نفع، شہنائی، پیادہ، دغا، بخشش، خراد، ریشم، غور، لائق حضور، بازار، ہزار، ثابت، صندوق، نیزہ، آخر، محل، فوج، سانہ، خبر، زہر، گنہگار، طاق، وغیرہ الفاظ بھی سور کے یہاں ملتے ہیں،

سورداس کی حیثیت اپنے عہد کے نمائندہ شاعر کی ہے، اس لیے حوالے تفصیل سے پیش کیے گئے، سور کے بعد کومبھن داس کا نام آتا ہے، جو اشٹ چھاپ شاعروں میں ہیں، انھیں بھی کرشن سے بڑی عقیدت تھی، انھوں نے اپنے دوہوں میں اس عقیدت کا اظہار کیا ہے، ان کے دوہوں میں گذر، بسر، اوقات، گمان، دربار، ناز، نیاز خواص، باقی، جمع، صاف، معاف وغیرہ الفاظ ملتے ہیں، لیکن سور کے مقابلے میں اس طرح کے الفاظ بہت کم ہیں کومبھن داس کے ہم عصر اور ہم عقیدہ چتربھج داس اور

پرمانند داس تھے۔ انھوں نے جہاں کرشن سے اظہار عقیدت کیا ہے وہاں شاعری کے دامن کو بھی وسیع کیا ہے، اگر برج کے شاعروں کی فہرست سے ان شعرا کو خارج کردیا جائے تو اس کے ادب کی تاریخ نامکمل رہ جائیگی، انھوں نے احوال، اعلان، جاسوس، زرہ، ہزار، کاغذ، صاف، دربار، مقتول، کلہ، قصیدہ، لائق، نہال، پردہ، ریختہ، حیف وغیرہ الفاظ استعمال کیے ہیں، سورداس کے بعد عربی فارسی الفاظ کے استعمال کا سلیقہ سب سے زیادہ پرمانند داس کے یہاں نظر آتا ہے۔

برج کا علاقہ متھرا اور اس کے آس پاس کا علاقہ ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ راجستھان جیسے دور افتادہ خطہ کی باشندہ شاہی گھرانے کی خاتون میرابائی نے کرشن جی سے اپنی محبت وعقیدت اور جوش جنوں کا اظہار اسی زبان (برج) میں کیا ہے، تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ میرا صغر سنی ہی میں بیوہ ہوگئی تھی، شوہر سوگ اور برہ کی آگ بجھانے کے لیے اس نے اپنی توجہ کرشن کی طرف منعطف کر دی تھی، اس کے یہاں بھی عربی اور فارسی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، بعض اشعار کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ ریختہ کے ہیں، مثلاً

جو میں ایسا جانتی رے پریت کیے دکھ ہوئے نگر ڈھنڈھورا پیٹتی رے پریت نہ کریو کوئے

کہتے ہیں کہ میرا کا سادھو سنتوں میں بیٹھنا اور انکے ساتھ بھجن کیرتن کرنا میرا کے دیور رانا کرماجیت کو پسند نہیں آیا۔ اسلیے اس نے زہر دینے کی کوشش کی، میرا نے کئی جگہ اس کا اظہار کیا ہے ؎

؎ زہر پیالہ بھیجیا رے دو بجیو میرا ہاتھ

؎ میرا کے پربھو گودھر ناگر ہنسکر پی گئی زہر

میرا کے یہاں نہایت روانی سے عربی فارسی الفاظ کا استعمال ہوا ہے،

آون کہہ گئے اجھو نہ آئے دوس رہا اب تھوڑا میرا کہے پربھو کب رملوگے عرض کروں کر جوڑ

لـه راجستھان کی پنگل بھاشا۔ موتی لال۔

کلیاتِ علی

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی دہلی یونیورسٹی

علی قلی بیگ ترکمان ابن سلطان خلیفہ فارس کے ترکوں میں تھے، جہانگیر[1] کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور شاہی ملازمت میں منسلک ہوگئے، مؤلف عرفات عاشقین کے زمانہ میں ان کی شان وشوکت کا شباب تھا، برہان پور میں مقیم تھے، مگر کچھ دنوں کے بعد معتوب ہوگئے، اور امارت اور درباری زندگی چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی اور فقراء کی صحبت میں رہنے لگے،

ان کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں۔ ان کے یہ چند اشعار کئی تذکروں نے نقل کیے ہیں :-

طبع تو گر کاہل افتادہ است جرم بادہ چیست ۔ بر گلوی شیشہ نتوان بست تقصیر ترا

بسیار ملولیم ازیں عمر ندانیم ۔ کا سایش ما در دم تیغ کہ نہفتہ است

خیال شمع رویش دشمن آسایش من شد ۔ چراغے در نظر دارم ازاں خوابم نمی آید

کلیات علی کا ایک عمدہ قلمی نسخہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے[2]، سید مظفر نامی نے اس نسخہ کے متعلق لکھا ہے کہ مصنف کی فرمایش سے لکھا گیا ہے، بعد ختم کتابت مصنف نے مضامین میں جو اضافہ کیا ہے، ان کو حواشی پر اپنے قلم سے لکھا ہے، اس میں

---

[1] ۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء [2] ۱۸۷، ادب، نظم فارسی

پانچ لو میں مذہب زبرجد کی ہیں۔

کلیات علی کی اہمیت اس وجہ سے بہت زیادہ ہے کہ مؤلف کے تجربات کا نچوڑ ہے، اور اس میں بے شمار حکایتیں ہیں، جن کا تعلق خود علی قلی سے تھا یا ان کے مشاہدہ میں آئی تھیں، ان سے اس زمانہ کی اخلاقی، معاشی اور سماجی حالت کا مطالعہ کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اور ان میں ایران و ہند کی مشترکہ ثقافت کے گہرے نقوش دکھائی دیتے ہیں، ان حکایتوں سے خود مؤلف کے رجحانات اور تجربات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس نسخہ میں سب سے پہلے نثر میں ایک مقدمہ ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

" نیست بر معنی وحدت شاہد، انما اللہ الہ واحد، در دار الشفا شرع معتبر
این بیمار نحیف علی گو یہ کہ نا ملایمات دنیوی و فکر احوال اخروی ......
این دیوانۂ الٰہی را چون بر دل ہجوم می کرد..... و زبان پریشان می گفت
دبر سرحیار سوق عالم کہ ہر کس بکیفیتی سرخوش بود و از شدت مستی پروای درد
کسی نمی کرد .... غمی کہ ہست غم فرد است ...."

اس کے بعد مثنوی " بقعۃ العارفین"[1] ہے، جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے:

زاں پیش کہ این نمود بی بود　　　از خلوت بود روی بنمود

اس کے بعد ایک دوست کا ذکر ہے جس نے انھیں شعر کہنے سے منع کیا تھا۔

از گفتن شعر خود چہ حاصل　　　رعنائی طبع را فرو ہل

اس کے بعد " ملما ی قال" کے سلسلہ میں ہندوستان کی ایک رات کا ذکر

---

[1] ۵۶۰ بیت

کیا ہے، جس میں دوان اول، دوم، سوم، اشراف، متکلم اور حکیم نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، پھر اپنے والد کی مدح کی

در گوشۂ این خرابہ خوارم یکتا پدر است غمگسارم

اور ان سے اجازت لے کر سفر شروع کیا،

اس مقام پر علی نے اہل مدرسہ و صومعہ کی توصیف کی ہے اور "عالم قال" کو چھوڑ کر "عالم حال" اور توحید کی طرف رجوع کیا ہے، اس کے بعد ملا محمد صوفی مازندرانی[1] کا بڑے خلوص سے ذکر کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انکے بڑے گہرے دوست تھے،

یاریست مرا بکشور ہند صوفی وندیم وزاہد ورند

صوفی منشی محمدش نام خود باغ و بہار بادۂ وجام

صابر عراقی[2]، ابراہیم خاکی، نادم جیلانی[3]، صدر الدین مسیحی، طالب عراقی کے ذکر پر یہ مثنوی ختم ہوتی ہے[4]

دوسری مثنوی "خرقۂ علی" ہے جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے:

خدایا توئی بر جہاں بادشا بزیرندۂ مردم پارسا

اس مثنوی کے شروع میں اس کا سبب تالیف یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک سرد رات میں علی بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک جوان نے آکر کہا کہ خرقہ تیار کرو، اس کے بعد شاہ عباس ماحی[5] کی مدح کی ہے:

---

[1] وفات ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵-۲۶ء [2] میر صابر متوفی ۱۰۷۰ھ / ۱۶۵۹-۶۰ء [3] شہسوار بیگ نام گیلانی متوفی ۱۱۰۰ھ / ۱۶۸۸-۸۹ء [4] تقریباً ۵۲ ابیات [5] ۹۸۵ھ - ۱۰۳۸ھ / ۱۵۸۷ء - ۱۶۲۹ء

خدیو خرد مند عباس شاہ فروزندۂ بخت و تخت و کلاہ

مثنوی میں چار باب اور بہت سی چھوٹی چھوٹی حکایتیں ہیں جن میں سے اکثر آپ بیتی ہیں یا شاعر کے مشاہدہ میں آئی تھیں، ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علی کتنے بڑے سیاح اور تجربہ کار تھے۔ پہلے باب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مثنوی ۱۰۷۰ھ (۱۶۶۰ء) میں ہندوستان میں لکھی گئی، اس وقت ان کی عمر تیس سال کی تھی، اس میں شاعر نے اپنے وطن واپس جانے کا بھی ذکر کیا ہے :-

شبی سر فرو بردہ بودم بخویش بیاد آمدم عہد یاران خویش
بسیج سفر را ہمی ساختم دو اسپہ بدیں شوق می تاختم
ز ہجرت فزون بود دہ بر ہزار کہ گشتم فلک وار ہر دیار
ہمانا کہ بودم ہمی سال سی نوشتم بہند اینچنیں فارسی

بادشاہوں کی عدالت کے بارہ میں ایک حکایت سید خواجہ کی ہے جو کسی سخی راجہ کے پاس بہت دنوں تک رہے تھے، ایک قصہ خود علی کی جوانی کا ہے، وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے، جب بادشاہ نے اس حسین کی شہرت سنی تو اس کو بلایا، پھر جب علی معشوق سے ملے تو اس نے کہا "اے علی تم نے ابھی تک وہ جہانسوز حسین نہیں دیکھا ہے جس کی آگ میں رند اور بادشاہ دونوں جل جاتے ہیں"۔

بگفتا علی سخت سوزیدۂ تو حسن جہاں سوز نا دیدۂ
سر کوئی خوباں ہمہ روزگار ز شاہان و رنداں بود فتنہ‌زار

درویشوں کے اخلاق کے بارہ میں بہت سی دلچسپ اور مفید حکایتیں ہیں، آخر میں ساقی نامہ کے طرز پر ایک حکایت ہے جس میں ایک گرم رات کا

نقشہ کھینچا گیا ہے،

"خرقۂ علی" کو علی نے نثر میں بھی لکھا ہے، اور اس کا نام "کتاب منثورۂ خرقۂ علی" رکھا ہے، اس میں بادشاہوں کی سیرت کے بہت سے واقعات ہیں جو خود علی قلی سے متعلق ہیں، یا ان کے مشاہدہ میں آئے ہیں،

اس کے بعد ایک چھوٹی سی مثنوی[1] ہے جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے،

بگذر از شاہد ان عہد حکیم　　　　اِنّ ربّی بکیدہن علیم

آخر میں ۲۵۲ رباعیاں ہیں، ایک رباعی میں اخوندوں کا مذاق اڑایا گیا ہے

اخوند کہ صوفی و متیں آمدہ است　　　　با نشاء تریاک حزیں آمدہ است

یک بین د موحدست در کردۂ خویش　　　　در عیب کساں ولی دو بین آمدہ است

ایک میں علی نے اپنے وطن جانے کا ذکر کیا ہے:۔

آں دوست کہ در جوہر ما ساخت عرض　　　　صحت ہمہ از و بود اگر اوست مرض

رو نہ بوطن علی بغربت تا کی　　　　ہر نامہ کہ خواندیم ہمیں بود غرض

ایک رباعی میں علی لوگوں کی مذہبی تنگ ذہنیتوں کا ذکر کرتے ہیں، جس سے ان کی وسعت مشرب کا پتہ چلتا ہے،

تا چند کہ ایں برافضی گشت شبیہ　　　　تا کی کہ فلاں بناصبی ہست کریہ

زیں کعبہ رواں کنارہ خواہ علی　　　　بتخانۂ ما ایں بتان است وجیہ

ایک رباعی میں کسی سورت کے بزرگ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

از بندر سورت از تو معنی کدہ　　　　ہر دم علی از نگاہت اندر بدہ

در آتش و آب در گرفتی عالم　　　　تا در تر و خشک آتش اندر زدہ

---

[1] ۳۰ بیت،

مآخذ

۱۔ تقی اوحدی: عرفات عاشقین، نسخۂ خطی شمارہ ۲۴۰، خدا بخش لائبریری پٹنہ
۲۔ والہ داغستانی:۔ ریاض الشعرا، نسخۂ خطی شمارہ ۲۲۳ ب، " " "
۳۔ سراج الدین علی خاں آرزو:۔ مجمع النفائس، نسخۂ خطی، شمارہ ۶۹۵ " " "
۴۔ حسین قلی خاں عظیم آبادی:۔ نشتر عشق، نسخۂ خطی شمارہ ۶۱۶ " " "
۵۔ سید علی حسن خاں: صبح گلشن، مطبع فیض شاہجہانی، بھوپال
۶۔ محمد عبدالغنی خاں: تذکرۃ الشعرا، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ ۱۹۱۶ء
۷۔ علی قلی: کلیات علی قلی، نسخۂ خطی شمارہ ۸۱، (نظم فارسی) سالار جنگ میوزیم حیدر آباد
۸۔ احمد علی ہاشمی: مخزن الغرائب، نسخۂ خطی شمارہ ۷۱۳، خدا بخش لائبریری پٹنہ

مقالہ نما

مضامین الندوہ

از

مولوی سلمان شمسی صاحب ندوی

(۶)

مباحث منطق، حکمت و فلسفہ

عبدالسلام ندوی ستمبر، اکتوبر ۱۹۱۱ء

"مسئلہ ارتقار اور حکماے اسلام" حوالہ ۲۷۹/۸

متکلمین اسلام نے جب علم کلام کو مدون کرنا چاہا تو ان کو دو مرحلے طے کرنا تھے، اولاً تو کہ خود یونانی فلسفہ سے صحیح واقفیت حاصل کی جائے، اس کے بعد ان کی تردید کی جائے، پہلا کام دوسرے کام سے مقدم تھا، اس بنا پر علما نے سب سے پہلے اسی طرف توجہ کی۔۔ ۔۔۔ میں جو لوگ قدیم فلسفہ میں چور ہیں اُن کے نزدیک ڈارون کی وقعت ایک بندر نچانے والے سے زیادہ نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس مسئلہ کا وہ موجد ہے اس سے زیادہ کوئی مسئلہ ۔۔۔سفہ کی تمام عظیم الشان شاخوں کا جامع نہیں،

عبدالکریم میرعلوی اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۱۲ء

حرکت زمین پر بسیط بحث حوالہ ۲۷۹/۹

اس رسالہ کے لکھنے سے بڑی غرض یہ ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو ایک دنیا کی دنیا لڑ رہی ہے، جو کچھ فریقین نے اپنے خیالات ثابت کرنے کے لئے موشگافی کی ہے، سب کو سامنے رکھ دیا جائے تاکہ لوگ خود فیصلہ کر سکیں،

اس رسالہ کے دیکھنے سے انگریزی داں۔ عربی دانوں کے خیالات مع دلائل پورے واقف ہوسکتے ہیں، اور عربی داں انگریزی دانوں کے خیالات سے واقف ہوسکتے ہیں

عبدالواحد صاحب جون ۱۹۱۱ء

امکان خلاء ص ۲ . ۱۵

حوالہ - ۲۷۹/۸

" فلسفہ کے حاملان قدیم و جدید بالاتفاق یہ مانتے ہیں کہ حقیقت اشیاء کا دریافت کرنا، انسانی طاقت سے بالاتر ہے، فلسفۂ قدیم کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ حقائق اشیاء کا علم محال ہے،

موضوع پر قدیم و جدید نظریات کی روشنی میں بحث کی گئی ہے،

علوی، ضیاء الحسن اگست ۱۹۰۸ء

"حواس خمسۂ باطنی" ص - ۵ - ۱۳

حوالہ ۲۷۹/۵

یونان کے کسی حکیم نے حواس خمسۂ ظاہری پر قیاس کر کے یہ تصویری قائم کی کہ انسان کے جس طرح یہ ظاہری پانچ حواس ہیں، اسی طرح پانچ حواس باطنی بھی ہیں،... اس مسئلہ کے ماننے والے ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں، سب سے پہلی آواز جو مسئلہ کی مخالفت میں اٹھی وہ متکلمین اسلام کی تھی،،

علوی، ضیاء الحسن — جنوری ۱۹۰۷ء

حدوث مادہ — ص - ۲۱ - ۲۷

حوالہ ۲۷۹/۴

" یہ مسئلہ کہ مادہ کو فنا نہیں، اور مادہ ہی ہر شے کی علت ہے، جب سے تاریخ فلسفہ کا ہم کو علم ہوا ہے، ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں مانا گیا ہے، اور اس مذہب کے موئدین ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں لیکن مادہ کا جس قدر زور و شور ہمارے زمانہ میں ہے ویسا کبھی نہیں ہوا، چونکہ اس مسئلہ کا ایک پہلو اسلام کے مخالف ہے، لہذا ہم نے مادہ کے بقا کے دلائل پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے ۔"

علی حسن خان (نواب مترجم) — جولائی ۱۹۱۶ء

ایمان علوم طبیعیہ — ص - ۹ - ۲۳

حوالہ ۲۸۶

" علوم طبیعیہ میں وہ سب علوم داخل ہیں، جن میں موجودات عالم یعنی جمادات، نباتات، حیوانات سے بحث کی جاتی ہے... ہم ان اشیاء کا خلاصہ بیان کرنا چاہتے ہیں، جن کو علمائے علوم طبیعیہ نے طول طویل بحثوں کے بعد متعدد زبانوں میں تحقیق کر کے دنیا پر واضح کیا ہے ۔

عمادی، عبداللہ — رجب ۱۳۲۳ھ

مناظرہ کا ایک جلوہ — ص - ۱۰ - ۱۶

حوالہ ۲۷۹/۲

" مناظرے سے ہماری مراد "علم مناظرہ مرایا" ہے، اور اس مضمون میں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں

کہ مناظر کی ابتدائی حالت کیا تھی، یونانیوں نے کس درجہ تک اس پر ترقی کی، اور مسلمانوں نے اسے کس حد تک سجایا، ساتھ ہی ہم یہ بھی دکھائیں گے کہ موجودہ علمی ترقی کو اسلامی تحقیقات سے کہاں تک فائدہ پہنچا، اور اہل یورپ نے اس بارے میں کس قدر مسلمانوں کے احسان مند ہیں۔

معین الدین احمد ندوی، دسمبر ۱۹۱۲ء

"شہاب ثاقب" ص - ۱۹ - ۲۳

حوالہ ۲۷۹/۹

شہاب ثاقب کے ٹکڑوں میں جو اجزا فلکی میں داخل ہیں، کوئی ایسا مادہ نہیں ہے جو زمین کے اشیاء میں موجود نہ ہو، پس اس سے معلوم ہوا کہ کواکب آفتاب اسی قسم کے مادوں سے مرکب ہیں،

ہادی محمد بی۔اے، (مترجم) فروری ۱۹۱۱ء

"تمثیل" ص - ۱۳ - ۲۲ حوالہ ۲۷۹/۸

ہم جب کسی چیز کا علم کرتے ہیں، تو ہم کو پہلے اس کا سادہ ادراک ہوتا ہے، اس کے بعد اس علم میں لذت پیدا ہو جاتی ہے، جس کو وجدان کہتے ہیں، وجدان سے قوت ارادی کو تحریک ہوتی ہے، اور یہ علم کا آخری نتیجہ ہے، ادراک سادہ سے سائنس وجدان سے فنون لطیفہ و تصوف اور قوت ارادی سے مذہب و اخلاق پیدا ہوتے ہیں،

(ہربرٹ اسپنسر کے مضمون کا ترجمہ و خلاصہ)

مضامین تمدن و ثقافت

آزاد ابو الکلام اکتوبر ۱۹۰۵ء

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ کی سرپرستی

ص ۲۳ - ۳۴ - حوالہ ۲۷۹

مسلمانوں کے لیے یہ بات درحقیقت سخت قابل شرم ہے کہ جس میدان میں انھیں ہمت کا قدم رکھنا تھا، آج اغیار بازی لے گئے۔ عربی زبان نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، بلکہ مسلمانوں کی جان، روح، عنصر جو کچھ کہو عربی ہے، مسلمانوں کے تمام علوم و فنون اسی خزانہ میں محفوظ ہیں لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج اس بے بہا خزانہ پر یورپ کا قبضہ ہے، اور مسلمان خالی ہاتھ اس کی جرأت کو تک رہے ہیں۔"

اکرام اللہ خاں ندوی

"سلاطین ہند کے دربار قصر شاہی کا منظر" اپریل ۱۹۱۵ء

ص ۲۱ - ۲۸

حوالہ ۲۸۵

شاہان مغلیہ کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ ہفتہ میں ایک روز انصاف و فریاد رسی کے لیے مخصوص کر لیتے تھے، اس روز بادشاہ بجائے دیوان عام کے دیوان خاص میں اجلاس کرتا تھا، بادشاہ کے سامنے قاضی، مفتی اور ارباب علم جمع ہوتے تھے ...... خاندان تیموری سے سلطنت مغلیہ کے درباروں کا منظر پیش کیا گیا ہے۔

اکرام اللہ خاں ندوی

ارباب تصنیف اور ان کا علمی انہماک جون ۱۹۱۵ء

ص - ۲۶ - ۳۲

حوالہ ۲۸۵

مسلمانوں کا تمام علمی سرمایہ وحشی فاتحین کے ہاتھوں بغداد و قرطبہ میں برباد ہوگیا، اور جو کچھ بچا تھا، وہ مسلمانوں کی غفلت شعاری کی نذر ہوا، اس لیے مسلمانوں کے علم و فضل کی داستان سرائی کا موقع حاصل نہیں، لیکن تاہم جو کچھ موجود ہے، وہ مسلمانوں کے فخر و مباہات کے لیے کافی ہے، موضوع بالا پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور مشہور مصنفین و محدثین کے واقعات قلمبند کیے گئے ہیں،

سلیمان ندوی (علامہ سید)

(۱) "عرب کے یورپین سیاح" ستمبر ۱۹۰۷ء

ص ۲۷ - ۳۱

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۴}$

سب سے پہلے اس اہم سفر کے لیے جس نے کمر ہمت باندھی وہ اسٹریلیا کا مشہور عالم نیوبھر تھا، ۱۷۶۲ء اور ۱۷۶۳ء میں اس نے یمن کا سفر کیا، اسکی نصف صدی کے بعد ۱۸۰۷ء میں باڈیا جو اسپین کا رہنے والا تھا، عربستان کے سفر کے لیے روانہ ہوا، پہلے مصر آیا اور اس نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا، اور علی بک عباسی اپنا نام رکھا، حلب پہنچا اور وہاں اس نے ایک شریف النسب مسلمان ہونے کا سرکاری سرٹیفکٹ حاصل کیا جس کی مدد سے مکہ معظمہ پہنچا .....

(۲) مسلمانوں کی بے تعصبی ستمبر ۱۹۰۷ء

"یہود اور دولت عثمانیہ ص ۳۲ - ۳۶

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۴}$

"مسلمانوں کی بے تعصبی کے متعلق بہت سے تاریخی واقعات اس طرز حکومت

کے پیش کیے جا چکے ہیں، جو مدت ہوئی مٹ چکی ہے، مگر اس وقت ہم ایک موجودہ اسلامی سلطنت کی بے تعصبی دکھانا چاہتے ہیں، دولت عثمانیہ کا اپنی یہودی رعایا کے ساتھ کیا برتاؤ رہا، اس مضمون کا موضوع ہے،

(۳) "مسلمان عورتوں کی بہادری" فروری ۱۹۰۸ء

ص ۵ - ۱۶

حوالہ ۲۷۹/۵

"اسلام میں قدیم دستور قائم رہا، جہاد میں برابر مردوں کے ساتھ انکی عورتیں شریک رہتی تھیں، ایک موقع پر ایسا ہوا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ اپنے ہاتھ سے مشک بھر بھر کر زخمی سپاہیوں کو پانی پلاتی تھیں، مگر اسی کے ساتھ رسول اللہؐ فضول اور بیکار عورتوں کا لے جانا سخت ناپسند فرماتے تھے،

(۴) "روسی مسلمانوں کے کچھ حالات" مئی ۱۹۱۲ء

ص - ۲۹ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۹

تاتاری مسلمانوں کا ایک اسلامی کتب خانہ شہر ترویسکی (روس) میں واقع جس کا نام 'نجات' ہے، گذشتہ سال کی جنوری سے لیکر اگست تک اس کتب خانہ گیارہ ہزار آدمیوں نے فائدہ اٹھایا،

کیا اس سے تاتاری مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

(۵) "اندھوں کی تعلیم" جولائی ۱۹۱۱ء

اس کا طریقہ پہلے مسلمانوں نے ایجاد کیا، ص ۲۹ - ۳۱

حوالہ ۲۷۹/۸

"اندھوں کی تعلیم کا سب سے پہلے باقاعدہ سسٹم فرانس میں جاری ہوا، والنیٹن ہوئے نے ۱۷۸۴ء میں اندھوں کا سب سے پہلا مدرسہ پیرس میں قائم کیا، فرانسیسیوں کے بعد انگریزوں نے ۱۷۹۱ء میں لیورپول میں ۱۷۹۲ء میں ایڈنبرگ اور اسکاٹلینڈ میں ۱۷۹۹ء میں، لندن میں اس قسم کے مدارس قائم کئے، اور اب یورپ کے ہر ملک میں اندھوں کی تعلیم کا کافی سامان موجود ہے،

(۶) فرمانروایان اسلام کا دربار اگست ۱۹۰۶ء

ص ۲۱ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۳

خلفائے راشدینؓ کے زمانہ تک خلیفہ اور غیر خلیفہ کی مجلس، تخاطب، گفتگو میں کوئی امتیاز نہ تھا، ہر شخص خلیفہ کا نام لیتا تھا، ساتھ بیٹھتا تھا، گفتگو کرتا تھا،

"جرجی زیدان کی کتاب "تاریخ التمدن الاسلامی" سے کچھ اقتباسات کا ترجمہ"

(۷) مسلمان اور سرجری جولائی ۱۹۰۹ء

"زہراوی" ص ۲۳ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۶

" موضوع سے مختصر بحث کی گئی ہے، اس کے بعد دنیائے طب کی عظیم شخصیت امام زہراوی کی شخصیت، اس کے کمال فن اور مہارت سرجری پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کی تصنیفات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے، اور اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

شبلی نعمانی (علامہ) جولائی ۱۹۰۹ء

(۱) "ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر" ص ۳ - ۲۲

حوالہ ۲۷۹

"اس معیار سے ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسلمان جو ہندوستان میں آئے کس شان سے آئے اور ملک پر ان کا کیا اثر ہوا، لیکن اس مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم کو جاننا چاہیے کہ ہندوستان کے قدیم تہذیب و تمدن کی حالت کیا تھی، چونکہ ہم اس مضمون میں صرف تیموری دورِ حکومت سے بحث کرنا چاہتے ہیں، اس لیے اسی زمانہ سے پہلے کی حالت دکھانا کافی ہوگا۔"

(۲) اسلام اور تمدن و ترقی جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ

ص ۱ - ۱۶

حوالہ ۲۷۹/۱

"مخالفین اسلام نے بارہا کہا ہے کہ اسلام وحشی قوموں کو ایک حد تک شائستہ اور مہذب بنا سکتا ہے، لیکن اعلیٰ درجہ کے تمدن کے موافق نہیں اور اس وجہ وہ اعلیٰ درجہ کا تمدن پیدا نہیں کر سکتا، اس مسئلہ کو طے کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ دریافت کیا جائے کہ تمدن و ترقی کے بزرگ ترین اصول کیا ہیں، اور وہ اس میں پائے جاتے ہیں یا نہیں؟"

زینبی، سید علی اکتوبر ۱۹۱۵ء

"اہل مصر کے قبرستان اور رسم تجہیز و تکفین" ص ۱ - ۱۸

حوالہ ۲۸۵

قدیم زمانہ میں اہل مصر اپنے مردوں کو کفن میں لپیٹ کر زمین کے اندر قبروں میں دفن کیا کرتے تھے، لاش براہ راست مٹی میں یا کسی مٹکے میں بند کرکے رکھی جاتی تھی، کہتے ہیں کہ یہ ابتدائی حالت انھوں نے قابیل کی تقلید میں حاصل کی تھی جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کرکے ایک کوّے سے دفن کرنے کا طریقہ سیکھا تھا،

عبد السلام ندوی اپریل ۱۹۱۱ء

(۱) "اسلامی علوم وفنون اور یورپ" ص ۱۳ - ۲۶ حوالہ ۲۷۹/۸

"یورپ میں عربی زبان سے جن کتابوں کا ترجمہ کرایا گیا ان کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ کتابیں ہیں جن کو خود اہل عرب نے یونانی زبان سے ترجمہ کیا تھا لیکن یہ کتابیں اصل مصنفین سے منسوب کر دی گئیں، اس قسم کی کتابیں زیادہ تر ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس، اقلیدس، ارشمیدس کی تصنیفات سے تھیں، دوسری وہ کتابیں جن کو ان علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد خود علمائے اسلام نے تصنیف کیا تھا،

(۲) "اکابران قوم کا درجہ قوموں کی تاریخ میں" جولائی ۱۹۱۵ء

ص ۲۲ - ۲۸ حوالہ ۲۸۵

عام خیال ہے کہ بانیان سیاست کو زمانہ گذشتہ کے تاریخی سلسلہ سے کوئی تعلق نہیں لیکن درحقیقت وہ بھی موحدین و مخترعین کی طرح دور ماضی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں، لیکن میگل، کوسن اور کارلائل جیسے انشا پردازوں کی آنکھوں کو ان مدبرین کے انقلاب انگیز کارناموں نے بالکل خیرہ کر دیا۔

معین الدین ندوی (حاجی) جون ۱۹۱۵ء

"ایام جاہلیت اور خواتین عرب" ص - ۱۱ - ۲۵

"زمانہ جاہلیت کی عورتوں میں زیور اور بناؤ سنگار کا بھی رواج تھا، بلکہ لوگ اسکو شرافت کی علامت سمجھتے تھے، چنانچہ حاتم طائی کو جب حالت قید میں ایک لونڈی نے طمانچہ مارا تھا، تو اس نے ان الفاظ میں حسرت ظاہر کی تھی

لو ذات سوار لطمتنی یعنی کاش مجھے کوئی کنگن والی طمانچہ مارتی۔

ادبیات

آیاتِ طیّبات

از جناب وارث القادری

آیاتِ ذو الجلال ہیں قرآں کی آیتیں — آئینۂ کمال ہیں قرآں کی آیتیں
دستور لازوال ہیں قرآں کی آیتیں — عالم میں بے مثال ہیں قرآں کی آیتیں
فکر و نظر کو نورِ بصیرت عطا کیا — روشن گرِ خیال ہیں قرآں کی آیتیں
جس کے طلوع کو نہیں اندیشۂ غروب — وہ مہرِ لازوال ہیں قرآں کی آیتیں
ابلیس کے فریب کو معدوم کر دیا — شعلہ پئے ضلال ہیں قرآں کی آیتیں
واللہ زندگی کا سہارا انہی سے ہو — مومن کی جان و مال ہیں قرآں کی آیتیں
سارے جہاں میں نیرِ معنی یہی تھیں اور — اب "آفتابِ حال" ہیں قرآں کی آیتیں
فطرت کے جزو خاص ہیں اسلام کے اصول — انساں کے حسبِ حال ہیں قرآں کی آیتیں
بزمِ جہاں کو مشرقِ ایماں بنا دیا — کیا صاحبِ کمال ہیں قرآں کی آیتیں
باطل کا سر کچلنے کو گویا وہ آج بھی — بے جنگ، بے جدال ہیں قرآں کی آیتیں
کفار کیوں نہ لیس کلام البشر کہیں — خالق کی بول چال ہیں قرآں کی آیتیں
"سبعہ معلقہ" کے قصیدے کدھر گئے — اور آج تک مثال ہیں قرآں کی آیتیں

گنجِ شرف، پیامِ اخوت، رہِ نجات　　"فی کافۃ الرجال" ہیں قرآں کی آیتیں
کتنی بھی ہوں بلائیں پٹکتی رہیں گی سر　　مومن کے حق میں ڈھال ہیں قرآں کی آیتیں
صدقہ ہے آپؐ کا کہ زمانہ میں خونگلن　　یا صاحب الجمال ہیں قرآں کی آیتیں
جس کا ثمر خدا و پیمبرؐ کا لطفِ خاص　　ایماں کا وہ نہال ہیں قرآں کی آیتیں
وارثِ الٰہی کے سایہ میں انسانیت پلی　　وہ پرچمِ ہلال ہیں قرآں کی آیتیں

بیانِ حقیقت

از جناب عروج زیدی

یہ تخلیقِ جہانِ مور و ماہی　　دکھائی تھی انھیں عالم پناہی
ادا امر کو دیا رنگِ نواہی　　دلِ گمراہ! یہ تیری تباہی!!
درِ خیر الوریٰ ہی ایک در ہے　　جہاں دُھلتی ہے ماتھے کی سیاہی
عرب کے ساربانوں کا مقدر　　جنھیں بخشا گیا اعزازِ شاہی
علم بردارِ امن و عافیت ہے　　احد کا اشجعِ عالم سپاہی
زباں کھولوں بھی کیوں بیشِ دکم پر　　مرا حصہ بہ تائیدِ الٰہی
خدا والوں کا تکیہ ناخدا پر　　قیامت ہے ہماری کم نگاہی
محبت مائلِ الفقر فخری　　سیاست کو غرورِ کج کلاہی
مرے سر پر ہے دامانِ محمدؐ　　یہ فطرت کا سلوکِ خیر خواہی
وہ جن کے دل ابھی اجلے نہیں ہیں　　وہ کیا دھوئیں گے ماتھے کی سیاہی
غلامِ صاحبِ ہر دو سرا ہوں　　مری ٹھوکر پہ تاجِ بادشاہی
عروجؔ! ایماں بھی ناقص ہے نظر بھی　　تباہی! اور پھر ایسی تباہی!!

تضمین بر کلام اقبال

از جناب ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خانصاحب منشاء

ہے میرے دم سے ہاؤ ہو میکدۂ حیات میں
جذب و جنونِ عشق ہے میرے تصرفات میں
مجھ سے ہے ہمہمہ تمام عالم شش جہات میں
میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

میرے ہی دم سے رنگ ہے محفل کائنات میں
حسن عمل کا دخل ہے میرے کمال ذات میں
خوبیٔ خاص ہے نہاں میری ہر اک بات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

فیض و فورِ شوق سے حوصلے ہیں مرے بلند
ڈال رہا ہوں آج میں ماہ و نجوم پر کمند
میرے لیے ہے وجہ ناز میرا یہ قلب دردمند
"گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند میری فغاں سے رستخیز کعبۂ و سومنات میں"

اپنی صفات ہی کا رنگ تو نے ہر مجھ میں بھر دیا
خاک کے پتلے کو شرف کتنا بڑا عطا کیا
تجھ سے مگر مجھے گلہ اتنا ہے اے مرے خدا
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھکو بھی فاش کر دیا میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

باب التقریظ والانتقاد

الجزء الاول

من

الابواب والتراجم للبخاری

از

مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی

از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، متوسط تقطیع کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ صفحات ۲۰۴ قیمت تحریر نہیں۔ پتہ (۱) مکتبہ یحیویہ مظاہر العلوم سہارنپور (۲) مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۳) مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ (سعودی عرب)

صحیح بخاری حدیث کی سب سے معتبر و مستند کتاب ہے، اس کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے، اس لیے امت نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، اس کے متعلق بے شمار کتابیں اور شرحیں لکھی گئی ہیں، اور وہ ہر زمانہ میں درس و تدریس کا لازمی جز رہی ہے،

منجملہ دیگر اسباب کے صحیح بخاری کی دوسری کتب حدیث پر فضیلت و تقدم

کی ایک اہم وجہ اس کے ابواب وتراجم بھی ہیں، جو امام بخاریؒ کی عظمت شان، جلالت قدر، جودت طبع، ذہن رسا، دقیقہ سنجی، نکتہ آفرینی، بالغ نظری، کثرت استحضار، وفور علم، تفقہ واجتہاد اور استخراج واستنباط وغیرہ کا حیرت انگیز نمونہ ہیں، اور یہ وہ محدثین اور علمائے فن کے غور وفکر کا مرکز رہے ہیں، اور انھوں نے ان کی حقیقت تک رسائی کی کوشش کی ہے۔

صحیح بخاری کی بعض شرحوں میں ابواب وتراجم کی جانب خاص توجہ کی گئی ہے، اور ان کے متعلق مستقل کتابیں اور علیحدہ رسالے بھی لکھے گئے ہیں، مگر متقدمین کی اکثر کتابوں کی طرح یہ اب ناپید ہیں، اور محض متداول شرحوں میں کہیں کہیں ان کے حوالے ملتے ہیں، ہندوستان کے علماء میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے صحیح کے ابواب وتراجم پر بیش قیمت رسالے تحریر کیے ہیں، جو طبع ہوچکے ہیں۔

موجودہ زمانے کے نامور محدث مولانا محمد زکریا صاحب کی عمر گرامی حدیث نبوی کی خدمت اور درس وتدریس میں گذری ہے، اور انھوں نے کئی اہم کتب حدیث کے شروح وحواشی اور ان سے متعلق مفید اور بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں، صحیح بخاری بھی عرصۂ دراز تک انکے درس ومطالعہ میں رہ چکی ہے، اسلیے اسکے مباحث پر انکی نظر نہایت عمیق اور گہری ہے، اس سلسلہ میں انکو ابواب تراجم کے موضوع پر بھی غور وفکر کا موقع ملا اور وہ اپنے مطالعہ وتحقیق کے نتائج قلمبند کرتے رہے۔

یہ عظیم الشان علمی ودینی ذخیرہ کئی جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی حیثیت دراصل بخاری انسائیکلوپیڈیا کی ہے، اس کے شروع میں ابواب وتراجم کے متعلق بڑے اہم اصول تحریر کیے گئے ہیں، اس لیے ان کو علیحدہ ایک جلد میں

پہلے شائع کیا گیا ہے، یہ چار حصوں میں منقسم ہے،

پہلے حصہ میں بخاری کے تراجم کی اہمیت اور ان پر لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ ہے، دوسرے میں ان مجمل اصول و قواعد کا ذکر ہے جو بخاری سے متعلق کتابوں اور شرحوں میں تراجم کے بارہ میں بیان کیے گئے ہیں، تیسرا حصہ اسی کی تفصیل ہے، اس میں نمبروار ستر اصولوں کی تشریح و توضیح کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اقوال و آراء کا جواب دیا گیا ہے جو ابواب و تراجم کی عدم مناسبت کے متعلق ظاہر کیے گئے ہیں، آخر میں ان ابواب و تراجم کا جدول دیا گیا ہے جن میں مسند حدیثیں درج نہیں ہیں، یہ جدول شیخ الہند کے رسالۂ تراجم سے ماخوذ اور حسب ذیل چار نوعیتوں کا ہے :-

(۱) وہ ابواب و تراجم جو گو مسند حدیثوں سے خالی ہیں مگر ان میں کوئی آیت، حدیث، اثر یا سلف کا قول موجود ہے،

(۲) وہ ترجمے جن میں نہ مسند روایت ہی ہے، اور نہ کوئی اور حدیث و آیت وغیرہ مگر نفس آیات ان کے ابواب کا عنوان ہیں،

(۳) ایسے تراجم جو مسند روایتوں سے بھی خالی ہیں، اور ان میں کوئی حدیث واثر اور آیت بھی درج نہیں ہے، بلکہ مصنف نے ان کا ترجمہ اپنے قول کو بنایا ہے،

(۴) وہ ابواب جو بلا ترجمہ ہیں،

شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ایک پر مغز مقدمہ ہے، اس میں تراجم کی اہمیت، ان کے متنوع مقاصد، ان کے غموض و خفا کے اسباب، صحیح بخاری کے ساتھ علماء کے غیر معمولی اشتغال و اعتناء، ابواب و تراجم کے متعلق

دیم تصنیفات اور زیر نظر کتاب کے بعض خصوصیات وغیرہ کا ذکر ہے،

اس رسالہ کے تیسرے حصہ میں جن ستر اصول تراجم کا مفصل ذکر ہے، وہ مصنف کی کتاب لامع الدراری کے مقدمہ میں بھی شامل ہیں، ان میں زیادہ تر شاہ ولی اللہؒ اور شیخ الہندؒ کی کتابوں، حافظ ابن حجرؒ، علامہ عینیؒ، قسطلانیؒ اور سندھی کی شروح و حواشی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا انور شاہ کشمیری، کے افادات سے ماخوذ و مستنبط ہیں، لیکن متعدد اصول خود صاحب رسالہ کے فکر و مطالعہ اور ذوق و وجدان کا نتیجہ ہیں،

یہ حصہ مصنف کے رسوخ فی الحدیث، وسعت علم و نظر اور کثرت مطالعہ و تدبر کا شاہکار ہے،

جن ابواب و تراجم سے عام شارحین سرسری گذر گئے ہیں یا ان کی ایسی دور از کار تاویل و توجیہہ کی ہے، جس نے امام بخاری کی ذات کو ہدف طعن و اعتراض بنا دیا ہے، ان ابواب میں مصنف علام کے ذوق سلیم اور نکتہ سنج ذہن نے عجیب عجیب حقائق و معارف کا سراغ لگایا ہے، اور ان کی حدیثوں سے مناسبت کے ایسے دقیق پہلو اور لطیف نکتے واضح کیے ہیں، جن سے امام صاحب پر عائد کردہ الزامات نہ صرف رفع ہو گئے ہیں، بلکہ وہ ان کی عظمت و کمال کی دلیل بن گئے ہیں،

جن ابواب و تراجم اور ان کی احادیث کے درمیان عدم مناسبت کو عموماً نقل کی مسامحت، امام صاحب کے وہم یا مسودہ کی تکمیل اور باقاعدہ ترتیب سے پہلے ان کی وفات یا ان کی اپنی شرط اور معیار کے مطابق حدیث نہ ملنے یا راویوں کے

اضافہ و تصرف وغیرہ کا نتیجہ بتایا جاتا ہے، مولانا نے اس طرح کے تمام ابواب و تراجم اور ان کی حدیثوں کے درمیان ایسی دلنشین مناسبت بیان کی ہے کہ ان سب الزامات کی مکمل تردید ہو گئی ہے اور وہ خود شارحین کے قصور فہم اور قلت تدبر وغیرہ کا نتیجہ معلوم ہونے لگے ہیں، ع

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

کتاب کا زیادہ حصہ اخذ و اقتباس پر مشتمل ہے، اور مصنف علام نے عموماً متقدمین کے اقوال اور اکابر کے بیانات کے دائرے کے اندر رہ کر انکی روشنی میں بخاری کے ابواب و تراجم کے اسرار و غوامض حل کیے ہیں، مگر جہاں یہ صورت ممکن نہیں تھی تو وہاں اپنے نتائج تحقیق بیان کیے ہیں، اور کہیں کہیں پورے ادب و احترام کے ساتھ اسلاف کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے، یا انکے مختلف آراء میں تطبیق و ترجیح دیکر اپنی مرجح رائے تحریر کی ہے،

مصنف نے بالکل غیر جانب داری سے بخاری شریف کا مطالعہ کیا ہے، اسلیے ان کو عام شارحین کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرنے اور ان کے آراء پر نقد و جرح کرنے میں تامل نہیں ہوا ہے، ان کی حق طلبی اور انصاف پسندی نے ان کو علامہ عینی کے مقابلہ میں حافظ ابن حجر کی ہمنوائی اور اپنی جماعت کے ممتاز بزرگ شیخ الہند سے بھی کہیں کہیں اختلاف کرنے پر آمادہ کر دیا ہے،

دوسرے بزرگوں کے جو اصول تحریر کیے ہیں ان کی توضیح کے لیے ان کے حوالے سے مثالیں بھی نقل کی ہیں، اور جن مثالوں میں انکو کوئی غلطی نظر آئی ہے،.... انکی تصحیح کر دی ہے، اور اصول و مباحث کے سلسلہ میں ان بزرگوں کے یہاں مثالیں نہیں

ہیں، خود تلاش و تفحص کرکے اس کی مثالیں دی ہیں، کسی بزرگ کے اصول کے
ن میں اس کی تائید میں ملنے والے دوسرے بزرگوں کے بیانات بھی نقل کیے ہیں
ور خود اپنے اصولوں کی تائید میں اگر متقدمین کے یہاں اس نوعیت کے معلومات
لے ہیں تو ان کو ذکر کر دیا ہے،

جن ابواب و تراجم کے مختلف الفاظ مروی ہیں ان کی تصریح اور مرجح روایت
کی نشاندہی کی گئی ہے،

بعض اصولوں میں باہم بڑی یکسانیت ہے۔ اس لیے ان کے دقیق فرق کو واضح
کرکے التباس رفع کر دیا گیا ہے،

غرض بخاری کے ابواب و تراجم کے متعلق مختلف کتابوں میں جو کچھ منتشر مواد
تھا وہ سب اس میں مفید اضافہ و تشریح کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے، اس اعتبار سے
یہ کتاب نہایت جامع اور معلومات افزا ہے،

اس کتاب کے محاسن کے ساتھ اس کے مسامحات کا مختصر ذکر اس لیے بھی
ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے آیندہ اس کی تصحیح میں مدد ملے گی،

صفحہ ۱۱ پر صاحب نزہۃ الخواطر کے حوالہ سے علامہ شبلی مرحوم کی ایک مسامحت
کا ذکر ہے کہ "انھوں نے گلشن ہند کے حاشیہ میں شیخ ولی اللہ دہلوی المتخلص باشتیاق
کو جو شعر و تصوف اور علم تفسیر میں صاحب کمال اور شیخ عبدالاحد بن محمد سعید
سرہندی کی اولاد میں تھے، اور حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی کو
ایک ہی شخص قرار دیا ہے، لیکن اصلاً یہ صاحب گلشن ہند کی غلطی ہے، مولانا شبلیؒ نے خود
اس قسم کی کوئی تصریح نہیں کی ہے، البتہ انھوں نے گلشن ہند کے اشتباہ میں ڈالنے والے

بیان کی تردید بھی نہیں کی ہے ،

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے اصولوں کے سلسلہ میں صفحہ ۴۳ و ۴۴ پر بارہویں اور تیرہویں اصول کو علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ انکو ایک ہی اصل میں شامل کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ خود مصنف نے شیخ الہند کے متعلق بیان کیا ہو کہ وہ ان کو ایک ہی اصل مانتے تھے ،

بعض جگہ کتابوں کے نام اتنے مختصر ومبہم ہیں کہ ان کی جانب ذہن آسانی سے نہیں منتقل ہوتا، مثلاً صفحہ ۳۲ پر حدیث طلا وسط کو اگر حدیث للطبرانی فی الاوسط لکھا جاتا تو ذہن آسانی سے منتقل ہو جاتا ،

عبارتوں کے نقل واقتباس میں حذف وترمیم کی وجہ سے کہیں کہیں مفہوم میں تبدیلی یا کم از کم ان کی وضاحت مشکل ہو گئی ہے ،

بخاری کے ابواب کے ناموں کو مختصراً ذکر کرنے کی وجہ سے بھی کہیں کہیں مصنف کا منشا پوری طرح واضح ہونے سے رہ گیا ہے ،

طباعت میں صحت کے اہتمام کے باوجود بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں، چند غلطیاں نقل کی جاتی ہیں .تاکہ دوسرے اڈیشن میں ان کی تصحیح کر دیجائے ،

غلط	صحیح
ص ۲۳ ۔ باب اثنان فما فوقہا جماعۃ	فوقہما
ص ۲۷ ۔ یہدی طالب الحدیث علی ہذا النوع	الی
ص ۲۳ ۔ باب المزایدہ	باب بیع المزایدۃ
ص ۳۹ ۔ بین ما روی عن عمر بن الخطاب وامیۃ رضی اللہ عنہما	ابنہ

غلط	صحیح
ص ۰۴۔ جعلها الی شیخ الهند	جعلها شیخ الهند
ص ۴۱۔ باب ذلک المرأة	ذلک (اس کا پورا نام باب ذلک المرأة نفسها اذا تطهرت من المحیض ہے پورا نام نہ لکھنے سے بڑا اشتباہ ہو گیا ہے)
ص ۱۷۔ فی کم تصلی المرأة من الباب	من الثیاب
ص ۲۷۔ ویقول الحسن قال زفر	ویقول الحسن قال بہ زفر
" باب ابواب الابل	باب ابوال الابل
ص ۴۷۔ باب الصلوٰة	باب الصلوٰة فی الخفاف
ص ۸۷۔ رأی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی اصحابہ فتاخر	"تاخرا"
ص ۹۲۔ باب علامة المنافق	باب علامات المنافق
ص ۹۹۔ باب وجوب الباب	باب وجوب الصلوٰة فی الثیاب
ص ۱۱۰۔ تقدم فی الفائدة الثالثة	الثانیة
ص ۱۲۵۔ باب الحکم من قذف مملوکہ	اثم ۔ قذف
ص ۱۲۷۔ باب المهر وجزاء الصید	المحصر
ص ۱۲۸۔ من استاجر اجیرا فبین	
ذالاجل	لہ الاجل

آخر میں شیخ الهند مولانا محمود حسن دیوبندی کے رسالہ سے جو جدول نقل

کیا گیا ہے۔ اس میں کہیں کہیں حاشیے میں اختلاف نسخ کا ذکر اور اس فرق کی تصریح کی گئی ہے، جو اصل اور جدول کے درمیان ہے۔ مگر اس قسم کے اور متعدد ابواب پر حواشی تحریر کرنا رہ گیا ہے،

دار العلوم ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والی کتابوں میں مفصل فہرست اور اسماء و اعلام کا اشاریہ شامل رہتا ہے، لیکن تعجب ہے کہ یہ اہم اور بیش قیمت کتاب فہرست اور انڈکس سے خالی ہے،

تذکرۃ المحدثین

حصہ اول)

اس میں دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام جن میں صحاح ستہ کے تمام مصنفین بھی داخل ہیں، مثلاً امام مالک، امام ابوداؤد طیالسی، امام عبدالرزاق بن ہمام، امام عبد اللہ ابن زبیر حمیدی، امام ابوبکر بن ابی شیبہ، امام اسحاق بن راہویہ، امام احمد بن حنبل، امام عبد اللہ دارمی، امام بخاری، امام مسلم، امام ابن ماجہ، امام ابوداؤد سجستانی، امام ترمذی، وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات و سوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

مؤلفہ ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین

ضخامت ۴۳۰ صفحات، قیمت ۵۰ روپیے

منیجر

مطبوعات جدیدہ

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک جناب خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی تقطیع بڑی، ضخامت ۲۵۶ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر۔
قیمت مجلد عـــہ۱۲ پتہ :- انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔

زبان وادب میں ترقی پسندی کوئی نئی چیز نہیں، ہر دور کے ترقی پسند خیالات ورجحانات کا اثر اس دور کے ادب پر پڑنا بالکل قدرتی ہے جس سے اردو بھی مستثنیٰ نہیں، اردو ادب میں ترقی پسند خیالات کی ابتدا سرسید، غالب، حالی، آزاد شبلی اور اقبال کی نظم ونثر سے ہوئی، اور اردو زبان نے خیالات اور طریقۂ تعبیر دونوں حیثیتوں سے ایک نیا قالب اختیار کیا، مگر اس کا دائرہ مسلمانوں کی مذہبی معاشرتی، تعلیمی اور اردو زبان وادب کی اصلاح تک محدود تھا، اس کے بعد بین الاقوامی انقلابات وسیاسیات کا دور شروع ہوا، اور سوویٹ روس کے انقلاب سے ساری دنیا گونج اٹھی، اور ایک طبقہ کی نگاہ میں کمیونزم ہی ترقی پسندی کا معیار قرار پائی، اس لیے دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی اس سے متاثر ہوئی، اور چند برسوں کے اندر اس میں ترقی پسند ادب کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا، لیکن یہ ادب تمامتر کمیونسٹ ادب کی صدائے بازگشت تھا، اس لیے اس کی خوبیاں اور خرابیاں دونوں اس کے حصہ میں آئیں، اور ابتدائی دور میں

اس میں بڑی بے اعتدالی ہوئی، ترقی پسند نوآموز شاعروں اور ادیبوں نے جو کمیونزم کو سمجھتے بھی نہ تھے، صرف بازار میں اس کا چلن دیکھکر اس کی لے میں لے ملانے لگے تھے، اس کی بڑی مکروہ تصویر پیش کی، اس کے انتہا پسندوں نے اس ادب کو محض کمیونزم کے پروپگنڈے کا ذریعہ اور ہر قدیم چیز سے بغاوت کو شعار بنا لیا، اور تعمیر کے بجائے تخریب کے نعرے لگانے لگے، اور عوامی ادب کی دھن میں یا عجز کی بنا پر اردو زبان کی پرانی روایات کو بھی نظرانداز کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیا ادب خیالات اور ادبی پہلو دونوں حیثیتوں سے سنجیدہ ادبی حلقوں میں اعتبار پیدا نہ کر سکا، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس میں اعتدال پیدا ہونے لگا، اور اس کے سنجیدہ ادیبوں نے تعمیری اور ادبی دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھا، درحقیقت یہی ترقی پسند ادب کا صحیح نمونہ ہے، اس کی تاریخ پر مضامین تو بہت لکھے گئے، لیکن غالباً کوئی مستقل کتاب نہ تھی، اس لیے لائق مصنف نے اس کو اپنے پی، ایچ، ڈی کے مقالہ کا موضوع بنایا، اب انجمن ترقی اردو نے اس مقالہ کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے، یہ تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی تاریخ ہے، دوسرے میں اس کے ادبی ذخیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے، تیسرے میں ترقی پسند ادیبوں کے تنقیدی خیالات پر تبصرہ ہے، مصنف نے بڑی محنت اور تلاش و تحقیق سے یہ کتاب لکھی ہے، اس کے لیے ترقی پسند ادب کا پورا دفتر کھنگالا ہے، اور بڑے اعتدال و توازن اور حسن مذاق سے اس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس سے اس کی پوری سرگذشت اور اس کا ہر رخ سامنے آجاتا ہے، مصنف ایک مشاق اہل قلم اور دیدہ ور نقاد ہیں، یہ خصوصیت اس کتاب میں بھی نمایاں ہے، اس سے اردو کے ادبی ذخیرے میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا،

علماء اہل سنت ۔ از مولانا محمود احمد صاحب قادری تقطیع بڑی، ضخامت ۳۷۶ ص کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت للعہ ۔ پتہ :- خانقاہ قادریہ اشرفیہ اسلام آباد، بھوانی پور، پوسٹ سنبرساڈہیہ ضلع مظفرپور، بہار۔

یہ بریلوی عقیدے کے علماء کا تذکرہ ہے۔ اہل سنت میں تو شیعہ کے علاوہ ایمۂ اربعہ کے مقلد، دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث سب داخل ہیں، لیکن بریلوی حضرات نے غالباً اہل بدعت کے مقابلہ میں اپنے لیے اہل سنت کی اصلاح مخصوص کرلی ہے، جو لوگ ان کے ہم عقیدہ نہیں ہیں، ان کو وہ اہل سنت سے خارج سمجھتے ہیں، ان میں بھی بڑے بڑے مشائخ وعلماء گذرے ہیں، مگر ان میں سے بہت کم لوگوں کے حالات لکھے گئے ہیں، اس لیے ان کا تذکرہ لکھنے کی ضرورت تھی، علماء اہل سنت انہی کے حالات پر مشتمل ہے، اس میں بہت سے معروف و غیر معروف علماء کے حالات آگئے ہیں، مگر بعض ایسے علماء کو بھی شامل کرلیا گیا ہے جو کسی حیثیت سے اس زمرہ میں نہیں آتے، مثلاً مولانا بحر العلوم اور مولانا عبد الحئی فرنگی محلی اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا گنج مرادآبادی تو اپنے دور کے بہت بڑے متبع سنت اور مخالف بدعت تھے، ان کے علاوہ بھی ایسے علماء ہیں جو بریلوی علماء کے زمرہ میں نہیں آتے، ہمارے لائق دوست مختار الدین احمد صاحب آرزو کے متعلق اس کتاب سے انکشاف ہوا کہ وہ بھی علمائے اہل سنت میں ہیں، اگر ایسا ہے تو لائق مبارک باد ہیں،

جن کو بریلوی اہل سنت سمجھتے ہیں، ان کے بھی دو طبقے ہیں، ایک متین و معتدل جو اپنے عقائد و رسوم کے تو پابند ہیں، لیکن کسی کو برا بھلا نہیں کہتے، انکے

تعلقات دیوبند اور اہل حدیث سب سے ہیں، مثلاً پھلواری اور فرنگی محل کے علماء، دوسرا طبقہ اپنے خلاف عقیدہ رکھنے والوں کی تکفیر وتفسیق بھی ضروری سمجھتا ہے، یہ کتاب بھی ان پر طنز وتعریض سے خالی نہیں ہے، بعض باتیں بالکل بے بنیاد ہیں، مثلاً شاہ عبداللطیف ستھنی بہادر شاہ ظفر کے لڑکے تھے، ان خامیوں سے قطع نظر، کتاب اس حیثیت سے مفید ہے کہ اس کے ذریعہ بہت سے علماء ومشائخ اور اصحاب علم وکمال کے حالات محفوظ ہو گئے،

نقشہائے رنگ رنگ۔ از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی۔ تقطیع بڑی، ضخامت ۱۵۴ صفحات۔ کاغذ، کتابت وطباعت نفیس، قیمت سات روپے۔ پتہ: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

غالب کی شہرت کی بنیاد زیادہ تر ان کا اردو کلام ہے، لیکن اس کو وہ "بے رنگ" اور اپنے کمال کا اصلی تماشاگاہ فارسی کے "نقشہائے رنگ رنگ" کو سمجھتے تھے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ان کے فارسی کلام میں اہل زبان کا لطف ہے، اور وہ تخیل کی رفعت وندرت میں اردو کلام سے بڑھا ہوا ہے، لیکن ان کے اردو کلام کے تخیل کی نزاکت بعض اوقات اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اس کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، اور فارسی کے تو جاننے والے بھی اب بہت کم رہ گئے ہیں، اس لیے اردو کلام سے لطف اٹھانے والے تو بہت ہیں، لیکن فارسی کلام کے سمجھنے والے بھی مشکل سے ملیں گے، لائق مترجم نے اردو داں طبقہ کو غالب کے فارسی کلام سے مانوس کرنے کے لیے ان کی غزلوں کے منتخب اشعار اور ان کی مثنویوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے مقابل میں اصل فارسی اشعار بھی دیدیے ہیں، انتخاب کا معاملہ ذوقی ہے، مگر اس انتخاب

میں خوش ذوقی نمایاں ہے، اس ترجمہ میں مترجم کے والد ماجد مولوی ضیا احمد صاحب بدایونی کا مشورہ شریک رہا ہے جو فارسی زبان کے مسلّم اساتذہ میں ہیں، اس لئے ان کا نام ترجمہ کی صحت اور خوبی کی پوری ضمانت ہے، امید ہے کہ اردو کے اصحاب ذوق اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

انوار سحر ۔ از ڈاکٹر انوار الحسن صاحب، صدر شعبۂ علوم مشرقی و عربی و فارسی، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۴۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، قیمت مجلد للعہ۔ پتہ: (۱) ادارہ صبح ادب، گلی نظام الملک اردو بازار دہلی (۲) ادارہ صبح ادب، بی، این ورار روڈ، لکھنؤ۔

انوار سحر ڈاکٹر انوار الحسن کے کلام کا مجموعہ ہے، ان کی علمی حیثیت سے تو واقفیت تھی، لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیت ہمارے لیے نیا انکشاف ہے، اور اس کمال کے ساتھ کہ ان کا کلام کہنہ مشق شعراء کے کلام کی ہمسری کرتا ہے، اس کی نمایاں خصوصیت اس کی دردمندی اور سوز و تپش ہے، جو ان کی جوانمرگ اہلیہ کی وفات کا نتیجہ ہے۔ غالباً اسی حادثہ نے ان کو شاعر بنایا ہے، اس لیے کہ پورا کلام درد و الم میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر شعر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے اس تاثر کے ساتھ ادبی محاسن سے بھی پوری طرح آراستہ اور دردمند اصحاب دل کے مطالعہ کے لائق ہے۔

م

مفتاح التبلیغ ۔ افادات مولانا محمد حسن خاں صاحب میواتی، ترتیب مولوی ابو عبید اللہ حکیم محمد حسن خاں صاحب میواتی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۵۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپے ۵۰ پیسے، ناشر

کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی ۶

اس کتاب میں تبلیغی جماعت کے مندرجہ ذیل چھ نمبروں کی مفصل تشریح و توضیح کی گئی ہے (۱) کلمۂ طیبہ (۲) نماز (۳) علم وذکر (۴) اکرام مسلم (۵) اخلاص نیت (۶) تفریغ وقت اور ان شش گانہ اصولوں کی اہمیت، ضرورت اور ان کے فضائل کی آیتیں اور حدیثیں جمع کرکے امت کے منصب دعوت و امامت اور دینی جد وجہد کی اہمیت بیان کی گئی ہے، اور آخر میں تبلیغی جماعت کے بعض خاص اشغال و امور نظم جماعت، تقسیم کار، ترتیب اوقات، امیر و مامور کے فرائض، سفر، گشت، مجالس و اجتماعات کے آداب اور تقریر، بیان اور تبلیغ و دعوت وغیرہ کے متعلق ضروری ہدایات تحریر کی گئی ہیں اور انکے متعلق مولانا محمد الیاسؒ کے ارشادات وملفوظات بھی نقل کیے گئے ہیں، [کزرع اخرج شطأہ] میں شطأ کا ترجمہ بال صحیح نہیں کیا گیا ہے صحیح ترجمہ انکھوا، پٹھا اور سوئی وغیرہ ہوگا، آیت قرآنی کے کلمہ طیبہ کا مفہوم اصطلاحی کلمہ طیبہ میں حصر کرنا اور جہاد و قتال کی آیتوں کو تبلیغی جماعت کے دوروں اور چلوں پر منطبق کرنا محل نظر ہے، آیت ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کو غلط نقل کیا گیا ہے، کتاب کی زبان سادہ و سلیس ہے، اور یہ نہ صرف تبلیغی جماعت کے کارکنوں بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہے۔

حیات مسلم، چاند تارے اور آسمان، اسلام کیوں۔ مرتبہ مولانا سید محمد میاں صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات بالترتیب ۱۱۲، ۴۸، ۳۲، قیمت عہ، ۵ پ، ۵ پیسے، ۲۰ پیسے۔ پتے (۱) الجمعیۃ بکڈپو، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶ (۲) کتابستان، گلی قاسم جان، دہلی ۶

پہلے کتابچہ میں مسلمان کی پیدائش سے وفات تک کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق اسلامی ہدایات و تعلیمات بیان کی گئی ہیں، اس میں عبادت، معاملت، اخلاق اور معاشرت و معیشت وغیرہ کے متعلق ضروری احکام آگئے ہیں ضمناً ان رسوم اور بدعات وغیرہ کی بھی تردید کی گئی ہے جو مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہوگئی ہیں، اور جن کی کوئی شرعی سند نہیں ہے، دوسرے میں خلائی پرواز کے نتیجے میں چاند، تاروں اور آسمان کے بارہ میں پیدا شدہ سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں، اور انکے متعلق قدیم علمائے ہیئت و فلاسفہ اور جدید سائنسدانوں کے خیالات پیش کیے گئے ہیں، تیسرے میں اسلام کی حقیقت اور اسکی تعلیمات کے امن و سلامتی کے ضامن ہونے کی وضاحت کی گئی ہے، ان کتابچوں کی زبان آسان و عام فہم اور پیرایۂ بیان دلکش ہے۔

"ض"

کتب دارالمصنفین

سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و سیر التابعین و تبع تابعین، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، سوانح، ادبی و فلسفیانہ کتابوں اور مولانا شبلی کے مقالات کے مستقل سلسلوں کے علاوہ جو بیحد مقبول ہیں اور جن میں سے ہر کتاب کے اب تک کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں مختلف موضوع پر اور بھی بہت سی کتابیں دارالمصنفین نے شائع کی ہیں جن کی مجمل فہرست یہ ہے:-

تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ محمد الخضری مرحوم کا دلنشین ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات بتفصیل بیان کی گئی ہیں۔ ۴۹۰ صفحے قیمت [illegible]

اسلام کا سیاسی نظام: اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اٹھارہ ابواب کے تحت اسلامی دستور کے تقریباً تمام اصولی اور سیاسی پہلو آگئے ہیں، ۳۰۰ صفحے قیمت ۶-۰۰ روپئے

حکمائے اسلام (حصہ اول) پانچویں صدی ہجری تک کے تمام مشہور حکماء و فلاسفہ کے سوانح و حالات اور ان کے علمی و فکری کارنامے، ۴۰۵ صفحے، قیمت [illegible]

حکمائے اسلام (حصہ دوم) متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات اور ان کی علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل، ۳۵۱ صفحے قیمت ۰۰-

طبقات الامم: اندلس کے نامور فاضل صاعد اندلسی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ، ۱۵۰ صفحے قیمت [illegible]

انقلاب الامم: ڈاکٹر لیبان کی کتاب کے عربی ترجمہ سر تطور الامم کا ادیبانہ و انشاپردازانہ ترجمہ؛ ۱۸۰ صفحے، قیمت: ۴-۰۰

ارض القرآن (حصہ اول) سرزمین قرآن یعنی عرب کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام و ملل و قبائل کا ذکر ہے، ان کی تاریخی و اثری تحقیق، ۳۲۰ صفحے قیمت ۶-۲۵

ارض القرآن (حصہ دوم) بنو ابراہیم کی تاریخ اور عربوں کے قبل از اسلام، تجارت، زبان و مذہب پر تحقیقات و مباحث، ۲۳۰ صفحے، قیمت: ۴-۲۵

خطبات مدراس: مولانا سید سلیمان ندوی کے سیرت نبوی سے متعلق خطبات کا مجموعہ، جس میں دارالمصنفین کے سلسلہ سیرۃ النبی کا پورا خلاصہ اور حیات نبوی کے تمام پہلو آگئے ہیں، ۲۰۰ صفحے قیمت ۴-۰۰

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

سلسلۂ مقالاتِ سلیمان

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف موضوع پر متعدد بلند پایہ اور اہم تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی و مذہبی و تحقیقی و تاریخی و ادبی و تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں، اب اُن کی وفات کے بعد ان کے مقالات کی ترتیب و تدوین و اشاعت کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے، اب تک اُن کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کی فہرست یہ ہے،

مقالاتِ سلیمان حصۂ اوّل

(تاریخی)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی
بدنصیب کشمیر اور سلسلۂ شاہجہانی کا نقشِ نگیں
لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان
تاج محل اور لال قلعہ کے معمار
استاد احمد معمار کے خاندان کی ایک اہم یادگار،
نالندہ کی سیر
قنوج،
سلطان ٹیپو کی چند باتیں،
۴۱۵ صفحے، قیمت ۹ روپئے،

مقالاتِ سلیمان حصۂ دوم

(علمی)

ہندوستان میں علم حدیث،
فرنگی محل اور علم حدیث
محمد بن عمر الواقدی اور سیرت
عرب و امریکہ، اسلامی رصد خانے
کتب خانہ اسکندریہ،
اسلامی ہندوستان کا عہد آخر،
مرزا بیدل، حکیم سنائی کے سنینِ عمر
سفرِ گجرات کی چند یادگاریں،
انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ
کتب خانہ حمیدیہ بھوپال،
۴۱۵ صفحے قیمت ۹ روپئے،

مقالاتِ سلیمان حصۂ سوم

(مذہبی)

علوم القرآن، اسماء القرآن
القرآن والفلسفۃ الجدیدۃ،
مسئلۂ ارتقاء اور قرآن مجید،
قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات،
تذکار نزول القرآن،
لفظ صلوٰۃ قرآن مجید میں،
قربانی کا اقتصادی پہلو،
سود اور صحفِ انبیاء، تحریمِ شراب
قرآن پاک کا تاریخی اعجاز،
خلیل اللہ کی بشریت
۴۲۵ صفحے قیمت ۹-۲۵ پیسے،

منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۳)

اکتوبر ۱۹۷۲ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

جلد ۱۱۰ ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۲ء عدد ۴

مضامین

مقالات

بَابُ التَّقرِیظِ وَالاِنتِقَاد

شذرات

نظام تعلیم میں حکومت جو اقدامات کر رہی ہے اس سے تعلیم کو قومیانے کا رجحان ظاہر ہو رہا ہے، اس کی زد میں اقلیتوں کے تعلیمی ادارے بھی آئیں گے، جو کسی حیثیت سے بھی ایک جمہوری اور سیکولر حکومت کے لیے زیبا نہیں ہے، تعلیم کا مقصد ذہن و دماغ کی آزادانہ تربیت اور نشو ونما ہے، قومیانے کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم حکومت کے تابع ہو جائے جو تعلیم کی آزادی کے سراسر خلاف ہے، تعلیم میں تو شخصی حکومتوں نے بھی کبھی مداخلت نہیں کی، خود اسلامی ہند میں ہندو مسلمانوں کے ہزاروں لاکھوں مدارس تھے، ان میں بہت کم ایسے تھے جو حکومت کے ماتحت رہے ہوں، بیشتر مدارس علماء اور اہل خیر قائم کرتے تھے، اور وہی ان کو چلاتے تھے، زیادہ سے زیادہ حکومت بعض مدارس کی امداد کرتی تھی، مگر اس کے نظام میں اسکو دخل دینے کا حق نہ تھا، اس لحاظ سے اس دور میں تعلیم صحیح معنوں میں پبلک کے ہاتھوں میں تھی، اس آزادی کو قائم رکھنے کے لیے عربی مدارس نے نہ انگریزوں کی حکومت کی امداد قبول کی اور نہ اب قومی حکومت کی، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ان مدارس کے علماء ہندوستان کی آزادی میں پیش پیش تھے، سارے متمدن اور جمہوری ملکوں میں تعلیم آزاد ہے، حکومتیں جن یونیورسٹیوں کی امداد بھی کرتی ہیں ان میں بھی ان کو مداخلت کا حق نہیں ہے،

تعلیم کو قومیانا سوویٹ یونین کی ایجاد ہے، جس کو قوموں کی آزادی اور مساوات کا

بہت بڑا وکیل سمجھا جاتا ہو لیکن حقیقۃً وہ انتہا درجہ کی مستبد حکومت ہو جس میں جذبات وخیالات پر بھی
پابندی ہے، حکومت پر کسی تنقید کو برداشت نہیں کیا جاتا، اس کی سزا قتل یا جلا وطنی ہے، وہ
زبان سے تو اپنی اقلیتوں کی مذہبی آزادی اور ان کی زبان اور تہذیب کے تحفظ کی مدعی ہے
لیکن عمل یہ ہے کہ سویٹ یونین کی مسلم ریاستوں کے مسلمانوں کو جن کی تعداد کئی کروڑ ہے، اتنا مسخ
کردیا ہے کہ وہ صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں، اور اس سرزمین میں جو صدیوں تک اسلامی
علوم وفنون کا مرکز رہ چکی ہے، اور جہاں بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے، اسلام کا نام ونشان
باقی نہیں ہے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ روس سے جو مسلمان طلبہ ہندوستان
میں حصول تعلیم کیلئے آتے ہیں، وہ روزے نماز کے نام تک سے ناواقف ہوتے ہیں، البتہ اس نے
دنیا کو دھوکا دینے کے لیے کچھ آثار قدیمہ رکھ چھوڑے ہیں جن کی ضرورت کے وقت نمائش کردی جاتی
ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ روس سے اسلام ختم ہو چکا ہے اور اسکے بچے کھچے آثار مٹانے کی کوشش برابر جاری ہے،

اس کے ایجنٹ بڑے فخر سے اس کا یہ کارنامہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے روس کے مسلمانوں کی
کایا پلٹ دی ہو، اور انکو تعلیمی تہذیبی اور اقتصادی حیثیت سے بام عروج پر پہنچا دیا ہے، اگر یہ صحیح بھی ہو
تو ایسے عروج اور ترقی سے کیا فائدہ جب مسلمان مسلمان ہی باقی نہ رہے بلکہ دوسری مادہ پرست
قوموں کی طرح ایک قوم بن گئے، یہ ترقی نہیں بلکہ نسل کشی ہے تعلیم کو قومیانے کی ایک دلیل یہ بھی
دیجاتی ہے کہ اس کا مقصد جذباتی ہم آہنگی اور اتحاد و یکجہتی پیدا کرنا ہے، یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے،
اتحاد و یکجہتی تنہا تعلیم کے ذریعہ نہیں پیدا کیجا سکتی، بلکہ بلاتفریق مذہب وملت ملک کے تمام باشندوں کے درمیان
حقوق میں عدل ومساوات اور رواداری وکشادہ دلی سے پیدا ہوتی ہو، کسی اقلیت پر
اسکے ملی مزاج کے خلاف تعلیم مسلط کرنے کا الٹا اثر پڑیگا، اس سے اور زیادہ بے اعتمادی پیدا ہوگی،

جس ملک میں ایک قوم، ایک مذہب اور ایک تہذیب ہو وہاں تو قومیانے کا جواز نکل سکتا ہو، لیکن جو ملک مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہو اور دستور نے ان سب کے تحفظ کی ضمانت بھی دی ہو وہاں تعلیم کو قومیانا دستوری تحفظ کے سراسر خلاف ہے، یہ مسئلہ اس پہلو سے بھی قابل غور ہے کہ جن ملکوں میں ڈکٹیٹرشپ ہے، یا جہاں ہمیشہ ایک ہی پارٹی کی حکومت کا قانون ہو وہاں تو قومیانا شاید مفید ہو لیکن ایک جمہوری ملک میں جہاں برابر حکومتیں بدلتی رہتی ہیں، بلکہ ایک ہی وقت میں مختلف ریاستوں میں مختلف پارٹیوں کی حکومت ہو سکتی ہے تعلیم کو قومیانا خود تعلیم کیلیے مضر ہے، اگر ہر برسر اقتدار حکومت اپنے اپنے نقطۂ نظر سے تعلیم کو قومیاتی رہے تو اس کا سارا نظام چوپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ اسلیے تعلیم کو خاص طور سے اقلیت کے تعلیمی اداروں کو قومیانا دستوری، جمہوری، اور تعلیمی کسی حیثیت سے بھی مناسب نہیں، تعلیم پر حکومت کی نگرانی صرف اسی حد تک ہونی چاہیے کہ اس میں کوئی چیز ملکی مفاد کے خلاف نہ ہو،

لیکن حکومت اور ملک کا مفاد دو الگ الگ چیزیں ہیں، ہندستان میں اس فرق کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے جس سے اقلیتوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہو، یہاں ملکی مفاد نام ہے اکثریت کے جذبات و خواہشات کا، خواہ وہ ملکی مفاد کے کتنے ہی خلاف ہوں، چنانچہ ایک ہی چیز جو اکثریت کے لئے قومیت اور وطنیت کی نشانی سمجھی جاتی ہو، اقلیت کے لیے فرقہ واریت بنجاتی ہے، اکثریت حکومت پر سخت سے سخت تنقید اور اس کی پالیسی کی مخالفت کرے تو اس سے اسکی قومیت اور وطن دوستی میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن اگر اقلیت کسی معاملہ میں ملک کی خیر خواہی میں کوئی ایسا خیال ظاہر کرے جو حکومت کی پالیسی یا اکثریت کے جذبات کے خلاف ہو تو فرقہ پروری اور ملک کے ساتھ غداری ہے، بلکہ اپنے حقوق کا مطالبہ بھی علیحدگی پسندی شمار کیا جاتا ہے، یہ روزانہ کے مشاہدات ہیں جس کی مثال دینے کی ضرورت نہیں،

مقالات

تہذیب کی تشکیل جدید

سیاسی نظام

از جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب، ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۷)

جمہوریت حکومت کی ترقی یافتہ شکل ہے

مغربی تہذیب نے سیاسی نظام میں کافی پیشرفت کر لی ہے، جمہوریت اس کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے، جس تک کافی تجربہ کے بعد پہنچا گیا، اور جس سے بہتر نظام کا تصور سر دست ناممکن ہے، لیکن اتنا عرصہ گذرنے کے بعد بھی نہ اس کی واضح تعریف ہو سکی اور نہ اس کو ٹھیک طرح عملی جامہ پہنایا جا سکا، چنانچہ ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی ثقافتی مجلس نے جو تحقیقاتی کمیٹی جمہوریت پر ریسرچ کیلئے قائم کی تھی، اس نے درج ذیل بنیادی سوال کیے تھے۔

جمہوریت سے متعلق دو بنیادی سوال اور ان کے جواب

(۱) جمہوریت کا مفہوم کیا ہے،

(۲) اکثریت کا فیصلہ کیا ہمیشہ درست ہوتا ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں اکثر لوگوں نے اعتراف کیا کہ جمہوریت ایک مبہم لفظ ہے، جسکا مفہوم اب تک متعین نہیں ہو سکا، اور دوسرے سوال کا جواب یہ دیا گیا کہ اکثریت کے

فیصلہ کو غلطی سے پاک سمجھنا خود زبردست غلطی ہے، کیونکہ انسان خواہ فرد ہو یا جماعت بہرحال انسان ہے، وہ ان کمزوریوں سے پاک نہیں ہوتا جو نوع انسانی کا خاصہ ہیں۔[1]

چند چیزیں جن کی ہر دور کی حکومت میں یکساں ضرورت رہتی ہے، اور جن میں عقل و تجربہ کی رہنمائی کافی نہیں ہے

حکومت کی شکل و صورت کا تعلق چونکہ شعور کی بیداری اور حالات کی تبدیلی سے ہے، جس میں عقل و تجربہ کی رہنمائی سے بڑی حد تک کام چلتا رہتا ہے، اس بنا پر تشکیل جدید میں شکل و صورت سے نہیں بحث کی گئی، بلکہ ان بنیادی چیزوں سے بحث کی گئی ہے، جن میں عقل و تجربہ کی رہنمائی کافی نہیں ہے، اور جن کی ہر دور کی حکومت میں یکساں ضرورت رہتی ہے، مثلاً

(۱) اقتدار اعلیٰ کا تصور (۲) حکومت کی نوعیت (۳) خیر و شر کا معیار،
(۴) جمالیاتی قدریں (۵) قانون سازی کا حق (۶) حقوق و فرائض کی تعیین وغیرہ۔

میکا ولی کا نظریۂ سیاست

مغرب کی سیاست میں ایسی بلند و برتر ہستی کا تصور مفقود ہے جو ہر جہت سے کامل اور ہر قسم کی کمزوریوں سے پاک ہو، اس بنا پر چار و ناچار مذکورہ چیزوں میں انسان کو رہنما تسلیم کیا گیا ہے، اور انسان نے اس سلسلہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، ان کا اندازہ میکاولی (Maciavelli) کے درج ذیل خیال سے ہوتا ہے جس پر مغرب کا سیاسی نظام قائم ہے، ملنچلی کہتے ہیں:-

"میکاولی کے نزدیک قومی مملکت ہی کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی اور انسان کی اصلی غرض و غایت ہے، وہ نفس قوت کی خاطر ترقی قوت کا پرستار ہے، اس سے بحث نہیں کہ یہ قوت کس سمت میں کام کرے گی، اس کی نظر میں سلطنت نہ اخلاقی ہے

---

[1] Democracy in a world of Tension. P.504

نہ قانونی بلکہ وہ محض سیاسی ہے، اور اسی معیار سے سلطنت کے تمام قانون
جانچ لینا چاہیے، اس سلسلہ میں مذہب، اخلاق اور قانون کو خاطر میں لانے
ضرورت نہیں ہے[1]

دوسری جگہ اس کی رائے منقول ہے:-

سلطنت کے قیام و بقا کے لیے "رئیس" کو اکثر اوقات معاہدوں، نیک نیتی، انسانیت
اور مذہب کے خلاف عمل کرنا چاہئے،[2]

ایک اور جگہ ہے:-

جب ملک کی ہستی معرض خطرہ میں ہو تو انصاف اور نا انصافی رحم اور ظلم
قابل ستائش اور شرمناک فعل کسی کا اطلاق نہیں ہوتا اور ان میں سے کسی
کو راہ عمل میں حائل نہ ہونا چاہیے، تمام مواقع کو برطرف کر کے وہی راہ اختیار
کرنی چاہیے جس سے ملک کا وجود اور اس کی آزادی قائم رہے، جو شخص اخلاق
کے عام تصورات سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا اس کے لیے انفرادی زندگی
ہی درست ہے، اسے حکمرانی کی جرأت نہیں کرنی چاہیے۔"[3]

ان کی فطری کمزوریاں | تشکیل جدید میں انسان کی درج ذیل فطری کمزوریوں کا ذکر
جو سب کے نزدیک مسلم اور سب کے تجربہ میں ہیں،

(۱) وہ دل کا کچا ہے

ان الانسان خلق ھلوعا (المعارج) بیشک انسان کچے دل کا پیدا کیا گیا ہے،

---

[1] نظریۂ سلطنت، میکیاولی ص ۲۷ و ۲۸ [2] تاریخ یورپ ص ۱۸۴ [3] تاریخ فلسفۂ جدید
ص ۲۶۔

• وہ کمزور ہے:

وخلق الانسان ضعیفا (النساء) — انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

وہ جلد باز ہے:

وکان الانسان عجولا (بنی اسرائیل) — انسان جلد باز ہے۔

وہ بے صبرا ہے:

اذا مسه الشر جزوعا (المعارج) — جب اس کو برائی (تنگی) پہنچتی ہے تو گھبرا جاتا ہے۔

وہ بے توفیقا ہے:

اذا مسه الخیر منوعا (ایضاً) — جب اس کو بھلائی (فراخی) پہنچتی ہے تو بے توفیقا ہو جاتا ہے

وہ جھگڑالو ہے:۔

وکان الانسان اکثر شئی جدلا (الکہف) — انسان بہت زیادہ جھگڑالو ہے

وہ مال و دولت کی محبت میں سخت ہے،

وتحبون المال حبا جما (الفجر-۱) — تم مال سے جی بھر کر محبت کرتے ہو

آل و اولاد میں اس کے لیے آزمائش ہے:

انما اموالکم واولادکم فتنة (التغابن-۱) — بیشک تمھارے مال اور اولاد تمھارے لیے فتنہ ہیں۔

عورت اس کا سب سے کمزور پہلو ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما رأیت من ناقصات عقل — کسی ذیرک مرد کی عقل سلب کرنے والا

وما رأیت من ناقصات عقل ودین اذھب للب الرجل الحازم من احداکن — تم عورتوں سے زیادہ کسی کو میں نے نہیں دیکھا۔

ظاہر ہے کہ ان فطری کمزوریوں کے ہوتے ہوئے مذکورہ چیزوں میں انسان کی رہنمائی قابل اعتماد نہیں ہوسکتی۔ اس بنا پر تشکیل میں اللہ کی رہنمائی قبول کی گئی ہے، جو ہر حیثیت سے کامل اور ہر قسم کی کمزوریوں سے پاک ہے،

ذیل میں ہر ایک کی کسی قدر تفصیل دیجاتی ہے:

(۱) اقتدار اعلیٰ کا تصور۔ | اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ ہے

مغرب میں اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) عوام کے سپرد ہے، اس کا اثر زندگی اور اجتماع پر جو مرتب ہوتا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے تشکیل میں اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، جس کے سامنے جواب دہی کا تصور گوشۂ تنہائی میں بھی انسان کو ہر قسم کی زیادتی و حق تلفی سے باز رکھتا ہے، قرآن حکیم میں ہے:

وھو الذی فی السماء الٰہ وفی الارض الٰہ وھو الحکیم العلیم (الدخان-۷) — اللہ ہی آسمان میں معبود ہے اور اور زمین میں معبود ہے، وہ حکمت والا اور علم والا ہے۔

اللّٰھم مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء (آل عمران-۳) — اے اللہ سلطنت کے مالک آپ جس کو چاہیں سلطنت دیں اور جس سے چاہیں لے لیں۔

وھو القاھر فوق عبادہ وھو الحکیم الخبیر (الانعام-۲) — اسی کا زور ہے اپنے بندوں پر وہ بڑی حکمت والا اور خبر رکھنے والا ہے،

واللہ غالب علی امرہ ولکن	اور اللہ اپنے حکم پر غالب ہے لیکن
اکثر الناس لا یعلمون (یوسف)	اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں ،
الا لہ الخلق والامر تبارک	یاد رکھو اللہ ہی کا کام پیدا کرنا اور حکم کرنا ہے
اللہ رب العلمین (الاعراف۔۷)	اللہ بڑی برکت والا سارے جہان کا
	پروردگار ہے ۔

سیدنا یوسف علیہ السلام نے جیل کے قیدیوں کے سامنے ہر اقتدار کی نفی کرتے ہوئے صرف اللہ کے اقتدار کی دعوت ان الفاظ میں پیش کی تھی ،

یٰصاحبی السجن ءارباب	اے میرے قید کے ساتھیو! ذرا غور تو
متفرقون خیر ام اللہ الواحد	کرو، متفرق معبود بہتر ہیں یا صرف اللہ
القہار	بہتر ہے جو اکیلا اور زبردست ہے ،

(۲) حکومت کی نوعیت

اللہ کا اقتدار تسلیم کرنے کے بعد حکومت میں بنیادی تبدیلیاں	اللہ کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے کے بعد حکومت کی نوعیت میں درج ذیل قسم کی تبدیلیاں ہوتی ہیں ،

(۱) اصل حکومت اللہ کی ہوتی ہے اور انسان بحیثیت نائب و امین حکومت کا حقدار بنتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے :

یا داؤد انا جعلنٰک خلیفۃ	اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں نائب بنایا
فی الارض فاحکم بین الناس	تم لوگوں کے درمیان انصاف سے حکم دو
بالحق ولا تتبع الھوی فیضلک عن	اور خواہشات کی پیروی نہ کرو ورنہ لوگ
سبیل اللہ (ص۔۲)	تمہیں گمراہ کر دیں گے ۔

وانفقوا مما جعلکم مستخلفین	خرچ کرو اس میں سے جن میں اللہ نے
فیہ (الحدید - ۱)	تمھیں خلیفہ بنایا ہے،
ان اللہ یامرکم ان تودوا	بیشک اللہ تمھیں اس بات کا حکم دیتا ہے
الامانات الیٰ اھلھا واذا	کہ امانتوں کو اس کے اہل تک پہنچاؤ
حکمتم بین الناس ان	اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو
تحکموا بالعدل (نساء - ۸)	تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔

اس آیت کے ذیل میں حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں :۔

آیت کریمہ میں حاکموں کو خطاب ہے کہ وہ رعایا کا مکمل بندوبست کریں، دین و شریعت کے مقتضیات کا ان کو پابند بنائیں "امانت" کی ادائیگی میں یہ بھی داخل ہے کہ عہدے صرف ان کے مستحقین کو دیے جائیں۔ (الجواب الکافی السیاسۃ الالٰھیہ ابن تیمیہ ص)

(ب) اللہ کے حکم کے مطابق حکومت شورائی طرز کی ہوتی ہے جس کی شکل و صورت، حالات اور شعور کی بیداری کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے،

قرآن حکیم میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے،

وشاورھم فی الامر (آل عمران) معاملات میں لوگوں سے مشورہ کیا کرو

دوسری جگہ ہے :

وامرھم شوریٰ بینھم (شوریٰ ۸) ان کے معاملات میں باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں

(ج) حکومت کے ہر قاعدہ و قانون میں اللہ کی حکمت عملی منعکس ہوتی ہے، یعنی باران رحمت کی طرح تنظیم و تقسیم کے قوانین اور ذرائع و مواقع سب کے لیے عام ہوتے ہیں،

ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان — بیشک اللہ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے،

یہ آیت زندگی کے تمام گوشوں کی جامع ہے، کتبِ فقہ میں ہے:

اجمع آیۃ فی القرآن للحث علی المصالح کلھا والزجر عن المفاسد باسرھا — یہ آیت تمام مصالح کے حصول پر ابھارنے اور مفاسد پر تنبیہ کے لیے سب سے زیادہ جامع ہے۔

(د) حکومت کے ہر و بود و بست میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا تصور ابھرتا ہے جس سے ذمہ داری کا احساس بڑھ جاتا ہے، اور بہت سی برائیوں سے حفاظت ہو جاتی ہے، قرآن حکیم میں ہے:

ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا — بیشک کان، آنکھ اور دل ان سب کی اس سے باز پرس ہوگی،

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ — جس شخص نے ذرہ برابر بھلائی کی اسکو دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی وہ اس کو دیکھے گا،

(ر) حکومت کا مقصد اقدار حیات کی حفاظت، برائیوں کا استیصال اور بھلائیوں کا فروغ ہے،

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا — یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ان کو ہم زمین میں حکومت دیں تو نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں

عن المنکر (الحج - ۶)

(۳) حکومت، قومیت و وطنیت کے تنگ دائرہ سے نکل کر انسانیت و بین الاقوامیت کے وسیع دائرہ میں داخل ہو جاتی اور ہر شے میں عالمگیریت پیدا ہو جاتی ہے، اسی بنا پر قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کی نسبت سے جو چیزیں بھی بیان کی گئی ہیں وہ ہر قسم کی اضافتوں اور حد بندیوں سے بلند ہیں،

(۳) خیر و شر کا معیار۔

خیر و شر کا معاملہ حد درجہ نازک ہے | خیر و شر کا معاملہ حد درجہ نازک ہے، اگر یہ کام انسانوں کے سپرد کر دیا جاتا تو ہوس کی نیرنگیاں خیر کو شر اور شر کو خیر میں تبدیل کرتی اور عقل کی جولانیاں اس تبدیلی کے لیے سند جواز مہیا کرتی رہتیں، چنانچہ مغربی تہذیب میں انفرادی یا اجتماعی پسند و ناپسند پر خیر و شر کا مدار ہے، پسند و ناپسند میں چونکہ برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے اس بنا پر ہر صبح کا خیر شام کے شر میں اور شام کا شر صبح کے خیر میں تبدیل ہوتا رہتا ہے،

تشکیل میں معیار اللہ کی کتاب ہے | تشکیل جدید میں خیر و شر کا معیار اللہ کی کتاب ہے، جو جو ناطق بالحق ہے اور جس کا فیصلہ آخری ہے، اس میں تبدیلی کی کسی زمانہ میں کوئی گنجایش نہیں ہے،

قرآن حکیم میں ہے:

يامرهم بالمعروف وينهٰهم عن المنكر ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث (اعراف - ۱۹)

اللہ کا رسول لوگوں کو معروف (خیر) کا حکم دیتا ہے، اور منکر (شر) سے منع کرتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا اور گندی چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے۔

[redacted]

دوسری جگہ ہے :-

وتمت کلمة ربك صدقا	آپ کے رب کی سچائی اور انصاف کی
وعدلا لا مبدل لکلمته	باتیں پوری ہوگئیں ان میں کوئی تبدیلی
وهو السميع العليم وان تطع	کرنے والا نہیں ہے، اللہ سننے والا اور
اکثر من فی الارض یضلوك	جاننے والا ہے، اگر آپ ان لوگوں کا
عن سبیل الله ان یتبعون	کہنا مانیں گے جو روئے زمین میں اکثریت
الا الظن وان هم الا	میں ہیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے
یخرصون	بھٹکا دیں گے، وہ محض اپنے گمان کی
(الانعام -۱۴۱)	پیروی کرتے اور صرف اٹکل دوڑاتے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا ہے ،

هو الفصل لیس بالهزل	وہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے
هو الذی لا تزیغ به الاهواء	والا ہے، وہ مذاق نہیں ہے، خواہشات
(مشکوٰۃ کتاب فضائل القرآن)	اس میں کجی نہیں پیدا کرسکتی ہیں ،

اقدار کی تین قسمیں

اقدار کی تین قسمیں ہیں :-

(ا) روحانی (ب) اخلاقی اور (ج) جمالیاتی

جمالیاتی قدریں زندگی اور اجتماع کے لیے جس طرح روحانی اور اخلاقی قدروں کی ضرورت ہے، اسی طرح جمالیاتی قدروں کی بھی ضرورت ہے، جمالیاتی میں حسن و جمال، لطف وکمال، توازن و اعتدال اور تناسب و ہم آہنگی وغیرہ شامل ہیں ،

مغرب میں قدروں کے درمیان موافقت نہیں ہے

مغربی تہذیب میں ان قدروں کے درمیان کوئی موافقت نہیں، بلکہ تضاد ہے، چنانچہ جمالیاتی ذوق کے اظہار کیلئے فنون لطیفہ اور آرٹ کے ذیل میں جو شکلیں اور صورتیں تجویز ہوتی ہیں اُن میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ "اخلاق" کا سایہ بھی ان پہ نہ پڑنے پائے، روحانیت کا درجہ تو اس کے بعد کا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب میں فنون لطیفہ اور آرٹ کے نام سے فحشیات اور بیحیائی کی ساری شکلیں رائج ہیں، پروفیسر P.A. Sorokin (پی اے، سار وکن) جدید آرٹ کے بارے میں لکھتے ہیں،

> اس نے تقریباً تمام مذہبی اور اخلاقی اقدار کو نظرانداز کر دیا ہے، کیونکہ یہ دلچسپی اور تفریح کا ایسا سامان شاذونادر ہی فراہم کرسکتے، جیسا شراب اور عورت کرسکتی ہے، جس کے نتیجہ میں یہ "آرٹ" اخلاق سے عاری، غیرمذہبی اور غیراجتماعی ہوگیا ہے، اور بسا اوقات مذہبیت، اخلاق اور اجتماعیت کا دشمن بنکر نمودار ہوتا ہے۔[1]

فنون لطیفہ کے بارے میں کہتا ہے :-

> آج ۷۰، تا ۸۰ فی صدی فلموں کی توجہ کا مرکز جنسی محبت یا جرائم ہیں مجسمہ سازی اور تصویر میں بھی ان ہی کا غلبہ ہے، فنون لطیفہ خاکے اڑانے اور طنز و استہزا میں خاص طور پر مشغول ہیں، خدا سے لیکر شیطان تک ہر ایک کی تحقیر اور انکا مذاق اڑانا ان کا معمول ہے،[2]

تشکیل میں جمالیاتی سرچشمہ اللہ کی صفات ہیں اور اقدار کے درمیان باہمی توافق ہے

تشکیل جدید میں دوسری اقدار کی طرح جمالیاتی اقدار کا سرچشمہ بھی اللہ کی صفات ہیں (تفصیل اوپر گذر چکی)

---

[1] Crisis of our Age P.62-75 [2] ایضاً

جن میں باہم تضاد نہیں بلکہ توافق ہے، یعنی تینوں کو تناسب و اعتدال کے ساتھ مقررہ حد کے اندر نشو و نما کا موقع ملتا ہے،

چند آیتیں اور حدیثیں | قرآن حکیم میں جمالیاتی اقدار کا ذکر ان آیتوں میں ہے:-

وصورکم فاحسن صورکم (المومن - ٦)	اس نے تمہاری صورت بنائی اور اچھی صورت بنائی،
لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (التین - ١)	ہم نے انسان کو خوب سے خوب اندازہ پر پیدا کیا،
الذی خلقک فسوٰک فعدلک (الانفطار - ١)	وہ ذات جس نے تجھ (انسان) کو پیدا کیا، درست کیا، توازن دیا۔
انا زینا السماء الدنیا بزینة الکواکب (الصٰفٰت - ١)	ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت کے ساتھ مزین کیا،
انا جعلنا ما علی الارض زینة لها (الکہف - ١)	جو کچھ روئے زمین پر ہے ہم نے اسکی زینت بنا دیا،
الذی احسن کل شئ (السجدہ ١)	جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی،
ولکم فیها جمال حین تریحون وحین تسرحون (النحل - ١)	اور تمہارے لیے جانوروں میں ایک حسین منظر ہے، جب تم انھیں شام کو چرا کر لاتے ہو اور جب چرانے لے جاتے ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ جمیل یحب الجمال	بیشک اللہ۔۔۔۔ جمیل ہے اور

(مسلم کتاب الایمان باب تحریم الکبر) جمال کو وہ پسند کرتا ہے۔

دوسری جگہ ہے :-

ان اللہ طیب یحب الطیب نظیف یحب النظافۃ (ترمذی ابواب الادب باب ما جاء فی النظافۃ) بیشک اللہ پاکیزہ ہے، وہ پاکیزگی کو پسند کرتا صاف ستھرا ہے، صفائی و ستھرائی کو پسند کرتا ہے،

ایک اور جگہ ہے :

حبب الی من الدنیا النساء والطیب (نسائی کتاب عشرۃ النساء) دنیا سے مجھے عورتیں اور خوشبو زیادہ مرغوب ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہیں جن سے جمالیاتی اقدار کا ثبوت ملتا ہے،

(۵) قانون سازی کا حق۔

قانون سازی کا حق اللہ کو حاصل ہے | قانون سازی کے لیے دو باتوں کی شدید ضرورت ہے،

(الف) باریک بینی و ہمہ جہتی نگاہ

(ب) عظمت و تقدس کا تحفظ

اگر یہ دونوں نہ ہوں تو کوئی قانون نہ انسانی مفاد کی حفاظت کر سکتا ہے، اور نہ سرکش گردن اس کے سامنے جھکنے کے لیے تیار ہوتی ہے، مغربی تہذیب میں قانون سازی انسان کے سپرد ہے، جو ہزار ترقی کے باوجود یہ دونوں باتیں اپنے اندر نہ پیدا کر سکا تشکیل جدید میں قانون سازی کا حق اصلاً اللہ کو ہے، جس کا قانون اس کی ہمہ جہتی نگاہ کی وجہ سے ایک طرف انسان کے مادی و روحانی مفاد کا ضامن ہے اور

دوسری اس کی عظمت و تقدس کے آگے گردنیں جھکنے پر مجبور ہوتی ہیں، قرآن حکیم میں ہے،

ان الحکم الا للّٰہ (یوسف-۱۰)	حکم صرف اللہ کا ہے
ولا یشرک فی حکمہ احداً (الکھف-۳)	اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا،
اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم	اس کا اتباع کرو جو تمہارے پاس تمہارے
ولا تتبعوا من دونہ اولیاء	رب کی طرف سے اتارا گیا، اسکے علاوہ
(الاعراف - ۱)	اور دوستوں کا اتباع نہ کرو
افغیر اللّٰہ ابتغی حکما وھو	کیا اللہ کے علاوہ کوئی فیصلہ کرنے والا
الذی انزل الیکم الکتب	تلاش کروں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف
مفصلاً (الانعام-۱۴)	مفصل کتاب اتار دی ۔

قانون کی دو قسمیں ہیں | قانون کی دو قسمیں کی جاتی ہیں :۔

(۱) اصلی اور (۲) ذیلی ۔

" اصلی وہ ہیں جو اللہ کی طرف سے مستقلاً عمل کے لیے مقرر ہوتے ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، البتہ حالات کے لحاظ سے وقتِ ضرورت ان کے موقع و محل کی تعیین ہوتی ہے ۔

" ذیلی " وہ ہیں جو قوت نافذہ کی طرف سے " اصلی " پر عمل در آمد کے لیے وقتاً فوقتاً مقرر کیے جاتے ہیں اور حالات کے لحاظ سے ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے ،

" ذیلی " قانون کی ضرورت دو وجہوں سے ہوتی ہے ،

(۱) جب معاشرتی فساد کی وجہ سے اصلی قانون پر عمل دشوار ہو جاتا ہے ،

(۲) اصلی قانون پر عمل درآمد کے لیے معاشرہ کی جس قدر بلند سطح درکار ہے،

وہ موجود نہیں ہوتی۔

اصول نسخ سے مدد | وضع قانون ہو یا موقع و محل کی تعیین دونوں میں اصول نسخ سے مدد لی جاتی ہے، یعنی اس کے ذریعہ قوت نافذہ کو قانون کے نفاذ میں حالات کے لحاظ سے وہ اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں جس کے ذریعہ دونوں کام بخوبی انجام پا سکتے ہیں، وہ اختیارات یہ ہیں:-

(۱) قانون کے نفاذ کو مقدم یا موخر کرنا (۲) اگر قانون میں عمومیت ہے تو اس میں خصوصیت پیدا کرنا (۳) اگر مطلق ہے تو اس کو مقید کرنا (۴) قانون کی وسعت کو محدود کرنا (۵) قانون سے بعض صورتوں کو مستثنیٰ کرنا (۶) قانون کے نفاذ میں کسی شرط کا اضافہ کرنا (۷) قانون کے نفاذ میں کسی صفت کا اضافہ کرنا۔

متقدمین کے نزدیک "نسخ" کے مفہوم سے ان اختیارات کا ثبوت ملتا ہے،

رفع دلالة العام والمطلق	نسخ کبھی عام، مطلق اور ظاہر لفظ وغیرہ
والظاهر وغيرها تارة اما	کی دلالت دکھا دینے کو کہتے ہیں، یعنی
بتخصيص او تقييد او حمل	عام میں تخصیص اور مطلق میں تقیید کیجاتی ہے
مطلق على مقيد و تفسيره	یا مطلق کو مقید پر محمول کر کے اسکی تفسیر و توضیح کیجاتی
وتبيينه حتى انهم ليسمون	ہے، یہانتک کہ استثناء شرط اور صفت کو بھی
الاستثناء والشرط والصفة	نسخ کہا جاتا ہے، کیونکہ انکے ذریعہ بھی ظاہر کی
نسخاً لتضمن ذلك رفع	دلالت اٹھا دیجاتی ہے، اور مراد کو بیان کیا
دلالة الظاهر وبيان المراد	جاتا ہے، سلف کی زبان میں نسخ مراد کے
فالنسخ عندهم وفي لسانهم	بیان کا نام ہے، یہ بیان اس لفظ

هو بيان المراد بغير ذلك	کے غیر سے بلکہ کسی امر خارج سے
بل بامرٍ خارج عنه[1]	بھی ہوتا ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

هو رفع الظاهر لتخصيص	کسی تخصیص تقیید شرط یا مانع کی وجہ سے
او تقييد او شرط او مانع	ظاہری محل کو نظر انداز کرنا عمومی
فهذا اكثر من السلف يسميه نسخاً[2]	طور پر سلف اسی کا نام نسخ رکھتے ہیں۔

مذکورہ اختیارات ہی کی بدولت حضرت عمرؓ نے بحیثیت قوت نافذہ بہت سے اصلی قانون کے موقع و محل متعین کیے تھے، اور بہت سے نئے قوانین وضع کیے تھے جیسا کہ ان کی فقہ سے ظاہر ہے،

اجتہاد کی جامع اصطلاح ذیلی قانون وضع کرنے یا اصلی کا موقع و محل متعین کرنے کا حق ہر دور میں قوت نافذہ یا اس کے قائمقام جماعت (علماء) کو حاصل رہا ہے۔ جس سے اصلی قانون ایک طرف جمود و تعطل سے محفوظ رہتا ہے۔ اور دوسری طرف زندگی و قانون کے درمیان ربط باقی رہتا ہے، مگر اس حق کو آزادانہ استعمال کرنے کی گنجایش نہیں ہے، اس کے لیے "اجتہاد" کی جامع اصطلاح موجود ہے، اسی کے دائرہ میں اس کو استعمال کی اجازت ہے، "اجتہاد" دراصل قانون کو ترقی پذیر زندگی سے ہم آہنگ بنانے کے لیے انتہائی کوشش کا نام ہے اس شرط کے ساتھ کہ اخلاق و قانون میں ربط باقی رہے، اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے راقم کی کتاب "فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر" اور "مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر" دیکھنا چاہیے،

[1و2] اعلام الموقعین فصل المراد بالنسخ عند عامة السلف

شہریت کے حقوق و فرائض | (۴) شہریت کے حقوق و فرائض متعین کرنے کا مسئلہ کچھ کم اہم نہیں ہے، مغرب کے نزدیک چونکہ اقدار حیات اضافی ہیں، اور ان کا سرچشمہ اور ان کے خوب و ناخوب کا معیار سوسائٹی ہے، اس بنا پر حقوق و فرائض کی تعین کے لیے مستقل و متعین بنیادیں نہ فراہم ہو سکیں، تشکیل جدید میں حقوق و فرائض کی بنیاد اخلاقی قدریں ہیں، جو مستقل اور دائمی ہیں، اس لیے ان کے لحاظ سے ہر شہری کو بلا تفریق مذہب و ملت درج ذیل قسم کے حقوق حاصل ہیں۔

ہر انسان واجب الاحترام ہے | (۱) ہر انسان بحیثیت انسان کے لائق احترام ہے، اس میں رنگ، نسل، زبان، مذہب، حسب و نسب، عزت و امارت، پیشہ اور ذات وغیرہ کی بنا پر کوئی تمیز و تفریق نہیں ہے، حکومت کا فرض ہے کہ مختلف تدبیروں سے مذکورہ اضافتوں کی بنا پر تفریق و تمیز کی ذہنیت کو ختم کر دے۔

قرآن حکیم میں ہے :-

ولقد کرّمنا بنی آدم (بنی اسرائیل)	ہم نے انسان کو معزز بنایا،
ولکل درجات مما عملوا (الانعام)	ہر ایک کے درجے ان کے عمل کے لحاظ سے ہیں،
انّ اکرمکم عند اللّٰہِ	اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ معزز
اتقٰکم (حجرات - ۲)	وہ ہے جو زیادہ متقی ہے

ہر ایک کو جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کا حق ہے | (۲) ہر شخص کا حق ہے کہ اس کے جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کی جائے،

انسانی حرمت کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ میں اس کے بارہ میں یہ تاکید فرمائی :-

فان دماءکم واموالکم	آج کے محترم دن (یوم عرفہ) کی طرح
واعراضکم حرام کحرمۃ	تمھاری جان و مال اور آبرو ایک
یومکم ھذا (مشکوٰۃ باب حجۃ الوداع)	دوسرے کے لیے محترم ہیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا :۔

اموالھم کاموالنا ودمائھم	ان کے (غیر مسلموں) مال مثل ہمارے مال کے
کدمائنا (نصب الرایہ ج ۲ کتاب السیر)	ہیں اور انکی جانیں مثل ہماری جانوں کے ہیں۔

عدل واحسان کے قوانین سب کے لیے عام ہیں

(۳) عدل واحسان کے قوانین سے سب کو یکساں فائدہ اٹھانے کا حق ہے، حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کرنے کا حکم ہے،

ولا یجرمنکم شنأن قوم علی	کسی قوم کی دشمنی بھی تمھیں اس پر
ان لا تعدلوا اعدلوا ھو	آمادہ نہ کرے کہ تم ان سے عدل نہ کرو
اقرب للتقوی (المائدہ - ۲)	ہر حال میں عدل کرو، یہ روش تقوی
	سے زیادہ قریب ہے۔

سب کو یکساں فائدہ اٹھانے کا حق ہے

(د) کائنات کی تمام چیزوں سے سب یکساں طور فائدہ اٹھانے کے مستحق ہیں۔

ھو الذی خلق لکم ما فی	اللہ ہی ہے جس نے تم سب کے لیے زمین
الارض جمیعا (بقرہ - ۳)	کی ساری چیزیں پیدا کی ہیں۔

دوسری جگہ ہے

وجعلنا لکم فیھا معائش	تم سب کے لیے ہم نے زمین میں زندگی

ومن لستولهم ما انوفين — کے ساز و سامان (وسائل و ذرائع) بنائے اور ان کے لیے بھی جن کو تم رزق نہیں دیتے ہو۔

(الحجر - ۲)

| حکومت میں ہر ایک کو شرکت کا حق ہے | (۴) حکومت میں (بشرط صلاحیت) ہر ایک کو

شرکت کا حق ہے، شورائی طرز حکومت میں اور باتوں کی طرح اس کا لحاظ بھی ضروری ہے، شوریٰ کی آیتیں اوپر گذر چکی ہیں،

حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ، بصرہ و شام کو لکھا کہ اپنے میں سے بہتر اور صاحب صلاحیت افراد کو منتخب کر کے بھیجو، تاکہ انکو حکومت میں شریک کیا جائے۔[۱]

اسی طرح مختلف ممالک فتح ہونے کے بعد اکثر سابق غیر مسلم افسران کو بحال رکھا گیا، جن کے بارے میں علامہ مقریزیؒ کہتے ہیں کہ حکومت کا مزاج بدلنے کے بعد ان سب نے ظلم و ستم کی راہیں چھوڑ دی تھیں،

فکانت جبایتهم بالتعدل — ان افسران کی وصول تحصیل عدل و انصاف کے ساتھ ہوگئی تھی۔

(کتاب الخطط للمقریزی ج ۱ ص ۱۲۰)

| ہر شخص کو مذہب و عقیدہ کی آزادی کا حق ہے | (۵) ہر شخص کو عقیدہ، مذہب اور مسلک میں آزادی کا حق ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:۔

لا اکراہ فی الدین — دین کے معاملہ میں کوئی جبر و زبردستی نہیں ہے۔

(البقرہ - ۳۵)

| آزادی کی مختلف شکلیں | اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مذاہب کے

[۱] کتاب الاموال باب فی تقبیل السواد و اختیار الولاۃ ص ۶۴

مانتے والوں کو آپس میں بھائی اور امت واحدہ قرار دیا:

الناس کلھم اخوۃ (مسلم و ابوداؤد) سب لوگ بھائی بھائی ہیں۔

دوسری جگہ ہے:۔

انھم امۃ واحدۃ (سیرت ابن ہشام ج وہ سب ایک امت ہیں

والاموال لابی عبیدص ۲۰۴ و ۲۰۵)

ہر مذہب کے عبادت خانوں، عبادت کے طریقوں اور مذہبی پیشواؤں کی حفاظت کی گئی، چنانچہ یہ حکم تھا:

لا ینھدم لھم بیعۃ ولا کنیسۃ	یہودیوں اور عیسائیوں کے عبادتخانے
ولا یمنعون من ضرب النواقیس	نہ گرائے جائیں، یہ لوگ ناقوس بجانے
ولا من اخراج الصلبان فی	اور اپنی عید کے دن صلیب نکالنے
یوم عیدھم (کتاب الخراج ص ۸۴)	سے نہ روکے جائیں۔

دوسری جگہ ہے:۔

لا یھدم لھم بیعۃ ولا کنیسۃ	یہودیوں اور عیسائیوں کے عبادتخانے
وعلی ان یضربوا نواقیسھم فی	نہ گرائے جائیں، یہ لوگ رات اور دن
ای ساعۃ شاؤوا من اللیل	میں جب چاہیں ناقوس بجائیں، البتہ نماز
او نھار، الا فی اوقات الصلوٰۃ	کے اوقات مستثنیٰ رہیں گے، یہ لوگ اپنی عید
وعلی ان یخرجوا الصلبان فی ایام	کے دن صلیب نکالیں۔

عیدھم ۔ (ایضاً)

ہر ایک کو عبادت کے علاوہ اور دوسرے مذہبی امور کی ادائیگی کی پوری آزادی

دی گئی، ابو عبید کئی مفتوحہ ملکوں کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتے ہیں :

فھذہ بلاد العنوۃ واقر	یہ تمام ممالک غلبہ سے فتح کیے گئے تھے
اھلھا فیھا علی مللھم	اور ان کے باشندے اپنے اپنے مذہب
وشرائعھم (کتاب الاموال ص ۱۰۱)	اور شریعتوں پر باقی رکھے گئے تھے،

ہر ایک کے پرسنل لا اور کلچر کے حفاظت کی ضمانت دی گئی، جیسا کہ تشریح ہے۔

فھم احرار فی شہاداتھم	یہ لوگ اپنی شہادت کے احکام،
ومناکحاتھم ومواریثھم	نکاح کے معاملات، وراثت کے
وجمیع احکامھم	قوانین اور دوسرے تمام پرسنل معاملات
(ایضاً ص ۱۴۸)	میں آزاد ہیں۔

ہر ایک کو مذہبی تبلیغ کی پوری آزادی دی گئی، جیسا کہ اس حکم سے ظاہر ہے:

ولا یحال بینھم وبین	ان کے اور ان کی شریعتوں کے
شرائعھم[1]	درمیان حائل نہ بنا جائے۔

دوسری جگہ ہے :

ولا یکرھون علی دینھم[2]	انکے دین میں کسی قسم کی زبردستی نہ کیجائے۔

حکومت وعوام دونوں سے متعلق حقوق وفرائض ہیں

جس طرح ہر شہری کو مذکورہ قسم کے حقوق حاصل ہیں، اسی طرح ان کا بھی فرض ہے کہ امور خیر میں حکومت کی اطاعت اور اس کے ساتھ تعاون و خیر خواہی کریں،

اسی طرح حکومت کا فرض ہے کہ ہر شہری کے حقوق ادا کرنے میں پوری کوشش

---

[1] طبری جزء رابع ذکر الخبر عن رقعۃ المسلمین والفرس بنہاوند [2] طبری فتح بیت القدس

کرے، غفلت و مداہنت سے کام نہ لے، اور ان کے آرام کی خاطر خود تکلیف اٹھائے،

غرض اس تشکیل میں دونوں طرف سے حقوق و فرائض کی تعیین کر دی گئی ہے، اگر ٹھیک ٹھیک ان پر عمل در آمد کیا جائے تو حکومت اور عوام کے مسائل بڑی آسانی کیساتھ حل ہوتے رہیں، اور موجودہ خلفشار کی نوبت نہ آئے۔

اسلام کا سیاسی نظام

اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی سیاسی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس میں کل اٹھارہ ابواب ہیں، جن میں نظریۂ خلافت مجلس تشریعی، طریقۂ قانون سازی، حقوق رعایا، بیت المال، احتساب حرب و دفاع، خارجی معاملات وغیرہ اسلامی دستور کے تمام اصولی اور سیاسی پہلو آ گئے ہیں،

آخر میں اٹھارہواں باب سیاست کے غیر اسلامی تصورات و نظریات سے متعلق ہے، اس میں موجودہ مختلف سیاسی نظریات، شخصیت، آمریت، جمہوریت وغیرہ پر مختصر مگر تشفی بخش جامع بحث کی گئی ہے، جس سے مشکل ہی سے کوئی اختلاف کر سکتا ہے، سلسلۂ تصنیفات و تالیفات دار المصنفین کی بہت اہم اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔

مؤلفہ مولانا محمد اسحٰق صاحب سندیلوی سابق استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

قیمت چھ روپئے۔ منیجر

عہد ہشام کا معاشی جائزہ

از جناب ڈاکٹر عبد الباری صاحب ایم اے۔ بی، ایل۔ پی، ایچ، ڈی
لکچرر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہشام بن عبد الملک (۱۰۵ھ-۱۲۵ھ) جو خاندان بنو امیہ کا دسواں خلیفہ تھا، اپنے دور کے لائق ترین مسلم حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے، اموی سلطنت کی پرشکوہ عمارت کے تین مستحکم ستونوں میں سے ایک ہشام بھی ہے، دوسرے دو اشخاص حضرت امیر معاویہؓ بن سفیان (متوفی ۶۰ھ) اور عبد الملک بن مروان (م ۸۶ھ) ہیں[۱] خلیفہ منصور (م ۱۵۸ھ) جیسا حکمراں بھی جو بنو امیہ کا سخت ترین مخالف تھا، ہشام کی ان الفاظ میں تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا:-

"ہشام خاندان بنو امیہ کے بہترین لوگوں میں سے ایک تھا۔"[۲]

ہشام نے قریب قریب بیس برس تک اموی حکومت کی سربراہی کی، اس کے عہد خلافت میں یہ حکومت تین بڑے براعظموں ایشیا، افریقہ اور یورپ میں پھیلی ہوئی تھی، جس کا ایک سرا مغرب میں جنوبی فرانس سے ملتا تھا، دوسرا مشرق میں گجرات تک وسیع تھا،

ہشام کا عہد اس لحاظ سے نہایت ممتاز ہے کہ اس نے اس سیاسی، مذہبی،

۱؎ المسعودی: مروج الذہب ج ۳ ص ۲۲۳ ۲؎ البلاذری: انساب الاشراف ج ۲ ص ۱۸۳

معاشی، سماجی اور علمی ڈھانچے کی معماری کا کام انجام دیا ہے، جسے اسلامی تاریخ میں سنہری دور سے تعبیر کیا گیا ہے، اس نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے، لیکن حکومت کی ترقیاتی اسکیموں کی کامیابی اور نظام مملکت کی کارکردگی بہت حد تک اس کے مستحکم اقتصادی نظام پر منحصر ہے، اس لحاظ سے سرکاری خزانہ کے استحکام اور اس کے دفاتر کی تنظیم میں ہشام نے بڑے کارنامے انجام دیے، اور اموی خلفاء میں اس کی حکومت کا بجٹ نہایت مناسب اور جدید ڈھنگ کا تھا، اموی خلفاء میں کوئی بھی حکومت کے معاملات خصوصاً عمال کے فرائض منصبی اور سرکاری دفاتر (دواوین) کی باقاعدگی کے سلسلے میں ہشام کے جیسا نگران اور محتاط نہیں تھا، [1] منصور نے بھی جو بعد از معز عباسی حکمران تھا، ہشام کی تقلید کی تھی، سرکاری خزانہ کے امور میں اس کی پالیسی کا بنیادی ڈھانچہ قریب قریب وہی تھا جسکی داغ بیل ہشام نے ڈالی تھی، یہاں تک کہ سکوں کا نظام بھی وہی تھا جس کی ابتدا ہشام نے کی تھی، [2] مالیات پر ہشام کا مکمل کنٹرول، سرکاری خزانہ میں غیر معمولی اضافہ کا سبب تھا، چنانچہ جتنی دولت اس کے خزانہ میں جمع ہوئی اتنی دولت کسی دوسرے اموی خلیفہ کو نصیب نہ ہو سکی۔ [3]

اب ہم اقتصادیات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں:

(۱) **زراعت**:۔ حکومت کے اقتصادی نظام کا سب سے اہم پہلو اس زمانہ میں زراعت تھا، ہشام کے عہد میں زراعتی پیداوار کے خطے درج ذیل تھے،

(۱) عراق میں دریائے دجلہ اور فرات کی وادی،

---

[1] ابن کثیر:۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۹ ص ۳۵۳ [2] المسعودی:۔ مروج الذہب ج ۳ ص ۲۲۳ الماوردی:۔ الاحکام السلطانیہ ص ۱۵۰ [3] الزرکلی:۔ الاعلام ج ۹ ص ۸۴-۸۵

(ii) الجزیرہ میں اس وادی کا بالائی حصہ ۔

(iii) مصر میں نیل کی وادی ،

(iv) خراسان میں دریائے جیحون (Oxus) کی وادی ۔

جہاں تک ان علاقوں کے تجارتی حالات اور سیاسی استحکام کا تعلق ہے عراق اور مصر سب سے زیادہ مضبوط پوزیشن میں تھے ، ان سب خطوں کی زمین زرخیز تھی ، زرعی پیداوار کے لیے آب و ہوا بھی مناسب تھی ، خود حکومت بھی زرعی ترقیاتی منصوبوں کی بہت افزائی کرتی تھی ، اس نے زرعی پیداوار کے اضافے کی بہت سی صورتیں اختیار کیں ، مرکزی اور صوبائی حکومتوں اور زمینداروں نے مل کر غیر مزروعہ آراضی کو قابل کاشت اور زیادہ سے زیادہ زرعی پیداوار کے لائق بنانے کی کوششیں کیں ۔[1]

حسان النبطی کے ذریعہ وادی نیل کے وارلی علاقوں اور دریائے دجلہ و فرات کے درمیان سیلاب سے متاثر علاقوں سے نئی قابل کاشت آراضی علیحدہ کی گئیں ۔[2] لوگوں کو لگان کی بہت کم شرح پر آراضی کاشت کے لیے دیجاتی تھی ، سینچائی کے لیے نہروں کا جال بچھا دیا گیا تھا جس سے پیداوار بہت بڑھ گئی تھی ، حکومت کی طرف سے سینچائی کو آسان بنانے ، سیلاب کو روکنے اور تجارتی و زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لیے متعدد اسکیمیں ، نہروں کی کھدائی ، پلوں اور پشتوں کی تعمیر بروئے کار لائی گئیں ، چنانچہ ہشام نے "الھنی" اور "المری" نہروں کو شہر "رقہ" کے قریب بنانے کا حکم دیا ،[3] دوسری نہر "الجامع" کے نام سے

---

[1] مروج الذہب ج ۳ ص ۲۱۷ ، [2] الماوردی : الاحکام ص ۱۴۳ ، جرجی زیدان ج ۱ ص ۲۱۵

[3] البلاذری : فتوح البلدان ص ۱۸۷ ، المصعب بن عبداللہ : نسب قریش ص ۱۶۰

کوفہ میں عراق کے گورنر خالد القسری (م ۱۲۶ھ) کے ذریعہ بنائی گئی،[1] اس کے علاوہ خالد القسری کی تعمیر کردہ نہر "المبارک" بھی مشہور ہے۔[2] ان نہروں کی تیاری میں بڑی بڑی رقمیں صرف ہوئیں، صرف "المبارک" کی تعمیر میں ایک لاکھ درہم خرچ ہوئے تھے۔[3] خالد القسری کے زیر اہتمام کوفہ کا ایک پرانا پل از سر نو تعمیر ہوا، تاکہ سیلاب کے پانی کو روکا جا سکے۔[4] اسپین کے گورنر عبد الرحمن الغافقی (م ۱۱۴ھ) نے بھی قرطبہ میں ایک بڑا اور حسین پل تعمیر کرایا جس کا مقصد تجارتی سامان کی نقل و حمل اور لوگوں کی آمد و رفت میں سہولتیں مہیا کرنا تھا۔[5] الحر بن یوسف (م ۱۱۳ھ) والی موصل نے آب رسانی کے لیے ایک نہر موصل میں نکلوائی،[6] اسی طرح بلال بن ابی بردہ (م ۱۲۰ھ) نے بصرہ میں ایک نہر تعمیر کرائی۔[7]

تجارت کے فروغ کے لیے جدید طرز کے بازاروں کا قیام، تجارتی مراکز میں عمل میں آیا، یہ سب بازار سڑکوں کے ذریعہ دار السلطنت سے اور خود ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیے گئے تھے، تاکہ غلہ اور دیگر اشیاء کی آمد و رفت آسانی سے ہو سکے۔[8] سبزیاں اور ادویات کے پودے اگانے پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا، کسانوں کو اس کی آزادی تھی کہ وہ ٹیکس نقد کی شکل میں ادا کریں یا جنس کی صورت میں، اس سے ان کو غلہ فروخت کرنے کی زحمت سے نجات مل جاتی تھی، کسانوں کو مختلف طریقوں سے آمادہ کیا جاتا تھا کہ وہ زرعی پیداوار کے اضافے

---

[1] ابن الفقیہ مختصر کتاب البلدان ص ۱۸۳ [2] یاقوت الحموی معجم البلدان ج ۷ ص ۸، ۳۰ [3] المبرد: الکامل ج ۲

[4] ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان، ص ۱۸۳ [5] الزرکلی الاعلام، ج ۴ ص ۱۴۸ [6] یاقوت الحموی:

معجم البلدان، ج ۸ ص ۳۰۳ [7] البلاذری: فتوح البلدان، ص ۲۹۴

میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف وادی نیل میں ۳۰،۰۰۰،۰۰۰ ایکڑ[1] (فدان) آراضی قابل کاشت بنائی گئی تھی،[1] اس طرح ہر ایک زرعی خطے کی پیداوار میں اضافہ ہوا، عراق کی پیداوار سب سے زیادہ بڑھی تھی، خالد القسری گورنر عراق نے صرف عراق کی آراضی سے ۱۳ لاکھ درہم سالانہ حاصل کیے تھے،[2]

ملک میں گیہوں اور کھجور کا استعمال سب سے زیادہ ہوتا تھا، دوسری پیداوار میں جو، چاول، گنا اور کپاس اہم تھے، ان کوششوں سے ملک غلہ کے معاملہ میں خود کفیل ہو گیا، اور ہشام کے دور میں غلہ کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی،

(۲) **معدنی ذخیرے**:۔ معدنیات بھی حکومت کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھے، معدنیات میں چاندی، لوہا، سلفر اور مٹی کا تیل فارس کی کانوں سے نکال کر صنعتی شہر بصرہ بھیجا جاتا تھا، سلفر اور لنڈ بلخ سے حاصل ہوتا تھا،[3] عہد ہشام میں سفید مٹی کا تیل (White Naphtha) خوزستان کے رامہرمز شہر سے اور سیاہ تیل آذربیجان سے نکالا جاتا تھا،[4] مٹی کا تیل اور تار (Tar) دجلہ کے مشرقی پہاڑوں سے بھی حاصل ہوتا تھا، تار اور سلفر بڑی مقدار میں موصل میں پایا جاتا تھا، یہاں سے عراق کے مختلف شہروں اور بندرگاہوں میں بھیجا جاتا تھا، اس کا استعمال جہازوں، کشتیوں اور حماموں میں ہوتا تھا، مٹی کے تیل اور تار (Tar) کی پیداوار میں اضافہ کے لیے اس پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا، موتی خلیج فارس میں الفرات کے دہانے کے قریب نکالے جاتے تھے،[5]

---

[1] جرجی زیدان: تاریخ تمدن اسلام ج ۲ ص ۱۱، [2] الجہشیاری: کتاب الوزراء ورق ۲۹ (ب) [3] الخربوطلی تاریخ العراق ص ۳۰۹، [4] الجہشیاری: کتاب الوزراء، ورق ۱۳۰ [5] الخربوطلی: تاریخ العراق ص ۳۶۵

اسپین کی کانیں بھی جستہ، لوہا، تانبہ، چاندی، سونا، کوئلہ اور پہاڑی نمک کا بڑا خزانہ تھیں[1]۔ ان کے علاوہ دوسری جگہوں خصوصاً خراسان سے مختلف قسم کے پتھر، سنگ مرمر اور جواہرات حاصل کیے جاتے تھے۔ لوگوں کو کان کنی کی پوری آزادی تھی، حکومت صرف ۱/۵ حصہ برآمد شدہ اشیاء کا لیتی تھی[2]۔

(۳) **صنعت وحرفت**:۔ جیسے جیسے نئے شہر بستے گئے اور ان کی آبادی میں اضافہ ہوا، ضروریات زندگی کی اشیاء کی مانگ بڑھتی گئی، اس کے علاوہ اسلامی مملکت کے اندر خام اشیاء، سستے مزدوروں اور نئے بازاروں کی دستیابی اور رسل و رسائل کے لائق اعتماد ذرائع نے مختلف مصنوعات کے کارخانوں کی افزائش میں غیر معمولی مدد پہنچائی۔

(۱) کپڑے کی صنعت:۔ ملک مختلف علاقوں میں سوتی، ریشمی اور اونی کپڑے تیار ہوتے تھے، اس عہد کی سب سے چالو تجارت کپڑوں کی تھی، پوشاک کے معاملہ میں خلیفۂ وقت کی اعلیٰ مذاقی سے پارچہ بافی کی صنعت کو بڑی ترقی ہوئی، عہد ہشام کے کپڑے اپنی نفاست، رنگوں کی بوقلمونی اور ڈیزائنوں کے حسن و تنوع کیلئے مشہور تھے، اور اس کی نسبت سے ہشامیہ کپڑے اپنے وقت کے فیشن ایبل اور مقبول ترین پوشاک میں شمار کیے جاتے تھے[3]۔ اسکے زمانہ کے اعلیٰ قسم کے کپڑے حسب ذیل تھے،

الخز (ریشم یا ریشم واون کے تاروں سے تیار شدہ)

القطوف (ریشمی کپڑے (Velvet))

الرقم (لکیر دار کپڑہ (Variegated))

---

[1] یاقوت الحموی: معجم البلدان ج ۱ ص ۲۳ [2] الصولی: ادب الکاتب ص ۱۹۸ - ۲۰۱

[3] المسعودی: مروج الذہب، ج ۳ ص ۲۰۷

الوشی: (ریشمی بروکیڈ مطرز)

الارمنی: (ریشمی بروکیڈ)

الدیباج: (بروکیڈ، مخمل)

ان کے علاوہ دوسری قسمیں بھی تیار ہوتی تھیں[1] الخز اور الدیباج اس عہد کے سب سے قیمتی اور عمدہ کپڑے تھے، جس کا سب سے بڑا صنعتی مرکز بصرہ تھا[2] کوفہ و بصرہ کپڑوں کے بڑے مرکز تھے، موصل بھی پارچہ بافی کی صنعت کے لیے مشہور تھا[3] دوسرے اہم مرکز مصر، یمن اور المشرق تھے،[4]

(ز) گھریلو دستکاری اور چھوٹی صنعتیں:۔ اس عہد میں اس قسم کے کام چھوٹے پیمانے پر انجام پاتے تھے، قالین، پردے، چادریں اور صوفہ پوش وغیرہ مختلف علاقوں میں تیار کیے جاتے تھے، الطراز (کشیدہ کاری اور زری کا کام) سب سے زیادہ شاہی محلات اور سرکاری حکام کے گھروں پر ہوتا تھا[5] فرنیچر اور امور خانہ داری سے متعلق لکڑی کا سامان عراق اور موصل میں تیار ہوتا تھا، شام اور عراق شیشے کے کارخانوں کے لیے مشہور تھے[6] شیشہ کے سامان کے لیے حلب آج تک مشہور ہے،

(ززز) آتشیں سامان اور اسلحہ سازی کے کارخانے:۔ خلیفہ ہشام کے زمانہ میں اسلحہ سازی کی صنعت کو بھی غیر معمولی ترقی ہوئی، اور اس کی پیداوار میں بڑا

---

[1] الیعقوبی:۔ تاریخ ج ۲ ص ۳۲۸ المسعودی: مروج، ج ۳ ص ۲۱۰ [2] الخربوطلی: تاریخ العراق ص ۳۵۸ - ۳۵۹ - [3] صالح احمد العلی: التنظیمات ص ۱۶۳ - ۱۶۵ [4] ابن خلدون: مقدمہ ص ۲۹۳

اضافہ ہوا۔[۱] اسلحہ سازی کے مشہور کارخانے شام، تونس اور عراق کے علاقوں میں قائم تھے۔

(۶) جہاز سازی کی صنعت:- بحر روم کی جنگوں کی بنا پر جنگی جہازوں اور کشتیوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی، اس سے جہاز سازی کی صنعت میں ترقی ہوئی۔ تونس اور ٹائرس کے جہاز سازی کے کارخانے اس دور میں سب سے زیادہ مشہور تھے۔[۲] نقل وحمل میں کام آنے والی کشتیاں عراق اور سندھ میں سدوسان کے مقام پر تیار کی جاتی تھیں۔[۳] اس زمانہ کی کامیاب بحری مہمیں جہاز سازی کی ترقی کا ثبوت ہیں۔

(۷) عمارت سازی کی صنعت:- ہشام کے عہد میں متعدد نئے شہر آباد ہوئے، اور بڑے بڑے محلات تعمیر کیے گئے شہری آبادی کے اضافہ نے تعمیر کی صنعت کو فروغ دیا، تعمیر کے کاموں میں استعمال ہونے والی اشیا مختلف جگہوں پر تیار کی جاتی تھیں، موصل میں "المنقوشہ" جیسے حسین محل کی تعمیر بذاتِ خود تعمیری ترقی کا ثبوت ہے۔[۴]

(۴) **تجارت** (الف) ہشامی عہد میں تجارت کو بڑا فروغ ہوا، عراق میں بصرہ سب سے بڑا اور ترقی یافتہ تجارتی مرکز تھا، اس کو پوری مملکت کا تجارتی مرکز ہونے کا شرف حاصل تھا۔[۵]

---

[۱] حتی: تاریخ شام ص ۴۸۰؛ الخربوطلی: تاریخ العراق ص ۳۰۶؛ الزرکلی: الاعلام ج ۴ ص ۳۴۵؛ امین واصف بک: فہرست معجم الخریطۃ التاریخیۃ ص ۳۹ [۲] الزرکلی: الاعلام ج ۴ ص ۳۴۵ مصطفیٰ بک نجیب: حماۃ اسلام ج ۱ ص ۱۹۸؛ امین واصف بک: فہرست ص ۱۳؛ حتی: تاریخ شام ص ۴۸۹ [۳] الخربوطلی: تاریخ ص ۲۰۵-۲۰۸ [۴] ابن الاثیر: الکامل ج ۵ ص ۶۳ [۵] ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان ص ۳۶۷

حج کے موقع پر ہر سال حجاز تجارت کا بہت بڑا بازار بنجاتا تھا، اور یہاں تجارتی لین دین اور معاہدات ہوتے تھے،[1]

(۱) بازار (السوق):- تجارت کی دنیا میں مارکیٹ کا وجود ضروری ہے، منظم و متوازن تجارت کا سارا دارومدار عمدہ اور مناسب بازاروں پر ہوتا ہے، انہی کے ذریعہ ہر قسم کے سامان کی کھپت ہوتی ہے،

عہد ہشام میں صرف عراق میں پانچ عمدہ قسم کے بازار قائم ہوئے[2]، کوفہ میں خالد القسری، گورنر عراق نے ایسا بازار بنوایا جس میں تجارتی اشیاء کے لیے الگ الگ حصے تھے، دوکانوں کی چھتیں پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں[3]، ایسے بازاروں کی زیادہ تفصیل تو دستیاب نہیں ہو سکی۔ لیکن اتنا پتہ چلتا ہے کہ ایک مرکزی بازار ہوتا تھا، جہاں ہر قسم کے تجار جمع ہوتے تھے، دوسری قسموں کے بازاروں کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہوتی تھی، بلکہ مختلف چیزوں کے بازار شہر کے مختلف حصوں میں ہوتے تھے[4] چنانچہ شہر بصرہ میں بزازوں کی دوکانیں باب عثمان کے قریب تھیں اور سبزیوں اور پھلوں کی باب المزبق کے پاس[5]، بازاروں کے نظم و نسق کی نگرانی مارکیٹ انسپکٹر کے ذریعہ ہوتی تھی جنھیں المحتسب کے نام سے پکارا جاتا تھا، اس کے مددگار "عامل علی السوق" اور "العارف" کہلاتے تھے، محتسب بازار کے بھاؤ اور ناپ تول کی بھی نگرانی کرتا تھا، اور تجارتی جھگڑوں کا فیصلہ بھی کرتا تھا، رات کو بازار بند ہونے کے بعد پولیس کا

---

[1] ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان ص ۳۰۷ [2] تین کوفہ میں اور ایک ایک بازار بصرہ وحیرہ میں تھا [3] البلاذری: فتوح البلدان ص ۲۹۴ [4] صالح احمد العلی: التنظیمات ص ۲۳۸ [5] ایضاً ص ۲۳۹

پھرا رہتا تھا[1]

صالح احمد العلی کے قول کے مطابق پیشہ ور تجار کی تعداد اس زمانہ میں کافی حد تک بڑھ گئی تھی[2] حکومت بازار کے بھاؤ اور خصوصیت سے اجناس کے نرخ کی بڑی سختی سے نگرانی کرتی تھی، بازار کا بھاؤ عام طور پر یکساں رہتا تھا۔ کیونکہ زمین کا لگان نقد جنس دونوں شکلوں میں ادا کیا جا سکتا تھا، اس سے کسانوں کو لگان کی ادائیگی کے لیے کم داموں پر غلہ نہیں بیچنا پڑتا تھا۔ اسکے علاوہ عام طور پر ٹیکسوں کو بڑھایا نہیں جاتا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بیشتر اوقات اشیائے خوردنی کا بھاؤ ایک سا رہتا تھا۔ صرف ایک مرتبہ صوبہ عراق میں خالد القسری کی گورنری کے زمانہ میں گیہوں کا نرخ بڑھ گیا تھا، ایک "الکیلہ" (تقریباً ۵ پونڈ) گیہوں ایک درہم میں فروخت ہونے لگا تھا[3]

(ز) تجارتی بنک کاری کا نظام:- تجارت اور لین دین کی ترقی کے لیے بڑے سرمایہ کا ہونا ضروری ہے۔ خلفائے راشدین ہی کے عہد سے اسلامی مملکت میں پونجی پتیوں کا ایک خوشحال طبقہ موجود تھا جس سے تجارت کو بڑا فائدہ پہنچا[4] اسلام پونجی پتیوں کا مخالف نہیں ہے، بشرطیکہ وہ اسلام کے اخلاقی و سماجی تقاضوں کو پورا کرتے اور اپنی دولت کی زکوٰۃ نکالتے رہیں[5]

عہد ہشام میں اسلامی مملکت میں پونجی پتیوں کی اچھی خاصی تعداد تھی، مگر بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو پونجی کی کمی کی بنا پر کسی بڑے اور مفید تجارتی

---

[1] صالح احمد العلی: التنظیمات الاجتماعیۃ ص ۲۳۴، ۲۳۹، ۲۶۷، [2] ایضاً ص ۲۳۵

[3] الطبری، تاریخ، ج ۳ ص ۲۵۰ [4] صالح احمد العلی: التنظیمات، ص ۱۸۵-۱۸۹ [5] ایضاً

ص ۱۸۵-۱۸۶

کاموں میں حصہ لینے سے معذور تھے،

ان حالات میں تجارت کے فروغ کے لیے قرض کا نظام ضروری تھا، مگر اسلام میں سود حرام ہے۔ اس لیے تجارتی قرض کا ایک نیا نظام قائم کیا گیا،[1] جو عہد حاضر کے نظامِ بینک کاری سے مختلف تھا۔ اس میں سرکاری خزانہ (بیت المال) کے علاوہ دوسرے بڑے سرمایہ دار بینک کا کام دیتے تھے اور وہ سود پر قرض دینے کے بجائے تجارت میں حصہ دار ہو جاتے تھے، مرکزی اور ریاستی بینک (بیت المال) بھی کسانوں کو محدود پیمانہ پر قرض دیا کرتے تھے، اس کی سہولت بھی حاصل تھی کہ ایک شخص بصرہ کے بیت المال سے قرض لے کر اس کو حجاز کے بیت المال میں ادا کر سکتا تھا،[2]

اس طرح کے بنکوں کے ممبران مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، قرض کی ضمانت یا رہن لکھ کر دیا جاتا تھا، رہن لینے والا رہن شدہ اشیاء کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کا مجاز تھا، یہی وہ نفع ہوتا تھا جو بینک (یونجی پتی افراد) رہن شدہ رقم پر حاصل کرتا تھا، اس کی حیثیت سود کی نہیں تھی، بلکہ یہ فائدہ رہن شدہ اشیاء کی حفاظت اور خدمت کے صلہ میں شمار ہوتا تھا۔

کچھ بینک ایسے بھی تھے، جنھوں نے مملکت کے مختلف شہروں میں شاخیں کھول رکھی تھیں، جن کا کنٹرول ہیڈ آفس کرتا تھا،[3]

لیکن قرضے کی رقمیں صرف اسلامی مملکت کے حدود کے اندر ہی دی جاتی تھیں، تاکہ وقت ضرورت قانونی چارہ جوئی کی جا سکے۔ اگر قرض خواہ قرض کی رقم

---

[1] صالح احمد العلی: التنظیمات ص ۱۸۷ - ۲۴۰ [2] ایضاً ص ۲۵۴ و ۲۵۵ [3] ایضاً ص ۲۶۵

وقت پر ادا نہ کرسکتا تو سزا دی جاتی تھی[1]

اس طرح کے بینکوں کا کام ہنڈی (Bill of exchange)، ڈرافٹس اور ملکیت کے وثیقہ (Title deeds) کا اجرا، تھا، اس سے یہ بڑا فائدہ تھا کہ تاجر سکوں کا بوجھ ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے کی زحمت سے محفوظ ہوجاتے تھے، اور راہ میں لٹنے کا خطرہ بھی نہیں رہتا تھا[2] کمرشیل کارکردگی مستحکم رائج الوقت سکوں کے نظام سے کنٹرول کیجاتی تھی، خلیفہ ہشام نے متعدد اصلاحات سکوں کی مستحکم اور منضبط گردش کے لیے کیں۔ اس عہد کے "الخالدیہ" اور "الیوسفیہ" سکے بہترین سکے شمار کیے گئے[3]

(iii) رسل ورسائل کے ذرائع :- رسل ورسائل کے دونوں ذریعوں بحری اور بری کی ترقی پر خاصی توجہ کی گئی تھی، اہم بازاروں کو سڑکوں اور شاہراہوں کے ذریعہ شہروں سے ملا دیا گیا تھا، مثلاً بصرہ سے مکہ معظمہ، کوفہ سے مکہ معظمہ، واسط سے بصرہ، کوفہ سے بصرہ اور واسط سے اہواز وغیرہ[4] سال میں ایک مرتبہ "حج کی شاہراہ" بڑے پیمانہ پر تجارتی رسل ورسائل کے کام دیتی تھی، ہشام نے اس شاہراہ پر متعدد سہولتوں کا انتظام کردیا تھا، جس سے مسافروں کو بڑا آرام ملتا تھا[5]

بحری حمل ونقل کے لیے نہریں کام آتی تھیں، کرایہ کی کشتیاں، بھاری سامان سستے داموں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی تھیں[6] اسلیے نہری نظم ونسق

---

[1] صالح احمد العلی: التنظیمات ص ۳۶۳ - ۳۶۴ [2] ایضاً ص ۳۶۴ [3] البلاذری: فتوح البلدان ص ۱۷،۴

[4] الخربوطلی: تاریخ العراق ص ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۷۰ [5] المسعودی: مروج الذہب ۳ ص ۷۱ [6] الخربوطلی تاریخ العراق ص ۳۵۴

میں ترقی ہوئی، اور متعدد نئی نہریں تعمیر کی گئیں، ان ذرائع کے علاوہ حکومت نے دوسرے ذرائع بھی اقتصادی ترقی کے لیے اختیار کیے، تجارتی سامانوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل وحرکت پر کوئی چنگی نہیں لیجاتی تھی۔[۱] اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ دور کی طرح علاقہ بندی (onal system) کے طریقے کو نہیں اپنایا گیا تھا،

(ب) خارجی تجارت:- غیر ملکی تجارت کے نقطۂ نظر سے اسلامی سلطنت ان دنوں دنیا میں سب سے زیادہ اچھی پوزیشن میں تھی، اس کا اقتدار تجارت کے اہم اور بڑے بڑے بحری راستوں پر قائم تھا، بحر احمر اور خلیج فارس کے ذریعہ مشرقی ممالک سے تجارت کرنا بہت آسان تھا، دوسری طرف مغربی ممالک سے تجارت کے لیے بحر روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا،

شمالی علاقوں (مثلاً بلاد الخزر وغیرہ) سے تجارتی روابط بحر کیسپین کے ذریعہ قائم تھے، گو غیر ممالک سے مختلف سرحدوں پر مسلسل جنگیں باقاعدہ خارجی تجارت کی ترقی میں سد راہ تھیں، پھر بھی غیر ملکی تجارت کو فروغ دینے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے، خلیفہ کی طرف سے گورنروں کو بندرگاہوں کی ترقی اور بہتر انتظامات کے لیے خصوصی احکامات صادر ہوتے تھے[۲]، سندھ ہند (سندھ کے بعد ہندستان کے دوسرے علاقے) اور چین سے تجارتی تعلقات کو فروغ دیا گیا،[۳] چین کو اسلامی مملکت سے قریب کرنے کے لیے ایک سفارتی وفد چین بھیجا گیا تھا،[۴]

عراق کے بندرگاہ میں روئی، ریشمی کپڑے، موتی، جواہرات، کھجوریں

۱؎ صالح احمد: التنظیمات ص ۱۵۱ ۲؎ المسعودی: مروج الذہب ج ۳ ص ۷۱ ۳؎ الخزبوطلی: تاریخ العراق ص ۳۷۹ ۴؎ الدکتور حسن ابراہیم: تاریخ الاسلام ج ۱ ص ۳۳۰

اور عطریات برآمد کیجاتی تھیں، لیکن برآمد شدہ اشیاء کی مقدار درآمدات سے ہمیشہ کم رہی، عراق کے درآمدات میں ناریل، کیلا، قالین، ہاتھی، ہاتھی دانت اور ادویات شامل تھیں[1] عراق ہندوستان سے جواہرات، زعفران، لونگ گنا، صندل، ٹیک کی لکڑی اور سیاہ مرچ درآمد کیا کرتا تھا[2]، سب سے عمدہ قسم کی مشک تبت سے منگائی جاتی تھی[3]

داخلی تجارت کے مقابلہ میں بیرونی تجارت زیادہ نہ تھی، اس کمی کا بڑا سبب یہ تھا کہ کمرشیل بنک کاری کا نظام غیر ممالک میں قرضوں کی سہولت مہیا نہیں کرسکتا تھا، لیکن زرِ تبادلہ کے مراکز (الصیارفۃ) غیر ملکی تجارت کو بہت مدد پہنچاتے تھے، بصرہ زرِ تبادلہ کا سب سے بڑا مرکز تھا، خصوصیت سے غیر ملکیوں کے لیے، صراف سونے کے بدلے رائج الوقت سکے بدلا کرتے تھے، اس عہد کے بازار کے بھاؤ کے مطابق غیر ملکی تجارت چلتی تھی۔ درآمدات کا سب سے بڑا حصہ ہندوستان سے بصرہ کے ذریعہ حاصل کیا جاتا تھا[4]

ان تفصیلات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہشامی عہد میں اقتصادی نظام کیسی مضبوط بنیادوں پر قائم تھا، جس کے اثرات اس عہد کی سماجی زندگی میں نمایاں تھے، چنانچہ محققین نے اندازہ لگایا ہے کہ اس زمانہ میں شخصی آمدنی کی سب سے نچلی سطح قریب دو سو درہم سالانہ کی تھی، اس رقم سے کم آمدنی والے اشخاص غربا میں شمار کیے جاتے تھے، اور انھیں صدقات دینا جائز تھا، "العطاء" (سرکاری وظیفہ) کی سب سے کم تر رقم بھی دو سو درہم سالانہ ہوتی تھی[5]

---

[1] الخربوطلی: تاریخ ص ۹۱، ۳۹۳ [2] ایضاً ص ۳۸۰ [3] صالح احمد العلی: التنظیمات ص ۲۶۶ [4] ایضاً ص ۱۶۰

دوسرے وظائف اور پنشن کے علاوہ صرف "العطاء" ہی کی رقم ایک شخص کی زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ اشیائے خوردنی میں سب سے اہم جنس کی قیمت ہمیشہ اعتدال پر رکھی جاتی تھی، گیہوں شرق اردن کے ممالک کی سب سے اہم غذا تھی، چنانچہ ہشام کے پورے عہد میں ایک "الکیلہ" (تقریباً پانچ پونڈ) گیہوں کی قیمت ایک درہم سے بھی کم رہی، صرف ایک مرتبہ ایسا موقع آیا تھا جب عراق میں ایک الکیلہ گیہوں ایک درہم میں فروخت

(الطبری: ج ۲۰ ص ۲۵۶)

ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کے بعض اہم ماخذ

از
جناب الطاف حسین خاں صاحب شروانی، اسلامیہ کالج اٹاوہ

(۳)

۱۔ ملفوظات | بیسویں صدی کے ابتدائی مورخین حسبِ ذیل ذرائع سے تاریخی معلومات حاصل کرتے تھے۔

(۱) عینی مشاہدہ (۲) سماجی روایات (۳) قصائد و عام اشعار، (۴) دفاتر سلطانی (۵) سکّے، منار، عمارتیں اور دیگر آثارِ قدیمہ، لیکن آج ان ذرائع کے علاوہ بھی ایسے مستند آخذ دستیاب ہو گئے ہیں جن سے ہماری رنگ برنگی تہذیب کے صحیح خد و خال سامنے آتے ہیں، یہ ہیں صوفیائے کرام کے وہ ملفوظات[۱] جن میں اپنے عہد کی عکاسی نہایت غیر جانبداری سے کی گئی ہے۔ سلاطین دہلی اور مغلیہ دورِ حکومت میں صوفیائے کرام کا اثر و رسوخ عوام و خواص کے دل و دماغ پر ایسا بیٹھ گیا تھا کہ عامی سے لیکر عالم تک

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھئے:
1. Introduction, Khair-ul-Majalis Aligrh, 1959. 2. Shik Nasiruddin, chiragh as a great historeal personlity, Islamic culture. April. 1946
3. Malfuat Literatur of Muslim Mystics by Dr. A. D. Arshad Radiance Delhi. June 14th 1960

ان کی خدمت میں جانا باعث برکت وسعادت سمجھتے تھے، ان صوفیائے کرام کی مجالس میں جہاں آہ وبکا کی دلسوز آوازیں گونجتی تھیں، زمانے کے تغیرات پر تبصرہ بھی ہوتا تھا، اپنے ماحول اور گذرے عہد کی خوبیوں اور برائیوں پر گفتگو ہوتی تھی، رنج وغم کی داستانیں سنائی جاتی تھیں، اور درد و محبت کے تذکرے ہوتے تھے، ان سبق آموز باتوں کو عقیدت مند قلمبند کرلیتے تھے،

ان صوفیہ نے اپنا قیمتی وقت عوام کے حلقہ میں گذارا اور ہمیشہ یہ سمجھا کہ بادشاہوں کی صحبت سے ایمان کی رونق میں کمی آتی ہے[1]، امراء تک سے تعلق رکھنا کبھی پسند نہیں کیا ؎

نے بنزد خان وسلطاں می روند　　　نے بہ نزدیک امیراں می شوند[2]

درباری مورخین جن واقعات کو سیاسی مصلحت یا ذاتی اغراض کی خاطر نظر انداز کر گئے ہیں، یہ درویش اپنی مجلسوں میں ان ہی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑتے گئے ہیں، اور اپنے عہد کے مذہب، تمدن ومعاشرت اور تاریخ وسیرت کی مکمل تصویر کھینچ دی ہے،

ان روحانی سلسلوں میں چشتیہ سلسلہ کا تعلق ہمارے ملک سے سب سے زیادہ رہا ہے، بقول مولانا سید سلیمان ندوی "اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے ملک کو غزنین اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا ہے، تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خانوادۂ چشت کے روحانی سلاطین نے

---

[1] دیکھئے، حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ پروفیسر خلیق احمد نظامی، دہلوی ۱۹۴۶ء ص ۲۴۱ (برہان اکتوبر)

[2] دیوان حضرت جمال الدین ہانسوی ج اول، ص ۱۰۹ دہلی، ۱۸۸۹ء

نقل کیا ہے۔ (نقوش سلیمانی ص ۔ نیز دیکھیے: (۱) تاریخ دعوت و عزیمت حصہ ۳ ص ۲۲۲ (۲) سلاطین دہلی اور مشائخ چشت، الفرقان نومبر ۱۹۶۲

اس لیے چشتی ملفوظات ہندی قرون وسطیٰ کے بڑے قیمتی تاریخی مآخذ ہیں، عوام کے سماجی، تمدنی اور مذہبی حالات ان ہی ملفوظات کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں، اس کے علاوہ بادشاہوں اور امراء کے ذہنی محرکات کا اندازہ بھی ان ہی ملفوظات سے ہوتا ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی فرماتے ہیں:

"قرون وسطیٰ کے بیشتر ہندی مورخین ایرانی نظریۂ تاریخ سے متاثر تھے، یہی وجہ ہے کہ اس دور کی تاریخوں میں صرف بادشاہوں کے حالات اور جنگی مہموں کی تفصیل ملتی ہے۔ عوام کی زندگی اور انکے مسائل کی کہیں کوئی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی، ملفوظات ہمارے تاریخی مآخذ کی اس تکلیف دہ کمی کو ایک حد تک پورا کر دیتے ہیں، ان میں عوام کے دلی جذبات، ان کی پوشیدہ آرزوئیں، کشمکش حیات میں ان کی بار جیت، ان کی مایوسیاں اور پریشانیاں، ان کی معصوم مسرتیں ——— سب ہی محفوظ ہو گئی ہیں۔"[1]

ان ملفوظات کا مطالعہ کرتے وقت ہم کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ یہ موضوع تو نہیں ہیں، پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس سلسلہ میں محققانہ بحث کی ہے،[2] پروفیسر خلیق احمد نظامی فرماتے ہیں:۔

---

[1] ملفوظات کی تاریخی اہمیت، نذر عرشی، دہلی ۱۹۶۶ء ص ۴ [2] تفصیل کے لیے دیکھیے:۔

1. Inc y of Islam, Vol, ii (London, 1965) P.50 (Prof. K.A. Nizami article
2. The life and Time of Shaikh F -uddin Ganj-i-Sha er by Prof. K.N. Nizami. P.118-120. 3. Chishti Mystics records of Sultanate period. By Prof M. Habib. M. I Quaret by Aligarh.

"ملفوظات کے بہت سے مجموعے جنھیں بعض لوگ مستند سمجھتے ہیں، حقیقتاً موضوع ہیں، ملفوظات کے مطالعہ میں اصل اور موضوع کا فرق کرنا ضروری ہے"[1]

(الف) چشتیہ ملفوظات کی فہرست جنھیں محققین نے مستند قرار دیا ہے درج ذیل ہے:-

(۱) سرور الصدور و نور البدور، ملفوظات شیخ حمید الدین ناگوری[2] (متوفی ۱۲۷۴ء) و شیخ فرید الدین، مرتبہ شیخ عزیز (مخطوطہ[3])

(۲) فوائد الفواد، ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاء، مرتبہ امیر حسن علاء سجزی دہلویؒ،

(۳) دُرَرِ نظامیہ۔ ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاء، مرتبہ مولانا علی محمود بن جاندارؒ۔

(۴) خیر المجالس[4]۔ ملفوظات خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، مرتبہ حمید قلندر،

---

[1] "ملفوظات کی تاریخی اہمیت" نذرِ عرشی، ص ۱۴۴-۱۴۳ [2] اس نام کے ایک ہی عہد میں دو بزرگ گذرے ہیں، ایک شیخ حمید الدین ناگوری، خلیفہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، دوسرے قاضی حمید الدین ناگوری (متوفی ۱۲۴۴ء) قاضی صاحب کا مزار دہلی میں ہے، دیکھئے، معارف، دسمبر ۱۹۷۰ء۔ اور آستانۂ زکریا، ملتان، مارچ ۱۹۶۱ء [3] پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے اس مخطوطہ کی تصحیح کر لی ہے لیکن ابھی شائع نہیں ہوا۔ [4] جس سلیقہ سے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے خیر المجالس کی تصحیح کی ہے، وہ اپنا ایک نمونہ ہے، دیکھئے: خیر المجالس۔ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۹ء

(۵) احسن الاقوال[1]۔ ملفوظات شیخ برہان الدین غریبؒ، مرتبہ خواجہ عماد ابن حماد کاشانی،

(۶) جوامع الکلم۔ ملفوظات سید محمد گیسو درازؒ، مرتبہ سید محمد اکبر حسینی،

(۷) انوار العیون فی اسرار المکنون، ملفوظات شیخ احمد عبد الحق رودولویؒ، مرتبہ شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ،

(۸) ملفوظات شیخ سلیم چشتیؒ[2]، مرتبہ ابراہیم معصوم،

(۹) لطائف قدوسی، ملفوظات شیخ عبد القدوس گنگوہی، مرتبہ رکن الدین دہلوی

(۱۰) احسن الشمائل[3]۔ ملفوظات شیخ نظام الدین اورنگ آبادی، مرتبہ خواجہ کامگار خاں،

(۱۱) فخر الطالبین۔ ملفوظات شاہ فخر الدین دہلوی، مرتبہ نور الدین حسینی،

(۱۲) نافع السالکین[4]۔ ملفوظات خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ (متوفی ۱۸۴۹ء) مرتبہ مولانا امام الدین مرید خواجہ تونسویؒ،

---

[1] اس کا قلمی نسخہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم علی گڑھ کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے،

[2] ابھی شائع نہیں ہوا، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ محمدیہ آگرہ میں محفوظ ہے،

[3] اس کا قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڈھ، شیفتہ کلکشن میں محفوظ ہے۔

[4] ایک قلمی نسخہ دو حصوں میں مکتوبہ ۱۸۷۰ء خاکسار نے مولانا آزاد لائبریری کے لیے خرید لیا گیا ہے۔ اس مخطوطہ کے تعارف کے سلسلہ میں دیکھئے: خاکسار کا مقالہ "فتح پور کے بعض مخطوطات اور نوادر" معارف فروری ۱۹۶۲ء۔

(ب) چشتی بزرگوں کے وہ ملفوظات جن پر بے اعتمادی[5] کا اظہار کیا گیا ہے، مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) انیس الارواح (۲) دلیل العارفین (۳) فوائد السالکین (۴) اسرار الاولیاء (۵) راحت القلوب (۶) افضل الفوائد (۷) مفتاح العاشقین (۸) گنج الاسرار (۹) راحت المحبین۔

ان موضوع ملفوظات کے سلسلہ میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے ایک طویل محققانہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جس میں پروفیسر محمد حبیب کی رائے سے اختلاف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

---

[5] پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اپنے ایک مقالہ

Chishti Mystics records of The Sultanate peiod

M. I. Quarterly, Aligarh. oct. 1950

میں فوائد الفواد، خیر المجالس، سیر الاولیاء، سیر العارفین، اخبار الاخیار، کشف المحجوب، مصباح الہدایہ، مکتوبات یحییٰ منیری اور صحائف السلوک (مصنفہ شیخ امام مولانا احمد) کو Genuine texts قرار دیا ہے، مندرجہ بالا ملفوظات پر بے اعتمادی کا اظہار کیا ہے، نیز دیکھئے: مقدمہ خیر المجالس، بتصحیح پروفیسر خلیق احمد نظامی، علی گڑھ ۱۹۵۹ء، اس موضوع پر سید حسن عسکری (پٹنہ) کا مقالہ "سلاطین دہلی کے عہد کے مشائخ کے ملفوظات کی تاریخی اہمیت" بھی پڑھنے کے لائق ہے، یہ مقالہ مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس منعقدہ دہلی ۱۹۶۴ء کے اجلاس میں پڑھا گیا۔ معارف فروری ۱۹۶۴ء ص ۱۳۹،

"بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملفوظات کے ہر مجموعہ کے مرتب کی یہ خواہش غالب رہی کہ اس کا مجموعہ اتنا اہم سمجھا جائے کہ اس کے پیشرو کے مجموعوں کی اہمیت کم ہو جائے، اس لیے وہ اپنے مرشد کی زبانی کوئی نہ کوئی ایسی روایت بیان کر دیتے جس سے پہلے کے مجموعوں کی اہمیت خواہ مخواہ گھٹ کر رہ جاتی۔"[۱]

آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

"یہ ملفوظات اب تک نہایت لاپرواہی سے چھپتے رہے، لیکن ان کو محنت سے ایڈٹ کیا جائے اور ان میں سنین اور اسمار کی جو غلطیاں ہیں، ان کی نشاندہی ہمدردانہ طور پر کر کے درست کر دی جائیں تو یہ قدیم العہد ماخذ کے طور پر احتیاط سے استعمال کیے جا سکتے ہیں، جیسا کہ عہد ماضی میں بھی اہل قلم کرتے رہے ہیں۔"[۲]

چشتیہ خانوادوں کے مستند اور موضوع ملفوظات کے علاوہ دوسرے خانوادوں میں سہروردیہ، فردوسیہ، قادریہ، شطاریہ اور نقشبندیہ ملفوظات بھی ہمارے قیمتی تاریخی ماخذ ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) اسرار المخدومین، ملفوظات خواجہ کرک سہروردی (متوفی [illegible]) مطبوعہ فتح پور ۱۸۹۳ء۔

(۲) سراج الہدایہ، ملفوظات حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت[۳]،

۱؎ معارف، اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۲۵۳ ۲؎ ایضاً، دسمبر ۱۹۶۲ء ص ۴۲۶۔

۳؎ Collection of Malfuzat of Makhdum-i-Jahanian (1307-88) of Uch. Proceeding of the Pakistan history conference Karachi, 1951.

(۳) معدن المعانی[۱] ۔ ملفوظات حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ، مرتبہ مولانا زید ابن عربی،

(۴) بحر الحقائق[۲] ۔ ملفوظات حضرت شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی ۔

۲۔ مجموعہ مکتوبات ہندی قرون وسطیٰ کے تاریخی مآخذ کے سلسلہ میں صوفیائے کرام کے مکتوبات بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں، اور قرون وسطیٰ کے سماجی اور اور مذہبی حالات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں، اس لیے ان مکتوبات کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا[۳]۔ ان خطوط میں ان بزرگان دین نے سماج کے ہر طبقہ کو مخاطب کیا ہے، اور بادشاہوں، امیروں، عالموں، درویشوں اور عوام سب کو ان کے غلط کردار پر جھنجھوڑا ہے، ان کے عیوب گنائے ہیں، ان کو نصیحتیں کی ہیں، زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آگاہ کیا ہے، اور نیکیوں کی تلقین کی ہے، ان خطوط کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ بزرگ اپنے زمانے کے بڑے نباض تھے، دکھ درد کا تجزیہ بھی کرتے تھے، اور اس کا علاج بھی بتاتے تھے، خواص سے محاسبہ بھی کرتے تھے اور غرباء کے زخموں پر مرہم بھی لگاتے تھے، اس سلسلہ میں چند مجموعۂ مکتوبات کے نام یہ ہیں:

(۱) مکتوبات حضرت شیخ بو علی قلندر بنام اختیار الدین[۴] (۲) مکتوبات حضرت شرف الدین یحییٰ منیری (۳) مکتوبات حضرت نور قطب عالم[۵] (۴) مکتوبات

---

[۱] دیکھئے: معارف، فروری ۱۹۵۷ء [۲] دیکھئے: معارف، جون ۱۹۵۸ء

[۳] تفصیل کیلئے دیکھئے: Ency of Islam, vol ii, P 50 [۴] اخبار الاخیار، ص ۱۲۱ نیز دیکھئے خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۳۲۲ [۵] اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار، ص ۱۰۴

سید محمد اشرف جہانگیر سمنانیؒ (مخطوطہ) (۵) مکتوبات شیخ احمد سرہندی (۶) مکتوبات خواجہ معصوم نقشبندیؒ (۷) بحرالمعانی[1] (مکتوبات حضرت خواجہ) (۸) مکتوبات قدوسی (حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ) (۹) مکتوبات[2] شیخ حسام الدین مانکپوریؒ (۱۰) مکتوبات شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ (مخطوطہ) (۱۱) مکتوبات شاہ ولی اللہ محدث دہلوی[3]ؒ (۱۲) مکتوبات شاہ کلیم اللہ دہلویؒ (۱۳) مکتوبات مرزا مظہر جانجاناںؒ

۳۔ فارسی تذکرے | صوفیائے کرام کے تذکروں سے بھی اسلامی ہند کے مستند حالات دستیاب ہوتے ہیں، آج کا مورخ ان تذکروں سے اس عہد کے عوام کے مذہبی رجحانات سے آگاہ ہوتا ہے، اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان ایام میں یہ بزرگ ایک نئے ماحول میں کس طرح اپنی زندگی گذارتے تھے، اور ان کی رواداری اور انسان دوستی کی بدولت اس اجنبی ماحول میں ان کی کتنی قدر و منزلت تھی[4]، بقول مولانا عبدالحق "انھیں مرے صدہا سال گذر چکے ہیں، مگر جن مقامات پر انکے قدم پڑے تھے، وہ اب تک "شریف" اور "مقدس" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں[5]، ان کے معاصرین اور عقیدتمندوں نے ان کے تقدس کا بڑے والہانہ انداز میں تذکرہ کیا ہے،

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے: رسالہ اردو، علی گڈھ، شمارہ ۳ بت ۱۹۶۱ء ص ۱۰ [2] مرات الکاملین (مخطوطہ ذاتی کلکشن)

[3] پروفیسر خلیق احمد نظامی نے انکے سیاسی مکتوبات کو اڈیٹ کرکے شائع فرمایا ہے جو ایک آپ اپنا نمونہ ہے

[4] دیکھئے (۱) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" مصنفہ سید ابوالحسن علی ندوی ص ۲۴۲-۲۵۲ (۲) تاریخ مشائخ چشت ص ۱۰

[5] اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ ص ۵۱

(۱) امیر خسرو فرماتے ہیں :- ؎

ہمہ شیطاں کش و فرشتہ خدم — در رہش بر ہوا نہادہ قدم
زندہ دار شب از دم تسبیح — غلغل افگندہ در رواق مسیح
ہر سوار شین شرع ساختہ تاج — دل شاں عرش و سجدہ شاں معراج[1]

(۲) حضرت جمال الدین ہانسویؒ کے جذبات ملاحظہ ہوں ؎

ایں طائفہ گلیم پوشاں — بے زحمت تاج و تخت شاہند
گرچہ حشم و خدم ندارند — با جامۂ زندہ بادشاہند[2]

(۳) شیخ جمالی فرماتے ہیں ؎

فی الحقیقت ہمچو خورشید سپہر — بر جہاں انداختی انوار مہر[3]

اب ہم ان ہندوستانی تذکروں کو پیش کرتے ہیں جن سے ہندی قرون وسطیٰ کے متعلق قیمتی اور مستند معلومات حاصل ہوتے ہیں:

(۱) سیر الاولیاء، امیر خورد (۲) لطائف اشرفی، مرتبہ نظام الدین یمینی (۳) سیر العارفین۔ مولانا جمالی (۴) اخبار الاخیار[4] شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ، (۵) گلزار ابرار، محمد غوثی شطاری (مخطوطہ[5]) (۶) اخبار الاصفیاء، عبد الصمد بن افضال محمد (مخطوط

---

[1] مثنوی ہشت بہشت، امیر خسرو (نولکشور، لکھنؤ) ص ۱۳ [2] دیوان جمال الدین ہانسوی ج ۱ ص ۵۰ [3] سیر العارفین ص ۱۴۷ [4] لطائف اشرفی میں صوفیہ کے تذکرے بھی ہیں، یہ قدیم ترین تذکروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے، دیکھئے: معارف ستمبر ۱۹۵۸ء [5] اسکا اردو ترجمہ اذکار ابرار کے نام سے آگرہ سے شائع ہوا ہے۔

(۷) مراۃ الاسرار، عبدالرحمن چشتی (مخطوطہ)۔ (۸) مجمع الاولیاء، میر علی اکبر حسینی اردستانی۔ (۹) سیر الاقطاب، شیخ اللہ دیا چشتی (۱۰) جواہر فریدی۔ علی اصغر چشتی (۱۱) معارج الولایت۔ غلام معین الدین عبد اللہ (۱۲) مطلوب الطالبین، محمد بلاق چشتی (مخطوطہ) (۱۳) روضۃ الاقطاب، محمد بلاق چشتی (۱۴) مناقب الاصفیاء، حضرت مخدوم شاہ شعیب[۱]۔ (۱۵) سفینۃ الاولیاء، دارشکوہ (۱۶) خزینۃ الاصفیاء غلام سرور (۱۷) ذکر الاصفیاء معروف تکملہ سیر الاولیاء، خواجہ گل محمد احمد پوری (۱۸) مرات الکاملین[۲]، عباد اللہ خواجہ عنایت اللہ کالپوی (مخطوطہ ذاتی کلکشن)

[۱] تفصیل کے لیے دیکھئے: معارف مارچ ۱۹۶۵ء [۲] تعارف کے سلسلہ میں دیکھئے: مقالہ "فتح پور کے بعض مخطوطات اور نوادر"۔ معارف فروری ۱۹۷۲ء

مقالہ نما

مضامین الندوہ

از مولوی سلمان صاحب شمسی ندوی

(۷)
دینی مباحث

آزاد ۔ ابوالکلام — فروری ۱۹۰۶ء

القضاء فی الاسلام — ص ۲۴ ۔ ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۲

اسلام دین و دنیا کا جامع ہے، اس لیے اس کے مجموعۂ تعلیم میں اعتقادات و عبادات کے ساتھ معاملات کا بھی مکمل حصہ موجود ہے، لیکن مخالفین کا دعویٰ ہے کہ اسلام آخری حصہ سے تہی دست تھا، اس لیے رومن لا کی دریوزہ گری کرکے اس کمی کو پورا کیا گیا، اس مضمون میں ہم قانون کے حصۂ قضاءت سے بحث کرنا چاہتے ہیں، اور دکھلانا چاہتے ہیں کہ بانیٔ اسلام نے کس جامعیت سے اس مسئلہ پر نظر ڈالی اور کس خوبی سے اس کے قواعد مرتب کیے،

۱۔ ابوالحسن علی ندوی (سید) — دسمبر ۱۹۴۱ء

"اعجاز القرآن" — ص ۱۱ ۔ ۲۷

حوالہ ۲۸۰/۲

قرآن کا امتیاز خصوصی اور اس کے اعجاز کا راز یہ ہے کہ وہ اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور حقیقت میں وہ اس کے علم خاص کا ایک مظہر ہے۔ اس لیے اس میں انسان اپنے ظنی اور مشتبہ، ناقص و محدود اور خدا کے بخشے ہوئے علم کے ساتھ کیا مقابلہ کرسکتے ہیں، جس طرح خدا کی اور صفات میں انسان مماثلت نہیں کرسکتا، اسی طرح وہ خدا کے علم میں بھی کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

۲۔ "قرآن کا تعارف قرآن کی زبان سے" جنوری ۱۹۴۱ء

ص ۴ - ۱۲

حوالہ ۲۸۰/۳

"اعجاز القرآن سے متعلق متفرق آیات کو جمع کرکے ان کی تفسیر کی گئی ہے"

۳۔ قرآن کی پیشین گوئی مئی ۱۹۴۱ء

ص ۵ - ۱۷

حوالہ ۲۷۹/۲

قرآن مجید کا ایک اعجاز پیشین گوئیاں ہیں .... جن حالات میں یہ پیشین گوئیاں کی گئی ہیں اور جس طرح ان کا ظہور ہوا وہ ایک معجزہ ہے۔"

سورہ روم کی روشنی میں بحث کی گئی ہے،

۴۔ قرآن مجید سے استفادہ کے شرائط و موانع نومبر ۱۹۴۱ء

ص ۹ - ۲۵

حوالہ ۲۸۰/۲

قرآن مجید کا خطاب سب سے یکساں ہے، لیکن اس کو قبول کرنے اور اس سے مستفید

...ہونے کی صلاحیت سب کی یکساں نہیں ہوتی، چیز ایک ہے، لیکن اس کے انسانی ...رف اور محل باہم متفاوت ہیں"۔

۵ - رسالت | اگست ۱۹۴۱ء
ص ۹ - ۲۰
حوالہ ۲۸۰/۲

پیغمبروں کو اپنے علم کے یقینی اور قطعی ہونے کا دعویٰ ہے، وہ صرف یہ نہیں کہتے کہ خدا ہے یا اس کے یہ صفات ہیں، بلکہ وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اسکی باتیں سنتے ہیں، ہم اس سے ہم کلام ہوتے ہیں، ہمارے پاس اس کے پیغام پہنچتے ہیں ہمارے پاس اس کے فرشتے آتے ہیں،

۱ - اسحٰق محمد پشاوری | مارچ ۱۹۴۲ء
"احتساب اسلام میں" | ص ۱۸ - ۲۵
حوالہ ۲۸۰/۳

پہلی صدی کے بعد جب لوگ اعمال میں تساہل برتنے لگے اور نگاہیں حق شناسی کی روادار نہ رہیں تو حکومت کی طرف سے احتساب کا شعبہ قائم ہوا، جس میں مختلف کارکن ہوتے تھے۔ جو مختلف خدمتوں پر مامور تھے، یہ محکمہ ادارۂ قضاۃ کے بالکل مشابہ تھا۔

۱ - اکرام اللہ خاں ندوی | مئی ۱۹۱۶ء
"غلامی اور اسلام" | ص ۱۶ - ۲۵
حوالہ ۲۸۶

مضمون میں مخالفین مذہب کے اس الزام کی تردید کی گئی ہے کہ اسلام نے

غلامی کو ختم نہیں کیا اور برقرار رکھا، مذاہب کا جائزہ لیا گیا اور اسلام میں غلاموں کے ساتھ جو حسن سلوک کی تاکید کی ہے، اسے بھی مع واقعات ذکر کیا ہے، نیز اسلام میں غلاموں کے حقوق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲- قرآن مجید اور معارضہ فروری ۱۹۱۵ء

ص ۹ - ۲۲

حوالہ ۲۶۹/۱۱

قرآن مجید کے موضوع معارضہ اور تحدی سے بحث کی گئی ہے، جس سے اعجاز قرآن پر روشنی پڑتی ہے۔

۳- ہمارا نصب العین اکتوبر ۱۹۱۵ء

ص ۲۹ - ۳۲

اسلامی نصب العین اور مسلمانوں کے فرائض و واجبات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حمید الدین فراہی، (مولانا حمید الدین فراہی صاحب تفسیر نظام القرآن)

"قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں" اپریل ۱۹۰۶ء

ص ۲۲ - ۳۲

حوالہ ۲۰۹/۳

قرآن مجید میں جہاں جہاں قسم کا لفظ آیا ہے، پہلے معنی کے لحاظ سے آیا ہے، خدا جب اپنی قدرت و شان کا اظہار کرتا ہے تو آفتاب کی، چاند کی، ستاروں کی، دن کی رات کی قسم کھاتا ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ تمام چیزیں اس کے وجود اور عظمت کی گواہی دے رہی ہیں۔

زکی ۔ احمد زکی بک جون ۱۹۰۹ء

اسلامی غزوات ص ۲۹ - ۳۲

حوالہ ۲۷۹/۹

اسلام کے دشمن کہتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کی جنگی مہمات اس امر کا ثبوت ہیں کہ اسلام نے محض تلوار کے سایہ میں اشاعت پائی ہے، لیکن ہر ایک منصف نظر شخص ان لڑائیوں کی صحیح تاریخ پڑھنے سے معلوم کر سکتا ہے کہ ان تمام غزوات اور لڑائیوں کا اصل سبب اشاعتِ اسلام کا جوش نہ تھا،

۱۔ سلیمان ندوی (سید علامہ) ستمبر ۱۹۱۱ء

الاحتساب فی الاسلام ص ۵ - ۲۳

حوالہ ۲۷۹/۸

محکمۂ احتساب اسلام کا وہ عظیم الشان اور روشن ترین کارنامہ ہے جس کی نظیر دنیا کا کوئی مذہب، کوئی تمدن، کوئی سلطنت پیش نہیں کر سکتی۔ یہ دعوی محتاج دلیل ہے۔ اس کی دلیل ناظرین مضمون کے خاتمہ پر پائیں گے،

۲۔ ارض القرآن اگست ۱۹۱۵ء تا نومبر ۱۹۱۵ء

حوالہ ۲۸۵

قرآن مجید میں بیس، تیس اقوام و اشخاص سے زیادہ نہیں، تاہم ان کی تحقیق کے لیے مخصوص طور سے کبھی کوشش نہیں کی گئی، عموماً یہ مباحث تفسیر کے ضمن میں لکھے گئے یا تاریخ عمومی میں مقدمہ کے طور پر مذکور ہوئے۔ حالانکہ اس اہمیت تخصیص و افراد کی محتاج تھی،

(کتاب سے اقتباسات)

۳۔ اسلام اور تمدن فروری ۱۹۰۹ء

ص ۱۷ - ۳۲

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۶}$

ایک فرانسیسی فاضل میسو رنیا میلیا کے لکچر کا ترجمہ جو اس نے پیرس کانفرنس میں دیا تھا، جس میں اسلامی تمدن کی برتری ثابت کی گئی ہے،

۴۔ اسماء القرآن اگست ۱۹۱۱ء

یعنی قرآن مجید کے نام اور انکے متعلق تحقیقات ص ۷ - ۲۰

حوالہ $\frac{۲۰۹}{۸}$

مندرجۂ ذیل عنادین سے بحث کی گئی ہے،

نام کی ضرورت ، دیگر صحف انبیاء کے نام ، الہامی کتابوں کے نام الہامی ہوئے ہیں ، کثرت اسماء القرآن ، قرآن مجید کے عام نام ، قرآن مجید کے مخصوص نام وغیرہ

۵۔ اشتراکیت اور اسلام مئی ۱۹۱۱ء

ص ۳ - ۲۴

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۴}$

نظریہ اشتراکیت کا جائزہ اور اسلام سے موازنہ کیا گیا ہے،

۶۔ برنابا کی انجیل اکتوبر ۱۹۰۷ء

ص ۲۳ - ۳۰

حوالہ $\frac{۲۷۹}{۴}$

لوقا، متی، مرقس، یوحنا کی انجیلوں کے سوا عیسائیوں کے یہاں ایک اور انجیل ہے جس کا نام برنابا کی انجیل ہے، عیسائی اس کو اصل انجیل نہیں سمجھتے، ان کے پاس اس دعویٰ کی صحت کی دلیل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس انجیل میں اسلام کی ہر جگہ تائید ہے اور ہمارے نزدیک یہی امر اس کی صداقت کا ثبوت ہے،

۷۔ تاریخ ارض القرآن کا ایک باب جنوری ۱۹۱۵ء

ص ۷ - ۳۶

حوالہ ۲۸۵

ارض القرآن کی پہلی جلد کا اقتباس جس میں اصحاب ایکہ، مکہ اور جدہ کے حالات لکھے گئے ہیں،

۸۔ تحریم شراب اکتوبر ۱۹۰۹ء

ص ۱۵ - ۲۴

حوالہ ۲۷۹/۹

جس طرح اسلام اور اس کے احکام فطری ہیں، اسی طرح اس کا طریقۂ تعلیم بھی فطری ہے۔ اس نے اپنے متبعین کو شراب کی حرمت کا مسئلہ بالکل تدریجی طور سے بتایا تاکہ عرب آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ اپنی اس قدیم اور راسخ عادت کو چھوڑ سکیں،

۹۔ جنگِ احد ستمبر ۱۹۰۹ء

ص ۱۹ - ۲۹

حوالہ ۲۷۹/۹

جنگِ احد کے واقعات سے اسلامی غزوات کے اسباب، مسلمانوں کی جنگی حفاظت، مسلمان مجاہدوں کی بے سروسامانی، مسلمانوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی محبت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقلال، صحابہ کی بہادری، مسلمان عورتوں کی شجاعت اور ان کی مذہبی خدمت گذاری، مسلمان شہداء کا ایمان صادق اور مشرکین کی سنگدلی کے حالات تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں۔

۱۰۔ سود اور صحفِ انبیاء جون ۱۹۰۹ء

ص ۲۱ - ۲۸

حوالہ ۲/۹ ۴

جائزہ لیا گیا ہے کہ گذشتہ صحف میں سود حرام قرار دیا گیا، تاریخی حقائق واقعات کو ذکر کیے گئے ہیں، اور آخر میں قرآن مجید کی آیات حرمت کی تفسیر پیش کی گئی ہے۔

۱۱۔ سیرت کا مختصر پیام مئی ۱۹۲۰ء

ص ۴ - ۱۲

حوالہ ۲۸۸

سیرت پر لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ایک نشری تقریر۔

۱۲۔ صحابہ کی تعداد اور طبقات روایت اگست ۱۹۰۹ء

ص ۴ - ۱۴ حوالہ ۲/۹ ۴

علامہ ذہبی کی رائے کے مطابق ان ایک سو پانچ صحابیوں میں سے اٹھائیس صحابہ ایسے ہیں جنکے نام سے علم حدیث کے اکثر صفحات مزین ہیں، ان اٹھائیس صحابیوں میں سے ...... نام کی تفصیل کے ساتھ ۶ صحابہ سب سے زیادہ کثیر الروایات ہیں۔

۱۳۔ القرآن والفلسفۃ الحدیثۃ جولائی ۱۹۰۸ء

ص ۲۱ - ۳۰

حوالہ ۲۷۹/۱

اسلام دنیا میں پہلا مذہب ہے جس نے اپنے مسائل کی بنیاد عقل پر رکھی، قرآن مجید کا طرز تعلیم دیکھو کہ اس نے اپنے پیرووں کو جہاں کسی مسئلہ کی تلقین کرنی چاہی، اس کی دلیل بھی بیان کر دی ہے، تتبع سے ایسی بہت سی حدیثیں اور آیتیں مل سکتی ہیں جن میں یہ صاف صاف کہا گیا ہے کہ مذہب کو عقل سے ماننا چاہیے"

۱۴۔ قیامت ستمبر ۱۹۰۹ء

ص ۹ - ۱۹ ۔ حوالہ ۲۷۹/۹

حوالہ ۲۷۹/۹

عقائد کے اکثر مسائل ایسے ہیں جنکے ثبوت اور طرز ثبوت میں اسلام کے مختلف فرقے مختلف الرائے ہیں، لیکن ابن حزم نے ملل میں لکھا ہے کہ قیامت کے اعتقاد پر کل فرقہائے اسلامیہ کا اتفاق ہے، لیکن یورپ، یونان اور ہندوستان کے اکثر حکماء کو قیامت اور فنائے عالم سے انکار ہے،

۱۵۔ مذہب اسلام اور علم و عقل جولائی ۱۹۱۱ء

ص ۵ - ۱۸

حوالہ ۲۷۹/۸

اس مذہب نے اپنے زور اور قوت کے موافق علم اور تحقیقات جدیدہ کی مخالفت کی عقل کو آگ اور تکفیر کے ہتھیار سے سزا دی لیکن نہ رکنا تھا نہ رکی

دشمنا کتی دمشی اور خود اس کو مٹا کر اور مٹا کر رہی، مذہب کے یہی مظالم ہیں جن میں اس نے اپنے خصوصیات سے باہر قدم رکھا، اور آخر حکمائے یورپ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ مذہب اور علم دو منافی چیزیں ہیں، جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں

۱۶۔ مسئلہ ارتقاء اور قرآن مجید جنوری ۱۹۰۸ء

ص ۱۹ - ۱۶

حوالہ $\frac{۷۶۹}{۴}$

مسئلہ ارتقاء کا پہلا حکم یہ ہے کہ انسان دفعۃً پیدا نہیں ہوا، بلکہ چند مرحلوں میں انسان اپنی اس آخری منزل تک پہنچا ہے، جماد سے نبات ہوا، نبات سے حیوان اور حیوان سے انسان، قرآن مجید کی بہت سی آیتیں انسان کے چند دوروں میں پیدا ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

(باقی)

مکتوب حمید

پالسیں۔ ۲۳ اگست

محترمی! زادمجدکم سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تہذیب جدید کا کرشمہ ہے کہ مئی ۱۹۷۲ء کا رسالہ معارف اب اگست کے آخر میں آیا ہے۔ اس میں امیہ بن ابی الصلت پر مقالہ شوق سے پڑھا۔ اگرچہ آخر میں "باقی" لکھا ہے لیکن اس کا کسے یقین کہ اسے دیکھنے کا موقع ضرور ملے گا۔ اسی لیے دو چیزیں جو ذہن میں گزریں، فوراً عرض کرتا ہوں۔

مقالہ کے شروع ہی میں (یعنی صفحہ ۳۲۵ کے حاشیے میں) لکھا ہے کہ زید ابن عمرو بن نفیل "بعثت نبوی سے ۵، سال پہلے ہی مرگیا" کیا ہندسے میں طباعتی غلطی ہے؟ یا مقالہ نگار نے تحقیق کے بعد لکھا ہے؟

بعثت نبوی چالیس سالہ عمر میں ہوئی۔ لہٰذا امیہ کو ولادتِ باسعادت نبوی سے پینتیس سال پہلے مرچکا ہونا چاہیے، لیکن میرے سامنے اس وقت الروض الانف للسہیلی (طبع اول) ہے، اس میں جلد اول کے صفحہ (۱۴۶) پر ہے

روی البخاری عن ...... ان	امام بخاری نے فلاں فلاں سے
النبی صلی اللہ علیہ وسلم	روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے
لقی زید بن عمرو بن نفیل	بلدح [پہاڑ] کے زیریں حصے میں
بأسفل بلدح قبل ان	زید سے ملاقات فرمائی اور اس
ینزل علی النبی علیہ السلام	وقت تک آپ پر وحی نازل

الوحی ..... الخ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ نہ ہوئی تھی ...... وغیرہ

اسی طرح سیرۃ رسول اللہ لابن ہشام میں ہے (طبع یورپ) اس کے صفحہ (۱۴۸ تا ۱۴۹) پر اس کی موت کے ذکر میں ہے کہ وہ دین حق کی تلاش میں موصل تک گیا، پھر شام آیا تو میفعہ کے مشہور راہب نے اس سے کہا: "تو اسے یہاں کہاں ڈھونڈھ رہا ہے، وہ تو تیرے ہی ملک میں مبعوث ہوگا۔ اور اب اس کا وقت آچکا ہے۔ اس پر وہ تیزی سے مکہ واپس ہوا، مگر راستے میں قبیلۂ لخم کے لٹیروں نے اسے مار ڈالا ـــــ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زید کی وفات بعثت نبوی کے بعد ہوئی،

دوسرا قابل توجہ امر یہ ہے کہ بلاذری کی کتاب انساب الاشراف (مخطوطۂ استانبول و رباط) کے اس حصہ میں جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، امیہ بن ابی الصلت کی سوانح عمری بھی ہے۔ اس میں یہ جملہ ہے:

وکان یھودیا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ وہ یہودی تھا،

اس توضیح کے بعد اس کے اشعار میں توحید، فرشتوں وغیرہ کا ذکر آئے تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے۔ قبیلۂ ثقیف سے اس کا تعلق موالات کا ہوگا، نسل کا نہیں،

خدا کرے آں محترم اب خیر و عافیت سے ہوں۔

نیازمند

محمد حمید اللہ

باب التقریظ والانتقاد

الهند فی العهد الاسلامی

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

الهند فی العهد الاسلامی اسلامی ہند کے مشہور مورخ و محقق حضرت مولانا حکیم سید عبد الحیٔ صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۴۱ھ) کی تیسری اہم ترین کتاب ہے، جو حال ہی میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے چھپکر شائع ہوئی ہے، اس سے پہلے ان کی دو کتابیں "نزہۃ الخواطر" اور "الثقافۃ الاسلامیہ فی الهند" حیدرآباد اور دمشق سے شائع ہوکر عالم اسلام میں قبول عام حاصل کرچکی ہیں، اب یہ تیسری کتاب ہمارے سامنے آئی ہے، اس وقت اسی کتاب کا تعارف مقصود ہے،

اسلامی ہند پر علماء نے اپنے اپنے دور میں زمانہ اور حالات کے تقاضے کے مطابق کتابیں لکھیں، قدماء میں واقدی (۲۰۷ھ) کی کتاب اخبار فتوح السند، مدائنی ۲۲۵ھ کی کتاب ثغر الهند، کتاب عمال الهند اور کتاب فتح مکران میں اموی دور اور ابتدائی عباسی دور کی فتوحات و امارات وغیرہ کا تذکرہ تھا، مگر ان میں سے کوئی کتاب آج موجود نہیں ہے، چوتھی صدی میں بزرگ بن شہریار ناخدا نے عجائب الهند کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں عباسی دور میں اہل ہند کے عادات و عوائد

سے متعلق کچھ باتیں پائی جاتی ہیں، یہ ایک قسم کا سفرنامہ ہے۔ البیرونی ۴۳۰ھ کی کتاب الہند اور تحقیق ماللہند میں یہاں کے علوم و فنون خاص طور سے ریاضی اور فلکیات کا بیان ہے، یہ سب کتابیں چھپ چکی ہیں، اسلامی ہند پر ان مستقل تصانیف کے علاوہ سلیمان تاجر، ابوزید سیرافی، ابن حوقل بغدادی، مسعر بن مہلہل ینبوعی، مسعودی وغیرہ نے اپنے سفرناموں اور کتابوں میں یہاں کے عام حالات درج کیے ہیں، اور ابن خردادبہ کی المسالک والممالک، ابن فقیہ ہمدانی کی کتاب البلدان، اصطخری کی مسالک الممالک، مقدسی کی احسن التقاسیم اور حموی کی معجم البلدان میں یہاں کے بلاد وامصار اور ان کے جغرافیائی حالات موجود ہیں، مگر ان کے مندرجات ومعلومات کا تعلق تیسری اور چوتھی صدی کے سندھ ومکران سے ہے، نیز ان سے اس زمانہ کے اسلامی ہند کی تصویر سامنے نہیں آتی ہے، البتہ ابن بطوطہ مغربی کے سفرنامہ کی دوسری جلد میں آٹھویں صدی کے اسلامی ہند کے سیاسی و ملکی حالات اور خطط و آثار کے بارے میں کافی مواد پایا جاتا ہے، اسی طرح فضل اللہ عمری کی مسالک الابصار میں متعلق دور کے بارے میں بہت سی قیمتی معلومات درج ہیں، مگر اس کا یہ حصہ ابھی تک مخطوط ہے، آخری دور میں شیخ غلام علی آزاد متوفی ۱۲۰۵ھ نے سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان لکھی، جس میں ہندوستان کے چند علماء و فضلاء کے تراجم، ہندوستان سے متعلق آثار و روایات اور ہندی شعر و ادب کا تذکرہ ہے،

یہ بات قابل تعجب اور ساتھ ہی افسوسناک ہے کہ ان بارہ تیرہ صدیوں میں یہاں کوئی ایسا عالم نہیں گذرا جس نے خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد، ابن عساکر کی تاریخ دمشق، لسان الدین خطیب کی الاحاطہ فی اخبار غرناطہ اور مقریزی کی

کتاب الخطط والآثار کی طرح اسلامی ہند پر کوئی جامع کتاب تصنیف کی ہو، اور تھوڑا بہت جو کام ہوا وہ غیر ہندی علما و مصنفین کے قلم کا احسان ہے، اس سلسلہ میں یہاں کے فارسی مورخوں اور تذکرہ نویسوں سے شکوہ فضول ہے، کیونکہ انھوں نے روز اول ہی سے اپنے اپنے حلقے مخصوص کر لیے تھے، ایک طبقہ کا قلم شاہی درباروں کی گلکاریوں میں منہمک رہا، اور دوسرا طبقہ مشائخ کی خانقاہوں میں بیٹھکر اپنے قلم کی برکت سے کشف و کرامات کا مینارۂ نور نصب کرتا رہا اس کے باوجود ان دونوں طبقوں نے بعض معیاری اور معلوماتی کتابیں لکھیں، جن کی قدر و منزلت مسلم ہے، چنانچہ درباری حلقہ میں ابوالفضل کی آئین اکبری اپنے موضوع پر نہایت جامع اور بے نظیر کتاب ہے، جس میں اکبری دور کے ہندوستان کی ملکی و آئینی معلومات اور دوسری بہت سی باتیں نہایت شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں، مگر اس کی حیثیت ایک حکومت کے انتظامی آئین نامہ کی ہے، یا زیادہ سے زیادہ اسے تیموری سلطنت کا آئینہ کہا جاسکتا ہے اس لیے ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جو اسلامی ہند کا نقشہ ہمارے سامنے یوں پیش کرے کہ ہم اس میں عہد بہ عہد مسلم ادوار کے خد و خال دیکھ سکیں اور معلوم ہو کہ امویوں، عباسیوں، غزنویوں، غلاموں، غوریوں، خلجیوں، تغلقوں، لودھیوں، تیموریوں اور ان کے دور کے علاقائی خود مختار امرا و سلاطین نے حکومت و سیاست کے میدان میں کیا کارنامے انجام دیے ہیں، ان کا نظام حکومت، نظام مالیات، نظام اراضی، نظام عدل و انصاف نظام جنگ وغیرہ کس قسم کا تھا، اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں کون کون سے عہدے اور مناصب تھے،

درباری آداب ورسوم کیا تھے، رعایا اور عوام سے امراء وسلاطین کے تعلقات کس نوعیت کے تھے، انھوں نے کیا کیا رفاہی خدمات انجام دیں اور امن وامان کی بحالی و برقراری کے لیے کیا جتن کیے، ان کے دور میں یہاں کے مختلف مذاہب اور مختلف طبقات کے ساتھ کیا سلوک تھا۔ انھوں نے کہاں کہاں اور کیسے کیسے مدارس قائم کیے، جوامع و مساجد تعمیر کیں، غیر مسلموں کے معبدوں کے لیے کیا کیا، شفاخانوں کا کیا انتظام تھا، ان میں مریضوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا تھا، انھوں نے اس ملک میں کیسی کیسی پُرشکوہ اور حسن وجمال سے بھرپور عمارتیں بنائیں کیسے کیسے باغات و انہار سے اس ملک کو سرزمین جنات وانہار بنایا، کس دوراندیشی سے راستوں اور سڑکوں کی تعمیر کرکے پورے ملک کو ایک بستی بنایا اور ڈاک کا بہتر سے بہتر انتظام کرکے ملک کے دور دراز علاقوں کو جوڑ دیا،

نیز اس دور میں یہاں کے باشندوں کے مذاہب، زبانیں، رسوم وعادات تہوار، ماہ وسال، اعداد و شمار اور معابد و ہیاکل وغیرہ معلوم ہوں،

بلاشبہہ ان تمام معلومات بلکہ ان کے علاوہ اور بہت سی نہایت اہم اور قیمتی معلومات کے لیے "الہند فی العہد الاسلامی" مکمل اور جامع کتاب ہے اور جس طرح اس کے مصنفِ مرحوم نزہۃ الخواطر میں ہندوستان کے ابن خلکان اور الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند میں ابن ندیم معلوم ہوتے ہیں اسی طرح الہند فی العہد الاسلامی میں اپنے ملک کے مقریزی نظر آتے ہیں،

جس زمانہ میں مولانا مرحوم اسلامی ہند کے علماء ومشائخ، علوم وفنون اور محاسن ومفاخر کی داستانیں عربی زبان میں مرتب کر رہے تھے، ان کے

معاصر مورخ و مصنف ان ہی موضوعات و مباحث پر اردو زبان میں کتابیں لکھ رہے تھے، اور ان کو مسلمانوں کے قدیم و جدید طبقوں میں قبول عام حاصل ہوتا تھا، مگر ان کا نقطۂ نظر وقتی اور مقامی نہیں تھا، اس لیے انھوں نے ان کتابوں کے لیے عربی کو تصنیفی زبان قرار دیکر پورے عالم اسلام میں اسلامی ہند کو روشناس کرانا چاہا تھا، چنانچہ یہ مقصد ان کی وفات کے چالیس پچاس سال کے بعد پورے طور سے حاصل ہوا اور انکی کتابیں ہندوستان کے علاوہ عرب ممالک بلکہ عالم اسلام کے علماء و محققین میں مقبول ہوئیں، ساتھ ہی مصنف مرحوم اپنی تصانیف کے ذریعہ ہندوستان کے مورخوں اور تذکرہ نویسوں کی اس غلطی کا ازالہ کرنا چاہتے تھے جسکا ارتکاب شروع سے آخر تک ان کی فارسی کی تاریخوں میں ہوا ہے، چنانچہ یادِ ایام میں ایک مقام پر لکھتے ہیں :-

"ملک کی بدمذاقی دیکھئے کہ ابتداء سے ابتک ہندوستان کی سیکڑوں تاریخیں لکھی گئیں اور مختلف عنوانوں سے لکھی گئیں، مگر ان میں سے کوئی کتاب تاریخ نویسی کے معیار پر پوری نہیں اترتی، جس کتاب کو اٹھا کر دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ رزم بزم کا کوئی افسانہ ہے، قرنا کوس کے ذکر سے اگر کوئی صفحہ خالی ملے گا تو چنگ و رباب کے ذکر سے اس کو آپ خالی نہ پائیں گے۔"

میں اسلامی ہند کی تاریخ کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس حقیقت کے اظہار میں اطمینان و مسرت محسوس کرتا ہوں کہ یہ کتاب "نزہۃ الخواطر

اور الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، اسلامی ہند کی تاریخ نویسی کے معیار پر پوری اترتی ہیں، اور ان میں یہاں کے اسلامی ادوار کی تاریخ کی پوری آئینہ داری موجود ہے، ضرورت ہے کہ "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" کی طرح ان دونوں کتابوں کا ترجمہ بھی اردو زبان میں کیا جائے، تاکہ اردو داں طبقہ کے سامنے بھی ہندوستان کے مسلم ادوار کا صحیح نقشہ آجائے، خاص طور سے موجودہ حالات میں اس کی بڑی ضرورت ہے، خود مصنف مرحوم نے اس ضرورت کا اظہار کتاب کے مقدمہ میں یوں کیا ہے کہ

"میں نے یہ کتاب تفریحی مشغلہ کے طور پر یا کسی کے دباؤ اور شوق دلانے پر تصنیف نہیں کی ہے، بلکہ میرے نزدیک یہ کام نہایت ضروری اور بقدر استطاعت فرض تھا، پھر وطن عزیز بمنزلہ والدہ کے ہوتا ہے، اسکا بھی حق ہے اور اس سے محبت ناگزیر ہے۔ اس لیے ہم پر لازم ہے کہ اس کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس سے مسلمانوں کو واقف کرائیں۔"

یوں تو پوری کتاب ہی "دریا بہ کوزہ" کے مصداق ہے، مگر آخری حصہ جو خطط و آثار پر مشتمل ہے، نہایت اہم ہے، اور کہنا چاہیے کہ یہ رخ اس قدر بسط و تفصیل کے ساتھ مستند و معتبر طریقہ پر پہلی بار سامنے آیا ہے، اس میں مختلف دور کے حکمرانوں کے اصول سلطنت، نظام مملکت، شاہی آداب و رسوم زمینوں کی تقسیم، خراج و عشر کی تشخیص، عدل و انصاف اور قضاء کا طریقہ سرکاری دواوین و مناصب، مرکزی اور صوبائی نظام، فوجی نظام، بری اور بحری طاقت، اصول جنگ، شہور و سنین اور ساعات، نقود، سکہ جات

ناپ تول، اوزان وغیرہ کا بیان نہایت مفصل طریقہ پر کیا گیا ہے، اس کے بعد مسلم حکمرانوں کی فنی و تعمیری اور علمی و دینی خدمات، اس سلسلے کے آثار یعنی مساجد، جوامع، مدارس، شفا خانوں، باغات، نہروں، حوضوں، سڑکوں ڈاک، مشاہد و مقابر، ہیاکل و معابد اور فن تعمیر اور فنون لطیفہ کے عجیب غریب آثار و علائم کا ذکر کیا گیا ہے، شاید اسی لیے مصنف نے اس کا نام جنۃ المشرق ومطلع النور المشرق رکھا تھا،

فروری ۱۹۲۳ء میں مصنف کا انتقال ہوا، اور اسی سال علامہ سید سلیمان ندویؒ نے دار المصنفین اعظم گڈھ سے اس کتاب کی اشاعت کا انتظام کیا، اور اس کی افادیت و اہمیت کے پیش نظر دہلی میں عربی ٹائپ پر چھپوانا چاہا، اس کا ایک معتد بہ حصہ چھپ بھی گیا تھا، مگر تاخیر کی وجہ سے مسودہ کا باقی حصہ کیڑوں کوڑوں کی نذر ہو گیا، جب اس علمی حادثہ کی خبر مصنف مرحوم کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم کو ہوئی تو انھوں نے اس کرم خوردہ اور ناقص مسودہ کو وہاں سے لیکر بڑی محنت سے مکمل کیا۔ بلکہ بعد کے واقعات کے سلسلے میں نہایت قیمتی اضافے بھی کیے، اور چونکہ اس وقت طباعت کی امید نہیں تھی، اس لیے بحفاظت رکھدیا، اللہ کی شان کہ اس بار بھی یہ مسودہ کیڑوں کوڑوں کی نذر ہو کر اس کے صفحات غائب ہو گئے مگر مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد اسے دوبارہ مرتب کیا، اور اپنے بھائی مرحوم ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے زیادات پر زیادت الزیادات لکھکر کتاب کو ہر اعتبار سے جامع و مکمل بنا دیا، اور ساتھ ہی موصوف نے مصنف کے حالات کے بعد ۲۳ صفحات کا بسیط مقدمہ لکھا جو بجائے خود ہندوستان کی اسلامی

تاریخ کا عصارہ اور الہند فی العہد الاسلامی کا خلاصہ ہے،

اس کتاب کے تین حصے یا فنون ہیں، پہلا فن ہندوستان کے جغرافیائی اور ملکی حالات پر مشتمل ہے، دوسرے فن میں مسلم سلاطین کی مختصر تاریخ ہے، اور تیسرے فن میں خطط و آثار کا بیان ہے،

فن اول صا سے ص۱۲۹ تک ہے، اس میں ایک مقدمہ اور پانچ ابواب ہیں، مقدمہ میں جغرافیہ کے عام اصطلاحی الفاظ و محاورات کی تشریح ہے، باب اول میں ہندوستان کا جغرافیہ، دریا، پہاڑ، آب و ہوا، پیداوار، حاصلات، عطور و بخور، عقاقیر، اشجار و اثمار، جانور، پرند، چرند، معدنیات، مذاہب، زبان وغیرہ کا بیان ہے، باب دوم میں طبعی اور جغرافیائی علاقوں اور خطوں کا تذکرہ ہے، باب سوم میں یہاں کے صوبوں اور ان کے مشہور مقامات اور شہروں کا ذکر ہے، باب چہارم میں فرانس اور پرتگال کے ہندوستانی مقبوضات اور انگریزی کے مسلم اور غیر مسلم حکمرانوں کی ریاستوں اور جاگیروں کی تفصیل ہے، باب پنجم میں ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کے باشندوں کی آبادی اور مختلف مذاہب والوں کے اعداد و شمار درج ہیں،

فن ثانی ص۱۳۰ سے ص۳۲۵ تک ہے، اس میں بڑے سلیقہ اور اختصار کے ساتھ ابتدائے اسلام سے اس دور تک کے مسلم بادشاہوں اور ان کی حکومتوں کا ذکر ہے، اس حصہ کے مطالعہ سے مسلم حکمرانی کے تمام ادوار سامنے آجاتے ہیں، اس میں دس ابواب ہیں، باب اول میں خلافت راشدہ سے لیکر تیسری صدی تک کے غزوات و فتوحات اور امارات کا اجمالی ذکر ہے، جو زیادہ تر بلاذری کی کتاب فتوح البلدان

ے باب فتوح السند پر مشتمل ہے، باب دوم میں غزنوی اور غوری سلاطین کا ذکر ہے، ب سوم میں سلاطین دہلی کا بیان ہے، جس میں غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور تیموریوں ے حالات بڑی جامعیت کے ساتھ درج ہیں، باب چہارم میں سلاطین کشمیر، باب پنجم یں سلاطین دکن، باب ششم میں سلاطین گجرات، باب ہفتم میں سلاطین شرقیہ جونپور، باب ہشتم میں ملوک مالوہ و مانڈو، باب نہم میں طوائف الملوکی کے دور کے امراء ملوک کا بیان ہے، جن میں ملوکِ سندھ، ملوکِ ملتان، ملوکِ بنگالہ، ملوکِ خاندیس، ملوکِ بیجاپور، ملوکِ احمدنگر، ملوکِ اڑیسہ، ملوکِ گولکنڈہ، ملوکِ برار، ملوکِ بریدشاہی، ملوکِ اودھ، اور بنگال، بہار، اڑیسہ، فرخ آباد، روہیل کھنڈ، نجیب الدولہ شاہی اور میسور کے حکمرانوں اور نوابوں کا ذکر شامل ہے، باب دہم میں تین فصلیں اور تذئیل و تکمیل ہیں، فصل اول میں ہندوستان میں برطانوی سلطنت اور انگریزی تسلط کی تاریخ ہے، فصل دوم میں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی اور فصل سوم میں انگریزی میں ہندوستان کے مسلمان امراء و نوابین کا تذکرہ ہے، تذئیل و تکمیل میں مصنف کے صاحبزادوں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۱۹۴۵ء سے ہند و پاکستان کی تقسیم کے بعد تک کے واقعات درج کیے ہیں، جن میں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے رو سے ملک کی آبادی میں مسلمانوں کا عددی تناسب، ہر صوبہ میں ان کی تعداد اور یہاں کی سرکاری زبانوں وغیرہ کا ذکر اختصار اور جامعیت کے ساتھ ہے، جو بجائے خود نہایت اہم اور مفید چیز ہے۔

فن ثالث ص ۳۲۶ سے ص ۴۶۳ تک ہے، اس میں سلطنت کے امور و معاملات، محکمہ جات عہدہ جات، مناصب، شاہی آداب و رسوم اور نظام مملکت اور کارناموں کا

ذکر نہایت تفصیل سے ہے، اس میں تین باب ہیں، پہلے باب میں آٹھ فصلیں ہیں،

فصل اول میں ہندوستان کے نظام حکومت اور دُوَلی قانون کے پس منظر کا ذکر کرکے ملوک ہند کے دو طبقے قائم کیے گئے ہیں، پہلے طبقہ میں ملوک اور خلجی وغیرہ سلاطین کے طرز حکومت اور سرکاری مناصب اور حسب ذیل شاہی محکمہ جات اور ارکان دولت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وزیر، عرض الممالک، حاجب، قاضی، امیر داد، کوتوال، امیر کلید دار، امیر وکیل دار، امیر جامدار، امیر سلاح دار، دیوان عرض، دبیر، مشرف، مستوفی، مجموعہ دار، اقطاع دار، مقطع، آخور بیگی، شحنۂ فیل، شحنۂ عمارت ان تمام عہدوں کی تفصیلات اور ان کے کاموں کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، دوسرے طبقۂ سلاطین میں سلاطین تیموریہ (سلاطین مغلیہ) کے مرکزی اور صوبائی عہدہ داروں اور سرکاری افسروں کی تفصیل درج ہے۔ مرکزی افسر اور ارکان دولت جو سفر و حضر میں بادشاہ کے ساتھ رہا کرتے تھے، اور اس کے نائب کی حیثیت سے امور مملکت کو انجام دیتے تھے، یہ تھے: وکیل مطلق، مدار المہام، دیوان اعلیٰ، میر بخشی، صدر الصدور، قاضی القضاۃ مفتی لشکر، محتسب، داروغۂ عدالت، دبیر، میر توزک، میر آتش، میر سامان، خانساماں، داروغۂ خریداری، داروغۂ جواہر خانہ، داروغۂ کتب خانہ، داروغۂ غسل خانہ، داروغۂ عرض مکرر، داروغۂ ڈاک چوکی، داروغۂ خاصاں، آخور بیگی، شحنۂ فیل، کوتوال ۔ صوبوں کے افسر اور شاہی ملازم یہ تھے، صوبہ دار، بخشی، دیوان (اسکے ماتحت پیشکار، داروغۂ کچہری، مشرف دفتر، تحویلدار، منشی کچہری، حضور نویس، صوبہ نویس، محرر خالصہ، محرر دفتر تن، محرر دفتر باقی، محرر سرشتہ تھے اور یہ سب دیوان کے حیثیت سے تعلق رکھتے تھے)، فوجدار، صدر، قاضی، محتسب، داروغۂ عدالت،

تاریخ نگار، کوتوال، تھانہ دار، عمل گزار، خزانہ دار، قانون گو، تیلچی، ان کے علاوہ صوبوں میں اور بھی مزید عہدے ہوتے تھے، مثلاً دیوان سائر (اس کے ماتحت داروغہ، امین روری، مشرف، تحویلدار ہوا کرتے تھے) دیوان حدائق، دیوان بیت المال، دیوان عمارت، بعور خانہ، دار الشفاء

فصل دوم میں فوجی نظام کا بیان ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ یہاں کے سلاطین کا فوجی نظام چنگیز خاں کے فوجی نظام سے ماخوذ و متاثر ہے، پھر علاء الدین خلجی، شیرشاہ سوری، سلیم شاہ، شیر شاہ سوری اور اکبر وغیرہ کے فوجی نظام اور جدید قوانین و اصلاحات کا ذکر ہے، اور یہ کہ شاہ جہاں کے دور میں بنگال میں زبردست بحری بیڑا تھا جس میں ایک ہزار جنگی جہاز اور ستر ہزار سپاہی تھے، پھر میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب، صف بندی اور طریقۂ جنگ کا بیان ہے؛

فصل سوم میں شاہی منصب کا ذکر ہے جو سلاطین کی طرف سے ارکان دولت، امرائے ملک اور مقربین بارگاہ کو بخشا جاتا تھا، مثلاً منصب دہ ہزاری، پنج ہزاری اور دو ہزاری وغیرہ میں بادشاہ کی طرف سے کیسے گھوڑے، ہاتھی، گاڑیاں اور ماہانہ وظائف ملتے تھے،

فصل چہارم میں نظام اراضی اور مالگذاری وغیرہ کے قوانین کا ذکر ہے اور اس سلسلہ کے عہدوں کی تفصیل ہے،

فصل پنجم میں سلاطین کے عدل و انصاف کے طور طریقہ کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں شیرشاہ کی سیاست کا ذکر خاص طور پر ہے، اس کے بعد مغل بادشاہوں کے قانون عدل کے بیان کے ساتھ ان کے دربار عام کا ذکر ہے، جس میں دور دور سے مظلوم اور

داد خواہ آکر عدل و انصاف پاتے تھے۔ اس سلسلہ میں عدل عالمگیری کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ سب سے پہلے عالمگیر نے دارالقضاء اور عدالتوں میں شرعی وکالت کا طریقہ جاری کیا،

فصل ششم میں سلاطین کے قصور و محلات کا ذکر ہے ا اور یہ کہ اس ملک کے کن کن سلاطین کے کہاں کہاں شاہی محلات ہیں اور ان کا طرز تعمیر کیا ہے۔

فصل ہفتم میں خاص طور سے بادشاہوں کے دربار عام کی تفصیل درج ہے، اور یہ کہ اس جلوس کے شاہی آداب کیا تھے،

فصل ہشتم میں سلاطین ہند کے جشن اور تہوار کا ذکر ہے۔

فصل نہم میں بادشاہ کے اپنے ملک میں نکلنے کے طور طریقہ کا بیان ہے،

فصل دہم میں بادشاہ کے سامنے آداب بجالانے کا ذکر ہے،

باب دوم میں پانچ فصلیں ہیں: فصل اول میں یہاں کے مہینوں، سالوں اور گھڑیوں کا بیان ہے اور مسلمانوں کی تاریخ کا خصوصی ذکر ہے۔ فصل دوم یہاں کے نقود اور سکہ جات کے بیان میں ہے۔ جس میں بڑی دقت نظر سے کام لیا گیا ہے اور ان کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات درج ہیں۔ فصل سوم میں مقادیر اوزان کا ذکر ہے، فصل چہارم میں زمین کے اقسام خالصہ، صرف خاص، پائیگاہ، جاگیر، انعام وغیرہ کا ذکر ہے۔ فصل پنجم میں عشر اور خراج وغیرہ کا بیان ہے، اسی ضمن میں یہاں کے بادشاہوں کے مالیات کا ذکر بھی آگیا ہے،

باب سوم میں آٹھ فصلیں ہیں: فصل اول میں سڑک اور ڈاک۔ فصل دوم میں حوض اور نہریں، فصل سوم میں باغات، فصل چہارم میں جوامع اور مساجد

فصل پنجم میں مدارس کا تذکرہ بڑی تفصیل سے ہے۔ اور ہر صوبہ اور علاقہ کے مشہور مدارس کے حالات درج ہیں، یہ فصل بہت ہی اہم اور مفید ہے۔ فصل ششم میں شفاخانوں، اطبار، ادویہ، امراض کی تفصیل کے ساتھ شفاخانوں کے حسن انتظام کا تذکرہ ہے، فصل ہفتم میں بزرگان دین اور امراء وسلاطین کے مقابر ومشاہد کا بیان ہے، اور فصل ہشتم میں یہاں کے امام باڑوں کے بارے میں معلومات ہیں، آخر میں نوادر کے بیان میں فیروز شاہ کی گھڑی، جونپور میں گومتی کا پل جسے اکبر کے زمانہ میں منعم خاں نے بنایا تھا، نظام شاہ کے حکم سے محمد رومی کی بنائی ہوئی توپ، فتح اللہ شیرازی کی بندوق اور اس کی چکی، حکیم علی گیلانی کا لاہور میں حوض اور رنگ آباد کی نہر پر سول اور دہلی کے لال قلعہ کا حمام درج ہے۔

مکتبۂ دار المصنفین

اس ماہ مبارک میں کچھ اور قابلِ مطالعہ کتابیں

تفسیر ماجدی اردو (سورۂ فاتحہ سے دس پارہ تک) قیمت جلد اول ۱۸ روپے دوم ۱۵ روپے

صحابہ، تابعین و تبع تابعین کا مکمل سٹ جو باختلاف قیمت ۱۴ کتابوں پر مشتمل ہے، مجموعی قیمت

ارض القرآن:۔ حصہ اول ۲۵ پ حصہ دوم ۲۵ پ

دین رحمت:۔ جس میں دکھایا گیا ہے کہ مذہب اسلام نہ صرف انسانوں بلکہ تمام کائنات کے لیے یکسر رافت ورحمت اور عدل وخیر ہے۔ قیمت ۵۰ پ

حکیم الامۃ مولانا تھانوی کی مناجات مقبول مع ترجمہ وشرح۔ از مولانا عبد الماجد دریابادی اڈیٹر صدق جدید قیمت ۲۵ پ

منیجر

مطبوعات جدیدہ

صدر یار جنگ ۔ مرتبہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب، بڑی تقطیع، کاغذ، وطباعت اچھی، صفحات ۴۸۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت: دس روپے، پتہ: مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس نمبر ۹۳ لکھنؤ۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم گوناگوں اوصاف و محامد کے جامع مسلمانوں کی اجتماعی، قومی و ملی سرگرمیوں میں پیش پیش اور ان کے متعدد مذہبی، علمی اور تعلیمی اداروں سے منسلک رہے ہیں، ریاست حیدرآباد کے امور مذہبی کے صدر الصدور، علی گڑھ کالج و یونیورسٹی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ندوۃ العلماء اور دار المصنفین کے رکن بھی تھے، مولانا شبلی مرحوم سے خصوصی تعلقات تھے، ان کی وفات کے بعد معارف نے اپنی وضع کے خلاف خاص نمبر شائع کیا تھا، مگر ان کی جیسی ہمہ گیر اور جامع کمالات شخصیت کے لیے مستقل سوانح عمری کی ضرورت تھی، اس کا دین ندوہ اور دار المصنفین کے کارکنوں کے ذمہ باقی تھا، اب دار العلوم ندوۃ العلماء کے موجودہ ناظم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی توجہ سے یہ ادا ہو سکا ہے، زیر نظر کتاب میں پہلے مولانا شروانی کے خاندانی حالات، ولادت، تعلیم، اساتذہ، بیعت و ارادت، انتظام ریاست، کتب خانہ، قومی و ملی خدمات اور مختلف اداروں سے وابستگی، ازواج و اولاد اور معاصرین و احباب کا تذکرہ ہے، پھر ان کے علمی کمالات، ذوقِ ادب، تصنیفات، شمائل و اخلاق اور زہد و اتقاء وغیرہ کا ذکر ہے،

آخر میں متعدد اکابر کے تاثرات نقل کیے گئے ہیں، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی
ندوی کے قلم سے ایک بصیرت افروز مقدمہ ہے، اس کو پڑھ کر بے اختیار جی چاہا کہ
کاش فاضل مقدمہ نگار ہی کے قلم سے پوری کتاب لکھی گئی ہوتی تو اس کی کیفیت کچھ
اور ہوتی، لیکن وہ اپنے عوارض اور مشغولیتوں کی وجہ سے اس سے معذور تھے،
اس لیے ان کی تجویز و انتخاب سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے نوجوان اور
لائق رفیق مولوی شمس تبریز خاں صاحب نے بڑی محنت اور جانکاہی سے مولانا شروانی
کے کمالات اور کارناموں کا مرقع تیار کیا ہے، اس سے ان کی سیرت کے گوناگوں جلوے
اور شخصیت کے خط و خال نمایاں ہوجاتے ہیں، مگر اس میں بعض خامیاں ہیں، مولانا
کے ستھرے اور پاکیزہ ادبی و تنقیدی ذوق اور شعر و سخن سے دلچسپی کا جس قدر تفصیل
سے ذکر کیا گیا ہے، اتنی تفصیل سے ان کی تاریخ و سیرت نگاری اور علمی بلند پایگی
کا ذکر نہیں ہے، مولانا کو دارالمصنفین سے مدۃ العمر جو تعلق رہا ہے، اس کا تقاضا تھا کہ اداروں
اور تحریکوں سے ان کی وابستگی کے سلسلہ میں مستقل عنوان کے ماتحت اس کا ذکر ہوتا۔
بعض جگہ پیرایۂ بیان علمی نہیں ہے، مثلاً نواب صاحب کی ڈائری میں سرسید سے ملاقات کا
ایک سن ۱۸۹۳ء ہے لیکن اندازہ یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی سرسید سے مل چکے ہوں گے،
بہرحال" (ص ۱۶۵)، یہاں اندازہ اور تخمینہ کے بجائے ثبوت اور دلیل کی ضرورت تھی، کیونکہ یہ دعویٰ
خود مولانا کے بیان کے خلاف کیا گیا ہے۔ "یونیورسٹی بننے کے پہلے سے کالج کے شعبۂ دینیات سے آپ کا تعلق تھا"
(ص ۱۶۶) آخر کس قسم کا تعلق؟ مولانا شعبہ کے صدر تھے، یہاں اس کی تصریح ضروری تھی،
"غالباً ایک حدیث قدسی میں ہے کہ ..." ص ۳۹۳۔ اس حدیث قدسی کی تحقیق ہوسکتی تھی۔
اقتباسات کے نقل میں عموماً بے احتیاطی کی گئی ہے، ایک اقتباس کے ساتھ ہی دوسرا اقتباس

دیدیا ہے، یا خود مصنف نے اپنی تحریر اس میں ملا کر شامل کردی ہے، مولانا شروانی کے معاصرین میں ڈاکٹر اقبال کو ان سے عمر میں بڑا بتایا گیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، مولانا شروانی اور مولانا سلیمان اشرف کے تعلقات کے ضمن میں علامہ سید سلیمان ندوی کے وہ تاثرات نقل کیے گئے ہیں جو انھوں نے مولانا سلیمان اشرف کی وفات پر تحریر فرمائے تھے، اس میں دونوں کے تعلقات کا کوئی ادنیٰ اشارہ بھی نہیں ہے، ص ۴۰۵ پر مولانا کی خوش طبعی کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے کہ "تحریروں میں تو انھیں (مولانا کو) اس کے اظہار کا موقع نہ تھا" مگر اسکے بعد دو ڈھائی صفحوں تک مولانا کی جو تحریریں نقل کی گئی ہیں، ان سے انکی خوش طبعی اور ظرافت ظاہر ہوتی ہے، املا و کتابت کی غلطیاں تو بیشمار ہیں، ص ۴۹۳ پر خورد کو تین تین جگہ خرد لکھا گیا ہے، کہیں کہیں سنین بھی غلط لکھے گئے ہیں، مثلاً ص ۱۶۱ پر ۱۹۴۵ء کے بجائے ۱۹۴۶ء ہے، ان خامیوں سے قطع نظر کتاب بجائے خود محنت اور خوش سلیقگی سے مرتب کی گئی ہے، نواب صاحب کی زندگی بڑی پاکیزہ اور دلکش تھی، وہ اپنے عہد کی ہر علمی و اجتماعی بزم کی رونق اور تمام علمی و تعلیمی تحریکوں کے روح رواں تھے، اور اس دور کے اکثر اعیان و اکابر سے ان کے تعلقات تھے، اس حیثیت یہ کتاب گویا اس عہد کی بڑی دلچسپ، سبق آموز اور قابل مطالعہ تاریخ ہے،

تصورات بیدل:- از پنڈت کیلاش نرائن کول دہلوی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۹۱ مجلد مع گرد پوش، قیمت صہ پتہ: ناشر محل، امین آباد، لکھنؤ۔

یہ آنجہانی پنڈت کیلاش نرائن کول بیدل کا مجموعۂ کلام ہے جسکو ان کے فرزند پی، این کول صاحب نے اب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا ہے، اسکے شروع میں چند رباعیاں و قطعات اور آخر میں نظمیں ہیں، مصنف کو زیادہ مناسبت غزلوں سے تھی، اسلیے اس مجموعہ کا زیادہ حصہ غزلیات ہی پر مشتمل ہے، بیدل صاحب شاعری کی قدیم، صالح روایتوں اور اسکے جدید انداز سے واقف تھے، ان کے دردمند دل میں انسانیت کا درد و غم، وطن کی الفت و محبت اور موجودہ گراوٹ اور بناوٹ کے خلاف نفرت کا جذبہ موجزن ہے، اسلیے انھوں نے غزلوں میں رمز و کنایہ کے پردہ میں غم زمانہ کی حکایت سنائی ہے، مصنف کی زبان کی سادگی، انداز بیان کی سلاست اور طبیعت کے سوز و گداز نے انکے تغزل میں بڑی کیفیت اور لطافت پیدا کر دی ہے، اور یہ مجموعہ اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔ "ض"

مکتبۂ دارالمصنفین

سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و سیر تابعین و تبع تابعین، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، سوانح، ادبی و فلسفیانہ کتابوں اور مولانا شبلی کے مقالات کے مستقل سلسلوں کے علاوہ جو بیحد مقبول ہیں، اور جن میں سے ہر ایک کے اب تک کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں مختلف موضوع پر اور بھی بہت سی کتابیں دارالمصنفین نے شائع کی ہیں جن کی مجمل فہرست یہ ہے:-

تاریخ فقہ اسلامی، تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ محمد الخضری مرحوم کا دلنشین ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات بتفصیل بیان کی گئی ہیں۔ ۴۹۰ صفحے قیمت ۶ روپے

اسلام کا سیاسی نظام: اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اٹھارہ ابواب کے تحت اسلامی دستور کے تقریباً تمام اصولی اور سیاسی پہلو آگئے ہیں، ۳۰۰ صفحے قیمت ۶-۰۰ روپئے

حکمائے اسلام (حصہ اول) پانچویں صدی ہجری تک کے تمام مشہور حکماء و فلاسفہ کے سوانح و حالات اور اُن کے علمی و فکری کارنامے، ۵۰۴ صفحے، قیمت ۱۰ روپے

حکمائے اسلام (حصہ دوم) متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات اور اُن کی علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل، ۳۵۱ صفحے قیمت ۷-۰۰

طبقات الامم: اندلس کے نامور فاضل صاعد اندلسی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ، ۱۵۰ صفحے قیمت ۳ روپے

انقلاب الامم ڈاکٹر لیبان کی کتاب کے عربی ترجمہ سر تطور الامم کا ادیبانہ و انشاپردازانہ ترجمہ؛ ۱۸۰ صفحے، قیمت: ۴-۰۰

ارض القرآن (حصہ اول) سرزمین قرآن یعنی عرب کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام و ملل و قبائل کا ذکر ہے، اُن کی تاریخی و اثری تحقیق ۳۲۰ صفحے قیمت ۶-۲۵

ارض القرآن (حصہ دوم) بنو ابراہیم کی تاریخ اور عربوں کے قبل از اسلام، تجارت، زبان و مذہب پر تحقیقات و مباحث، ۲۳۸ صفحے، قیمت: ۴-۲۵

خطبات مدراس مولانا سید سلیمان ندوی کے سیرت نبوی سے متعلق خطبات کا مجموعہ، جس میں دارالمصنفین کے سلسلۂ سیرۃ النبی کا پورا خلاصہ اور حیات نبوی صلعم کے تمام پہلو آگئے ہیں، ۲۰۰ صفحے قیمت ۶-۰۰

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

سلسلۂ مقالاتِ سلیمان

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف موضوع پر متعدد و بلند پایہ اور اہم تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی و مذہبی و فقہی و تاریخی و ادبی و تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں، اب اُن کی وفات کے بعد ان کے ان مقالات کی ترتیب تدوین و اشاعت کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے اب تک اُن کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن کی فہرست یہ ہے،

مقالاتِ سلیمان حصہ اول

(تاریخی)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی

بدنصیب کشمیر اور عدل شاہجہانی کا نقش سنگی

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان

تاج محل اور لال قلعہ کے معمار،

استاد احمد معمار کے خاندان کی ایک اور یادگار،

نالندہ کی سیر،

قنوج،

سلطان ٹیپو کی چند باتیں،

۵۱۴ صفحے، قیمت ۹ روپیے،

مقالاتِ سلیمان حصہ دوم

(علمی)

ہندوستان میں علم حدیث،

فرنگی محل اور علم حدیث

محمد بن عمر الواقدی اور سیرت

عرب و امریکہ اسلامی رصد خانے

کتب خانہ اسکندریہ،

اسلامی ہندوستان کا عہد آخر،

مرزا بیدل حکیم سنائی کے سنین عمر

سفر گجرات کی چند یادگاریں،

انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ

کتب خانہ حمیدیہ بھوپال،

۵۱۴ صفحے قیمت ۹-۰ روپیے

مقالاتِ سلیمان حصہ سوم

(مذہبی)

علوم القرآن، اسماء القرآن

القرآن والفلسفۃ الجدیدہ،

مسئلہ ارتقاء اور قرآن مجید،

قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات،

تذکار نزول القرآن،

لفظ صلوٰۃ قرآن مجید میں،

قربانی کا اقتصادی پہلو،

سود اور صحف انبیاء، تحریم شراب،

قرآن پاک کا تاریخی اعجاز،

خلیل اللہ کی بشارت

۴۲۵ صفحے قیمت ۹-۲۵ پیسے،

منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۳۰)

نومبر ۱۹۶۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۱۱۰ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۲ء عدد ۵

مضامین

شذرات

دارالمصنفین اس وقت مالی مشکلات سے دوچار ہو رہا ہے، اس کا سالانہ بجٹ تقریباً ایک لاکھ روپیہ کا ہوتا ہے، اس کے مختلف شعبوں میں چالیس آدمی کام کرتے ہیں، ان سب کی تنخواہیں عام معیار کے لحاظ سے بہت کم ہیں، مگران میں زیادہ تر ایسے خدمتگذار ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لئے وقف کردی ہے، ان کی قناعت پسندی ضرور قابلِ قدر ہے مگر ادارہ کی طرف سے اُن کو قوتِ لایموت کا جو سامان ہوتا تھا، اس کا بھی اب فراہم کرنا مشکل ہو رہا ہے،

دارالمصنفین کو یوپی یا مرکز کی حکومت کی طرف سے کوئی مستقل سالانہ امداد نہیں ملتی ہے، مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی زندگی کے آخر زمانہ میں حکومت کشمیر سے پانچ ہزار سالانہ کی امداد مقرر کرائی تھی، انھوں نے ازراہِ سرپرستی وعدہ فرمایا تھا کہ آیندہ یہ رقم اور بھی زیادہ بڑھوادی جائے گی، مگر وہ اس رقم کے جاری ہونے کے بعد جلد ہی اللہ کو پیارے ہوئے، یہ پانچہزار کی سالانہ امداد اب تک مل رہی ہے لیکن ہر سال یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں بند نہ ہو جائے نظام ٹرسٹ حیدرآباد کی طرف سے پانچسو روپے ماہانہ کی رقم گذشتہ دو سال سے مل رہی ہے لیکن یہ مستقل نہیں ہے، اس ٹرسٹ کو مسلسل امداد دینے کا شاید قانونی حق بھی نہیں، ان قلیل رقموں سے تھوڑا سہارا ضرور مل جاتا ہے، ورنہ اور تمام اخراجات کا بار ادارہ کو خود اٹھانا

پڑتا ہے جو مطبوعات کی فروخت سے اب تک پورے ہوتے رہے ہیں لیکن اس کی فروخت اب بہت کم ہوگئی ہے، اس کے بہت سے اسباب ہیں تقسیم سے پہلے پاکستان میں اب جو علاقے ہیں، وہاں بکثرت وی پی کے ذریعہ سے کتابیں جایا کرتی تھیں تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں وی پی۔ اور منی آرڈر کا بھیجنا بند ہوگیا، تو ایک بڑی آمدنی جاتی رہی، پھر وہاں کے تاجر لائسنس کے ذریعہ سے کتابیں منگوانے لگے، اس طرح بھی ہماری کتابیں پہلے کی طرح تو نہیں پھر بھی وہاں بہت کافی تعداد میں جایا کرتی تھیں جس سے تقریباً پچاس ہزار روپے کی آمدنی ہو جایا کرتی تھی، ۱۹۶۵ء سے جب دونوں ملکوں کا تجارتی لین دین بند ہوگیا، تو گذشتہ سات سال سے ادارہ کو تقریباً اتنی ہی رقم کا سالانہ خسارہ ہو رہا ہے، جو اب تک محض رحمتِ ایزدی سے پورا ہو رہا، لیکن اب اس ادارہ کی قوتِ برداشت جواب دے رہی ہے،

……⁂……

ہندوستان میں ہماری مطبوعات کی فروخت اتنی نہیں ہوتی، کہ اس سے ہمارے اخراجات پورے ہوں، ایک تو یہاں کے اردو پڑھنے والوں کی قوتِ خرید کسی زمانہ میں زیادہ نہیں رہی وہ کتابوں کو شوق سے ضرور پڑھتے ہیں لیکن خرید کر پڑھنا پسند نہیں کرتے، پھر جو اصحابِ ذوق خریدنا بھی چاہتے ہیں، تو اُن کی مالی حالت ایسی نہیں ہوتی، کہ اپنے اور اخراجات پورا کرکے کتابیں بھی خرید سکیں، جن کے پاس کافی دولت ہے وہ کتابوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے، ادارہ کی طرف سے اچھی خاصی تنخواہ پر ایک نمایندہ بھی مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مختلف شہروں میں جاکر اس کی مطبوعات کی فروخت واشاعت کی کوشش کرے، مگر یہ تجربہ کامیاب نہیں ہو رہا ہے، اس کی تنخواہ کی گرانباری سے مالی مشکلات کا اور اضافہ ہوگیا ہے،

……⁂……

ہمارے اخراجات دو قسم کے ہیں، ایک تو یہاں کے خدمت گذاروں کو پابندی کے ساتھ ہر مہینہ تنخواہیں ادا کرنا کیونکہ ان کو جو تھوڑی بہت تنخواہ مل جاتی ہے، وہ بھی نہ ملے تو محض خدمت وایثار کا جذبہ اب زیادہ کارگر نہیں بنایا جاسکتا، دوسرے نئی مطبوعات میں اضافہ کرنا اور پرانی مطبوعات کو چھاپتے رہنا، الحمد للہ اس وقت تک اس کی طرف سے تقریبًا ڈیڑھ سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے ہر سال کچھ نہ کچھ کتابوں کا پرانا اڈیشن ختم ہوتا رہتا ہے اگر یہ نہ چھاپی جائیں تو تجارتی آمدنی پر اثر پڑجاتا ہے، کوشش اب تک یہی رہی کہ پرانی کتابوں کے ساتھ ہر سال کم سے کم دو نئی کتابیں بھی ضرور شائع ہوتی رہیں، ہماری کتابوں کی اوسطًا ضخامت چار سو سے کم نہیں ہوتی بعض کی ضخامت تو نو نو سو صفحے کی بھی ہے نئی اور پرانی دونوں کتابوں کی طباعت میں کافی اخراجات ہوتے ہیں جنکو اب پورا کرنا مشکل ہوگیا ہے،

……∘⋈∘……

دارالمصنفین اپنی امداد کے سلسلہ میں کسی سے کوئی چندہ یا عطیہ نہیں مانگتا ہے آج تک اس نے کوئی چندہ قبول نہیں کیا، وہ صرف اس کا خواستگار ہے کہ اسکی کتابیں زیادہ سے خرید کر پڑھی جائیں، اسکے علاوہ اسکی طرف سے دو قسم کی دائمی رکنیت بھی ہے ایک ایک ہزار کی اور ایک پانچسو کی، جو صاحب ایکہزار کی رقم دیتے ہیں اُن کی خدمت میں گذشتہ مطبوعات میں سے پانچسو قیمت کی کتابیں فورًا بھیج دیجاتی ہیں پھر تاحیات نئی مطبوعات اور رسالہ معارف ہدیۃً بھیجا جاتا ہے جو صاحب پانچسو کی رقم دیتے ہیں اُن کے پاس ڈھائی سو کی کتابیں فورًا بھیج کر تاحیات نئی مطبوعات اور رسالہ معارف جاتا رہتا ہے، ہماری اپیل ہے کہ لوگ یہاں کی مطبوعات زیادہ سے زیادہ خرید کر یا کافی تعداد میں اس کے رکن دوامی بن کر اسکی مالی مشکلات کو دور کرنے میں مدد کریں، ورنہ خدانخواستہ یہ مالی پریشانیوں سے ختم ہوگیا تو جہاں اسکے وابستگان پر یہ الزام آئیگا کہ وہ اس شاندار علمی ادارہ کو برقرار نہ رکھ سکے، وہاں اُردو داں طبقے بھی موردِ الزام قرار پائیں گے کہ وہ ایک مفید ادارہ کو قائم رکھنے میں مدد نہ پہنچا سکے، اس کو برقرار رکھنے میں اُن کی حمیت اور علم دوستی کا بھی امتحان ہے،

مقالات

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں

از سید صباح الدین عبد الرحمن

موجودہ دور میں دنیا کے مسلمانوں کی جو المناک سیاسی حیثیت ہو رہی ہے، اس سے کون ایسا مسلمان ہے جس کا دل نہ دکھتا اور کڑھتا ہوگا، خود ہندوستان کے اندر مسلمانوں میں جو سیاسی اور مذہبی بدحالی بلکہ کردار شکنی اور ضمیر فروشی پیدا ہوتی جارہی ہے، اس کو سوچ کر عام مسلمان تحیر، اضطراب اور مایوسی کے دور سے گزر رہے ہیں، وہ مڑ کر اپنی پچھلی تاریخ کو دیکھتے ہیں، اس سے قطع نظر کہ انھوں نے ہندوستان میں رہ کر اپنی حکومت کے زمانے میں اس کو سیاسی، اقتصادی اور تمدنی حیثیت سے کس طرح سنوارا، وہ دورِ غلامی میں بھی بیسویں صدی کے شروع کے زمانہ کو اپنے لیے بڑا تابناک پاتے ہیں، کیسے اچھے اچھے دماغ اس وقت موجود تھے۔ علامہ شبلی، حالی، نذیر احمد، آزاد سر آغا خاں، سر امیر علی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محمد علی جناح، خواجہ کمال الدین، سر محمد اقبال، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسین احمد، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، یہ دور اسلامی جذبہ، اسلامی غیرت اور اسلامی حمیت میں سرشار رہنے کا تھا، شبلی، حالی اور

نذیر احمد کی تحریروں میں اسلام کی رجز خوانی اور حدی خوانی تھی، سرآغا خاں اپنے تعیش اور ڈربی کے گھوڑ دوڑ کی دلچسپی کی وجہ سے بدنام تھے لیکن ان میں جیسی اسلامی غیرت رہی، وہ بھی آج قابل قدر سمجھی جاتی ہے، سرامیر علی جیسے انگریز نما ہندوستانی مسلمان نے اسلام کی اسپرٹ کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ترکوں کی محبت میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہتے، خواجہ کمال الدین نے تبلیغی سرگرمیوں کے ساتھ آئیڈیل پر افٹ لکھ کر شاید اپنی عاقبت بھی سنوار لی، مولانا حسین احمد مدنی نے سیاست میں حصہ لینے کے ساتھ حدیث کی سند میں حرف آخر سمجھے جاتے، مولانا شبیر احمد عثمانی سیاسی رہنما بھی بنے لیکن کلام پاک کی تفسیر کے بہت بڑے نکتہ ور عالم بھی تصور کیے جاتے، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے لیکن اسی کے ساتھ جو سینئر علوم اسلامیہ کے فراز بھی قرار دیے گئے۔ اقبال حکیم الامت اور شاعر مشرق بن کر اسلامی دنیا کے افق پر بھی چمکے، مولانا ظفر علی خاں کی نظموں میں اسلامی اخوت کی للکار اور پکار رہی، مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ تو اسلام کی برتری کے مغرورانہ احساس کا صور پھونکا، اور بڑے اذعان ویقین کے ساتھ مسلمانوں کو یہ پیام دیا کہ اسلام ایک روحانی انقلاب تھا جو اس لیے ہوا کہ دنیا تغیر کے لیے بیقرار اور تبدیلی کیلیے تشنہ تھی، وہ سرچشمۂ ہدایت وفیضان الٰہی کا ایک سرجوش آسمانی تھا، وہ خدا کی محبت اور فرشتوں کی برکت کا ایک ظہور الٰہی تھا جس نے نسل آدم کے بچھڑے ہوئے گھرانے کو یکجا کیا، اور زمین کی امنیت اور سعادت واپس دلایا، مولانا نے اپنی مختلف تحریروں سے مسلمانوں کو یہ کہکر جھنجوڑا کہ وہ اپنے ساتھ انسانی شرف وجلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتے ہیں، وہ دنیا میں اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ وہ ان زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا شیطانی قوتوں کی انسانوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کردیں، نہ اس لیے کہ سب سے بھاری

زنجیر کو خود اپنی گردن کا زیور بنالیں، وہ دنیا میں اس لیے آئے ہیں کہ حاکم ہوں نہ اس لیے کہ غلام ہوں، وہ خود ایسی قوت ہیں کہ دوسری قوتیں اس کے آگے جھک کر روحانی وجسمانی نجات پاسکتی ہیں، وہ کسی کے آگے جھکنے کے لیے نہیں پیدا ہوئے۔

الہلال کے ساتھ مولانا محمد علی کا کامریڈ یاد آجاتا ہے۔ اور پھر ان کی پرشور اور ہنگامہ خیز زندگی نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہے، جس میں صرف توحید کے اذعان اور ایمان کے راسخ عقیدے ہی کے جلوے نظر آتے ہیں، کچھ روز پہلے اُن کی یادوں کی شمع میرے ذہن میں کچھ ایسی روشن ہوئی کہ ایک چھوٹا سا مضمون ان پر لکھنے بیٹھا لیکن قلم چلا تو چلتا گیا اور ایک لمبی تحریر کے بعد رکا، جو اس وقت ناظرین کے سامنے ہے، یہ کوئی تحقیقی مقالہ نہیں ہے، بلکہ میرے ذاتی تاثرات وخیالات کے اوراق پریشاں ہیں، ان میں شاید کوئی نئی بات نظر آئے صرف پرانی باتیں یاد دلادی گئی ہیں، مولانا محمد علی کو میں اس لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ سچے اور پکے مسلمان ہونے کے ساتھ سچے اور پکے ہندوستانی بھی تھے، ان پر خواہ کتنی ہی نکتہ چینیاں کی جائیں، لیکن ان کی اسلامیت اور ہندوستانیت میں کوئی شبہ نہیں کرسکتا، ان کی ذات اب بھی یہ پیام ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کی قوس وقزح سے ملک کی سیاست میں رنگین اور حسین بہار لائی جاسکتی ہے، اور اگر کوئی یہ بہار نہیں لاسکتا ہے تو اس کی وجہ اس کی ناقص ذات ہوسکتی ہے۔ اسلامیت اور ہندوستانیت مورد الزام نہیں قرار پاسکتی ہے۔

مولانا محمد علی کا اصلی وطن کہاں تھا، مراد آباد یا بجنور، اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں، اتنا کافی ہے کہ وہ یو۔ پی کے تھے۔ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں یتیمی کا داغ لگ گیا، لیکن ان کی والدہ نے جو بی اماں کے نام سے مشہور ہوئیں، ان کی تعلیم وتربیت

میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ گھر پر اردو فارسی کی تعلیم دلا کر بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کیا، وہاں سے تعلیم کیلیے اپنے بڑے بھائی شوکت علی کی نگرانی میں علی گڑھ بھیجدیے گئے۔ وہ ایم اے، او کالج میں تعلیم پا رہے تھے، تب ہی انکے ساتھیوں کو ان کی عبقریت اور سیمابی کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی تو چاہتے تھے کہ وہ آئی سی ایس ہو کر خاندان کا نام روشن کریں لیکن خداوند تعالیٰ کو ان سے کچھ اور کام لینا تھا، انھوں نے لندن جا کر سول سروس کا امتحان تو دیا لیکن اس میں ناکام رہے، ہندوستان واپس آکر پھر آکسفورڈ گئے، جہاں بی اے کی ڈگری حاصل کی، ہندوستان واپس ہوئے، تو رامپور کے محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہو گئے، جس کے بعد بڑودہ کے محکمۂ افیون کے ایک اعلیٰ افسر مقرر ہوئے، یہاں رہ کر اپنی قابلیت دکھائی تو مہاراجہ بڑودہ نے ان کو ضلع نوساری کا کمشنر مقرر کیا، اس کے بعد بڑودہ کے ولی عہد کنور فتح سنگھ کے پرسنل اسسٹنٹ مقرر ہوئے، اسی ملازمت کے دوران میں نواب صاحب جاورہ نے ان کو اپنے یہاں وزارت پیش کی، اور بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنی ریاست میں چیف سکریٹری کا عہدہ دینا چاہا لیکن انھوں نے ان عہدوں سے منہ موڑا، اور طے کیا کہ وہ ایک اخبار نکال کر مسلمانوں اور ہندوستانیوں کی خدمت کرینگے، چنانچہ ملازمت کی آلائشوں سے نجات حاصل کرکے ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے کامریڈ نکالنا شروع کیا، اس کے اجراء سے انکی انگریزی دانی کا سکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ انگلستان میں بھی بیٹھا، ان کو اپنی ذہانت کی بدولت انگریزی زبان کے طرز ادا اور طریقۂ بیان کے ہر پیچ وخم سے واقفیت تھی، ان کو انگلستان کے اہلیوں، عالموں، گنواروں، شہریوں، فقیروں، امیروں، مزدوروں اور وزیروں کی گفتگوؤں کے ادا کرنے پر یکساں قدرت اور مہارت حاصل تھی۔ انگلستان کے ملاحوں

کے نغمے، انّا دن کی لوریاں، آوارہ گرد چھوکروں کی پھبتیاں یاد تھیں، انگریزی زبان کے ہر دور کے شاعروں اور ادیبوں کے جواہر پارے ان کی زبان پر تھے، انجیل کی عبارتیں ان کو از بر تھیں، انگلستان کے لطیفے برجستہ بیان کر سکتے تھے، ان تمام چیزوں کا استعمال وہ کامریڈ میں کرتے رہے، اسی لیے کامریڈ کی اشاعت کے زمانے میں کہا جاتا کہ کوئی ہندوستانی انگریزی زبان پر اُن کی قدرت و مہارت کا مقابلہ نہیں کر سکتا آگے چل کر انگریزی زبان کے مشہور مصنف ایچ، جی، ولیس نے کہا کہ ان کا قلم میکاولے کا قلم ہے، اسی قلم سے انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور سیاسی خیالات کو برانگیختہ کیا، مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کا رنگ کچھ اور تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ کامریڈ نے اپنے مضامین سے جس طرح مسلمانوں کو جگایا، وہ مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں الہلال ہی کی طرح بھلایا نہیں جا سکتا، اس انگریزی ہفتہ وار کے ساتھ مولانا نے اردو کا ایک روزنامہ اخبار ہمدرد بھی فروری ۱۹۱۳ء میں نکالنا شروع کیا، خود کہا کرتے کہ ہمدرد تو مسلمانوں کی سیاسی تربیت کے لیے ہے اور کامریڈ حکومت تک مسلمانوں کی آواز پہنچانے کے لیے ہے،

کامریڈ کی صحافتی زندگی سے مولانا محمد علی کی سیاسی زندگی بھی شروع ہوئی، ان کو اپنے زمانہ میں بنگال کی تقسیم کی تنسیخ سے بڑا دکھ ہوا، پھر اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو مولانا آزاد ہی کی طرح وہ بھی بے چین ہو گئے، اور کامریڈ کے صفحات میں انکی اس بے چینی کا اظہار ہوتا رہا، اور جب ۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگ شروع ہوئی اور ترکوں کی شکست کی خبریں آنے لگیں، تو وہ جذبات سے اتنا مغلوب ہو گئے کہ خودکشی کرنے پر آمادہ ہو گئے، جیسا کہ وہ اپنی ناتمام خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں اس غیر شرعی فعل سے تو وہ باز رہے لیکن ترکوں کی حمایت میں جان

کی بازی لگا دی۔"

ان کو ترکوں سے بڑی محبت تھی، ان کے یہاں خلافت قائم تھی، تو وہ گویا اسلامی ممالک کے ضمیر کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا اقتدار بلقانی ریاستوں کے علاوہ پورے مشرق وسطیٰ پر بھی تھا، اس لیے وہ ایک امپائر کے مالک تھے، اور اس امپائر کی وجہ سے دنیا میں اسلام کو بڑا وزن اور وقار حاصل تھا، اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو ان سے بڑا لگاؤ تھا، مولانا محمد علی بھی ان کی محبت میں سرشار اور مخمور رہے، اسی لیے انھوں نے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ترکوں کی مدد کے لیے ایک طبی وفد بھی بھیجا، یہ بظاہر ایک طبی وفد تھا لیکن اس کی تشکیل سے بڑا مذہبی اور سیاسی جوش ابھرا جس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ وفد ہندوستان سے روانہ ہو رہا تھا تو لکھنؤ بھی آیا، علامہ شبلی بھی لکھنؤ اسٹیشن پر اس کو الوداع کہنے کے لیے پہنچے، اور جب ڈاکٹر مختار احمد انصاری ٹرین کے ڈبہ کے دروازہ پر آکر کھڑے ہوئے تو مولانا شبلی نے ان کے بوٹ کا بوسہ لیا، اور اپنے آنسوؤں سے اس کے گرد و غبار کو دھویا، مولانا محمد علی اس وفد کے کارناموں کو اپنے اخبار کامریڈ میں برابر چھاپتے رہے، اور جب یہ وفد واپسی میں بمبئی پہنچا تو اس کے استقبال میں مسلمانوں نے ترکوں سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا علامہ شبلی اس وقت بمبئی ہی میں تھے، وہ ڈاکٹر انصاری کے خیر مقدم کے لیے ان کے پاس پہنچے، تو ان کے پاؤں کا پھر بوسہ لینا چاہا، اور فرمایا یہ تمھارے پاؤں نہیں، اسلام کے مجسمۂ غربت کے پاؤں ہیں، خود علامہؒ نے ترکوں کی حمایت میں بڑی ولولہ انگیز نظمیں لکھیں، ان میں سے ان کی نظم شہر آشوب اسلام بہت مقبول ہوئی، اس کے کچھ اشعار یہ ہیں،

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع وملت ہے عزیز و فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک
پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک
جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگِ اذاں کب تک

ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں کی حمایت میں دل کھول کر مالی قربانیاں کیں، انکی امداد و اعانت کے لیے بڑے بڑے شہر میں ہلال احمر کے نام سے ایجنسی قائم تھی، اور حکومت برطانیہ سے مطالبہ تھا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے احساسات کا خیال رکھتے ہوئے بلقانی ریاستوں کی سیاسی مدد کرنے سے باز رہے، لیکن یوروپین طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے ترکوں کو پسپا ہونا پڑا،

مسلمانوں کے مشتعل جذبات ابھی تھمنے بھی نہ پائے تھے کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی، ترکوں نے اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا، ہندوستان کے مسلمان عجیب کشمکش میں پڑ گئے، ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ حکومت برطانیہ کی حمایت کریں جس کے اندر رہ کر ان کو زندگی بسر کرنی تھی، یا ترکوں کے حامی بنیں جن سے ان کو بڑی محبت اور عقیدت تھی، کیونکہ ترکی ہی میں خلافت قائم تھی، اور ترک ہی پرستاران کعبہ اور اسلام کے تمام مقاماتِ مقدسہ کے نگراں و نگہبان تھے، لیکن اس زمانہ کے برطانیہ کے وزیر اعظم لائڈ جارج نے یقین دلایا کہ وہ اس لیے جنگ نہیں کر رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے دار السلطنت یا ایشیائے کوچک کے مشہور اور زرخیز سرزمین یا تھریس سے محروم کر دیں یا مقاماتِ مقدسہ میں عراق، عرب اور جدہ پر قبضہ کریں، اس یقین دہانی پر ہندوستان کے مسلمان حکومت برطانیہ کے ساتھ ہو گئے، اور مسلمان سپاہی بھی فوج میں بھرتی ہوئے، لیکن جب ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی تو لندن ٹائمس

نے ترکوں کو مشورہ دیا کہ وہ جنگ میں دور کے تماشائی ہوں، اس میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو۔ مضمون بہت ہی حقارت آمیز لب و لہجہ کے ساتھ لکھا گیا تھا، اس کو پڑھ کر مولانا محمد علی بے قابو ہو گئے، اور انھوں نے چالیس گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد کامریڈ کے لیے ایک مضمون "چوائس آف دی ٹرکس" کے عنوان سے لکھا، جو انگریزوں کے بالکل خلاف تھا، جب یہ مضمون شائع ہوا تو کامریڈ کی ضمانت ضبط کر لی گئی، اس کے بعد مولانا محمد علی اور شوکت علی پہلے رامپور پھر مہرولی دہلی میں نظر بند کر دیے گئے، وہاں سے لینس ڈون پھر چھندواڑہ منتقل کر دیے گئے، اس پر بھی اکتفا نہ کیا گیا تو دونوں بیتول جیل خانہ میں قید کر دیے گئے۔

اس اثناء میں برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کے ساتھ بہت سے ناروا سلوک کیے، رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا، اس کی رو سے حکومت کو اندھا دھند مقدمے چلانے اور گرفتاریاں کرنے کا اختیار دیا گیا تھا، اور قانون میں جو عام طور پر احتیاط ہوتی ہے اس میں اس کا نام تک نہ تھا، اس کے شائع ہوتے ہی سارے ہندوستان میں غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی، گاندھی جی نے اس کو انسانی آزادی کے بالکل منافی قرار دیا، اور اسکے خلاف اپریل ۱۹۱۹ء میں اپنی ستیہ گرہ کی مہم چلائی، اس سلسلہ میں ہندوستان کا شاید ہی کوئی بڑا شہر ہو جہاں بے دردی سے برطانوی حکومت نے گولیاں نہ چلائی ہوں، سب سے زیادہ دردناک حادثہ امرت سر کے جلیان والا باغ میں پیش آیا۔

امرت سر میں ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی کوششوں سے ہندو مسلمان بہت ہی شیر و شکر ہو گئے تھے، وہاں رولٹ ایکٹ کے سلسلہ میں جلسہ ہوا، تو اس میں پچاس ہزار آدمی شریک ہوئے، پھر اس کے بعد رام نومی کا جلوس نکلا تو مسلمان اس میں کثرت سے شریک ہوئے، حکومت کو یہ فضا پسند نہ ہوئی، پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر مائیکل اوڈائر نے ڈاکٹر

ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو گرفتار کر کے کسی نامعلوم جگہ پر بھیج دیا، اس سے امرت سر کے لوگوں کو بڑا دکھ ہوا، اور وہ ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر آکر احتجاج کرنے لگے حکومت نے ان پر گولیاں چلا دیں جس سے کچھ آدمی ہلاک ہوئے، یہ مجمع مشتعل ہو کر واپس ہوا، تو بینکوں اور دوسرے سرکاری دفتروں کو لوٹ لیا، اور اُن میں آگ لگا دی، کچھ انگریزوں کو بھی قتل کر ڈالا، اور بعض میموں پر حملے کیے جس کے بعد جنرل ڈائر نے آکر شہر پر قبضہ کر لیا، ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ میں ایک جلسہ کا اعلان ہوا، جنرل ڈائر نے اسے ممنوع قرار دیا لیکن اس روز ہندوؤں کا بیساکھی کا تہوار تھا اور میلہ بھی، اس لیے جلیانوالہ باغ کا چھوٹا سا میدان عورتوں، بچوں اور مردوں سے بھر گیا، جنرل ڈائر اس جلسہ کو منتشر کرنے کے لیے وہاں پہنچ گیا، اس نے فوراً اپنے فوجی دستہ کو گولی چلانے کا حکم دیدیا، اور اور اُس وقت تک برابر گولی چلواتا رہا جب تک کہ ان سپاہیوں کے پاس گولی چلانے کیلیے کارتوس باقی رہے، کہا جاتا ہے کہ ۱۶۰۵ گولیاں چلائی گئیں، پانچ چھ سو آدمی ہلاک اور بے شمار اشخاص زخمی ہوئے، یہ جگہ چاروں طرف سے مکانوں سے گھری ہوئی تھی، اس لیے کوئی شخص جان بچا کر بھاگ نہ سکا،

امرت سر کی جس گلی میں میموں پر حملہ کیا گیا تھا، اس میں سے ہندوستانیوں کے گزرنے کی یہ شرط مقرر کر دی گئی کہ وہ وہاں سے گزریں تو زمین کے کیڑوں کی طرح پیٹ کے بل رینگتے ہوئے گزریں، شہر میں مارشل لا جاری رہا جس کے ذریعہ بڑی سفاکیاں عمل میں آئیں، سر مائیکل اوڈائر اور ڈائر کے وحشیانہ مظالم کی وجہ سے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بڑی نفرت پھیلی، اسی کے بعد ہندوستان کی آزادی کی جنگ کا ایک نیا باب شروع ہوا، برطانوی حکومت کی پالیسی نرم پڑی تو تمام سیاسی قیدی غیر مشروط طور پر

رہا کر دیے گئے، علی برادران جیسے شیرانِ وطن اور فدائیانِ ملت بھی کم و بیش پانچ سال کے بعد نظربندی اور اسیری سے رہا ہوئے، گاندھی جی نے ان کی رہائی سے پورا فائدہ اٹھایا، برطانوی حکومت نے ترکوں کے ساتھ ناروا رویہ اختیار اور علی برادران کو قید کر کے مسلمانوں میں ایسا اشتعال پیدا کر دیا تھا کہ انگریزوں سے ان کی نفرت انتہائی درجہ تک پہنچ گئی تھی، جلیانوالہ باغ کے حادثہ سے عام ہندوستانیوں کو بھی حکومت کے خلاف بڑا غصہ تھا، اس نفرت اور غصہ سے آزادی کی جنگ کے سپاہیوں نے پورا فائدہ اٹھایا، گاندھی جی نے ہندو مسلمان دونوں کے جذبات سے واقف ہو کر ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی، اس سال امرتسر میں کانگریس کے سالانہ جلسہ کے ساتھ مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی رکھے گئے، علی برادران کو چھندواڑہ جیل سے رہائی کے بعد امرتسر ہی سیدھے آنے کی دعوت دی گئی، اور وہاں جس شاندار طریقہ پر ان کا استقبال کیا گیا، اس وقت تک کسی اور رہنما کا نہیں ہوا، پنڈت مدن موہن مالوی جی نے علی برادران کو کانگریس کا ڈیلیگیٹ بنایا، اس کے بعد سے کانگریس کی سرگرمیوں میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا، جیسا کہ جواہر لال نہرو بھی لکھتے ہیں

"علی برادران اسی زمانہ میں نظربندی سے رہا ہوئے، اور فوراً کانگریس کی شرکت کے لیے امرتسر پہنچ گئے، اب قومی تحریک نے ایک نئی صورت اور نئی حیثیت اختیار کرنا شروع کر دی" (ص ۴۸ جلد اول)

اسی زمانہ میں لندن میں صلح کانفرنس ہونے والی تھی جس میں ترکی اور جزیرۃ العرب کا فیصلہ ہونے والا تھا، اس کانفرنس کے انعقاد سے پہلے جو فضا قائم ہو گئی تھی، اس سے اندازہ ہو چکا تھا کہ جرمنوں کے ساتھ ترکوں کو بھی شکست ہو جائیگی تو اس شکست کی وجہ سے ترکی کے حصے بخرے کر کے اس کو بالکل کمزور کر دیا جائے گا، اور اس کے امپائر میں سے جزیرۃ العرب

اور دوسرے اسلامی ممالک پر انگریزوں اور یورپی قوتوں کا تسلط ہوجائے گا، اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اتحادیوں اور انگریزوں کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے، اس لیے مولانا محمد علیؒ نے ہندو مسلمان لیڈروں کا ایک مشترکہ وفد ترتیب دیا جو اُس وقت کے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ سے ملا، اور وائسرائے کو ہندوستان کی مسلم رعایا کے جذبات سے مطلع کیا، اس وفد کے ارکان میں مسلمان لیڈروں کے علاوہ گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو بھی تھے، اس کے بعد یہ طے ہوا کہ جنگ عظیم کی صلح کانفرنس سے پہلے ایک وفد یورپ خصوصاً انگلستان جائے جہاں ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو وہاں کی حکومت اور لوگوں کے سامنے پیش کرے، تاکہ وہ خلافت ترکیہ کے اقتدار و قوت کو بحال کرانے میں مدد دیں، اس وفد کے صدر مولانا محمد علی اور ارکان سید حسین، مولانا سید سلیمان ندوی اور ابوالقاسم صاحب اور سکریٹری جناب حسن محمد حیات صاحب منتخب ہوئے، جب یہ وفد ہندوستان سے روانہ ہوا تو لوک مانیہ تلک، پنڈت مدن موہن مالویہ، گاندھی جی کی بھی نیک خواہشات اس کے ساتھ تھیں، اور تمام ہندو رہنما بھی اس کی کامیابی کے خواہاں تھے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی ایک تحریر میں لکھا ہے کہ یہ وفد ہندوستان سے نہ صرف سات کروڑ مسلمانوں کی زبان بن کر گیا بلکہ جیسا کہ لوک مانیہ تلک آنجہانی نے وفد خلافت کو رخصت کرتے ہوئے کہا تھا "وہ متحدہ ہندوستان کی طرف سے پیام لے کر فرنگستان گیا تھا، اور حقیقت میں وہ یورپ کی سرزمین میں متحیر، خاموش، ساکن لیکن مضطرب تغلب دنیائے اسلام کے جذبات و احساسات کا ترجمان تھا، اس طرح یہ وفد خلافت دنیائے تاریخ کا ایک انقلابی واقعہ مشرق کی طرف سے مغرب کے مظالم کے خلاف پہلی تنبیہی صدا، توحید

کی جانب سے تثلیث کو نذرانۂ رحمت بلکہ جیسا کہ پوپ آنجہانی نے وفد خلافت کے جواب میں کہا کہ وہ مذہب کی طرف سے الحاد کو اور روحانیت کی طرف سے مادہ پرستی کو اعلان جنگ تھا۔

یہ وفد ۱۹۲۰ء میں انگلستان پہنچا۔ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے وفد کے سلسلہ میں جو کارنامے انجام دیے وہ ان کے مکاتیب کے مجموعے برید فرنگ سے معلوم ہوں گے، پھر برادر محترم جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کی لکھی ہوئی حیات سلیمان میں بھی تفصیلات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، جہاں تک تقریروں کا تعلق تھا، اس کا بار زیادہ تر مولانا محمد علی پر پڑا، افسوس یہ ہے کہ یہ تقریریں اردو کی کسی کتاب میں قلمبند نہیں ہوئیں ۱۹۳۹ء میں کلکتہ گیا ہوا تھا، تو وہاں فٹ پاتھ پر کتابوں کے ایک ڈھیر میں All about The Khilafat delegation مل گئی، اس کے مطالعہ سے وفد کی ساری سرگرمیاں نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔

انگلستان پہنچکر اس وفد نے پہلے اس زمانہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر مانٹیگو سے ملنا چاہا، مسٹر مانٹیگو تو خود نہ ملے، وہ علیل تھے، لیکن ان کی طرف سے مسٹر فشر، سرولیم ڈیوک مسٹر جے، ای شاک برگ اور مسٹر ایس، کے براؤن ملے، اس ملاقات میں مولانا محمد علی اور سید حسن نے بڑی مدلل تقریریں کیں، ان کا مطالبہ تھا کہ خلیفہ کے ماتحت اسلام کے تمام مقدس مقامات برقرار رکھے جائیں، جزیرۃ العرب پر بھی خلیفہ کا تسلط ہو، اور وہاں اتحادیوں کا کوئی حلیف اور پٹھو حکمراں نہ بیٹھایا جائے، خلیفہ کو مضبوط اور طاقتور برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی سلطنت سیاسی، بحری، اقتصادی اور صنعتی لحاظ سے مضبوط اور مستحکم ہو، اس لیے دولت عثمانیہ کے حصے بخرے نہ کیے جائیں، مولانا

محمد علی نے ان مسائل کو اپنی ایک پرزور تقریر میں پیش کیے جس کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

اس تقریر کا اصلی لطف تو انگریزی ہی میں پڑھنے سے مل سکتا ہے کہ مولانا اس زبان پر غیر معمولی قدرت رکھنے کی وجہ سے اپنی تقریر میں کیا کیا رنگ ڈھنگ پیدا کر سکتے تھے جملوں کے اندر جملے لاکر اپنے مطالب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے تھے، پھر اس میں ایسی روانی ہوتی کہ معلوم ہوتا کہ ایک بہتا ہوا چشمہ ہے جو بہتا چلا جاتا ہے، تقریر کے اردو ترجمے میں وہ لطف نہیں مل سکے گا، لیکن پھر بھی یہ اندازہ ہوگا کہ مولانا تقریر کرتے وقت کس طرح ابلتے، امنڈتے، پیٹتے اور پلٹ کر جھپٹتے، جو کچھ کہتے نڈر ہو کر کہتے، اور اپنے ایمانی جوش، مذہبی غیرت اور ملی حمیت کا اظہار کرتے وقت بالکل نہ جھجکتے، بلکہ اس کے اظہار ہی کو اپنی دنیاوی اور اخروی نجات کا ذریعہ سمجھتے، ان کی تقریروں سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ پہلے مسلمانوں کی قیادت کا کیا رنگ تھا، اور موجودہ دور میں کیا ہو کر رہ گیا ہے، مولانا نے اپنی تقریر میں کہا:۔

"میرا خیال ہے کہ سکریٹری آف اسٹیٹ غالباً اس بات سے واقف ہیں کہ امرتسر میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کا ایک اجلاس اس سال کے شروع میں ہوا جس میں دوسری بار یہ تجویز منظور ہوئی کہ پہلے ایک وفد یورپ اور امریکہ جائے تاکہ مسلمانوں کے نقطہ ہائے نظر بادشاہ سلامت کی حکومت، اتحادیوں اور صلح کانفرنس کے سامنے پیش کیے جائیں، اور ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی احساسات اور جذبات سے آگاہ کر کے انکی پوزیشن کی وضاحت کیجائے، اور یہ بھی ظاہر کیا جائے کہ ہندوستان کی کثیر رائے عامہ ہندوستانی مسلمانوں کی تائید میں ہے،

"ہم لوگوں کو صحیح طور پر اس کا علم نہیں تھا کہ صلح کا نفرنس کب شروع ہوگی، اور ترکوں سے کیا معاہدے ہوں گے، وائسرائے نے تو ہمارے سپاسنامہ کے جواب میں اپنے اس خطرہ کا اظہار کیا تھا کہ ہم جہاں جارہے ہیں وہاں اتنی تاخیر سے پہنچیں گے کہ مشکل سے ہماری شنوائی ہوگی، اسی لیے جب ہم ۲۲ر فروری کو وینس پہنچے تو وہاں سے ہم نے سکریٹری آف اسٹیٹ اور وزیر اعظم کو تار بھیجے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے ہم لوگوں کو کہنے سننے کا موقع دیا جائے، اب ہم یہاں ہیں، ہم اس کے شکر گذار ہیں کہ مسٹر مانٹیگو کی طرف سے ہمارا استقبال ہورہا ہے گرچہ مسٹر مانٹیگو کی علالت کی خبر پاکر ہم لوگوں کو افسوس ہوا،

اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے پہلے ہم یہ ظاہر کردیں کہ جب ہم یہاں پہنچے، بلکہ یورپ کے سفر کے دوران ہی میں ہم نے محسوس کیا کہ آرمینیوں، یونانیوں اور ترکوں کے دوسرے مخالفوں کی طرف سے یہ پروپگنڈا ہورہا ہے کہ ترکوں کی طرف سے بہت ہی ہولناک اور اشتعال انگیز جرائم سرزد ہوئے، ہم صاف طور پر یہ کہدیں کہ ہم اس طرح کے پروپگنڈے کے قائل نہیں ہیں، کیونکہ اس کے لیے نہ ہمارے پاس سرمایہ ہے نہ وہ اخلاق ہے اور نہ ایسے پروپگنڈے کے ذرائع ہیں، اس کے علاوہ اس وقت ترکوں کے بارے میں براہ راست معلومات کا کوئی ذریعہ بھی نہیں، اس لیے ہم ان شدید الزامات کی تصدیق بھی نہیں کرسکتے جو ان پر عائد کیے جارہے ہیں، لیکن فروری ۱۵، ۱۶ر کو بمبئی میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کا جو آخری اجلاس ہوا تھا، اس میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد ایشیائے کوچک اور خلافت کے اندر جو علاقے ہیں وہاں جائے اور جب یہ وہاں پہنچ جائے تو وہاں کے قتل عام کی جو خبریں ہیں، انکے سچ اور جھوٹ ہونے کی تصدیق بے زرے،

"ہمارے لیے یہ ایک مذہبی سوال ہے، ہم تفصیلات میں جانے سے پہلے یہ واضح کردیں کہ یہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک بڑا اہم مذہبی معاملہ ہے، کہیں کہیں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خواہش ہے کہ وہ بادشاہ سلامت کی حکومت اور اتحادیوں پر اپنا فیصلہ نافذ کرائیں، جناب عالی! میں یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے ذہن میں فیصلہ نافذ کرانے یا دھمکی دینے کا کوئی شائبہ نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ترکی کے ساتھ جو معاہدہ ہوگا، اس کا تعلق امپیریل پالیسی سے ہے یا صرف برطانیہ سے ہے، اگر اس کا تعلق صرف برطانیہ سے ہے تو پھر ہم کو کچھ کہنے کا حق نہیں رہتا، لیکن اس کے برخلاف اگر پورے برطانوی امپائر سے ہے اور بہ ظاہر ہے، تو پھر اگر ہندوستانی مسلمان اپنا فیصلہ نافذ کرانے کا حق نہیں رکھتے، تو یہ حق برطانیہ کو بھی حاصل نہیں ہوسکتا، یہ پورے امپائر کا ایک مشترکہ معاملہ ہونا چاہیے، ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے یہ واضح کردیا ہے کہ اب صورت حال ایسی ہوگئی ہے کہ بادشاہ سلامت کی رعایا کی حیثیت سے ہم اپنے فرائض میں کوتاہی کریں گے اگر ہم یہ ظاہر نہ کریں کہ اب معاملہ کی صورت کیا ہے،

یہ محض مسلمانوں کے جذبات کا سوال نہیں جو کسی کی خواہش کے مطابق بدل کر رکھ دیا جائے، یہ ایک مذہبی سوال ہے، جس کا تعلق مذہبی عقیدہ سے ہے، خلافت کا سوال ہمارے عقیدہ کا نہ صرف ایک حصہ ہے، بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ سراسر ہمارا مذہبی عقیدہ ہے، خلافت ان دنیاوی اور روحانی سرگرمیوں کو متحد کرتی ہے، جو اسلام کی تعلیم ہے، ہمارے رسولؐ کی وفات کے بعد سے خلافت قائم ہے، اور اس کو ہر زمانہ میں قائم رہنا چاہیے، اسلام میں صرف روحانی پیشوائی کی قسم کی کوئی چیز نہیں، اسلام ایتھکس کا حرف آخر ہے، یہ ہمارے تمام کاموں کی رہنمائی کرتا ہے، مسلمانوں کی زندگی کا ہر کام ایک مذہبی کام ہے

ہم بادشاہ سلامت کے ساتھ جو خدمات انجام دیتے ہیں، ان میں بھی مذہبی احساسات ہوتے ہیں، ہم اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں، وہ بھی مذہبی فرائض میں سے ہے اس لیے دنیاوی اور روحانی قیادت کی تفریق کرنا درست نہیں، خلیفہ پوپ سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے، اس سلسلہ میں جو غلط فہمی ہے، اس کو دور کرکے ہم خلافت سے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں،

"ایک ایسا ادارہ جو دنیاوی اور مذہبی دونوں ہو، اس کو برقرار رکھنا اسلام کے لیے لازمی ہے، خلیفہ کے لیے ضروری ہے کہ اسکو دنیاوی اقتدار بھی حاصل ہو تاکہ وہ ہمارے مذہب کی مدافعت کرسکے۔ یہ اقتدار وقتاً فوقتاً اس کے دشمنوں کی قوت کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، لیکن یہ اقتدار اتنا کم نہ ہو کہ یہ بے اثر ہو جائے، ہمارا خیال ہے کہ بلقان کی جنگ کے بعد خلیفہ کے اقتدار کو اتنا کم کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو وقار کے ساتھ نہ برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ وہ موثر طریقہ پر اپنے دین کا حامی بن سکتا ہے، اسی لیے ہم اس کو پہلے جیسی پوزیشن پر دیکھنا چاہتے ہیں، اس کے بغیر وہ امیرالمومنین نہیں ہو سکتا، اور نہ ہمارے دین کو خطرے کے وقت بچا سکتا ہے،

"ہم سیاسی اور علاقائی تبدیلیوں کے مخالف نہیں ہیں، ہم کو اس پر اعتراض نہ ہوگا اگر صلح کانفرنس کے رو سے ٹرکش امپائر کے غیر ترکی فرقوں کو خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان یا یہودی خود مختاری دیدی جائے۔ یہ صدر ولسن کے چودہویں نکات کی بارہویں دفعہ کے مطابق ہوگا، لیکن ایسی خود مختاری دیتے وقت عثمانی سلطنت کے وقار اور اقتدار اعلیٰ کو ضرور قائم رکھا جائے،

"خلافت کو دنیاوی اقتدار کے ساتھ برقرار رکھنے کے علاوہ جزیرۃ العرب کا بھی سوال ہے

یورپ کے جغرافیہ دانوں کے لیے عرب محض ایک جزیرہ نما ہے، جو چاروں طرف سے زمین سے گھرا ہوا ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے ایک جزیرہ ہے جس کی چوتھی سرحد کی طرف دجلہ اور فرات ہے، اس میں حجاز، یمن، نجد اور عرب کے دوسرے صوبے ہی شامل نہیں ہیں، بلکہ اس میں شام، فلسطین اور اس کے ملحق علاقے بھی داخل ہیں، اور یہ ہمارے رسول کا حکم صریح ہے کہ ان علاقوں میں غیر مسلموں کا تسلط نہ ہو، یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ امریکہ، فرانس اور برطانیہ کے عیسائیوں کو ان علاقوں کا اقتدار سپرد کر دیا جائے، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے ہم ہندوستان کی حکومت، پھر برطانیہ کی حکومت پر یہ واضح کر دیں کہ کوئی مسلمان اس کے لیے رضامند نہیں ہوگا کسی مسلمان کا ضمیر یہ گوارا نہیں کر سکے گا،

مولانا محمد علی کی تقریر کے درمیان مسٹر فنشر بول اٹھے کہ اگر مسلمانوں کا ضمیر فلسطین اور شام پر عیسائیوں کا تسلط نہیں گوارا کر سکتا ہے، تو پھر مسلمانوں کا ضمیر ہندوستان میں برطانوی حکومت کو کیسے گوارا کیے ہوئے ہے، اس کا جواب مولانا محمد علی کے ساتھی سید حسین نے دیا کہ دونوں جگہوں میں فرق ہے، عرب میں مقامات مقدسہ ہیں، اسی لیے ان پر غیر مسلموں کا قبضہ گوارا نہیں کیا جا سکتا،

اس کے بعد مولانا محمد علیؔ نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مجھکو افسوس ہوگا اگر میں کوئی ایسی بات کہوں جس سے قسطنطنیہ کی اہمیت کم ہو، کیونکہ یہ پانچ صدیوں سے خلافت کا مرکز رہا ہے، اس کی اہمیت کو کم کرنا مسلمانوں کے جذبات کو اس لحاظ سے مجروح کرنا ہے کہ وہ دار الاسلام کے کسی حصہ کو ہاتھ سے جانے دے سکتے ہیں لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے چلا جائے تو اس کا وہ اثر نہ ہوگا جو جزیرۃ العرب پر غیر مسلموں کے تسلط سے ہوگا، یہ علاقہ غیر آباد سہی لیکن قرآنی آیتوں کی رو سے پیغمبروں

کی سرزمین ہے۔ اسی لیے اس پر اسلام اور مسلمانوں کا اقتدار ہونا چاہیے ہم اپنے کو حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا روحانی وارث سمجھتے ہیں، اسی لیے اس علاقہ کو مقدس سمجھکر اپنے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، ہم اس کے تقدس کو برقرار رکھنا لازمی تصور کرتے ہیں، اور یہ بھی کہ یہ علاقہ پرامن ہو، مومنوں کا مرکز ہو، اور یہاں مذہبی حکومت آسانی سے قائم ہوتی رہے، اس کے تقدس اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر مسلمانوں کا قبضہ رہے، وہ دن ہمارے لیے بہت ہی خطرناک ہوگا جب اس کا کوئی حصہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتا رہے گا، اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے خدائی احکام کی پابندی ہونے نہیں دی، اس لیے مسلمان کسی حال میں اس کو پسند نہ کریں گے کہ جزیرۃ العرب پر کسی غیر مسلم کا تسلط ہو،

"مقامات مقدسہ کے بہت سے مذہبی احکام ہیں، مکہ، مدینہ اور بیت المقدس ہمیشہ خلیفہ کے زیر اقتدار ہوں کسی اور کا تسلط مسلمانوں کا ضمیر گوارا نہیں کرسکتا مسلمانوں کا تو یہ بھی دعویٰ ہے کہ نجف، کربلا، کاظمین سامرا اور بغداد کا بھی نگراں خلیفہ ہی ہو، ان پر غیر مسلموں کا اقتدار تو کسی حال میں بھی جائز نہیں، اس لیے مکہ، مدینہ، بیت المقدس اور تمام مقدس مزارات خلیفہ کی نگرانی میں ہونے چاہییں، جیسا کہ جنگ سے پہلے تھے، کیونکہ یہ سب جزیرۃ العرب میں واقع ہوئے ہیں جسکے ہر حصہ پر مسلمانوں کا اقتدار ہونا ضروری ہے، اگر یہ خلیفہ کی نگرانی میں ہو جائیں تو نہ صرف ایک مذہبی ضرورت پوری ہو جائے گی، کیونکہ اس طرح خلافت کو وہ دنیاوی قوت بھی حاصل ہو جائے گی جو ہمارے دین کی مدافعت کے لیے ضروری ہے بلکہ اسی کے ساتھ وزیر اعظم کا وہ وعدہ بھی پورا ہو جائے گا جو انھوں نے جنوری ۱۹۱۸ء کو کیا تھا، اور صدر ولسن کے چودہ۱۴ نکات کی بارہویں دفعہ کی آبرومندانہ تکمیل بھی ہو جائیگی

جس کی بنیاد پر ترکی سے صلح کی گئی تھی، پھر مسلمان بھی خوش ہوں گے اگر ان کی وفاداری کے صلہ میں جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کا احترام باقی رکھ کر خلافت کی پہلی جیسی پوزیشن قائم رکھی گئی، ہمارا یہ وفد پھر مطمئن ہو جائے گا، کہ خلافت دنیاوی اقتدار اور کافی علاقے کے ساتھ باقی رکھی گئی، اگر ضرورت سمجھی جائے تو خلیفہ سے اچھی حکومت، زندگی کے تحفظ، مذہب میں رواداری اور علاقوں میں خود مختاری کی ضمانت بھی لی جائے، بشرطیکہ یہ خلیفہ کے وقار اور آزادانہ اقتدار اعلیٰ کے عین مطابق ہو،

"یہاں پر میں یہ عرض کروں گا کہ ہم لوگوں کو اس کا احساس ہے کہ اتحادیوں اور انکی حکومتوں کی رعایا کا یہ فرض ہے کہ وہ ان سے وفاداری کا ثبوت دیں، لیکن ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ خلافت سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیں' ہم یہ نہیں چاہتے اور نہ ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ہم جس سیاسی پوزیشن میں ہیں، اس سے دور ہو جائیں، لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ہم حکومتوں کی غلط روش کی وجہ سے ایسے پریشان کن حالات میں ڈال دیے جائیں کہ خلیفہ کی حکومت کی طرف سے ہم پر جو فرائض ہیں ان کو انجام نہ دے سکیں، اگر ہم سے ایسے مطالبے کیے جائیں گے جو ہماری نجات کے منافی ہونگے تو پھر ہم اپنی پوزیشن پر از سر نو غور کریں گے،

"جہاں تک اس ملک میں ترکوں کے خلاف پروپگنڈا کا سوال ہے تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ترکوں پر ان کے جرائم عائد کرتے وقت بہت سے ایسے مذہبی اور نسلی تعصبات بروئے کار آجاتے ہیں جو صدیوں سے ان کے خلاف ہیں، اس پروپگنڈا میں اس حریصانہ خواہش کو بھی دخل ہے جس کی بنا پر ترکوں کے ہمسائے عثمانی علاقوں کو زیادہ سے زیادہ ہضم کرنا چاہتے ہیں، ہم کم سے کم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترکوں کے جرائم کو پیش کرنے میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے

عیسائی دنیا کے بعض حصوں میں تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ترکوں کو قسطنطنیہ سے اس لیے نکال دینا چاہیے کیونکہ وہ نہ صرف ترک ہیں بلکہ مسلمان ہیں، اسلام ان کے لیے ایک ناگوار چیز ہے، ہم کو ان گہرے تعصبات کو دور کرنا چاہیے، اور اسلام کے ساتھ جو مجرمانہ رویہ ہے، اس کو بھی بدلنے ... کی ضرورت ہے، ہم مسلمان کی حیثیت سے اسکے بھی خواہاں ہیں کہ غیر مسلموں کے دلوں میں کسی قسم کے شکوک نہ ہونے چاہئیں یہانتک ترکوں کے کردار کا یقین ہے، وہ اس تصویر سے بالکل مختلف ہے جو پیش کیجاتی ہے، ہم یہاں پر گرجاگھروں کے ان فتنہ انگیز اور تعصب آمیز پروپگنڈا کا ذکر نہیں کرنا چاہتے جو ترکوں کے خلاف عرصہ سے جاری ہے، ہم یہاں آکر کوئی تلخی پیدا کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ ہم صلح کا پیغام لے کر آئے ہیں، لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ترکوں کو غیر جانبدارانہ طور سے مطالعہ کرنے کی خاطر ان سازشوں کی تفتیش کرنے کی ضرورت ہے جو ترکوں کے دشمن ان کے خلاف دو صدیوں سے ان کی عیسائی رعایا میں اس لیے کر رہے ہیں کہ یورپ اور ایشیا میں عثمانی امپائر کے حصوں کو کاٹنے میں کامیابی حاصل ہو، یہ بھی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ترکی میں رہنے والی عیسائی آبادی کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ ہمسایگی کا ہے یا اشتعال انگیز ہے، اور اگر ترک قابل الزام تھے تو ان کو کافی سبق مل چکا، اور جناب عالی! میں یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو مطمئن کیا گیا اور ترکوں سے ان کی توقع کے مطابق سمجھوتہ کیا گیا تو پھر وہ ترکوں پر اثر انداز ہوں گے کہ وہ حکومت برطانیہ اور ان کے اتحادیوں سے اچھے تعلقات رکھیں، ہندوستانی مسلمان ترکوں پر یہ دباؤ بھی ڈالیں گے کہ جن ہولناک جرائم کے الزامات ان پر رکھے جاتے ہیں، وہ نہ صرف ان سے سرزد ہوں، بلکہ دوسروں کے دلوں میں ان کے شکوک بھی پیدا نہ ہوں، مسلمانوں کی حیثیت سے

ہمارا یہ فرض ہے کہ اسلام کی نیک نامی پر غیر انسانی حرکتوں کا داغ نہ لگنے پائے، برطانوی حکومت اور اس کے اتحادیوں کو ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان اسلام کے اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی نہ کریں گے، ہندوستانی مسلمانوں کے ان اثرات سے پورا فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے، ہمارے مشن دو قسم کے ہیں، ہم بادشاہ سلامت کی حکومت پر اپنے جذبات کا اظہار کریں کیونکہ ہم ان کی رعایا ہیں، اور ہم پھر اپنے خلیفہ کو بھی معاملات سے آگاہ کریں کیونکہ وہ ہمارے امیر المومنین ہیں، ہم ان دونوں کو بروے کار لانا چاہتے ہیں، اگر خلافت کے معاملہ میں ہماری خواہش کے مطابق سمجھوتہ ہوا تو ہمارے اثرات اچھے قائم ہوں گے، جو برطانوی امپائر اور انسانیت کے مفاد کی خاطر استعمال کیے جا سکتے ہیں، لیکن اگر ایسا سمجھوتہ ہوا جو ہمارے جذبات اور مذہبی احساسات کے خلاف ہوا تو ہم کوئی ایسے الفاظ تو استعمال نہیں کریں گے جو دھمکی پر محمول کیے جائیں لیکن ہم صاف طور پر کہہ دیں کہ ہم اپنے مذہبی فرائض کو پہلے اہمیت دیں گے۔

"بادشاہ سلامت کی حکومت ہندوستان سے دور واقع ہوئی ہے، اس کا مذہبی اور سیاسی ماحول بھی مختلف ہے، اس لیے ہندوستان میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اسکا اندازہ لگانا اس کے لیے مشکل ہے، میں حکومت ہند اور اس کے حکام کے خلاف کچھ کہنا نہیں چاہتا، انھوں نے ہمارے وفد کا خیر مقدم بڑے اخلاق سے کیا، اور انھوں نے ہم کو ہندوستان سے یہاں تک پہنچنے میں سہولتیں فراہم کیں، لیکن میں یہ کہوں گا کہ یہ سرکاری حکام ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کا اندازہ نہیں کر سکتے، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت ہمارے دلوں کے اندر کیا ہو رہا ہے، میری زندگی کے اوراق اس طرف کم و بیش سادہ اس لیے رہے ہیں کہ میں نے قید اور نظر بندی کی زندگی گزاری ہے، لیکن جناب عالی! میں آپ کو یقین

دلاتا ہوں کہ جب ہم جیل سے باہر آئے اور اپنی آنکھوں سے حالات دیکھے تو ہم پر شاق گزرا کہ رہائی کے بعد اب حالات کیا ہوگئے ہیں، ہندوستان میں اتنی تبدیلیاں آگئی ہیں کہ جس نے اس کو پانچ سال پہلے دیکھا تھا وہ اس کو مختلف صورت میں پائیگا، یہاں ایسے تغیرات ہوگئے ہیں کہ جو معاملات برسوں میں طے ہوتے تھے اب مہینوں میں طے پائیں گے، ہندوستان کے سرکاری حکام یہاں کے لوگوں سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ترکوں کے ساتھ سمجھوتہ نہ کرنے میں مسلمانوں کے مذہبی احساسات کا خیال نہیں رکھا گیا تو پھر معاملہ بہت ہی خطرناک ہوجائیگا، میں انگریز نہیں ہوں اور نہ انگریزوں کی طرح انگریزی جاننے کا دعوی کرتا ہوں، اس لیے مجھکو ڈر ہے کہ جو میں الفاظ استعمال کروں، ان سے ایسے مطالب نکالے جائیں جو میرے ذہن میں نہ ہوں، میرے لیے اپنے خیالات کی تصریح کرنا تو مشکل ہے، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ جب ہم لوگ یہاں آئے تو دارالعوام میں قسطنطنیہ پر مباحثہ سننے کے لیے گئے، کرنل ویجوڈ نے اپنی بحث میں کہا کہ تم انگریزوں کو قائل کرکے ان سے بہت کچھ لے سکتے ہو لیکن ان کو دھمکی نہ دو، جناب عالی! یہ بات ہر خوددار قوم کے لیے ضروری ہے، اور جب انگریزوں کے لیے ضروری ہے تو جناب عالی! میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ مجھے بتائیں کہ سخت سے سخت انتباہ کس طرح کیا جائے کہ وہ دھمکی پر محمول نہ ہو۔"

مولانا محمد علی کے بعد سید حسین نے تقریر کی، جس میں انھوں نے اپنے رنگ میں وہی ساری باتیں کہیں جو مولانا محمد علی کہہ چکے تھے، انھوں نے اس پر زور دیا کہ ہندوستان کے ہندو بھی خلافت کے معاملہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہیں، پھر مولانا محمد علی اور سید حسین دونوں نے اس منشور کی تفصیل بتائی جو گاندھی جی کی نگرانی میں آل انڈیا خلافت کانفرنس میں منظور ہوا تھا، دونوں نے یہ بتایا کہ جس وقت یہ منشور

پیش ہوا تو گاندھی جی نے علماء سے جرح کر کے اپنے کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کا یہ مذہبی مسئلہ ہے لیکن ہندوؤں کو اپنے ہموطن مسلمانوں کے اس مسئلہ میں اس لیے ساتھ دینا چاہیے کہ اگر ہندوؤں پر اسی قسم کا مشکل وقت آیا تو مسلمان بھی ان کا ساتھ اسی طرح دیں گے، اس کے بعد برطانوی حکومت کے نمایندوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، جو اس لیے یہاں پر پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ اندازہ ہو کہ انگریز اپنی فتنہ انگیزیوں اور سیاسی ریشہ دوانیوں پر کیسے خوبصورت انداز سے پردے ڈال کر اپنی مطلب برآری کر سکتے ہیں، اور پھر کیسے میٹھے اور ملائم الفاظ میں سخت سے سخت باتیں بھی کہنے کے عادی رہے ہیں، وہ الفاظ اور جملوں کے جال میں اپنے مخاطبین کو پھنسا کر رکھ دینے میں کیسے ماہر ہوتے ہیں،

سر ولیم ڈیوک نے کہا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مسلمانوں کے تمام مقامات مقدسہ پر جزیرۃ العرب کا کیسے تسلط ہو سکتا ہے، کیونکہ میرے تصور میں یہ بات ہے کہ مسوپوٹیمیا کے مقامات مقدسہ تو صرف شیعوں کے لیے مقدس ہیں اور شیعے خلیفہ کو تسلیم نہیں کرتے۔

مولانا محمد علی نے اس کا یہ جواب دیا کہ ان مقامات مقدسہ کا احترام مسلمانوں کے تمام فرقے کرتے ہیں، سنی مسلمان بھی ان کی زیارت کو جایا کرتے ہیں،

سر ولیم ڈیوک نے کہا کہ لیکن یہاں زائرین میں زیادہ تر شیعے ہی ہوتے ہیں، سنی مسلمان وہاں جانا شیعوں کی طرح ضروری نہیں سمجھتے،

اس کے بعد رائٹ آنریبل مسٹر فشر بولنے کے لیے کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا آپ لوگ بہت دور دراز کی مسافت طے کر کے اپنے معاملات کو برطانوی حکومت کے سامنے پیش کرنے کے لیے آئے ہیں، آپ نے اپنی انگریزی دانی پر معذرت کی، لیکن اس

معذرت کی ضرورت نہ تھی، آپ نے اپنے معاملے کو پوری وضاحت کے ساتھ اچھی طرح پیش بلکہ میں یہ کہوں گا کہ بڑے اعتدال سے پیش کیا ہے، برطانوی حکومت کو اس کا احساس ہے کہ گذشتہ جنگ میں دس لاکھ ہندوستانی سپاہیوں نے بڑی قیمتی مدد پہنچائی، اور یہ بھی معلوم ہے کہ ان سپاہیوں میں بہت سے مسلمان تھے، برطانوی حکومت کو ان مسلمان فوجیوں کے جذبات کا بھی احساس ہے، جو ان کی خاطر جنگ میں لڑے. ہندوستان کی وفادار مسلمان رعایا کے احساسات کا بھی خیال ہے، اور آپ یقین جانیں کہ ہم لوگ آپ کے ہم مذہبوں کے مذہبی جذبات و احساسات کو پورے طور پر ملحوظ رکھیں گے، اور جو بھی بین الاقوامی سمجھوتہ ہوگا، اس میں ہندوستان کے لوگوں کے خیالات بھی سامنے رکھے جائینگے، اور یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے کہ حال ہی میں اتحادیوں اور ان کی حکومتوں کی طرف سے قسطنطنیہ پر ترکوں کے اقتدار اعلیٰ کے تسلیم کرنے میں جو فیصلہ کیا گیا ہے، اس میں ہندوستان کی مسلمان رعایا کے مذہبی جذبات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، آپ کا یہ خیال صحیح ہے کہ یہ مسئلہ اہم ہے، برطانوی حکومت بھی اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کرے گی، لیکن برطانوی حکومت کے وزراء کے سامنے یہی مسئلہ سب سے زیادہ اہم نہیں ہے، ان کو اور بھی دوسری پیچیدگیوں کو سامنے رکھنا پڑ، اس مسئلہ کے ساتھ اور بھی مسائل ہیں، آپ خود اچھی طرح واقف ہیں، ترکی امپائر کی رعایا کا خیال بھی سامنے رکھنا ضروری ہے، میں آپ کی توجہ اس طرف دلاؤں کہ اس ملک پر سلیشیا کے قتل عام پر بڑا تکلیف دہ ردعمل ہوا ہے، اسی لیے یہ مسئلہ پیچیدہ ہو گیا ہے، پھر بھی برطانوی حکومت جس نتیجہ پر پہونچے گی، اس میں ہندوستان کی مسلم آبادی کی خیر سگالی کا خیال ضرور رکھے گی، اور آپ یقین جانیں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے، حکومت اس پر مناسب طور پر غور کرے گی، مسٹر محمد علی! آپنے اپنی تقریر کے الفاظ میں بڑی خوبی سے اس کی احتیاط کی ہے کہ دھمکی کی زبان استعمال نہ کیجائے، اور

آپ نے اس طرح دانشمندی سے کام لیا ہے، آپ کو قومی کاموں کے سلسلہ میں اس کا پورا تجربہ ہے کہ برطانوی حکومت اپنی حکمت عملی میں تمام معاملات کو سامنے رکھتی ہے اور اس میں وہ کسی سے ایک انچ کی تبدیلی نہیں کر سکتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ برطانوی امپائر کی وفادار رعایا مخلصانہ اور ایماندارانہ طور پر کوئی بات کہتی ہے تو حکومت اس پر پورے طور پر غور کرتی ہے، مجھکو افسوس ہے کہ اس وفد سے سکریٹری آف اسٹیٹ کی ملاقات نہیں ہو سکی، وہ ملنے کی خواہش رکھتے تھے، اور نہ ملنے سے ان کو مایوسی ہوئی لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہ اس وقت علیل ہیں، اسی لیے میں انکی نمائندگی کر رہا ہوں، لیکن مجھے امید ہے کہ آپ کے ہندوستان جانے سے پہلے آپ کو وزیر اعظم سے ملنے اور ان کے سامنے معاملات کو پیش کرنے کا موقع ملے گا، آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت ایک کانفرنس ہو رہی ہے، وزیر اعظم ڈاؤننگ اسٹریٹ میں اتحادیوں کے مدبروں سے مل رہے ہیں اور بہت سے اہم معاملات زیر بحث ہیں، مسٹر لائڈ جارج اس وقت بہت مشغول ہو رہے ہیں، میں وعدہ نہیں کر سکتا ہوں کہ وہ آپ سے ملیں گے، لیکن مجھکو امید ہے کہ وہ آپ سے مل سکیں گے۔

حضرات! میں صرف ایک بات کہنے کو آیا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ ایک فلسفی نے کہا ہے کہ تاریخ دوسری بہتر چیز کو قبول کرنے کا نام ہے، ہم جو کچھ چاہا کرتے ہیں، وہ تو سب نہیں حاصل ہوا کرتا، لیکن آپ یقین رکھیں کہ برطانوی حکومت ان خیالات پر مناسب طور پر ضرور غور کرے گی جو برطانوی امپائر کی رعایا کی طرف سے وفادارانہ اور مخلصانہ طور پر ظاہر ہوں گے،

مولانا محمد علی اس جواب سے خوش نہ تھے، بلکہ شاید تلملا اٹھے، اور وہ ان قائدین میں تھے جو اپنی تلملاہٹ کو ضبط نہیں کر سکتے تھے، اس لیے اس کا جواب دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ بھی انگریزوں ہی کی طرح انگریزی زبان کے لفظوں، فقروں اور جملوں سے کھیل کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں ماہر تھے، اس لیے مسٹر فشر کو مخاطب کر کے بولے:

"کیا مجھکو اس شکریہ کے ادا کرنے کی اجازت ہے جو اس وفد کے استقبال میں وسعت قلب دکھائی گئی ہے، میں سمجھتا ہوں. میرا خیال ہے کہ ہم میں ہر شخص سمجھتا ہے، ہندوستان کا ان پڑھ بھی سمجھ سکتا ہے کہ صرف ہماری خواہشات اور جذبات ہی کو اس قسم کے مسئلہ کو طے کرنے میں ملحوظ رکھا جائے گا، لیکن ایک بات ہے جس کی طرف بالکل توجہ نہیں دیجا رہی ہے اور ہم لوگ اسی پر زور دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے بعض مذہبی اعتقادات ہیں جنکی نوعیت ایسی ہے کہ ہم ان ہی کو اولیت دینا پسند کرینگے، اور چونکہ ہماری وفاداری کا تعلق ان ہی مذہبی اعتقادات سے ہے اسلیے بادشاہ سلامت کی حکومت کو بھی ان مذہبی اعتقادات کو اولیت دینا چاہیے، یہ سچ ہے کہ زندگی دوسری بہتر چیز کے انتخاب کا نام ہے اور مفاہمت سیاست کا اہم جز ہے، اس کا احساس رکھتے ہوئے ہم نے اپنے مطالبات پیش کیے ہیں، اتحادیوں اور انکی حکومتوں کے بیان سے ہم کو امید ہو چلی تھی کہ ایک نئی دنیا اور نیا آسمان قائم ہونے والا ہے اور جن علاقوں پر طاقت کے ذریعہ قبضہ کر لیا گیا ہے، ان کو ان کے جائز حقداروں کو واپس کر دیا جائیگا، اس طرح ہم یہ مطالبہ کرتے کہ مصر، طرابلس، بوسنیا، ہرزگو وینا، کریٹ اور ترکی کے وہ علاقے جو بلقان کے علاقوں سے کاٹ لیے گئے ہیں، واپس کیے جائیں لیکن ہم نے ایسا مطالبہ نہیں کیا ہے، اگرچہ ہم کو ان علاقوں کے اپنے ہم مذہبوں سے پوری ہمدردی ہے، ہم نے اس طرح دوسری بہتر چیز کے انتخاب پر عمل کر دکھایا ہے، لیکن جہاں تک مذہبی معاملات و اعتقادات کا سوال ہے، ان میں کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی، ان چیزوں پر مذکورہ فلسفہ کا اطلاق نہیں ہوتا، ان معاملات میں ہم اسی چیز کا انتخاب کرینگے جو بہترین ہے، ورنہ دوسری بہتر چیز کا انتخاب نہ صرف بد ملکہ بدترین چیز کے انتخاب کے برابر ہوگا،

"جہاں تک وزیر اعظم سے ملاقات کی ہماری خواہش کا سوال ہے، انکی مشغولیت سے ہم اچھی طرح

اقف ہیں، اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ ان کیلیے وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے لیکن احترام بر حرف لائے بغیر ہم کو یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ مشروسے فی زیلوز بار بار آتے ہیں اور بادشاہ سلامت کی حکومت کو انکی باتوں پر کان دھرنے کا موقع مل جاتا ہے، تو پھر یہ بالکل مناسب ہوگا کہ ہندستان اور ہندستانی مسلمانوں کے نمایندوں کو جو بقول آپکے اتنی دور دراز سے آئے ہیں، کہنے سننے کا موقع دیا جائے ، تاکہ بادشاہ سلامت کے وزراء فیصلے کرنے سے پہلے ہمارے جذبات سے بھی واقف ہوجائیں۔

"جہاں تک سلیشیا کے قتل عام کا تعلق ہے ہم لوگوں کو یقین ہے کہ اسکی خبروں کے آنے کے ذرائع قابل اعتماد نہیں، ہم تو اسکے قائل ہیں کہ اس قتل عام کی مکمل اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے ایک کمیشن مقرر کیا جائے تاکہ اصلیت کا پتہ لگایا جائے، یونانیوں، یہودیوں اور آرمینیوں نے اپنے اپنے کمیشن بھیج دیے لیکن ہندستانی مسلمانوں کو اپنا کمیشن بھیجنے سے روکا جارہا ہے، انکو بھی ایک کمیشن بھیجنے اجازت دیجائے، اور اگر انکی غیر جانبداری قابل شبہ سمجھی جائے تو اس کمیشن میں انگریز اور ہندوستانی بھی شریک کیے جائیں، اور اس میں شریک ہونے میں بڑا سا بڑا آدمی بھی اپنے رتبہ سے فروتر نہ سمجھے گا، ہز اگزالٹڈ ہائینس نظام اور ہندوستان کے دوسرے والیان ریاست، علما جن میں مولانا عبدالباری اور مولانا محمود الحسن بھی ہوں گے، ہندوستان کے ہندو مسلمان دونوں رہنما بھی خوش ہونگے کہ اس کمیشن کے ذریعہ صداقت کا اظہار ہو، پہلے مکمل تحقیقات تو ہونے دی جائے اگر ترک ویسے ہی ثابت ہوئے جیسا کہ وہ بدنام کیے جارہے ہیں، تو ہم لوگ ان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، ہماری خواہش کبھی یہ نہ ہوگی کہ اسلام پر یہ داغ آئے کہ وہ قاتلوں کا حامی ہے،

"میں آپ کی اجازت سے آپ کی توجہ ایک بات کی طرف اور دلاؤں، وزیر اعظم اور دار العوام کے لیڈر کی تقریروں میں خلیفہ اور اس کے دار الخلافت اور آبنائے میں اتحادیوں کی فوجوں کے قیام کا ذکر آیا ہے، اس کا ہم کو احساس ہے کہ پارلیمنٹ کے مباحثے

.. میں خصوصاً اور سیاست میں ..... مدبروں کو ایسی باتیں کہنی پڑتی ہیں کہ مختلف رائے رکھنے والے مطمئن رہیں، یہ مدبرین اپنی رائے کے اظہار میں کچھ ایسی باتیں بھی کہ جاتے ہیں جو نجی طور پر کہنا پسند نہ کریں گے، لیکن اگر یہ واقعہ ہے کہ خلیفہ کو اتحادیوں کی بندوقوں کے سایہ میں قسطنطنیہ میں رکھا جائے گا، جہاں اس کو اپنی جان کا بھی خوف لاحق رہے گا، تو پھر اس کی پوزیشن وٹیکن کے پوپ سے بھی بدتر ہوگی، وہ اوگینوا کا پوپ بلکہ اس سے بھی بدتر بن کر رہے گا، اور ایک غیر مذہب اور غیر عقیدہ والوں کا قیدی ہوگا، اگر یہ اصلیت ہے تو پھر ہم اس کو بار بوسہ یا قونیہ میں جلا وطن ہو جانا زیادہ پسند کریں گے، لیکن اسلام کی جو تذلیل اس سے ہوگی اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے، اس کے نتائج کو نظر انداز کرنا دانشمندی کے خلاف ہوگا،،

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس موقع ایک مختصر تقریر کی، جس میں انھوں نے فرمایا کہ میں صرف اتنی بات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں شاید پہلا ہندوستانی مولوی ہوں جو یہاں آیا ہوں، میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں، مولانا عبدالباری نے جو لکھنؤ کے فرنگی محل کے مشہور خاندان سے ہیں، مجھکو خاص طور پر اپنی نمایندگی کرنے کے لیے بھیجا ہے، تاکہ میں بادشاہ سلامت کی حکومت پر واضح کردوں کہ ہم لوگوں کے لیے یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ خالص ایک مذہبی معاملہ ہے،

رائٹ آنریبل فشر سے وفد کی یہ پہلی ملاقات ختم ہوگئی، اسکے بعد انگلستان کے وزیر اعظم لائڈ جارج سے ملاقات ہوئی، اس ملاقات میں مولانا محمد علی نے جس جرأت اور مذہبی جوش سے تقریر کی، وہ بھی مطالعہ کے لائق ہے، یہ تقریریں قصۂ پارینہ بن چکی ہیں لیکن انکے اندر جو چنگاریاں ہیں وہ آج بھی مسلمانوں کے دلوں کو سلگانے میں کام دے سکتی ہیں،

(باقی)

کیا علامہ ابن حبان پر زندقہ کا الزام صحیح ہے؟

از

از ضیاء الدین اصلاحی

امام ابو حاتم محمد ابن حبان (المتوفی ۳۵۴ھ) اکابر محدثین میں ہیں، وہ علوم حدیث خصوصاً فن جرح و تعدیل کے ماہر اور متعدد فنون میں دستگاہ رکھتے تھے، شاہ عبد العزیز صاحب فرماتے ہیں :-

"فقہ و لغت و طب و نجوم و فلک و ہندسہ را نیک می دانست"[1]

لیکن بعض نامور علماء و ائمۂ حدیث کی طرح ان پر بھی کچھ اعتراضات کئے گئے ہیں، ان میں سب سے بڑا الزام زندقہ اور بدعقیدگی کا لگایا گیا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلا وطن کر دیئے گئے تھے، اس مضمون میں اس کا جائزہ لیا جائے گا، اور اس کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس الزام کا دار و مدار ان دو روایتوں پر ہے جو مشہور صوفی ابو اسماعیل عبد اللہ بن محمد انصاری ہروی (متوفی ۴۸۱ھ) سے مروی ہیں، ان میں پہلی روایت یہ ہے :-

---

[1] بستان المحدثین

قال سألت يحيى بن عمار عن	ابو اسماعیل ہروی کا بیان ہے کہ
ابی حاتم بن حبان فقال رأيته	میں نے یحیی بن عمار سے ابو حاتم بن حبان
ونحن اخرجناه من سجستان	کے بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے
كان له علم كثير ولم يكن له	کہا کہ میں نے انھیں دیکھا ہے، اور
دين كبير قدم علينا فانكر الحد	ہم ہی لوگوں نے ان کو سجستان سے
لله فاخرجناه[1]	جلاوطن کیا تھا، وہ کثیر العلم ضرور تھے
	مگر ان کا دینی پایہ زیادہ بلند نہیں
	تھا، وہ ہمارے پاس آئے، اور اللہ
	کے بارہ میں حد کا انکار کیا، تو ہم نے
	اُن کو شہر بدر کر دیا،

دوسری روایت ہے:-

قال ابو اسماعيل الانصاري	ابو اسماعیل انصاری کہتے ہیں کہ
سمعت عبد الصمد بن محمد	میں نے عبد الصمد سے اور انھوں نے
ابن محمد يقول سمعت ابي يقول	اپنے والد محمد سے یہ سنا کہ لوگوں نے
انكروا على ابن حبان قوله	ابن حبان کے قول (النبوة العلم و
(النبوة العلم والعمل) و	العمل یعنی نبوت علم و عمل ہے) کی وجہ
	سے ان پر نکیر کی، الحاد و زندقہ کا الزام[2]

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴، و ۱۳۵، و میزان الاعتدال ج ۳ و طبقات الشافعیۃ الکبری ج ۲ ص ۱۴۱ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳ [2] اس سے التباس ہوتا ہے کہ ابن حبان کے نزدیک

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۵ پر دیکھئے)

حکموا علیہ بالزندقۃ وھجروہ وکتب فیہ الی الخلیفۃ فامر بقتلہ وسمعت غیرہ یقول انہ اخرج الی سمرقند[1]

لگایا اور ان سے قطع تعلق کر کے خلیفہ سے اُن کی شکایت کی، خلیفہ نے اُن کے قتل کا حکم دیا (ابو اسماعیل کہتے ہیں، مگر) میں نے عبدالصمد کے علاوہ دوسرے شخص سے یہ سنا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلاوطن کئے گئے تھے،

مذکورۂ بالا دونوں روایتوں میں عائد کردہ الزامات کی نوعیت مختلف ہے، پہلی روایت میں ابن حبان کی دینی فضیلت و برتری میں کلام کیا گیا ہے، اور دوسری روایت میں اُن کے الحاد و زندقہ کا ذکر ہے، اسی طرح دونوں روایتوں میں الزام کے اسباب اور وجہیں مختلف بتائی گئی ہیں، پہلی روایت میں صرف جلاوطنی کا تذکرہ ہے، اور دوسری میں اس کے بجائے خلیفہ کی طرف سے قتل کے فرمان کا ذکر ہے، مگر اس سے پتہ نہیں چلتا کہ واقعۃً قتل کئے گئے تھے یا نہیں[2] پھر فرمانِ قتل کے بارہ میں خود راوی نے شک و تذبذب ظاہر کر کے روایت کو مشکوک بنا دیا ہے، جس سے اس کا سوءِ حفظ اور نسیان بھی ثابت ہوتا ہے،

ابو اسماعیل انصاری کا زہد و تقدس اور تصوف میں اُن کا کمال مسلّم ہے، مگر روایت و درایت میں ضبط و تیقظ ثابت نہیں ہے، عموماً صوفیہ روایات کی صحت اور سندوں کی قوت کا زیادہ لحاظ نہیں کرتے، علاوہ ازیں وہی تنہا ان دونوں روایتوں کے راوی ہیں، ان

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۵) نبوت کا جزو علم و عمل ہے یعنی جس میں یہ اوصاف پائے جائیں وہ نبی ہو سکتا ہے) گویا نبوت وہبی نہیں بلکہ کسبی ہے [1] میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۳۹ و تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۳۵ ولسان المیزان جلد ۵ ص ۱۱۴،

[2] شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعۃً قتل نہیں کئے گئے تھے، بلکہ بعض ثقہ محدثین نے درمیان میں پڑ کر اس کو رفع دفع کرا دیا تھا،

احتمالات کی موجودگی میں ابن حبان جیسے جلیل القدر محدث کے بارہ میں اتنے اہم اور سنگین الزام کو کیسے صحیح مانا جاسکتا ہے؟ ہروی کی پیدائش اور ابن حبان کی وفات کے درمیان، چالیس بیالیس سال کا فرق ہے، اگر یہ الزام کچھ بھی وزنی ہوتا تو اس عرصہ میں پوری طرح مشہور ہوچکا ہوتا، اور اس کو بیان کرنے والے متعدد افراد اور ابن حبان کے معاصرین بھی ہوتے، کیونکہ ان کا شمار ائمۂ حدیث اور جرح و تعدیل میں ہوتا ہے، اس لئے دوسرے ارباب فن اور رجال و اسناد کے ماہرین ان کے بارہ میں چھان بین ضرور کرتے لیکن اتنے اہم الزام کے بعد بھی اُن کی شہرت و اہمیت، وثوق واعتبار اور عظمت و بلند پایگی میں فرق نہ آنا اور اُن کی ذات کا محدثین اور ائمۂ فن کا مرکز توجہ بنا رہنا اور رجال کی کتابوں کا اُن کے اقوال سے معمور ہونا اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اُن پر یہ الزام ثابت و متحقق نہیں[1]،

ان دو روایتوں کے ناقابلِ یقین ہونے ہی کی بنا پر اُن کو بعض اربابِ سیر و تذکرہ نے نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے، اور جن مورخین نے اُن کو نقل کیا ہے انھوں نے بھی ان پر نقد و تعقب کیا ہے، درحقیقت ایسے سنگین الزام محض مشکوک روایتوں کی بنا پر تسلیم نہیں کئے جاسکتے جب تک کہ متعدد افراد کے بیانات، معاصرین کی شہادتوں اور دوسرے قرائن سے انکی پوری تصدیق نہ ہوجائے دونوں روایتوں کے اختلاف و اضطراب اور ان میں خطا و تحریف کے احتمالات کو نظر انداز کرکے اگر انھیں صحیح بھی مان لیا جائے، تو ابن حبان پر الحاد اور بدعقیدگی کا الزام ثابت نہیں ہوسکتا اس کی تفصیل یہ ہے:-

---

[1] اس سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ روایت میں ابن حبان سے تعلقات، اور روایات وغیرہ ترک کرنے کا جو ذکر ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، ممکن ہے ان کے بعض مخالفین نے ان سے روایت کرنا چھوڑ دیا ہو لیکن عام طور سے وہ ثقہ اور معتبر سمجھے جاتے رہے،

اوپر گذر چکا ہے کہ پہلی روایت میں الحاد اور بے دینی کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں محض ابن حبان کی دینی عظمت وجلالت کے بارہ میں کلام کیا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے حد وحیز کی نفی کرتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ کوئی الحاد اور بے دینی کی بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کو بلا حد ومکان ماننا ہی اسلامی عقائد کے مطابق اور صحیح نقطۂ نظر ہے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں۔

انظر ما اجھل ھذا الجارح ولیت شعری من المجروح، مثبت الحد للّٰہ او نافیہ،

ذرا غور کرو کہ یہ جارحانہ الزام لگانے والا بھی کس قدر ناواقف ہے، کاش میں بھی جانتا کہ دونوں میں قابل جرح والزام کون شخص ہے؟ آیا وہ جو اللہ کے لئے حد کو مانتا اور ثابت کرتا ہے یا وہ جو اس کی نفی کرتا ہے؟

حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلدی کا بیان ہے۔

یاللّٰہ العجب من احق بالاخراج والتبدیع وقلۃ الدین۔

مجھے سخت تعجب ہے، آخر جلاوطنی کی سزا اور بدعت اور دین میں ضعف کے الزام کا کون زیادہ مستحق ہے؟

حافظ ابن حجر نے بڑے صریح الفاظ میں علامہ ابن حبان کے موقف کو صحیح قرار دیا۔ وہ فرماتے ہیں:۔

وقولہ (بدت) من ابن حبان ھفوۃ طعنوا فیہ بھا ان

معترض کا یہ کہنا کہ ابن حبان سے کوئی ایسی لغزش سرزد ہو گئی جن کی

اما دالقصۃ الا و لی الحق صدر	وجہ سے لوگوں نے ان پر طعن کیا ہو،
بھا کلا مہ فلیت ھذہ بھفوۃ	اگر اس سے اس کی مراد پہلی روایت[1]
والحق ان الحق مع ابن حبان	والا قصہ ہے تو دراصل اس میں کوئی
فیھا،	لغزش نہیں ہے، بلکہ انصاف کی بات
	یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابن حبان ہی کا موقف
	برحق ہے،

ان اقوال سے ظاہر ہو گیا کہ حد کے مسئلہ میں علامہ ابن حبان کی رائے میں کوئی غلطی اور قابلِ اعتراض بات نہ تھی، بلکہ ان ہی کا نقطہ نظر صحیح تھا، البتہ اس پر اس پہلو سے اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خواہ مخواہ ایک غیر ضروری مسئلہ کو چھیڑا، کیونکہ محتاط علما اس قسم کے کلامی مسائل میں غور و خوض کو پسند نہیں کرتے، ان کے نزدیک خدا کی صفات وغیرہ میں بحث و تدقیق فضول اور لایعنی بات تھی، اور ان مباحث میں سکوت افضل اور سوال و تفتیش اور بحث و جستجو بدعت ہے، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:-

انکارہ الحد واثباتکم للحد نوع	ابنِ حبان کا اللہ کے لئے حد ہونے
من فضول الکلام والسکوت	کا انکار کرنا اور تم لوگوں کا اس کیلئے
عن الطرفین اولی اذ لم یأت	حد کو ثابت کرنا دونوں ہی فضول
نص بنفی ذٰلک ولا اثباتہ و	باتیں ہیں، ان کے متعلق خاموشی
اللہ تعالی لیس کمثلہ شیئ فمن	افضل و اولیٰ ہے، اس لئے کہ نفی و

[1] یعنی وہ روایت جس میں ابن حبان کی جانب حد کی نفی کی نسبت کی گئی ہے،

[2] لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴،

اثبتہ قال لہ خصمہ جعلت
للہ حدا ابدأیت ولا نص
معك بالحد والمحدود
مخلوق تعالی اللہ عن ذلك
علوا کبیرا وقال ھو للتنافی
ساویت ربك بالشئ المعدوم
اذ المعدوم لا حد لہ فمن نزہ اللہ
وسکت سلم وتابع السلف[1]

اثبات کے بارہ میں کوئی نص وارد
نہیں ہے، اور اللہ کا یہ حال ہے کہ
اس کے مانند کوئی چیز بھی نہیں پس
جو شخص حد کا قائل ہے، اس کا مخالف
اس سے کہے گا کہ تم نے تو رائے وقیاس
سے اللہ کے لئے حد بنائی ہے، اس کے
لئے تمہارے پاس کوئی ثبوت اور
نص نہیں ہے، (نتیجہ کے اعتبار سے
اس قول سے اللہ کا محدود ہونا ثابت
ہوتا ہے حالانکہ) محدود مخلوق ہوتا ہے،
اور اللہ کی شان اس سے بہت اعلیٰ
وارفع ہے، مگر حد کو ماننے والا نہ ماننے
والے سے یہ کہے گا کہ تم نے تو خداوند
کو معدوم چیزوں کے برابر کر دیا ہے[2]
کیونکہ معدوم چیزوں کے لئے کوئی
حد نہیں ہوتی، پس ایسی حالت میں
جو لوگ اللہ کو منزہ سمجھے اور ان امور

---

[1] حافظ ابن حجر نے اس کی تردید میں لکھا ہے کہ یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے، کیونکہ اللہ کے وجود کے تحقیق کے بعد اس کے لئے حد کی نفی اس کو معدوم اشیاء کے برابر کر دینا نہیں ہو سکتا۔ [2] لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۳۹

کے بارہ میں خاموشی اختیار کرتے ہیں
وہی سلف صالحین کے متبع ہیں،"
اور انہی کا طریقہ احتیاط اور سلامتی
پر مبنی ہے،

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ حد کے مثبت و منکر دونوں ایک غیر ضروری اور بے سود مسئلہ کو موضوع بنا کر غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں، اور ان دونوں کا طریقہ احتیاط و تورع کے منافی ہے، علامہ ذہبی دوسری جگہ لکھتے ہیں،

کلا قسما مخطی اذلم یات نص	اثبات و انکار دونوں کے قائلین
باثبات الحد ولا بنفیه ومن	غلطی کرتے ہیں، کیونکہ حد کی نفی و
حسن اسلام المرء ترکه	ثبوت کے متعلق کوئی نص نہیں ہے،
ما لا یعنیه[1]	اور آدمی کے حسن اسلام کا تقاضا
	یہ ہے کہ وہ لایعنی باتیں چھوڑ دے،

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) حد کے بارہ میں ابن حبان کا موقف صحیح اور اسلامی عقائد کے مطابق تھا،

(۲) ان کی غلطی اتنی ہے کہ انھوں نے ایک غیر ضروری اور بے سود مسئلہ کو موضوع بحث بنایا، جس میں سکوت افضل اور بہتر تھا، لیکن اس کو عقیدہ کے بگاڑ اور دین میں فتور سے کوئی تعلق نہیں،

مگر مزید غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حبان نے بلا ضرورت اس مسئلہ میں کلام

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵،

نہیں کیا تھا، ذیل میں اس کی توضیح کی جاتی ہے،

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ مسئلہ صفات میں غور و خوض نامناسب اور خلاف احتیاط ہے لیکن اس صورت میں جب خواہ مخواہ اور بلا ضرورت غور و خوض اور بحث و کلام کیا جائے لیکن ضرورةً اور ناگزیر حالات میں خاموشی کے بجائے اظہار خیال ہی مناسب ہے، علامہ ابن حبان نے ضروری اور ناگزیر حالت ہی میں اس کے متعلق اظہار خیال فرمایا تھا، اُن کے زمانہ میں یہ مسئلہ بحث و نظر کا موضوع بنا ہوا تھا، اور کچھ لوگ شد و مد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے حد و حیز ثابت کر رہے تھے، اس لئے انھوں نے اس مسئلہ میں اظہار خیال ضروری سمجھا، اور وہ بات کہی جو عقائد صحیحہ کے مطابق تھی، اس لئے انھوں نے کوئی خلاف احتیاط نہیں کام کیا، خلق قرآن کے مسئلہ میں امام احمد کے طرز عمل میں بھی اس کی مثال ملتی ہے، اس کے بارہ میں علمائے حق کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس میں بحث و تفتیش فضول، سوال و تجسس بدعت، اور خاموشی افضل و اولیٰ ہے، چنانچہ امام بخاری سے جب اس کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے یہی جواب دیا، اور خود امام احمد سے بھی جب لوگوں نے اس کے بارہ میں دریافت کیا، تو انھوں نے اس کو فضول اور لایعنی مشغلہ قرار دیا، اور اس میں بحث اور کرید کرنے سے منع کیا[1] مگر جب معتزلہ کے استیلاء و تسلط اور خلفائے عباسیہ کے جبر و تشدد نے اس کو فتنہ کی شکل دیدی تو اس وقت خاموشی کے بجائے انھوں نے اظہار خیال کو ضروری سمجھا، اور ابتلا و آزمایش کی پرواہ کئے بغیر بڑی جرأت و بے باکی سے یہ اعلان کیا کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے، وہ کسی طرح بھی مخلوق نہیں ہو سکتا، اس کے نتیجہ میں انھوں نے قید و بند اور سخت قسم کی جسمانی سزائیں برداشت کیں، ابن حبان نے اس اسوہ پر عمل کیا،

---

[1] احمد بن حنبل والمحنۃ ص ۳۳،

رہی دوسری روایت تو اس میں الحاد وزندقہ کا ضرور ذکر ہے، مگر اس کی جو توجیہ بیان کی گئی ہے، اس سے اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا، کفر وایمان کا معاملہ نہایت نازک ہے، محققین اور علمائے حق کا معمول رہا ہے کہ وہ اس میں ہمیشہ توقف اور تأمل سے کام لیتے ہیں، اور پوری تحقیق کے بغیر الزام عائد نہیں کرتے، اور جہاں تک ممکن تھا، توجیہ وتاویل سے کام لیتے تھے، محدثین اور نقادانِ فن نے ابن حبان کے بارہ میں بھی اس اصول کو مدنظر رکھا ہے، اُن کی توجیہ وتاویل سے یہ الزام پوری طرح رفع ہوجاتا ہے، ذیل میں ان کے اقوال درج کئے جاتے ہیں:-

علامہ ذہبی رقمطراز ہیں:-

وهذا ايضاً له محمل حسن و	(دوسرا اعتراض بھی درست نہیں ہے،
لم يرد حصر المبتدأ في الخبر	کیونکہ اس کی عمدہ توجیہ ممکن ہے،
ومثله الحج عرفة فمعلوم ان	درحقیقت ابن حبان کی مراد مبتدا کو
الرجل لا يصير حاجاً بمجرد	خبر میں محصور ومحدود کرنا نہیں ہے،
الوقوف بعرفة وانما ذكر	جس طرح کہ رسول اکرمؐ کے ارشاد
مهم الحج ومهم النبوة اذا	(الحج عرفة یعنی حج عرفہ ہے) کا یہ مطلب
كمل صفات النبي العلم و	نہیں ہے کہ حج کی ادائیگی کے لئے صرف
العمل ولا يكون احد نبياً	عرفہ میں قیام کرلینا کافی ہے، اور
الا ان يكون عالماً عاملاً (نعم)	نہ تنہا عرفہ میں قیام سے حج کے تمام
النبوة موهبة من الله تعالى	ارکان ومناسک ادا ہوجائیں گے،
لمن اصطفاه من اولى العلم	بلکہ آپ کا مقصد حج کے سب اہم،
والعمل لا حيل للبشر في اكتسابها	ضروری، اور مقدم رکن کو بیان کرنا ہے،

ابداً او بهما يتولد العلم النافع و
العمل الصالح ولا ريب ان
اطلاق ما نقل عن ابي حاتم
لا يسوغ و ذلك نفس فلسفي[1]

(اسی طرح ابن حبان کے قول کا منشا
یہ ہے کہ) نبوت کی اہم اور ضروری
حقیقت علم و عمل میں نبی کا کمال و
امتیاز ہے، اور کوئی شخص ان میں
درجہ کمال کو پہنچے بغیر نبی نہیں ہوسکتا۔
یہ صحیح ہے کہ نبوت وہ مخصوص موہبت
الٰہی اور عطیۂ ربانی ہے جس کے لئے اللہ
اپنے علم و عمل والے بندے کا انتخاب
کرتا ہے، اس میں آدمی کے کسب اور
حیلہ و تدبیر کا کوئی دخل نہیں ہوتا، اور نہ
وہ ریاضت اور محنت شاقہ سے حاصل کی
جاسکتی ہے، اسی سے علم نافع اور عمل صالح
کا سرچشمہ پھوٹتا ہے (اس نقطۂ نظر سے دیکھا
جائے تو ابن حبان کے قول میں کوئی خرابی
اور قباحت نظر نہیں آئیگی) البتہ مطلق شکل
میں ان سے جو کچھ منقول ہے، وہ صحیح
نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت ایک فلسفیانہ رائے و خیال کی ہے،

حافظ ذہبی اور علامہ ابن حجر دونوں نے یہ توجیہ بھی تحریر کی ہے:۔

ولقوله هذا محمل سائغ ان

ابن حبان کے اس قول کی ایک

۱؎ تذکرة الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵،

كان عناه اي عماد النبوة
العلم والعمل لان الله
لم يوت النبوة والوحي
الا من اتصف بهذين
النعتين وذلك لان النبي
يصير بالوحي عالما ويلزمه
من وجود العلم الالهي العمل
الصالح فصدق بهذا الاعتبار
قولهم النبوة العلم اللدني و
العمل المقرب الى الله فالنبوة
اذا تتحقق بوجود هذين الوصفين
الكاملين ولا سبيل الى تحصيل
هذين الوصفين بكمالهما
الا بالوحي الالهي اذ الوحي
الالهي علم يقيني ما فيه ظن
وعلم غير الانبياء منه
يقيني واكثره ظني، ثم
النبوة ملازمة للعصمة
ولا عصمة بغيرهم ولو بلغ

مناسب توجیہ یہ ہے کہ اگر اُن کی مراد
یہ ہو کہ نبوت کا دار و مدار علم و عمل پر ہے
کیونکہ اللہ تعالیٰ نبوت و وحی سے اسی
شخص کو سرفراز کرتا ہے جو ان دونوں
اوصاف سے متصف ہو اور نبی وحی کی
وجہ سے علم والا ہوتا ہے اور علم الٰہی عمل
صالح کو مستلزم ہے تو اس اعتبار سے
اُن کا قول صحیح ہے کیونکہ نبوت علم لدنی
اور اُن اعمال کا نام ہے جو قربت الٰہی کا
ذریعہ ہیں پس نبوت ان دونوں چیزوں
کے تمام و کمال پائے جانے کا نام ہے
اور وحی الٰہی کے بغیر ان دونوں کا بدرجۂ
کمال حصول نہیں ہو سکتا کیونکہ وحی
الٰہی ایسا یقینی علم ہے جس میں ظن و تخمین
کو دخل نہیں ہوتا مگر غیر انبیاء کا علم
یقینی کم اور ظنی زیادہ ہوتا ہے پھر نبوت
عصمت کو مستلزم ہے اور انبیاء کے علاوہ
کسی شخص کے لئے عصمت نہیں خواہ وہ
علم و عمل کے کتنے ہی اعلیٰ مدارج اور بلند مراتب

فی العلم والعمل ما بلغ والخبر
کیوں نہ طے کر لے، دوسری بات یہ ہے

عن الشیٔ یصدق ببعض
کہ جب کسی چیز کے بارہ میں خبر دیجاتی ہے

ارکانہ واھم مقاصدہ
تو وہ اُس کے ضروری مقاصد اور اہم

غیر انالا نسوغ لاحد اطلاق
اجزا کے لحاظ سے دیجاتی ہے جس طرح

ھذا الا بقرینة کقولہ علیہ
کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ (الحج عرفۃ) تاہم

الصلوٰة والسلام الحج عرفة
کسی کے لئے اس طرح کی بات (جیسی ابن

وان کان عنی الحصر ای لیس
حبان نے کہی ہے) مطلقاً اور بلا قرینہ کہنا

ھی الا العلم والعمل فھذہ
درست نہیں ہے، اور اگر ابن حبان کا مقصد

زندقة وفلسفة،
حصر ہو یعنی نبوت صرف علم وعمل ہی کا

نام ہے، تو یہ بلا شبہ زندقہ اور فلسفہ ہے۔

[illegible]

اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کی تقریر بھی قابلِ ملاحظہ ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

لیکن انصاف آنست کہ این کلامِ
مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ابن حبان

چنداں دور از عقائد حقہ نیست چہ مرادِ
کا یہ قول عقائد صحیحہ کے چنداں خلاف

آن نیست کہ نبوت کسبی است بریاضت
نہیں ہے کیونکہ ان کا یہ مطلب نہیں تھا

در علم وعمل حاصل تواں کرد، چنانچہ
کہ نبوت کوئی کسبی چیز ہے جو علم وعمل کی

مذہب فلاسفہ ہست بلکہ غرضِ اوست
ریاضت سے حاصل ہو سکتی ہے، جیسا کہ

کہ نبوة را لازم است کہ نفس ناطقہ انسان
فلاسفہ کا مذہب ہے بلکہ اُن کی غرض

سلے میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۲، و ۱۱۳،

در علم و عمل زیادتی بین داشته باشد
بعد ازاں بطریق موہبت اورا نبوت
عطا می شود چنانچہ در قرآن مجید اشارہ
باں معنی می فرماید جاے کہ فرمودہ است
اللہ اعلم حیث یجعل رسالته و
اعتقاد آں کہ انبیاء را ہیچ مرتبہ در قوت
علمیہ و علمیہ بر سائر افراد نمی باید کہ باشد
و بطریق تحکم محض یکے را از میان افراد
متساویہ بہ نبوت سرافراز میفرماید
اصلا از شریعت و دین ثابت نمی شود
یا مرادش آنست کہ انبیاء را بعد از بخشش
نبوت تفوق در ہر دو جانب علم و
عمل حاصل می کرد، و لہذا معصوم
می باشند از خطا و گناہ و این معنی
مجمع علیہ جمیع اہل اسلام است،[1]

یہ ہے کہ نبوت کے لئے انسان میں اس
نفس ناطقہ کا پایا جانا لازمی ہے جو علم
و عمل میں نمایاں زیادتی رکھتا ہو اس
کے بعد ہی اس کو وہبی طور پر نبوت عطا
کی جاتی ہے، قرآن مجید کی اس آیت
میں اسی مفہوم کی جانب اشارہ کیا
گیا ہے، (اللہ اعلم حیث یجعل رسالته
یعنی اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت
و نبوت سے کسی کو سرفراز کرے) رہا
یہ عقیدہ کہ انبیاء علیہم السلام کو علمی و
عملی استعداد میں دوسرے افراد پر برتری
حاصل نہیں ہوتی، بلکہ خدا تعالیٰ محض اپنے
حکم و فیصلہ سے برابر برابر صلاحیت رکھنے
والے لوگوں میں سے کسی ایک شخص کو
زبردستی نبوت سے سرفراز کر دیتا ہے تو یہ
بات ہرگز دین و شریعت سے ثابت نہیں ہے،
یا ابن حبان کا یہ بھی منشا ہو سکتا ہے کہ
کہ انبیاء علیہم السلام کو نبوت عطا کئے

---

[1] بستان المحدثین ص ۴۰

جانے کے بعد علم وعمل دونوں اعتبار
سے فوقیت اور برتری حاصل ہوجاتی
ہے اس لئے وہ معصوم اور گناہوں سے
محفوظ رہتے ہیں، تو یہ ایسی بات ہے[۲]

[illegible]

ان توجیہات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل) میں بھی الزام واعتراض اور الحاد و بدعقیدگی کی کوئی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ اس کو سوء تعبیر کہا جاسکتا ہے، البتہ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے بڑے محدث اور ایسی جلیل القدر شخصیت پر محض سوء تعبیر کی وجہ سے اتنا بڑا الزام کیوں عائد کیا گیا ہے، اس کے مختلف اسباب معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ ایک سبب یہ ہے کہ ابن حبان علم وفن میں نہایت ممتاز اور بڑے ذہین وطباع شخص تھے، ان کے غیر معمولی کمالات نے بعض لوگوں میں ان کو محسود بنا دیا تھا، اور وہ اُن کو مطعون ومتہم کرنے کی فکر میں رہتے تھے، ان کے اس قول نے انکے لئے اس کا موقع فراہم کر دیا، اور انھوں نے انکی تعبیری غلطی سے فائدہ اٹھاکر اور اس کو سیاق وسباق سے جدا کر کے اسے انکا الحاد و زندقہ قرار دیا، حاکم فرماتے ہیں:۔

"ابوحاتم نہایت عالی مرتبہ تھے، اس بنا پر ان سے حسد کیا جاتا تھا"[۱]

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

"بجز عناد وتعصب کے ان پر اس الزام کے عائد کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، وہ یگانۂ روزگار اور غیر معمولی ذہین وطباع تھے، اُن کا حافظہ بے مثال تھا"[۲]

۲۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ فلسفہ وکلام کے ماہر اور فلسفیانہ ومتکلمانہ مذاق رکھتے تھے، اور فلسفہ وکلام میں انہماک بعض لوگوں کے عقائد وخیالات میں فساد پیدا کر دیتا ہے، اس بنا پر متقشف علماء کو ابن حبان سے بدگمانی ہوگئی، اور وہ ان پر طعن وتشنیع کرنے لگے، علامہ

سیوطی کا بیان ہے کہ وہ فلسفہ و کلام وغیرہ کے بڑے واقف کار تھے، اس لئے ان پر زندقہ کا الزام لگایا جاتا ہے، حالانکہ فلسفہ و کلام سے فساد عقیدہ ضروری نہیں ہے، ایسے بہت سے علما ہیں جو ان فنون سے غیر معمولی اشتغال رکھنے کے باوجود دینی حیثیت سے نہایت ممتاز اور بلند تھے، فلسفہ و کلام میں انہماک نے اُن کے عقائد میں کوئی خرابی نہیں پیدا کی، اس لئے ابن حبان کے فلسفہ و کلام کی دلچسپی کو بھی ایمان و عقیدہ کے فساد اور بگاڑ کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا، تاآنکہ اس کا پورا ثبوت موجود نہ ہو،

۳- ابن حبان پر اتہام و الزام کی روایت کرنے والے ابو اسماعیل انصاری ہروی جلیل القدر صوفی اور عارف باللہ تھے، صوفیہ کا ان مسائل میں تشدد مشہور ہے، اس لئے وہ ابن حبان سے ان کے فلسفہ و کلام میں اشتغال کی بنا پر خوش نہ رہے ہوں گے، اس فروگذاشت نے ان کا رویہ اور سخت بنا دیا ہوگا، اور انھوں نے ان پر الحاد و زندقہ کا الزام لگا دیا، اس لئے یہ الزام درحقیقت ان کے غایت تورع کا نتیجہ ہے، جو حقیقت پر مبنی نہیں ہے،

ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کے بعض اہم ماخذ

از

جناب الطاف حسین خانصاحب شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ

(۴)

(۴) ہندی قرونِ وسطیٰ کے شعرا اور انکا کلام | ہندی قرونِ وسطیٰ کے فارسی شعراء کا جہانتک تعلق ہے، امیر خسرو ان میں سرفہرست ہیں، ان کے اشعار میں تیرہویں صدی کے ہندوستان کے جو حالات ملتے ہیں وہ وہ مستند مورخوں کے تاریخی بیانات سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں، خسرو کی تاریخی مثنویوں میں نہ سپہر، قران السعدین، دولرانی خضرخاں، تغلق نامہ اور مفتاح الفتوح وغیرہ شعر و سخن کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے علاوہ ہندوستان کے سماجی اور تاریخی واقعات کی آئینہ دار ہیں، جنکو سید حسن برنی نے "تاریخی نقاشی" کے نام سے تعبیر کیا ہے، ان مثنویوں کو گہری نظر سے پڑھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ خسرو نے اپنے عہد کے تمدن کی جزئیات تک کو نہیں چھوڑا ہے ؎

ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی

ان کے تاریخی کارناموں کے متعلق مورخین اور محققین کے خیالات ملاحظہ ہوں،

(۱) پروفیسر محمد حبیب لکھتے ہیں :

"انھوں نے دلی کا ہر رخ سے معائنہ کیا، یہاں کے واعظین کی خطابت اور صوفیہ کے پُرکیف مکالمے ہوں یا یہاں کی رقاصاؤں کے دلربایانہ عشوے، انکی نظر سے نہیں بچے، جب انھوں نے لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو گہرے سے گہرے انسانی جذبات

سے ان کا دل مملو تھا، شیخ سعدی نے کہا ہے ؎

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم　　ز ہر گوشۂ خرمنے یافتم

خسرو نے اپنے پیشرو کی تقلید کی اور دربار سے لیکر مزدور کی گلیوں تک، خانقاہوں سے لیکر خرابات تک معاشرت انسانی کی تمام تہ بہ تہ حالتوں کا مطالعہ کیا۔"[1]

(۲) ڈاکٹر تاراچند فرماتے ہیں :

"شاعر کے بارے میں کہا جاتا ہے، اپنے زمانے کا آئینہ ہوتا ہے، خسرو اس قوم کے بہترین نمونوں میں سے ہیں، انکے کلام میں تیرہویں اور چودھویں صدی کے ہندوستان کی ذہنیت کا بڑا ستھرا عکس دکھائی دیتا ہے، سیاسیات کی روشن تصویریں ہیں، اخلاقی قدروں کا کامل نقشہ ہے، زندگی کی رنگا رنگ جھلکیاں ہیں، شاہی جشنوں کے دلوں کو گرمانے والے نظارے، راہ عشق کے پیچ و خم، محبت کے متانوں کے راز و نیاز کے تذکرے ہیں، آرزوؤں کی سنہری دنیا کی سیر ہے، اور ناکامیوں کا المیہ، پند و نصیحت، حکمت و تدبیر، تصوف و معرفت کیا کچھ ہے، جو خسرو سخن کی قلمرو کے باہر ہے۔"[2]

(۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :-

" آج کا مورخ جب ہندی قرون سے اسکے بہترین تہذیبی نمونے کے متعلق سوال کرتا ہے تو جواب میں "امیر خسرو" ہی کا چہرہ دکھائی پڑتا ہے۔"[3]

(۴) تغلق نامہ کے دیباچہ نویس لکھتے ہیں :-

---

[1] سوانح حیات امیر خسرو (اردو ترجمہ) الہ آباد، ۱۹۴۸ء ص ، [2] امیر خسرو اور ہندوستان، خسرو اکیڈمی، نئی دہلی ص ۱۳ [3] تاریخی مقالات، دہلی، ۱۹۶۶ء ص ۸،

"شاید دنیا کی کسی قوم نے ایسا شاعر نہیں پیدا کیا جس نے طویل اور اہم تاریخی واقعات کو شاعرانہ حسن گفتار کے ساتھ اتنی صحت سے نظم کا جامہ پہنانے میں کامیابی پائی ہو، جیسے کہ برانی دہلی کے اس درباری شاعر کے حصے میں آئی۔"[1]

(۵) ڈاکٹر وحید مرزا نے صحیح فرمایا ہے:

"انکے زمانے کی تقریباً مکمل تاریخ ان ہی کی تصانیف سے مرتب کی جا سکتی ہے۔"[2]

یہی نہیں بلکہ تاریخ کے بعض واقعات صرف خسرو ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں، مثلاً خان شہید کا مرثیہ جس کو فارسی شاعری کا "دریتیم" کہا جاتا ہے، اسکے بارے میں پروفیسر محمد حبیب لکھتے ہیں:

"شہزادہ شہید کی فوج کشی، مغلوں سے مقابلہ اور پھر اسکی شہادت، امیر خسرو کی گرفتاری اور رہائی، ان تمام واقعات کا تفصیلی علم ان کے زمانے میں عوام و خواص دونوں کو اور ہمارے زمانے میں تاریخ کے طلبہ کو صرف اسکا مرثیہ سے ہوا ہے۔"[3]

خسرو کے علاوہ ہندی قرون وسطیٰ کے فارسی شعراء میں بہاء الدین اوشی، امیر روحانی، محمد عوفی، ناصری خراسانی، بدر چاچ، تاج الدین ریزہ، شہاب مہمرہ، شمس دبیر، مولانا مطہر کڑہ، شیخ جمال الدین ہانسوی، امیر حسن علا سجزی، مولانا ضیاء الدین نخشبی مولانا عصامی اور شیخ جمالی کے اشعار میں بھی ہندی قرون وسطیٰ کے تمدنی، ادبی اور سیاسی حالات ملتے ہیں۔

وہ گمنام شعراء جن کا سرمایۂ حیات مفقود ہو چکا تھا، مگر اب دستیاب ہو گیا ہے، عجب نہیں کہ ان میں بھی تاریخی و سماجی واقعات کی داستانیں ہوں۔ ان شعراء میں سراجی، عمید تولکی، برہان الدین بزاز، تاج الدین بخاری، اعز الدین علوی، حکیم تاتاری اور محمود خطاط جو سلاطین دہلی

---

[1] تغلق نامہ، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء ص ۳-۴ [2] امیر خسرو، (ترجمہ) الہ آباد، ۱۹۴۹ء ص ۴
[3] سوانح حیات امیر خسرو دہلوی (ترجمہ) ص ۲۱

کے عہد کے شعراء تھے، قرون وسطیٰ کی تاریخ میں انکے کلام سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے،

۷- تاریخی اور ادبی مخطوطات کی اشاعت | اسلامی ہندوستان میں ساڑھے چھ سو سال کے عرصہ میں سیکڑوں تاریخی اور ادبی کتابیں تصنیف کی گئیں، ان میں سے بہت سی ضائع ہوچکی ہیں اور ضائع ہو رہی ہیں لیکن اب بھی ایک بڑی تعداد ان قلمی کتابوں کی ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے کتب خانوں میں محفوظ ہے، گو اہم تاریخی ماخذوں کی اچھی خاصی تعداد شائع ہوچکی ہے، پھر بھی دنیا کے مختلف کتبخانوں میں ایسے بہت سے مخطوطے موجود ہیں جنکی اشاعت ہندی قرون وسطیٰ کے تاریخی معلومات کے لیے نہایت ضروری ہے، چند اہم تاریخی مخطوطات جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکے ہیں، ان کے نام یہ ہیں :

(۱) ظفر نامۂ فیضی یا فتحنامۂ گجرات، برٹش میوزیم لندن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، (۲) شاہجہاں نامہ، محمد امین قزوینی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۳) تاریخ حقی یا ذکر الملوک شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ایضاً (۴) فوائد فیروز شاہی، مولانا شرف محمد العطائی، ایضاً، بانکی پور، (۵) طبقات شاہجہانی، شیخ محمد صادق، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۶) ذخیرۃ الملوک، سید علی ہمدانی، ایضاً (۷) مآثر جہانگیری، کامگار حسین، انڈیا آفس لندن (۸) اخلاق جہانگیری، نور الدین محمد، ایضاً، پنجاب یونیورسٹی لاہور (۹) تکملہ سیر المتاخرین یا تاریخ سلاطین بنگالہ منشی غلام حسین خاں جونپوری، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۱۰) بادشاہ نامہ، محمد امین قزوینی، برٹش میوزیم لندن (۱۱) افسانۂ شاہان، محمد کبیر بن شیخ اسمٰعیل، ایضاً (۱۲) تذکرۃ الواقعات[1] جوہر آفتابچی، ایضاً (۱۳) تاریخ چغتائی، محمد شفیع، ایضاً (۱۴) زبدۃ التواریخ، محمد نور الحق محدث، ایضاً، آصفیہ حیدر آباد (۱۵) ہفت گلشن محمد شاہی، ہادی کامور خاں، برٹش میوزیم،

---

[1] ڈاکٹر معین الحق نے اس کا اردو ترجمہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی سے شائع کر دیا ہے۔

واقعات مشتاقی، مولانا رزق اللہ مشتاقی، برٹش میوزیم (۱۷) تاج المآثر حسن نظامی
ری، آصفیہ لائبریری حیدرآباد (۱۸) سیرت فیروزشاہی، مصنف گمنام، بانکی پور
ی (۱۹) فتحنامہ نورجہاں، ملا کامی شیرازی، کتبخانۂ ملی پیرس (۲۰) سے الاخبار
یف وقوعی، انڈیا آفس لائبریری (۲۱) تذکرۃ الامراء، کیول رام، مولانا آزاد لائبریری
ہ (۲۲) تاریخ ہند محسنی، میر محمد محسن، ایضاً (۲۳) قواعد سلطنت شاہجہانی،
بھان برہمن، ایضاً (۲۴) تاریخ مظفری، محمد علی خاں انصاری، ایضاً (۲۵)
عالمگیری، احمد علی صفوی، ایضاً (۲۶) تاریخ وقائع زمان شاہی، مرزا ابوالحسن خاں
(۲۷) تاریخ حسینی، امام الدین، ایضاً (۲۸) تزک شاہ شجاع دفتر اول، دوم، سوم
دل و دوم مرتبہ شاہ شجاع، دفتر سوم مرتبہ محمد حسن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ۔
) تاریخ احمد شاہ (حالات احمد شاہ عالمگیر ثانی) مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ،
) تاریخ محمد شاہی یا نادر الزمانی، منشی خوشحال چند، ایضاً (۳۱) تاریخ محمد (عادل شاہی)
و ر پسر ملا ظہوری، ایضاً (۳۲) مظفرنامہ تاریخ بنگالہ، کرم علی خاں، ایضاً

ان تاریخی قلمی نسخوں کے علاوہ ان ادبی اور مذہبی کتابوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا
ے قلمی نسخے لندن، پیرس، برلن اور روسی ترکستان کے کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔
رہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی جو دیکھیں اس کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ان ادبی و مذہبی قلمی نسخوں سے بڑا اہم تاریخی مواد دستیاب ہوتا ہے، مثلاً ہم ہندستان
سانی اور ادبی ارتقا سے آگاہ ہوتے ہیں، مذہب اور تمدن کی حقیقی صورت ہمیں نظر
ہے، خانقاہوں اور مساجد کے آنے جانے والوں کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے،
کا انداز گفتگو، ان کی نیک صحبتیں اور ان کا طرز سخن معلوم ہوتا ہے، غرض ان سے

تاریخی اور تمدنی معلومات حاصل ہوتے ہیں، چند غیر مطبوعہ ادبی اور مذہبی نسخوں کے نام یہ ہیں:
(۱) سراج الہدایت، احمد بھی علوی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۲) مرأۃ الاسرار عبدالرحمٰن چشتی، ایضاً (۳) ریاض الاولیاء، بختاور خاں، برٹش میوزیم لندن (۴) احسن الاقوال، خواجہ عماد بن حماد کاشانی، ذخیرہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم (۵) تحفۃ المجالس شیخ احمد کھتو، انڈیا آفس لائبریری (۶) مخ المعنی[1] امیر حسن علاء سجزی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۷) طوالع الشموس، قاضی حمید الدین ناگوری، ایضاً (۸) بحرالمعانی، سید محمد بن جعفر مکی الحسینی، ایضاً (۹) مبلغ الرجال، عبداللہ عبیداللہ بن خواجہ باقی باللہ، ایضاً، (۱۰) فتاوائے جہانداری، ضیاء الدین برنی، انڈیا آفس لائبریری (۱۱) فتاوائے فیروزشاہی مولانا صدر الدین یعقوب مظفر کرمانی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۱۲) فقر بابری، نورالدین ابن قطب الدین، کتبخانہ دارالمصنفین اعظم گڈھ (۱۳) نظم گزیدہ، ناظم تبریزی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۱۴) خلاصۃ الاشعار، تقی کاشی، ایضاً (۱۵) مخزن الغرائب، علی احمد خاں سندیلوی، ایضاً (۱۶) دیوان مولانا مطہر کڑہ، ایضاً (۱۷) دیوان نورالعین، مسعود بک، برٹش میوزیم لندن (۱۸) عرفات عاشقین، تقی بن معین الدین حسینی اوحدی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (۲۰) مثنوی مہر وماہ، شیخ جمالی، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (۲۱) چہار گلشن، منشی چترمن کایستھ، انڈیا آفس، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ (۲۲) سفینۂ خوشگو، بندرابن خوشگو، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ

حرفِ مدعا

یہ کہہ کے آتے آتے رک گئی صبح بہار اپنی
ابھی تو راہ میں ہنگامۂ شیخ و برہمن ہے

ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد جب ہم نے اپنی قومی املاک کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا

---
[1] تاریخی مقالات مصنفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۱۶۶

ہمارے بہت سے قیمتی ذخائر یہاں سے منتقل کیے جا چکے ہیں، مغلوں کے محلوں اور مقبروں کے جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء انگلستان کے خزانوں اور عجائب خانوں میں محفوظ ہیں، ہمارے فنون لطیفہ کے شاہکار انگلستان کے گھروں کی زینت ہیں، اور ہماری لاتعداد قیمتی قلمی کتابیں انڈیا آفس لائبریری کے نام سے ملک بدر کی جا چکی ہیں،

آیئے اب اپنے نقصانات کی فہرست مرتب کریں، جو انگریزوں کے ظالمانہ تدبر سے ہم ہندوستانیوں کو پہنچے،

(۱) ہندو مسلم درویشوں کا وہ مشن جو کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کو پہنچ رہا تھا، اور اس سرزمین کو مہر و محبت کا گہوارہ بنانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکا تھا انگریزوں نے اس کو ناکام بنا دیا،

(۲) ہمارے ملک کی وہ قومی اور سیاسی تحریکیں جن کو سلطان ٹیپو اور جھانسی کی رانی نے اپنے خون سے سینچا تھا، سرد پڑ گئیں،

(۳) ہندو مسلم عوام کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت و عداوت پیدا ہو گئی،

(۴) ہمارے سماج کی تمام خوبیاں جو بہادری، ایمانداری، حق گوئی، رواداری اور سچائی پر مشتمل تھیں، خوشامد، بزدلی، جھوٹ، مکاری اور قوم فروشی میں تبدیل ہو گئیں،

(۵) اس منافرت سے ہمارے ملک کو اتنا نقصان پہنچا کہ شاید سو برس کی مسلسل جنگ سے بھی اتنا نقصان عظیم نہ پہنچتا اور آج بھی ہم اپنی نادانی اور غفلت سے اپنے قومی اثاثے کو آگ لگانے اور تباہ کرنے میں مصروف ہیں،

اسلیے اپنے ہندوستانی مورخوں، استادوں اور اسکالروں سے ہماری استدعا ہے کہ موجودہ دور ہماری قومی اور ملی زندگی کا بڑا نازک دور ہے، ہم کو اس وقت

انگریز مورخوں کی لگائی ہوئی آگ کو حق و انصاف سے اور سچائی و رواداری سے بجھانا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے اپنے ایک خطبہ میں مورخین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"آپ یہ نہ سمجھیے کہ اس دور آزادی میں تاریخ کو تفریقی سیاست کا آلۂ کار بنانا ختم ہو چکا ہے، آج بھی یہی رجحان باقی ہے، اور خاصا قوی ہے، آج بھی دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندو مسلم تہذیبوں میں کبھی میل نہیں ہوا، ہمیشہ ٹکر ہوتی رہی، اور آیندہ بھی ہوتی رہے گی، جب تک ایک تہذیب دوسری تہذیب میں جذب نہ ہو جائے، اس لیے آپ کو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے کہ آپ کی سعی ابھی ناتمام اور آپ کا کام ابھی ادھورا ہے، آپ کو اور زیادہ محنت، ہمت اور استقلال کے ساتھ یہ جد و جہد کرنی ہے، تاریخ نگاری کو اس کجروی سے محفوظ رکھنے کی اور یہ واضح کرنے کی کہ گو قرون وسطیٰ میں ہندو مسلم تہذیبوں کے اپنے اپنے دائرے تھے، لیکن ان میں ایک مشترک قطعہ بھی تھا، جو اس عہد میں قومی تہذیب کی حیثیت رکھتا، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے آپ زبردستی تاویل سے کام لیں، یہ نہ تو دیانتدار مورخوں کی حیثیت سے آپ کے لیے جائز ہے اور نہ آپ کو اس کی ضرورت ہے، آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اس کے ثبوت تاریخ کے صفحوں پر بکھرے ہوئے ہیں، صرف انھیں جمع کرنے اور ترتیب دینے کی ضرورت ہے، میرا یہ پختہ خیال ہے، جسے تاریخی نظریہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن ذہنی عقیدہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں

ہندو مسلم تہذیبوں ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں کہیں بھی دو تہذیبوں میں ٹکراؤ نہیں ہوا، تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتیں، وحشتیں ٹکرایا کرتی ہیں،........

آپ تہذیبوں کی کہانی لکھئے اور نئے ہندوستان کے ماضی کی روشنی میں حال کا یہ اہم ترین مسئلہ حل کرنے میں مدد دیجئے، کہ کس طرح مختلف تہذیبوں کے الگ الگ رنگ و آہنگ کو ضروری حد تک قائم رکھتے ہوئے ان میں ہم رنگی وہم آہنگی پیدا کرے، جو ایک متحد اور مضبوط قوم بنانے کے لیے درکار ہے، اور اپنے محبوب وطن کو ایسی مہذب انسانی برادری کا گھر بنانے میں ہاتھ بٹائیے جس کے صدر دروازہ پر حالیؔ کی یہ رباعی رقم ہو؎

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں — شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
دنیا کو جو کہتے ہیں جہنم ہے یہ — وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں[1]

آخر میں ڈاکٹر تاراچند کی تقریر کا ایک حصہ سنا کر گفتگو ختم کرتا ہوں، ڈاکٹر صاحب خسرو اکیڈمی نئی دہلی کے ایک جلسہ (۱۹۶۲ء) میں فرماتے ہیں :-

"آج ہمارے ملک میں قومیت کا احساس پیدا ہو چکا ہے، لیکن ابھی پختہ نہیں ہوا، اس کی نشانی یہ ہے کہ ہم تمدنی تنوع کو سماجوں کا معمولی مظاہرہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے خاص اہمیت دیتے ہیں، اور چھوٹے چھوٹے اختلافوں کو بنیاد مان کر ایک دوسرے کو شک وشبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، ہمیں یقین نہیں آتا کہ یہ ضروری نہیں کہ مذہب اور زبان کے فرق قومیت کے راستے میں حائل ہوں، اسی شک وشبہہ کا نتیجہ ہے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ

---

[1] خطبۂ افتتاحیہ جشن طلائی شبلی اکیڈمی، دار المصنفین اعظم گڈھ، معارف جولائی ۱۹۶۹ء ص ۶۰-۶۲

خصوصاً پچھلے زمانہ کی تاریخ کو علم کی شفاف روشنی میں نہیں بلکہ جذبوں کے گرد و غبار کے دھندلکے سے ڈھکا ہوا دیکھتے ہیں، چونکہ قومی احساس کے بننے بگڑنے میں تاریخ کا گہرا اثر ہوتا ہے، تاریخ لکھنے والوں نے اس پہلو پر جتنا چاہیے غور نہیں کیا، تاریخ قوم کی لمبی اور ہیجانی سرگذشت کی یاد ہے، اور جس طرح کسی آدمی کی انفرادیت اس کے کارناموں کی یاد ہے، جو اس کے ذہن میں محفوظ ہیں، اسی طرح تاریخ قومی کارناموں کا وہ وجدانی سلسلہ ہے جس سے قوم اپنی نسلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھتی ہے تاریخ دانوں کی غفلت اور بے راہ روی ملک کو خطرہ میں ڈال سکتی ہے، اپنی روایتوں کی غلط تفسیر سماج کے بندھنوں کو کمزور کر سکتی ہے، اس میں شک نہیں اس معاملہ میں ہمارے برطانوی حکمرانوں نے جو ڈگر چلائی اس کے نتیجے ہمارے لیے بدبختی کا باعث ہوئے اور اگر اب بھی ہم نہ چیتے تو آیندہ کے لیے سخت نقصان پہنچانے والے ثابت ہو سکتے ہیں[۱]" (امیر خسرو اور ہندوستان ص ۶-۵)

ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

اس میں امیر خسرو کی مثنویوں اور دواوین سے اُن کی وطن دوستی، وطن نوازی اور وطن پروری سے متعلق اُن کے تمام تاثرات کو یکجا کر دیا گیا ہے اور اخیر میں اُن کی مثنویوں اور دواوین کے اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں، جن سے اس عہد کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے،

ضخامت: ۱۲۶ صفحے - قیمت:- ۲-۷۵

منیجر

کلکتہ کا ایک علمی سفر

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

اس سال ۱۲ ستمبر کو کلکتہ کی ایران سوسائٹی میں ڈاکٹر محمد اسحاق میموریل لکچر کے سلسلہ میں ایک مقالہ پڑھنے کی عزت حاصل ہوئی، اس سوسائٹی نے گذشتہ پچیس ۲۵ سال میں جو علمی خدمات انجام دی ہیں، اس بنا پر اب اس کا شمار ملک کے مفید اور اہم اداروں میں ہونے لگا ہے، اس کو ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم نے ۱۹۴۴ء میں قائم کیا، ان کے کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے اسی ادارہ کو پدرانہ شفقت کے ساتھ پرورش کر کے پروان چڑھایا، ان کو فارسی زبان سے شغف نہیں بلکہ عشق تھا، ان کے اس عشق کا اظہار ان کی تصنیف "سخنورانِ ایران درعصر حاضر" سے خاص طور سے ہوگا، جس کی دو جلدوں میں ایران کے موجودہ شعراء پر اپنی عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور کیے ہیں، وہ زندگی بھر فارسی کے کسی نہ کسی پہلو پر کام کرتے رہے، کبھی فارسی شاعری پر لکھتے، کبھی کسی فارسی تذکرہ کے ایڈٹ کرنے میں مشغول رہتے، اور جب ایران سوسائٹی قائم کی تو علم، فن اور فارسی زبان سے متعلق ان کے سارے خفتہ جذبات بیدار ہوتے گئے، ایران سوسائٹی کی طرف سے انڈو ایرانیکا ایک رسالہ نکالنا شروع کیا، تو اس کے لیے مضامین فراہم کرنے، ان کے ترتیب دینے، چھپوانے اور شائع کرنے ہی میں ان کو زندگی کی تمام لذتیں ملنے لگیں، جب اس رسالہ کی تعریف ان کے کانوں میں پڑ جاتی تو ان کو معلوم ہوتا کہ انکی زندگی کا اصلی اور واحد مقصد پورا ہوگیا، ان ہی کے بزرگانہ اور پُر اصرار خطوط پر مجھکو بھی اس میں

بہت سے مضامین لکھنے کا موقع ملا، اس سے پہلے میں اسلامک کلچر حیدرآباد کا مستقل مضمون نگار تھا، لیکن اب جب کبھی کوئی انگریزی مضمون لکھنے بیٹھتا ہوں تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کھڑے نظر آتے ہیں، اور پھر قلم سے انگریزی میں ایسی ہی تحریر نکلتی ہے جو انڈو ایرانیکا ہی کے لائق ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب ۲۱ ستمبر ۱۹۶۶ء کو اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے، وفات سے پہلے انھوں نے اپنی ساری دولت علم و فن ہی کے فروغ کے لیے وقف کر دی تھی جس میں کلکتہ، علی گڑھ اور پٹنہ یونیورسٹیوں کو بھی حصہ ملا لیکن اپنے سرمایہ کا بڑا حصہ ایران سوسائٹی ہی کو دیا، اپنا قیمتی کتبخانہ بھی اسی کو عطا کیا، اسکی عمارت کڈ اسٹریٹ میں ہے، یہ سڑک اب ڈاکٹر صاحب مرحوم ہی کے نام سے موسوم کر دی گئی ہے، کلکتہ میں کسی علمی ادارہ کے لیے کوئی بڑی عمارت بنوانا آسان کام نہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی مخلصانہ کوششوں سے اس کے لیے ایک بہت بڑی عمارت بھی حاصل کر لی تھی جو اب لاکھوں روپیے کی ہے،

انکی وفات کے بعد ان ہی کے سرمایہ سے ان کے عقیدتمندوں نے ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان ہی کے نام سے سالانہ میموریل لکچر کا سلسلہ شروع کیا ہے، گذشتہ سال اس کا پہلا لکچر تھا جس کیلیے فارسی زبان و ادب کے ممتاز محقق ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مدعو کیے گئے تھے،

ان کے لکچر کا عنوان *Mohamad Sadiq Isfahani an official of Shah Jahan's Time* تھا،

معلوم نہیں ایران سوسائٹی والوں کے لیے میری کونسی تصنیف یا تحریر لائق توجہ تھی کہ اس سال اس لکچر کے لیے مجھکو طلب کیا، یہ لکچر انگریزی ہی میں ہوتا ہے، میرے مقالہ کا عنوان یہ تھا *Love and adoration for India in Indo-Persian literature with special reference to Bengal.* - "ہندوستان کے فارسی لٹریچر میں ہندوستان اور خاص طور سے بنگال سے محبت و تحسین کا اظہار"

اس مقالہ کے لیے میں ۱۱ ستمبر کی صبح کو ہوڑہ اسٹیشن پہنچا، تو اسٹیشن ہی پر ایران سوسائٹی کے

بعض عہدیداروں سے ملاقات ہوئی، مسٹر آر، ٹی سکلت ایران سوسائٹی کے صدر ہیں، دبلے پتلے نستعلیق سے ہیں، عمر کی کافی منزلیں طے کر چکے ہیں لیکن ان میں جوانوں کی سرگرمیاں نظر آتی ہیں، مذہباً پارسی ہیں، ایران سوسائٹی سے گہری دلچسپی لینے کے سبب اس کے ارکین ان کو محبت اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں، مجھ سے بھی بڑے اخلاق سے ملے، عبد المجید صاحب ایران سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ہیں، سرکاری ملازم بھی ہیں، لیکن کسی ادارہ سے وابستہ ہوکر اس کو سنوارنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، ایران سوسائٹی کے حسن انتظام میں ان کا بڑا حصہ ہے، انگریزی میں فارسی زبان کے بعض پہلوؤں پر مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق نے اپنی زندگی ہی میں ایران سوسائٹی کے لیے اپنے جانشینوں میں سے ان کا بھی انتخاب کر لیا تھا، خواجہ محمد یوسف صاحب ایران سوسائٹی کے مختلف عہدوں پر رہ چکے ہیں، آجکل اس کے ٹریزرر ہیں، کلکتہ ہائی کورٹ کے کامیاب ایڈوکیٹ بھی ہیں، جسم کا وزن بڑھ جانے کی وجہ سے بلڈ پریشر کے مریض ہیں، لیکن کام انجام دینے میں بڑے چست اور سرگرم ہیں، انکی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی، اسی عمر میں کلکتہ کے تمام علمی حلقوں میں مقبول ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کا بس چلتا تو اپنے سینے اور سفینے کا سارا علم ان ہی کو دے جاتے، اور بہت کچھ دے گئے، ان کو اپنی زندگی میں انڈو ایرانیکا کا اڈیٹر بنا گئے، جس کا اونچا معیار وہ ابھی تک قائم رکھے ہوئے ہیں، اپنی پیشہ ورانہ مشغولیت کی بدولت انڈو ایرانیکا کو سلیقہ سے اڈٹ کرنے اور اس میں مضامین لکھنے کے علاوہ اسٹیٹسمین، ہندوستان اسٹینڈرڈ، امرت بازار پتریکا، السٹریٹیڈ ویکلی اور دوسرے انگریزی جرائد میں بھی برابر لکھتے رہتے ہیں، قہقہوں میں باتیں کرنے کے عادی ہیں،

ان حضرات کی معیت میں امینیہ ہوٹل ۱۰ کورپریشن اسٹریٹ پہنچا، جہاں ایک بہت آرام دہ کمرہ میں میرے قیام کا انتظام تھا، اسکے مالک حاجی عبد القیوم صاحب ہیں، دریاباد ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے ہیں، لیکن اب کلکتہ ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں، کلکتہ کے مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی

اور معاشرتی کاموں میں شوق سے حصہ لیتے رہتے ہیں، اپنے اخلاص اور حسن اخلاق کی وجہ سے عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، ایران سوسائٹی سے بھی ان کو گہری دلچسپی ہے۔

شام کو خواجہ محمد یوسف صاحب ایران سوسائٹی لے گئے، اس کو میں نے ۱۹۶۹ء کے ستمبر میں پہلی دفعہ دیکھا تھا، اس تین برس کے اندر اس میں پہلے سے زیادہ رونق دیکھی، خصوصاً اس کے کتب خانہ میں ڈاکٹر محمد اسحٰق کے کتب خانہ کے آجانے سے اس کی زینت میں اضافہ ہو گیا ہے، وہاں مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی سے ملاقات ہوئی، جو اس وقت کلکتہ مدرسہ میں حدیث اور تفسیر کے قابل اور مقبول استاد ہیں، ان سے پرانی ملاقات ہے، اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے سے بڑی بے تکلفی سے ملے۔

شام کو ساڑھے چھ بجے مقالہ پڑھنا تھا، خواجہ محمد یوسف صاحب نے وقت سے پہلے وہاں ایک چائے رکھی تھی، وہاں مجھکو لے گئے، بہت سے معززین سے تعارف ہوا، مگر مجھکو جادو پور یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر جگدیش نراین سرکار سے مل کر خاص طور سے خوشی ہوئی، وہ پٹنہ یونیورسٹی کے بڑے ممتاز اور مشہور طالب علم رہے ہیں، یہ میری بھی مادر درسگاہ رہی ہے، وہ مجھ سے دو سال آگے تھے، انھوں نے میٹرک سے ایم، اے تک اول پوزیشن حاصل کی، طالب علمی ہی کے زمانہ سے بڑے سنجیدہ، خاموش اور الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے، ہم لوگ دور سے ان کو ایک ہیرو کی حیثیت سے دیکھا کرتے تھے، ان سے تقریباً چالیس برس کے بعد ملاقات ہوئی، اس اثنا میں انھوں نے سرجدوناتھ سرکار کی نگرانی میں بھی کام کیا، جادو پور یونیورسٹی کے ایک لائق اور قابل استاد ہونے کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، آجکل ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے فوجی نظام پر انگریزی میں کتاب لکھ رہے ہیں، اس موضوع پر میری بھی ایک کتاب نکل چکی ہے، یہ انکی نظر سے گذری ہے، اسکا ذکر دیر تک کرتے رہے، ان ہی کی صدارت میں جلسہ ہونے والا تھا جس سے مجھے اندرونی مسرت ہوئی انھوں نے بیگ سے اپنا ایک انگریزی مضمون نکال کر دیا، جس کا عنوان یہ ہے،

Islam in Bengal (13th to 19th Centuries)۔ اس کو میں نے بعد میں پڑھا، تو مجھکو بہت پسند آیا، اب اس کا ترجمہ معارف کی کسی قریبی اشاعت میں شائع ہوگا،

مقالہ خوانی کے جلسہ میں سامعین کی تعداد عموماً بہت کم ہوتی ہے، مگر میری توقع کے خلاف کافی لوگ اس میں شریک ہوئے، خواجہ محمد یوسف صاحب نے کہا کہ ایران سوسائٹی کے جلسہ میں لوگ شوق سے آتے ہیں، پھر یہ بھی کہہ کر شاید مجھکو خوش کرنے کی کوشش کی کہ آج کا موضوع کچھ ایسا دلچسپ ہے کہ لوگوں کو اس کے سننے کا بڑا اشتیاق ہے، جو حضرات اس میں شریک ہوئے ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی کا ذکر اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہاں کے علمی حلقہ کی ایک جھلک معارف کے ناظرین کے سامنے بھی آجائے گی،

مسٹر آر، بی سکلت صدر ایران سوسائٹی، مسٹر جے، ان تعلقدار، آئی سی، ایس (ریٹائرڈ) نائب صدر سوسائٹی، خواجہ محمد یوسف صاحب ٹرزر سوسائٹی، جناب عبد المجید صاحب جنرل سکریٹری، مسٹر لے کور ساہتی اسسٹنٹ جنرل سکریٹری کے علاوہ معززین شہر میں مسٹر ایس، بی رائے، کمشنر سپلائی حکومت مغربی بنگال، الحاج جناب امیر حسن صاحب، مالک ساسہ موسی شوگر ورکس مل، الحاج عبد القیوم صاحب، مالک امینیہ ہوٹل، جناب احمد سعید صاحب اڈیٹر آزاد ہند، جناب عبد المجید صاحب پروپرائٹر رسل اکسچینج، جناب خلیل الرحمن صاحب مجسٹریٹ سیالدہ پولیس کورٹ، مولانا عبد الفتاح قیم جماعت اسلامی مغربی بنگال و آسام، اور جناب ایس، آر سالک، اور مسٹر ہاشم عبد الحلیم (ڈاکٹر محمد اسحق مرحوم کے بھتیجے) تھے، تعلیمی حلقوں سے مسٹر دی، پولاڈ بن پرنسپل آرمینئنس کالج، ڈاکٹر عطا کریم برق صدر شعبۂ فارسی و عربی کلکتہ یونیورسٹی، پروفیسر مسعود حسن صدر شعبۂ عربی، ڈاکٹر حبیب الرحمن صدر شعبۂ فارسی، پروفیسر شاہ مقبول احمد، صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج، جناب ایس، ایم شاہ القادری، استاد عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی، جناب عبد الرؤف صاحب، استاد اردو کلکتہ یونیورسٹی،

جناب محمد اسمٰعیل صاحب استاد عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی، جناب محمد سمیع اللہ اسد صاحب استاد عربی مولانا آزاد کالج، جناب جاوید نہالی صاحب استاد اردو مولانا آزاد کالج، جناب شاہ وصی الدین احمد صاحب اندرا موہن کالج، مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی استاد تفسیر و حدیث کلکتہ مدرسہ، جناب علقمہ شبلی صاحب، استاد کلکتہ مدرسہ اور ڈاکٹر مجیب الرحمن صدر شعبۂ فارسی مولانا آزاد کالج شریک ہوئے،

مقالہ کا لکھنا میرے لیے بہت صبر آزما ثابت ہوا تھا، جب اسکو لکھنے کا ارادہ کیا تو اتنے مواد ملے کہ ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی تھی، اس کو سمیٹ کر ایک ایسا مقالہ لکھنا تھا جو ایک گھنٹہ کے اندر پڑھ کر ختم ہو جائے، مقالہ پھیلا، سمٹا، سمٹ کر پھیلا اور پھر پھیل کر سمیٹا گیا، میں خود خوش تھا کہ فارسی لٹریچر میں اس ملک سے حب الوطنی اور عقیدت کے کیسے کیسے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، اگر ان کو برابر پیش کیا جاتا رہے تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں، فارسی نثر اور شاعری دونوں میں ایسے مواد کی بڑی فراوانی ہے، میں نے تاریخ یمینی، تاج المآثر، برنی اور عفیف کی تاریخ فیروز شاہی، تزک تیموری، تزک بابری، آئین اکبری، تزک جہانگیری، مآثر رحیمی، بادشاہ نامہ، سیر المتاخرین، ریاض السلاطین وغیرہ سے نثر کے جو ٹکڑے جمع کیے ان کو یہاں پر پیش کرنا ممکن نہیں،

اسی طرح فارسی زبان کے مصنفوں نے ہندوستان کے مختلف علوم و فنون سے جو دلچسپی لی، اسکا ذکر بھی مقالہ میں کیا گیا ہے، باغبانی، مصوری، موسیقی، فن تعمیرات اور دوسرے تمدنی کارناموں کے ذریعہ سے ہندوستان کو جس طرح جنت نشان بنا کر اس کو خلد بریں اور بہشت ہشتمیں بنانے کی کوشش کی گئی، اس کی بھی تفصیل بیان کی گئی، ان تمام چیزوں کا ذکر یہاں پر طوالت کا باعث ہوگا، البتہ ہندوستان اور اس کے مختلف حصوں پر شعراء نے جو مدحیہ اشعار لکھکر اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے، ان میں سے کچھ معارف کے ناظرین کی خدمت میں بھی ہدیہ کرنے کو جی چاہتا ہے،

مولانا منہاج سراج مولف طبقات ناصری شاعر بھی تھے، ان کو فخر تھا کہ سلطان شمس الدین التمش

کے دور میں یہاں کے دولت مند قیصر و کسریٰ اور خان چین سے زیادہ اچھے تھے،

کمیں بندۂ او بہ از قیصر و کسریٰ ۔ کمیں چاکر او بہ از خان چین تتار

عصامی نے فتوح السلاطین میں اسی دور کے دہلی کی تعریف اس طرح کی ہے ۔

در آں شہر یک رونقے شد پدید ۔ کہ لذتے باشد اندر جدید

بسے سیّدانِ صحیح النسب ۔ رسیدند در وے ز ملکِ عرب

بسے کاسبانِ خراساں زمیں ۔ بسے نقشبندانِ اقلیمِ چیں

بسے عالمانِ بخارا نژاد ۔ بسے زاہد و عابد از ہر بلاد

ز ہر ملک ہر جنس صنعت گراں ۔ ز ہر شہر ہر اصل سیمیں بر اں

بسے ناقدانِ جواہر شناس ۔ جواہر فروشاں بروں از قیاس

حکیمانِ یونان طبیبانِ روم ۔ بسے اہلِ دانش ز ہر مرز و بوم

دراں شہر فرخندہ جمع آمدند ۔ چو پروانہ بر نورِ شمع آمدند

یکے کعبۂ ہفت اقلیم شد ۔ دیارش ہمہ دار اسلیم شد

امیر خسرو تو اس کے قائل تھے کہ ملک کی محبت کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا ہے، کہتے ہیں:

دیں ز رسول آمدہ کایں زمرۂ دیں ۔ حبِ وطن ہست ز ایمان بیقیں

وہ تو اسی محبت میں ہندو مذہب کو اسلام کے علاوہ ہر مذہب سے بہتر سمجھتے رہے، اس کے لیے اپنی مثنوی نہ سپہر میں بہت سے دلائل دیے ہیں، اور پھر اسی مثنوی میں بڑی مسرت اور فراخدلی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان تمام ممالک سے بہتر اور برتر ہے، وہ کہہ اٹھے ہیں کہ

حکمت و دانش و علم و ہنر   وانچہ کہ در ہند معاینت نگر

وہ یہ بھی لکھ گئے ہیں ع کشور ہند است بہشتے بزمیں

وہ یہ بھی لکھتے ہیں

ہند چو از خلد نشاں بود ورد   زامر خدا ایش قدم آسود ورد

وہ ہندی اور سنسکرت کی خوبیوں کے بھی معترف رہے

زبان ہندیم تازی مثال است   کہ آمیزش در انجا کم مجال است

لکھتے ہیں کہ سنسکرت عربی سے تو کمتر لیکن فارسی سے برتر زبان ہے، اس میں فارسی سے کم شیرینی اور مٹھاس نہیں،

آنست زبانے بصفت دردری   از عربی کمتر و برتر از دری

گرچہ کہ شیرینست دری شکریں   ذوقِ عبارت کم ازاں نیست دریں

وہ تو ہندو مرد اور عورت میں وفا شعاری کا جو جذبہ ہوتا ہے، اس سے بھی متاثر رہے، کہتے ہیں ؎

ہست عجب مردن ہندو بوفا   مردنش از تیغ و زآتش بجفا

زن ز پے مرد بسوزد بہوس   مرد ز بہر بت و با منعم و بس

گرچہ در اسلام روا نیست چنیں   لیک چو بس کار بزرگ ست ببیں

گر بشریعت بود ایں نوع روا   جاں بدہند اہل سعادت بہوا

وہ یہ بھی کہہ گئے ہیں

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری   ہم ز وے آموز پرستش گری

وہ تو ہندوستان کے نسوانی حسن کے اس طرح قائل رہے کہ اپنی مثنوی دول رانی

میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستان کی حسین عورتیں مصر، روم، قندھار، سمرقند، خطا، ختن، خلخ اور تمام حسینان عالم پر اپنے حسن کی صفات میں فائق ہیں، اس کے لیے طرح طرح کے دلائل دیے ہیں، وہ تو صرف یہاں کے حسینوں کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، بلکہ انکی شاعری کا آرٹ پان، آم، ہندوستانی پھولوں، پھلوں، جانوروں، کپڑوں اور یہاں کی تمام چیزوں کی مدح میں پورے طور پر دکھائی دیتا ہے، دہلی تو ان کا وطن ہی ہو گیا تھا، اس لیے اسکی تعریف میں ان کا قلم کیوں نہ نشاط انگیز ہو جاتا، کہتے ہیں:

حضرت دہلی کنف دین و داد — جنت عدن ست کہ آباد باد
ہست چو ذات ارم اندر صفات — حرسہا اللہ عن الحادثات
گر شنود قصۂ ایں بوستاں — مکہ شود طائف ہندوستاں
شہر نبی را ابرہ اوقسم — شہر خدا گشتہ ز عیشش اصم
قبۂ اسلام شدہ در جہاں — بستہ او قبۂ ہفت آسماں

امیر خسرو کے یار غار امیر حسن سجزی کو بھی ہندوستان، دہلی اور اس کے ہر شہر سے اسی طرح محبت رہی، وہ اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیا کے حکم سے دولت آباد منتقل ہو گئے، تو دہلی کو یاد کرکے لکھتے ہیں،

کجاست حضرت دہلی و خوبرویانش — کے بہشت درون و بروں او دوزخ

لیکن جب دولت آباد ان کا وطن ثانی ہو گیا تو اس کی محبت میں لکھتے ہیں:

زہے خرم بنائے دولت آباد — کہ ہم برپائے دولت باد بنیاد
خداوندا زمین ایں مکاں را — بدہ قدرے کہ دادی آسماں را

اپنی ایک نظم میں ناگور کا ذکر اس طرح کیا ہے،

سوادش چو خط معشوق دلکش — درو آبے چو اشک عاشقاں وش

وہاں کی عورتوں کے متعلق کہتے ہیں:

دہان پسیم سا سیا سے سمن ساق — زچوں مہ بل چو خورشید از بتاں طاق

وہاں کے حسن وعشق کی ایک سچی داستان لکھتے ہوئے اس معشوق کی قلمی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:

بت ہندو نسب چوں ترک خوں ریز — بلب شکر بہ غمزہ شورش انگیز
چہ کسبکی از کہ این کو مباری — کہ چوں رفتار خوش گفتار داری
بہشتت با ہمہ حوران خلا ست — اگر حوری بہشت تو کدامست

اس کے سوکر اٹھنے کی تعریف اس طرح کی ہے

بت ہندو ز سرشت از خواب برخاست — نقاب ابر از مہتاب برخاست

سلطان ناصرالدین محمود کے دربار میں چنگیز خاں کے پوتے نے اپنا ایک ایلچی بھیجا، تو اس کو مرعوب کرنے کے لیے ہر قسم کی شان وشوکت دکھائی گئی، اس موقع پر مولانا منہاج سراج کہہ اٹھے کہ دہلی تو بہشت ہشتمیں اور ہندوستان خوشتر زچین ہو گیا

ز ترتیب نہاد و رسم و آئین نشاط او — تو گفتی عرصۂ دہلی بہشت ہشتمیں گشتہ
مبارکباد بر اسلام ایں بزم شہ عالم — کزیں ترتیب ہندوستاں بسے خوشتر ز چیں گشتہ

تاتاریوں کے مختلف حملوں کا ذکر عصامی نے فتوح السلاطین میں کیا ہے، ہندوستان کی فوج کی برتری اور تاتاریوں کی پسپائی کی مرقع آرائی کرنے میں عصامی نے فردوسی کے قلم کا زور دکھانے کی کوشش کی ہے اس سلسلہ میں اس کے قلم سے غالباً ہزاروں اشعار نکلے ہیں، ایک جگہ لکھتا ہے

سپہ راند صفدر ز ہندوستاں — بگشت از شکوہش سر آسماں
ز ہندی سواران جل سی ہزار — ہمہ زورمند اند از دو نیزہ گذار
بدشمن شکارے ہمہ چیرہ دست — خروشان وجوشاں تر از پیل مست
ز آہن قبا و کلاہ ہمہ — کمر بستہ گرگاں بقصد رمہ

ستادند پیش سپاہ مغل — ہر سو گرفتند راہ مغل

مغل بیشتر زانکہ راند سپاہ — جہاں دید از گرد گشتہ سیاہ

ایک دوسری جگہ ہندوستانی فوج پر فخر کرتا ہوا لکھتا ہے

ندارد کسے یاد اندر جہاں — چنیں شاہ و لشکر بہ ہندوستاں

گماں می برم اے شہ نامور — کز آل کیانی بدیں کر و فر

چنیں آید از خسروان دلیر — کہ باشند در بیشۂ خود چو شیر

اور جب تاتاری پسپا ہو جاتے ہیں تو اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کرتا ہے

چو بشنید صفدار ہندوستاں — کہ باد خزاں رفت ازیں بوستاں

نرفتند شیران شرزہ شکار — بدنبال سگ خاصہ وقت فرار

بعینی مغل را ز ہندوستاں — بروں کردہ چوں بوم از بوستاں

عصامی نے ایک جگہ ہندوستان کی تعریف دل کھول کر کی ہے جس میں سے چند اشعار یہ ہیں

خوشا رونق ملک ہندوستاں — کہ جنت برد رشک ازیں بوستاں

سوادش شدہ زیب روئے زمیں — چو خالے بہ رخسار ہر نازنیں

چو کبریت احمر در و خاک گشت — بہ ہر چار فصلش ہوائے بہشت

سرشتہ ہمہ خاک او با گلاب — در و شبنمے دادہ نفع سحاب

کشایش ہمہ گلبن و میوہ دار — زمیں سایہ در سایہ از شاخسار

معطر شدہ خاکش از بوئے گل — معطر شدہ آبش از روئے گل

ز خاکش قوی گشتہ اصل بشر — ز بادش شدہ خوش ہوائے سحر

بدر چاچ نے نگر کوٹ کے قلعہ پر ایک قصیدہ کہہ کر گویا ہندوؤں کے فن تعمیرات کو خراج تحسین پیش کیا ہے

تنے حصار کہ بیں زحلقہ قدا رست | محیط نہ زبعض ہفت قلعہ حیث
چہ قلعہ ایست کہ خوشی بود زرفعت او | فضائے عرصۂ بام رواق او دانا

فیروز شاہ تغلق کے ساتھ مطہر سندھ کے شہر ٹھٹھ گیا تو اس پر ایک لمبی نظم کہی جس کے دو شعر یہ ہیں

نے نے کہ شہر خطۂ بہشتی ست دلپذیر | آراستہ بسندس و استبرق و حریر
آبش ہمہ گلاب و گلابش ہمہ عبیر | خشتش ززر سرخ وزمینش زسیم ناب

فیروز شاہ نے جب فیروز آباد بسایا تو مطہر نے اس پر ایک ترکیب بند کہا جس کے کچھ اشعار یہ ہیں،

حبذا شہر گزیں حضرت فیروز آباد | کہ در وجوی خلد واست دینا با بغداد
ہر طرف طرفہ عمارات ارم ذات عماد | ہر سوئے نزہت صحراے و تماشای سواد
آفریں باد بریں شہر و بدیں شاہ جواد | کایں چنیں شہر جہانگیر ازو شد بنیاد

ابوالفضل اور فیضی کو تو ہندوستان سے عشق رہا، ابوالفضل کی آئین اکبری تو ہندوستان کا قصیدہ معلقہ ہے، فیضی بھی ابوالفضل ہی کی طرح ہندوستان کی محبت کا دم بھرتا رہا، کہتا ہے

ہند است در ہزار عالم عشق | ہند ست و جہاں جہاں غم عشق
بے نقش و فا خط جبیں نیست | بے رنگ جگر گل زمیں ہست
خاکش ہمہ ذرہ ذرہ مہر ست | ہر ذرہ چراغ ز سپہر ست
عشق عرب و عجم شنیدم | از ہند بگویم انچہ دیدم
ایں شعلہ بر ہند گرم خیز ست | اینجا ست کہ آفتاب تیز ست

شاہجہانی دور کا ملک الشعراء ابو طالب کلیم تو ہندوستان کا راگ مختلف طریقے سے الاپتا رہا،

خوشا ہندوستاں ما وائے عشرت | سواد اعظم اقلیم راحت
ز خاک پاک او بر داشتن کام | چناں آساں کہ بر دارد کسے کام

کلیم کو ہندوستان سے ایسی محبت ہوگئی تھی کہ ایک بار اس کو اپنے عزیزوں کے ساتھ ایران جانا پڑا تو روتا دھوتا گیا اور ہندوستان کی یاد میں مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا،

اسیر ہندم و زیں رفتنِ بیجا پشیمانم — کجا خواہد رسانید پر فشانی مرغ بسمل را

بہ ایراں می رود نالاں کلیم از شوق ہمراہاں — بپائے دیگراں ہمچو جرس طے کردہ منزل را

زشوق ہند زاں ساں چشم حسرت بر قفا دارم — کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

مختلف علاقوں اور شہروں پر بھی محبت بھرے اشعار بکثرت ملیں گے، کشمیر پر تو اتنی نظمیں کہی گئی ہیں کہ کئی جلدوں میں شائع ہو سکتی ہیں، ابوطالب کلیم نے اکبرآباد پر بڑے اچھے قصیدے کہے ہیں، ملا محمد صوفی مازندرانی (المتوفی ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء) ہندوستان آئے اور گجرات میں سورت میں متوطن ہوئے تو اسکی تعریف میں کہتے ہیں،

بہ گجرات آر زو با خود مبر دل — کہ آنجا دل ربا بیش از شمار است

مقرش از آں شد شہر سورت — کہ دانستم کہ ایں دار القرار ست

جمال ایں جا ندار د با وفا جنگ — صباحت با ملاحت نیز یار است

داراشکوہ کے مرشد ملا شاہ نے اپنی ایک مثنوی نسبت میں ہر جگہ کا ذکر اسکی خصوصیت کے ساتھ کیا، جعفر بیگ بینش کشمیری شاہجہانی عہد کا شاعر تھا، اس نے اپنی مثنوی بینش ابصار میں دہلی، لاہور، اور پنجاب وغیرہ کی تعریف کی ہے، بنارس کے متعلق وہ کہتا ہے،

بنارس راجب آب و ہوائیست — برائے عشق بازی طرفہ جائیست

زن و مرد از محبت گشتہ مفتوں — چو زلف لیلے و زنجیر مجنوں

بتانش از نمک نیکو سرشتند — کہ موجِ سبزۂ باغ بہشتند

دریں کشور کہ از عشق فسوں ساز — ہم کفر و مسلمانیست ہمراز

بنارس پر تو علی حزیں (المتوفی ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء) نے بہت سے اشعار کہے، ان ہی کا یہ شعر ہے

از بنارس نروم معبد عام است اینجا — ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

غالب نے تو بنارس پر چراغ دیر کے نام سے پوری ایک مثنوی کہہ ڈالی ہے جس میں ۱۰۴ اشعار ہیں، اس کا ایک شعر یہ ہے:

گر گوئی بنارس شاہدے است ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست

ان اشعار کو سنکر سامعین محظوظ تو ضرور ہو رہے تھے، مگر کلکتہ میں بیٹھکر بنگال کی مدح سننے کے لیے زیادہ بےچین تھے، مقالہ میں ابوالفضل کی آئین اکبری، غلام حسین طباطبائی کی سیرالمتاخرین اور غلام حسین سلیم کی ریاض السلاطین سے بنگال، لکھنوتی، بنگلا، باربک آباد، بڑوہا، مدایراں، نذلا، مرشد آباد کے متعلق دلچسپ اور تعریف آمیز ٹکڑے جمع کیے گئے تھے، اس خطہ سے اس لحاظ سے بھی دلچسپی دکھلائی گئی کہ ایک نامعلوم مورخ نے عبرت ارباب بصر، منشی سلیم اللہ نے تواریخ بنگالہ، یوسف علی خاں نے تاریخ بنگالہ مہابت جنگی، غلام حسین طباطبائی نے سیرالمتاخرین، کرم علی نے مظفر نامہ، غلام حسین سلیم نے ریاض السلاطین اور کلیان سنگھ نے واردات قاسمی لکھ کر بنگال کے مختلف ادوار کی تاریخ مرتب کرکے اس کو محفوظ کر دیا، شعراء بھی بنگال کی مدح میں اشعار کہتے رہے، بنگال کی برسات سے غالباً بنگال کے لوگ بھی پریشان رہتے ہیں لیکن شاہجہانی دور کے ایک شاعر مرزا صادق (المتوفی ۱۰۶۱ھ) کو وہاں کی برسات بہت پسند آگئی، اس نے اس کو موضوع بناکر جو اشعار کہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

خوشا ملک بنگالہ در برشگال سوادش بروے زمیں ہمچو خال

زمیں پر ز آب و ہوا پر ز تیغ نہاں آب در سبزہ چوں آب میغ

سیہ ابر پیوستہ در ہائی و ہوئے تو گوئی بلا ئیست تکبیر گوے

ز گلہا زمیں گنج پور پشنگ نگہبان او اژدہا ہے چو گنگ

ز کوہ آبشار آنچناں ریختہ تو گوئی فلک کہکشاں ریختہ

جہانگیر کے دور میں محمد قاسم خاں بنیجہ بنگال کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تو اسکی تعریف میں

جو شعر کہا، اس سے بڑھ کر مبالغہ آمیز تعریف نہیں کی جا سکتی ہے،

سواد سبزۂ بنگالہ را ہر کس کہ دریابد بود او دوزخی گر با بہشتی کار می ماند

منیر لاہوری نے تو بنگال پر پوری مثنوی لکھ دی جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے شائع بھی ہو گئی ہے، انیسویں صدی میں ایک شاعر آزاد نے ڈھاکہ پر اور خان بہادر مولوی حمید اللہ نے چاٹگام کی تعریف میں نظمیں کہیں، کلکتہ پر ریاض السلاطین میں ایک لمبی نظم ہے جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

زہے شہر کلکتہ در ملک بنگ کہ ہست آں نمودار چین و فرنگ

عمارات آں دلکش و جانفزا ہمہ سرکشیدہ با وج ہوا

صنائع دراں کرد استاد کار ہمہ رنگ رنگ وہمہ خوش نگار

ہر کوچہ اش مہ رخاں در طواف ببر کردہ پوشاک رنگین وصاف

رخ شان چو ماہ منور بتاب تو گوئی زمیں سیر شد ماہتاب

یکے چوں سہ وآں دیگر مشتری یکے ہمچو زہرہ بہ جلوہ گری

زبس شد چو سیارہ ہر سو چنان شدہ کوچہ با نقشۂ کہکشاں

بہ بینی کنی گر بہ بازار رو متاع نفیس جہانی درو

بود ہر چہ در ربع مسکوں قماش بیابی بہ بازار او بے تلاش

گر از اہل صنعت نمایم رقم چناں نقش صورت نہ بندد قلم

ولی ہست مشہور در خاص عام کہ صنعت بہ چین و فرنگ است تمام

بہ گلگشت مردم چوں آنسو روند چو سیارہ در سیر باہم شوند

چنیں شہر در ملک بنگالیاں ندیدست کس نے شنیدہ چناں

غالب کے ان فارسی خطوط کے اقتباسات بھی دیے گئے جن میں کلکتہ کی تعریف ہے،

اور پھر ان کے اشعار بھی پیش کیے گئے۔

حالِ کلکتہ باز جستم — باید اقلیم ہشتمش گفتن
گفتم آدم ہم رسد در وے — گفت از ہر دیار وا ز ہر فن

اسی سلسلہ میں غالب کے وہ مشہور اردو اشعار سنائے گئے، جس کا پہلا شعر یہ ہے

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں — اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

آخر میں ایران کے سابق سفیر ہند حکمت علی اصغر کے یہ اشعار بھی سنائے گئے

جز تیر نگاہت بہ جگر مستہ ندیدم — چو ناوکِ مژگان تو البتہ ندیدم
دیدم بہ جہاں شہر بسے خرم و آباد — شہرے بدلآرائی کلکتہ ندیدم

کلکتہ میں بیٹھ کر بنگال اور کلکتہ کی تعریف سنکر وہاں کے لوگوں کا محظوظ ہونا ناگزیر تھا، جلسہ میں بظاہر شعر و شاعری کے بزم کی فضا قائم ہوگئی تھی، ۳۵ صفحے کا مقالہ بعض حصے کو حذف کرنے کے باوجود ۵۰ منٹ میں ختم ہوا، اوپر صرف خلاصہ درج کیا گیا ہے، جب یہ مقالہ ختم ہوا، تو حاضرین نے بہت سے سوالات کیے، جن سے اندازہ ہوا کہ یہ طویل مقالہ ان کے لیے صبر آزما ثابت نہ ہوا بلکہ انھوں نے دلچسپی سے سنا، پروفیسر جگدیش سرکار اپنی اختتامی تقریر کے لیے ایک پرمغز تحریر لکھ کر لائے تھے، مگر انھوں نے اس کو پڑھنا پسند نہیں کیا اور اپنی انتہائی شرافت و اخلاق میں کہا کہ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد وہ آج رات کے مقالہ نگار کے سامنے محض ایک ڈوارف (بونا) نظر آئیں گے، یہ کہکر انھوں نے محض اپنی خاکساری کا ثبوت دیا، ورنہ ان کے قلم سے جو بھی تحریر نکلتی ہے اس سے ان کی علم کی گہرائی اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے، وہ اپنی تحریر پڑھتے تو ہم سب مستفید ہوتے،

آخر میں ایران سوسائٹی کی طرف سے صدر جلسہ کے ہاتھوں Iran Society کی ایک جلد مجھکو دے کر میری عزت بڑھائی گئی، Silver Jubilee Souvenir (1944-1969)

یہ ایران سوسائٹی کا تازہ علمی کارنامہ ہے، ۴۰۰ صفحے پر مشتمل ہے، بہت ہی عمدہ لکھائی چھپائی اور کاغذ کے ساتھ تیار کی گئی ہے، اس میں ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے تقریباً تیس مشہور اہل قلم کے بڑے بلند پایہ اور گرانقدر مقالات ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم ایران سوسائٹی کی پچیس سالہ جوبلی کی خوشی میں اس کو مرتب کر رہے تھے، اس کا کچھ حصہ انکی نگرانی میں چھپ بھی چکا تھا، لیکن ان کی اچانک وفات ہوگئی، تو پھر یہ کام ایک اڈیٹوریل بورڈ کے ذریعہ طے پایا، جس میں ڈاکٹر اے، کے، برق، مسٹر وی پولسٹرین، جناب خواجہ محمد یوسف اور جناب ام، اے، مجید صاحبان تھے، یہ جلد ایران سوسائٹی کے بہت ہی اہم کاموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، معارف میں آیندہ اس پر تفصیلی ریویو شائع ہوگا، جلسہ کی کارروائی جیسے ہی ختم ہوئی تو جناب الحاج امیر حسن صاحب میری طرف بڑھے، ان کی داڑھی سرسید احمد خاں کی یاد تازہ کرتی تھی، ان کا چہرہ بڑا منور اور متدین نظر آیا، انگریزی سوٹ پہنے ہوئے، جس کے اندر سے ان کی مذہبیت اور بھی زیادہ نکھری اور ستھری معلوم ہو رہی تھی، جلسہ کے اور معزز حاضرین سے بے تکلفانہ انداز سے ملنے ملانے کے بعد یہ دلچسپ صحبت ختم ہوئی۔

اسی کے بعد خواجہ محمد یوسف صاحب نے اپنی طرف سے امینیہ ہوٹل میں ایک ڈنر رکھا تھا جس میں جلسہ کے بہت سے شرکاء کے علاوہ کلکتہ ہائی کورٹ کے آنریبل جسٹس ایس، اے مسعود اور وہاں کے مشہور رہنما خان بہادر جان محمد صاحب بھی شریک ہوئے، مسٹر جسٹس مسعود اب حکومت ہند کے فنانس کمیٹی کے رکن ہوگئے ہیں، بہت ہی اخلاق سے ملے، ان کی مادری زبان بنگالی ہے، لیکن گفتگو اردو ہی میں کی، خان بہادر جان محمد صاحب کے اسم گرامی سے اچھی طرح واقف تھا، اخباروں میں ان کا ذکر برابر آتا ہے، میری ان سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی، وہ شروانی، داڑھی اور منور چہرہ کے ساتھ بہت بھلے اور اور باوقار نظر آئے، ان کے علاوہ کلکتہ کے دو ممتاز اڈیوکیٹ جناب شہادت حسین اور جناب سید

ابوالمنصور حبیب اللہ بھی تھے۔ ڈنر ختم ہوا تو میری توقع کے خلاف جناب خلیل الرحمٰن صاحب مجسٹریٹ ایک نظم پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، جس میں کچھ میرا ذکر کرکے یہ بھی پڑھا ؂

بزم ایراں میں ہو ہمیشہ بہار لگے اس کو نہ کبھی باد سموم

اس کے بعد جناب علقمہ شبلی صاحب نے ایک نظم بہار سلیمانی کے عنوان سے پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا ؂

گلشن شبلی نعمانی سے آئی بوئے نسیم دوش پر اپنے لیے ملک سلیماں کی بہار

اس کے بعد جناب احمد سعید اڈیٹر آزاد ہند نے ایک تقریر کی جس میں دارالمصنفین کے کارناموں کو سراہا، اس کے جواب میں مجھ سے بھی جو کچھ بن پڑا، تھوڑی دیر تک بولتا رہا، یہ صحبت بھی دلچسپ رہی، اور تقریباً بارہ بجے رات کو ختم ہوئی، صبح کے وقت میں سو کر جیسے ہی اٹھا تو جناب احمد سعید صاحب میرے کمرے میں آئے، ان کے ہاتھ میں آزاد ہند تھا، جس میں رات کے جلسہ اور کھانے کی، روداد بھی موجود تھی، اس عاجلانہ رپورٹنگ سے آزاد ہند کی کارکردگی کا اچھا اثر پڑا، ابھی احمد سعید صاحب باتیں ہی کر رہے تھے کہ جناب شاہ مقبول احمد صاحب صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج ملنے آگئے جو محض ان کی محبت کا ثبوت تھا، وہ بہار ہی کے ہیں، اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ دارالمصنفین سے بہار کی تاریخ شائع ہونی چاہیے، میں نے ان سے کہا کہ بہار کے اہل قلم بہار میں رہ کر تاریخ مرتب کردیں تو دارالمصنفین اس کو ضرور شائع کردے گا، انھوں نے مجھ سے لکھنے کو کہا، مگر میں نے ان سے ہنس کر کہا، اب تو میں چالیس برس کے بعد خالصۃً یو، پی کا ہو چکا ہوں، اس کے بعد جناب عبدالمجید صاحب، خواجہ محمد یوسف صاحب اور پروفیسر عطا کریم برق آگئے۔ میں برق صاحب کے ساتھ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب سے ملنے چلا گیا، انھوں نے ۶۔ سہروردی ایونیو میں ایک بڑا مکان بنا لیا ہے، اس میں ہر طرح کی خوش سلیقگی، صفائی اور ستھرائی دکھائی دیتی ہے، ان سے

پہلی ملاقات ۱۹۳۲ء میں ہوئی تھی وہ میرے استاد بھی رہ چکے ہیں، انکی نگرانی میں پی، ایچ ڈی کا ایک مقالہ بھی لکھنا شروع کیا تھا، جو ہندوستان کے صوفیائے کرام کے حالات اور علمی کارناموں پر مشتمل تھا جب یہ ختم ہوا تو ان بزرگان دین کو دنیاوی کاموں میں استعمال کرنا اچھا نہ سمجھا، اسلیے یہ بزم صوفیہ کے نام سے دارالمصنفین سے شائع ہوگئی ہے، مگر اسکے محرک ڈاکٹر صاحب ہی تھے، جس کیلیے ان کا ابتک شکرگذار ہوں، وہ حسب معمول بڑی شفقت سے ملے، اس مرتبہ انکو بہت ضعیف پایا، پھر بھی کچھ نہ کچھ علمی کام کرتے رہتے ہیں، اپنے ایک تازہ مقالے کی مطبوعہ کاپی دی، جو دہلی کے رسالہ اسٹڈیز ان اسلام میں اطراف الحدیث کے عنوان سے شائع ہوا ہے، شام کو جناب احمد سعید صاحب کے یہاں ایک دلچسپ صحبت رہی، وہ اپنے فلیٹ پر بہت ہی سلیقہ سے رہتے ہیں، تقسیم ہند سے پہلے وہ کچھ دنوں دارالمصنفین میں قیام کرچکے تھے، یں انکے والد مرحوم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے دہلی میں برابر ملتا رہا، بلکہ ایک بار انکے یہاں نرولا ہوٹل میں کافی دنوں تک مقیم بھی رہا، اسی لیے ہم دونوں عزیزانہ طور پر ملے، اس نشست میں زیادہ تر انکے والد مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کے گہرے تعلقات کا ذکر رہا، کچھ رات گذرے اپنے کمرہ میں پہنچا تو مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی اور حسن زماں صاحب وہاں موجود تھے، مولانا معصومی بارہ بجے رات تک دینی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے جس سے متاثر ہوا، حسن زماں صاحب کلکتہ کے ایک مخلص اور علم دوست نوجوان ہیں، انکے گھر میں بنگالی اور اردو دونوں بولی جاتی ہے، مگر انکو ہندوستان کے تمام اہل علم اور اسی کے ساتھ ہندوستان کی تمام خانقاہوں سے گہری دلچسپی ہے، دوسری صبح کو ڈھاکہ جانا تھی، جناب عبدالمجید صاحب، خواجہ محمد یوسف صاحب اور جناب احمد سعید صاحب ساتھ اسٹیشن چلے، اسی صبح کو احمد سعید صاحب نے اپنا سفرنامہ حج "اللہ کے گھر میں" پڑھنے کو دیا، اور جب گاڑی چلنے کو تھی تو ایک صاحب حسن زماں صاحب کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئے، انکے ہاتھ میں بزم صوفیہ تھی، تصنیف کے ساتھ شاید اسکے مصنف کو دیکھنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنا ایک چھوٹا سا کتابچہ بھی جلدی سے میرے ہاتھ میں دیا، اسکا نام "مان" تھا" اسی میں انکا نام حسین وارثی سہسرامی صاحب پڑھا، گاڑی چلی تو "اللہ کے گھر میں" پڑھنا شروع کیا جو اس قدر دلچسپ اور پرتاثیر تھی کہ دن بھر کا سفر اسی کو لطف ولذت سے پڑھنے میں گزر گیا، مرتب کی گہری مذہبیت سے متاثر ہوکر دل سے ان کے لیے دعائیں نکلیں،

مطبوعات جدیدہ

قد ابوالکلام مرتبہ ڈاکٹر رضی الدین احمد صاحب صدر شعبہ اردو، عربی و فارسی، سری
ونکٹیشورا یونیورسٹی، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت غنیمت صفحات ۱۱۱۵ مجلد
قیمت درج نہیں، شائع کردہ رجسٹرار سری ونکٹیشورا یونیورسٹی، ترو پتی (آندھرا)

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم پر ابتک جو کتابیں لکھی گئی ہیں زیر نظر کتاب ان سب میں
دہ ضخیم ہے، اور بقول ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم "یہ تصنیف کہنے کو "نقد ابوالکلام" ہے لیکن حقیقتاً
وکے انانیتی ادب کا تفصیلی اور تقابلی مطالعہ ہے"، یہ چھ ابواب میں منقسم ہے، پہلے باب میں انانیت
حقیقت و ماہیت اور اس کے خط و خال اجاگر کئے گئے ہیں، اور آخری باب میں مولانا کے
د تصورات کا جائزہ لیکر انانیتی ادب کے بارہ میں ان کی جدت و انفرادیت اور امتیازی
ت و خصوصیات دکھائے گئے ہیں، درمیان کے چار ابواب میں بالترتیب میر، غالب، سرسید
خاں اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کے انانیتی رجحانات و میلانات کا ذکر کرکے ان سے مولانا
نیت کا مقابلہ و موازنہ کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب گویا اردو کے انانیتی ادب کی تاریخ
س کا مفصل تجزیہ ہے، اور اس میں تنہا مولانا ہی کے کارنامے اور انانیتی رجحانات بیان
پہ اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اردو کے مذکورۂ بالا چاروں مشاہیر کے علاوہ اردو اساطین
ادب کے انانیتی میلان و نقطۂ نظر پر بھی سیر حاصل بحث و تبصرہ کیا گیا ہے، ابھی تک

اردو کے انانیتی ادب کے بارہ میں اس قدر مفصل اور پُر از معلومات کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، لائق مصنف نے اردو کے علاوہ انگریزی اور دوسری زبانوں کے ادیبوں اور مبصروں کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے، اس لئے یہ بڑی قابل قدر اور ضخیم ہونے کے باوجود دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب ہے، لیکن غالبؔ و ابوالکلام کے تقابلی مطالعہ کے ضمن میں مولانا کی انانیت کی برتری دکھاتے وقت دونوں کے عہد کے فرق کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، جبکہ سرسید اور مولانا کے موازنہ میں مولانا کے ترجیحی پلڑے کو عہد کے فرق کا نتیجہ بتایا گیا ہے، سرسید اور مولانا کے موازنہ کے باب میں "تفریق ملت اور تقسیم انسانیت" کے زیر عنوان سرسید مرحوم کی جو تحریریں نقل کی گئی ہیں، ان میں مسلمانوں کے فقہی و فروعی اختلافات کا ماتم ہے، حالانکہ مولانا نے بھی مختلف مذاہب کے تفرقے کا تذکرہ کیا ہے، اسی طرح سرسید نے "وحدت دین" کے پہلو کو صرف نمایاں کیا ہے، لیکن مولانا "وحدت ادیان" کے داعی معلوم ہوتے ہیں، ظاہر ہے ان دونوں کی نوعیت میں بڑا فرق ہے، مولانا کی طرح سرسید کو بھی "متحدہ قومیت" کا حامی ثابت کرنا زبردستی کی بات ہے، اور ان کی تفسیر کو مولانا کی تفسیر کا اصل ماخذ ثابت کرنا بھی زبردستی ہے، دونوں کی آزادی فکر اور عقلیت کے سلسلہ میں مصنف کے قلم سے بعض اور غیر معتدل باتیں بھی نکل گئی ہیں ص۵۲ پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ترجمۂ قرآن کی وجہ سے ان کے پیچھے آنا سے نے کی بے سروپا روایت بھی درج ہے، مولانا کی اصول پسندی اور شان بے نیازی کو ان کی عظمت کے بجائے سلبیت پر محمول کرنا تعجب انگیز ہے، اس قسم کی اور بھی بعض باتیں کھٹکتی ہیں، لیکن ان سے کتاب کی قدر و قیمت اور مصنف کی محنت و کاوش میں فرق نہیں آتا، انھوں نے اس کو بڑے اعتماد و جرأت کے ساتھ لکھا ہے، اور اس سے ان کی ادبی بصیرت اور تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے،

مجلہ علوم الدین مرتبہ مولانا مفتی محمد رضا انصاری صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ

صفحات ۹۰، قیمت درج نہیں، پتہ فیکلٹی آف تھیالوجی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی دوسری فیکلٹیوں کی طرح فیکلٹی آف تھیالوجی نے بھی اب پہلی دفعہ اپنا مجلّہ شائع کیا ہے، اس کی ترتیب وادارت کی ذمہ داری فیکلٹی سے وابستہ ایک باذوق صاحب علم وقلم مولانا محمد رضا انصاری فرنگی محلی کے حصہ میں آئی، جو حق بحقدار رسید کے مصداق ہے، اُن کا نام ہی مجلّہ کی خوبی کی ضمانت ہے، یہ مجلّہ نو بلند پایہ دینی، علمی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے، یہ سب مضامین انہی لوگوں کے قلم کے ہیں، جو فیکلٹی سے متعلق ہیں، یا پہلے متعلق رہے ہیں، یوں تو سب ہی مضامین فیکلٹی کے معیار و مرتبہ کے شایانِ شان عالمانہ و محققانہ ہیں، لیکن فاضل مرتب کا مضمون "مولانا عبدالحی فرنگی محلی، اور اُن کی تاریخی خدمات" خاص طور پر قابلِ ذکر اور پُرمغز ہے، انھوں نے غالبًا پہلی مرتبہ فنِ رجال و تاریخ میں مولانا کی خدمات کا اس قدر مفصل جائزہ لیا ہے، ناسخ ومنسوخ (ڈاکٹر قاری رضوان اللہ) چوتھی صدی ہجری کی ایک عظیم عہد ساز علمی و دینی شخصیت (ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن کامنوری) بھی مفید مضامین ہیں "کچھ یادیں" (پروفیسر حمید اللہ خاں) نہایت دلچسپ اور شگفتہ و برجستہ مضمون ہے، لائق مرتب نے افتتاحیہ میں فیکلٹی کی گذشتہ خدمات اور موجودہ کارگذاری کی مفصل روداد بھی سنائی ہے جو دلچسپ بھی ہے، اور اس سے فیکلٹی کے متعلق مفید اور ضروری معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں، شروع میں ملّا نظام الدین محمد سہالوی بانی درس نظامی کے دو اصل خطوط کے عکس درج ہیں، گو فیکلٹی کا یہ پہلا نمبر ہے، مگر مضامین کے تنوع، معیار، ترتیب کے سلیقہ اور طباعت کی نفاست وغیرہ کے اعتبار سے بہت خوب ہے، اس کی اشاعت پر لائق مرتب اور فیکلٹی دونوں تحسین کے مستحق ہیں،

"ض"

مکتبۂ دارالمصنفین

سیرۃ النبی، سیر الصحابہ وسیر تابعین وتبع تابعین، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، سوانح، ادبی و فلسفیانہ کتابوں اور مولانا شبلی کے مقالات کے مستقل سلسلوں کے علاوہ جو بیحد مقبول ہیں اور جن میں سے ہر ایک کے اب تک کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں مختلف موضوع پر اور بھی بہت سی کتابیں دارالمصنفین نے شائع کی ہیں جن کی مجمل فہرست یہ ہے:۔

تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ محمد الخضری مرحوم کا دلنشین ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات بتفصیل بیان کی گئی ہیں۔ ۴۹۰ صفحے قیمت ۸ روپے

اسلام کا سیاسی نظام: اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اٹھارہ ابواب کے تحت اسلامی دستور کے تقریباً تمام اصولی اور سیاسی پہلو آگئے ہیں، ۳۰۰ صفحے قیمت ۶۔۰۰ روپے

حکمائے اسلام (حصہ اول) پانچویں صدی ہجری تک کے تمام مشہور حکما و فلاسفہ کے سوانح و حالات اور ان کے علمی و فکری کارنامے، ۴۰۵ صفحے، قیمت ۸

حکمائے اسلام (حصہ دوم) متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات اور ان کی علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل، ۳۵۱ صفحے قیمت ۷۔۰۰

طبقات الامم: اندلس کے نامور فاضل صاعد اندلسی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ، ۱۵۰ صفحے قیمت ۳

انقلاب الامم ڈاکٹر لیبان کی کتاب کے عربی ترجمہ سر تطور الامم کا ادیبانہ و انشاپردازانہ ترجمہ؛

۱۸۸ صفحے، قیمت: ۴۔۰۰

ارض القرآن (حصہ اول) سرزمین قرآن یعنی عرب کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام و ملل و قبائل کا ذکر ہے، ان کی تاریخی و اثری تحقیق ۳۲۰ صفحے قیمت ۶۔۲۵

ارض القرآن (حصہ دوم) بنو ابراہیم کی تاریخ اور عربوں کے قبل از اسلام، تجارت، زبان و مذہب پر تحقیقات و مباحث، ۲۳۸ صفحے، قیمت: ۴۔۲۵

خطبات مدراس مولانا سید سلیمان ندوی کے سیرت نبوی سے متعلق خطبات کا مجموعہ، جس میں دارالمصنفین کے سلسلۂ سیرۃ النبی کا پورا خلاصہ اور حیات نبوی کے تمام پہلو آگئے ہیں، ۲۰۰ صفحے قیمت ۴۔۰۰

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڑھ)

رجسٹرڈ نمبر ال [illegible]

دسمبر ۱۹۶۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ اقبال احمد)

جلد ۱۱۰ - ماہ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۲ء - عدد ۶

مضامین

شذرات

اہل اللہ کی زندگی کا کوئی لمحہ عبادت و ریاضت، ذکر و فکر اور ارشاد و ہدایت سے خالی نہیں ہوتا، ان کا ہر عمل عبادت ہوتا ہے، لیکن رمضان المبارک جو نزول برکات کا خاص مہینہ ہے، ان کے لیے موسم بہار ہوتا ہے جس میں عبادت و ریاضت اور ارشاد و ہدایت کا سرچشمہ پورے جوش سے ابلتا ہے، اسلیے متوسلین اور سالکین طریقت اس مہینہ میں خصوصیت کے ساتھ استفادہ کے لیے جمع ہوتے ہیں، ماضی قریب میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خانقاہیں اس کا نمونہ تھیں جن سے پرانے بزرگوں کی یاد تازہ ہوتی تھی، اب اس زمانہ میں یہ سنت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کی ذات سے قائم ہے، رمضان المبارک میں حضرت شیخ پورے مہینہ کا اعتکاف فرماتے ہیں، اور متوسلین و طالبین پورے ہندوستان بلکہ بیرون ہند سے بھی حصول فیض کے لیے جمع ہوتے ہیں، اور دار جدید کی وسیع مسجد ذکر و فکر اور ارشاد و ہدایت کا مرکز بن جاتی ہے، جس سے مسجد اور صفۂ نبویؐ کی تصویر نظر آجاتی ہے۔

راقم کو کئی سال سے اس مبارک موقع پر حاضری کی تمنا تھی، جو الحمد للہ گذشتہ رمضان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی رفاقت میں پوری ہوئی، ۱۹ رمضان کو حاضری ہوئی تھی اور ۲۰ کو واپسی، اس وقفہ میں آنکھوں نے جو دیکھا اور دل نے جو محسوس کیا، اس کا تعلق صرف مشاہدہ سے ہے، قلم اس کے بیان سے قاصر ہے، اس وقت چار سو کے قریب مجمع تھا، اور آخر عشرہ میں آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، یہ سب مسجد اور اسکے صحن کے شامیانہ میں مقیم اور بہت سے معتکف بھی تھے،

ان کا سارا وقت ذکر و فکر، نوافل و تلاوت قرآن میں گذرتا تھا، دن میں وعظ بھی ہوتا، اور رات کو ذکر و فکر کی مجلس ہوتی تھی، اور ترغیب و ترہیب کی کتابیں پڑھی جاتی تھیں، درود خوانی بھی ہوتی تھی، غرض رات دن کا بڑا حصہ انہی پاکیزہ مشاغل میں گذرتا تھا، اور ہر شخص اپنے ذوق و طلب کے مطابق فیض پاتا تھا، ان سارے مہمانوں کی میزبانی حضرت شیخ کی طرف سے ہوتی ہے، اور افطار، کھانے اور سحری کا اتنا اہتمام ہوتا ہے کہ بہتیرے گھرانوں میں بھی نہیں ہو سکتا، اس دور میں اس کی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔

پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی ناگہانی وفات علمی و ادبی دنیا کا بڑا سانحہ ہے، مرحوم اس دور کے چوٹی کے ادیبوں اور نقادوں میں تھے، ترقی پسند ادب کے تو معلم و رہنما تھے، اس دور کے نوجوان ادیبوں کی پوری نسل ان سے متاثر ہوئی، جدید ادب کے ساتھ قدیم ادبیات پر بھی انکی نظر بڑی گہری اور مبصرانہ تھی، اور وہ اس کی اچھی روایات کے بھی قدرشناس تھے، لسانیات سے بھی واقف تھے، انھوں نے سیکڑوں ادبی و تنقیدی مضامین اور بعض مستقل کتابیں لکھیں، اگرچہ وہ ترقی پسندوں کے امام تھے لیکن ان کے خیالات میں بڑا اعتدال و توازن اور زبان و قلم دونوں میں بڑی شائستگی تھی، اسلیے جدید کے ساتھ قدیم طبقہ میں بھی ان کی بڑی قدر تھی، وہ ابتدا میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لکچرر مقرر ہوئے اور تقریباً ۱۵-۱۶ سال اس عہدہ پر رہے، پھر الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ہو گئے تھے، اردو کی تمام اہم مجالس کے ممتاز رکن تھے، کوئی اہم ادبی اجتماع ان کے بغیر کامیاب نہ سمجھا جاتا تھا، انھوں نے مختلف حیثیتوں سے اردو کی بڑی قیمتی خدمات انجام دیں اور ہر محاذ پر اردو کے مخالفین کا مقابلہ کیا۔

ان علمی کمالات کے ساتھ وہ طبعاً بڑے متین، سنجیدہ، شریف اور وضعدار تھے، ان کے علم سے زیادہ ان کے اخلاق و شرافت کا اثر پڑتا تھا، دارالمصنفین سے ان کو دوہرا تعلق تھا، ایک علمی و ادبی، دوسرا وطنی، ما ہل ضلع عظم گڈھ ان کا وطن تھا، ہائی اسکول تک ان کی تعلیم بھی اعظم گڈھ میں ہوئی تھی، اسی زمانہ سے ان کو دارالمصنفین سے تعلق تھا، جو ہر زمانہ میں یکساں قائم رہا، جب تک وہ لکھنؤ میں رہے، اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، الہ آباد جانے کے بعد کبھی ہندوستانی اکیڈمی کے جلسہ میں اور کبھی اردو کی دوسری مجالس میں ملاقات ہو جاتی تھی، جب ملاقات ہوتی تو اپنی طالب علمی کے زمانہ کے دارالمصنفین کے تمام لوگوں کو فرداً فرداً پوچھتے، اپنے اعظم گڈھ کے شاگردوں کو دارالمصنفین سے استفادہ کی برابر تاکید کرتے رہتے، اور ہر مرتبہ آنے کا وعدہ کرتے جس کے پورے ہونے کی نوبت نہ آئی، ان کی موت سے اردو کا بہت بڑا ستون گر گیا اور تہذیب و شرافت کا ایک نمونہ اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے۔

جامعہ ملیہ دہلی کی زیر تعمیر مسجد کا ذکر ایک مرتبہ آچکا ہے، اصل عمارت قریب قریب مکمل ہو گئی ہے، لیکن ابھی فرش اور پلاسٹر وغیرہ باقی ہے، اس وقت تک چار پانچ لاکھ روپئے صرف ہو چکے ہیں، ابھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی اور ضرورت ہے، یہ مسجد اپنی وسعت، خوبصورتی اور طرز تعمیر کے لحاظ سے دارالسلطنت دہلی کے شایان شان اور جامعہ ملیہ میں اسلام کی سب سے بڑی نشانی ہے، اس لیے اس کی تعمیر میں امداد دینا مذہبی فریضہ ہے، ہم کو امید ہے کہ صاحب ثروت مسلمان اس کار خیر میں پوری مدد دیں گے، ہمارے دوست سعید انصاری صاحب نے جن مخالف حالات میں اس کام کو انجام دیا ہے وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

مقالات

خریطۂ جواہر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

دلی مرحوم کی سرزمین نے ہر صنف میں جیسے جیسے اصحابِ کمال پیدا کیے اسکی مثال ملک کے کسی دوسرے حصہ میں نہیں مل سکتی اور یہ عجیب واقعہ ہے کہ حکومت کے زوال اور دلی کی تباہی کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا، جب پورے ملک میں انقلاب برپا تھا، تیموری حکومت دم توڑ رہی تھی، دلی پر آئے دن مصائب کا نزول ہوتا رہتا تھا۔ اسکی علمی بزم اسی طرح قائم تھی، سیاسی مطلع پر تاریکی چھائی ہوئی تھی، مگر دلی کا آسمان علم و ادب کے ستاروں سے جگمگا رہا تھا، اور اس کی خزاں بھی ہمرنگِ بہار تھی،

اس مختصر مضمون میں ان اصحابِ کمال کے نام گنانے کی بھی گنجایش نہیں ہے، اور نہ ہمارا مقصود ہے، صرف ایک صنف شعر و ادب کے اساطین اشرف علی فغاں، مرزا سودا، میر تقی میر، خواجہ میر درد، میر اثر اور مصحفی وغیرہ اسی دور کی پیداوار ہیں، فارسی شعراء میں میر عبد الجلیل بلگرامی، قزلباش خاں امید، شیخ سعد اللہ گلشن، سراج الدین خاں آرزو، انند رام مخلص اسی دور کی یادگار ہیں، اور یہ سلسلہ بہادر شاہ ظفر تک برابر قائم رہا، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا امام بخش صہبائی، مرزا غالب، مومن اور ذوق کے نام اس کے لیے کافی ہیں،

مرزا مظہر جانجاناں بھی اس عہد کے باکمال بزرگ ہیں، ان کی شخصیت مختلف حیثیتوں سے نہایت ممتاز تھی، وہ ایک طرف صاحب دل صوفی اور طریقۂ نقشبندیہ کے نامور شیخ تھے، دوسری طرف فارسی اور اردو کے نازک خیال شاعر اور شعر و ادب کے دیدہ ور نقاد تھے، تمام تذکرہ نویس ان کی سخنوری اور سخن سنجی پر متفق ہیں، اردو زبان اور شاعری کی اصلاح میں ان کا نمایاں حصہ ہے، انہوں نے ایہام گوئی کا پرانا طرز چھوڑ کر اردو شاعری کو سیدھے راستہ پر لگایا، قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں:-

اول کسے کہ طرز ایہام گوئی را ترک کردہ ریختہ در زبان اردوئے معلی شاہ جہان آباد کہ فی الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروج ساختہ

مصحفی لکھتے ہیں :-

فی الحقیقۃ نقاش اول زبان ریختہ باعتقاد فقیر مرزا ست وپس بدیگران رسیدہ

مولانا محمد حسین آزاد کو بھی جنھوں نے بادل ناخواستہ آبحیات میں مرزا صاحب کو جگہ دی ہے، یہ اعتراف کرنا پڑا

لطافت مزاج و نزاکت طبع کا نتیجہ ہے کہ زبان کی طرف توجہ کی اور اسے ایسا تراشا کہ جو شعرا پہلے گذرے ہیں انھیں پیچھے چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کر دیا، اور اہل زبان کو نیا نمونہ تراش کر دیا۔

فارسی شاعری میں بھی اُن کا پایہ بہت اونچا تھا، جو نفاست و لطافت ان کے مزاج میں تھی، وہی نظافت و پاکیزگی ان کے کلام میں بھی ہے، وہ ہندوستان کے اُن فارسی شعراء میں ہیں، جنکا کلام اہل زبان کے کلام کا ہم پایہ ہے، میر تقی میر جیسا سخت گیر نقاد انکو سلیم و کلیم کا ہم پایہ سمجھتا تھا، نکات الشعراء میں لکھتے ہیں:

دیوان مختصر شعر فارسی او (میرزا) بہ نظر فقیر مولف آمدہ است از سلیم و کلیم پایۂ کمی نداد

اگرچہ شعر گفتن دون مرتبہ است لیکن گاہے متوجہ این فن بے حاصل میشود۔"

میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں :

مرزا جامع فقر و فضیلت و سخن گستری است و باقتضائے اسم خود روح الروح معنی پروری نوعروس مقال را مشاطگی ، نوہنش طرز تازہ ، وقصد یر خیال را بتر وستی فکرش حسن بے اندازہ شعلۂ وادیش آتش زن خرمنہا وشوخی اندازش شور افگن انجمنہا

فارسی شاعری ایک زمانہ تک گل وبلبل اور ہجر و وصال کا افسانہ رہی اس میں تصوف نے جان پیدا کی ، مولانا شبلی لکھتے ہیں :

فارسی شاعری اس وقت تک قالب بیجان رہی جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہ ہوا ۔ شاعری اصل میں اظہار جذبات کا نام ہے ، تصوف سے پہلے جذبات کا سرے سے وجود ہی نہ تھا ، قصیدہ مداحی وخوشامد کا نام تھا ، مثنوی واقعہ نگاری تھی ، غزل زبانی باتیں تھیں ، تصوف کا اصل مایۂ خمیر عشق حقیقی ہے ، جو سرتا پا جذبہ و جوش ہے ، عشق حقیقی کی بدولت مجازی کی بھی قدر ہوئی اور اس آگ نے تمام سینہ و دل گرما دیئے۔"

سلطان ابوسعید ابوالخیر ، حکیم سنائی ، خواجہ فرید الدین عطار ، عراقی ، مغربی جامی اور خسرو وغیرہ کے کلام میں اسی شراب کی مستی اور اسی طور کی تجلیاں ہیں ،

مرزا مظہر جانجاناں تنہا شاعر نہیں بلکہ صاحب دل شیخ بھی تھے ، اس لیے ان کے کلام میں بھی اس کے شرارے نظر آتے ہیں ، ہمارا اصل مقصد انکے فارسی شعراء کے انتخاب خریطۂ جواہر پر تبصرہ کرنا ہے ، مگر اس سے پہلے ان کے کلام پر مختصر تبصرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے ، انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب خریطۂ جواہر میں بھی دیا ہے ، اور میر غلام علی آزاد بلگرامی کی فرمائش پر انکو

بھی بھیجا تھا، جسے انھوں نے سروآزاد میں نقل کیا ہے، ان ہی دونوں سے اس کے کچھ نمونے نقل کیے جاتے ہیں، جس سے انکے مرتبۂ شاعری کا اندازہ ہوگا،

مرزا کی نفاست طبع اور نزاکت مزاج دیوانگی کے عالم میں بھی قائم رہتی ہے، چنانچہ وہ چاہتے ہیں کہ دیوانگی میں ان کو پتھر مارنے کے بجائے شیشہ کے صاف و شفاف ٹکڑوں سے مارا جائے،

بجائے سنگ طفلان پارہائے شیشہ باید زد ۔۔۔ چو مظہر مرزا دیوانۂ نازک طبیعت را

معشوق کی شوخی کے وفور کو اس شوخ انداز میں بیان کرتے ہیں،

زصد جا چاک سازد جامہ را اندامش از شوخی ۔۔۔ چوں آں صہبائے پر زورے کہ در مینائی گنجد

اسکی شوخی و شرارت سے اس کا بدن اس کے لباس کو تار تار کر دیتا ہے، جس طرح تیز و تند شراب مینا میں نہیں سماتی، اس پر اردو کا ایک شعر یاد آگیا،

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی ۔۔۔ تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی

جاں دادہ اند بسکہ غریباں دریں دیار ۔۔۔ یک سنگ راہ نیست کہ لوح مزار نیست

یعنی دیار محبت میں اتنے لوگوں نے جانیں دی ہیں کہ اس راہ کا ہر پتھر لوح مزار بن گیا ہے،

ہزار عمر فدائے دمے کہ من از شوق ۔۔۔ بخاک و خون طپم و گوئی از برائے من است

اس لمحہ پر ہزاروں عمریں نثار ہیں کہ میں شوق میں خاک و خون میں تڑپ رہا ہوں اور تو کہے کہ یہ میرے لیے ہے،

حیف دردے کہ بخود ننگ مداوا برداشت ۔۔۔ ہر جانے نتواں ناز مسیحا برداشت

وہ درد قابل افسوس ہے جو اپنے لیے مداوا کا ننگ برداشت کرے، ایک جان کیلیے مسیحا کا ناز نہ اٹھانا چاہیے، معشوق کی برہمی کی کتنی پُر لطف تصویر ہے،

پشت پائے بر حنا زد سرمہ را در خاک ریخت از پئے آزار من ناحق در آزار خود است

مہندی کو پیروں سے مسل ڈالا اور سرمہ کو خاک میں ملا دیا، میرے ستانے کے لیے ناحق خود آزار میں مبتلا ہے،

سوز دل از ہر بن مویم نمایاں کردہ اند ایں جفا جویاں مرا سرو چراغاں کردہ اند

ان جفا جو معشوقوں نے میرے ہر بن موسے ایسا سوز دل نمایاں کر دیا ہے کہ اس کی روشنی نے سرو چراغاں بنا دیا ہے،

جز تو در دیدہ من کس نگذارد قدمے شہرہ دارد کہ دریں خانہ پری می باشد

جس گھر میں جن اور پری کا سایہ ہوتا ہے اس میں لوگ جاتے ڈرتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھا کر کہتے ہیں کہ میری آنکھ میں تیرے سوا کوئی قدم نہیں رکھتا کیونکہ یہ شہرت ہے کہ اس گھر میں پری رہتی ہے" پری" نے اس شعر میں کتنا لطف پیدا کر دیا ہے،

کتنی عمدہ تشبیہ ہے :-

برنگ غنچہ گر اندک نسیمے باز می گردد اگر حرفے بپرسد باز دل دفتر بروں آید

میرا حال غنچہ کے جیسا ہے کہ جو تھوڑی سی نسیم چلنے سے کھل جاتا ہے، اسی طرح اگر محبوب ذرا بھی حال پوچھتا ہے تو دل پورا دفتر کھول دیتا ہے،

ایک دوسری تشبیہ ملاحظہ ہو :

باایں ضعف از اشارتہائے ابروئے تو در شورم کہ تا ساز ندہ را ناخن بجنبد تار می نالد

جس طرح ساز بجانے والے کے ناخن کی ذرا سی چھیڑ سے تار کا تار بجنے لگتا ہے اسی طرح ضعف و ناتوانی کے باوجود تیرے ابرو کے اشارے سے دل میں شورش پیدا ہو جاتی ہے۔

شب ندانم کہ بفرقم سر پائے زدہ است کز گل زخم سرم بوئے حنا می آید

معلوم نہیں رات میرے سر پر کس نے پاؤں رکھا ہو کہ میرے سر کے زخم سے حنا کی خوشبو آتی ہے،

یہ اشارہ محبوب کی طرف ہے،

نیست خاکِ بیکساں منت کش شمع چراغ خار بر گور غریباں گل فشانی می کند

بےکسوں کی خاکِ مزار شمع اور چراغ کی احسانمند نہیں ہے۔ گور غریباں پر گلفشانی کیلیے

خار کافی ہیں،

کتنا پاکیزہ شعر ہے

چشم ہر گاہ کہ بر روئے تو وا می گردد دستِ فریاد مرا دستِ دعا می گردد

جب میں فریاد کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں اور تیرے چہرہ پر نظر پڑتی ہے تو فریاد کا ہاتھ دستِ دعا

بنجاتا ہے اور فریاد کے بجائے دعا نکلنے لگتی ہے،

کجا صفہائے مژگاں را درونِ دیدہ جا باشد تہی از بوریا ہم خانۂ اہلِ صفا باشد

صفِ مژگاں کو آنکھ کے اندر کہاں جگہ مل سکتی ہے۔ کیونکہ اہلِ صفا کا گھر بوریے سے بھی خالی

ہوتا ہے،

وسعتِ مشرب چہ دنیائے فراخ بودہ است چوں فلک در گردشِ ساغر جہانے یافتم

وسیع المشربی کی دنیا بھی کتنی وسیع ہے جس طرح فلک ایک گردش میں پورا جہان طے کرلیتا

ہے، اسی طرح ساغر کی ایک گردش میں ایک جہان مجھے مل گیا یا نظر سے گذر گیا،

حرفے نہ گفت نامہ برم از زبان یار شرمت نیامد از دلِ امیدوارِ من

یعنی اگر محبوب نے میرے نامۂ شوق کا جواب نہیں دیا تھا تو نامہ بر کو بھی میرے امیدوار دل سے

شرم نہ آئی کہ وہی دل کی تسلی کے لیے محبوب کی زبان سے اپنی طرف سے کچھ کہہ دیتا،

یاد آں ذوق کہ مظہر بدم تیغ کشی سینۂ می سودے و تسکین جگر می کردے

وہ ذوق و شوق بھی کیسا تھا کہ محبوب کی تیغ کشی کے وقت مظہر دل و جگر کی تسکین کیلئے سینہ کو تلوار سے رگڑتا تھا۔

ان اشعار سے مرزا صاحب کے اعلیٰ ذوق اور ان کے مرتبۂ شاعری کا اندازہ ہوگا، وہ جس درجہ کے شاعر تھے، اسی درجہ کے سخن سنج بھی تھے، اس پر انکا انتخاب خریطۂ جواہر شاہد ہے، اس میں انھوں نے فارسی شاعری کے پورے دفتر کا عطر کھینچ دیا ہے، خریطۂ جواہر اُن کتابوں میں ہے جنھوں نے ہندوستان میں فارسی شاعری کا صحیح ذوق پیدا کیا ہے، اب فارسی شعر و ادب کا ذوق ختم ہو رہا ہے، اب تیرے تو خریطۂ جواہر کے نام سے بھی واقف نہ ہوں گے، اس لیے عرصہ سے اس پر تبصرہ کا خیال تھا، جو اب جاکر پورا ہوا، اس میں کئی سو شاعروں کا انتخاب ہے، جو بڑی تقطیع کے اسّی صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، ان سب پر تبصرہ کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، اس لیے اس انتخاب میں راقم کو جو شعر زیادہ پسند آئے گا، ان کو مع ترجمہ پیش کیا جائے گا، اس طرح یہ گویا مرزا صاحب کے انتخاب کا انتخاب ہے۔

فارسی کیا کسی شایستہ زبان کی شاعری کا ایسا ترجمہ ناممکن ہے جس میں اصل کی ساری خوبیاں قائم رہیں، ترجمہ میں مفہوم تو ایک حد تک ادا ہو جاتا ہے لیکن اصل زبان کے الفاظ اور ترکیبوں کی خوبی و لطافت سے جو حسن پیدا ہوتا ہے، اس کو ترجمہ میں منتقل نہیں کیا جاسکتا، فارسی جیسی نازک اور لطیف زبان کی خوبیوں، پھر ایرانی شعراء کی نازک خیالی کو ترجمہ میں قائم رکھنا تو اور بھی دشوار ہے۔ ترجمہ سے صرف شعر کے مفہوم کی طرف رہبری ہوتی ہے، پورا لطف و لذت اصل ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اس ترجمہ کی حیثیت بھی یہی ہے۔

انوری بخاری: شاید کہ بہ بینم سرِ خود در قدم او خواہم کہ شوم کشتۂ تیغ ستم او

مجھے اس کی تیغ ستم سے اس لیے قتل ہونے کی تمنا ہے کہ شاید اس طرح میرا سر کٹ کر اُنکے قدموں پہ آجائے،

اہلی خراسانی: تابوت من آہستہ زکویش گذرانید چوں نیست امیدم کہ بیایم دگر آنجا

مرا تابوت اس کے کوچہ سے آہستہ آہستہ لے چلنا، کیونکہ دوبارہ یہاں آنے کی امید نہیں۔

بگلگشت چمن سروے ندا وانہ قامتش یادم کہ ہمچوں سایہ بیخود گشتہ در پایش نیفتادم

چمن کی سیر میں جب کسی سرو نے اس سرو قد کی یاد دلائی تو میں بیخود ہو کر سایہ کی طرح اس کے قدموں پر گر پڑا،

اہلی شیرازی: خواہد بخشم و ناز شود کم محبتم غافل کہ ایں کرشمہ محبت فزوں کند

محبوب اس لیے غصہ و ناز کرتا ہے کہ اس سے میری محبت کم ہو جائیگی، مگر وہ شاید اس سے ناواقف ہے کہ یہ کرشمہ محبت اور بڑھا دیتا ہے،

شرمندہ ز آسمان و زمینم کہ بہر تو تا کے بسجدہ افتم و تا کے دعا کنم

ترے لیے اتنے سجدے کیے ہیں اور اتنی مرتبہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہیں کہ اب آسمان و زمین سے شرم آنے لگی ہے۔

بچہ اندیشہ ام از خاطر ناشاد روی چہ بخاطر بگذارم گر تو از یاد روی

تو کس خیال سے میرے دل سے نکل جانا چاہتا ہے، جب تیری یاد ہی نکل جائے گی تو پھر دل میں رہنے کے لیے کیا رہ جائے گا۔

مولانا آہی: خوش آں مجلس کہ آنجا تو بخود چوں کنم ظاہر مرا ساقی گریباں گیرد و مے در گلو ریزد

وہ مجلس بھی کیا خوب ہے کہ جب میں وہاں تو بہ ظاہر کروں تو ساقی میرا گریبان پکڑ کر مرے منہ میں شراب انڈیل دے۔

میرابوالحسن فرہانی: نگویم حال دل از حال من گو بے خبر باشد ٭ بہ بیدرداں بیان درد دل درد دگر باشد

جو شخص میری حالت سے بے خبر ہوتا ہے اس سے میں اپنا حال دل نہیں بیان کرتا، ایسے بیدردوں سے درد دل بیان کرنا ایک دوسرا درد سر ہے۔

شیخ ابوالقاسم: بر لوح دل چو تختۂ تعلیم کودکاں ہر حرف آرزو کہ نوشتم خراب شد

دل کی لوح پر بچوں کی تعلیم کی تختی کی طرح جو حرف آرزو لکھا وہ خراب گیا، بچوں کی اکثر تحریریں خراب ہو جاتی ہیں، یعنی کوئی آرزو برنہ آئی۔

ز معجزہائے عشقت اینکہ شبہا در سر کویش نگاہ بام و در را لذت دیدار می باشد

ترے عشق کا یہ معجزہ ہے کہ راتوں کو اس کے کوچے کے در و بام میں لذت دیدار پیدا ہو جاتی ہے یا اس کے بام و در کو دیکھنے میں بھی لذت ملتی ہے۔

خواجہ آصفی:۔ تو ہم در آئینہ حیران حسن خویشتنی زمانہ ایست کہ ہر کس بخود گرفتار است

تو آئینہ دیکھکر اپنے حسن پر آپ حیران ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، زمانہ میں ہر شخص اپنے حال میں مبتلا ہے

طالب آملی: بسوئے خویشتن از لطف گستاخانہ کش دستم کہ من بسیار محجوبم ہم آغوشی نمیدانم

ایک ناتجربہ کار عاشق التجا کرتا ہے کہ تو پیار سے بے حجابانہ میرا ہاتھ اپنی طرف کھینچ لے، میں بہت شرمندہ ہوں کہ ہم آغوشی کا طریقہ نہیں جانتا،

اس پر مولانا شبلی کا مشہور شوخ شعر یاد آگیا

من فدائے بت شوخے کہ بہنگام وصال بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را

میں اس شوخ بت پر فدا ہوں کہ جس نے وصال کے وقت مجھکو خود ہم آغوشی کا طریقہ سکھایا،

ز انگشتم شمیم غنچۂ فردوس می آید نمیدانم سحر بند گریبان کہ واکردم

معلوم نہیں صبح کو میں نے کس کا بند گریباں کھولا تھا کہ میری انگلیوں سے غنچۂ و گل کی خوشبو آتی ہے۔

چو در خوابم در آئی بخت بد از بہر محرومی — مرا بیدار می سازد کہ یار آمد چہ خوابست این

جب تو کبھی خواب میں نظر آتا ہے تو بخت بد اس کے لطف و لذت سے محروم کرنے کے لیے یہ کہہ کر بیدار کر دیتا ہے کہ محبوب آگیا ہے، یہ کون سونے کا وقت ہے یعنی بدبختی سے ایسے وقت میں آنکھ کھل جاتی ہے۔

بدشنام دگر امید وارم — چہ خواہی عذر دشنام گذشتہ

تو گذشتہ دشنام کی معذرت کیوں کر رہا ہے۔ میں تو دوسری دشنام کا امیدوار ہوں۔

اے جنس وفا چوں تو متاع بجہان ست — عیب تو ہمین است کہ در کشور ما ئی

وفا سے خطاب کر کے کہتے ہیں کہ تیری جیسی بے بہا متاع دنیا میں نہیں ہے، اس کے باوجود تیری ناقدری کی وجہ یا تیرا عیب صرف یہ ہے کہ مجھ میں ہے، اس لیے کوئی قدر نہیں۔

امیس شاملو:۔ قاصد ادائے نامہ تواند نہ عرض شوق — حیف از زباں کہ بال کبوتر نمی شود

قاصد میں نہ تو نامہ پہنچانے کی صلاحیت ہے اور نہ عرض شوق کی، وہ زبان بھی کیا زبان ہے جو کبوتر کے پر کا کام بھی نہیں دے سکتی (کہ وہ نامۂ شوق تو پہنچا دیتا ہے)

رضا نظام:۔ لذت از تیغ او دارم کہ چاک سینہ ام — چوں خمار آلودہ نتواند لب از خمیازہ بست

اس کی تلوار کے زخم میں اتنی لذت ہے کہ جس طرح خمار آلودہ جمائی سے منہ بند نہیں کر سکتا اسی طرح میرے سینے کے زخم کا منہ بند نہیں ہوتا۔ ذوق لذت میں ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

یلم الٰہی شیخ الزماں:۔ راز نہانِ محمل او می تواں شنید — افغاں کہ با زبان جرس آشنا نیم

اس کی محمل کے راز نہاں کو سنا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ میں خود زبان جرس سے واقف ہوں۔

اس شعر پر فارسی کا یہ مشہور شعر یاد آگیا۔

کس ندانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست   ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

کسی کو بھی اصل منزل مقصود کی خبر نہیں، بس اتنا ہے کہ جرس کی آواز سنائی دیتی ہے،

امانی مجفی :۔ فرصتم کے شد کہ آیم دامن وصلش بکف   از گریباں دست اگر برداشتم بر سر زدم

مجھکو اس کا دامنِ وصل پکڑنے کی فرصت کہاں ملی جب گریبان ہاتھ سے چھوڑتا تھا تو سر پیٹتا تھا۔

مرزا مخدوم اشرف :۔ خدارا یک زماں بردار از رخ پردہ آں لیلیٰ   کہ ناصح بر ملامت می کند مجنون شیدا را

لیلیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ناصح مجھ مجنون کو ملامت کرتا رہتا ہے، ذرا اپنے رخ سے پردہ ہٹا دے کہ اس کو بھی تیرے حسن کا اندازہ ہو جائے،

اردو کا مشہور شعر ہے،

دکھاؤں گا تجھے ناصح اس آفتِ جاں کو   خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

اوجی نظری :۔ گر بیخود آمدیم بکوئے تو دور نیست   فرصت نیافتیم کہ خود را خبر کنم

اگر میں تیری گلی میں بیخود آیا تو تعجب کی بات نہیں ہے، مجھکو اس کی فرصت ہی نہیں ملی کہ اپنے کو ہشیار کر سکوں،

مرزا ابوالحسن شیرازی :۔ خوش آنکہ در قدمت رو دہد شہادتِ من   نشان پائے تو گردد نشانِ تربت من

کیا اچھا ہوتا کہ تیرے قدموں میں میری شہادت ہوتی اور تیرے قدم کا نشان میری تربت کا نشان بنتا،

مرزا قزوینی :۔ بتمکینے غمش در دل نشستہ   کہ گر وصل آید از بر نہ خیزد

اس کا غم دل میں ایسا جم کر بیٹھا ہے کہ اگر وصل بھی آجائے تو اپنی جگہ سے نہیں اٹھ سکتا یعنی وصل بھی غم محبت کو دور نہیں کر سکتا،

مرزا اسیر رازی:۔ قاصد رقیب بود و من غافل از فریب بیدرد مدعائے خود اندر میانہ ساخت

قاصد در اصل رقیب اور میں اس کے فریب سے غافل تھا، اس لیے اس نے میرے اور محبوب کے نامہ و پیام میں اپنا مقصد شامل کر دیا یا اپنا کام بنالیا،

عنایت خان آشنا:۔ یکبار آستان تو بوسہ دادہ ایم با ما ہنوز دشمنی آسماں بجا است

اس جرم میں کہ میں نے ایک مرتبہ تیرے آستانہ کو بوسہ دیا تھا، میرے ساتھ اب تک آسمان کی دشمنی قائم ہے،

شفیعائی اثر: اکنوں کہ گفتہ لطف بہت بامنش اے روزگار فرصتے اے مرگ مہلتے

اب جبکہ تو نے یہ خوشخبری سنائی ہے کہ مجھ پر نظر توجہ ہے تو اے زمانہ اور اے موت اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تھوڑی سی مہلت دیدے۔

شیخ آذری: ز ہول روز حساب آذری چرا ترسی تو کیستی کہ در آں روز در حساب آئی

آذری تو روز حساب کے ہول سے کیوں خوف زدہ ہے، تیری کیا حقیقت ہے کہ اس دن تیرا بھی حساب کیا جائیگا اور تو بھی کسی شمار میں آئے گا،

ابوالفرج رونی: درست گشت کہ جان منی بایں معنی کہ تا ز من بہ گستی بمن ز پیوستی

اس معنی میں تجھکو میری جان کہنا صحیح ہے کہ جس طرح جان چلی جانے کے بعد پھر نہیں لوٹتی، اسی طرح تو جب سے مجھ سے الگ ہوا ہے پھر نہیں ملا۔

میر عقیل بزمی: رحم است برآں بلبل شوریدہ کہ گل را بیند کہ بچینند و بہ بازار فروشند

اس شوریدہ بلبل کی حالت قابل رحم ہے جو یہ دیکھتی ہے کہ (اس کے محبوب) پھول کو توڑ کر بازار میں بیچتے ہیں۔

عبدالسلام بیانی: بیم از وفادار یدہ وعدۂ کرمے از ذوق ایں نوید بغرد انمی رسم

ایفائے وعدہ کا خوف نہ کر وعدہ کرلے، اس لیے کہ اس خوشخبری کو سنکر میں کل تک زندہ ہی نہ رہوں گا کہ تجھ کو وعدہ وفا کرنے کی زحمت اٹھانا پڑے۔

ملا باقر کاشانی: مدعی گر برد پیش محتسب مستم چہ باک آہ اگر ہشیار پیش میفروش آرد مرا

اگر حریف مجھکو مستی کی حالت میں محتسب کے پاس لیجاتا ہے تو کچھ پروا نہیں، البتہ اگر ہشیاری کی حالت میں مے فروش کے پاس لیجاتا تو باعث شرم ہوتا۔

یارب آں سوز فگن در دلِ دیوانۂ ما کہ کلیم آید و آتش برد از سینۂ ما

خدایا میرے دل میں وہ سوز پیدا کر دے کہ موسیٰ کلیم اللہ (جو آگ کی تلاش میں طور کی طرف گئے تھے) آکر میرے سینہ سے آگ لیجائیں۔

باقر گمانِ مہر و وفا داشتی بیار ایں جور ہا سزائے دلِ بدگمان تست

باقر تجھکو محبوب سے مہر و وفا کی امید تھی، اس کا ظلم و جور دل کی اسی بدگمانی کی سزا ہے۔

زاں سو نہ رنجشے نہ ازیں سو شکایتے خوں باد دل کہ صد سخن اندر میانہ ساخت

کسی سے کوئی رنجش اور شکوہ و شکایت نہیں، خدا دل کو غارت کرے، اسی نے ساری باتیں پیدا کیں

دانم کہ سراپائے وجودم ہمہ درد است داغ تو ندانم کہ کجا ہست کجا نیست

میرا پورا وجود سراپا درد بن گیا ہے، مجھے اس کا بھی پتہ نہیں کہ تیرا داغ کہاں ہے کہاں نہیں ہے

از بسکہ بہر دام فنا دیم و رمیدیم در دست کسے نیست کہ مشت پر مانیست

میں ہر دام میں پھنسکر بچ نکلا اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اسکے ہاتھ میں میرے کچھ پر نہ ہوں،

ہنوز آں سنگدل از ناز با من سرگراں دارد مرا کشتست و منت بر زمین و آسمان دارد

ابتک وہ سنگدل از راہ ناز مجھ سے سرگراں ہے، مجھے قتل کیا ہے اور اس کا احسان زمین و آسمان پر رکھتا ہے

گر نہ شرمندہ ام تا پیش او یک لحظہ بنشینم　　پئے تعظیم تا پیدا شوم از دور برخیزد

اگر میں اس کے پاس ایک لمحہ بیٹھتا ہوں تو مجھے شرمندہ کرنے کے لیے مجھ کو دور سے دیکھ کر میری تعظیم کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔

فارغ ز شہیدان وفا باش کہ ایشاں　　آں دست ندارند کہ دامان تو گیرند

شہیدان وفا کی طرف سے بالکل بے فکر رہ، ان میں اس کی طاقت ہی نہیں کہ (دادخواہی کے لیے) تیرا دامن پکڑ سکیں۔

ما در خورِ فراغتِ وصل تو نیستم　　مارا برائے خاطر ہجراں نگاہ دار

میں تیرے وصل کے لائق نہیں ہوں، اس لیے مجھ کو ہجر کی خاطر محفوظ رکھ یا رکھ چھوڑ،

دلِ کم حوصلہ بر نیم نگہ قادر نیست　　چشم دارم کہ سراپائے تو نظارہ کنم

میرے پست ہمت دل کا تو حال یہ ہے کہ اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے پر بھی قادر نہیں اور میں تیرے سراپا کے نظارہ کی آرزو رکھتا ہوں،

ترا بر جملہ خوباں برگزید اے وائے چوں سازم　　ز دستِ من نمی آید کہ چشم خویشتن پوشم

میری آنکھ نے سارے حسینوں میں تجھی کو انتخاب کیا ہے، میں کیا کروں، اپنے ہاتھ سے اپنی آنکھ نہیں بند کر سکتا، یعنی اگرچہ یہ مصیبت آنکھ کی لائی ہوئی ہے لیکن میں دیدہ و دانستہ اس کو بند بھی نہیں کر سکتا تھا،

شدہ است از ہر دو جانب کشش طلب بجائے　　کہ تو ہم نمی توانی ز من احتراز کردن

ز من شکستہ عجزے ز سر نیاز مندی　　تو و سنگ دل نگاہے بہزار ناز کردن

دونوں طرف سے ذوق طلب کی ایسی کشش ہے کہ تو بھی مجھ سے دامن نہیں بچا سکتا، اگرچہ مجھ شکستہ دل کی طرف سے از راہ نیاز مندی عجز و فتادگی ہے تو تجھ جیسے سنگ دل کی طرف سے ہزاروں

نازواداکے ساتھ ایک نگاہ ہے، یعنی تو بھی نگاہ ڈالنے پر مجبور ہے۔

حزنی اصفہانی: مرا بر سادہ لوحی ہائے حزنی خندہ می آید   کہ عاشق گشت و چشم مرحمت از یار ہم دارد

مجھے حزنی کی اس سادہ لوحی پر ہنسی آتی ہے کہ محبوب پر عاشق بھی ہے اور اس سے لطف و مرحمت کی امید بھی رکھتا ہے،

درچمن بود زلیخا و بحسرت می گفت   یاد زنداں کہ در انجمن آرائے ہست

زلیخا چمن میں رہ کر بھی حسرت سے کہتی تھی کہ وہ زنداں بھی یاد کے قابل ہے جس میں ایک انجمن آرا (حضرت یوسفؑ) مقیم ہے،

حسن بیگ نعیمی: تسلیش نکند آرزو اگر اینست   ہزار سالہ وصال تو انتظار مرا

اگر آرزو کی شدت کا یہی عالم ہے تو ہزار سالہ وصال بھی میرے انتظار کی تسلی نہیں کر سکتا،

گیرم کہ حرف قاصد با من ہمہ فریب است   این بس کہ دل زمانے امیدوار گردد

میں مانتا ہوں کہ قاصد کی ساری باتیں فریب ہیں مگر اتنا کافی ہے کہ اس سے تھوڑی دیر کے لیے دل کو امید بندھ جاتی ہے،

اگرچہ امشبم از درد ہجراں جاں نمی ماند   بایں شادم کہ بار محنت ہجراں نمی ماند

اگرچہ آج کی رات درد ہجراں سے زندہ نہ بچوں گا لیکن اس سے خوش ہوں کہ اسکے بعد ہجر کی مشقت اٹھانے سے نجات مل جائے گی،

صد بارہ از بزم تو گر رنجہ روم باز آیم   کشش شوق بلائیست کہ من می دانم

اگر سو بار بھی تیری بزم سے رنجیدہ چلا آتا ہوں تو پھر جاتا ہوں، شوق کی کشش ایسی بلا ہے کہ اس کی لذت میں ہی جانتا ہوں۔

مرزا جامی: ز فریب وعدہ امشب نزدیم چشم بر ہم   کہ شبے امید واری درخانہ ہا نباشد

محبوب کے پُر فریب وعدہ سے آج کی رات آنکھ نہیں جھپکائی کیونکہ جس رات کو کسی کے آنے کی امید ہوتی ہے تو گھر کا دروازہ کھلا رہتا ہے،

حضوری قمی: بجرم آنکہ نمودم بذوق روز وصال ۔۔۔ فراق آنچہ بمن می کند سزائے من است

وصال کے دن جو ذوق و شوق میں نے ظاہر کیا ہے، فراق میرے ساتھ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ اسی جرم کی سزا ہے،

خیالی گیلانی: تو وفا با دگران کن کہ من سوختہ دل ۔۔۔ زندہ از بہر ہمینم کہ جفائے تو کشم

تو شوق سے دوسروں کے ساتھ وفا کر، اس لیے کہ میں سوختہ دل تو صرف تیری جفائیں سہنے کے لیے زندہ ہوں۔

حسن شاملو: امشب بہ ہیچ وجہ دلم وا نمی شود ۔۔۔ گویا کہ خاطر کسے از من گرفتہ است

آج کی رات میرا دل کسی عنوان نہیں کھلتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا دل میری طرف سے آزردہ ہے، یہ دل گرفتگی اسی کا نتیجہ ہے۔

بخدا کار چو افتاد خدا ساز شود ۔۔۔ گرہ قطرہ بدریا چو رسد باز شود

جو کام خدا سے پڑتا ہے اس کو وہ خود بنا دیتا ہے، قطرہ کی گرہ سمندر میں پہنچکر خود بخود کھل جاتی ہے۔

اس شعر پر مثنوی کا یہ مشہور شعر یاد آگیا

کار ساز ما بفکر کار ما ۔۔۔ فکر ما در کار ما آزار ما

چو آدمی بجہاں نیست دل بمہر کہ بندم ۔۔۔ کسے ز صفحہ خالی چہ انتخاب کند

جب دنیا میں آدمی ہی کا وجود نہیں تو دل کا تعلق کس سے قائم کروں، کوئی شخص سادہ صفحہ سے کیا انتخاب کر سکتا ہے۔

شیخ علی حزیں: شادم کہ از رقیباں دامن فشاں گذشتی گو مشتِ خاکِ ماہم بر باد رفتہ باشد

میں اس پر خوش ہوں کہ تو رقیبوں سے دامن جھاڑتا گذر گیا خواہ اس میں میری خاک بھی برباد ہو جائے،

امیر خسرو: ما را وداع کرد دل و دین ہر چہ بود الا سر نیاز کہ بر آستاں بماند

اس سر نیاز کے سوا جو کسی کے آستانہ پر جھکا تھا دین و دل سب نے ساتھ چھوڑ دیا، کوئی بھی کام نہ آیا،

بیم تیغم نیست لیکن ایں سرم بحبت را دوست میدارم کہ زیر پائے او بسیار بود

مجھکو اس کی تلوار کا خوف نہیں ہے کہ (سر قلم ہو جائے گا) بلکہ یہ سر اس لیے محبوب ہے کہ اس کے قدم کے نیچے بہت رہ چکا ہے،

بخفت خسروِ مسکیں دریں ہوس شبہا کہ دیدہ بر سرِ پایت نہد بخواب رود

بیچارہ خسرو اس تمنا میں بہت سی راتوں کو نہیں سویا کہ تیرے قدموں پر آنکھ رکھکر سو جائے جو میسر نہ ہوا۔

خسرو است و شب و افسانۂ یار و ہر آں قدرے می گرید پس بر سرِ افسانہ رود

خسرو کا شغل یہ ہے کہ خسرو ہے، رات کا سناٹا ہے اور یار کا افسانہ ہے، وہ تھوڑا سا افسانہ سنا کر روتا ہے اور پھر شروع سے افسانہ شروع کرتا ہے،

کشش کہ عشق دارد نگذارت بدیساں بجنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی

عشق کی کشش تجھے اسی طرح آزاد نہ چھوڑے گی، اگر تو جنازہ پر نہیں تو مزار پر آنے کے لیے مجبور ہو گا،

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

تو نے اپنی قیمت دونوں عالم بتائی ہے، ابھی قیمت اور بڑھا کہ ان داموں میں بہت ستا ہے،

بگفتندش فلاں مرد از غمت گفت نخواہد مرد چوں من جان اُویم

محبوب سے لوگوں نے کہا کہ فلاں تیرے غم میں مرگیا، اس نے جواب دیا کہ جس کی جان میں ہوں وہ کبھی نہیں مرسکتا،

من اشک بیدلاں را خندہ می پنداشتم زینے کنوں برمی دہد تخمے کہ من می کاشتم روزے

میں شکستہ دل عاشقوں کے آنسوؤں کو کبھی ہنسی کھیل سمجھتا تھا، جو بیج میں نے بویا تھا، آج وہ پھل لایا ہے، یعنی میں بھی اسی حال میں مبتلا ہوگیا ہوں۔

کسے نماند کہ او را بہ تیغ ناز کشی مگر زندہ کنی خلق را و باز کشی

تیری تیغ ناز سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا، اب سوا اس کے کوئی قتل کے لیے نہیں مل سکتا کہ ان مقتولوں کو زندہ کرکے دوبارہ قتل کرو،

خصالی کاشی: زبیم غمزہ اش دزدیدہ دروے بنگرم و ترسم چو شخصے کز چمن گل چیند و از باغباں ترسد

میں اس کے غمزہ کے خوف سے اس کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہوں اور ڈرتا رہتا ہوں جس طرح کوئی شخص چمن سے پھول توڑتا ہے، مگر باغبان سے ڈرتا رہتا ہے،

میر حید خصالی: چو طفل مریضم بمہد زمانہ ہر عضوے درد و گفتن ندانم

زمانہ کے گہوارہ میں میں اس بیمار بچے کی طرح ہوں جو اپنی بیماری نہیں بتا سکتا یہی حال میرا ہے کہ ہر عضو میں درد ہے مگر بتانے کی طاقت نہیں،

اس پر اس سے ملتے جلتے ہوئے ہندی اور اردو کے دو شعر یاد آگئے:

من میں راکھوں من جلے کہوں تو کہہ جل جائے گونگے کا سپنا بھیو سمجھ سمجھ پچتائے

دل میں رکھوں تو دل جلے اور منہ سے کہوں تو منہ جل جائے، میرا بھی حال گونگے کے خواب جیسا ہے کہ زبان سے نہیں بتا سکتا اور سوچ سوچ کر کڑھتا ہے،

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

مرزا خلقی: رسید بر سر بالیں بوقتِ نزع یار چراغ زندگیم شام مرگ روشن شد

محبوب میری نزع کے وقت میرے سرہانے آیا، میری زندگی کا چراغ میری موت کی شام کو روشن ہوا،

رکن الدین دعوی: دست من گیر کہ ایں دست ہماں ست کہ من بارہا در غم ہجران تو بر سر زدہ ام

اسی شرم میں میرا ہاتھ پکڑلے کہ یہ وہ ہاتھ ہے جس سے تیرے غم ہجر میں بارہا سر پیٹا ہے،

مرزا دانش: کاش در تاراج گلشن صید گلچیں می شدم پیش ازاں کز آشیاں صیاد بردارد مرا

کاش اس سے پہلے کہ صیاد مجھکو آشیانہ سے نکالے گلشن کی تاراج کے وقت گلچیں کا شکار ہوگیا ہوتا کہ صیاد کو آشیانہ سے محروم کرنے کی نوبت نہ آتی،

جلوہ گاہ خوش خرام ماست خاکِ لالہ زار آں حنائی نقش پائے جابجا افتادہ است

لالہ زار کی سرزمین ہمارے خوش خرام (معشوق) کی جلوہ گاہ ہے۔ یہ لالہ کی سرخی نہیں ہے بلکہ محبوب کے حنائی قدموں کے نشانات ہیں،

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگ محتسب بر سر من آمد و ایں آفت از مینا گذشت

مستوں کو مبارکباد ہو کہ محتسب کا ڈھیلا میرے سر پر پڑا اور مینا کے سر سے یہ آفت ٹل گئی میرا سر ٹوٹ گیا مگر مینا گزند سے محفوظ رہا،

ما بذوقِ گریۂ مستی دریں بزم آمدیم مے بدہ ساقی بقدرِ آنکہ چشمم تر شود

میں گریۂ مستی کے ذوق میں اس بزم میں آیا ہوں اس لیے اتنی شراب تو دے کہ اس سے میری آنکھ تر ہو جائے،

تاک را سیراب سازد ابر نیساں در بہار قطرۂ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

بہار میں ابر نیساں اس لیے انگور کی بیل کو سیراب کرتا ہے کہ جو قطرۂ شراب بن سکتا ہے وہ موتی بنکر کیوں ضائع ہو۔

نمک شناسِ اسیران چو از قفس رستند		ز نخل خانۂ صیاد آشیاں بستند

صیاد کے نمک کے حق شناس جب قفس سے رہا ہوئے تو حق نمک ادا کرنے کے لیے دور نہیں چلے گئے بلکہ صیاد کے گھر کے درخت پر آشیانہ بنایا۔

مباش در پئے مرغ شکستہ پر صیاد		رسد بپائے گل ار گر بآشیاں نرسد

صیاد سے التجا کرتا ہے کہ مرغ شکستہ پر کے درپئے آزار نہ ہو، اس میں اڑنے کی طاقت نہیں، اس لیے آشیانہ تک تو نہیں پہنچ سکتا ہے، شاید رینگتے رینگتے کسی پھول تک پہنچ جائے

آشیانِ چند ہم نگذاشت در ویرانہ ام		خانۂ صیاد آباد اں کہ تقصیرے نکرد

میرے ویرانے میں الو کا آشیانہ بھی باقی نہ چھوڑا، خدا صیاد کا گھر آباد رکھے، اس نے اپنی طرف سے اپنے کام یعنی ویران کرنے میں کوئی کمی نہیں کی،

سخت کوشیہائے صیادم بجاں آوردہ است		در قفس بلبل بگلگشت گلستاں آورد

میرے صیاد کی سنگ دلی نے جان پر بنا دی ہے، ستم یہ ہے کہ وہ قفس میں بلبل کو گلستاں کی سیر کے لیے لاتا ہے، اس طرح اسے اور تڑپاتا ہے،

چساں تنیم کرے را محتسب بر خاک می ریزد		کہ می لرزد دلم برگے کہ از تاک می ریزد

میں محتسب کو شراب زمین پر گراتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہوں جبکہ میرا دل انگور کی پتی گرتے ہوئے دیکھکر لرز جاتا ہے،

گل دمید از شاخ و بر خاکِ گلستاں می طپم		کو پر و بالے کہ جائے آشیاں پیدا کنم

پھول شاخوں پر کھل گئے اور میں گلستاں کی خاک پر لوٹتا ہوں، اب وہ بال و پر کہاں

کہ آشیانہ بنا سکوں۔

ذوقِ دل تنگی بو جدم در قفس آوردہ است   بیخبر پندار د انداز رہائی میکنم

دل تنگی کے ذوق نے مجھکو قفس میں بجو دکر دیا ہے۔ بیخبر صیاد سمجھتا ہے کہ میں نے رہائی کے لیے یہ شکل اختیار کی ہے،

ملا دری قمی: کم از یوسف نئی پیش صبا بکشا گریباں را   کہ در عہد تو ہم یک چشم نابینا شود روشن

تم یوسف سے کم نہیں ہو بادِ صبا کے سامنے گریباں تو کھولو (جس کی بو سونگھ کر) تمھارے زمانہ میں بھی ایک نابینا آنکھ روشن ہو جائے (جس طرح حضرت یوسفؑ کی بو سونگھ کر حضرت یعقوبؑ کی آنکھ روشن ہو گئی تھی)

با شمع بگوئید کہ مردیم ز غیرت   ما طاقتِ سرگوشی پروانہ نداریم

شمع سے کہدو کہ میں غیرت سے مرگیا، مجھ میں شمع سے پروانہ کی سرگوشی دیکھنے کی طاقت نہیں،

میر حیدر معمائی قمی: نمیدانم چہ سازم آہ با جانِ غیور خود   کہ ہر دیدنش می میرد و سویش نمی بیند

آہ اس غیرت مند جان کے ساتھ کیا کروں جو اس کو دیکھنے کے لیے تو مرتی ہے لیکن اس کی طرف آنکھ نہیں اٹھاتی،

عبدالرحیم خانخاناں: بجرم عشق توام می کشند غوغائیست   تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

ایک شور ہے کہ تیرے جرم عشق کی سزا میں مجھے قتل کر رہے ہیں، تو بھی ذرا بام پر آکر دیکھ لے کہ بہت اچھا تماشا ہے،

اعظم خاں: ادائے حق محبت عنایتست ز دوست   وگرنہ عاشق خاطر بہیچ خرسند است

محبت کا پورا حق ادا کرنا دوست کی عنایت و مہربانی ہے، ورنہ بیچارہ عاشق تو ادنیٰ برتاؤ سے بھی خوش ہے،

رباعی: ستارہ ایست دُرِ گوش آں ہلال ابرو زروئے حسن بخورشید می زند پہلو

ہلال جیسے ابرو کے محبوب کے کانوں کا موتی ستارہ کی طرح ہے۔ مگر اپنے حسن و خوبی میں خورشید کی برابری کرتا ہے یا اس کا پہلو دباتا ہے۔

محسن بیگ اشکی: اے کاش بدوزخ بفرستند و نہ پرسند جرمم کہ ندارم سر سودائے قیامت

اے کاش میرا جرم پوچھے بغیر مجھے دوزخ میں بھیج دیں مجھ میں قیامت کا ہنگامہ برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے،

بر رہ تو ہر کہ بینم کُشد ایں غمم کہ مسکیں چہ فریب خوردہ باشد بچہ دل نہادہ باشد

جب میں تیری گلی میں کسی (نو وارد) کو دیکھتا ہوں تو یہ غم مجھے مارے ڈالتا ہے کہ بیچارہ کیسا فریب خوردہ ہے اور کس سے دل لگایا ہے،

اسی مضمون کا فارسی کا ایک اور شعر ہے،

اگر بینم کسے از کوئے او دل شاد می آید فریب کز تو اول خوردہ بودم یاد می آید

جب میں کسی کو اس کے کوچہ سے خوش و مسرور آتا دیکھتا ہوں تو وہ دھوکا جو میں نے پہلی مرتبہ کھایا تھا، یاد آتا ہے،

محمد رشید: شود از دیگراں در خشم و بر من دامن افشاند غبارِ در دل از ہر کس کہ دارد بر من افشاند

وہ غصہ دوسروں سے ہوتا ہے اور اتارتا مجھ پر ہے، دل میں جس سے بھی غبار رکھتا ہو مگر دامن مجھ پر جھاڑتا ہے،

رضائی کاشی: ز جہانیاں ندارم بکسے بجز تو الفت وگرم تو ہم نخواہی سر بیکسی سلامت

میں دنیا میں تیرے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا، اگر تو بھی اس کا روادار نہیں تو خدا میری بیکسی سلامت رکھے،

کاشی مدنکی: کسے چگونہ رہِ دل زغم نگہ دارد خرابۂ دل عاشق ہزار رہ دارد

دل عاشق کے خرابہ میں ہزاروں راہیں ہیں، اس لیے کوئی شخص غم سے اس راہ کی نگہبانی کیونکر کرسکتا ہے،

نیاز عاشقاں معشوق را در ناز آورد		تو سرتا پا وفا بودی ترا من بے وفا کردم

عاشقوں کی نیازمندی معشوقوں میں ناز پیدا کرتی ہے، تو تو سراپا وفا تھا میری نیازمندی نے تجھے بے وفا بنادیا،

قاضی حسن اصفہانی: حسن تا دید ترا دست ز یوسف برداشت		باغباں تربیت گلبن نوخیز کند

حسن نے جب تجھکو دیکھا یوسف سے دست بردار ہوگیا کیونکہ باغبان نوخیز پودے کی پرورش کرتا ہے،

روشنی ہمدانی: با چنیں بختے کہ خود ہم دشمن جان خودم		سادہ لوحی ہیں کہ خواہم دوستدار من شوی

ایسی قسمت کے ساتھ کہ میں خود اپنی جان کا دشمن ہوں، یہ سادہ لوحی بھی دیکھنے کے لائق ہے کہ چاہتا ہوں کہ تو میرا دوست بنجائے۔

بدگمانی ملاحظہ ہو:

در بزم ازاں بہ پہلوئے خود جا دہد مرا		تا راست سوئے او نہ توانم نگاہ کرد

بزم میں مجھے اس لیے اپنے پہلو میں بٹھاتا ہے کہ میں اس کی طرف سیدھی نگاہ نہ ڈال سکوں، (کہ پہلو میں رخ پھیرے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا)

میر محمد رضا: رمید خاطرم از ہرچہ ہست در عالم		بغیر یار کہ او عالم دگر دارد

اس عالم میں جو کچھ بھی ہے سب سے میرا دل بے تعلق ہوگیا بجز دوست کے کہ اس کا عالم ہی دوسرا ہے،

سلطان بیگ رہا: فضائے کنج قفس دلنشینم افتادہ است		وگرنہ در ہمہ جا آب و دانہ بسیار است

کسی جگہ بھی آب و دانہ کی کمی نہیں لیکن کنج قفس کی فضا دل میں ایسی بھاگئی ہے کہ اور کسی طرف

نگاہ نہیں اٹھتی۔

گفتم بہ بلبل چکنم در فراقِ یار — از شاخِ گل بخاک فتاد و طپید و مرد

میں نے بلبل سے پوچھا کہ فراق یار میں کیا کروں، وہ شاخ گل سے زمین پر گری، تڑپی اور مرگئی یعنی فراق کا علاج صرف موت ہے۔

رشید زرگر: مطلبم بارِ دگر در خاک و خوں غلطیدن است — گر بگیرم روزِ محشر دامنِ قاتل بکف

حشر میں اگر میں قاتل کا دامن پکڑوں تو اس مقصد (داد خواہی نہیں) بلکہ دوبارہ خاک و خون میں لوٹنا ہے۔

محمد رضا: بیابانِ بلا خارے ندارد — کہ از دامانِ من یاری ندارد

بیابان بلا میں کوئی ایسا خار نہیں ہے جو میرے دامن سے دوستی نہ رکھتا ہو، یعنی ہر خار دامن سے الجھتا ہے۔

محمد رضا کشمیری: محبت پس از قطع محبت لذتے دارد — کہ شاخِ نخل پیوندی بہ از اول ثمر گیرد

محبت میں قطع محبت میں بھی ایک لذت ہو کیونکہ جس شاخ میں پیوند لگایا جاتا ہے وہ پہلے سے بہتر پھل دیتی ہے۔

مرزا حسن بیگ رفیع: اے جرس ایں ہمہ فریاد ز دل تنگی چیست — شکرہا کن کہ دلت جائے تپیدن دارد

جرس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تیری یہ فریاد دل تنگی کی وجہ سے کیوں ہے، تجھے تو شکر کرنا چاہیے کہ تیرے دل کے لیے تڑپنے کی جگہ ہے، مجھے یہ بھی حاصل نہیں۔

تا قیامت دگر آں کشتہ نگیرد آرام — کہ دلش زخم دگر خواہد و قاتل برود

قیامت تک اس مقتول کو آرام نہیں مل سکتا جس کا دل دوسرے زخم کا تمنائی ہو اور قاتل پہلا زخم لگا کر چلا جائے۔

(باقی)

مولانا محمد علی کی یاد میں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۲)

اس ملاقات کے بعد وفد خلافت انگلستان کے وزیر اعظم ڈیوڈ لائڈ جارج سے ملا، اس موقع پر وفد کے ارکان مولانا محمد علیؒ، سید حسین، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور محمد حیات کے علاوہ رائٹ آنریبل ایچ، اے، ایل فشر اور سر فریڈرک ولیم ڈیوک بھی تھے، موخر الذکر بنگال کے گورنر بھی رہ چکے تھے، اس زمانہ میں ساری دنیا میں لائڈ جارج کا طوطی بول رہا تھا، وہ پہلی جنگ عظیم کے اصلی فاتح سمجھے جاتے تھے، عام طور سے یہ بات مشہور تھی کہ انھوں نے ایک رات اس جنگ کا نقشہ اتنی دماغ سوزی سے تیار کیا تھا کہ صبح کو ان کے سارے سیاہ بال سفید ہو گئے تھے، وہ اپنی مقبولیت کی وجہ سے جو بات کہہ جاتے، وہ غلط اور جھوٹ بھی ہوتی تو صحیح اور سچی سمجھی جاتی، اس بڑی جنگ کا ایک بڑا مقصد ترکی امپائر کا حصہ بخرا کرنا تھا، کیونکہ اسکی وجہ سے دنیا میں اسلام کی ایک موثر قوت بنی ہوئی تھی، اسی لیے شام، عراق، عرب، یمن، مصر، سلیشیا، ارمینیا اور تھریس وغیرہ کے لیے جمہوریت کے نام پر حق آزادی کا نعرہ بلند کیا گیا تھا، مزہ تو یہ تھا کہ اس جمہوریت اور آزادی کے علمبردار خود ایک ایسے امپائر کے مالک بنے ہوئے تھے جس کے غلاموں کی سرزمین میں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا تھا، ہندوستان جیسا بڑا ملک بھی اُن کا غلام بنا ہوا تھا، یہاں ان کے نزدیک حق جمہوریت اور آزادی کا نام زبان پر

لانے والوں کے لیے یا تو جیل خانہ تھا یا فوج اور پولیس کی گولیاں تھیں، اس زمانہ میں ونسٹن چرچل اپنی تقریروں میں کہتے کہ یہ جنگ ترکوں کے خلاف ایک صلیبی جنگ ہے، لارڈ ایلن بائی نے ٹرکش امپائر کے حصے بخرے کرنے میں جو حصہ لیا، اس بنا پر انکے متعلق اخباروں میں لکھا جاتا کہ جو کام پوری عیسائی دنیا متحد ہو کر نہ کر سکی تھی، وہ تنہا کر سکے صحافتی جادو بھی پورا کام کر رہا تھا، ترک اپنی مردم شماری کے دستاویزات سے ثابت کرتے کہ تھریس میں ان کی اکثریت ہے، وہ ۲۰۰۶ فی صدی ہیں یونانی صرف ۲۶۰۹ فی صدی ہیں، مگر اخباری پروپیگنڈا کے ذریعہ اس حقیقت کو جھٹلا کر رکھ دیا گیا، اکثریت اقلیت میں تبدیل کر دی گئی، اسی طرح اخباروں میں آرمینیوں کے قتل عام کی شہرت ایسی دی گئی کہ سارے جھوٹے بیانات سچے معلوم ہونے لگے، تمام اخبارات مل کر مالا جپنے لگے کہ وہاں تیس لاکھ آدمی قتل کر دیے گئے، اس بڑی تعداد کے قتل کے جھوٹے الزامات کو نہ صرف اخباروں بلکہ تصویروں اور سینماؤں کے ذریعہ صحیح قرار دینے کی کوشش کی گئی، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنی نجی صحبت میں فرماتے تھے کہ ترکوں کی طرف سے ان الزامات کی تردید ہوتی تو کوئی اخبار شائع نہ کرتا، اخبار ٹائمس لندن صحافتی آزادی کا بڑا حامی تھا، اس میں ترکوں کی حمایت میں کوئی بیان یا تحریر بھیجی جاتی تو کسی حال میں شائع کرنا پسند نہ کرتا، استاذی المحترم فرماتے کہ انگلستان اور یورپ والوں نے پریس اور صحافت کی آزادی کو آسمانی وحی کی طرح مقدس چیز منوالیا ہے، مگر انھوں نے اس آزادی کی آڑ میں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کا ایک ایسا فن ایجاد کیا ہے، کہ دنیا منہ تاکتی رہ جاتی ہے، اور صحافتی جادو سچ کو جھوٹ منوا کر اپنا مطلب پورا کر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے، ان کا مسلک یہ ہے کہ جھوٹ کو اس وقت تک دہراتے رہنا چاہیے جب تک کہ یہ سچ نہ سمجھ لیا جائے۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی میں نازی وزیر گوئبلز اس کا بڑا ماہر

سمجھا جاتا تھا لیکن موجودہ دور کے اخبارات اب اس سے کہیں زیادہ بازی لے گئے ہیں ،

برطانوی حکومت اور پریس دونوں نے طے کر لیا تھا کہ ترکوں کو مجرم قرار دے کر انکو ساری دنیا میں ملعون اور مبغوض کیا جائے، اس لیے اپنے پروپگنڈا کی مشنریوں کو جتنا زیادہ تیز کر سکتے تھے، کرتے رہے، ان ہی حالات میں مولانا محمد علی کا وفد لائڈ جارج سے ملا، دونوں کی تقریریں ذیل میں درج کی جاتی ہیں، مولانا محمد علی نے وہی باتیں کہیں جو رائٹ آنریبل مسٹر فشر کے سامنے کہہ چکے تھے، لیکن ان کی تقریر کا تیور بدلا ہوا تھا، اس زمانہ میں ان کی تقریروں کی دھوم مچی رہتی، ہندوستان کے تمام اخبارات نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کرتے رہتے، انگریزوں کی جابر اور سامراجی حکومت کے زمانہ میں سب کچھ کہنا آسان نہ تھا، لیکن اس زمانہ میں مولانا محمد علی نے جس جرأت اور دلیری سے کام لے کر تقریریں کیں، وہ اس جمہوری دور میں بھی شاید ہی کوئی کر سکتا ہے، لائڈ جارج کے سامنے ان کی تقریر کا پورا ترجمہ اس لیے درج کیا جا رہا ہے کہ ان کے جو پرستار اب بھی باقی ہیں، وہ اس سے لطف لیں اور جو ان کے نکتہ چیں رہ گئے ہیں وہ عبرت حاصل کریں کہ جب ایمانی حمیت اور مذہبی غیرت باقی رہتی ہے تو آتش نمرود بھی اس کے لیے گلزار خلیل بنجاتی ہے، مولانا محمد علی کی زندگی اب بھی یہ کہہ رہی ہے

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

وہ اسلام کے سفیر اور ضمیر بنکر شیر کی طرح غراتے رہے، وہ ان رہنماؤں میں نہ تھے جو اپنی فطرت کی جہانبانی کا دعویٰ تو کرتے رہتے ہیں لیکن کسی جمشید کا ساغر بنے رہتے ہیں، کسی جمشید کا ساغر بنکر رہنے میں زبان تو اپنی ہوتی ہے، لیکن ضمیر اپنا نہیں ہوتا، گویا وہ اپنی چرب زبانی سے اپنی ضمیر فروشی کو بھی اسلام ہی کا ضمیر قرار دیتے رہتے ہیں، مولانا محمد علی میں عقل کی روباہی کے بجائے عشق ید اللّٰہی رہا، جس سے ان میں ایک ایسی روشن ضمیری پیدا ہوئی جو ان سے کہتی رہی ؎

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا　　عشق تمام مصطفےٰ، عقل تمام بولہب

قوموں کا لہو پی کر جمہوریت اور آزادی کی تعلیم دینے والے وزیر اعظم لائڈ جارج کے سامنے حیلۂ افرنگی کے جواب میں مولانا محمد علی نے قلندرانہ شان کے ساتھ اندازِ ملوکانہ میں جو جملۂ ترکانہ یا جو نعرۂ مستانہ بلند کیا وہ ذیل کی تقریر میں دیکھا اور سنا جا سکتا ہے، اس میں لے تو حجازی ضرور ہے لیکن نفس سراسر ہندی ہے، ان تقریروں سے ہندوستان میں تحریک خلافت کی نوعیت اور اہمیت بھی سامنے آجائے گی۔

"میں یہ واضح کردوں کہ ہم لوگ یہاں ایک مذہبی مسئلہ کو لیکر آئے ہیں جو ہمارے لیے اہم ترین ہے۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خلافت سے ہندوستانی مسلمانوں کا کیا لگاؤ ہے، ہم لوگوں کے نزدیک مذہب محض مراسم یا عقائد کے مجموعہ کا نام نہیں ہے، یہ پوری زندگی کا اخلاقی اور معاشرتی نظام ہے، یہ کوئی ایسی چیز کو تسلیم نہیں کرتا جس سے روحانی اور دنیاوی چیزوں یا حکومت اور مذہب میں فرق و امتیاز پیدا ہو جائے، یہ زندگی کو ہر طرح ناقابلِ تقسیم حد تک متحد اور مربوط دیکھنے کی تعلیم دیتا ہے جس میں انسانیت کے تمام مسائل میں یزدانی رہنمائی ہے، مسلمان اپنے کو خدا کا بندہ یعنی غلام سمجھتا ہے، اسی کی اطاعت کرتا ہے، اور اسی کو اپنا آخری حاکم سمجھتا ہے، اسلام میں لسانی، جغرافیائی اور سیاسی حدود ایسے نہیں ہیں جو انسانوں کے میل ملاپ اور ہمدردی میں رکاوٹ بن جائیں، اسلام زندگی کو قومی (National) نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے مافوق القومی (Super national) طریقہ سے دیکھنے کی تعلیم دیتا ہے، شروع سے اسلام کے دو مرکز رہے ہیں ایک تو ذاتی اور ایک مکانی۔ ذاتی مرکز کا تعلق خلیفہ سے ہے، جو کہ رسول کا جانشین سمجھا جاتا ہے، ہمارے رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) اسلام کے ذاتی مرکز تھے، خلیفہ کی وجہ سے آپ کی جانشینی کی روایت برقرار ہے۔ مکانی مرکز جزیرۃ العرب ہے، جو پیغمبروں کی سرزمین تھی

کہلاتا ہے، اسلام میں عرب محض ایک جزیرہ نما نہیں ہے، اس کی چوتھی سرحد دریائے فرات اور دجلہ ہے، خلیفہ ان تمام معاملات میں امیرالمومنین ہے، جن کے لیے اسلام میں یزدانی رہنمائی کی تلقین موجود ہے، خلیفہ کے تمام احکام کی اطاعت تمام مسلمانوں کے لیے ضروری ہے، بشرطیکہ وہ قرآن وسنت کے مطابق ہوں۔ دین کی محافظت کے لیے امیرالمومنین کے پاس ہمیشہ قابل ذکر علاقہ، بری اور بحری فوج اور مالیاتی ذرائع ہونے چاہئیں، جن کو اصطلاحاً دنیاوی قوت کہا جاتا ہے۔

قرآن کا حکم ہے لکم دینکم ولی دین۔ مذہب میں جبر نہیں ہے، اسلام میں طاقت اس وقت استعمال کی جاتی ہے، جب اس کے مخالفین طاقت کی دلیل کا سہارا لیتے ہیں، مسلمان کی ذات اور اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ محض ربانی امانت ہے، اگر دین کی حمایت اور خداوند تعالیٰ کی خدمت کی خاطر اس امانت کی ضرورت پڑے تو مسلمان اس امانت کو پیش نہ کر کے اس میں خیانت کرنے کا حق نہیں رکھتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کی دنیاوی قوتوں کے لیے یہی امانت بڑا سرمایہ ہے، دنیا اب بھی طاقت پر بھروسہ رکھتی ہے، اسی لیے خلیفہ اپنی دنیاوی طاقت سے کس طرح سبکدوش کیا جا سکتا ہے۔

اسی لیے جناب عالی! ہمارا پہلا حق یہ ہے، جس کو ہم یہاں پیش کرنے کے لیے آئے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ہر زمانہ میں خلیفہ کو خاطر خواہ دنیاوی طاقت کے ساتھ برقرار رکھیں۔ اس دنیاوی طاقت کا معیار وہی ہو جیسا ہونا چاہیے۔

ہم زیادہ تفصیل میں تو نہیں جانا چاہتے ہیں، لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ ترکوں نے جو جو مختلف لڑائیاں لڑیں، خصوصاً بلقان کی جنگ کے بعد خلیفہ کی سلطنت اتنی محدود ہو کر رہ گئی ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی ہے، اسی لیے مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ اب خلیفہ کے

پاس جو کچھ رہ گیا ہے، وہ باقی رہنے دیا جائے۔ مسلمان ترکی کے اقتدارِ اعلیٰ کے ساتھ سیاسی تبدیلیوں کے مخالف نہیں ہیں، ترکی امپائر کے اندر جتنے عیسائی، یہودی، اور مسلمان فرقے ہیں ان کے جان و مال کی حفاظت کے ساتھ ان کو خود مختارانہ طور پر آگے بڑھنے کے مواقع ضرور دیے جائیں، لیکن ترکی کے اقتدارِ اعلیٰ اور وقار کو بھی ساتھ ہی ساتھ برقرار رکھا جائے۔"

وزیرِ اعظم ۔ تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ شامی مسلمانوں کی اس بات کے مخالف ہیں کہ انھوں نے امیر فیصل کو عرب کا بادشاہ تسلیم کر لیا ہے؟

مولانا محمد علی ۔ جی ہاں، میں اس بات کا ذکر کرنے والا ہی تھا، لیکن آپ نے یہ سوال کیا ہے تو پھر میں یہ عرض کروں گا کہ اس مسئلہ کو مسلمانوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ خود حل کریں، جس طرح خلیفہ کے ساتھ ہماری وابستگی مذہبی نوعیت کی ہے، اسی طرح ہم ایک لازمی اور اہم مذہبی فریضہ سمجھ کر ترکوں اور عربوں سے مل کر بھی ان سے کچھ کہنا چاہیں گے۔ قرآن کا حکم ہے کہ "تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، ان میں باہمی صلح کراؤ،" ہم صلح اور آشتی کی خاطر یہاں آئے ہیں، اور اسی مقصد کو لیکر عربوں اور ترکوں کے پاس بھی جانا چاہتے ہیں۔

وزیرِ اعظم ۔ میرا تعلق شاید خلیفہ کی صرف دنیاوی طاقت کی حد تک ہے، کیونکہ آپ نے پیش کیا ہے، کہ جنگ کی ابتدا میں سلطان کے پاس جو طاقت رہ گئی تھی، وہ کم سے کم تھی، تو اب میں سمجھتا ہوں، گرچہ میری معلومات نامکمل ہیں، کہ شام، فلسطین اور دوسرے علاقوں کے مسلمانوں نے خلیفہ سے کٹ کر ایک آزاد مسلم ریاست کا اعلان کیا ہے،

مولانا محمد علی ۔ جنابِ عالی! مجھکو امید ہے کہ اگر ہم لوگوں کو ان لوگوں سے ملنے کا موقع دیا گیا تو ہمارے لیے یہ ممکن ہو سکے گا کہ ہم ان میں ملاپ پیدا کر دیں، عربوں اور ترکوں میں اختلافات ضرور رہے ہیں، لیکن امیر فیصل جب ایک مسلمان کی حیثیت سے اس مسئلہ

پر غور کریں گے، اور ان کو اس طرح ضرور غور کرنا چاہیے، تو وہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ انکے ذاتی اور خود عربوں کے حوصلوں کی تکمیل ترکوں کے اقتدار اعلیٰ کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے۔

وزیر اعظم ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ عربوں کی آزادی کے خلاف ہیں۔

مولانا محمد علی ۔ ہاں، میں کہہ رہا تھا کہ مسلمان اپنے خلیفہ کے لیے دنیاوی طاقت کے خواہاں ہیں، میں اس کا مخالف نہیں ہوں کہ عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کو عثمانی اقتدار اعلیٰ کے ساتھ جان و مال کی حفاظت اور خود مختاری کی ضمانت بھی دیجائے، اگر ترکی کے اقتدار اعلیٰ کے وقار کو قائم رکھا جائے، تو یہ مسئلہ زیادہ مشکل نظر نہیں آئے گا، ہمارے برطانوی امپائر میں بھی تو مختلف مذہبی فرقے کے لوگ آباد ہیں، ان میں سے کچھ تو بڑی حد تک آزاد ہیں، اور کچھ یہ امید رکھتے ہیں ـــ میرا اشارہ ہندوستان کی طرف ہے ـــ کہ ان کو اس سے زیادہ خود مختاری حاصل ہو جائے گی جو اب ان کو حاصل ہے، ہماری خود خواہش ہے کہ ہم کو خود مختاری حاصل ہو تو پھر ہم ٹرکش امپائر کے عربوں، یہودیوں اور عیسائیوں کو اس حق سے کیوں محروم کر دینا پسند کریں گے، ہمارا برطانوی امپائر نمونہ ہے جس کی مدد سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

ایک تو ہماری یہ تجویز ہے کہ خلیفہ کو خاطر خواہ دنیاوی طاقت کے ساتھ برقرار رکھا جائے، دوسری تجویز یہ ہے کہ ہمارے دین کا مکانی مرکز یعنی جزیرۃ العرب کو خالص مسلمانوں کے قبضہ میں رہنا چاہیے، ہمارے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ آخری وصیت تھی، جزیرۃ العرب کی جو کچھ سرحد دجلہ اور فرات ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ اس میں شام، فلسطین اور میسوپوٹامیا کے علاوہ وہ علاقے بھی شامل ہیں جن کو یورپ کے جغرافیہ داں عرب کا جزیرۃ العرب کہتے ہیں، اگر اس پر یا اس کے کسی علاقہ پر غیر مسلموں کا تسلط کسی قسم

کا بھی ہوا تو مسلمان اس کو کبھی برداشت نہیں کریں گے، یہ ہمارے لیے ایک لازمی مذہبی حکم ہے، کہ اس پورے علاقہ پر مسلمانوں ہی کا تسلط ہو، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ علاقہ خلیفہ ہی کے زیرنگیں ہو، ذرا میں اور واضح کردوں کہ مذہبی حکم کی تعمیل تو ہو جائے گی اگر امیر فیصل کا اس پر آزادانہ تسلط ہو، لیکن خلیفہ کے لیے کافی علاقے، ذرائع، بری اور بحری افواج کا ہونا ضروری ہے، اس لحاظ سے اقتصادی اور معاشی ضرورتوں کا بھی یہ تقاضا ہوتا ہے کہ جزیرۃ العرب جنگ سے پہلے کی طرح خلیفہ کے براہ راست اقتدار میں باقی رہے، ہم کو بڑی امید ہے کہ اگر ہم اپنے ہم مذہبوں سے ملے تو ہم ترکوں اور عربوں کے اختلافات کو دور کردیں گے، اور یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ عرب میں ترکوں کی حکومت ایسی رہی کہ دوسری طاقتوں کے لیے مداخلت کرنا ضروری ہوگیا، ہم کو ان کے مظالم کی خبر نہیں ملی ہے، اور جناب عالی! آپ کو یہ معلوم ہے کہ یمن میں بڑی شورش رہی، لیکن اس جنگ میں یمن نے ترکی سے علحدگی اختیار نہیں کی،

ہم تیسری تجویز بھی مسلمانوں کی طرف سے آپ کے سامنے یہاں پیش کرنے کے لیے آئے ہیں، ہمارے لیے یہ مذہبی حکم ہے کہ مکہ، مدینہ اور بیت المقدس کا نگراں خلیفہ ہو، مسلمانوں کی اکثریت یہ بھی چاہتی ہے کہ نجف، کربلا، کاظمین، سامرا اور بغداد کی زیارت گاہیں بھی خلیفہ ہی کی نگرانی میں ہوں، چونکہ یہ سب جزیرۃ العرب ہی میں واقع ہیں،

یہ دعاوی تو مذہبی قسم کے ہیں، جن کے پورے ہونے ہی پر مسلمان اپنے کو مطمئن پائینگے، لیکن وہ فطری طور پر قسطنطنیہ، تھریس اور ایشیائے کوچک کے سلسلہ میں آپ کی مزید مدد کے خواہاں ہیں، یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، آپ کا جو وعدہ تھا، جس کا اعادہ ابھی حال میں بھی کیا گیا ہے، مسلمان اس کا ایفا چاہتے ہیں، مکہ، مدینہ اور بیت المقدس کی طرح قسطنطنیہ

اتقدس کمال نہیں ہے، جو بھی قسطنطنیہ کو دنیا کے تمام مسلمان مقدس نظروں سے دیکھتے آئے ہیں، اور اسلام بول استنبول یعنی اسلام کے شہر کے ساتھ تو پانچ صدیوں کی تاریخ وابستہ ہے، "اسلام کا شہر" ایسا نام کسی اور شہر کو اب تک نہیں دیا گیا، اگر ترکوں کو اس دارالخلافت سے ان کے بوریا بستر کے ساتھ نکال باہر کیا گیا تو مسلمان یہی سمجھیں گے کہ اسلام کو پھر صلیبی جنگ کا چیلنج دیا گیا ہے، اور پورے مشرق پر یورپ اپنا تسلط چاہتا ہے، اگر ایسا ہوا تو پوری دنیا کے مسلمان اور پورا مشرق اس کو اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھیں گے، اور یہ خطرہ برطانوی امپائر، ایشیا اور افریقہ کے اتحادیوں کے لیے بھی ہوگا۔

پھر میں یہ بھی عرض کردوں کہ مسلمان اسلام کی اس اہانت کو کبھی برداشت نہیں کرسکتے کہ خلیفہ کو قسطنطنیہ میں محض یرغمال بنا کر رکھا جائے، وہ تو ویٹیکن کا پوپ نہیں ہوسکتا، اور ویگنن کا پوپ بن کر رہنا کیسے گوارا کرسکتا ہے، اور یہ کہکر اپنا فرض ادا کروں گا کہ اتحادیوں نے اس وقت جو رویہ اختیار کر رکھا ہے، اس سے مسلمانوں کے جذبات میں ایسا اشتعال پیدا ہوجائے گا جن کو قابو میں رکھنا بہت ہی مشکل ہوگا، ان کا اشتعال دنیا کے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے،

جہاں تک تھریس کا تعلق ہے، اگر وہاں کے لوگوں کو حق خود اختیاری دیا گیا تو یہ ترکی کے ساتھ خود ہی رہنا پسند کریں گے بشرطیکہ یہ حق منصفانہ اور ایماندارانہ طور سے استعمال کرنے کو دیا گیا،

سمرنا پر اب یونانیوں کا قبضہ ہے، وہ تو جنگ میں ترکوں کے خلاف برسرپیکار بھی نہیں رہے، لیکن اتحادیوں کی سرپرستی میں ان کے اس تسلط سے مسلمانوں کے اس اعتماد کو بڑا دھکا پہنچا ہے، جو برطانوی وعدوں کی وجہ سے پیدا ہوا تھا، اور وہاں جو مظالم ہو رہے ہیں اس سے مسلمانوں میں اشتعال انگیز برگشتگی پیدا ہوگئی ہے، مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ یونانی سرمایہ دار یہاں اس لیے قبضہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایشیائے کوچک کے

دولتمند اور مشہور علاقوں کا استحصال کریں ۔ یہ علاقے بلا شائبہ شبہ ترکوں کا وطن ہے مگر یہ صورت حال جاری رکھی گئی تو ترک نہ صرف یورپ ہی سے بوریا بستر کے ساتھ نکال باہر کردیے جائیں گے ،بلکہ ایشیا میں بھی ان کے بوریا بستر کے لیے کوئی جگہ نہ رہے گی ،وہ تجارت اور صنعت میں بالکل مفلوج ہوکر رہ جائیں گے ،اور ایشیائے کوچک کے ایک ٹکڑے ہوئے علاقے میں محدود ہوجائیں گے ،جن کا جلد از جلد دیوالیہ ہونا یقینی ہو جائے گا ، اگر یہاں بھی حق خود اختیاری دیا گیا تو اس زرخیز علاقہ میں یونانیوں کا دعویٰ خود بخود ختم ہو جائے گا ،جس پر سرمایہ داروں اور استحصال کرنے والوں کی حریصانہ نظر پڑ رہی ہے ،

سلیشیا کے تسلط میں وہی سارے اسباب کارفرما ہیں ،جو سمرنا میں دیکھے جارہے ہیں ، سلیشیا سے زیادہ الکزنڈریٹا کی خلیج صرف کچھ لوگوں کی حریصانہ نظر کا مرکز بنی ہوئی ہے ، اسی طرح جس طرح کہ سمرنا کی خلیج بنی ہوئی ہے ،

جس قتل عام کی شہرت ہے اس کو میں نظر انداز نہیں کرتا ہوں کسی مسلمان کے خواب و خیال میں بھی قتل اور سفاکی کے مجرموں کی حمایت کی خواہش پیدا نہیں ہوسکتی ہے ،ہندوستان کا یہ وفد ان جرائم پر اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے ،اور ان تمام مظلومین کے ساتھ خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان ،ہمدردی کا اظہار کرتا ہے ،لیکن اگر ترکوں کو مجرم بنا کر سزا دینی ہے ،اور محض اس جرم پر کہ ترک ظالم حکمراں ہیں اس لیے دوسرے مذہبی فرقوں اور گروہوں کو عثمانی حکومت سے آزاد کرنا ضروری ہے تو پھر ہمارے وفد کی یہ تجویز ہے کہ قتل کے سارے مسئلے کی تحقیقات ایک بین الاقوامی کمیشن کے ذریعہ کرائی جائے جس میں کل ہند خلافت کانفرنس کی بھی نمایندگی مناسب طور سے ہو، جناب عالی ! یہ تجویز پہلے بھی ہم تار کے ذریعہ پیش کرنے کی عزت حاصل کرچکے ہیں ، جہاں جہاں جرائم سرزد ہوئے ہیں ان کی اصلیت کی چھان بین کمیشن کرے ،پھر اسی کے ساتھ

اس قتل عام کی بھی پوری تحقیقات ہو، جبکہ روس کی وجہ سے ایشیائے کوچک میں بلقان کی کامیاب سازشوں کی بنا پر ہوا، یہ کمیشن سلطان کی عیسائی رعایا کی ان انقلابی تنظیموں کی باغیانہ حرکتوں کی بھی تحقیقات کرے جو سلطان کی حکومت کے خلاف ہوتی رہیں، یہ کمیشن ان اشتعال انگیزیوں کی بھی تحقیقات کرے جو اس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت کے خلاف بروئے کار آئیں اور پھر ان جھگڑوں کی نوعیت اور ان میں جو قوتیں کام کرتی رہیں ان کی بھی تحقیقات ہو،

وزیر اعظم۔ آپ کی دلیلوں سے میرے لیے یہ بات واضح نہیں ہو رہی ہے کہ آپ وہاں کے قتل عام سے انکار کر رہے ہیں یا اس کو درست قرار دے رہے ہیں،

مولانا محمد علی۔ میں نہ اس سے انکار کرتا ہوں اور نہ اس کو درست قرار دے رہا ہوں، میری گذارش ہے کہ جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے ہم لوگ اس پوزیشن میں ہیں کہ نہ اس کو صحیح قرار دے سکتے ہیں اور نہ اس سے انکار کر سکتے ہیں، ہم مسلمان کی حیثیت سے صرف یہ کہنا چاہتے ہیں، ہم ترک نہیں ہیں بلکہ مسلمان ہیں — کہ اگر کسی بات پر ترکوں کو سزا دینی ہے تو پہلے اس کے لیے مکمل اور غیر جانبدارانہ تحقیقات ہو جانی چاہیے۔

وزیر اعظم۔ پیرس میں ترکوں کے وفد نے جو ہم لوگوں کو جواب دیا تھا، اس میں تو انھوں نے اس قتل عام کا اعتراف کیا تھا، ان کا جواب صرف یہ تھا کہ اتنی ہی تعداد میں ایشیائے کوچک کی بری حکومت کی وجہ سے مسلمان بھی قتل کیے گئے۔"

مولانا محمد علی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ کہوں کہ ہم سے زیادہ ترک ہی بہتر طریقہ پر بتا سکتے ہیں کہ ان کی نمایندگی کون کرتا ہے اور کون نہیں کرتا ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ ترکوں کی آبادی کا بڑا حصہ اس وفد کو اپنا نمایندہ نہیں سمجھتا ہے، جو پیرس آیا، مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں ترکی کی مجلس اتحاد و ترقی سے وابستہ ہوں، حالانکہ میں نہیں ہوں، میرا اس سے کوئی

تعلق نہیں رہا، میں اس مجلس کے ممتاز اراکین کے نام تک نہیں جانتا ہوں، ہاں البتہ ایک مرتبہ میں حکومت ہند کے ذریعہ طلعت بے کو جو اس وقت ترکی کے وزیر امور داخلہ تھے، ایک پیام بھیجا تھا کہ وہ جنگ میں شریک نہ ہوں، اس میں شرکت کرنے سے پہلے ہزار بار غور و فکر کریں، ان کو میں نے سمجھایا کہ اگر وہ انگلستان کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے تو ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت بڑی ہی غمناک ہوگی، بس میرا اتنا ہی تعلق رہا۔

وزیر اعظم۔ یہ بہت ہی مناسب نصیحت تھی، کاش اس کو وہ لوگ قبول کرتے، ہم لوگ ترکی کے خلاف لڑائی کے خواہش مند نہیں ہوئے،

مولانا محمد علی۔ میں یہ سمجھتا ہوں۔

وزیر اعظم۔ ہم نے تو اس کا خواب بھی نہیں دیکھا، ہم لوگوں کے خلاف ترکی نے جنگ کی۔

مولانا محمد علی۔ اگر اس وقت برطانوی حکومت ہم لوگوں کی خدمت حاصل کرتی تو ہم موثر ہو سکتے تھے، ہم ترکوں کو کامیابی کے ساتھ سمجھا سکتے تھے، مگر یہ باتیں تو اب ماضی کی ہیں۔

وزیر اعظم۔ ترکوں کی یادداشت کی ایک نقل مجھکو دیجئے۔

مولانا محمد علی۔ یہ ٹائمس اخبار میں شائع ہو چکی ہے، میں نے اس کو ہندوستان میں پڑھا، اس کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ ایک جماعت جو دوسری جماعت کے متعلق کہتی ہے، اس پر ہمیشہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے، اگر تمام ترکوں کو سزا دی گئی تو یہ سزا دا اد فرید پاشا اور انکے ہم خیالوں کی سزا تو نہ ہوگی، اس وقت جو لوگ برسر اقتدار تھے ان ہی کو جنگی مجرم قرار دیا جا سکتا ہے، میں کسی کی وکالت نہیں کرتا، میں ترکوں کی طرف سے وکالت نامہ لیکر نہیں آیا ہوں، میں تو صرف اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں کی وکالت کرنے آیا ہوں، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں اور یہی مسٹر فشر کے سامنے کہہ چکا ہوں کہ مکمل تحقیقات ہو، اگر اس کے ذریعہ سے ساری دنیا کو

یقین ہو جائے کہ ترک کسی اشتعال کے بغیر ہی قاتل بنے رہے، ان سے سفاکیاں ہوئیں، ہولناک جرائم سرزد ہوئے تو میں ان سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا، ہم لوگوں کے لیے تو یہ زیادہ اہم بات ہے کہ اسلام کی نیک نامی پر کوئی دھبہ بھی نہ آئے، ہم تو ساری دنیا کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں، لیکن اگر ترک قاتل ثابت ہوئے تو ہم کس منہ سے دنیا کے سامنے جائیں گے، اور کیا یہ کہہ سکیں گے کہ ہم قاتلوں کے بھائی ہیں ہاںلیکن ہم بھی اس قتل کی تاریخ سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں، صرف آرمینیا ہی میں ترکوں کو بڑا غیر روادار بتایا جاتا ہے، ان کے پاس ایسے علاقے بھی تو ہیں جہاں عیسائی اور یہودی رہتے ہیں، آرمینیا کے لوگ صدیوں تک ترکوں کی حکومت میں رہے، لیکن اس سے پہلے کبھی ان کی غیر رواداری کی شکایت نہیں کی، آرمینیا میں ترکوں کے مظالم کی آواز گذشتہ صدی کے آغاز میں بلند کی گئی ہے، لیکن درحقیقت یہ قتل گذشتہ صدی کے آخری حصے میں اس وقت شروع ہوا جبکہ روسیوں کو بلقان میں کامیابی ہونے لگی، روسیوں نے پیٹر اعظم ہی کے زمانہ سے قسطنطنیہ پر اپنا تسلط قائم کرنے کی خواہش کے پردے کو اٹھا رکھا تھا، وہ اس کو زار گراڈ بنا کر یہاں تک آنا چاہتے تھے، ان کی سازش بلقان میں شروع ہوئی جس میں ان کو اپنی توقع کے خلاف کامیابی ہوئی، بلغاریہ بلغاریہ عظیم بن کر آزاد ہوا، لیکن جہاں تک آرمینیوں کا تعلق ہے، وہ جنگ جو کبھی نہیں رہے، ان میں حکومت کے قیام کی خواہش بھی نہیں رہی، وہ تو روسیوں کے راسخ العقیدہ گرجا والوں سے گفتگو کرتے بھی گھبراتے، وہ فریب میں آخر آگئے، جب سازشوں کا جال بچھایا گیا، ان کو اکسایا گیا کہ وہ روس کے زار سے کچھ سمجھوتہ کر لیں تو ان کی صورت حال بہتر ہو جائے گی، اسی کے بعد قتل کی داستان شروع ہوئی، اسکے خلاف شور و غوغا ہوا، اور شہادتیں بھی پیش کی گئیں، لیکن کبھی بین الاقوامی تحقیقات ایسی نہیں ہوئی جو مسلمانوں اور عیسائیوں کو مطمئن کر سکے، اسی لیے ہم لوگ مخلصانہ طور پر آپ سے پوری

عیسائی دنیا، جناب پوپ اور پورے امریکہ سے اپیل کرتے ہیں کہ اگر ترکوں کو صرف اس لیے دیکھا جا رہا ہے کہ وہ ظالم ہیں، اور ان کی حکومت ظلم سے بھری رہی تو پھر اس کے لیے ایسی شہادتیں ہونی چاہئیں جو شک وشبہہ سے بالا ہوں، ہم عاجزانہ طور پر کہتے ہیں کہ ایسی شہادتیں اس وقت موجود نہیں، آج کے ٹائمس میں بھی ان معصوم بھیڑوں کے بچوں کی خبر چھپی ہے، ہم یہ اصطلاح آرمینی عیسائیوں کے لیے کسی تلخی کی غرض سے استعمال نہیں کر رہے ہیں، ہم یہاں تلخیوں میں اضافہ کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں، بلکہ ممکن ہوا تو ہم اس میں کمی پیدا کریں گے۔ ہاں ٹائمس میں ترکوں کے مظالم کی خبریں چھپی ہیں، ہم اس پروپگنڈے سے اچھی طرح واقف ہیں، جو اس ملک میں روزانہ جاری ہے، یہ ثابت کرنے کی کوشش ہو رہی ہے کہ آرمینی باشندے بالکل معصوم ہیں، پاشا اور آفندی اقلیت میں ہونے کے باوجود اکثریت پر حکومت کر رہے ہیں یہ سرمایہ دار ان لوگوں کو پیس رہے ہیں، قتل عام کر رہے ہیں، انگریز اور یورپ کے دوسرے باشندے جو ترکوں کے علاقے میں گئے اور رہے، وہ ترکوں کو اب تک رحمدل اور مہربان سمجھتے ہیں لیکن مجھکو یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یکایک کیا ہو گیا جس سے ترکوں سے ساری انسانیت جاتی رہی، اور وہ ایسے ہو گئے کہ سارے مسلمانوں اور عیسائیوں کو ان سے نفرت کرنا چاہیے، ترکوں کے متعلق اگر کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے تو یہ شک وشبہہ سے بالاتر شہادتوں کی بنا پر ہونا چاہیے، دنیا میں ایسے تھوڑے لوگ ہیں جو یہ سمجھیں گے کہ ترکوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے سزا نہیں دی گئی لیکن لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو یہی سمجھیں گے کہ ان کو سزا اس لیے دی گئی ہے کہ وہ مسلمان ہیں، اس قسم کے غلط اثرات کو دور کرنا ضروری ہے، مجھکو یقین ہے کہ آپ یا آپ کی حکومت کو اس کا احساس ہے کہ اس میں ذرا بھی شبہہ پیدا نہ ہو کہ آپ نے ترکوں کے ساتھ صلیبی جنگ کا سلوک کیا یا آپ ان پر یورپی تسلط چاہتے ہیں، ہم بھی مشرق میں یہی اثرات پیدا کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم صلح وآشتی

نہ چاہتے تو یہاں نہ آتے، ہم تو امن کا پیام لے کر آئے ہیں، دنیا کے لیے صحیح معنوں میں امن کے خواہاں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ترکی سے صلح کرنے میں کافی تاخیر ہو چکی ہے، ہماری حکومت نے بتایا ہے کہ اس کے لیے برطانیہ ذمہ دار نہیں ہے، تو اس کی ذمہ داری نہ ہم پر اور نہ ترکوں پر عائد کی جا سکتی ہے، اگر صحیح معنوں میں کوئی آخری سمجھوتہ کیا جائے تو مناسب تحقیقات کے لیے چھ مہینے کا وقت کوئی طویل مدت نہیں، کوئی ایسا سمجھوتہ نہ ہونا چاہیے جو مستقبل میں جنگ کا بیج بو دینے کے مرادف سمجھا جائے۔

میں زیادہ وقت لے کر آپ کے پیمانۂ صبر کو لبریز نہیں کرنا چاہتا ہوں، ہماری صرف درخواست یہ ہے کہ ایک مکمل اور غیر جانبدارانہ تحقیقات ہو، جس میں کل ہند خلافت کانفرنس کی بھی مناسب نمایندگی ہو، میں نے مسٹر فشر سے بھی کہا ہے کہ اگر ترک واقعی نالائق ہیں اور خلافت کی حکومت بھی ایسی ہے تو نہ صرف عیسائیوں کے خیال سے بلکہ خود ہم مسلمان کی حیثیت سے یہ غور کریں گے کہ ایسی خلافت قابل برداشت ہے کہ نہیں، ہمارے سامنے ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے کی مثال موجود ہے کہ ان کے ساتھ صرف بہتر[۷۲] آدمی تھے، لیکن انھوں نے یزید کا مقابلہ اور کربلا میں شہادت حاصل کی محض اس لیے کہ ایک ظالم کی حکومت قبول نہیں کی جا سکتی تھی، اگر ترک اس سے بھی زیادہ ظالم ثابت ہوئے اور ان کے مظالم کو مسلمانوں نے تسلیم کر لیا تو پھر خلافت کا مسئلہ ہی ختم کر دیا جائے گا، یہ بڑی دکھ بھری چیز ہو گی، لیکن ہم کو اسلام کے مفاد کی خاطر ایسا کرنا ہو گا۔

ذرا میں فلسطین پر یہودیوں کے دعویٰ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، ہمارا وفد یہودیوں کے فرقہ سے کوئی ناانصافی کرنا نہیں چاہتا، میرا خیال ہے کہ اسلام کو اس منصفانہ سلوک پر فخر ہے جو گذشتہ زمانہ میں اس کی طرف سے یہودیوں کے ساتھ کیا جاتا رہا،

اگر مسلمانوں کا قبضہ اس مقدس سرزمین پر رہا تو کوئی وجہ نہیں کہ یہودیوں کے جائز حقوق کی پامالی ہو، اگر ان کی باتیں معقول اور قابل قبول ہوئیں تو عثمانی حکومت ضرور منظور کرتی رہے گی، صیہونی تحریک کے بعض ذمہ دار پروپگنڈا کرنے والوں سے میری ملاقات ہوئی ہے، انھوں نے اپنی گفتگو میں مجھ سے کہا کہ وہ یہاں کوئی سیاسی اقتدار اعلیٰ نہیں چاہتے، وہ صرف وطن چاہتے ہیں جس کی تفصیل پر بحث کی جا سکتی ہے، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ برطانیہ کا یہاں اقتدار اعلیٰ ہو یا یہ علاقہ برطانیہ کے فرامین کو عمل میں لانے والا ہو، انھوں نے جواب دیا، نہیں، ہم تو انسانیت کے نام پر معمولی طور کی معقول گارنٹی چاہتے ہیں کہ ہم خود مختارانہ طور پر پھیلنے پھولنے کا موقع دیا جائے۔" ہم لوگ ہندوستان میں رہتے ہیں، اور ہندوستان کے مختلف مذاہب کے فرقوں کے ایک وفاق پر یقین رکھتے ہیں، ہندوستان کی جو قومیت بھی رہی ہے وہ غالباً دنیا میں مختلف مذاہب کے فرقوں کے وفاق کی پہلی مثال ہوگی، تو ہم یہودیوں کی کلچرل آٹانومی یعنی ثقافتی خود مختاری کے حق کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں، یہودیوں کی بڑی چھوٹی اقلیت ہے، اور میں ایک لمحہ کے لیے اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ سارے یہودی یہاں کھنچ کر چلے آئیں گے، جیسا کہ صیہونیت کے پرجوش حامی خیال کرتے ہیں، یہی بات میں آرمینیوں کی ریاست کے متعلق کہوں گا، میں ان کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا پسند نہیں کرتا ہوں جس سے ان کو اشتعال پیدا ہو، خود ہم لوگ ذلت آمیز سلوک میں مبتلا رہے ہیں، اسی لیے ہم کوئی ایسی بات نہ کہیں گے جو ان کو برا معلوم ہو، اگر اتحادی تمام آرمینیوں کو ایک ملے ہوئے علاقہ میں لا کر بسا دیں اور تمام کردوں کو نکال باہر کریں تو آرمینیا کے لوگ خود یہ پسند نہ کریں گے، چاہے ان کو کتنا ہی بڑا علاقہ نہ مل جائے بلکہ اپنی پرانی حالت ہی پر رہنا پسند کریں گے۔

وزیر اعظم۔ کیا آپ آرمینیا کے باشندوں کے متعلق کچھ کہہ رہے ہیں؟

مولانا محمد علی ۔ جی ہاں، یہی بات میں یہودیوں کے متعلق کہوں گا، وہ دوسری جگہوں پر بڑے خوشحال ہیں، ان کو ایک وطن کی بڑی خواہش ضرور ہے لیکن مجھکو اس کا ڈر نہیں ہے کہ یہودی اتنی تعداد میں یہاں آجائیں گے کہ مسلمانوں کی تعداد سے زیادہ ہوجائیں گے، یہودی تو یہی کہتے ہیں کہ دنیا کے اس حصہ پر ترکوں کے اقتدار اعلیٰ پر ان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا، جب تک ان کو وہاں رہنے، اپنے طرز پر پھلنے پھولنے اور ثقافتی خودمختاری کے حق کو استعمال کرنے کا موقع دیا جاتا رہے گا،

کچھ دیر پہلے آپ نے عربوں سے متعلق ایک سوال کیا تھا، ہمارے وفد کو یہ شبہہ نہیں ہے کہ خلیفہ اور عربوں میں سمجھوتہ نہ ہوسکے گا، میں عرض کرچکا ہوں کہ قرآن مجید میں ہے کہ سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، ان بھائیوں میں باہمی صلح کراؤ، اور یہ ہم پر فرض ہے، بمبئی میں کل ہند خلافت کانفرنس میں یہ تجویز منظور ہوچکی ہے کہ ایک وفد حجاز جاکر عربوں اور ترکوں میں مصالحت کرائے، مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری دلچسپی خلافت کے ساتھ ہے، مسلمانوں کو عرب اور عربوں سے زیادہ کوئی اور علاقہ اور آبادی عزیز نہیں، عربوں کے مقابلہ میں ترکوں سے محبت زیادہ نہیں ہوسکتی ہے، عرب کو ہم خالص مسلمانوں کی نگرانی میں دیکھنا چاہتے ہیں، کسی اور کی نگرانی کو ہم کسی حال میں قبول نہ کریں گے، یہ ہمارے لیے ایک مذہبی فریضہ ہے، اس لیے اگر ہم جزیرۃ العرب پر خلیفہ کا اقتدار اعلیٰ چاہتے ہیں تو اس سے عربوں کے ساتھ غیر ہمدردی اور ترکوں کے ساتھ ہمدردی مراد نہیں، ترک تو ہم سے دور آباد ہیں، ہم میں سے کم ہی لوگ ٹرکش امپائر کی پوری تفصیلات سے واقف ہیں، مکہ اور مدینہ تو ہمارے لوگ بکثرت جایا کرتے ہیں، ہم میں سے تو بہت سے لوگ اس سرزمین میں مرنا پسند کرتے ہیں، بہت سے

مسلمان وہاں جاکر آباد ہوجاتے ہیں، وہاں شادی بیاہ کرتے ہیں، میری ایک بچی عرب خاتون بیاہی ہیں، ہم اپنے اس سفر کے دوران جہاں بھی عربوں سے ملے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم کو اعلی تعلیم یافتہ عربوں سے بحث و مباحثہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن پھر بھی جن عربوں سے ملے، ان سے ہم نے پوچھا کہ حجاز کے بادشاہ کے متعلق ان کا کیا خیال ہے، ایسے ملک کا بادشاہ جہاں خدا کے علاوہ کوئی بادشاہ نہیں ہوسکتا، ان عربوں نے جواب دیا کہ یہ ایسا فعل ہے جس کی وہ مذمت کرتے ہیں، اور یہ ان کی مرضی کے خلاف عمل میں آیا، وہ اس کو غلط سمجھتے ہیں، یہ عرب اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہے، مجھکو یہ نہیں معلوم ہے کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے، ایسے بہت سے لوگ بھی ہیں جو عربوں کی طرف سے معذرت کرنے کے لیے پیش پیش ہیں، انکا عذر ہے کہ امیر فیصل اور شریف نے جو کچھ کیا وہ اسلام کو بچانے کی خاطر ہی کیا، وہ ترکوں کے خلاف نہ تھے، بلکہ وہ اسلام کے حامی ہیں، اس میں کہاں تک حقیقت ہے، اس سے قطع نظر یہ عذر پہلے نہیں پیش کیا گیا، اب پیش کیا جارہا ہے، ہم کو اس کا خوف نہیں ہے کہ ہم عربوں اور ترکوں میں مصالحت نہ کرا سکیں گے، یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اتحادی کانسل اور صلح کانفرنس مسلمانوں کے لیے چھوڑ دے کہ وہ خود اس بارے میں کچھ طے کرلیں، میری یہ ہرگز خواہش نہیں کہ سنگینوں کی مدد سے عربوں کو ترکوں کے ماتحت رکھا جائے، ہم وفاق چاہتے ہیں، اگر ہمارا یہ خواب حقیقت بنجائے تو کوئی وجہ نہیں کہ عربوں کو وہ تمام آزادی حاصل ہوجائے گی جو وہ چاہتے ہیں، وہ قومی آزادی کے ضرور دعویدار ہوسکتے ہیں لیکن وہ اس کو فراموش نہیں کرسکتے کہ اسلام قومی آزادی کے علاوہ مافوق القومی نقطۂ نظر کی بھی تعلیم دیتا ہے، اسی لحاظ سے خلافت ان کے لیے اسی طرح عزیز ہونی چاہئے جس طرح کہ ہم کو ہے، شاہ حجاز خلیفہ بننے کا دعوی نہیں کرتے ہیں، جب لوگ انکو خلیفہ کہنے لگے تو انھوں نے ان کو ڈانٹا اور اپنے سرکاری ترجمان القبلہ میں یہ شائع کرادیا کہ

وہ صرف شاہ حجاز کہلانا چاہتے ہیں، امیرالمومنین کا لقب خلیفہ کے لیے ہوتا ہے،

وزیر اعظم۔ امیرالمومنین کے کیا معنے ہوتے ہیں؟

مولانا محمد علی۔ مومنوں کا سردار، وہ ان کی سربراہی اسلام کے قانون کی خاطر کرتا ہے، اس کو بادشاہت کے اختیارات حاصل کرنے کا حق نہیں ہوتا، جناب عالی! میرا خیال ہے کہ آپ اس سے متاثر ہوں گے کہ خلافت کا نظریہ جمہوریت کا ہے، اور دنیا کے تمام سربراہوں میں خلیفہ ہی ایک ایسا سربراہ ہے جس کی تاجپوشی کی رسم کسی محل میں ادا نہیں کی جاتی ہے، وہ صرف حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر جاتا ہے، جو رسول اللہ (صلعم) کے صحابی تھے، جو قسطنطنیہ کی فتح کے لیے بھیجے گئے تھے، خلیفہ اس مزار پر آکر نماز ادا کرتا ہے، اور محمد فاتح کی تلوار کو اپنی کمر میں آویزاں کر لیتا ہے،

وزیر اعظم۔ کیا یہ خاندانی وراثت کی چیز ہے؟

مولانا محمد علی۔ اسی کی وضاحت سے خلیفہ کا مسئلہ واضح ہوجائیگا، اسلام کو دین کی مدافعت کی خاطر دنیاوی قوت کی ضرورت ہوتی ہے، اگر پرہیزگاری اور طاقت کسی ایک شخص میں جمع نہیں ہوسکتی تو مسلمانوں کا یہ عمل ہوتا ہے کہ وہ کسی زیادہ طاقتور شخص کو قبول کرلیں، اگر وہ بہت زیادہ پرہیزگار نہیں ہے، لیکن اپنی طاقت کو مسلمانوں کی پرہیزگاری کے معیار کے ماتحت رکھتا ہے، تو وہ قابل قبول ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان بنوامیہ اور بنوعباس کے حکمرانوں کو خلیفہ کی حیثیت سے تعلیم کرتے رہے، اور ترکوں کے سلاطین کو بھی اسی لحاظ خلیفہ مانتے رہے، ان کو اس لیے تسلیم کر لیا گیا کہ ان کی وجہ سے ایک زبردست طاقت دین کی حمایت کے لیے حاصل ہوتی رہی، اگر ترک عام مسلمانوں کے ساتھ اس پر رضامند ہوجائیں کہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی ادنیٰ شخص خلیفہ تسلیم کر لیا جائے تو وہ خلیفہ

بن سکتا ہے. خلفائے راشدین کے زمانہ میں کوئی بھی خلیفہ بن سکتا تھا، اگر اسی اصول کو عمل میں لایا جائے، تو تمام مسلمان بے حد خوش ہوں گے، لیکن ہم کو انسانی فطرت کی بھی کچھ رعایتیں کرنی پڑیں گی. ۱۵۱۷ء میں ترکی کے سلاطین اپنے اقتدار سے علٰحدہ ہونا نہیں چاہتے، جس طرح کہ مصر کے مملوک حکمراں نہیں ہوتے.

آخر میں ہم اپنی تجویزوں کا خلاصہ بیان کرنا چاہتے ہیں، خلیفہ مقدس مقامات کا نگراں رہے، جزیرۃ العرب پر اسی کا اقتدار اعلیٰ ہو، آپ نے جناب عالی جو وعدے کیے تھے، انکا ایفا ہو، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کی اس بارہویں دفعہ کی تکمیل ہو، جو صلح کے شرائط میں داخل ہے، اگر یہ باتیں عمل میں آگئیں تو خلیفہ کو ایسی دنیاوی طاقت حاصل رہے گی جو خلافت کے لیے ضروری ہے، اور یہ طاقت کم سے کم ہے، جو جنگ سے پہلے کر دی گئی تھی، ہندوستانی مسلمان مصالحت کے لیے بے چین ہیں، آپ کا جذبہ انتقامی نہ ہونا چاہیے، بلکہ مصالحانہ ہو، اگر ترک واقعی قابل الزام ہیں، تو مسلمانوں کو اور دوسرے لوگوں سے زیادہ اس کا خیال ہے کہ مستقبل میں ان پر ماضی کے ایسے الزامات نہ آنے پائیں، اگر ترکوں سے صحیح اور منصفانہ سمجھوتہ نہ کیا گیا تو ہندوستانی مسلمان دنیا میں امن قائم، ترکی میں اچھی حکومت بحال، ترکوں اور برطانیہ اور اسکے اتحادیوں میں میل ملاپ کرانے میں زیادہ موثر اور مفید ہونگے، ہز مجسٹی کی حکومت میں انکی مسلمان رعایا ایک مؤثر قوت ہیں، انکو مؤثر طریقہ سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے، مگر ماضی میں اس ضرورت کو محسوس نہیں کیا گیا. میں ہندوستان کے جذبات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں، مگر میرے ساتھی مسٹر سید حسین اس کو واضح اور میری معروضات میں اور کچھ اضافہ کرینگے۔

وزیر اعظم ۔ اب وہ کیا اضافہ کرینگے، آپنے یقیناً تمام مسئلہ کو پورے طور پر پیش کر دیا ہے۔

مولانا محمد علی ۔ ان کو اجازت دی جائے کہ ہندوستان کے اندر اس وقت جو جذبات ہیں، ان کو وہ بیان کریں۔

(باقی)

مرکزی سیاست اور قانون شخصی

از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس

مشہور فاضل و محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے پرسنل لا پر یہ مفید مضمون بھیجا ہے، آجکل ہندوستان میں پرسنل لا کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے، اس مضمون سے اس کے تاریخی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

قانون شخصی یعنی نکاح، طلاق، وراثت اور ان کے مماثل امور کے قواعد و احکام ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں عام طور پر ہر مذہب بلکہ ہر فرقہ دوسرے سے اختلاف رکھتا ہے، اسکے مختلف پہلو ہیں، مرکزی اور اساسی، سیاست میں ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اس مختصر نوٹ میں صرف چند پر توجہ منعطف کرائی جائے گی۔

اس کا فلسفہ یہ تاریخی واقعہ قابل ذکر ہے کہ خلافت راشدہ میں مسلمان سیلاب کی رفتار سے دنیا میں پھیل گئے، ۲۶ھ میں یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف پندرہ سال بعد حضرت عثمانؓ ہی کے زمانہ میں دار الخلافہ کا رقبہ مدینہ سے ایک طرف اندلس (اسپین) تک، اور دوسری طرف ماوراء النہر میں چینی ترکستان تک وسیع ہو گیا، اس وقت رعایا کی بہت بڑی اکثریت غیر مسلم تھی، اور ان لوگوں کی تھی جو کل تک حکمراں تھے، اور "راتوں رات" محکوم بن گئے تھے، لیکن اپنے ماضی کو بھولے نہ تھے، حضرت عثمانؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں جانشینی کے مسئلے پر خانہ جنگی شروع ہوئی جو عبد اللہ بن زبیرؓ کی شکست اور عبد الملک بن مروان کی کامیابی تک عملاً بیس سال جاری رہی، تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ اس خلفشار کے زمانے میں بھی کسی جگہ غیر مسلم رعایا نے بغاوت نہ کی حتیٰ کہ جب قیصر روم نے [illegible]

بھی یہ غیر مذہب والے (مسلمانوں) کی ماتحتی کو ترجیح دیتے رہے، اور اپنے ہم مذہب بزنطینیوں کی حکومت میں دوبارہ آنا پسند نہ کیا۔

اس کی وجہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اسلام سے کچھ پہلے بزنطینی حکومت میں عیسائیوں کے عقائد میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے، کچھ پادری کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کاملاً خدا ہیں، کچھ کہتے تھے کہ نہیں، ان میں بیک وقت دو طبیعتیں ہیں اور وہ نیم خدا اور نیم انسان ہیں، ایک تیسرے گروہ نے اس میں یہ تطبیق دی کہ ان میں طبیعتیں دو تھیں، لیکن مشیت صرف ایک تھی، شہنشاہ اس تیسرے عقیدے کی طرف مائل ہوا، اور ساری رعیت سے اس کو قبول کرانا چاہا، اس سلسلے میں بڑی سختی برتی، اور قتل و خون سے بھی دریغ نہ کیا۔

اسی زمانے میں اسلام کا ظہور ہوا، اور پیغمبر اسلام روحنا فداہ نے شہنشاہ ہرقل اور اس کے صوبہ داروں کو بھی اسلام کی دعوت دی، ایک صوبہ دار مسلمان ہو گیا لیکن دوسرے صوبہ دار نے اس دعوت کو ہتک سمجھ کر سفیر ہی کو قتل کر ڈالا، ہرقل نے نومسلم صوبہ دار کو پھانسی کی سزا دی، اور مجرم صوبہ دار کو نہ صرف کوئی سزا نہیں دی بلکہ رعایا کو ضمیر کی آزادی دینے سے بھی انکار کیا، اس پر جنگ چھڑ گئی، ہالینڈ کی مستشرق دخویے (De Goeje) اپنی کتاب "شام کی فتح پر یادداشت" صفحہ (۱۰۲ تا ۱۰۶) میں لکھتا ہے کہ "اس وقت یہ حیرت انگیز بات نظر آئی کہ بزنطینی علاقے کے عیسائیوں نے مسلمانوں کا حملہ آوروں کی طرح نہیں بلکہ نجات دہندہ کی حیثیت سے استقبال کیا، اور یہ بے وجہ نہ تھا کیونکہ مسلمان فاتحوں نے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت کے مطابق مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے جس نرمی کا سلوک کیا وہ ان کے سابق آقاؤں کے ذلیل ظلم کے بالکل برعکس تھا، ہرقل نے اس عیسائی رعایا کے جس نے سرکاری عقائد کو ماننے سے انکار کیا تھا، ناک اور کان کاٹے اور ان کے مکان ڈھائے،

اس کے برخلاف عرب اپنے مفتوحوں کے ساتھ صلح جویانہ برتاؤ کرتے رہے، اور اپنے وعدوں کی شدت سے پابندی کی، اس زمانے کے ایک نسطوری پادری کا خط اب تک محفوظ ہے، وہ لکھتا ہے کہ "ہمارے نئے آقا عرب ہمارے عیسائی مذہب سے ذرا بھی نہیں جھگڑتے، اسکے برعکس ہمارے دین کی حفاظت اور ہمارے پادریوں اور مقدس لوگوں کا احترام کرتے ہیں، اور ہمارے گرجاؤں اور خانقاہوں کو عطیے دیتے ہیں"۔

مسلمانوں نے قرآنی احکام کی تعمیل میں مفتوحہ علاقوں میں اپنا قانون جاری نہیں کیا، بلکہ ہر طبقے کو قانونی اور عدالتی آزادی دیدی، مسلمانوں کے لیے اسلامی قانون اور غیر مسلموں کے لیے ان کے اپنے قانون پر عمل رہا، حتی کہ حاکم عدالت بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے اگر فریقین مقدمہ نسطوری فرقے کے عیسائی ہوتے تو قانون بھی نسطوری اور عدالت بھی نسطوری اور حاکم عدالت بھی نسطوری ہوتا تھا، جو نسطوری قانون کے مطابق فیصلہ کرتا تھا، اور ہر فرقے کے مذہبی پیشواؤں کو اجازت تھی کہ وہ اپنا حاکم عدالت خود مقرر کیا کریں،

مسلمان حکومتیں ہزار سال سے زیادہ تک اس پر عمل کرتی رہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم رعایا نے نہ کبھی مذہبی اساس پر بغاوت کی اور نہ اپنے ہم مذہب بیرونی حملہ آوروں کی مدد کی،

یہ طریقہ مدینہ، دمشق، بغداد اور قسطنطنیہ ہی میں نہیں، بلکہ دہلی اور حیدر آباد میں بھی تھا، کیا ہندو بتا سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہزار سالہ دور حکومت میں حکومت نے کبھی ہندوؤں پر ان کے شخصی مسائل میں اپنا قانون جاری کیا ہو؟ نکاح، طلاق، وراثت، عقد بیوگان اور اس کے مماثل دوسرے معاملات میں ہمالیہ سے لیکر لنکا تک ہر فرقہ اور ہر مذہب اپنے قانون پر عمل کرتا رہا۔

جو حکومت اپنی قوت کے بل پر ساری رعایا کو ایک ہی قانون پر عامل بنانا چاہتی ہے اسے سوچ لینا چاہیے کہ وہ شہنشاہ ہرقل کا انجام چاہتی ہے یا خلیفہ ابوبکرؓ کا، یہ ہوا مسئلے کا فلسفیانہ رخ۔

اس کی عملی حیثیت | آدمی کو بعض وقت وہم ہو جاتا ہے اور وہ نامعلوم چیزوں کے متعلق قسم قسم کے مفروضے تراش لیتا ہے، اسلام میں طلاق کی آزادی ہے، انجیل میں طلاق کو حرام قرار دیا گیا ہے، مغرب نے طویل تجربے کے بعد مجبور ہو کر یورپ اور امریکہ دونوں میں کشوری قانون کے ذریعے طلاق کی اجازت دیدی، اور آج طلاقوں کا تناسب یورپ و امریکہ میں اسلامی ممالک سے اونچا ہو چکا ہے، اور چونکہ عدالتی طلاق گراں بھی ہے، طویل وقت بھی لگتا ہے، اور قسم قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور چونکہ فرنگستان میں زنا بالرضا جائز ہے، اس لیے بغیر طلاق کے ہزاروں لاکھوں شادی شدہ مرد داشتاؤں کے ساتھ، اور شادی شدہ عورتیں اپنے دوستوں کے گھر میں روز افزوں رہنے لگی ہیں۔

فرنگی قانون میں طلاق کی صرف ایک صورت ہے یعنی تفریق عدالتی، اسلام میں پانچ صورتیں ہیں،

(۱) یک طرفہ شوہر کی مرضی پر،

(۲) یک طرفہ بیوی کی مرضی پر (عقد نکاح میں تفویض طلاق کے ذریعے سے)

(۳) طرفین کی رضامندی سے (خلع کے ذریعہ سے)

(۴) تحکیم اور ثالثی کے فیصلے پر،

(۵) تفریق بحکم قاضی (یعنی حاکم عدالت)

پھر بھی جو اسلامی قانون سے مخصوص ہے طلاق میں ایک موثر مانع ہے، اور طلاق سے پہلے شوہر کو پوری طرح سوچنا پڑتا ہے، قرآن و حدیث میں طلاق کی شدید مذمت اور بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی جو تعلیم ہے اس کو فرنگی اور جمہوری دونوں زبانوں میں اس لیے کہا گیا ہے کہ

مذہبی تعلیم کو مدارس سے خارج رکھا گیا، اس میں قصور مسلمانوں کا نہیں، اگر کسی درخت کے پتے مرجھائے ہوئے نظر آئیں تو ان کو توڑنے کے بجائے جڑ کو دیکھنا چاہیے کہ اس میں کونسا کیڑا لگ گیا ہے۔

مورخ لکھتے ہیں کہ مغلیہ دور کے اختتام پر جب انگریزوں نے مردم شماری کرائی تو مسلمانوں میں تعدد ازدواج کی تعداد دو فی ہزار تھی، اقوام متحدہ کی رپورٹ ہے کہ وحدت ازدواج پر عامل پاناما میں اب پچھتر فی صد بچے نکاح کے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔ مسلمان ممالک میں مصر سب سے زیادہ "ترقی یافتہ" ہے، وہاں ایسے بچے صرف ایک فیصد ہیں، تعدد ازدواج کا کبھی یہ نتیجہ نہیں نکلا کہ بہ کثرت مسلمان اس پر عامل ہوں، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ تعدد ازدواج سے نہیں بلکہ تبلیغ سے ہوا ہے، تبلیغ میں اس دین کو زیادہ کامیابی ہوتی ہے، جو معقول اور انسانیت کے لیے مفید ہو، روپئے پیسے سے مصیبت زدوں کا ایمان خریدا جا سکتا ہے لیکن نہ وہ راسخ ہوتا ہے اور نہ دیرپا۔

اسلامی ملکوں میں یتیم پوتے کو اسکے چچا کی موجودگی میں دادا خود ہی ہبہ میں وصیت کے ذریعہ سے بہت کچھ دیتا ہے، قانون کے ذریعہ اسکو دادا کی وراثت میں لازمی حصہ دلانے میں قباحت یہ ہے کہ یہ مسائل عقائد کا جزء ہیں، اور اسلام میں کوئی انسانی طاقت خدائی احکام کو بدلنے کی مجاز نہیں، جو حکومت اس میں دخل دینا چاہے تو اسے ہر قدم کا انجام پیش نظر رکھنا چاہیے، اسلام میں ہر شخص کو آزادی ہے کہ اسکے فرقوں میں سے جس فرقے سے چاہے تعلق رکھے، سنی چاہے تو شیعہ بن جائے، شیعہ چاہے تو سنی بن جائے، اسے کوئی نہیں روک سکتا، لیکن اگر کوئی مسلمان حکومت سنیوں پر شیعہ قانون اور شیعوں پر سنی قانون نافذ کرے تو اس سے رعایا کی دلشکنی اور حکومت سے نفرت پیدا ہوگی، آج پاکستان سے زیادہ ہندوستان میں مسلمان اپنے دین پر راسخ ہیں، مصر اور الجزائر سے زیادہ روس کے مسلمان اپنے دین پر جمے ہوئے ہیں، اور پچاس سالہ دباؤ نے انکو مذہب سے پھیرنے کے بجائے اس پر اور مستحکم کر دیا ہے۔

اسلام اور عرب سوشلزم

مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے رفیق دار المصنفین

عرب ممالک میں اسلام اور قوم پرستی کے ملے جلے جذبات نے ترقی پسند سوشلسٹ تحریک کو جنم دیا ہے، لیکن یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ان ملکوں میں سوشلسٹ تحریک کے بڑھنے کی ایک خاص حد ہے، اور اسلام اس حد سے اس کو آگے نہیں جانے دیتا۔ بلاشبہہ عرب قوم پرستی اسلام ہی کی مرہون منت ہے، دنیائے عرب سے باہر عام طور پر لوگ ان دونوں چیزوں میں ایک خلیج اور تضاد محسوس کرتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں عرب قومیت ایک مخصوص لسانی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ اور مذہب سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ نیشنلزم سیکولر نظریات پر مبنی ایک اچھے طرز زندگی کا نام ہے، اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عرب قومیت پرستی کے بہت سے علمبردار خود یہ کہتے ہیں کہ ان کی نیشنلزم کی تحریک سیکولر طرز کی ہے لیکن یہ تفریق عملاً عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتی۔ دنیائے عرب میں قوم پرستی کا جذبہ ایک اہم سیاسی طاقت کا نام ہے، اور اس کا مذہب سے کوئی ٹکراؤ نہیں، عوام اور بہت سے تعلیم یافتہ ذہنوں میں بھی ملت اسلامیہ اور ملت عربیہ میں کوئی واضح فرق نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں تاریخی طور پر ایک دوسرے کے ہمیشہ ممد و معاون رہے ہیں۔ اور عرب ممالک میں قومیت کے لفظ نے ایک نئے معنی کا جامہ پہن لیا ہے جس کا مطلب ہے مسلم اتحاد، مسلمانوں کا وقار اور ان کا اہم تاریخی کردار۔

لیکن ان ملکوں میں اسلام اور نیشنلزم کے درمیان تضاد و تصادم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب نیشلسٹ لیڈر سماجی زندگی اور سیاسی اصولوں کے جدید نظریات کو اپناتے ہیں، یہاں سے اسلام اور نیشنلزم کا ٹکراؤ شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے اخلاقی اصول متضاد ہیں، اسلام اطاعت چاہتا ہے اور سوشلزم بغاوت۔ بعض دانشوروں کا دعویٰ ہے کہ اسلام اور سوشلزم ایک دوسرے کے حلیف ہیں نہ کہ حریف۔ انھوں نے بڑی ہشیاری سے اس مسئلہ پر اظہار رائے سے احتراز کیا ہے کہ سوشلسٹ تحریک کی پشت پر اصل طاقت کونسی ہے، اسلام یا سوشلزم۔ حقیقتاً تو یہ سیکولر تحریک ہے لیکن کھلم کھلا کوئی بھی اس کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا، اس لیے سوشلسٹ تحریک کے پروگرام کو نفسیاتی اور نظریاتی تصادم سے بچانے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ اسے ایک مخصوص حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ سوشلزم کو عرب جذبات نے اتنا فائدہ پہنچایا ہے جتنا سیکولر نظریات کو نہیں پہنچ سکا ہے۔ سیکولرزم کا مطلب ہے سماج کے تمام طبقوں سے ایسی مساوات برتنا جو ترقی پسندی پر مبنی ہو، انتخابات میں حصہ لینے کی پوری آزادی حاصل ہو، اور ہر فرقہ اپنے اور دوسرے کے مذہبی و اخلاقی اصولوں کا احترام کرتا ہو، لیکن بیشتر عرب ممالک چونکہ معاشی طور پر پسماندہ اور طبقاتی نابرابری کا شکار ہیں، اس لیے وہاں اس طرح کے سیکولر نظریات کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہو سکا، سیاسی طور پر جو لوگ بیدار مغز ہیں، وہ بھی ان نظریات کو زیادہ پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے۔ یہ لوگ سماجی فلاح کے لیے جن چیزوں کو اہمیت دیتے ہیں وہ ہے معاشرہ کا اتحاد، باہمی وقار اور اخلاقی قدریں، کچھ عرصہ تک تو سیکولر نظریات ان ممالک میں بہت مقبول رہے، کیونکہ ان میں سے بیشتر ملک یورپ کے زیر تسلط تھے لیکن اس زمانے میں بھی یہ نظریات ایک خاص حد سے آگے مقبول عوام نہ ہو سکے۔

سوشلزم کے کچھ اصول مندرجہ بالا نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں، ان سے مذہبیت و قومیت دونوں کے جذبات کو تسکین ملتی ہے، مثلاً سوشلسٹ تحریک ترقی، سماجی اتحاد، مساوات، معاشرتی اقتدار اور قومی وقار کی ضامن ہے، جو قوم پرستوں کے نظریات کی مؤید ہے، اور مذہبی طبقہ کے لیے موجودہ دور کی زندگی میں صراط مستقیم کا تعین کرتی ہے، ان کی تکمیل کے لیے ایسے لیڈروں کی ضرورت ہے، جنھیں عوام کی پوری حمایت حاصل ہو، ملت عربیہ نے ان تمام کاموں کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور اس میں ایسے استقلال و ثبات قدمی کا ثبوت دیا ہے کہ نیشنلسٹ طبقہ تک اس کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتا اور اسکی تائید کرتا ہے، اسی کے ساتھ ان لوگوں نے اپنے دینی و مذہبی اصولوں کو بھی فراموش نہیں کیا، اور ایسی راہ اختیار کی ہے جو جہاد کی راہ کہی جاسکتی ہے، لیکن اخلاقی اصول، صراط مستقیم "راستی" یا "جہاد" جیسی اصطلاحات کا اسلام میں وہ مفہوم نہیں ہے، جو ترقی پسند سوشلسٹ تحریک یا نیشنلزم میں ہے، جب تک ان اصطلاحات کا مطلب غیر واضح رہے گا اور قومی و مذہبی جذبات ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہیں گے کسی خطرناک تصادم کے امکانات بہت کم ہیں،

اصل دشواری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سوشلزم پر عمل درآمد کا مسئلہ آتا ہے۔ کیونکہ ملی اور قومی جذبات کے علاوہ سوشلزم کا مدار دوسری بنیادوں پر ہے، سوشلزم میں عملی سیاست اور معاشی مسائل سب سے زیادہ توجہ طلب ہوتے ہیں، اور روایتی طرز معیشت ان مسائل کا حل پیش نہیں کر پایا، ملک کے رسم و رواج، اخلاقی اقتدار کا تعین کرتے ہیں، مگر مندرجہ بالا مسائل حل نہیں کر پاتے، یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ اخلاقی اقتدار سے ملک کے سیاسی و معاشی مسائل کی اہمیت کا اندازہ ہو پاتا ہے، نہ ان مسائل

کو حل کرنے میں نہ تو کوئی واضح مقصد سامنے ہوتا ہے اور نہ حصول مقصد کے متعین وسیلے ہوتے ہیں۔ یہ تمام خصوصیات صرف سوشلزم میں پائی جاتی ہے۔ عقائد اور رسم و رواج سوشلزم کی طرف نہ صرف بڑھنے نہیں دیتے، بلکہ پہلے ہی سے اس کے عبرتناک انجام کا نقشہ پیش کرنے لگتے ہیں۔ معاشی مسائل حل کرنے کے لیے سوشلزم مادہ پرستوں اور ماہرین منصوبہ بندی سے مدد لیتا ہے، لیکن معاشیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ملک کا کوئی بھی مسئلہ صرف معاشی نہیں ہوتا، بلکہ اس کا ایک سماجی اور سیاسی پہلو بھی ہوتا ہے، اس لیے اس کے حل کے لیے ایک وسیع اور دائمی نظریاتی اصول کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً عرب کی سوشلسٹ حکومتوں یعنی مصر اور شام میں اس اصولی نظریے کا کام کمیونزم سے لیا جا رہا ہے، جو ایک دائمی اصول بھی ہے اور سائنٹفک بھی ہے، اور جس کا بعض ملکوں میں کامیاب تجربہ بھی کیا جا چکا ہے۔

عرب ممالک کے سوشلسٹ بھی ان اصولوں کی آفاقیت پر غور کر رہے ہیں، اس بارہ میں عرب جذبات اسلامی رنگ سے مل کر سوشلزم کو ایک حد تک اسی راہ پر لے جاتے ہیں، جو مارکس اور لینن کے نظریاتی اصولوں کے متوازی ہے، لیکن چونکہ اسلام اور کمیونزم کے سرچشمے علیحدہ علیحدہ ہیں، اس لیے ان دونوں کی راہیں بھی جداگانہ ہیں، اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ عرب سوشلزم ایک آفاقی اور سیکولر اصول ہے تو پھر اسے صرف عرب کا سوشلزم نہیں کہا جا سکتا، اور نہ وہ سوشلزم اسلامی ہو سکتا ہے، پھر اگر اس اصول کے آفاقی تسلیم کرلینے سے اسلام کی آفاقیت پر حرف نہ آتا تو کوئی بات نہ تھی، لیکن اس اصول کو ماننے کے بعد اسلام محض ایک اخلاقی اصول ہو کر رہ جائے گا، حالانکہ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ

قومیت کے مقابلہ میں اسلام کا بیشتر یہی حشر ہوا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے، دنیا کی ہر نیشلزم کی طرح عرب قوم پرستی بھی کسی آفاقی اصول پر مبنی نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عرب نیشلزم اسلام ہی کی پیداوار ہے،

اس وقت مسئلہ یہ درپیش ہے کہ عرب سوشلزم کی صحیح نوعیت کیا ہوگی؟ اس میں عرب رنگ زیادہ نمایاں ہوگا یا سوشلسٹ نظریات؟ بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب سوشلزم عربوں کے قومی اور تاریخی کردار کا حامل کوئی جدید ترقی یافتہ اصول ہوگا۔ ایسی صورت میں اس پر اسلام کا رنگ غالب رہیگا یا وہاں کا سوشلزم بھی اسی طرز کا ہوگا جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہے، اور جسکا مقصد طبقاتی استحصال کو روکنا ہے، اول الذکر کے پیرو کہتے ہیں کہ ہمارا سوشلزم کمیونزم نہیں ہے۔ اور وہ اس غیر ملکی نظریے کو اپنے ملک میں لانے سے احتراز کرتے ہیں، دوسری صورت کے ماننے والے اسی کے منکر ہیں کہ سوشلزم یا کمیونزم کوئی غیر ملکی نظریہ ہے، اس لیے وہ عرب سوشلزم کی اصطلاح کو ہی ناپسند کرتے ہیں، مصر کے کمیونسٹ کہتے ہیں کہ مرحوم صدر ناصر خود عرب سوشلزم کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے، اس کے بجائے ان کی اصطلاح تھی "عرب ملکوں میں چلنے والی سوشلزم کی تحریک"

مصر میں ابتک کمیونزم اور اسلام کے درمیان فرق زیر بحث ہے، لیکن شام کی بعث پارٹی نے اس فرق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، حالانکہ کمیونزم کے کچھ اصول اسلام سے اتنے مختلف ہیں کہ وہ عرب اور اسلامی تہذیب کی بنیادی باتوں پر کاری ضرب لگاتے ہیں، عرب سوشلزم کمیونزم کی مادہ پرستی اور طبقاتی خونریزی کو ماننے سے انکار کرتا ہے، اور نجی ملکیت اور تجارت کے حق کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن کیا

اس قسم کے عرب سوشلسٹ اصولی اسے کمیونزم سے الگ کرتے ہیں یا در اصل اسے کمیونزم ہی کی طرف لے جاتے ہیں، عرب ملکوں میں سوشلسٹ انقلاب کی راہ میں بڑی رکاوٹ مذہب ہے، وہاں کے بہت سے متشدد سوشلزم کے ساتھ "عرب" لگانا بھی پسند نہیں کرتے، وہ اپنی بھی زندگی میں دھریے یا مذہب کے مخالف ہیں، اور اگر انھیں موقع ملے تو وہ دہریت کا پروپیگنڈا کرنا بھی شروع کر دیں، ورنہ کم از کم دینی افکار و نظریات پر نکتہ چینی تو ضرور ہی کریں، مگر کسی اصلاح کی نیت سے نہیں، خوش قسمتی سے اب تک ان لوگوں کو دہریت کی تبلیغ کا موقع نہیں مل سکا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ان عرب ممالک میں بھی جہاں سوشلزم تحریک قدم جا چکی ہے، ارباب اقتدار عوام کو سمجھاتے رہتے ہیں کہ ان کی ہر پالیسی اور اقدام شریعت کے عین مطابق ہے، یہ حکمراں ڈرتے ہیں کہ اگر عوام کو یہ اندازہ ہو گیا کہ سوشلسٹ انقلاب اور دہریت میں کوئی ربط ہے تو وہ سوشلسٹ اقدامات کی پرزور مخالفت کریں گے، اسی لیے ۱۹۶۵ء میں مرحوم جمال عبد الناصر نے مصر کے کمیونسٹوں کو متنبہ کیا تھا کہ وہ عوام میں لادینی افکار کی تبلیغ سے باز رہیں، حالانکہ یہ تنبیہ قطعی مصنوعی تھی، کیونکہ ایسے کمیونسٹوں کو خود ناصر نے قید سے رہا کر کے ممتاز عہدوں پر فائز کیا تھا،

معاشرہ کو مستحکم بنانے کے لیے مذہب میں کچھ ایسے رسم و رواج ہوتے ہیں، جنکا سیاست سے براہ راست تصادم ہوتا ہے، مثلاً اگر سوسائٹی میں معاشی عدم مساوات ہوگی تو طبقاتی ٹکراؤ ناگزیر ہے، اس لیے اس نابرابری کو مذہب بھی دور کرنا چاہتا ہے مگر اس کے لیے اس نے قانونی انصاف اور سماجی اتحاد کی راہ بتائی ہے، طبقاتی کشمکش سے سوسائٹی کا شیرازہ منتشر ہوتا ہے، اس لیے مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا، یہی

وجہ ہے کہ طبقاتی کشمکش کے بارے میں ناصر نواز اور بعث پارٹی کے ماننے والوں کے ذہنوں میں ابھی تک دورنگی باقی ہے، اور وہ اس بات کا کوئی واضح تصور نہیں رکھتے کہ جو انقلاب وہ لانا چاہتے ہیں اس کا ڈھانچہ طبقاتی کشمکش کو اہمیت دے گا یا نہیں، دونوں کو تسلیم ہے کہ یہ کشمکش موجود ضرور ہے مگر اس کو عدم تشدد کے ذریعہ حل کرنا چاہیے، لیکن وہ اس کی وضاحت نہیں کرتے کہ اگر عدم تشدد سے یہ مسئلہ حل نہ ہوسکے تو پھر کیا کیا جائے؟ ان ہی وجوہ سے یہ مسئلہ ابھی وہاں دبا ہوا ہے، مگر کسی وقت بھی ابھر سکتا ہے۔

مصر کے مرحوم صدر جمال عبد الناصر عرب ممالک کے قدامت پسند حکمرانوں سے کبھی دوستی کرتے تھے اور کبھی دشمنی، کبھی مخالفت کے بعد پھر مصالحت کرلیتے تھے، اس سے اس غیر یقینی صورت حال کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ صدر ناصر عمر بھر یہ طے نہیں کرسکے کہ مسلم حکومتوں کے سربراہ ان کے مسلمان بھائی ہیں یا طبقاتی دشمن، یہ ظاہر ہے کہ مذہبی جذبہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کے موافق فیصلہ صادر کریگا، بعث پارٹی کے کچھ متشدد لوگ اس مسئلہ پر ناصر کی بہ نسبت ایک قطعی فیصلہ کرچکے ہیں، مثلاً ڈاکٹر نور الدین العطاشی نے ۲۴ رمئی ۱۹۶۶ء کو اعلان کیا تھا کہ

> شام عربوں کی چوٹی کانفرنسوں اور عرب اتحاد کے معاہدوں کی مذمت کرتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر یہ کانفرنسیں جاری رہیں تو مسئلہ فلسطین کے حل کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا، کیونکہ اس طرح چوٹی کانفرنسیں ان حکمرانوں کو تقویت پہنچاتی ہیں، جنھیں عوام ناپسند کرتے ہیں۔"

عرب سوشلزم کے بارہ میں اسلامی اور سیکولر نظریات میں ٹکراؤ کا ایک سبب وہاں کے حکمرانوں کی حاکمانہ ذہنیت بھی ہے، یہ حکمران نظام حکومت کو قدیم طرز کے مطابق

چلانے کے عادی رہے ہیں، اور ان کی زیادہ تر توجہ اپنے ذاتی تحفظ اور پُرشوکت زندگی پر رہی ہے، اس سے ان لوگوں کو سخت مایوسی ہوتی ہے، جو حکومت کی مشنری کو انقلاب کا آلہ بنانا چاہتے ہیں، اس وقت اسلام ایک اصول اور طرز زندگی کے بجائے ایک خاص ذہنیت کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے، عرب سوشلسٹ اس بات پر کتنا ہی زور دیں کہ اسلام میں انقلابی قوتوں کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہبی جذبات و روایات ہمیشہ قدامت پرستی کی طرف لے جاتے ہیں، اور یہ چیز مارکس اور لینن کے اصولوں، نئے سائنٹفک تجربات اور عرب سوشلسٹوں کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے، حالانکہ ذہنیت اسلام کی پیدا کردہ نہیں ہے، دراصل آج کی عرب حکومتوں کے مسائل بڑی حد تک ویسے ہی ہیں، جیسے قدیم اسلامی سلطنتوں کے سامنے تھے، جب بازنطینی اور ساسانی حکومتیں مسلمانوں کے زیر تسلط آئیں تو ان کے طرز حکومت میں تبدیلی لانا مسلم حکمرانوں کے لیے ایک اہم مسئلہ تھا، آج کے عربوں کے پاس اسلامی نظام حکومت کا ورثہ موجود ہے، اسلام میں اہم سماجی مسائل کے حل کے لیے گذشتہ روایات پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کوئی نیا طریقہ کار اپنایا جاتا ہے تو اس طریقہ کے بانیوں کو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ ان کا طریقہ پرانے روایتی طریقوں سے بہتر ہے، اور اسکا اسلامی اخلاق سے ٹکراؤ نہیں ہوگا، مصلحین کی بہت سی نسلیں اصلاح کی کوششیں کرکے تھک چکی ہیں، لیکن مندرجہ بالا ثبوت کے بغیر عوام نے ان کی باتوں کو ہمیشہ رد کر دیا ہے، اور ان کے ذہنوں میں کوئی تبدیلی نہیں آسکی، ایسی صورت میں نظریۂ حکومت کو بدلنا تو اور بھی مشکل کام ہے،

مولانا شاہ غلام مرتضیٰ جنوںؔ

اور

ان کی تفسیر مرتضوی منظوم اردو

از جناب قاضی سید عبد الرؤف صاحب اورنگ آبادی

مولانا شاہ غلام مرتضیٰ نسباً علوی اور وطناً بہاری ہیں، سنہ پیدائش اور وفات صحیح معلوم نہیں، سید عزیز الدین بلخی رآز مولف تاریخ شعرائے بہار لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۱۵۰ھ سے پہلے پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۰۰ھ کے بعد وفات پائی، جائے پیدائش اور جائے وفات بھی صحیح معلوم نہیں، مشہور شاعر سوداؔ کے ہم عصر تھے۔ سوداؔ نے ان کے ایک مصرع پہ تضمین کی ہے ؎

اے جنوںؔ مصرع ترا سوداؔ کی ہے زنجیر پا — قید سے تیرے نہیں ہونے کو اب آزاد ہم

ان کے والد محترم مولانا شاہ تیمور سہسرامی الہ آبادی ہیں، اور مولانا شاہ محمد برکت الہ آبادی سے تلمذ ہے۔ قرینہ غالب ہے کہ شاعری کے ساتھ علوم و فنون میں بھی ان سے تلمذ ہوگا،

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ صاحب دیوان تھے، مگر دیوان نایاب ہے، تفسیر منظوم اردو کی دو جلدیں تفسیر مرتضوی کے نام سے دستیاب ہوئی ہیں، پہلی جلد مختلف سورتوں کی تفسیر ہے، اور غیر مطبوعہ ہے، مخطوطہ کا سنہ کتابت سنہ ۱۲۶۴ھ اور کاتب کا نام سید امجد حسن حسنی

ساکن مولانگر، بھاگلپور (بہار ہے)، یہ مخطوطہ مولانا شاہ مرتضیٰ حسن بلخی رحمۃ اللہ علیہ سابق سجادہ نشین خانقاہ فتوحہ پٹنہ کے کتب خانہ میں ہے۔ دوسری جلد تیسویں پارہ کے کل سورتوں پر مشتمل اور مطبوعہ ہے، جو راقم کے پیش نظر ہے، اور مولانا ممدوح کے تبحر علم و فن، عقل و نقل، تقدس و تصوف کی جامعیت کی بڑی سند ہے، الفاظ کی تحقیق، لغات کا حل، قرأت قرآن کا اختلاف، روایات اور راویوں سے استناد و استشہاد، اولیا و صلحاء کے روحانی نکات متداول اور غیر متداول تفاسیر کے حوالے مفسر کے وسعت علم کے شاہد ہیں،

پیش نظر تفسیر میں شیخ اکبر یا شیخ الاسلام کشاف، تفسیر ابن عباسؓ، معالم زاہدی، لباب کلبی اور دیگر مستند تفاسیر کے حوالے ہیں، تفسیر مذکور میں ایک طرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت اقدس میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، اور آل عبا دوازدہ امام کا ذکر والہانہ انداز میں کیا ہے، تو دوسری طرف حضرات شیخین صدیق اکبر و فاروق اعظم رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مدح و منقبت ہے، اس کے علاوہ خاتم الانبیاءؐ کے ختم نبوت، شفاعت کبریٰ کا ذکر جمیل بھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مسلک اہل سنت والجماعت ہی تھا، مگر اہل بیت رسول کی محبت میں غلو تھا، تفسیر کے اختتام پر خاتمۂ کتاب کے زیر عنوان ۹۵ اشعار کی ایک نظم ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر منظوم اردو دو جلدوں میں ہے، اور اخلاف میں صرف ایک صاحبزادہ غلام حسین نامی تھے، یہ تفسیر اس دور میں تالیف ہوئی ہے، جب نظم اردو میں کوئی تفسیر عالم وجود میں نہیں آئی تھی، لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ تفسیر منظوم اردو کی اولیت کا فخر اسی کو حاصل ہے،

تفسیر کی نوعیت | اول سورتوں کا شان نزول کلمات وحروف نیز آیات ورکوع کی تعداد بیان کی ہے، صرفی قواعد، نحوی تراکیب، تحقیق الفاظ، حل لغات اور اختلاف قرأت کو جا بجا بیان کیا ہے، اور اس کے حوالے بھی دیے ہیں، سورتوں کے اختتام پر ان کے خواص وادعیہ ماثورہ بھی تحریر کیے ہیں،

تفسیر مطبوعہ کے صفحۂ اول کی عبارتیں درج ذیل ہیں:-

تفسیر مرتضوی یعنی پارۂ عم کی تفسیر نظم ہندی تصنیف مولانا شاہ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ متخلص بہ جنوںؔ ابن حضرت سید شاہ مولانا محمد تیمور الہ آبادی کو خاکسار خواجہ عبد الصمد نے بعد تصحیح کے حافظ محمد صدیق صاحب اور مولوی محمد وجیہ صاحب مدرس مدرسہ کمپنی بہادر کے مطبع علمی میں مولوی عبد الماجد بن حکیم مولوی عبد المجید خاں مرحوم نے واسطے فائدہ خاص وعام کے روز جمعہ ۱۲۹۹ھ میں چھپوایا۔

مصنف کے تفصیلی حالات اگرچہ نہیں ملے مگر مختصر ذکر مختلف تذکروں میں ہے، صاحبِ تذکرہ طبقات الشعراء، قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں:-

> جنوںؔ مردیست ذوفنون از خاندان عالی بہرۂ وافی از فقر و درویشی دارد از معاصرین مرزا رفیع سوداؔ موصوف کہ در حق او می گوید
>
> اے جنوں مصرع تر اسودا کی ہوزنجیر پا | قید سے تیرے نہیں ہونے کو اب آزاد ہم
>
> گویند مردیست مہذب، پاکیزہ، صورت نہایت خوش مذاق و قابل و در اکثر فنون کامل، دیوان ریختہ ترتیب دادہ و بسیار معانی تلاش در و نمودہ فاما اشعارش ایں راقم الحروف بہم نہ رسیدہ اگرچہ از چند روز در ظاہر اعمٰی وسلب بصارت او شدہ است فاما ایں چند ابیات دال بر بصارت باطنی و

خوش فکری و خوش تلاشی ا وست "

از وست

دشمن جاں ہو گئی آخر یہ بینائی مجھے	جو بلا کیئے سو ان آنکھوں نے دکھلائی مجھے
گن کے قدم رکھے ہے یار اک دو سہ چار پنج شش	مر گئے ہم تھے غمگسار اک دو سہ چار پنج شش
ساقی تو اب اٹھالے آگے سے یہ گلابیاں	شیشہ ہی طاق سے لا اک دو سہ چار پنج شش
پھر کوئی جام لیکے بیٹھے تا کہیں ہوں سیاہ مست	دے مجھے بھر کے ایک ہی بار اک دو سہ چار پانچ شش
پنجۂ تقدیر سے کیا بس چلے تدبیر کا	اے جنوں ہوگا وہی جو ہے لکھا تقدیر کا
مرشد کامل ہے دہ وعشق ہر مذہب کے بیچ	میں تو کافر ہوں اگر بندہ نہ ہوں اس پیر کا
کھینچیں شکل عاشق و معشوق اب دیوار پہ	اب یہ نکلا ہے رواج اس شہر کی تعمیر کا
تب جنوں کہنے لگا ہم تجھ سے فرمائش کریں	اے تصور سیکھ لے یہ طور ہے تحریر کا
مجھ گریباں چاک کو تو اس کا دامن گیر کر	اس طرح نقشہ اتارا اس نے مری تصویر کا
پہنچا کوئی کبھو سے کوئی دیر سے پہنچا	تھی جس پہ تری مہر وہی خیر سے پہنچا
جوں قبلہ نما اپنے جنوں گرد پھرا پھر	واللہ مجھے کچھ نہ کسی غیر سے پہنچا
کب ماہ اس سمک میں ہم سنگ ہو تمہارا	حقا کہ حسن یوسف پاسنگ ہے تمہارا
آنکھیں مری تمہارے یوں رنگ میں رنگی ہیں	جو رنگ ہوں دکھاتا سو رنگ ہے تمہارا
لاکھوں ہی رنگ گل کے رنگ میں تمہارے دیکھے	دیکھا نہ ہر کسو نے کیا رنگ ہے تمہارا
آنکھیں بھی چڑھ رہی ہیں منہ بھی اتر رہا ہے	کچھ رنگ ان دنوں میں بے رنگ ہے تمہارا
اک بوسہ ان لبوں سے دیے جنوں کو بھی	اے غنچہ لب نہایت دل تنگ ہے تمہارا

تذکرۂ شورش و تذکرۂ عشق مطبوعہ ۱۹۵۹ء،

تذکرۂ شورش و تذکرۂ عشق کا نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ لندن میں ہے اور تذکرۂ عشق کا دوسرا نسخہ قاضی سید عبدالودود صاحب کی ملکیت میں ہے، حسب منشا تذکرۂ شورش

لکھتے ہیں :۔

جنون دیگر شاہ غلام مرتضیٰ الہ آبادی جنون تخلص ابن حضرت شاہ تیمور قدس سرہٗ شاگرد مولوی برکت الہ آبادی قدس سرہٗ کا ہے، فکر شعر فارسی لگا ہے ریختہ می فرمایند از وست

کہیو خدا سے اے ملک الموت جائے تو دیتا نہیں ہے جی کو جنون شاہ کیا کروں

مصنف تذکرۂ عشق کا بیان ہے :۔

جنون تخلص الہ آبادی موسوم بہ شیخ غلام مرتضیٰ خلف شاہ تیمور سہسرامی از شاگردان مولوی محمد برکت جوانے طالب علم مستعد است و رسائی طبع وجودت رائے انصاف دارد می گویند از چندے بصارت چشمانش اغماض عین نمودہ آں بیچارہ از دید دنیائے زماں معطل می ساخت ۔"

شورش نے ۱۱۹۰ھ میں وفات پائی، تذکرۂ عشق ۱۲۳۰ھ میں مرتب ہوا ہے، تذکرہ کی مذکورہ بالا تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت جنون زندہ تھے۔

گلزار ابراہیم مخطوطہ، مولفہ نواب علی ابراہیم خاں خلیل میں ہے :

جنون تخلص، شاہ غلام مرتضیٰ نام، شاگرد مولوی محمد برکت مقیم الہ آباد سہسرامی درویش تھے، آخر ایام میں نابینا ہو گئے تھے،

عبدالغفور خاں بہادر نساخ سخن شعراء میں لکھتے ہیں :۔

جنون تخلص، شاہ غلام مرتضیٰ ساکن سہسرام شاہ آباد شاگرد برکت

تری چشم مست سے ساقیا یہ سیاہ مست جنوں ہوا

گرے وہ آتشہ طاق پر جو دھری تھی یونہی دھری رہی

اب تفسیر مرتضوی کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

سورۂ والشمس وضحٰہا کی آیت قد افلح من زکّٰہا وقد خاب من دسّٰہا کا

ترجمہ اور تفسیر ؎

بے گماں ناجی ہوا جس نے کیا — پاک نفس اپنے کو از شرک وریا
یا ہوا ناجی بحق وجسم خاک — نفس کو جس نے کیا توبہ سے پاک
اور کیا تعلیم اخلاقِ نکو — تا نہ ہو اوصاف بد کے زشت خو
بالیقیں وہ شخص بے بہرہ رہا — جس نے اپنے نفس کے تئیں گم کیا
لذتِ فسق و معاصی میں تمام — مست لایعقل رکھا ہر صبح و شام
یوں روایت ہے کہ حضرت مصطفٰے — جب یہ آیت پڑھتے پڑھتے یہ دعا
اللھم آت نفسی تقونہا وزکّٰہا — انت خیر من زکّٰہا انت ولیہا ومولٰہا
کہتے ہیں سارے محقق بے خلاف — تزکیہ سے نفس کے دل ہووے صاف

سورۂ کورت، آیت واذا الموٗدۃ سئلت بای ذنب قتلت ؎

اور جس دن دختران خوش لقا — زندہ خاکِ گور میں جن کو کیا
پوچھے جاوینگے کہ ایسا کیا گناہ — تم ہی سے واں صادر ہوا تھا شام و پگاہ
جس گنہ کے واسطے مارا انھیں — جیتے ہی جی گور میں گاڑا انھیں
تھی یہ عادت جاہلی قومِ عرب — لڑکی ان کے گھر میں پیدا ہوتی جب
خوفِ درویشی سے یا از ننگ و عار — زندہ در گور اس کو کرتے نابکار

حدیث قدسی " قال اللہ تعالیٰ انفاسک امینائی کا ترجمہ ؎

حق نے فرمایا ہے کو جی سے قبول — کہ تیرے انفاس ہیں میرے رسول

حدیث قدسی اذ تنفست بذکری فقد احییت انبیائی ؎

جب تو میرے ذکر میں لیتا ہے دم ان رسولوں کو جلاتا ہے ہم

حدیث" واذا تنفست بغیر ذکری فعلیک دیتی فان دیتی ؎

جب تو دم مارے ہے بے یاد خدا قتل تو کرتا ہے میرے انبیا
پس ہے تجھ پر خوں بہائے انبیا پس کہاں ہے پاس تیرے خوں بہا

سورہ والنازعات غرقاً

آیت واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ ؎

پس ولی ہے جس کے دل میں ترس و بیم ہے مجھے پیش خدا ہونا مقیم
ہے کھڑا ہونا مجھے بہر حساب اور خدا کو اپنے دینا ہے جواب
اور رکھا اس نفس کو باز از ہوا یعنی حرص و آز سے مانع ہوا
پس ہے جنت بے گماں جائے پناہ ہے وہ جائے عشرت و آرامگاہ
پیرو فرعون ہے وہ خیرہ سر نفس جس کا ہے امام و راہ بر
پیرو موسیٰ ہیں وہ مرد خدا کہ رکھیں ہیں نفس کو باز از ہوا
مذکور ہے از مردمان ذی عقول دیکھ لے لکھتا ہے یوں اہل فضول
سن لے یہ آیت ہے اسکے شان میں کہ خلاف نفس ہو اس آن میں
ہو شب تنہائی در جائے پناہ پاس ہو محبوب رشک مہر و ماہ
وہاں رہے خوف خدا سے اپنے باز جنتی بے شک ہے وہ اہل نیاز
از خلاف نفس و از خوف خدا اپنے تئیں اس جرم سے رکھے بچا
روح شاہ و جسم نفس اس کی کنیز دل وزیر شاہ ہے با تمیز

جان ہوا جب نفس امّارہ کا رام — شہ ہوا تب لونڈی کا غلام

مت کہا کر نفس کا اے باتمیز — مصر دل میں ہوگا جیوں یوسف عزیز

دل میں رکھ یک صاحب دل کا کلام — دل سے سن تیرے بہت آئیگا کام

کہتے ہیں بالغ اسے مردان خاص — کہ ہوائے نفس سے پاوے خلاص

نہ ہے بالغ جو ہے پابند ہوا — گرچہ ہو جوں چرخ پیری سے دوتا

مت تعجب کر کہ بانفس ردی — جمع ہو ریش سفید و امردی

یہ سنا تو نے حکیموں کا مقال — کہ بزرگی ہے بعقل و نہ بسال

مرد بوڑھا ہو حرص سو ہے جوان — پیر نا بالغ ہیں اکثر مردمان

دیکھا ہوگا حال اس تجار کا — شیخ سعدی نے گلستاں میں لکھا

آں شنیدستی کہ وقتے تاجرے — در بیابانے بیفتاد از خرے

گفت چشم تنگ دنیا دار را — یا قناعت پر کند یا خاک گور

خلق اطفال اند جز مست خدا — نیست بالغ جز رمیدہ از ہوا

اہل دل نے یہ حدیث مصطفیٰ — سن کے اس کو صحیفۂ دل پہ لکھا

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بئس العبد عبد الهوىٰ یضلّہ

بد ہے بندوں میں وہ بندہ نفس کا — جس کو حرص و آز نے گمراہ کیا

کوئی عمل اے سالک راہ خدا — نہیں تجھے انفع بجز ترک ہوا

سورۂ والنّٰزعٰت غرقاً

فنادیٰ فقال انا ربکم الاعلیٰ ؎

پس بلایا پس کہا یہ آشکار — میں تمہارا ہوں بڑا پروردگار

پوجتے جو جو بتوں کو روز و شب ۔۔۔ رب اعلیٰ میں ہوں اور ادنیٰ ہیں سب
یہ لطیفہ ہے لطائف میں لکھا ۔۔۔ یہ سخن ابلیس نے جس دم سنا
اس طرح کہنے لگا وہ راہزن ۔۔۔ کہ میں سن سکتا نہیں ہوں یہ سخن
یوں لگا کہنے دکھا کر پیچ و تاب ۔۔۔ کہ مجھے نہ اس سخن سننے کی تاب
جو انا خیر وہاں میں نے کہا ۔۔۔ اتنے پر تو اس طرح راندہ گیا
ماری ہے یہ لاف جو وہ آشکار ۔۔۔ دیکھئے کیا اس کا ہو انجام کار
منہ پہ ت چھوٹا اور یہ کلمہ بڑا ۔۔۔ ربکم الاعلیٰ جو کہتا ہے بڑا
روز و شب کہتا ہے یہ بیٹھے کھڑے ۔۔۔ دیکھئے اس کے اوپر کیسی پڑے

فاخذہ اللہ نکال الآخرۃ

پس اسے پکڑا خدا نے مستقیم ۔۔۔ در عذاب آخرت لے در جحیم
یعنی ڈالا اسکے تئیں بیقال وقیل ۔۔۔ آتش دوزخ میں بعد از غرق نیل

والاولیٰ

اور نکال دنیوی ہے یہ عذاب ۔۔۔ کر دیا دریا میں اول غرق آب
یا یہ دو کلمہ جو کہتا تھا عیاں ۔۔۔ حق نے پکڑا در عذاب دو جہاں
پہلے تو کہتا تھا وہ کافر دنی ۔۔۔ یعنی میں ہوں رب اعلیٰ از منی
بعد ازیں کہنے لگا وہ نابکار ۔۔۔ کون ہے میرے سوا پروردگار
یعنی یوں کہتا تھا وہ گم کردہ راہ ۔۔۔ قبطیوں سے ما لکم غیری الٰہ
اپنی فوج کو کہا کہ ”ما علمت لکم من الٰہٍ غیری“
اے میرے بندو نہیں میں جانتا ۔۔۔ کوئی تمھارا ہے خدا میرے سوا

شیخ رکن الدین تھے والا صفات | اس میں فرماتے ہیں کیا عالی نکات
ایک دن مجھ پہ عجیب حالت ہوئی | روح میری سیر علوی کو گئی
دل میں آیا عالم علوی میں جا | دیکھیے احوال ٹک منصور کا
جب میں علیین میں پہنچا تیز گام | اس کو پایا میں نے در عالی مقام
حق سے کی میں یہ دعا اور التجا | ہو علانیہ کہ اس میں بھید ہے کیا
یعنی میں ہوں رب کہا مغرور نے | اور انا الحق ہے کہا منصور نے
ایک ہی قول دونوں کا ہے میرے رب | ایک پر ہو رحمت اور یک پہ غضب
روح ہے فرعون کی سجین میں | اور ہے منصور علیین میں
حیف ہے جباری اے پروردگار | جبر میں بندوں کا ہے کیا اختیار
اختیار بندہ کہتے ہیں غلط | یہاں تو ہے جبار جباری فقط
اور وہیں گوش دل میں آئی یہ ندا | جانِ از خود رفتہ پہ القا ہوا
تھی انا فرعون کی ظلمت فزا | کیونکہ خود بیں تھا نہ بینائی خدا
نور تھا چشم خود بیں سے نہاں | چشم خود بیں میں خدا بینی کہاں
وہ خودی سے اپنے تئیں کہتا تھا رب | اس لیے میں نے کیا اس پر غضب
تھی انا منصور کی میری انا | کیونکہ تھا وہ پیش حق میں فنا
جب ہوا منصور خالی از خودی | نور حق سے بھر گیا وہ جسدی
رنگ سے جب پاوے آئینہ صفا | تو انا الشمس اس کو کہنا ہے بجا
دیدۂ منصور تھا بینا بحق | لے گیا فرعون پہ اسے سبق
دیدۂ فرعون تھا بینا بخود | ہو گیا وہ اسی خود بینی سے رد

انے جنوں تو نفی ؟ سے — تاکہ ہو اثبات حق اس بات سے
رکھ تو ایک آئینہ پیش آفتاب — دیکھ عکس مہر تاباں بے حجاب
ایک انا تیری ہے ایک حق کی انا — اس انا کو اس انا میں کر فنا
ایک انا باطل ہے اس میں ایک حق — جب کہ آیا حق ہوا باطل زھق

عم یتسألون

اصل میں تھا عم عنہا اے پسر — نون کیتی کر میم پھر ادغام کر
کر الف کو حذف سن معنی بجاں — پوچھیں ہیں کس چیز سے یہ کافراں

آیت وجعلنا اللیل لباساً

اور ترجمہ دانا ہے ہم نے رات کو — پردۂ کار بد کار نکو
شیخ اکبر کے سخن پہ کر تو میل — معنی شب ہے پردۂ اصحاب لیل
شب ملاتی ہے انھوں کو یار سے — کر کے پنہاں دیدۂ اغیار سے
تاکہ اس خلوت میں ان کو با حبیب — لذت دیدار ہوتی ہے نصیب
ہوئے ہیں محبوب جاں سے ہم کلام — پیتے ہیں جام حضوری کو مدام
درخور احوال و استعداد خویش — ہوتے ہیں برخوردار ہر درویش ریش
یہ سخن سن لے تو شیخ اسلام کا — ہے یہ نکتہ سالکوں کے کام کا
یعنی شب ہے پردہ دار سالکاں — پردہ پوش کاروبار عاشقاں
شب ہے پردۂ گریۂ عشاق کا — شب ہے پردہ عاشق بیتاب کا
شب ہے پردہ دیدۂ بیخواب کا — شب ہے پردہ عاشق بے تاب کا
شب دل عشاق کی ہے رازدار — عاشق و معشوق کی ہے غمگسار
کہتے ہیں اہل وصال دوست سب — کاشکی تا صبح قیامت رہتی شب

(باقی)

ادبیات

غزل

از جناب عروجؔ زیدی

اس تلون کا برا ہو کیا تھا اور کیا بن گیا
ایک ایمانِ وفا، کفرِ سراپا بن گیا

ترجمانِ حالِ دل پانی کا قطرہ بن گیا
اک لرزتا اشک شکووں کا خلاصا بن گیا

آدمی انسان بنتا، درد انساں جانتا
زہد سے تو یہ بزعم خود فرشتا بن گیا

غیر جانبدار رہتا یہ مرے حالات پر
وقت بھی منجملۂ اہلِ تماشا بن گیا

میری عرضِ شوق کی تفسیر ہے رنگ برنگ
مدعا لفظ و بیاں سے اک معما بن گیا

اسکا شاہد طور بھی، عرش بریں بھی، دار بھی
آپ نے جیسا بنایا عشق ویسا بن گیا

ہم نے موڑی ہے کلائی گردشِ ایام کی
اور یہ کردار دنیا کو نمونا بن گیا

اس کو دنیا اور مافیہا سے کچھ مطلب نہیں
جو بھری دنیا کو ٹھکرا کر تمھارا بن گیا

یوں بھی نظریں اٹھ نہ پاتیں احترامِ حسن سے
تابشِ جلوہ سے خود جلوہ ہی پردا بن گیا

اس کی جرأت پر نچھاور راحتِ کون و مکاں
جو ترے دردِ محبت کا شناسا بن گیا

حسن کی فطرت میں نرمی ہی نہیں گرمی بھی ہے
گاہ شبنم ہو گیا یہ گاہ شعلا بن گیا

جیتے جی تو حرفِ ناگفتہ تھا میں لیکن عروجؔ
موت نے جادو جگایا تو صحیفا بن گیا

غزل

از جناب سید رفیع الدین احمد صاحب سالک رحمانی

جس غم سے ہم کو منصبِ لوح و قلم ملے　　　یارب اگر ملے تو ہمیں ایسا غم ملے

سب بھول جاؤں آپکے روضہ کے سامنے　　　میری نوائے شوق کو بابِ حرم ملے

ہر منزلِ حیات تھی اپنا ہی نقشِ غم　　　ہر اک قدم پہ اپنے ہی نقشِ قدم ملے

جو پیچ و خم ہیں آج ہمارے مزاج میں　　　ایسے نہ راستوں میں کہیں پیچ و خم ملے

ان آنسوؤں کا دیکھنے والا کوئی تو ہو　　　جن آنسوؤں سے دامنِ پندار نم ملے

مہر و وفا کے نام سے کھاتے تھے جو قسم　　　وہ بھی اسیر شیوۂ جور و ستم ملے

وہ جنس دیجے کہ دولتِ کونین بخشدی　　　یوں بھی کبھی کبھی ہمیں اہلِ کرم ملے

اک آدمی جو بزمِ سرور و نشاط میں　　　ملتا تھا گاہ گاہ مگر اب تو کم ملے

سالک ہم اس مقام کی عظمت کو کیا کہیں　　　اس کی گلی میں آج تو شیخِ حرم ملے

غزل

از جناب اسلم سندیلوی

کاش وہ اتنا ہی چاکِ گریباں ہوتا جاتا ہے　　　فراواں جس قدر شوقِ فراواں ہوتا جاتا ہے

سوا ہر لحظہ ہوتی جاتی ہیں بیتابیاں دل کی　　　الٰہی خیر۔ ساحل نذرِ طوفاں ہوتا جاتا ہے

سحر سے دونوں وابستہ ہیں گل بھی اور شبنم بھی　　　یہ گریاں ہوتی جاتی ہے وہ خنداں ہوتا جاتا ہے

نگاہوں سے حجاباتِ مجازی اٹھتے جاتے ہیں　　　دلوں پر منکشف رازِ گلستاں ہوتا جاتا ہے

سوا کچھ اتنی ہی ہوتی ہیں اسلم رحمتیں اس کی
کشادہ جتنا امید وں کا دامن ہوتا جاتا ہے

مطبوعات جدیدہ

سید امیر علی ۔ مرتبہ جناب شاہد حسین صاحب رزاقی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۳۱۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت [illegible]، پتہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، پاکستان۔

جسٹس سید امیر علی مرحوم نے انیسویں صدی کے مسلمانوں کی علمی وفکری، تہذیبی و معاشرتی اور قومی وسیاسی بیداری میں بڑا حصہ لیا، اور انگریزی زبان میں متعدد وبلند پایہ کتابیں لکھیں، جن میں یورپ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے لائق رکن جناب شاہد حسین رزاقی نے سید امیر علی کے خود نوشت حالات اور دوسری تصنیفات کی مدد سے یہ سوانح عمری مرتب کی ہے، جو تین حصوں میں ہے۔ پہلے حصہ میں ان کے خاندانی حالات تعلیم، بنگال ہائی کورٹ میں پریکٹس اور انگلستان میں قیام وغیرہ کا ذکر ہے، دوسرا حصہ ان کی قومی وسیاسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے، اس میں ہندوستان کے عام امور ومسائل خصوصاً ہندوستان اور اسلامی ملکوں کے مسلمانوں کے اہم مسائل اور تحریکوں سے متعلق ان کی خدمات اور کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے، آخری حصہ میں ان کی دینی وعلمی خدمات کا بیان ہے۔ اس سلسلہ میں عورتوں کے حقوق، تعدد ازدواج، طلاق، غلامی اور غیر مسلموں سے رواداری وغیرہ کے متعلق اسلام پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کے جوابات اور مسلمانوں کی جدید تعلیم، اس کے اداروں اور تعلیم نسواں کی ضرورت

واہمیت اور رائج الوقت نظام تعلیم کے نقائص وغیرہ کے متعلق امیر علی کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے، اور ان کی تصنیفات و مقالات کا مفصل تعارف کرایا گیا ہے، آخر میں ان کے ان خطوط و مراسلات کی فہرست ہے، جو لندن کے بعض اخبارات میں ہندوستانی مسلمانوں اور اسلامی ملکوں کے مفاد کے بارے میں لکھے تھے، یہ کتاب سید امیر علی کے حالات و سوانح، افکار و خیالات اور خدمات و کمالات کا مرقع ہے اور اس سے ان کی قومی، وطنی اور مذہبی و ملی خدمات کے سلسلہ میں مسلمانوں کی اس عہد کی قومی و سیاسی تاریخ کا اجمالی خاکہ سامنے آجاتا ہے، اس لحاظ سے یہ دلچسپ، پر از معلومات اور اردو کے سوانحی ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہے، مگر امیر علی کے بعض مذہبی و سیاسی خیالات مثلاً پردہ، تعدد ازدواج، غلامی اور جداگانہ قومیت کے نظریہ سے عام مسلمانوں کو اتفاق نہیں تھا، مصنف نے ان کے ان خیالات کی صرف ترجمانی پر اکتفا کیا ہے، اور ان کو بغیر کسی نقد و تبصرہ کے نقل کر دیا ہے۔

ترجمۂ قرآن ۔ از مولانا حمید الدین فراہیؒ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۲۰، قیمت عہ؍ ۲ پیسے۔ پتے (۱) مکتبۃ الحسنات رام پور (یو۔پی) (۲) دار الحمید پھریہا ضلع اعظم گڈھ (یو۔پی)

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ نے ایک زمانہ میں قرآن مجید کا اردو ترجمہ کرنا چاہا تھا، مگر قرآن مجید سے متعلق دوسرے اہم کاموں نے اس کا موقع نہیں دیا، اس لیے وہ صرف آخر کے سوا پارے (سورۂ قیامہ تا ناس) کا ترجمہ کر سکے، عرصہ ہوا اس کا نمونہ دائرۂ حمیدیہ کے مرحوم مجلہ "الاصلاح" میں چھپا تھا، اور اب اس کے موجودہ ناظم مولانا بدر الدین اصلاحی نے جو مولانا فراہیؒ اور ان کی تصنیفات کے اداشناس اور گذشتہ

چند برسوں میں ان کی کئی مفید اور اہم قرآنی تصنیفات بڑے اہتمام سے شائع کرچکے ہیں، اس ترجمہ کو بھی شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا، مگر ابن حمید صاحب نے ان کے اہتمام و نگرانی کے بغیر ہی اس کو چھاپا ہے، اس لیے اس میں ان کے مقدمہ کی کمی رہ گئی ہے، نفس ترجمہ نہایت شستہ و شگفتہ، مختصر و بلیغ اور حشو و زوائد سے پاک ہے، ترجمہ سے پہلے فاضل مترجم نے قرآن کے ترجمہ کے متعلق مفید اور ضروری اصول بیان کیے ہیں، اور شروع میں انکے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی کا ایک مضمون درج ہے، جو مولانا فراہیؒ کے حالات و سوانح اور اوصاف و کمالات کا مرقع ہے، طلبۂ قرآن کو اس ترجمہ کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

دعوت مسلم یونیورسٹی نمبر۔ مرتبہ جناب محمد مسلم صاحب، اخباری سائز، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی صفحات ۶۸، قیمت عہ، پتہ دفتر روزنامہ دعوت، دہلی۔

مسلمانان ہند کے مشہور تعلیمی و تہذیبی ادارہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نئے ایکٹ سے سارے ملک میں جو اضطراب بپا ہے، یہ نمبر اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں یونیورسٹی کے آغاز سے ابتک کے حالات و کوائف کا جائزہ لیا گیا ہے، اس کے قیام کی غرض و غایت، اس کے بانیوں اور ذمہ داروں کے عزائم و منصوبے اور اسکی گذشتہ روایات و خصوصیات بیان کی گئی ہیں، اور ۱۹۲۰ء کا ایکٹ جب اس نے باقاعدہ یونیورسٹی کی شکل اختیار کی اور ۱۹۶۷ء کا نیا ایکٹ درج کرکے دونوں کا فرق اور موخر الذکر کے خلاف مسلمانوں اور ملک کی سیکولر و ترقی پسند جماعتوں کے احتجاج و تشویش کے اسباب کی وضاحت کی گئی ہے، اور ۱۹۶۵ء کے عارضی آرڈیننس سے پیدا ہونے والی غیر اطمینانی حالت کے بارہ میں مسلمانوں کی اہم جماعتوں کی قراردادیں، اکابر کے بیانات اور اخباروں کے تاثرات کے علاوہ خود حکومت کی مقرر کردہ کمیٹیوں کی سفارشات اور تجویزیں بھی درج کی گئی ہیں۔

یہ نمبر مسلم یونیورسٹی کی گذشتہ تاریخ و روایات اور مقاصد خصوصیات وغیرہ کے متعلق معلومات افزا مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایک قیمتی دستاویز ہے، اور اس سے یونیورسٹی کے بارہ میں حکومت کے موجودہ موقف کا غلط، غیر آئینی، حکومت کی اپنی مقررہ کمیشیوں کی سفارشات، اس کی اب تک کی یقین دہانیوں اور ۱۹۷۱ء کے کانگریس کے انتخابی منشور کے سراسر خلاف ہونا اچھی طرح ظاہر ہوجاتا ہے۔

ندائے ملت جائزہ نمبر - مرتبہ جناب محمد عبد القدوس، حکیم عبد القوی، نور عظیم ندوی و نذر الحفیظ ندوی صاحبان، بڑا اخباری سائز، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۰، قیمت للعہ، پتہ دفتر ندائے ملت، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

ہفت روزہ ندائے ملت کو خاص نمبروں کی وجہ سے بھی شہرت و امتیاز حاصل ہے، اس سال اس نے آزادی کے جشن سیمیں کے موقع پر یہ ضخیم نمبر شائع کیا ہے، اس میں ان حالات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، جن سے آزادی کے بعد عموماً پورا ملک اور خصوصاً مسلمان دوچار ہیں، یہ نمبر تین درجن مفید اور متنوع مضامین پر مشتمل ہے، یہ سب مضامین خوش سلیقگی سے مختلف عنوانات کے تحت مرتب کیے گئے ہیں، پہلے حصہ میں "ذکر دار و رسن" کے زیر عنوان آزادی کی جد و جہد کی مختصر سرگذشت، اس میں مسلمانوں کا حصہ اور ان کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں، "روداد چمن" کے عنوان سے ہندوستان کے آئین و جمہوریت کی خصوصیت وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد جمہوریت کو لاحق خطرات، مسلمانوں کے آلام و مصائب، ان کی سیاسی، معاشی، تعلیمی اور معاشرتی پسماندگی، اور ملک کی سیاسی و معاشی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ "تعمیر نشیمن" کے عنوان سے مفید، حوصلہ افزا اور تعمیری مضامین درج ہیں نظموں اور طنزیہ مضامین کی چاشنی نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے، اس کے علاوہ ہندوستان کے جدید اکابر و علماء

اور اصحاب علم و قلم مثلاً ملا جگو پال اچاریہ اے پرکاش نرائن اچاریہ کرپلانی، ملراج مدھوک، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، اور مولانا محمد عثمان فارقلیط کے افکار و مضامین بھی ہیں، لیکن بعض مضامین میں لب و لہجہ جذباتی اور شکایت کا انداز تلخ ہے، گو حکومت سے مسلمانوں کی شکایتیں بجا ہیں، مگر ان کو خود بھی اپنے حالات و مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے، اس سے قطع نظر یہ نمبر ہر حیثیت سے قابل قدر ہے، نداے ملت ملکی خصوصاً مسلمانوں کے مسائل پر بڑا اچھا ناقدانہ تبصرہ کرتا ہے، یہ نمبر خصوصیت سے اس کا نمونہ ہے، امید ہے کہ مسلمان اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے، اور اکثریت کے سنجیدہ اور ذمہ دار لوگ بھی انصاف اور حقیقت پسندی سے اس کا مطالعہ کریں گے۔

امریکہ کے کالے مسلمان ۔ از ڈاکٹر مشیر الحق صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۸۰، قیمت عے، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

امریکہ کے تقریباً ۲ کروڑ حبشیوں میں عیسائیوں اور یہودیوں سے زیادہ مسلمانوں کی تعداد ہے، ان میں سنی، شیعہ اور قادیانیوں کے علاوہ ایک بڑا اور منظم طبقہ ان لوگوں کا ہے جو کالے مسلمان کہلاتے ہیں، ان کی تحریک مذہبی و دینی سے زیادہ قومی، سیاسی اور عالمی ہے، اردو خواں طبقہ کو ان کے بارہ میں بہت کم واقفیت ہے، اس لیے لائق مصنف نے اپنے کناڈا کے قیام کے دوران میں اور اس کے بعد انگریزی کتابوں کی مدد سے ان کالے مسلمانوں کے بارہ میں معلومات حاصل کرکے یہ کتاب لکھی ہے، اس میں حسب ذیل پانچ ابواب ہیں:

(۱) کالی قومیت (۲) کالا ایمان (۳) کالا اسلام (۴) کالے لوگ (۵) کالا دیس۔

ان ابواب میں کالے مسلمانوں کے مخصوص عقائد و مزعومات، سیاسی و سماجی رجحانات، اور دوسری سرگرمیوں کے متعلق ان کی صحت و عدم صحت کا ذکر کیے بغیر جو معلومات حاصل ہوئے ہیں

ان کو قلمبند کر دیا گیا ہے، اردو میں امریکہ کے کالے مسلمانوں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، اس لحاظ سے یہ کتاب بہت مفید ہے،

تین دیوانے ـ از جناب م، احمد ایم اے صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۹۲، قیمت ۲؍ ۲۵ پیسے، پتہ الجمعیۃ بکڈپو، گلی قاسم جان، دہلی

اس مزاحیہ کتاب میں آزادی کے بعد کی سیاسی و اخلاقی حالت اور ملک میں ہونے والے آئے دن کے شرمناک فرقہ وارانہ فسادات کا خاکہ کھینچا گیا ہے، اس سے سرکاری محکموں کی بدعنوانی، رشوت خوری دفتری کاموں سے لاپروائی، حکام اور پولیس کی فرض ناشناسی، اور سیاستدانوں اور حکمرانوں کی ذاتی نفع اندوزی اور منافقانہ کردار وغیرہ کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، چند مضامین میں پاکستان کی ابتر سیاسی، مذہبی اور اخلاقی حالت کی عکاسی بھی کی گئی ہے، آخر میں فسادات سے تباہ حال اور خانماں برباد لوگوں کے ہمت و حوصلہ کو بڑھانے والے چند مضامین دیے گئے ہیں، یہ کتاب گو زمانہ سازی اور مصلحت کیشی سے ناواقف سچے محب قوم و وطن تین دیوانوں کی باہمی گفتگو پر مشتمل ہے، مگر یہ دراصل ملک کے ابتر حالات پر بلیغ اور معنی خیز تبصرہ ہے، کاش "فرزانے" بھی اس پر توجہ دیتے۔

چلم نامہ ـ از جناب محمد یوسف صاحب پاپا، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۵۸ قیمت عہ، پتہ اردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

جناب محمد یوسف پاپا استاد فزکس جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کو سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں قسم کی شاعری کا ذوق ہے، چلم نامہ انکی طنزیہ شاعری کا نمونہ ہے، اس میں ان لوگوں کے کردار کی عکاسی کیگئی ہے جن کی عزت و شہرت اور وجاہت و اعزاز خوشامد اور تملق کا رہین منت ہوتا ہے، یہ مجموعہ سماج کے نااہل اور خوشامدی لوگوں پر ایک گہرا طنز اور پاپا صاحب کی دوربینی اور انکے مشاہدہ کی وسعت و گہرائی کا نتیجہ ہے، شروع میں اردو کے مشہور مزاحیہ نگار شاعر و ادیب جناب غلام احمد فرقت کاکوروی نے شاعر اور اسکے کلام کا دلچسپ اور مزاحیہ انداز میں تعارف کرایا ہے،

(ض)

مکتبۂ دارالمصنفین

سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و سیر تابعین و تبع تابعین، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، سوانح، ادبی و فلسفیانہ کتابوں اور مولانا شبلی کے مقالات کے مستقل سلسلوں کے علاوہ جو بیحد مقبول ہیں اور جن میں سے ہر ایک کے اب تک کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں مختلف موضوع پر اور بھی بہت سی کتابیں دارالمصنفین نے شائع کی ہیں جن کی مجمل فہرست یہ ہے :-

تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ محمد الخضری مرحوم کا دلنشین ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات بتفصیل بیان کی گئی ہیں۔ ۴۹۰ صفحے قیمت عہ/

اسلام کا سیاسی نظام: اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اٹھارہ ابواب کے تحت اسلامی دستور کے تقریباً تمام اصولی اور سیاسی پہلو آگئے ہیں، ۳۰۰ صفحے قیمت ۶-۰۰ روپئے

حکمائے اسلام (حصہ اول) پانچویں صدی ہجری تک کے تمام مشہور حکماء و فلاسفہ کے سوانح و حالات اور ان کے علمی و فکری کارنامے، ۴۰۴ صفحے، قیمت عہ/

حکمائے اسلام (حصہ دوم) متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات اور ان کی علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل، ۳۵۱ صفحے قیمت ۷-۰۰

طبقات الامم: اندلس کے نامور فاضل صاعد اندلسی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ، ۱۵۰ صفحے قیمت عہ/

انقلاب الامم ڈاکٹر لیبان کی کتاب کے عربی ترجمہ سر تطور الامم کا ادیبانہ و انشا پردازانہ ترجمہ؛ ۱۸۰ صفحے، قیمت: ۴-۰۰

ارض القرآن (حصہ اول) سرزمین قرآن یعنی عرب کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام و ملل و قبائل کا ذکر ہے، ان کی تاریخی و اثری تحقیق، ۳۲۰ صفحے قیمت ۶-۲۵

ارض القرآن (حصہ دوم) بنو ابراہیم کی تاریخ اور عربوں کے قبل از اسلام، تجارت، زبان و مذہب پر تحقیقات و مباحث، ۲۳۰ صفحے، قیمت: ۴-۲۵

خطبات مدراس مولانا سید سلیمان ندوی کے سیرت نبوی سے متعلق خطبات کا مجموعہ، جس میں دارالمصنفین کے سلسلۂ سیرۃ النبی کا پورا خلاصہ اور حیات نبوی کے تمام پہلو آگئے ہیں، ۲۰۰ صفحے قیمت ۶-۰۰

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

سلسلۂ مقالاتِ سلیمان

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف موضوعات پر بلند پایہ تصنیفات کے علاوہ بہت سے علمی، مذہبی، فقہی، تاریخی، ادبی و تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں، اب ان کی وفات کے بعد ان مقالات کی ترتیب، تدوین و اشاعت کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے اب تک ان کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کی فہرست یہ ہے،

مقالاتِ سلیمان حصۂ اول

(تاریخی)

- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی
- ٹیپو سلطان [illegible]
- [illegible] کا ایک [illegible] خاندان
- تاج محل اور لال قلعہ کے معمار،
- شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان کی ایک یادگار،
- [illegible] کی سیر،
- قنوج،
- [illegible] کی چند [illegible]،
- [illegible] قیمت [illegible]

مقالاتِ سلیمان حصۂ دوم

(علمی)

- ہندوستان میں علم حدیث،
- فرنگی محل اور علم حدیث
- محمد بن عمر الواقدی اور سیرت
- عرب [illegible] اسلامی رصد خانے
- کتب خانۂ اسکندریہ،
- اسلامی ہندوستان کا عہد آخر [illegible]
- مرزا [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- کتب خانۂ [illegible] بھوپال،
- [illegible]

مقالاتِ سلیمان حصۂ سوم

(مذہبی)

- علوم القرآن، اسماء القرآن
- القرآن والفلسفۃ الجدیدۃ،
- مسئلۂ ارتقاء اور قرآن مجید،
- قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات
- [illegible] نزول القرآن،
- لفظ صلوٰۃ قرآن مجید میں،
- قربانی کا اقتصادی پہلو،
- [illegible] تحریم شراب
- قرآن پاک کا تاریخی اعجاز،
- خلیل اللہ کی ہجرت
- [illegible]

[illegible]